هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جلد چہارم

سورۂ روم تا سورۂ احقاف

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

تفہیم القرآن

سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ لقمان تا سورۃ الاحقاف

جلد چہارم

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام سورت	سورت نمبر	صفحہ
۱	لقمان	۳۱	۶
۲	السجدہ	۳۲	۳۲
۳	الاحزاب	۳۳	۵۴
۴	سبا	۳۴	۱۷۲
۵	فاطر	۳۵	۲۱۶
۶	یٰسین	۳۶	۲۴۴
۷	الصافات	۳۷	۲۷۶
۸	صٓ	۳۸	۳۱۶
۹	الزمر	۳۹	۳۵۴
۱۰	المومن	۴۰	۳۸۸
۱۱	حٰمٓ السجدہ	۴۱	۴۳۴
۱۲	الشوریٰ	۴۲	۴۷۴
۱۳	الزخرف	۴۳	۵۲۰
۱۴	الدخان	۴۴	۵۵۶
۱۵	الجاثیہ	۴۵	۵۷۶
۱۶	الاحقاف	۴۶	۵۹۶
۱۷	فہرست موضوعات		۶۲۳

فہرست نقشہ جات وتصاویر

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱	عہد نبوی میں قبائل عرب کے علاقے	۵۷
۲	جنگ احزاب	۵۹
۳	وہ یہودی ریاست جس کا خواب اسرائیل کے لیڈر دیکھ رہے ہیں	۱۶۷
۴	حقیقی مسیح کے نزول کا مقام	۱۶۸
۵	یمن میں قوم سبا کا بنایا ہوا مشہور ڈیم ''سد مآرب''	۱۹۲-۱۹۳
۶	صحرائے الاحقاف	۶۱۴
۷	وادی نخلہ	۶۱۹

تفہیم القرآن

لقمان

(۳۱)

لقمان

نام اس سورہ کے دوسرے رُکوع میں وہ نصیحتیں نقل کی گئی ہیں جو لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ اسی مُناسبت سے اس کا نام لقمان رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اسلامی دعوت کو دبانے اور روکنے کے لیے جبر و ظلم کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جانے لگے تھے لیکن ابھی طوفانِ مخالفت نے پوری شدت اختیار نہ کی تھی۔ اس کی نشان دہی آیت ۱۴ - ۱۵ سے ہوتی ہے جس میں نئے نئے مسلمان ہونے والے نوجوانوں کو بتایا گیا ہے کہ والدین کے حُقوق تو بے شک خدا کے بعد سب سے بڑھ کر ہیں، لیکن اگر وہ تمھیں اسلام قبول کرنے سے روکیں اور دینِ شرک کی طرف پلٹنے پر مجبُور کریں تو ان کی یہ بات ہرگز نہ مانو۔ یہی بات سورۂ عنکبوت میں بھی ارشاد ہوئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں ایک ہی دور میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن دونوں کے مجموعی اندازِ بیان اور مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورۂ لقمان پہلے نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ اس کے پَسِ منظر میں کسی شدید مخالَفت کا نشان نہیں ملتا، اور اس کے برعکس سورۂ عنکبوت کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نُزول کے زمانے میں مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم ہو رہا تھا۔

موضوع و مضمون اس سورہ میں لوگوں کو شرک کی لغویت و نامعقولیت اور توحید کی صداقت و معقولیت سمجھائی گئی ہے، اور انھیں دعوت دی گئی ہے کہ باپ دادا کی اندھی تقلید چھوڑ دیں، کھلے دل سے اس تعلیم پر غور کریں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم خداوندِ عالَم کی طرف سے پیش کر رہے ہیں، اور کھلی آنکھوں سے دیکھیں کہ ہر طرف کائنات میں اور خود ان کے اپنے نفس میں کیسے کیسے صریح آثار اس کی سچّائی پر شہادت دے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی آواز نہیں ہے جو دنیا میں یا خود دیارِ عرب میں پہلی مرتبہ ہی اُٹھی ہو اور لوگوں کے لیے بالکل نامانوس ہو۔ پہلے بھی جو لوگ علم و عقل اور حکمت و دانائی رکھتے تھے، وہ یہی باتیں کہتے تھے جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں۔ تمھارے اپنے ہی ملک میں لقمان نامی حکیم گزر چکا ہے، جس کی حکمت و دانش کے افسانے تمھارے ہاں مشہور ہیں، جس کی ضرب الامثال اور جس کے حکیمانہ مقولوں کو تم اپنی گفتگوؤں میں نقل کرتے ہو، جس کا ذکر تمھارے شاعر اور خطیب اکثر کیا کرتے ہیں۔ اب خود ہی دیکھ لو کہ وہ کس عقیدے اور کن اخلاقیات کی تعلیم دیتا تھا۔

۳۴ آیاتہا

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ

۴ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳﴾
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ
يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

ال م۔ یہ کتابِ حکیم کی آیات ہیں،[۱] ہدایت اور رحمت نیکوکار لوگوں کے لیے،[۲] جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں[۳]۔ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں[۴]۔

۱- یعنی ایسی کتاب کی آیات جو حکمت سے لبریز ہے، جس کی ہر بات حکیمانہ ہے۔

۲- یعنی یہ آیات راہِ راست کی طرف رہنمائی کرنے والی ہیں اور خدا کی طرف سے رحمت بن کر آئی ہیں، مگر اس رحمت اور ہدایت سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہی لوگ ہیں جو حُسنِ عمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، جو نیک بننا چاہتے ہیں، جنھیں بھلائی کی جستجو ہے، جن کی صفت یہ ہے کہ برائیوں پر جب انھیں متنبہ کر دیا جائے تو ان سے رُک جاتے ہیں، اور خیر کی راہیں جب ان کے سامنے کھول کر رکھ دی جائیں تو ان پر چلنے لگتے ہیں۔ رہے بدکار اور شرپسند لوگ، تو وہ نہ اس رہنمائی سے فائدہ اُٹھائیں گے نہ اس رحمت میں سے حصہ پائیں گے۔

۳- یہ مراد نہیں ہے کہ جن لوگوں کو ''نیکوکار'' کہا گیا ہے وہ بس اِنھی تین صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ دراصل پہلے ''نیکوکار'' کا عام لفظ استعمال کر کے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا کہ وہ اُن تمام برائیوں سے رکنے والے ہیں جن سے یہ کتاب روکتی ہے، اور اُن سارے نیک کاموں پر عمل کرنے والے ہیں جن کا یہ کتاب حکم دیتی ہے۔ پھر اُن ''نیکوکار'' لوگوں کی تین اہم صفات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ باقی ساری نیکیوں کا دارومدار انھی تین چیزوں پر ہے۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں، جس سے خدا پرستی و خدا ترسی ان کی مستقل عادت بن جاتی ہے۔ وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، جس سے ایثار و قربانی کا جذبہ ان کے اندر مستحکم ہوتا ہے، متاعِ دنیا کی محبّت دبتی ہے اور رضائے الٰہی کی طلب اُبھرتی ہے۔ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جس سے ان کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس اُبھرتا ہے، جس کی بدولت وہ اس جانور کی طرح نہیں رہتے جو چراگاہ میں چھُوٹا پھر رہا ہو، بلکہ اس انسان کی طرح ہو جاتے ہیں جسے یہ شعور حاصل ہو کہ میں خود مختار نہیں ہوں، کسی آقا کا بندہ ہوں اور اپنی ساری کارگزاریوں پر اپنے آقا

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ

اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے[۵] جو کلامِ دلفریب[۶] خرید کر لاتا ہے تا کہ لوگوں کو اللہ کے

کے سامنے مجھے جواب دِہی کرنی ہے۔ ان تین خصوصیات کی وجہ سے یہ ''نیکوکار'' اس طرح کے نیکوکار نہیں رہتے جن سے اتفاقاً نیکی سرزد ہو جاتی ہے اور بدی بھی اسی شان سے سرزد ہو سکتی ہے جس شان سے نیکی سرزد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ خُصوصیات ان کے نفس میں ایک مستقل نظامِ فکر و اخلاق پیدا کر دیتی ہیں جس کے باعث ان سے نیکی کا صُدور با قاعدہ ایک ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے اور بدی اگر سرزد ہوتی بھی ہے تو محض ایک حادثہ کے طور پر ہوتی ہے۔ کوئی گہرے محرکات ایسے نہیں ہوتے جو ان کے نظامِ فکر و اخلاق سے ابھرتے اور ان کو اپنے اقتضائے طبع سے بدی کی راہ پر لے جاتے ہوں۔

۴ — جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس وقت کفارِ مکہ یہ سمجھتے تھے اور عَلانیہ کہتے بھی تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اس دعوت کو قبول کرنے والے لوگ اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں۔ اس لیے حَصر کے ساتھ اور پورے زور کے ساتھ فرمایا گیا کہ ''یہی فلاح پانے والے ہیں''، یعنی یہ برباد ہونے والے نہیں ہیں جیسا کہ تم اپنے خیالِ خام میں سمجھ رہے ہو، بلکہ دراصل فلاح یہی لوگ پانے والے ہیں اور اس سے محروم رہنے والے وہ ہیں جنھوں نے اِس راہ کو اختیار کرنے سے انکار کیا ہے۔

یہاں قرآن کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے میں وہ شخص سخت غَلَطی کرے گا جو فلاح کو صرف اس دنیا کی حد تک، اور وہ بھی صرف مادّی خوشحالی کے معنٰی میں لے گا۔ فلاح کا قرآنی تصور معلوم کرنے کے لیے حسبِ ذیل آیات کو تفہیم القرآن کے تشریحی حواشی کے ساتھ بغور دیکھنا چاہیے: البقرہ: آیات ۲ تا ۵۔ آل عمران: آیات ۱۰۲، ۱۳۰، ۲۰۰۔ المائدہ: آیات ۳۵، ۹۰۔ الانعام: ۲۱۔ الاعراف: آیات ۷، ۸، ۱۵۷۔ التوبہ: ۸۸۔ یونس: ۱۷۔ النحل: ۱۱۶۔ الحج: ۷۷۔ المومنون: ۱، ۱۱۷۔ النور: ۵۱۔ الروم: ۳۸۔

۵ — یعنی ایک طرف تو خدا کی طرف سے یہ رحمت اور ہدایت آئی ہوئی ہے جس سے کچھ لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ دوسری طرف انھی خوش نصیب انسانوں کے پہلو بہ پہلو ایسے بدنصیب لوگ بھی موجود ہیں جو اللہ کی آیات کے مقابلے میں یہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں۔

۶ — اصل الفاظ ہیں: ''لَهْوَ الْحَدِيْثِ''، یعنی ایسی بات جو آدمی کو اپنے اندر مشغول کر کے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے۔ لغت کے اعتبار سے تو ان الفاظ میں کوئی ذَم کا پہلو نہیں ہے۔ لیکن استعمال میں اِن کا اطلاق بُری اور فضول اور بے ہودہ باتوں پر ہی ہوتا ہے، مثلاً گپ، خُرافات، ہنسی مذاق، داستانیں، افسانے اور ناول، گانا بجانا، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔

لہوالحدیث ''خریدنے'' کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ شخص حدیثِ حق کو چھوڑ کر حدیثِ باطل کو اختیار کرتا ہے اور ہدایت سے منہ موڑ کر ان باتوں کی طرف راغب ہوتا ہے جن میں اس کے لیے نہ دنیا میں کوئی بھلائی ہے نہ آخرت میں۔ لیکن یہ مجازی معنٰی ہیں۔ حقیقی معنٰی اس فقرے کے یہی ہیں کہ آدمی اپنا مال صَرف کر کے کوئی بے ہودہ چیز خریدے۔ اور بکثرت رِوایات بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ ابنِ ہِشامؒ نے محمد بن اسحاقؒ کی رِوایت نقل کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کفارِ مکہ کی ساری کوششوں کے باوجود پھیلتی چلی جارہی تھی تو نَضر بن حارث نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تم اس شخص کا مقابلہ کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔

اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ

راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اُڑا دے۔^۵ ایسے لوگوں کے لیے سخت

یہ شخص تمھارے درمیان بچپن سے اُدھیڑ عمر کو پہنچا ہے۔ آج تک وہ اپنے اخلاق میں تمھارا سب سے بہتر آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچّا اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، ساحر ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ آخر ان باتوں کو کون باور کرے گا؟ کیا لوگ ساحروں کو نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کی جھاڑ پھونک کرتے ہیں؟ کیا لوگوں کو معلوم نہیں کہ کاہن کس قسم کی باتیں بنایا کرتے ہیں؟ کیا لوگ شعر و شاعری سے ناواقف ہیں؟ کیا لوگوں کو جنون کی کیفیات کا علم نہیں ہے؟ ان الزامات میں سے آخر کون سا الزام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر چسپاں ہوتا ہے کہ اس کا یقین دلا کر تم عوام کو اُس کی طرف توجہ کرنے سے روک سکو گے۔ ٹھیرو، اس کا علاج میں کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ مکہ سے عراق گیا اور وہاں سے شاہانِ عجم کے قصے اور رُستم و اَسْفَنْدیار کی داستانیں لا کر اس نے قصہ گوئی کی محفلیں برپا کرنی شروع کر دیں تا کہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹے اور وہ ان کہانیوں میں کھو جائیں۔ (سیرت ابنِ ہِشام، ج ۱، ص ۳۲۰-۳۲۱) یہی روایت اسباب النُّزول میں واحدی نے کَلبی اور مُقاتِل سے نقل کی ہے۔ اور ابنِ عباسؓ نے اس پر مزید یہ اضافہ کیا ہے کہ نَضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے مُتأثّر ہو رہا ہے اس پر اپنی ایک لونڈی مسلّط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا تا کہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل اُدھر سے ہٹ جائے۔ یہ قریب قریب وہی چال تھی جس سے قوموں کے اکابر مجرمین ہر زمانے میں کام لیتے رہے ہیں۔ وہ عوام کو کھیل تماشوں اور رقص و سُرود (کلچر) میں غرق کر دینے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ انھیں زندگی کے سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہ رہے اور اس عالَمِ مستی میں ان کو سرے سے یہ محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ انھیں کس تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

لَهْوَ الْحَدِيْثِ کی یہی تفسیر بکثرت صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول ہے۔ عبداللہؓ بن مسعود سے پوچھا گیا کہ اس آیت میں لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے تین مرتبہ زور دے کر فرمایا: ھو واللّٰہ الغناء۔ ''خدا کی قسم! اِس سے مراد گانا ہے'' (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی شَیْبَہ، حاکم، بَیْہَقی) اسی سے ملتے جلتے اقوال حضرات عبداللہ بن عباسؓ، جابر بن عبداللہؓ، مجاہدؒ، عِکْرِمہؒ، سعید بن جُبَیرؒ، حسن بصریؒ اور مَکْحُولؒ سے مروی ہیں۔ ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم اور تِرْمِذی نے حضرت ابو اُمامہؓ باہلی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لایحل بیع المغنیات ولاشراؤھن ولا التجارۃ فیھن ولا اثمانھن۔ ''مُغَنِّیہ عورتوں کا بیچنا اور خریدنا اور ان کی تجارت کرنا حلال نہیں ہے اور نہ ان کی قیمت لینا حلال ہے۔'' ایک دوسری روایت میں آخری فقرے کے الفاظ یہ ہیں: اکل ثمنھن حرام۔ ''ان کی قیمت کھانا حرام ہے۔'' ایک اور روایت انھی ابو امامہؓ سے ان الفاظ میں منقول ہے کہ لا یحل تعلیم المغنیات ولا بیعھن ولا شراؤھن وثمنھن حرام۔ ''لونڈیوں کو گانے بجانے کی تعلیم دینا اور ان کی خرید و فروخت کرنا حلال نہیں، اور ان کی قیمت حرام ہے۔'' ان تینوں حدیثوں میں یہ صراحت بھی ہے کہ آیت میں مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ انھی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ قاضی ابوبکر ابنُ العَرَبیؒ ''احکام القرآن'' میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور امام مالکؒ کے حوالے سے

مُّهِيْنٌ ۝٦ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ
يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْۤ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٧
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝٨

ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔[9] اُسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رُخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اس نے انھیں سُنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔ اچھا، مُژدہ سنا دو اسے ایک دردناک عذاب کا۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، اُن کے لیے نعمت بھری جنتیں

حضرت اَنسؓ کی رِوایت نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من جلس الی قینة یسمع منها صُبَّ فی اذنیه الاٰنُكُ یَومَ القیٰمة۔ " جو شخص گانے والی لونڈی کی مجلس میں بیٹھ کر اس کا گانا سنے گا قیامت کے روز اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسا ڈالا جائے گا۔" (اس سلسلے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اُس زمانے میں گانے بجانے کی "ثقافت" تمام تر، بلکہ کُلِّیتاً لونڈیوں کی بدولت زندہ تھی۔ آزاد عورتیں اس وقت تک "آرٹسٹ" نہ بنی تھیں۔ اسی لیے حضورؐ نے مُغَنِّیات کی بَیع وشرا کا ذکر فرمایا اور ان کی فیس کو قیمت کے لفظ سے تعبیر کیا اور گانے والی خاتون کے لیے قَینَہ کا لفظ استعمال کیا جو عربی زبان میں لونڈی کے لیے بولا جاتا ہے۔)

۷ ۔ "علم کے بغیر" کا تعلق "خریدتا ہے" کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے اور "بھٹکا دے" کے ساتھ بھی۔ اگر اس کا تعلق پہلے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ جاہل اور نادان آدمی اس دلفریب چیز کو خریدتا ہے اور کچھ نہیں جانتا کہ کیسی قیمتی چیز کو چھوڑ کر وہ کس تباہ کُن چیز کو خرید رہا ہے۔ ایک طرف حکمت اور ہدایت سے لبریز آیاتِ الٰہی ہیں جو مفت اسے مل رہی ہیں مگر وہ ان سے منہ موڑ رہا ہے۔ دوسری طرف یہ بےہودہ چیزیں ہیں جو فکر و اخلاق کو غارت کر دینے والی ہیں اور وہ اپنا مال خرچ کر کے انھیں حاصل کر رہا ہے۔ اور اگر اسے دوسرے فقرے سے متعلق سمجھا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ وہ علم کے بغیر لوگوں کی رہنمائی کرنے اٹھا ہے، اسے یہ شعور نہیں ہے کہ خلقِ خدا کو راہِ خدا سے بھٹکانے کی کوشش کر کے وہ کتنا بڑا مَظلِمَہ اپنی گردن پر لے رہا ہے۔

۸ ۔ یعنی یہ شخص لوگوں کو قصے کہانیوں اور گانے بجانے میں مشغول کر کے اللہ کی آیات کا منہ چڑانا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ قرآن کی اس دعوت کو ہنسی ٹھٹھوں میں اُڑا دیا جائے۔ یہ خدا کے دین سے لڑنے کے لیے کچھ اس طرح کا نقشۂ جنگ جمانا چاہتا ہے کہ اِدھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی آیات سنانے نکلیں، اُدھر کہیں کسی خوش اَندام و خوش گلو مُغَنِّیَہ کا مُجرا ہو رہا ہو، کہیں کوئی چرب زبان قصہ گو ایران توران کی کہانیاں سنا رہا ہو، اور لوگ ان ثقافتی سرگرمیوں میں غرق ہو کر اس موڈ ہی میں نہ رہیں کہ خدا اور آخرت اور اخلاق کی باتیں انھیں سنائی جا سکیں۔

۹ ۔ یہ سزا ان کے جرم کی مناسبت سے ہے۔ وہ خدا کے دین اور اس کی آیات اور اس کے رسول کی تذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ خدا اس کے بدلے میں ان کو سخت ذلت کا عذاب دے گا۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ
تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ

ہیں[10] جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔[11]

اُس[12] نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔[13] اُس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔[14] اُس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور آسمان سے

۱۰ – یہ نہیں فرمایا کہ ان کے لیے جنت کی نعمتیں ہیں، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں۔ اگر پہلی بات فرمائی جاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ان نعمتوں سے لطف اندوز تو ضرور ہوں گے مگر وہ جنتیں ان کی اپنی نہ ہوں گی۔ اس کے بجائے جب یہ فرمایا گیا کہ "ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں"، تو اس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پوری پوری جنتیں ان کے حوالے کر دی جائیں گی اور وہ اُن کی نعمتوں سے اس طرح مستفید ہوں گے جس طرح ایک مالک اپنی چیز سے مستفید ہوتا ہے، نہ کہ اُس طرح جیسے کسی کو حقوقِ ملکیت دیے بغیر محض ایک چیز سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دے دیا جائے۔

۱۱ – یعنی کوئی چیز اس کو اپنا وعدہ پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی، اور وہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک ٹھیک حکمت اور عدل کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے۔ "یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے" کہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کو بیان کرنے کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو بالارادہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے اور نہ اس کائنات میں کوئی طاقت ایسی ہے جو اس کا وعدہ پورا ہونے میں مانع ہو سکتی ہو، اس لیے اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا کہ ایمان و عملِ صالح کے انعام میں جو کچھ اللہ نے دینے کا وعدہ فرمایا ہے وہ کسی کو نہ ملے۔ نیز یہ کہ اللہ کی طرف سے اس انعام کا اعلان سراسر اس کی حکمت اور اس کے عدل پر مبنی ہے۔ اس کے ہاں کوئی غلط بخشی نہیں ہے کہ مستحق کو محروم رکھا جائے اور غیر مستحق کو نواز دیا جائے۔ ایمان و عملِ صالح سے متّصف لوگ فی الواقع اس انعام کے مستحق ہیں اور اللہ یہ انعام انھی کو عطا فرمائے گا۔

۱۲ – اُوپر کے تمہیدی فقروں کے بعد اب اصل مدّعا، یعنی تردیدِ شرک اور دعوتِ توحید پر کلام شروع ہوتا ہے۔

۱۳ – اصل الفاظ ہیں: بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ "تم خود دیکھ رہے ہو کہ وہ بغیر ستونوں کے قائم ہیں۔" دوسرا مطلب یہ کہ "وہ ایسے ستونوں پر قائم ہیں جو تم کو نظر نہیں آتے۔" ابنِ عباسؓ اور مجاہد نے دوسرا مطلب لیا ہے، اور بہت سے دوسرے مفسرین پہلا مطلب لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علومِ طبیعی کے لحاظ سے اگر اس کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام عالمِ افلاک میں یہ بے حد و حساب عظیم الشان تارے اور سیّارے اپنے اپنے مقام و مدار پر غیر مرئی سہاروں سے قائم کیے گئے ہیں۔ کوئی تار نہیں ہیں جنھوں نے ان کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہو۔ کوئی سلاخیں

مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۰﴾ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ
مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۱﴾ ع وَ
لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ

پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ، اِن دُوسروں نے کیا پیدا کیا ہے[15]؟ —— اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں[16] ع

ہم[17] نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار رہو[18]۔ جو کوئی شکر کرے اُس کا شکر اُس کے

نہیں ہیں جو ان کو ایک دوسرے پر گر جانے سے روک رہی ہوں۔ صرف قانونِ جذب وکشش ہے جو اس نظام کو تھامے ہوئے ہے۔ یہ تعبیر ہمارے آج کے علم کے لحاظ سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل ہمارے علم میں کچھ اور اضافہ ہو اور اس سے زیادہ لگتی ہوئی کوئی دوسری تعبیر اس حقیقت کی کی جاسکے۔

۱۴ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۲، سورۃ النحل، حاشیہ ۱۲۔

۱۵ – یعنی ان ہستیوں نے جن کو تم اپنا معبُود بنائے بیٹھے ہو، جنھیں تم اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ رہے ہو، جن کی بندگی بجالانے پر تمھیں اتنا اصرار ہے۔

۱۶ – یعنی جب یہ لوگ اللہ کے سوا اس کائنات میں کسی دوسرے کی تخلیق کی کوئی نشان دہی نہیں کر سکتے، اور ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے، تو ان کا غیر خالق ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرانا اور ان کے آگے سرِنیاز جھکانا، اور ان سے دعائیں مانگنا اور حاجتیں طلب کرنا، بجز اس کے کہ صریح بے عقلی ہے، اور کوئی دوسری تاویل ان کے اس احمقانہ فعل کی نہیں کی جاسکتی۔ جب تک کوئی شخص بالکل ہی نہ بہک گیا ہو اس سے اتنی بڑی حماقت سرزد نہیں ہوسکتی کہ آپ کے سامنے وہ خود اپنے معبُودوں کے غیر خالق ہونے اور صرف اللہ ہی کے خالق ہونے کا اعتراف کرے اور پھر بھی انھیں معبود ماننے پر مُصِرّ رہے۔ کسی کے بھیجے میں ذرّہ برابر بھی عقل ہو تو وہ لامحالہ یہ سوچے گا کہ جو کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، اور جس کا زمین و آسمان کی کسی شے کی تخلیق میں برائے نام بھی کوئی حصّہ نہیں ہے، وہ آخر کیوں ہمارا معبُود ہو؟ کیوں ہم اس کے آگے سجدہ ریز ہوں یا اس کی قدم بوسی و آستانہ بوسی کرتے پھریں؟ کیا طاقت اس کے پاس ہے کہ وہ ہماری فریاد رسی اور حاجت روائی کر سکے؟ بالفرض وہ ہماری دعاؤں کو سنتا بھی ہو تو ان کے جواب میں وہ خود کیا کارروائی کر سکتا ہے، جب کہ وہ کچھ بنانے کے اختیارات رکھتا ہی نہیں؟ بگڑی تو وہی بنائے گا جو کچھ بنا سکتا ہو، نہ کہ وہ جو کچھ بھی نہ بنا سکتا ہو۔

۱۷- شرک کی تردید میں ایک پُرزور عقلی دلیل پیش کرنے کے بعد اب عرب کے لوگوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ معقول بات آج کوئی پہلی مرتبہ تمھارے سامنے پیش نہیں کی جا رہی ہے، بلکہ پہلے بھی عاقل و دانا لوگ یہی بات کہتے رہے ہیں اور تمھارا اپنا مشہور حکیم، لقمان اب سے بہت پہلے یہی کچھ کہہ گیا ہے۔ اس لیے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر شرک کوئی نامعقول عقیدہ ہے تو پہلے کسی کو یہ بات کیوں نہ سوجھی۔

لقمان کی شخصیت عرب میں ایک حکیم و دانا کی حیثیت سے بہت مشہور تھی۔ شعرائے جاہلیّت، مثلاً اِمرَؤُالقَیس، لَبِید، اَعْشیٰ، طَرَفَہ وغیرہ کے کلام میں اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہلِ عرب میں بعض پڑھے لکھے لوگوں کے پاس صحیفۂ لقمان کے نام سے ان کے حکیمانہ اقوال کا ایک مجموعہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ رِوایات میں آیا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے مدینے کا اوّلین شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مُتأثّر ہوا، وہ سُوَید بن صامِت تھا۔ وہ حج کے لیے مکہ گیا۔ وہاں حضورؐ اپنے قاعدے کے مطابق مختلف علاقوں سے آئے ہوئے حاجیوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر دعوتِ اسلام دیتے پھر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں سُوَید نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سنی تو اس نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپ جو باتیں پیش کر رہے ہیں، ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے۔ آپؐ نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: مُجلّۂ لقمان۔ پھر آپؐ کی فرمایش پر اس نے اس مُجلّے کا کچھ حصہ آپؐ کو سنایا۔ آپؐ نے فرمایا: یہ بہت اچھا کلام ہے، مگر میرے پاس ایک اور کلام اس سے بھی بہتر ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے اسے قرآن سنایا، اور اس نے اعتراف کیا کہ یہ بلاشبہ مُجلّۂ لقمان سے بہتر ہے۔ (سیرت ابنِ ہِشَام، ج ۲، ص ۶۷-۶۹۔ اُسْدُ الغابہ، ج ۲، صفحہ ۳۷۸) مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ شخص (سُوَید بن صامِت) مدینے میں اپنی لیاقت، بہادری، شعر و سُخَن اور شرف کی بنا پر ''کامل'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے بعد جب وہ مدینہ واپس ہوا تو کچھ مدت بعد جنگِ بُعَاث پیش آئی اور یہ اس میں مارا گیا۔ اس کے قبیلے کے لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ حضورؐ سے ملاقات کے بعد وہ مسلمان ہو گیا تھا۔

تاریخی اعتبار سے لقمان کی شخصیت کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ جاہلیت کی تاریک صدیوں میں کوئی مُدوَّن تاریخ تو موجود نہ تھی۔ معلومات کا انحصار اُن سینہ بہ سینہ روایات پر تھا جو سیکڑوں برس سے چلی آ رہی تھیں۔ ان رِوایات کی رُو سے بعض لوگ لقمان کو قومِ عاد کا ایک فرد اور یمن کا ایک بادشاہ قرار دیتے تھے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے انھی رِوایات پر اعتماد کر کے ارض القرآن میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ قومِ عاد پر خدا کا عذاب آنے کے بعد اس قوم کے جو اہلِ ایمان حضرت ہودؑ کے ساتھ بچ رہے تھے، لقمان انھی کی نسل سے تھا، اور یمن میں اس قوم نے جو حکومت قائم کی تھی، یہ اس کے بادشاہوں میں سے ایک تھا۔ لیکن دوسری روایات جو بعض اکابر صحابہؓ و تابعینؒ سے مروی ہیں، اس کے بالکل خلاف ہیں۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ لقمان ایک حبشی غلام تھا۔ یہی قول حضرت ابوہُریرہؓ، مُجاہدؒ، عِکرِمہؒ اور خالد الرّبعیؒ کا ہے۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کا بیان ہے کہ وہ نُوبہ کا رہنے والا تھا۔ سعید بن مُسَیَّبؒ کا قول ہے کہ وہ مصر کے سیاہ رنگ لوگوں میں سے تھا۔ یہ تینوں اقوال قریب قریب متشابہ ہیں۔ کیونکہ عرب کے لوگ سیاہ رنگ لوگوں کو اس زمانے میں عُموماً حَبَشی کہتے تھے، اور نوبہ اس علاقے کا نام ہے جو مصر کے جنوب اور سُودان (سوڈان) کے شِمال میں واقع ہے۔ اس لیے تینوں اقوال میں ایک شخص کو مصری، نُوبی اور حبشی قرار دینا محض لفظی اختلاف ہے۔ معنیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر رَوْضُ الْاُنُف میں سُہَیلی اور مُرُوج الذَّہَب میں مَسعودی کے بیانات سے اس سوال پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس سُودانی غلام کی باتیں عرب میں کیسے پھیلیں۔ ان دونوں کا بیان

لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑫ وَ اِذْ قَالَ
لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲

اپنے ہی لیے مفید ہے۔ اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔[19]
یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: "بیٹا! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا[20]

ہے کہ یہ شخص اصلاً تو نُوبی تھا، لیکن باشندہ مَدْیَن اور اَیْلَہ (موجودہ عَقَبَہ) کے علاقے کا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی زبان عربی تھی اور اس کی حکمت عرب میں شائع ہوئی۔ مزید برآں سُہَیلی نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ لقمانِ حکیم اور لقمان بن عاد دو الگ الگ اشخاص ہیں۔ ان کو ایک شخصیت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ (رَوضُ الاُنُف، ج ۱، ص ۲۶۶۔ مسعودی، ج ۱، ص ۵۷)

یہاں اس بات کی تصریح بھی ضروری ہے کہ مُستَشرِق دیرنبورگ (Derenbourg) نے پیرس کے کُتُب خانہ کا ایک عَرَبی مخطوطہ جو "اَمثالِ لقمان الحکیم" (Fables De Loqman Le Sage) کے نام سے شائع کیا ہے وہ حقیقت میں ایک موضوع چیز ہے جس کا مُجلّۂ لقمان سے کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ یہ امثال تیرھویں صدی عیسوی میں کسی شخص نے مرتّب کی تھیں۔ اس کی عربی بہت ناقص ہے اور اسے پڑھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ دراصل کسی اور زبان کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مصنف یا مترجم نے اپنی طرف سے لقمانِ حکیم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مستشرقین اس قسم کی جعلی چیزیں نکال نکال کر جس مقصد کے لیے سامنے لاتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی طرح قرآن کے بیان کردہ قصوں کو غیر تاریخی افسانے ثابت کر کے ساقط الاعتبار ٹھیرا دیا جائے۔ جو شخص بھی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں "لقمان" کے عنوان پر ہیلر (B. Heller) کا مضمون پڑھے گا، اس سے ان لوگوں کی نیت کا حال مخفی نہ رہے گا۔

۱۸ – یعنی اللہ کی بخشی ہوئی اس حکمت و دانائی اور بصیرت و فرزانگی کا اوّلین تقاضا یہ تھا کہ انسان اپنے رب کے مقابلے میں شکر گزاری و احسان مندی کا رَوِیّہ اختیار کرے نہ کہ کفرانِ نعمت اور نمک حرامی کا۔ اور اس کا یہ شکر محض زبانی جمع خرچ ہی نہ ہو بلکہ فکر اور قول اور عمل، تینوں صورتوں میں ہو۔ وہ اپنے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اس بات کا یقین و شُعور بھی رکھتا ہو کہ مجھے جو کچھ نصیب ہے خدا کا دیا ہوا ہے۔ اس کی زبان اپنے خدا کے احسانات کا ہمیشہ اعتراف بھی کرتی رہے۔ اور وہ عملاً بھی خدا کی فرماں برداری کر کے، اس کی مَعصِیَت سے پرہیز کر کے، اس کی رضا کی طلب میں دوڑ دھوپ کر کے، اس کے دیے ہوئے انعامات کو اس کے بندوں تک پہنچا کر، اور اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے مجاہدہ کر کے یہ ثابت کر دے کہ وہ فی الواقع اپنے خدا کا احسان مند ہے۔

۱۹ – یعنی جو شخص کفر کرتا ہے اس کا کفر اس کے اپنے لیے نقصان دِہ ہے، اللہ تعالیٰ کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ بے نیاز ہے، کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ کسی کا شکر اس کی خدائی میں کوئی اضافہ نہیں کر دیتا، نہ کسی کا کفر اس امرِ واقعہ کو بدل سکتا ہے کہ بندوں کو جو نعمت بھی نصیب ہے اسی کی عطا کردہ ہے۔ وہ تو آپ سے آپ محمود ہے خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ

اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسٰنَ بِوَالِدَيۡهِۚ

حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"[21] ـــــ اور یہ حقیقت ہے[22] کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے

کرے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے کمال و جمال اور اس کی خلّاقی و رزّاقی پر شہادت دے رہا ہے اور ہر مخلوق زبانِ حال سے اس کی حمد بجا لا رہی ہے۔

۲۰ – لقمان کی حکیمانہ باتوں میں سے اس خاص نصیحت کو دو مناسبتوں کی بنا پر یہاں نقل کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ انھوں نے یہ نصیحت اپنے بیٹے کو کی تھی، اور ظاہر بات ہے کہ آدمی دنیا میں سب سے بڑھ کر اگر کسی کے حق میں مخلص ہو سکتا ہے تو وہ اس کی اپنی اولاد ہی ہے۔ ایک شخص دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے، ان سے منافقانہ باتیں کر سکتا ہے، لیکن اپنی اولاد کو تو ایک بُرے سے بُرا آدمی بھی فریب دینے کی کوشش کبھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے لقمان کا اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کے نزدیک شرک فی الواقع ایک بدترین فعل تھا اور اسی بنا پر انھوں نے سب سے پہلے جس چیز کی اپنے لختِ جگر کو تلقین کی وہ یہ تھی کہ اس گمراہی سے اجتناب کرے۔ دوسری مناسبت اس حکایت کی یہ ہے کہ کفارِ مکہ میں سے بہت سے ماں باپ اس وقت اپنی اولاد کو دینِ شرک پر قائم رہنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید سے منہ موڑ لینے پر مجبور کر رہے تھے، جیسا کہ آگے کی آیات بتا رہی ہیں۔ اس لیے ان نادانوں کو سنایا جا رہا ہے کہ تمھاری سرزمین کے مشہور حکیم نے تو اپنی اولاد کی خیر خواہی کا حق یوں ادا کیا تھا کہ اسے شرک سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی۔ اب تم جو اپنی اولاد کو اسی شرک پر مجبور کر رہے ہو تو یہ ان کے ساتھ بدخواہی ہے یا خیر خواہی؟

۲۱ – ظلم کے اصل معنیٰ ہیں: کسی کا حق مارنا اور انصاف کے خلاف کام کرنا۔ شرک اس وجہ سے ظلمِ عظیم ہے کہ آدمی اُن ہستیوں کو اپنے خالق اور رازق اور مُنعم کے برابر لا کھڑا کرتا ہے جن کا نہ اس کے پیدا کرنے میں کوئی حصّہ، نہ اس کو رزق پہنچانے میں کوئی دخل، اور نہ اُن نعمتوں کے عطا کرنے میں کوئی شرکت جن سے آدمی اس دنیا میں مُتمتّع ہو رہا ہے۔ یہ ایسی بے انصافی ہے جس سے بڑھ کر کسی بے انصافی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ پھر آدمی پر اُس کے خالق کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی و پرستش کرے، مگر وہ دوسروں کی بندگی بجا لا کر اُس کا حق مارتا ہے۔ پھر اس بندگیِ غیر کے سلسلے میں آدمی جو عمل بھی کرتا ہے اس میں وہ اپنے ذہن و جسم سے لے کر زمین و آسمان تک کی بہت سی چیزوں کو استعمال کرتا ہے، حالاں کہ یہ ساری چیزیں اللہ وحدہٗ لا شریک کی پیدا کردہ ہیں اور ان میں سے کسی چیز کو بھی اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں استعمال کرنے کا اُسے حق نہیں ہے۔ پھر آدمی پر خود اس کے اپنے نفس کا یہ حق ہے کہ وہ اسے ذلّت اور عذاب میں مبتلا نہ کرے۔ مگر وہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی بندگی کر کے اپنے آپ کو ذلیل بھی کرتا ہے اور مستحقِ عذاب بھی بناتا ہے۔ اس طرح مشرک کی پوری زندگی ایک ہمہ جہتی اور ہمہ وقتی ظلم بن جاتی ہے جس کا کوئی سانس بھی ظلم سے خالی نہیں رہتا۔

۲۲ – یہاں سے پیراگراف کے آخر تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے لقمان کے قول کی تشریحِ مزید کے لیے ارشاد فرمایا ہے۔

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰی وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِیۡ عَامَیۡنِ اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ
وَلِوَالِدَیۡکَ ؕ اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِكَ النصف
بِیۡ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا
مَعۡرُوۡفًا ۫ وَّاتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ

کی خود تاکید کی ہے۔ اُس کی ماں نے ضُعف پر ضُعف اُٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔[۲۳] (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا[۲۴] تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ، مگر پیروی اُس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے،[۲۵] اُس وقت

۲۳ – ان الفاظ سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد (رحمہم اللہ) نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچے کی مدّتِ رضاعت دو سال ہے۔ اس مدت کے اندر اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تب تو حُرمتِ رضاعت ثابت ہوگی، ورنہ بعد کی کسی رضاعت کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا۔ امام مالکؒ سے بھی ایک رِوایت اسی قول کے حق میں ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ نے مزید احتیاط کی خاطر ڈھائی سال کی مدت تجویز کی ہے، اور اس کے ساتھ ہی امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر دو سال یا اس سے کم مدّت میں بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا ہو اور اپنی غذا کے لیے بچہ دودھ کا محتاج نہ رہا ہو تو اس کے بعد کسی عورت کا دودھ پی لینے سے کوئی حرمت ثابت نہ ہوگی۔ البتہ اگر بچے کی اصل غذا دودھ ہی ہو تو دوسری غذا تھوڑی بہت کھانے کے باوجود اس زمانے کی رضاعت سے حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اس لیے کہ آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ بچے کو لازماً دو سال ہی دودھ پلایا جائے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے: وَالۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ، ''مائیں بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اُس شخص کے لیے جو رضاعت پوری کرانا چاہتا ہو۔'' (آیت ۲۳۳)

ابنِ عباسؓ نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور اہلِ علم نے اس پر ان سے اتفاق کیا ہے کہ حمل کی قلیل ترین مدت چھ ماہ ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا، ''اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کا دودھ چھوٹنا ۳۰ مہینوں میں ہوا۔'' (الاحقاف، آیت ۱۵) یہ ایک اہم قانونی نکتہ ہے جو جائز اور ناجائز ولادت کی بہت سی بحثوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

۲۴ – یعنی جو تیرے علم میں میرا شریک نہیں ہے۔

فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ
خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۶﴾ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۚ ﴿۱۷﴾

میں تمھیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔[۲۶]

(اور لقمان[۲۷] نے کہا تھا کہ) ”بیٹا! کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اُسے نکال لائے گا۔[۲۸] وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ بیٹا! نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔[۲۹] یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔[۳۰]

---

۲۵ – یعنی اولاد اور والدین سب کو۔

۲۶ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، سورۂ عنکبوت، حواشی ۱۱ – ۱۲

۲۷ – لقمان کے دوسرے نصائح کا ذکر یہاں یہ بتانے کے لیے کیا جا رہا ہے کہ عقائد کی طرح اَخلاق کے متعلق بھی جو تعلیمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، وہ بھی عرب میں کوئی انوکھی باتیں نہیں ہیں۔

۲۸ – یعنی اللہ کے علم سے اور اس کی گرفت سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی۔ چٹان کے اندر ایک دانہ تمھارے لیے مخفی ہوسکتا ہے، مگر اُس کے لیے عیاں ہے۔ آسمانوں میں کوئی ذرّہ تم سے بعید ترین ہوسکتا ہے، مگر اللہ کے لیے وہ بہت قریب ہے۔ زمین کی تہوں میں پڑی ہوئی کوئی چیز تمھارے لیے سخت تاریکی میں ہے، مگر اس کے لیے بالکل روشنی میں ہے۔ لہٰذا تم کہیں کسی حال میں بھی نیکی یا بدی کا کوئی کام ایسا نہیں کر سکتے جو اللہ سے مخفی رہ جائے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس سے واقف ہے، بلکہ جب محاسبہ کا وقت آئے گا تو وہ تمھاری ایک ایک حرکت کا ریکارڈ سامنے لا کر رکھ دے گا۔

۲۹ – اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ جو شخص بھی نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے کا کام کرے گا اس پر مصائب کا نُزول ناگزیر ہے۔ دنیا لازماً ایسے شخص کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ جاتی ہے اور اسے ہر قسم کی اذیتوں سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔

۳۰ – دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اصلاحِ خَلق کے لیے اُٹھنا اور اس کی مشکلات کو انگیز کرنا کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ان کاموں میں سے ہے جن کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ؕ إِنَّ اللَّهَ
لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ
مِنْ صَوْتِكَ ؕ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿١٩﴾ ع

ع ۲ ۸ ۱۱

اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر،[۳۱] نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔[۳۲] اپنی چال میں اعتدال اختیار کر،[۳۳] اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔[۳۴] ع

۳۱- اصل الفاظ ہیں: لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ۔ صَعَر عربی زبان میں ایک بیماری کو کہتے ہیں جو اُونٹ کی گردن میں ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اونٹ اپنا منہ ہر وقت ایک ہی طرف پھیرے رکھتا ہے۔ اس سے محاورہ نکلا: فلان صعّر خدّہ، ''فلاں شخص نے اُونٹ کی طرح اپنا کلّہ پھیر لیا'' یعنی تکبر کے ساتھ پیش آیا اور منہ پھیر کر بات کی۔ اسی کے متعلق قبیلۂ تَغلب کا ایک شاعر عَمْرو بن حُیَیّ کہتا ہے:

وَ کنّا اذا الجبّار صَعَّر خَدَّہٗ   اقمنَا لہ من میلہ فتقوّمَا

''ہم ایسے تھے کہ جب کبھی کسی جبار نے ہم سے منہ پھیر کر بات کی تو ہم نے اس کی ٹیڑھ ایسی نکالی کہ وہ سیدھا ہوگیا۔''

۳۲- اصل الفاظ ہیں: مُخْتَالٍ اور فَخُورٍ۔ مُخْتَالٍ کے معنٰی ہیں: وہ شخص جو اپنی دانست میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہو۔ اور فَخُورٍ اس کو کہتے ہیں جو اپنی بڑائی کا دوسروں پر اظہار کرے۔ آدمی کی چال میں اکڑ اور اِتراہٹ اور تَبَختُر کی شان لازماً اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے دماغ میں تکبر کی ہوا بھر جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو اپنی بڑائی محسوس کرائے۔

۳۳- بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ ''تیز بھی نہ چل اور آہستہ بھی نہ چل، بلکہ میانہ روی اختیار کر''، لیکن سیاقِ کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رفتار کی تیزی وسستی زیرِ بحث نہیں ہے۔ آہستہ چلنا یا تیز چلنا اپنے اندر کوئی اَخلاقی حُسن و قُبح نہیں رکھتا اور نہ اس کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔ آدمی کو جلدی کا کوئی کام ہو تو تیز کیوں نہ چلے۔ اور اگر وہ محض تفریحاً چل رہا ہو تو آخر آہستہ چلنے میں کیا قباحت ہے۔ میانہ روی کا اگر کوئی معیار ہو بھی تو ہر حالت میں ہر شخص کے لیے ایک قاعدۂ کُلِّیہ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ دراصل جو چیز یہاں مقصود ہے وہ تو نفس کی اُس کیفیت کی اصلاح ہے جس کے اثر سے چال میں تَبَختُر اور مسکینی کا ظہور ہوتا ہے۔ بڑائی کا گھمنڈ اندر موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص طرز کی چال میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے جسے دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے بلکہ چال کی شان یہ تک بتا دیتی ہے کہ کس گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ دولت، اقتدار، حُسن، علم، طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں بھی انسان کے اندر تکبُّر پیدا کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اس کی چال کا ایک مخصوص ٹائپ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس چال میں مسکینی کا ظہور بھی کسی نہ کسی مذموم نفسی کیفیت کے اثر سے ہوتا ہے۔ کبھی انسان کے نفس کا مخفی تکبر ایک نمائشی تواضع اور دکھاوے

اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمھارے لیے مُسخّر کر رکھی ہیں[۳۵]

کی درویشی و خدا رسیدگی کا رُوپ دھارتا ہے اور یہ چیز اس کی چال میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اور کبھی انسان واقعی دنیا اور اس کے حالات سے شکست کھا کر اور اپنی نگاہ میں آپ حقیر ہو کر مَرِیَل چال چلنے لگتا ہے۔ لقمان کی نصیحت کا منشا یہ ہے کہ اپنے نفس کی ان کیفیات کو دُور کرو اور ایک سیدھے سادھے معقول اور شریف آدمی کی سی چال چلو، جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو، نہ مَرِیَل پَن، اور نہ ریا کارانہ زُہد و انکسار۔

صحابۂ کرامؓ کا ذوق اس معاملے میں جیسا کچھ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو سر جھکائے ہوئے چلتے دیکھا تو پکار فرمایا: "سر اٹھا کر چل، اسلام مریض نہیں ہے۔" ایک اور شخص کو انھوں نے مریل چال چلتے دیکھا تو فرمایا: "ظالم، ہمارے دین کو کیوں مارے ڈالتا ہے۔" ان دونوں واقعات سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک دین داری کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ آدمی بیماروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھے اور خواہ مخواہ مسکین بنا چلا جائے۔ کسی مسلمان کو ایسی چال چلتے دیکھ کر انھیں خطرہ ہوتا تھا کہ یہ چال دوسروں کے سامنے اسلام کی غلط نمایندگی کرے گی اور خود مسلمانوں کے اندر اَفسُردگی پیدا کر دے گی۔ ایسا ہی واقعہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو پیش آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک صاحب بہت مُضمَحل سے بنے ہوئے چل رہے ہیں۔ پوچھا: انھیں کیا ہو گیا؟ عرض کیا گیا کہ یہ قُرّا میں سے ہیں۔ (یعنی قرآن پڑھنے پڑھانے والے اور تعلیم و عبادت میں مشغول رہنے والے۔) اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "عمر سَیّدُ القُرّا تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب چلتے تو زور سے چلتے، جب بولتے تو قوت کے ساتھ بولتے، اور جب پیٹتے تو خوب پیٹتے تھے۔" (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ بنی اسرائیل، حاشیہ ۴۳۔ تفسیر سورۃ الفرقان، حاشیہ ۷۹)

۳۴۔ اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ آدمی ہمیشہ آہستہ بولے اور کبھی زور سے بات نہ کرے۔ بلکہ گدھے کی آواز سے تشبیہ دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ مقصود کس طرح کے لہجے اور کس طرح کی آواز میں بات کرنے سے روکنا ہے۔ لہجے اور آواز کی ایک پستی و بلندی اور سختی و نرمی تو وہ ہوتی ہے جو فطری اور حقیقی ضروریات کے لحاظ سے ہو، مثلاً قریب کے آدمی یا کم آدمیوں سے آپ مخاطَب ہوں تو آہستہ بولیں گے۔ دُور کے آدمی سے بولنا ہو یا بہت سے لوگوں سے خطاب کرنا ہو تو لامحالہ زور ہی سے بولنا ہو گا۔ ایسا ہی فرق لہجوں میں بھی موقع و محل کے لحاظ سے لازماً ہوتا ہے۔ تعریف کا لہجہ مَذمّت کے لہجے سے اور اظہارِ خوشنودی کا لہجہ اظہارِ ناراضی کے لہجے سے مختلف ہونا ہی چاہیے۔ یہ چیز کسی درجے میں بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ نہ لقمان کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس فرق کو مٹا کر بس ہمیشہ ایک ہی طرح نرم آواز اور پست لہجے میں بات کیا کرے۔ قابلِ اعتراض جو چیز ہے، وہ تکبر کا اظہار کرنے اور دھونس جمانے اور دوسرے کو ذلیل و مرعوب کرنے کے لیے گلا پھاڑنا اور گدھے کی سی آواز میں بولنا ہے۔

۳۵۔ کسی چیز کو کسی کے لیے مسخّر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک، یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرّف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ دوسری، یہ کہ اس چیز کو کیسے

وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ
يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۲۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ
لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ
اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾

اور اپنی کُھلی اور چُھپی نعمتیں[۳۶] تم پر تمام کر دی ہیں؟ اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں[۳۷] بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب[۳۸]۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ انھی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان اُن کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو؟[۳۹]

ضابطے کا پابند کر دیا جائے جس کی بدولت وہ اُس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک ہی معنیٰ میں مسخر نہیں کر دیا ہے، بلکہ بعض چیزیں پہلے معنیٰ میں مسخر کی ہیں اور بعض دوسرے معنیٰ میں۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنیٰ میں ہمارے لیے مسخر ہیں، اور چاند، سورج وغیرہ دوسرے معنیٰ میں۔

۳۶- کھلی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو آدمی کو کسی نہ کسی طرح محسوس ہوتی ہیں، یا جو اس کے علم میں ہیں۔ اور چھپی ہوئی نعمتوں سے وہ نعمتیں مراد ہیں جنھیں آدمی نہ جانتا ہے نہ محسوس کرتا ہے۔ بے حد و حساب چیزیں ہیں جو انسان کے اپنے جسم میں اور اس کے باہر دنیا میں اس کے مفاد کے لیے کام کر رہی ہیں، مگر انسان کو ان کا پتا تک نہیں ہے کہ اس کے خالق نے اس کی حفاظت کے لیے، اس کی رزق رسانی کے لیے، اس کی نَشْو و نُما کے لیے، اور اس کی فلاح کے لیے کیا کیا سروسامان فراہم کر رکھا ہے۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں انسان تحقیق کے جتنے قدم آگے بڑھاتا جا رہا ہے، اس کے سامنے خدا کی بہت سی وہ نعمتیں بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں جو پہلے اس سے بالکل مخفی تھیں، اور آج تک جن نعمتوں پر سے پردہ اٹھا ہے، وہ ان نعمتوں کے مقابلے میں درحقیقت کسی شمار میں بھی نہیں ہیں جن پر سے اب تک پردہ نہیں اُٹھا ہے۔

۳۷- یعنی اس طرح کے مسائل میں جھگڑے اور بحثیں کرتے ہیں کہ مثلاً اللہ ہے بھی یا نہیں؟ اکیلا وہی ایک خدا ہے یا دوسرے خدا بھی ہیں؟ اس کی صفات کیا ہیں اور کیسی ہیں؟ اپنی مخلوقات سے اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ وغیرہ۔

وَ مَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا یَحْزُنْكَ
كُفْرُهٗ ؕ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُهُمْ قَلِیْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۲۴﴾

جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے[40] اور عملاً وہ نیک[41] ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام[42] لیا، اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمھیں غم میں مبتلا[43] نہ کرے، انھیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم انھیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ ہم تھوڑی مدت انھیں دنیا میں مزے کرنے کا موقع دے رہے ہیں، پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔

---

۳۸ – یعنی نہ تو ان کے پاس کوئی ایسا ذریعۂ علم ہے جس سے انھوں نے براہِ راست خود حقیقت کا مُشاہَدہ یا تَجرِبہ کر لیا ہو، نہ کسی ایسے رہنما کی رہنمائی انھیں حاصل ہے جس نے حقیقت کا مُشاہدہ کر کے انھیں بتایا ہو، اور نہ کوئی کتابِ الٰہی ان کے پاس ہے جس پر یہ اپنے عقیدے کی بنیاد رکھتے ہوں۔

۳۹ – یعنی ہر شخص اور ہر خاندان اور ہر قوم کے باپ دادا کا حق پر ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔ محض یہ بات کہ یہ طریقہ باپ دادا کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ حق بھی ہے۔ کوئی عقل مند آدمی یہ نادانی کی حرکت نہیں کر سکتا کہ اگر اس کے باپ دادا گمراہ رہے ہوں تو وہ بھی آنکھیں بند کر کے انھی کی راہ پر چلے جائے، اور کبھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہ محسوس کرے کہ یہ راہ جا کدھر رہی ہے۔

۴۰ – یعنی پوری طرح اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دے دے۔ اپنی کوئی چیز اس کی بندگی سے مستثنیٰ کر کے نہ رکھے۔ اپنے سارے معاملات اس کے سُپرد کر دے اور اسی کی دی ہوئی ہِدایات کو اپنی پوری زندگی کا قانون بنائے۔

۴۱ – یعنی ایسا نہ ہو کہ زبان سے تو وہ حوالگی وسُپردگی کا اعلان کر دے مگر عَملاً وہ رَوِیّہ اختیار نہ کرے جو خدا کے ایک مطیع فرمان بندے کا ہونا چاہیے۔

۴۲ – یعنی نہ اس کو اس بات کا کوئی خطرہ کہ اسے غلط رہنمائی ملے گی، نہ اس بات کا کوئی اندیشہ کہ خدا کی بندگی کر کے اس کا انجام خراب ہوگا۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِىُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ اَنَّ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ

اگر تم اِن سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو: الحمدُ للہ۔[۴۴] مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۴۵] آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے،[۴۶] بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔[۴۷] زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب

۴۳ – خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ! جو شخص تمھاری بات ماننے سے انکار کرتا ہے وہ اپنے نزدیک تو یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اسلام کو رد کر کے اور کفر پر اصرار کر کے تمھیں زک پہنچائی ہے، لیکن دراصل اس نے زک اپنے آپ کو پہنچائی ہے۔ اس نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا، اپنا کچھ بگاڑا ہے۔ اگر وہ نہیں مانتا تو تمھیں پروا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۴۴ – یعنی شکر ہے کہ تم اتنی بات تو جانتے اور مانتے ہو۔ لیکن جب حقیقت یہ ہے تو پھر حمد ساری کی ساری صرف اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیے۔ دوسری کوئی ہستی حمد کی مستحق کیسے ہوسکتی ہے جب کہ تخلیقِ کائنات میں اس کا کوئی حصّہ ہی نہیں ہے۔

۴۵ – یعنی اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ کو خالقِ کائنات ماننے کے لازمی نتائج اور تقاضے کیا ہیں، اور کون سی باتیں اس کی نقیض پڑتی ہیں۔ جب ایک شخص یہ مانتا ہے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق صرف اللہ ہے تو لازماً اس کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ اِلٰہ اور رب بھی صرف اللہ ہی ہے، عبادت اور طاعت و بندگی کا مستحق بھی تنہا وہی ہے، تسبیح و تحمید بھی اس کے سوا کسی دوسرے کی نہیں کی جاسکتی، دعائیں بھی اس کے سوا کسی اور سے نہیں مانگی جاسکتیں، اور اپنی مخلوق کے لیے شارع اور حاکم بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ خالق ایک ہو اور معبود دوسرا، یہ بالکل عقل کے خلاف ہے، سراسر متضاد بات ہے جس کا قائل صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جو جہالت میں پڑا ہوا ہو۔ اسی طرح ایک ہستی کو خالق ماننا اور پھر دوسری ہستیوں میں سے کسی کو حاجت روا و مشکل کُشا ٹھیرانا، کسی کے آگے سرِ نیاز جھکانا، اور کسی کو حاکم ذی اختیار اور مُطاعِ مُطلَق تسلیم کرنا، یہ سب بھی باہم مُتَناقِض باتیں ہیں جنھیں کوئی صاحبِ علم انسان قبول نہیں کرسکتا۔

۴۶ – یعنی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے بلکہ درحقیقت وہی ان سب چیزوں کا مالک بھی ہے جو زمین اور آسمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اللہ نے اپنی یہ کائنات بنا کر یونہی نہیں چھوڑ دی ہے کہ جو چاہے اس کا، یا اس کے کسی حصے کا مالک بن بیٹھے۔ اپنی خَلق کا وہ آپ ہی مالک ہے اور ہر چیز جو اس کائنات میں موجود ہے وہ اُس کی مِلک ہے۔ یہاں اس کے سوا کسی کی بھی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اُسے خداوندانہ اختیارات حاصل ہوں۔

۴۷ – اس کی تشریح حاشیہ ۱۹ میں گزر چکی ہے۔

اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ
النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے)، جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۔[۴۸] بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جِلا اُٹھانا تو (اُس کے لیے) بس ایسا ہے جیسے ایک مُتنفّس کو (پیدا کرنا اور جِلا اُٹھانا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔[۴۹]

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اُس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے،[۵۰] سب ایک وقتِ مقرر تک چلے جا رہے ہیں۔[۵۱] اور (کیا تم نہیں جانتے)

۴۸ — اللہ کی باتوں سے مراد ہیں اس کے تخلیقی کام اور اس کی قدرت و حکمت کے کرشمے۔ یہ مضمون اس سے ذرا مختلف الفاظ میں سورۂ کہف آیت ۱۰۹ میں بھی بیان ہوا ہے۔ بظاہر ایک شخص یہ گمان کرے گا کہ شاید اس قول میں مبالغہ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر آدمی تھوڑا سا غور کرے تو اسے محسوس ہو گا کہ درحقیقت اس میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں ہے۔ جتنے قلم اس زمین کے درختوں سے بن سکتے ہیں، اور جتنی روشنائی زمین کے موجودہ سمندر اور ویسے ہی سات مزید سمندر فراہم کر سکتے ہیں، ان سے اللہ کی قدرت و حکمت اور اس کی تخلیق کے سارے کرشمے تو درکنار، شاید موجوداتِ عالَم کی مکمل فہرست بھی نہیں لکھی جا سکتی۔ تنہا اس زمین پر جتنی موجودات پائی جاتی ہیں انھی کا شمار مشکل ہے، کجا کہ اس اتھاہ کائنات کی ساری موجودات ضبطِ تحریر میں لائی جا سکیں۔

اس بیان سے دراصل یہ تصوّر دلانا مقصود ہے کہ جو خدا اتنی بڑی کائنات کو وجود میں لایا ہے اور اَزَل سے اَبد تک اس کا سارا نظم و نسق چلا رہا ہے اس کی خدائی میں ان چھوٹی چھوٹی ہستیوں کی حیثیت ہی کیا ہے جنھیں تم معبود بنائے بیٹھے ہو۔ اس عظیم الشان سلطنت کے چلانے میں دخیل ہونا تو درکنار، اس کے کسی اَقَلّ قلیل جُز سے پوری واقفیت اور محض واقفیت تک کسی مخلوق کے بس کی چیز نہیں ہے۔ پھر بھلا یہ کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کو یہاں خداوندانہ اختیارات کا کوئی ادنیٰ سا حصّہ بھی مل سکے جس کی بنا پر وہ دعائیں سننے اور قسمتیں بنانے اور بگاڑنے پر قادر ہو۔

۴۹ — یعنی وہ بیک وقت ساری کائنات کی آوازیں الگ الگ سُن رہا ہے اور کوئی آواز اس کی سماعت کو اس طرح مشغول

وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٣٠﴾ ع

ع ۳ ۱۱/۱۲

کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے؟ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے [52]، اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں [53]، اور (اِس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے [54]۔ ع

نہیں کرتی کہ اسے سنتے ہوئے وہ دوسری چیزیں نہ سن سکے۔ اسی طرح وہ بیک وقت ساری کائنات کو اس کی ایک ایک چیز اور ایک ایک واقعے کی تفصیل کے ساتھ دیکھ رہا ہے، اور کسی چیز کے دیکھنے میں اس کی بینائی اس طرح مشغول نہیں ہوتی کہ اسے دیکھتے ہوئے وہ دوسری چیزیں نہ دیکھ سکے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ انسانوں کے پیدا کرنے اور دوبارہ وجود میں لانے کا بھی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے آدمی بھی پیدا ہوئے ہیں اور آیندہ قیامت تک ہوں گے، ان سب کو وہ ایک آن کی آن میں پھر پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی قدرتِ تخلیق ایک انسان کو بنانے میں اس طرح مشغول نہیں ہوتی کہ اسی وقت وہ دوسرے انسان نہ پیدا کر سکے۔ اس کے لیے ایک انسان کا بنانا اور کھربوں انسانوں کا بنا دینا یکساں ہے۔

۵۰ – یعنی رات اور دن کا پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ آنا خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ سورج اور چاند پوری طرح ایک ضابطے میں کَسے ہوئے ہیں۔ سورج اور چاند کا ذکر یہاں محض اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ دونوں عالَمِ بالا کی وہ نمایاں ترین چیزیں ہیں جن کو انسان قدیم زمانے سے معبُود بناتا چلا آ رہا ہے اور آج بھی بہت سے انسان انھیں دیوتا مان رہے ہیں۔ ورنہ درحقیقت زمین سمیت کائنات کے تمام تاروں اور سیّاروں کو اللہ تعالیٰ نے ایک اٹل ضابطے میں کَس رکھا ہے جس سے وہ یک سرِ مُو ہٹ نہیں سکتے۔

۵۱ – یعنی ہر چیز کی جو مدّتِ عمر مقرر کر دی گئی ہے اسی وقت تک وہ چل رہی ہے۔ سورج ہو یا چاند، یا کائنات کا کوئی اور تارا یا سیّارہ، ان میں سے کوئی چیز بھی نہ اَزَلی ہے نہ اَبَدی۔ ہر ایک کا ایک وقتِ آغاز ہے جس سے پہلے وہ موجود نہ تھی، اور ایک وقتِ اختتام ہے جس کے بعد وہ موجود نہ رہے گی۔ اس ذکر سے مقصود یہ جتانا ہے کہ ایسی حادِث اور بے بس چیزیں آخر معبُود کیسے ہو سکتی ہیں۔

۵۲ – یعنی حقیقی فاعلِ مختار ہے، خلق و تدبیر کے اختیارات کا اصل مالک ہے۔

۵۳ – یعنی وہ سب محض تمھارے تخیُّلات کے آفریدہ خدا ہیں۔ تم نے فرض کر لیا ہے کہ فُلاں صاحب خدائی میں کوئی دخل رکھتے ہیں اور فُلاں حضرت کو مشکل کُشائی و حاجت روائی کے اختیارات حاصل ہیں۔ حالاں کہ فی الواقع ان میں سے کوئی صاحب بھی کچھ نہیں بنا سکتے۔

۵۴ – یعنی ہر چیز سے بالا و برتر جس کے سامنے سب پست ہیں، اور ہر چیز سے بزرگ جس کے سامنے سب چھوٹے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۳۱ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ
كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ۬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ
فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝۳۲

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تا کہ وہ تمھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے؟[۵۵] درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔[۵۶] اور جب (سمندر میں) اِن لوگوں پر ایک موج سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے، پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اِقتصاد برتتا ہے،[۵۷] اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے۔[۵۸]

۵۵ — یعنی ایسی نشانیاں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اختیارات بالکل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کیسے ہی مضبوط اور بحری سفر کے لیے موزوں جہاز بنالے اور جہاز رانی کے فن اور اس سے تعلق رکھنے والی معلومات اور تجرِبات میں کتنا ہی کمال حاصل کر لے، لیکن سمندر میں جن ہولناک طاقتوں سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے میں وہ تنہا اپنی تدابیر کے بَل بُوتے پر بخیریت سفر نہیں کر سکتا جب تک اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ اس کی نگاہِ کرم پھرتے ہی آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ذرائع و وسائل اور کمالاتِ فن کتنے پانی میں ہیں۔ اسی طرح آدمی امن و اطمینان کی حالت میں چاہے کیسا ہی سخت دَہریّہ یا کٹّا مشرک ہو، لیکن سمندر کے طوفان میں جب اس کی کشتی ڈولنے لگتی ہے اس وقت دہریّے کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا ہے، اور مشرک بھی جان لیتا ہے کہ خدا بس ایک ہی ہے۔

۵۶ — یعنی جن لوگوں میں یہ دو صفات پائی جاتی ہیں وہ جب ان نشانیوں سے حقیقت کو پہچان جاتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے توحید کا سبق حاصل کر کے اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتے ہیں۔ پہلی صفت، یہ کہ وہ صبّار (بڑے صبر کرنے والے) ہوں۔ ان کے مزاج میں تلوُّن نہ ہو بلکہ ثابت قدمی ہو۔ گوارا اور ناگوار، سخت اور نرم، اچھے اور بُرے، تمام حالات میں ایک عقیدۂ صالحہ پر قائم رہیں۔ یہ کمزوری ان میں نہ ہو کہ بُرا وقت آیا تو خدا کے سامنے گڑگڑانے لگے اور اچھا وقت آتے ہی سب کچھ بھول گئے، یا اس کے برعکس اچھے حالات میں خدا پرستی کرتے رہے اور مصائب کی ایک چوٹ پڑتے ہی خدا کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ دوسری صفت یہ کہ وہ شکور (بڑے شکر کرنے والے) ہوں۔ نمک حرام اور احسان فراموش نہ ہوں بلکہ نعمت کی قدر پہچانتے ہوں اور نعمت دینے والے کے لیے ایک مستقل جذبۂ شکر و سپاس اپنے دل میں جاگزیں رکھیں۔

يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ
وَّلَدِهٖ ۫ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْــًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٚ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾

لوگو! بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہوگا۔[59] فی الواقع اللہ کا وعدہ[60] سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالے[61] اور نہ دھوکے باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے۔[62]

۵۷ – اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ اقتصاد کو اگر راست رَوی کے معنٰی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن میں سے کم ہی ایسے نکلتے ہیں جو وہ وقت گزر جانے کے بعد بھی اُس توحید پر ثابت قدم رہتے ہیں جس کا اقرار انھوں نے طوفان میں گِھر کر کیا تھا اور یہ سبق ہمیشہ کے لیے ان کو راست رَو بنا دیتا ہے۔ اور اگر اقتصاد بمعنٰی تَوَسُّط و اعتدال لیا جائے تو اس کا ایک مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض لوگ اپنے شرک و دَہریّت کے عقیدے میں اس شدت پر قائم نہیں رہتے جس پر اس تجرِبے سے پہلے تھے، اور دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ وہ وقت گزر جانے کے بعد ان میں سے بعض لوگوں کے اندر اِخلاص کی وہ کیفیت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے جو اس وقت پیدا ہوئی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ ذو معنٰی فقرہ بیک وقت ان تینوں کیفیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال فرمایا ہو۔ مدّعا غالباً یہ بتانا ہے کہ بحری طوفان کے وقت تو سب کا دماغ دُرستی پر آ جاتا ہے اور شرک و دہریّت کو چھوڑ کر سب کے سب خدائے واحد کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن خیریت سے ساحل پر پہنچ جانے کے بعد ایک قلیل تعداد ہی ایسی نکلتی ہے جس نے اس تجرِبے سے کوئی پائدار سبق حاصل کیا ہو۔ پھر یہ قلیل تعداد بھی تین قسم کے گروہوں میں بٹ جاتی ہے: ایک، وہ جو ہمیشہ کے لیے سیدھا ہو گیا۔ دوسرا، وہ جس کا کفر کچھ اعتدال پر آ گیا۔ تیسرا، وہ جس کے اندر اُس ہنگامی اِخلاص میں سے کچھ نہ کچھ باقی رہ گیا۔

۵۸ – یہ دو صفات اُن دو صفتوں کے مقابلے میں ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں کیا گیا تھا۔ غدار وہ شخص ہے جو سخت بے وفا ہو اور اپنے عہد و پیمان کا کوئی پاس نہ رکھے۔ اور ناشکرا وہ ہے جس پر خواہ کتنی ہی نعمتوں کی بارش کر دی جائے وہ احسان مان کر نہ دے اور اپنے مُحسن کے مقابلے میں سرکشی سے پیش آئے۔ یہ صفات جن لوگوں میں پائی جاتی ہیں وہ خطرے کا وقت ٹل جانے کے بعد بے تکلّف اپنے کفر، اپنی دہریّت اور اپنے شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ انھوں نے طوفان کی حالت میں خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کچھ نشانیاں خارج میں بھی اور خود اپنے نفس میں بھی پائی تھیں اور ان کا خدا کو پکارنا اسی وِجدانِ حقیقت کا نتیجہ تھا۔ ان میں سے جو دہریے ہیں وہ اپنے اس فعل کی یہ توَجیہ کرتے ہیں کہ وہ تو ایک کمزوری تھی جو بحالتِ اضطراب ہم سے سرزد ہو گئی، ورنہ درحقیقت خدا وُدا کوئی نہ تھا جس نے ہمیں طوفان سے بچایا ہو، ہم تو فُلاں فُلاں اسباب و ذرائع سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ رہے مشرکین، تو وہ بالعموم یہ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگوں، یا دیوی دیوتاؤں

کا سایہ ہمارے سر پر تھا جس کے طفیل ہم بچ گئے۔ چنانچہ ساحل پر پہنچتے ہی وہ اپنے معبُودانِ باطل کے شکریے ادا کرنے شروع کر دیتے ہیں اور انھی کے آستانوں پر چڑھاوے چڑھانے لگتے ہیں۔ یہ خیال تک انھیں نہیں آتا کہ جب ساری اُمیدوں کے سہارے ٹوٹ گئے تھے، اس وقت اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی نہ تھا جس کا دامن انھوں نے تھاما ہو۔

۵۹ – یعنی دوست، لیڈر، پیر اور اسی طرح کے دوسرے لوگ تو پھر بھی دور کا تعلق رکھنے والے ہیں، دنیا میں قریب ترین تعلق اگر کوئی ہے تو وہ اولاد اور والدین کا ہے۔ مگر وہاں حالت یہ ہوگی کہ بیٹا پکڑا گیا ہو تو باپ آگے بڑھ کر یہ نہیں کہے گا کہ اس کے گناہ میں مجھے پکڑ لیا جائے، اور باپ کی شامت آ رہی ہو تو بیٹے میں یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوگی کہ اس کے بدلے مجھے جہنّم میں بھیج دیا جائے۔ اس حالت میں یہ توقع کرنے کی کیا گنجایش باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی دوسرا شخص وہاں کسی کے کچھ کام آئے گا۔ لہٰذا نادان ہے وہ شخص جو دنیا میں دوسروں کی خاطر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے، یا کسی کے بھروسے پر گمراہی اور گناہ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس مقام پر آیت ۱۵ کا مضمون بھی نگاہ میں رہنا چاہیے جس میں اولاد کو تلقین کی گئی تھی کہ دُنیوی زندگی کے معاملات میں والدین کی خدمت کرنا تو بے شک برحق ہے مگر دین و اعتقاد کے معاملے میں والدین کے کہنے پر گمراہی قبول کر لینا ہرگز صحیح نہیں ہے۔

۶۰ – اللہ کے وعدے سے مراد یہ وعدہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور ایک روز اللہ کی عدالت قائم ہو کر رہے گی، جس میں ہر ایک کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

۶۱ – دنیا کی زندگی سطح بیں انسانوں کو مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دنیا میں ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، لہٰذا جتنا کچھ بھی تمھیں کرنا ہے بس یہیں کر لو۔ کوئی اپنی دولت اور طاقت اور خوش حالی کے نشے میں بدمست ہو کر اپنی موت کو بھول جاتا ہے اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اُس کا عیش اور اس کا اقتدار لازوال ہے۔ کوئی اَخلاقی و روحانی مقاصد کو فراموش کر کے صرف مادّی فوائد اور لذتوں کو مقصود بِالذّات سمجھ لیتا ہے اور ”معیارِ زندگی“ کی بلندی کے سوا کسی دوسرے مقصد کو کوئی اہمیّت نہیں دیتا خواہ نتیجے میں اس کا معیارِ آدمیت کتنا ہی پست ہوتا چلا جائے۔ کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ دنیوی خوش حالی ہی حق و باطل کا اصل معیار ہے، ہر وہ طریقہ حق ہے جس پر چل کر یہ نتیجہ حاصل ہو، اور اس کے برعکس جو کچھ بھی ہے باطل ہے۔ کوئی اسی خوش حالی کو مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی علامت سمجھتا ہے اور یہ قاعدۂ کُلِّیہّ بنا کر بیٹھ جاتا ہے کہ جس کی دنیا خوب بَن رہی ہے، خواہ کیسے ہی طریقوں سے بنے، وہ خدا کا محبُوب ہے، اور جس کی دنیا خراب ہے، چاہے وہ حق پسندی و راست بازی ہی کی بدولت خراب ہو، اس کی عاقبت بھی خراب ہے۔ یہ اور ایسی ہی جتنی غلط فہمیاں بھی ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ”دنیوی زندگی کے دھوکے“ سے تعبیر فرمایا ہے۔

۶۲ – اَلْغَرُوْرُ (دھوکے باز) سے مراد شیطان بھی ہو سکتا ہے، کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ بھی ہو سکتا ہے، انسان کا اپنا نفس بھی ہو سکتا ہے، اور کوئی دوسری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ کسی شخصِ خاص یا شئے خاص کا تعین کیے بغیر اس وسیع المعنیٰ لفظ کو اس کی مُطلَق صورت میں رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے لیے فریب خوردگی کے بنیادی اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ جس شخص نے خاص طور پر جس ذریعے سے بھی وہ اصل فریب کھایا ہو جس کے اثر سے اس کی زندگی کا رخ صحیح سَمت سے غلط سَمت میں مڑ گیا، وہی اس کے لیے اَلْغَرُوْرُ ہے۔

”اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے“ کے الفاظ بھی بہت وسیع ہیں جن میں بے شمار مختلف قسم کے دھوکے آ جاتے ہیں۔ کسی کو اس کا ”دھوکے باز“ یہ یقین دلاتا ہے کہ خدا سرے سے ہے ہی نہیں۔ کسی کو یہ سمجھاتا ہے کہ خدا اس دنیا کو بنا کر الگ جا بیٹھا ہے اور اب

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾ ع ۴

اُس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے، کوئی مُتنفّس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے، اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔[۶۳] ع

یہ دنیا بندوں کے حوالے ہے۔ کسی کو اس غلط فہمی میں ڈالتا ہے کہ خدا کے کچھ پیارے ایسے ہیں جن کا تقرُّب حاصل کر لو تو جو کچھ بھی تم چاہو کرتے رہو، بخشش تمھاری یقینی ہے۔ کسی کو اس دھوکے میں مبتلا کرتا ہے کہ خدا تو غفورٌ رَّحیم ہے، تم گناہ کرتے چلے جاؤ، وہ بخشتا چلا جائے گا۔ کسی کو جبر کا عقیدہ سمجھاتا ہے اور اس غَلَط فہمی میں ڈال دیتا ہے کہ تم تو مجبُور ہو، بدی کرتے ہو تو خدا تم سے کراتا ہے اور نیکی سے دور بھاگتے ہو تو خدا ہی تمھیں اس کی توفیق نہیں دیتا۔ اس طرح کے نہ معلوم کتنے دھوکے ہیں جو انسان خدا کے بارے میں کھا رہا ہے، اور اگر تجزِیہ کر کے دیکھا جائے تو آخرِ کار تمام گمراہیوں اور گناہوں اور جرائم کا بنیادی سبب یہی نکلتا ہے کہ انسان نے خدا کے بارے میں کوئی نہ کوئی دھوکا کھایا ہے تب ہی اس سے کسی اعتقادی ضلالت یا اخلاقی بے راہ رَوی کا صُدور ہوا ہے۔

۶۳ — یہ آیت دراصل اس سوال کا جواب ہے جو قیامت کا ذکر اور آخرت کا وعدہ سن کر کفارِ مکہ بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تھے کہ آخر وہ گھڑی کب آئے گی۔ قرآنِ مجید میں کہیں ان کے اِس سوال کو نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اور کہیں نقل کیے بغیر جواب دے دیا گیا ہے، کیونکہ مخاطبین کے ذہن میں وہ موجود تھا۔ یہ آیت بھی انھی آیات میں سے ہے جن میں سوال کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔

پہلا فقرہ: ”اُس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے“ یہ اصل سوال کا جواب ہے۔ اس کے بعد کے چاروں فقرے اس کے لیے دلیل کے طور پر ارشاد ہوئے ہیں۔ دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جن معاملات سے انسان کی قریب ترین دلچسپیاں وابستہ ہیں، انسان ان کے متعلق بھی کوئی علم نہیں رکھتا، پھر بھلا یہ جاننا اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ ساری دنیا کے انجام کا وقت کب آئے گا۔ تمھاری خوش حالی و بدحالی کا بڑا انحصار بارش پر ہے۔ مگر اس کا سرِرشتہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب، جہاں، جتنی چاہتا ہے برساتا ہے اور جب چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ تم قطعاً نہیں جانتے کہ کہاں، کس وقت، کتنی بارش ہو گی اور کون سی زمین اس سے محروم رہ جائے گی، یا کس زمین پر بارش اُلٹی نقصان دِہ ہو جائے گی۔ تمھاری اپنی بیویوں کے پیٹ میں تمھارے اپنے نطفے سے حمل قرار پاتا ہے جس سے تمھاری نسل کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ مگر تم نہیں جانتے کہ کیا چیز اس پیٹ میں پرورش پا رہی ہے اور کس شکل میں کن بھلائیوں یا بُرائیوں کو لیے ہوئے وہ برآمد ہو گی۔ تم کو یہ تک پتا نہیں ہے کہ کل تمھارے ساتھ کیا کچھ پیش آنا ہے۔

ایک اچانک حادثہ تمھاری تقدیر بدل سکتا ہے، مگر ایک مِنَٹ پہلے بھی تم کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ تم کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ تمھاری اس زندگی کا خاتمہ آخرِ کار کہاں کس طرح ہوگا۔ یہ ساری معلومات اللہ نے اپنے ہی پاس رکھی ہیں اور ان میں سے کسی کا علم بھی تم کو نہیں دیا۔ ان میں سے ایک ایک چیز ایسی ہے جسے تم چاہتے ہو کہ پہلے سے تمھیں اس کا علم ہو جائے تو کچھ اس کے لیے پیش بندی کر سکو، لیکن تمھارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ان معاملات میں اللہ ہی کی تدبیر اور اسی کی قضا پر بھروسا کرو۔ اسی طرح دنیا کے اختتام کی ساعت کے معاملے میں بھی اللہ کے فیصلے پر اعتماد کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس کا علم بھی نہ کسی کو دیا گیا ہے نہ دیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس آیت میں اُمورِ غیب کی کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ یہاں تو صرف سامنے کی چند چیزیں مثالاً پیش کی گئی ہیں جن سے انسان کی نہایت گہری اور قریبی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور انسان ان سے بے خبر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا دُرست نہ ہوگا کہ صرف یہی پانچ اُمورِ غیب ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ غیب نام ہی اُس چیز کا ہے جو مخلوقات سے پوشیدہ اور صرف اللہ پر روشن ہو، اور فی الحقیقت اس غیب کی کوئی حد نہیں ہے۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۃ النمل، حاشیہ ۸۳)

تفہیم القرآن

السجدہ

(۳۲)

السجدہ

نام آیت ۱۵ میں سجدہ کا جو مضمون آیا ہے اسی کو سورہ کا عنوان قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اندازِ بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکے کا دورِ مُتوسِّط ہے، اور اس کا بھی ابتدائی زمانہ، کیونکہ اس کلام کے پَسِ منظر میں ظلم وستم کی وہ شدت نظر نہیں آتی جو بعد کے ادوار کی سورتوں کے پیچھے نظر آتی ہے۔

موضوع اور مباحث سورہ کا موضوع توحید، آخرت اور رسالت کے متعلق لوگوں کے شبہات کو رفع کرنا اور ان تینوں حقیقتوں پر ایمان کی دعوت دینا ہے۔ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپس میں چرچے کر رہے تھے کہ یہ شخص عجیب عجیب باتیں گھڑ گھڑ کر سنا رہا ہے۔ کبھی مرنے کے بعد کی خبریں دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مٹی میں رَل مِل جانے کے بعد تم پھر اُٹھائے جاؤ گے اور حساب کتاب ہوگا اور دوزخ ہوگی اور جنت ہوگی۔ کبھی کہتا ہے کہ یہ دیوی دیوتا اور بزرگ کوئی چیز نہیں ہیں، بس اکیلا ایک خدا ہی معبود ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، آسمان سے مجھ پر وحی آتی ہے اور یہ کلام جو میں تم کو سنا رہا ہوں، میرا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے۔ یہ عجیب افسانے ہیں جو یہ شخص ہمیں سنا رہا ہے—— انھی باتوں کا جواب اِس سورہ کا موضوعِ بحث ہے۔

اس جواب میں کفار سے کہا گیا ہے کہ بلا شک وَریب یہ خدا ہی کا کلام ہے اور اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ نبوت کے فیض سے محروم، غفلت میں پڑی ہوئی ایک قوم کو چونکایا جائے۔ اِسے تم اِفتِرا کیسے کہہ سکتے ہو جب کہ اس کا مُنزَّل مِن اللہ ہونا ظاہر و باہر ہے۔

پھر ان سے فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن جن حقیقتوں کو تمھارے سامنے پیش کرتا ہے، عقل سے کام لے کر خود سوچو کہ ان میں کیا چیز اَچنبھے کی ہے۔ آسمان و زمین کے انتظام کو دیکھو، خود اپنی پیدائش اور بناوٹ پر غور کرو، کیا یہ سب کچھ اُس تعلیم کی صداقت پر شاہد نہیں ہے جو اس نبی کی زبان سے اِس قرآن میں تم کو دی جارہی ہے؟ یہ نظامِ کائنات توحید پر دلالت کر رہا ہے یا شرک پر؟ اور اس سارے نظام کو دیکھ کر اور خود اپنی پیدائش پر نگاہ ڈال کر کیا تمھاری عقل یہی گواہی دیتی ہے کہ جس نے اب تمھیں پیدا کر رکھا ہے وہ پھر تمھیں پیدا نہ کر سکے گا؟

پھر عالَمِ آخرت کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایمان کے ثمرات اور کفر کے نتائج وعواقب بیان کر کے یہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ لوگ بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے کفر چھوڑ دیں اور قرآن کی اس تعلیم کو قبول کر لیں جسے مان کر خود ان کی اپنی ہی عاقبت دُرست ہوگی۔

پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ وہ انسان کے قصوروں پر یکایک آخری اور فیصلہ کُن

عذاب میں اسے نہیں پکڑ لیتا بلکہ اُس سے پہلے چھوٹی چھوٹی تکلیفیں، مصیبتیں، آفات اور نقصانات بھیجتا رہتا ہے۔ ہلکی ہلکی چوٹیں لگاتا رہتا ہے، تاکہ اُسے تنبیہ ہو اور اس کی آنکھیں کھل جائیں۔ آدمی اگر اِن ابتدائی چوٹوں ہی سے ہوش میں آجائے تو اس کے اپنے حق میں بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ دنیا میں یہ کوئی پہلا اور انوکھا واقعہ تو نہیں ہے کہ ایک شخص پر خدا کی طرف سے کتاب آئی ہو۔ اس سے پہلے آخر موسیٰ (علیہ السلام) پر بھی تو کتاب آئی تھی جسے تم سب لوگ جانتے ہو۔ یہ آخر کون سی ایسی بات ہے کہ اس پر تم لوگ یوں کان کھڑے کر رہے ہو۔ یقین مانو کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے آئی ہے، اور خوب سمجھ لو کہ اب پھر وہی کچھ ہوگا جو موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد میں ہو چکا ہے۔ اِمامت و پیشوائی اب انھی کو نصیب ہوگی جو اس کتابِ الٰہی کو مان لیں گے۔ اسے ردّ کر دینے والوں کے لیے ناکامی مقدر ہو چکی ہے۔

پھر کفارِ مکہ سے کہا گیا ہے کہ اپنے تجارتی سفروں کے دَوران میں تم جن پچھلی تباہ شدہ قوموں کی بستیوں پر سے گزرتے ہو ان کا انجام دیکھ لو، کیا یہی انجام تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ ظاہر سے دھوکا نہ کھاؤ۔ آج تم دیکھ رہے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات چند لڑکوں اور چند غلاموں اور غریب لوگوں کے سوا کوئی نہیں سُن رہا ہے اور ہر طرف سے ان پر طعن اور ملامت اور پھبتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس سے تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ چلنے والی بات نہیں ہے، چار دن چلے گی اور پھر ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ محض تمھاری نظر کا دھوکا ہے۔ کیا یہ تمھارا رات دن کا مشاہَدہ نہیں ہے کہ آج ایک زمین بالکل بے آب و گیاہ پڑی ہے جسے دیکھ کر گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کے پیٹ میں روئیدگی کے خزانے چھُپے ہوئے ہیں، مگر کل ایک ہی بارش میں وہ اس طرح پھَبک اُٹھتی ہے کہ اس کے چپّے چپّے سے نمو کی طاقتیں پھوٹنی شروع ہو جاتی ہیں۔

خاتمۂ کلام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ تمھاری باتیں سن کر مذاق اُڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ حضرت! یہ فیصلہ کُن فتح آپ کو کب نصیب ہونے والی ہے، ذرا تاریخ تو ارشاد ہو۔ ان سے کہو کہ جب ہمارے اور تمھارے فیصلے کا وقت آ جائے گا اس وقت ماننا تمھارے لیے کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ ماننا ہے تو اب مان لو۔ اور آخری فیصلے ہی کا انتظار کرنا ہے تو بیٹھے انتظار کرتے رہو۔

---

۳ رکوعاتہا ۳۰ آیاتہا

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢﴾

الٓ مٓ ۔ اِس کتاب کی تنزیل بلاشبہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ا

ا — قرآنِ مجید کی متعدّد سُورتیں اس طرح کے کسی نہ کسی تعارفی فقرہ سے شروع ہوتی ہیں جس سے مقصود آغازِ کلام ہی میں یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ کلام کہاں سے آ رہا ہے۔ یہ بظاہر اُسی طرز کا ایک تمہیدی فقرہ ہے جیسے ریڈیو پر اعلان کرنے والا پروگرام کے آغاز میں کہتا ہے کہ ہم فلاں اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ لیکن ریڈیو کے اس معمولی سے اعلان کے برعکس قرآنِ مجید کی کسی سورت کا آغاز جب اس غیر معمولی اعلان سے ہوتا ہے کہ یہ پیغام فرماں روائے کائنات کی طرف سے آ رہا ہے تو یہ محض مَصدرِ کلام کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اس میں ایک بہت بڑا دعویٰ، ایک عظیم چیلنج اور ایک سخت اِنذار بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ چھُوٹتے ہی اتنی بڑی خبر دیتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، خداوندِ عالم کا کلام ہے۔ یہ اعلان فوراً ہی یہ بھاری سوال آدمی کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے کہ اس دعوے کو تسلیم کروں یا نہ کروں۔ تسلیم کرتا ہوں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہوگا، پھر میرے لیے اس کے مقابلے میں کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ تسلیم نہیں کرتا تو لامحالہ یہ خطرۂ عظیم مول لیتا ہوں کہ اگر واقعی یہ خداوندِ عالَم کا کلام ہے تو اسے ردّ کرنے کا نتیجہ مجھ کو اَبدی شقاوت و بدبختی کی صورت میں دیکھنا پڑے گا۔ اِس بنا پر یہ تمہیدی فقرہ مُجرَّد اپنی اس غیر معمولی نوعیت ہی کی بنا پر آدمی کو مجبور کر دیتا ہے کہ چوکنّا ہو کر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس کلام کو سنے اور یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کلامِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے یا نہیں۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب ربّ العالَمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے، بلکہ مزید برآں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ، بے شک یہ خدا کی کتاب ہے، اس کے منزّل مِن اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجایش نہیں ہے۔ اس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پَس منظر اور خود قرآن کے اپنے سِیاق میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکۂ معظّمہ کے اُن باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی اُن کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی بھی اور اس کے بعد کی بھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو شخص اس دعوے کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا ہے وہ ہماری قوم کا سب سے زیادہ راست باز، سنجیدہ اور پاک سیرت انسان ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اُس سے وہ باتیں کبھی نہ سنی تھیں جو دعوائے نبوت کے بعد یکایک اُس نے بیان کرنی شروع کر دیں۔ وہ اس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اس بات کو بَداہتاً جانتے

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ۚ بَلۡ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ لِتُنۡذِرَ
قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىہُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ لَعَلَّہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۳﴾

کیا[۲] یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟[۳] نہیں، بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے[۴] تاکہ تو متنبّہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبّہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔[۵]

تھے کہ ایک ہی شخص کے دو اسٹائل اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہوسکتے۔ وہ اس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ ان کے سارے ادیب اور شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ ان کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مضامین اس کلام میں بیان کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ انھیں اس کتاب میں، اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دُور دُور بھی اُس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مُدَّعی کا کام اور کلام کبھی خالی نہیں ہوسکتا۔ وہ خُردبین لگا کر بھی اس امر کی نشان دِہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم اور قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف ان کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل جُل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں، اسی لیے اس پَس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا کہ اس کتاب کا ربّ العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر کسی دلیل کے اضافے کی کوئی حاجت نہ تھی۔

۲ — اوپر کے تمہیدی فقرے کے بعد مشرکینِ مکّہ کے پہلے اعتراض کو لیا جا رہا ہے جو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کرتے تھے۔

۳ — یہ محض سوال واستفہام نہیں ہے بلکہ اس میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن ساری باتوں کے باوجود، جن کی بنا پر اس کتاب کا مُنَزّل مِن اللہ ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، کیا یہ لوگ ایسی صریح ہٹ دھرمی کی بات کہہ رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اللہ ربّ العالمین کی طرف منسوب کر دیا ہے؟ اتنا لغو اور بے سروپا الزام رکھتے ہوئے کوئی شرم ان کو نہیں آتی؟ انھیں کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور اُن کے کام اور کلام کو جانتے ہیں اور اس کتاب کو بھی سمجھتے ہیں، وہ اس بے ہودہ الزام کو سُن کر کیا رائے قائم کریں گے؟

۴ — جس طرح پہلی آیت میں لَا رَیۡبَ فِیۡہِ کہنا کافی سمجھا گیا تھا اور اس سے بڑھ کر کوئی اِستدلال قرآن کے کلامِ الٰہی

ہونے کے حق میں پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، اُسی طرح اب اس آیت میں بھی کفارِ مکہ کے الزامِ اِفترا پر صرف اتنی بات ہی کہنے پر اِکتفا کیا جا رہا ہے کہ ''یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔'' اس کی وجہ وہی ہے جو اُوپر حاشیہ نمبر ا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ کون، کس ماحول میں، کس شان کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا تھا، یہ سب کچھ سامعین کے سامنے موجود تھا۔ اور یہ کتاب بھی اپنی زبان اور اپنے ادب اور مضامین کے ساتھ سب کے سامنے تھی۔ اور اس کے اثرات و نتائج بھی مکے کی اُس سوسائٹی میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں اس کتاب کا ربّ العالمین کی طرف سے آیا ہوا حق ہونا ایسا صریح امرِ واقعہ تھا جسے صرف حتمی طور پر بیان کر دینا ہی کفار کے الزام کی تردید کے لیے کافی تھا۔ اس پر کسی استدلال کی کوشش بات کو مضبوط کرنے کے بجائے الٹی اسے کمزور کرنے کی موجب ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت سورج چمک رہا ہو اور کوئی ڈھیٹ آدمی کہے کہ یہ اندھیری رات ہے۔ اس کے جواب میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ تم اسے رات کہتے ہو؟ یہ روزِ روشن تو سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد دن کے موجود ہونے پر اگر آپ منطقی دلیلیں قائم کریں گے تو اپنے جواب کے زور میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے بلکہ درحقیقت اس کے زور کو کچھ کم ہی کر دیں گے۔

۵ – یعنی جس طرح اِس کا حق ہونا اور من جانبِ اللہ ہونا قطعی و یقینی امر ہے اُسی طرح اِس کا مبنی برحکمت ہونا اور خود تم لوگوں کے لیے خدا کی ایک رحمت ہونا بھی ظاہر ہے۔ تم خود جانتے ہو کہ صدہا برس سے تمھارے اندر کوئی پیغمبر نہیں آیا ہے۔ تم خود جانتے ہو کہ تمھاری ساری قوم جہالت اور اَخلاقی پستی اور سخت پسماندگی میں مبتلا ہے۔ اس حالت میں اگر تمھیں بیدار کرنے اور راہِ راست دکھانے کے لیے ایک پیغمبر تمھارے درمیان بھیجا گیا ہے تو اس پر حیران کیوں ہوتے ہو۔ یہ تو ایک بڑی ضرورت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پورا کیا ہے اور تمھاری اپنی بھلائی کے لیے کیا ہے۔

واضح رہے کہ عرب میں دینِ حق کی روشنی سب سے پہلے حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے ذریعے سے پہنچی تھی جو زمانۂ قبلِ تاریخ میں گزرے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام آئے جن کا زمانہ حضورؐ سے ڈھائی ہزار برس قبل گزرا ہے۔ اس کے بعد آخری پیغمبر جو عرب کی سرزمین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھیجے گئے وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ اور ان کی آمد پر بھی تقریباً دو ہزار برس گزر چکے تھے۔ یہ اتنی طویل مدت ہے کہ اس کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ اس قوم کے اندر کوئی مُتنَبِّہ کرنے والا نہیں آیا۔ اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قوم میں کبھی کوئی مُتنَبِّہ کرنے والا نہ آیا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مدّتِ دراز سے یہ قوم ایک مُتنَبِّہ کرنے والے کی محتاج چلی آ رہی ہے۔

یہاں ایک اور سوال سامنے آ جاتا ہے جس کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس آیت کو پڑھتے ہوئے آدمی کے ذہن میں یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے صدہا برس تک عربوں میں کوئی نبی نہیں آیا تو اُس جاہلیّت کے دور میں گزرے ہوئے لوگوں سے آخر بازپُرس کس بنیاد پر ہوگی؟ انھیں معلوم ہی کب تھا کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا؟ پھر اگر وہ گمراہ تھے تو اپنی اس گمراہی کے ذمہ دار وہ کیسے قرار دیے جا سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کا تفصیلی علم چاہے اُس جاہلیّت کے زمانے میں لوگوں کے پاس نہ رہا ہو، مگر یہ بات اُس زمانے میں بھی لوگوں سے پوشیدہ نہ تھی کہ اصل دین توحید ہے اور انبیا علیہم السلام نے کبھی بت پرستی نہیں سکھائی ہے۔ یہ حقیقت اُن روایات میں بھی محفوظ تھی جو عرب کے لوگوں کو اپنی سرزمین کے انبیا

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ

وہ اللہ ہی ہے[6] جس نے آسمانوں اور زمین کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں چھ دنوں میں پیدا

سے پہنچی تھیں، اور اسے قریب کی سرزمین میں آئے ہوئے انبیا حضرت موسٰی، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت عیسٰی علیہم السلام کی تعلیمات کے واسطے سے بھی وہ جانتے تھے۔ عرب کی روایات میں یہ بات بھی مشہور و معروف تھی کہ قدیم زمانے میں اہلِ عرب کا اصل دین، دینِ ابراہیمؑ تھا اور بت پرستی اُن کے ہاں عمرو بن لُحَیّ نامی ایک شخص نے شروع کی تھی۔ شرک و بت پرستی کے رواجِ عام کے باوجود عرب کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو شرک سے انکار کرتے تھے، توحید کا اعلان کرتے تھے اور بتوں پر قربانیاں کرنے کی علانیہ مذمّت کرتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے بالکل قریب زمانے میں قُسّ بن ساعِدہ اَلْاِیادِی، اُمَیَّہ بن ابی الصَّلْت، سُوَید بن عَمْرو المُصطَلِقی، وَکیع بن سَلَمَہ بن زُہیر اَلْاِیادِی، عَمْرو بن جُنْدُب اَلجُہَنی، ابوقیس صَرْمَہ بن ابی اَنَس، زید بن عَمْرو بن نُفَیل، وَرَقَہ بن نَوفَل، عثمان بن الحُوَیْرِث، عبیداللہ بن جَحْش، عامر بن الظَّرب العَدْوانی، عَلّاف بن شِہاب التَّمیمی، المُتَلَمِّس بن اُمَیَّۃَ الکِنانی، زُہیر بن ابی سُلْمٰی، خالد بن سِنان بن غَیْث العَبْسی، عبداللہ القُضَاعی اور ایسے ہی بہت سے لوگوں کے حالات ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں جنھیں حُنَفَا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ عَلَی الاعلان توحید کو اصل دین کہتے تھے اور مشرکین کے مذہب سے اپنی بے تعلقی کا صاف صاف اظہار کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں یہ تخیّل انبیا علیہم السلام کی سابقہ تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات ہی سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ یمن میں چوتھی پانچویں صدی عیسوی کے جو کتبات آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں برآمد ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دَور میں وہاں ایک توحیدی مذہب موجود تھا جس کے پیرو الرحمٰن اور ربّ السماء والارض ہی کو الٰہِ واحد تسلیم کرتے تھے۔ ۳۷۸ء کا ایک کتبہ ایک عبادت گاہ کے کھنڈر سے ملا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ یہ مَعْبَد ''اِلٰہِ ذُوسَمَوِیْ'' یعنی اِلٰہِ السّماء یا ربّ السّماء کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ ۴۶۵ء کے ایک کتبے میں بنصر و ردا الٰھن بعل سمین وارضین (بنصر وبعون الالٰہ ربّ السّماء والارض) کے الفاظ لکھے ہیں، جو عقیدۂ توحید پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ اسی دَور کا ایک اور کتبہ ایک قبر پر ملا ہے جس میں بخیل رحمنن (یعنی استعین بحول الرحمٰن) کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح شمالِ عرب میں دریائے فرات اور قِنّسْرین کے درمیان زَبَد کے مَقام پر ۵۱۲ء کا ایک کتبہ ملا ہے جس میں بِسْمِ الْاِلٰہ، لَاعِزَّ اِلَّا لَہٗ، لَا شُکْرَ اِلَّا لَہٗ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت سے پہلے انبیائے سابقین کی تعلیمات کے آثار عرب سے بالکل مٹ نہیں گئے تھے، اور کم از کم اتنی بات یاد دلانے کے لیے بہت سے ذرائع موجود تھے کہ ''تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے۔'' (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۃ الفرقان، حاشیہ ۸۴)

۶ - اب مشرکین کے دوسرے اعتراض کو لیا جاتا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید پر کرتے تھے۔ ان کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دیوتاؤں اور بزرگوں کی معبُودیت سے انکار کرتے ہیں اور ہانکے پکارے یہ دعوت دیتے ہیں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی کارساز، کوئی حاجت روا، کوئی دعائیں سننے والا، اور بگڑی بنانے والا، اور کوئی حاکم

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ
اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ
يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵

کیا اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا،[7] اُس کے سوا نہ تمھارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اُس کے آگے سفارش کرنے والا، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟[8] وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی رُوداد اُوپر اُس کے حُضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔[9]

ذی اختیار نہیں ہے۔

۷ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیت ۵۴، یونُس، آیت ۳، الرَّعد، آیت ۲۔

۸ – یعنی تمھارا اصل خدا تو خالقِ زمین و آسمان ہے۔ تم کس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ کائنات کی اس عظیم الشان سلطنت میں اُس کے سوا دوسروں کو کارساز سمجھ بیٹھے ہو۔ اس پوری کائنات کا اور اس کی ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی ذات کے سوا ہر دوسری چیز جو یہاں پائی جاتی ہے، مخلوق ہے۔ اور اللہ اس دنیا کو بنا دینے کے بعد کہیں جا کر سو بھی نہیں گیا ہے، بلکہ اپنی اِس سلطنت کا تخت نشین اور حاکم و فرماں روا بھی وہ آپ ہی ہے۔ پھر تمھاری عقل آخر کہاں چرنے چلی گئی ہے کہ تم مخلوقات میں سے چند ہستیوں کو اپنی قسمتوں کا مالک قرار دے رہے ہو؟ اگر اللہ تمھاری مدد نہ کرے تو ان میں سے کس کی یہ طاقت ہے کہ تمھاری مدد کر سکے؟ اگر اللہ تمھیں پکڑے تو ان میں سے کس کا یہ زور ہے کہ تمھیں چُھڑا سکے؟ اگر اللہ سفارش نہ سنے تو ان میں سے کون یہ بل بُوتا رکھتا ہے کہ اس سے اپنی سفارش منوا لے؟

۹ – یعنی تمھارے نزدیک جو ایک ہزار برس کی تاریخ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گویا ایک دن کا کام ہے جس کی اسکیم آج کارکنانِ قضا و قدر کے سُپرد کی جاتی ہے اور کل وہ اس کی رُوداد اُس کے حضور پیش کرتے ہیں، تاکہ دوسرے دن (یعنی تمھارے حساب سے ایک ہزار برس) کا کام ان کے سپرد کیا جائے۔ قرآنِ مجید میں یہ مضمون دو مقامات پر اور بھی آیا ہے جنھیں نگاہ میں رکھنے سے اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کفارِ عرب کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبوت کا دعویٰ لے کر سامنے آئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ وہ بار بار ہم سے کہتے ہیں کہ اگر میری اس دعوت کو تم لوگ قبول نہ کرو گے اور مجھے جھٹلا دو گے تو تم پر خدا کا عذاب آ جائے گا۔ مگر کئی برس سے وہ اپنی یہ بات دُہرائے جا رہے ہیں اور آج تک عذاب نہ آیا، حالانکہ ہم ایک دفعہ نہیں، ہزاروں مرتبہ انھیں صاف صاف جھٹلا چکے ہیں۔ اُن کی یہ دھمکیاں واقعی سچّی ہوتیں تو ہم پر نہ معلوم کبھی کا عذاب آ چکا ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ سُورۂ حج میں فرماتا ہے:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ — یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُۙ ۝۶
الَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ
مِنْ طِیْنٍۚ ۝۷ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍۚ ۝۸

وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا[10]، زبردست[11] اور رحیم[12]۔ جو چیز بھی اس نے بنائی خوب[13] ہی بنائی۔ اُس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اُس کی نسل ایک ایسے سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے[14]،

اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (آیت ۴۷)

کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تم لوگوں کے شمار سے ہزار برس جیسا ہوا کرتا ہے۔

دوسری جگہ اسی بات کا جواب دیا گیا ہے:

سَاَلَ سَآىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍۙ لِّلْكٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌۙ مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِؕ تَعْرُجُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍۚ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًاۙ وَّ نَرٰىهُ قَرِیْبًاؕ (المعارج: آیات ۱-۷)

پوچھنے والا پوچھتا ہے اُس عذاب کو جو واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے، جس کو دفع کرنے والا کوئی نہیں ہے، اُس خدا کی طرف سے جو چڑھتے درجوں والا ہے (یعنی درجہ بدرجہ کام کرنے والا ہے)۔ چڑھتے ہیں اُس کی طرف ملائکہ اور روح ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔ پس اے نبی! صبرِ جمیل سے کام لو۔ یہ لوگ اسے دُور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

اِن تمام ارشادات سے جو بات ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں خدا کے فیصلے دنیا کی گھڑیوں اور جنتریوں کے لحاظ سے نہیں ہوتے۔ کسی قوم سے اگر یہ کہا جائے کہ تم فلاں رَوِش اختیار کرو گے تو اس کا انجام تمھیں یہ کچھ دیکھنا ہوگا، تو وہ قوم سخت احمق ہوگی اگر اس کا یہ مطلب سمجھے کہ آج وہ روش اختیار کی جائے اور کل اس کے بُرے نتائج سامنے آ جائیں۔ ظہورِ نتائج کے لیے دن اور مہینے اور سال تو کیا چیز ہیں، صدیاں بھی کوئی بڑی مدّت نہیں ہیں۔

۱۰ — یعنی دوسرے جو بھی ہیں ان کے لیے ایک چیز ظاہر ہے تو بے شمار چیزیں ان سے پوشیدہ ہیں۔ فرشتے ہوں یا جنّ، یا نبی اور ولی اور برگزیدہ انسان، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو سب کچھ جاننے والا ہو۔ یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ اس پر ہر چیز عیاں ہے۔ جو کچھ گزر چکا ہے، جو کچھ موجود ہے اور جو کچھ آنے والا ہے، سب اس پر روشن ہے۔

۱۱ — یعنی ہر چیز پر غالب۔ کائنات میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کے ارادے میں مُزاحم ہو سکے اور اس کے حکم کو نافذ ہونے سے روک سکے۔ ہر شے اس سے مغلوب ہے اور کسی میں اس کے مقابلے کا بَل بُوتا نہیں ہے۔

۱۲ — یعنی اس غلبے اور قوتِ قاہرہ کے باوجود وہ ظالم نہیں ہے بلکہ اپنی مخلوق پر رحیم و شفیق ہے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ

پھر اس کو نِک سُک سے درست کیا[15] اور اس کے اندر اپنی رُوح پھونک دی،[16] اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور

۱۳- یعنی اس عظیم الشان کائنات میں اس نے بے حد و حساب چیزیں بنائی ہیں، مگر کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو بے ڈھنگی اور بے تُکی ہو۔ ہر شے اپنا ایک الگ حُسن رکھتی ہے۔ ہر شے اپنی جگہ مُتناسب اور موزوں ہے۔ جو چیز جس کام کے لیے بھی اُس نے بنائی ہے، اس کے لیے موزوں ترین شکل پر، مناسب ترین صفات کے ساتھ بنائی ہے۔ دیکھنے کے لیے آنکھ اور سننے کے لیے کان کی ساخت سے زیادہ موزوں کسی ساخت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ہوا اور پانی جن مقاصد کے لیے بنائے گئے ہیں، ان کے لیے ہوا ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی ہونی چاہیے، اور پانی وہی اوصاف رکھتا ہے جیسے ہونے چاہییں۔ تم خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے نقشے میں کسی کوتاہی کی نشان دِہی نہیں کر سکتے، نہ اس میں کوئی ترمیم پیش کر سکتے ہو۔

۱۴- یعنی پہلے اس نے براہِ راست اپنے تخلیقی عمل (direct creation) سے انسان کو پیدا کیا، اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر تناسُل کی یہ طاقت رکھ دی کہ اس کے نطفے سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔ ایک کمال یہ تھا کہ زمین کے مواد کو جمع کر کے ایک تخلیقی حکم سے اس میں وہ زندگی اور وہ شُعور و تعقُّل پیدا کر دیا جس سے انسان جیسی ایک حیرت انگیز مخلوق وجود میں آ گئی۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ آیندہ مزید انسانوں کی پیدائش کے لیے ایک ایسی عجیب مشینری خود انسانی ساخت کے اندر رکھ دی جس کی ترکیب اور کارگزاری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ آیت قرآنِ مجید کی ان آیات میں سے ہے جو انسانِ اوّل کی براہِ راست تخلیق کی تصریح کرتی ہیں۔ ڈارون کے زمانے سے سائنس داں حضرات اس تصور پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بڑی حقارت کے ساتھ وہ اس کو ایک غیر سائنٹفک نظریہ قرار دے کر گویا پھینک دیتے ہیں۔ لیکن انسان کی نہ سہی، تمام انواعِ حیوانی کی نہ سہی، اوّلین جرثومۂ حیات کی براہِ راست تخلیق سے تو وہ کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اس تخلیق کو نہ مانا جائے تو پھر یہ انتہائی لغو بات ماننی پڑے گی کہ زندگی کی ابتدا محض ایک حادثے کے طور پر ہوئی ہے۔ حالاں کہ صرف ایک خَلِیّہ (cell) والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے حادثے کا نتیجہ قرار دینا اُس سے لاکھوں درجے غیر سائنٹفک بات ہے جتنا نظریۂ اِرتقا کے قائلین نظریۂ تخلیق کو ٹھیراتے ہیں۔ اور اگر ایک دفعہ آدمی یہ مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہِ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا، تو پھر آخر یہی ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوعِ حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے، اور پھر اس کی نسل تناسُل (procreation) کی مختلف صورتوں سے چلی ہے۔ اس بات کو مان لینے سے وہ بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں جو ڈارونیت کے عَلَم برداروں کی ساری سائنٹفک شاعری کے باوجود ان کے نظریۂ ارتقا میں غیر حل شدہ رہ گئی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۵۳، النساء، حاشیہ ۱، الانعام، حاشیہ ۶۳ - جلد دوم، الاعراف، حواشی ۱۰ - ۱۴۵، الحِجر، حاشیہ ۱۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۵، المومنون، حواشی ۱۲ - ۱۳)

۱۵- یعنی ایک انتہائی باریک خُرد بینی وجود سے بڑھا کر اسے پوری انسانی شکل تک پہنچایا اور اس کا جسم سارے

الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۹ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ
ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ۬ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰ قُلْ
يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱ ع

ع ۱ ۱۴

دِل دیے[17]۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو[18]۔

اور[19] یہ لوگ کہتے ہیں: ''جب ہم مٹی میں رَل مِل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟'' اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں[20]۔ اِن سے کہو: ''موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پُورا کا پُورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے[21]۔'' ع

اعضا و جوارح کے ساتھ مکمل کر دیا۔

۱۶ – رُوح سے مراد محض وہ زندگی نہیں ہے جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے، بلکہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شُعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے، جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقاتِ ارضی سے ممتاز ایک صاحبِ شخصیت ہستی، صاحبِ انا ہستی، اور حاملِ خلافت ہستی بنتا ہے۔ اِس رُوح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح یا تو اس معنیٰ میں فرمایا ہے کہ وہ اُسی کی مِلک ہے اور اس کی ذاتِ پاک کی طرف اس کا انتساب اُسی طرح کا ہے جس طرح ایک چیز اپنے مالک کی طرف منسوب ہو کر اُس کی چیز کہلاتی ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر علم، فکر، شعور، ارادہ، فیصلہ، اختیار اور ایسے ہی دوسرے جو اوصاف پیدا ہوئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ ان کا سرچشمہ مادّے کی کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے، اللہ کی حکمت سے اس کو دانائی ملی ہے، اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے۔ یہ اوصاف کسی بے علم، بے دانش اور بے اختیار ماخذ سے انسان کے اندر نہیں آئے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۱۷-۱۹)

۱۷ – یہ ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ رُوح پھونکنے سے پہلے انسان کا سارا ذکر صیغۂ غائب میں کیا جاتا رہا۔ ''اُس کی تخلیق کی''، ''اس کی نسل چلائی''، ''اس کو نِک سُک سے دُرست کیا''، ''اُس کے اندر روح پھونکی''۔ اس لیے کہ اُس وقت تک وہ خطاب کے لائق نہ تھا۔ پھر جب رُوح پھونک دی گئی تو اب اُس سے فرمایا جا رہا ہے کہ ''تم کو کان دیے''، ''تم کو آنکھیں دیں''، ''تم کو دل دیے'' اس لیے کہ حاملِ رُوح ہو جانے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوا کہ اُسے مخاطَب کیا جائے۔

کان اور آنکھوں سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ حُصولِ علم کے ذرائع ذائقہ اور لامسہ

اور شامّہ بھی ہیں، لیکن سَماعت و بینائی تمام دوسرے حواس سے زیادہ بڑے اور اہم ذرائع ہیں، اس لیے قرآن جگہ جگہ انھی دو کو خدا کے نمایاں عطیّوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد ”دِل“ سے مراد وہ ذہن (mind) ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل شدہ معلومات کو مرتّب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے اور عمل کی مختلف امکانی راہوں میں سے کوئی ایک راہ منتخب کرتا اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

۱۸ – یعنی یہ عظیم القدر انسانی روح اتنے بلند پایہ اوصاف کے ساتھ تم کو اس لیے تو عطا نہیں کی گئی تھی کہ تم دنیا میں جانوروں کی طرح رہو اور اپنے لیے بس وہی زندگی کا نقشہ بنالو جو کوئی حیوان بنا سکتا ہے۔ یہ آنکھیں تمھیں چشمِ بصیرت سے دیکھنے کے لیے دی گئی تھیں نہ کہ اندھے بن کر رہنے کے لیے۔ یہ کان تمھیں گوشِ ہوش سے سننے کے لیے دیے گئے تھے نہ کہ بہرے بن کر رہنے کے لیے۔ یہ دل تمھیں اس لیے دیے گئے تھے کہ حقیقت کو سمجھو اور صحیح راہِ فکر و عمل اختیار کرو، نہ اس لیے کہ اپنی ساری صلاحیتیں صرف اپنی حیوانیت کی پرورش کے وسائل فراہم کرنے میں صَرف کر دو، اور اس سے کچھ اونچے اُٹھو تو اپنے خالق سے بغاوت کے فلسفے اور پروگرام بنانے لگو۔ یہ بیش قیمت نعمتیں خدا سے پانے کے بعد جب تم دہریّت یا شرک اختیار کرتے ہو، جب تم خود خدا یا دوسرے خداؤں کے بندے بنتے ہو، جب تم خواہشات کے غلام بن کر جسم و نفس کی لذّتوں میں غرق ہو جاتے ہو، تو گویا اپنے خدا سے یہ کہتے ہو کہ ہم ان نعمتوں کے لائق نہ تھے، ہمیں انسان بنانے کے بجائے تجھے ایک بندر، یا ایک بھیڑیا، یا ایک مگرمچھ، یا ایک کوّا بنانا چاہیے تھا۔

۱۹ – رسالت اور توحید پر کفار کے اعتراضات کا جواب دینے کے بعد اب اسلام کے تیسرے بنیادی عقیدے یعنی آخرت پر اُن کے اعتراض کو لے کر اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ آیت میں وَقَالُوْٓا کا واوِ عطف مضمونِ ماسبق سے اس پیراگراف کا تعلق جوڑتا ہے۔ گویا ترتیبِ کلام یوں ہے کہ ”وہ کہتے ہیں: محمدؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں“، ”وہ کہتے ہیں: اللہ معبُودِ واحد نہیں ہے“، اور ”وہ کہتے ہیں کہ ہم مر کر دوبارہ نہ اُٹھیں گے“۔

۲۰ – اوپر کے فقرے اور اِس فقرے کے درمیان ایک داستان ہے جسے سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کفار کا جو اعتراض پہلے فقرے میں نقل کیا گیا ہے وہ اتنا مُہمَل ہے کہ اس کی تردید کی حاجت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کا محض نقل کر دینا ہی اس کی لغویت ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اس لیے کہ ان کا اعتراض جن دو اجزا پر مشتمل ہے وہ دونوں ہی سراسر غیر معقول ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ”ہم مٹی میں رَل مِل چکے ہوں گے“ آخر کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ ”ہم“ جس چیز کا نام ہے وہ کب مٹی میں رَلتی ملتی ہے؟ مٹی میں تو صرف وہ جسم ملتا ہے جس سے ”ہم“ نکل چکا ہوتا ہے۔ اس جسم کا نام ”ہم“ نہیں ہے۔ زندگی کی حالت میں جب اس جسم کے اعضا کاٹے جاتے ہیں تو عُضو پر عُضو کٹتا چلا جاتا ہے مگر ”ہم“ پورا کا پورا اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اس کا کوئی جز بھی کسی کٹے ہوئے عضو کے ساتھ نہیں جاتا۔ اور جب یہ ”ہم“ کسی جسم میں سے نکل جاتا ہے تو پورا جسم موجود ہوتے ہوئے بھی اس پر اِس ”ہم“ کے کسی ادنیٰ شائبے تک کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو ایک عاشق جاں نثار اپنے معشوق کے مُردہ جسم کو لے جا کر دفن کر دیتا ہے، کیونکہ معشوق اس جسم سے نکل چکا ہوتا ہے اور وہ معشوق نہیں بلکہ اُس خالی جسم کو دفن کرتا ہے جس میں کبھی اس کا معشوق رہتا تھا۔ پس معترضین کے اعتراض کا پہلا مُقدّمہ ہی بے بنیاد ہے۔ رہا اس کا دوسرا جُز: ”کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے“؟ تو یہ انکار و تعجب کے انداز کا سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا اگر معترضین نے بات کرنے سے پہلے اِس ”ہم“، اور اس کے پیدا کیے جانے کے مفہوم پر ایک لمحے کے لیے کچھ غور کر لیا ہوتا۔ اس ”ہم“

کی موجودہ پیدائش اس کے سوا کیا ہے کہ کہیں سے کوئلا اور کہیں سے لوہا اور کہیں سے چُونا اور اسی طرح کے دوسرے اجزا جمع ہوئے اور اس کالُبدِ خاکی میں یہ ''ہم'' براجمان ہو گیا۔ پھر اس کی موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کالُبدِ خاکی میں سے جب ''ہم'' نکل جاتا ہے تو اس کا مکان تعمیر کرنے کے لیے جو اجزا زمین کے مختلف حصوں سے فراہم کیے گئے تھے، وہ سب اسی زمین میں واپس چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس نے پہلے اس ''ہم'' کو یہ مکان بنا کر دیا تھا، کیا وہ دوبارہ اسی سروسامان سے وہی مکان بنا کر اسے اَز سرِنَو اس میں نہیں بسا سکتا؟ یہ چیز جب پہلے ممکن تھی اور واقعے کی صورت میں رُونما ہو چکی ہے، تو دوبارہ اس کے ممکن ہونے اور واقعہ بننے میں آخر کیا امر مانع ہے؟ یہ باتیں ایسی ہیں جنھیں ذرا سی عقل آدمی استعمال کرے تو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنی عقل کو اس رُخ پر کیوں نہیں جانے دیتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے حیات بعدالموت اور آخرت پر اس طرح کے لایعنی اعتراضات جَڑتا ہے؟ بیچ کی ساری بحث چھوڑ کر اللہ تعالیٰ دوسرے فقرے میں اسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ ''دراصل یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔'' یعنی اصل بات یہ نہیں ہے کہ دوبارہ پیدائش کوئی بڑی ہی انوکھی اور بعید از امکان بات ہے جو ان کی سمجھ میں نہ آ سکتی ہو، بلکہ دراصل جو چیز انھیں یہ بات سمجھنے سے روکتی ہے وہ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہم زمین میں چھُوٹے پھریں اور دل کھول کر گناہ کریں اور پھر نِلُّوہ (scot-free) یہاں سے نکل جائیں۔ پھر ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہو۔ پھر اپنے کرتوتوں کا کوئی حساب ہمیں نہ دینا پڑے۔

۲۱ — یعنی تمھارا وہ ''ہم'' مِٹّی میں رَل مل نہ جائے گا، بلکہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوتے ہی خدا کا فرشتۂ موت آئے گا اور اُسے جسم سے نکال کر سموچا اپنے قبضے میں لے لے گا۔ اُس کا کوئی ادنیٰ سا جُز بھی جسم کے ساتھ مِٹّی میں نہ جا سکے گا۔ وہ پورا کا پورا احراست (custody) میں لے لیا جائے گا اور اپنے رب کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔

اس مختصر سی آیت میں بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر سے سرسری طور پر نہ گزر جایئے:

(۱) اس میں تصریح ہے کہ موت کچھ یونہی نہیں آ جاتی کہ ایک گھڑی چل رہی تھی، کُوک ختم ہوئی اور وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو گئی۔ بلکہ دراصل اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آ کر باقاعدہ رُوح کو ٹھیک اُسی طرح وصول کرتا ہے جس طرح ایک سرکاری امین (official receiver) کسی چیز کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مَقامات پر اس کی مزید تفصیلات جو بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس افسرِ موت کے ماتحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے جو موت وارد کرنے اور روح کو جسم سے نکالنے اور اس کو قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النّوع خدمات انجام دیتا ہے۔ نیز یہ کہ اس عملے کا برتاؤ مجرم رُوح کے ساتھ کچھ اَور ہوتا ہے اور مومنِ صالح روح کے ساتھ کچھ اور۔ (اِن تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، آیت ۹۷۔ الانعام، ۹۳۔ النحل، ۲۸۔ الواقعہ، ۸۳-۹۴)

(۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ قرآن کے الفاظ ''موت کا فرشتہ تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا'' اِسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔

(۳) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے، وہ آدمی کی حیوانی زندگی (biological life) نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ اَنا (ego) ہے جو ''مَیں'' اور ''ہم'' اور ''تم'' کے الفاظ

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا
وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ
نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ

کاش! تم دیکھو وہ وقت جب یہ مُجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے (اُس وقت یہ کہہ رہے ہوں گے:) ''اے ہمارے رب! ہم نے خوب دیکھ لیا اور سُن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب یقین آ گیا ہے۔''[۲۲] (جواب میں ارشاد ہوگا:) ''اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے۔[۲۳] مگر میری وہ بات پوری ہوگئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنّم کو جِنّوں اور انسانوں

سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ اَنا دنیا میں کام کر کے جیسی کچھ شخصیّت بھی بنتی ہے وہ پوری کی پوری، جُوں کی تُوں (intact) نکال لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے۔ اسی کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اسی پر مقدّمہ قائم کیا جائے گا، اسی سے حساب لیا جائے گا، اور اسی کو جزا وسزا دیکھنی ہوگی۔

۲۲ – اب اُس حالت کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے جب اپنے رب کی طرف پلٹ کر یہ انسانی ''اَنا'' اپنا حساب دینے کے لیے اس کے حضور کھڑی ہوگی۔

۲۳ – یعنی اِس طرح حقیقت کا مشاہدہ اور تجرِبہ کرا کر ہی لوگوں کو ہدایت دینا ہمارے پیشِ نظر ہوتا تو دنیا کی زندگی میں اتنے بڑے امتحان سے گزار کر تم کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی، ایسی ہدایت تو ہم پہلے ہی تم کو دے سکتے تھے۔ لیکن تمھارے لیے تو آغاز ہی سے ہماری اسکیم یہ نہ تھی۔ ہم تو حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل اور حواس سے مخفی رکھ کر تمھارا امتحان لینا چاہتے تھے کہ تم براہِ راست اُس کو بے نقاب دیکھنے کے بجائے کائنات میں اور خود اپنے نفس میں اُس کی علامات دیکھ کر اپنی عقل سے اُس کو پہچانتے ہو یا نہیں، ہم اپنے انبیاؑ اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے اِس حقیقت شناسی میں تمھاری جو مدد کرتے ہیں اُس سے فائدہ اٹھاتے ہو یا نہیں، اور حقیقت جان لینے کے بعد اپنے نفس پر اتنا قابو پاتے ہو یا نہیں کہ خواہشات اور اَغراض کی بندگی سے آزاد ہو کر اس حقیقت کو مان جاؤ اور اس کے مطابق اپنا طرزِ عمل دُرست کر لو۔ اس امتحان میں تم ناکام ہو چکے ہو۔ اب دوبارہ اسی امتحان کا سلسلہ شروع کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ دوسرا امتحان اگر اس طرح لیا جائے کہ تمھیں وہ سب کچھ یاد ہو جو تم نے یہاں دیکھ اور سُن لیا ہے تو یہ سرے سے کوئی امتحان ہی نہ ہوگا۔ اور اگر پہلے کی طرح تمھیں خالی الذہن کر کے اور حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل رکھ کر تمھیں پھر دنیا میں پیدا کر دیا جائے اور نئے سرے سے تمھارا اُسی طرح امتحان لیا جائے جیسے پہلے لیا گیا تھا، تو نتیجہ پچھلے امتحان سے کچھ بھی مختلف نہ ہوگا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۲۸، الاَنعام، حواشی ۶-۱۴۱- جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۲۶- جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۹۱)

النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۳ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا
نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴ اِنَّمَا
يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا
بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ۝۱۵ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ
الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

السجدۃ ۹

سب سے بھردوں گا۔[۲۴] پس اب چکھو مزا اپنی اِس حرکت کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کردیا،[۲۵] ہم نے بھی اب تمھیں فراموش کردیا ہے۔ چکھو ہمیشگی کے عذاب کا مزا اپنے کرتوتوں کی پاداش میں۔"

ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنھیں یہ آیات سُنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبّر نہیں کرتے۔[۲۶] سجدہ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں،[۲۷] اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے

۲۴ – اشارہ ہے اُس قول کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آدمؑ کے وقت ابلیس کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا تھا۔ سورۂ ص کے آخری رکوع میں اُس وقت کا پورا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور نسلِ آدم کو بہکانے کے لیے قیامت تک کی مہلت مانگی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۚ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ "پس حق یہ ہے، اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں کہ میں جہنّم کو بھر دوں گا تجھ سے اور اُن لوگوں سے جو انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔"

اَجْمَعِيْنَ کا لفظ یہاں اس معنیٰ میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ تمام جنّ اور تمام انسان جہنّم میں ڈال دیے جائیں گے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیاطین اور ان شیاطین کے پیرو انسان، سب ایک ساتھ واصلِ بجہنم ہوں گے۔

۲۵ – یعنی دنیا کے عیش میں گم ہو کر تم نے اس بات کو بالکل بھلا دیا کہ کبھی اپنے رب کے سامنے بھی جانا ہے۔

۲۶ – بالفاظِ دیگر، وہ اپنے غلط خیالات کو چھوڑ کر اللہ کی بات مان لینے اور اللہ کی بندگی اختیار کر کے اس کی عبادت بجالانے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات نہیں سمجھتے۔ نفس کی کبریائی انھیں قبولِ حق اور اطاعتِ رب سے مانع نہیں ہوتی۔

۲۷ – یعنی راتوں کو دادِ عیش دیتے پھرنے کے بجائے وہ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا حال اُن دنیا پرستوں

يُنْفِقُوْنَ ۝١٦ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ
جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٧ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ
فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ۝١٨ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

رقف غفران

اس میں سے خرچ کرتے ہیں[۲۸]۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے اس کی کسی مُتنفِّس کو خبر نہیں ہے[۲۹]۔ بھلا کہیں یہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اُس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو؟[۳۰] یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے[۳۱]۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں

کا سا نہیں ہے جنھیں دن کی محنتوں کی کُلفت دور کرنے کے لیے راتوں کو ناچ گانے اور شراب نوشی اور کھیل تماشوں کی تفریحات درکار ہوتی ہیں۔ اس کے بجائے ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ دن بھر اپنے فرائض انجام دے کر جب وہ فارغ ہوتے ہیں تو اپنے رب کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی یاد میں راتیں گزارتے ہیں۔ اس کے خوف سے کانپتے ہیں اور اسی سے اپنی ساری اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں۔

بستروں سے پیٹھیں الگ رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ راتوں کو سوتے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ راتوں کا ایک حصّہ خدا کی عبادت میں صَرف کرتے ہیں۔

۲۸ – رزق سے مراد ہے رزقِ حلال۔ مالِ حرام کو اللہ تعالیٰ اپنے دیے ہوئے رزق سے تعبیر نہیں فرماتا۔ لٰہذا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو تھوڑا یا بہت پاک رزق ہم نے انھیں دیا ہے اسی میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس سے تجاوز کر کے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے حرام مال پر ہاتھ نہیں مارتے۔

۲۹ – بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسندِ احمد میں متعدّد طریقوں سے حضرت ابوہُریرہؓ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَعْدَدْتُّ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ فراہم کر رکھا ہے جسے نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کبھی کسی کان نے سنا، نہ کوئی انسان کبھی اس کا تصور کر سکا ہے۔“ یہی مضمون تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ حضرت ابوسعید خُدریؓ، حضرت مُغیرہؓ بن شُعبہ اور حضرت سَہل بن سَعد ساعدیؓ نے بھی حضورؐ سے روایت کیا ہے جسے مسلم، احمد، ابنِ جَریر اور ترمذی نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۳۰ – یہاں مومن اور فاسق کی دو مُتقابِل اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ مومن سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبودِ واحد مان کر اس قانون کی اطاعت اختیار کر لے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اس کے برعکس

فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۚ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٩ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ
اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ
تُكَذِّبُوْنَ ۝٢٠ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ
الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝٢١ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ

اُن کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں[۳۲]، ضیافت کے طور پر اُن کے اعمال کے بدلے میں۔ اور جنھوں نے فِسق اختیار کیا ہے اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اُسی آگ کے عذاب کا مزا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔
اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اِسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزا اِنھیں چکھاتے رہیں گے شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں[۳۳]۔ اور اُس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے

فاسق وہ ہے جو فسق (خُروج از طاعت، یا بالفاظِ دیگر، بغاوت، خودمختاری اور اطاعتِ غیر اللہ) کا رویّہ اختیار کرے۔

۳۱– یعنی نہ دنیا میں ان کا طرزِ فکر و طرزِ حیات یکساں ہو سکتا ہے اور نہ آخرت میں ان کے ساتھ خدا کا معاملہ یکساں ہو سکتا ہے۔

۳۲– یعنی وہ جنتیں محض ان کی سیر گاہیں نہیں ہوں گی بلکہ وہی ان کی قیام گاہیں بھی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

۳۳– ''عذابِ اکبر'' سے مراد آخرت کا عذاب ہے جو کفر و فسق کی پاداش میں دیا جائے گا۔ اس کے مقابلے میں ''عذابِ ادنیٰ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ تکلیفیں ہیں جو اِسی دنیا میں انسان کو پہنچتی ہیں۔ مثلاً افراد کی زندگی میں سخت بیماریاں، اپنے عزیز ترین لوگوں کی موت، المناک حادثے، نقصانات، ناکامیاں وغیرہ۔ اور اجتماعی زندگی میں طوفان، زلزلے، سیلاب، وبائیں، قحط، فسادات، لڑائیاں اور دوسری بہت سی بلائیں جو ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ان آفات کے نازل کرنے کی مَصلَحت یہ بیان کی گئی ہے کہ عذابِ اکبر میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی لوگ ہوش میں آجائیں اور اُس طرزِ فکر و عمل کو چھوڑ دیں جس کی پاداش میں آخرِ کار انھیں وہ بڑا عذاب بُھگتنا پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بالکل بخیریت ہی نہیں رکھا ہے کہ پورے آرام و سکون سے زندگی کی گاڑی چلتی رہے اور آدمی اِس غَلَط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ اس سے

رَّبِّهٖ ثُمَّ اَعۡرَضَ عَنۡهَا ؕ اِنَّا مِنَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُنۡتَقِمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ع

ذریعہ سے نصیحت کی جائے اور پھر وہ ان سے منہ پھیر لے۔[۳۴] ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے۔ ع

بالاتر کوئی طاقت نہیں ہے جو اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ وقتاً فوقتاً افراد پر بھی اور قوموں اور ملکوں پر بھی ایسی آفات بھیجتا رہتا ہے جو اسے اپنی بے بسی کا اور اپنے سے بالاتر ایک ہمہ گیر سلطنت کی فرماں روائی کا احساس دلاتی ہیں۔ یہ آفات ایک ایک شخص کو، ایک ایک گروہ کو اور ایک ایک قوم کو یہ یاد دلاتی ہیں کہ اوپر تمھاری قسمتوں کو کوئی اور کنٹرول کر رہا ہے۔ سب کچھ تمھارے ہاتھ میں نہیں دے دیا گیا ہے۔ اصل طاقت اسی کارفرما اقتدار کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کی طرف سے جب کوئی آفت تمھارے اوپر آئے تو نہ تمھاری کوئی تدبیر اسے دفع کر سکتی ہے، اور نہ کسی جنّ، یا رُوح، یا دیوی اور دیوتا، یا نبی اور ولی سے مدد مانگ کر تم اس کو روک سکتے ہو۔ اس لحاظ سے یہ آفات محض آفات نہیں ہیں بلکہ خدا کی تنبیہات ہیں جو انسان کو حقیقت سے آگاہ کرنے اور اس کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ ان سے سبق لے کر دنیا ہی میں آدمی اپنا عقیدہ اور عمل ٹھیک کر لے تو آخرت میں خدا کا بڑا عذاب دیکھنے کی نوبت ہی کیوں آئے۔

۳۴۔ ”رب کی آیات“ یعنی اُس کی نشانیوں کے الفاظ بہت جامع ہیں جن کے اندر تمام اقسام کی نشانیاں آجاتی ہیں۔ قرآنِ مجید کے جملہ بیانات کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانیاں حسبِ ذیل چھ قسموں پر مشتمل ہیں:

(۱) وہ نشانیاں جو زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز میں اور کائنات کے مجموعی نظام میں پائی جاتی ہیں۔

(۲) وہ نشانیاں جو انسان کی اپنی پیدایش اور اس کی ساخت اور اس کے وجود میں پائی جاتی ہیں۔

(۳) وہ نشانیاں جو انسان کے وِجدان میں، اس کے لاشُعور اور تحت الشعور میں، اور اس کے اَخلاقی تصوّرات میں پائی جاتی ہیں۔

(۴) وہ نشانیاں جو انسانی تاریخ کے مسلسل تجَربات میں پائی جاتی ہیں۔

(۵) وہ نشانیاں جو انسان پر آفاتِ ارضی وسماوی کے نزول میں پائی جاتی ہیں۔

(۶) اور ان سب کے بعد وہ آیات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاؑ کے ذریعے سے بھیجیں، تاکہ معقول طریقے سے انسان کو انھی حقائق سے آگاہ کیا جائے جن کی طرف اوپر کی تمام نشانیاں اشارہ کر رہی ہیں۔

یہ ساری نشانیاں پوری ہم آہنگی اور بلند آہنگی کے ساتھ انسان کو یہ بتا رہی ہیں کہ تو بے خدا نہیں ہے، نہ بہت سے خداؤں کا بندہ ہے، بلکہ تیرا خدا صرف ایک ہی خدا ہے جس کی عبادت و اطاعت کے سوا تیرے لیے کوئی دوسرا راستہ صحیح نہیں ہے۔ تو اس دنیا میں آزاد و خود مختار اور غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ تجھے اپنا کارنامۂ حیات ختم کرنے کے بعد اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر جواب دہی کرنی ہے اور اپنے عمل کے لحاظ سے جزا اور سزا پانی ہے۔ پس تیری اپنی خیر اسی میں ہے کہ تیرے خدا نے تیری رہنمائی کے لیے اپنے انبیاؑ اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے جو ہدایت بھیجی ہے، اس کی پیروی کر اور خود مختاری کی رَوِش سے باز آجا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس انسان کو اتنے مختلف طریقوں سے سمجھایا گیا ہو، جس کی فہمایش کے لیے طرح طرح کی اتنی بے شمار نشانیاں فراہم کی گئی ہوں، اور جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان، اور سوچنے سمجھنے کے لیے دل کی نعمتیں بھی دی گئی ہوں، وہ اگر ان ساری نشانیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے،

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ
هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ
بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ

اس سے پہلے ہم موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دے چکے ہیں، لہٰذا اُسی چیز کے ملنے پر تمھیں کوئی شک نہ ہونا چاہیے۔[۳۵] اُس کتاب کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا،[۳۶] اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔[۳۷] یقیناً تیرا رب ہی

سمجھانے والوں کی تذکیر و نصیحت کے لیے بھی اپنے کان بند کر لیتا ہے، اور اپنے دماغ سے بھی اَوندھے فلسفے ہی گھڑنے کا کام لیتا ہے، اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ پھر اسی کا مستحق ہے کہ دنیا میں اپنے امتحان کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو تو بغاوت کی بھرپور سزا پائے۔

۳۵ – خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضورؐ کی رسالت میں، اور آپؐ کے اوپر کتابِ الٰہی کے نازل ہونے میں شک کر رہے تھے۔ یہاں سے کلام کا رُخ اُسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جو آغازِ سورہ (آیات نمبر ۲ اور ۳) میں بیان ہوا تھا۔ کفارِ مکہ کہہ رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر خدا کی طرف سے کوئی کتاب نہیں آئی ہے، انھوں نے اِسے خود گھڑ لیا ہے اور دعویٰ یہ کر رہے ہیں کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے۔ اس کا ایک جواب ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ اب اس کا دوسرا جواب دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات جو فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اے نبیؐ! یہ نادان لوگ تم پر کتابِ الٰہی کے نازل ہونے کو اپنے نزدیک بعید از امکان سمجھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر دوسرا شخص بھی اگر اس کا انکار نہ کرے تو کم از کم اس کے متعلق شک ہی میں پڑ جائے۔ لیکن ایک بندے پر خدا کی طرف سے کتاب نازل ہونا ایک نرالا واقعہ تو نہیں ہے جو انسانی تاریخ میں آج پہلی مرتبہ ہی پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے متعدّد انبیاؑ پر کتابیں نازل ہو چکی ہیں، جن میں سے مشہور ترین کتاب وہ ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کو دی گئی تھی۔ لہٰذا اسی نوعیت کی ایک چیز آج تمھیں دی گئی ہے تو آخر اس میں انوکھی بات کیا ہے جس پر خواہ مخواہ شک کیا جائے۔

۳۶ – یعنی وہ کتاب بنی اسرائیل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنائی گئی تھی، اور یہ کتاب اُسی طرح تم لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجی گئی ہے، جیسا کہ آیت نمبر ۳ میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اِس ارشاد کی پوری معنویت اس کے تاریخی پَس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے ہی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے، اور کفارِ مکہ بھی اس سے ناواقف نہ تھے کہ بنی اسرائیل کئی صدی تک مصر میں انتہائی ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ (علیہ السلام) کو پیدا کیا، ان کے ذریعے سے اس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا، پھر ان پر کتاب نازل کی اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پِسی ہوئی

يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۲۵﴾ اَوَلَمۡ
يَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ يَمۡشُوۡنَ فِىۡ مَسٰكِنِهِمۡ ؕ
اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۶﴾ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَى
الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا تَاۡكُلُ مِنۡهُ اَنۡعَامُهُمۡ وَاَنۡفُسُهُمۡ ؕ

قیامت کے روز اُن باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں (بنی اسرائیل) باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔[۳۸]
اور کیا اِن لوگوں کو (اِن تاریخی واقعات میں) کوئی ہدایت نہیں ملی کہ اِن سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں، جن کے رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟[۳۹] اس میں بڑی نشانیاں ہیں، کیا یہ سُنتے نہیں ہیں؟ اور کیا اِن لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہا لاتے ہیں؟ اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اُگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارا مِلتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں؟

قوم ہدایت پا کر دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔ اس تاریخ کی طرف اشارہ کر کے اہلِ عرب سے فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے وہ کتاب بھیجی گئی تھی، اسی طرح تمھاری ہدایت کے لیے یہ کتاب بھیجی گئی ہے۔

۳۷– یعنی بنی اسرائیل کو اس کتاب نے جو کچھ بنایا اور جن مدارج پر ان کو پہنچایا، وہ محض ان کے درمیان کتاب کے آ جانے کا کرشمہ نہ تھا کہ گویا یہ کوئی تعویذ ہو جو باندھ کر اس قوم کے گلے میں لٹکا دیا گیا ہو اور اس کے لٹکتے ہی قوم نے بامِ عُروج پر چڑھنا شروع کر دیا ہو۔ بلکہ یہ ساری کرامت اُس یقین کی تھی جو وہ اللہ کی آیات پر لائے، اور اُس صبر اور ثابت قدمی کی تھی جو انھوں نے احکامِ الٰہی کی پیروی میں دکھائی۔ خود بنی اسرائیل کے اندر بھی پیشوائی انھی کو نصیب ہوئی جو ان میں سے کتاب اللہ کے سچے مومن تھے اور دُنیوی فائدوں اور لذتوں کی طمع میں پھسل جانے والے نہ تھے۔ انھوں نے جب حق پرستی میں ہر خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ہر نقصان اور ہر تکلیف کو برداشت کیا، اور اپنے نفس کی شہوات سے لے کر باہر کے اعدائے دین تک ہر ایک کے خلاف مُجاہَدہ کا حق ادا کر دیا تب ہی وہ دنیا کے امام بنے۔ اس سے مقصود کفارِ عرب کو مُتنبّہ کرنا ہے کہ جس طرح خدا کی کتاب کے نزول نے بنی اسرائیل کے اندر قسمتوں کے فیصلے کیے تھے، اسی طرح اب اس کتاب کا نزول تمھارے درمیان بھی قسمتوں کا فیصلہ کر دے گا۔ اب وہی لوگ امام بنیں گے جو اس کو مان کر صبر و ثبات کے ساتھ حق کی پیروی کریں گے۔ اس سے منہ موڑنے والوں کی تقدیر گردش میں آ چکی ہے۔

۳۸– یہ اشارہ ہے اُن اختلافات اور فرقہ بندیوں کی طرف جن کے اندر بنی اسرائیل ایمان و یقین کی دولت سے محروم ہونے، اور اپنے راست رَو ائمہ کی پیروی چھوڑ دینے، اور دنیا پرستی میں پڑ جانے کے بعد مبتلا ہوئے۔ اس حالت کا ایک نتیجہ تو ظاہر ہے جسے ساری دُنیا

أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿٢٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِن كُنتُمْ
صَادِقِينَ ﴿٢٨﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ
وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٢٩﴾ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانتَظِرْ إِنَّهُم مُّنتَظِرُونَ ﴿٣٠﴾ ع

تو کیا انھیں کچھ نہیں سُوجھتا؟[40] یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ فیصلہ کب ہو گا اگر تم سچے ہو؟"[41] ان سے کہو: "فیصلے کے دن ایمان لانا اُن لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا جنھوں نے کفر کیا ہے اور پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملے گی۔"[42] اچھا، اِنھیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں۔ ع

دیکھ رہی ہے کہ بنی اسرائیل ذلّت ونکبت میں گرفتار ہیں۔ دوسرا نتیجہ وہ ہے جو دنیا نہیں جانتی، اور وہ قیامت کے روز ظاہر ہو گا۔

۳۹ – یعنی کیا تاریخ کے اس مسلسل تجرِبے سے اِن لوگوں نے کوئی سبق نہیں لیا کہ جس قوم میں بھی خدا کا رسول آیا ہے، اُس کی قسمت کا فیصلہ اُس رَوِیّے کے ساتھ معلّق ہو گیا ہے جو اپنے رسول کے معاملے میں اُس نے اختیار کیا۔ رسول کو جھٹلا دینے کے بعد پھر کوئی قوم بچ نہیں سکی ہے۔ اُس میں سے بچے ہیں تو صرف وہی لوگ جو اس پر ایمان لائے۔ انکار کر دینے والے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سامانِ عبرت بن کر رہ گئے۔

۴۰ – سِیاق وسَباق کو نگاہ میں رکھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں یہ ذکر حیات بعد الموت پر اِستِدلال کرنے کے لیے نہیں کیا گیا ہے، جیسا کہ قرآن میں بالعُموم ہوتا ہے، بلکہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بات ایک اور ہی مقصد کے لیے فرمائی گئی ہے۔ اس میں دراصل ایک لطیف اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح ایک بنجر پڑی ہوئی زمین کو دیکھ کر آدمی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ یہ بھی کبھی لہلہاتی کِشتِ زار بن جائے گی، مگر خدا کی بھیجی ہوئی برسات کا ایک ہی ریلا اس کا رنگ بدل دیتا ہے، اسی طرح یہ دعوتِ اسلام بھی اِس وقت تم کو ایک نہ چلنے والی چیز نظر آتی ہے، لیکن خدا کی قدرت کا ایک ہی کرشمہ اس کو وہ فروغ دے گا کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔

۴۱ – یعنی تم جو کہتے ہو کہ آخرِ کار اللہ کی مدد آئے گی اور ہمیں جھٹلانے والوں پر اُس کا غضب ٹوٹ پڑے گا، تو بتاؤ وہ وقت کب آئے گا؟ کب ہمارا تمھارا فیصلہ ہو گا؟

۴۲ – یعنی یہ کون سی ایسی چیز ہے جس کے لیے تم بے چین ہوتے ہو۔ خدا کا عذاب آ گیا تو پھر سنبھلنے کا موقع تم کو نصیب نہ ہو گا۔ اس مہلت کو غنیمت جانو جو عذاب آنے سے پہلے تم کو ملی ہوئی ہے۔ عذاب سامنے دیکھ کر ایمان لاؤ گے تو کچھ حاصل نہ ہو گا۔

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۳۳)

الاحزاب

نام آیت ۲۰ کے فقرہ یَحۡسَبُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ لَمۡ یَذۡهَبُوۡا سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول اس سورت کے مضامین تین اہم واقعات سے بحث کرتے ہیں: ایک، غزوۂ اَحزاب جو شوال ۵ ھ میں پیش آیا۔ دوسرے، غزوۂ بنی قُرَیْظَہ جو ذی القَعْدہ ۵ ھ میں پیش آیا۔ تیسرے، حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جو اسی سال ذی القعدہ میں ہوا۔ ان تاریخی واقعات سے سورت کا زمانۂ نزول ٹھیک متعیّن ہو جاتا ہے۔

تاریخی پس منظر جنگِ اُحُد (شوال ۳ ھ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے تیر اندازوں کی غلطی سے لشکرِ اسلام کو جو شکست نصیب ہو گئی تھی اس کی وجہ سے مشرکینِ عرب، یہود اور منافقین کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور انھیں اُمید بندھ چلی تھی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا قَلع قَمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان بڑھتے ہوئے حوصلوں کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو اُحُد کے بعد پہلے ہی سال میں پیش آئے۔ جنگِ اُحُد پر دو مہینوں سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ نجد کے قبیلۂ بنی اَسَد نے مدینۂ طَیِّبہ پر چھاپا مارنے کی تیاریاں کیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی روک تھام کے لیے سَرِیَّۂ[1] ابو سَلَمہ بھیجنا پڑا۔ پھر صفر ۴ ھ میں قبائلِ عَضَل اور قارہ نے حضورؐ سے چند آدمی مانگے تاکہ وہ ان کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دینِ اسلام کی تعلیم دیں۔ حضورؐ نے چھ اصحاب کو ان کے ساتھ کر دیا۔ مگر رَجِیع (جِدّہ اور رابِغ کے درمیان) پہنچ کر وہ لوگ قبیلۂ ہُذَیل کے کفار کو ان بے بس مبلّغین پر چڑھا لائے، ان میں سے چار کو قتل کر دیا، اور دو صاحبوں (حضرت خُبَیْبؓ بن عَدِی، اور حضرت زیدؓ بن الدَّثِنَہ) کو لے جا کر مکۂ معظّمہ میں دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پھر اسی ماہِ صفر میں بنی عامر کے ایک سردار کی درخواست پر حضورؐ نے ایک اور تبلیغی وفد جو چالیس (یا بقولِ بعض ۷۰) انصاری نوجوانوں پر مشتمل تھا، نجد کی طرف روانہ کیا۔ مگر ان کے ساتھ بھی غداری کی گئی اور بنی سُلَیم کے قبائل عُصَیَّہ اور رِعْل اور ذَکْوان نے بِئرِ معونہ کے مقام پر اچانک نرغہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ اسی دوران میں مدینے کا یہودی قبیلہ بنی النَّضِیر دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا، یہاں تک کہ ربیع الاوّل ۴ ھ میں اُس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کی سازش تک کر ڈالی۔ پھر جُمادِی الاُولیٰ ۴ ھ میں بنی غَطفان کے دو قبیلوں، بنو ثَعْلَبَہ اور بنو مُحارِب نے مدینے پر حملے کی تیاریاں کیں اور حضورؐ کو خود ان کی روک تھام کے لیے جانا پڑا۔ اس طرح جنگِ اُحُد کی شکست سے جو ہوا اکھڑی تھی، وہ مسلسل سات آٹھ مہینے تک اپنا رنگ دکھاتی رہی۔

1۔ اصطلاح میں سَرِیَّہ اُس فوجی مہم کو کہتے ہیں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک نہ ہوتے تھے۔ اور غَزْوہ اُس جنگ یا مہم کو کہا جاتا ہے جس میں حضورؐ خود قیادت فرماتے تھے۔

لیکن وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم و تدبر اور صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ فدا کاری تھا جس نے تھوڑی مدت کے اندر ہی حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ عربوں کے مَعاشی مُقاطَعے نے اہلِ مدینہ کے لیے جینا دشوار کر رکھا تھا۔ گِردوپیش کے تمام مشرک قبائل چیرہ دست ہو رہے تھے۔ خود مدینے کے اندر یہود اور منافقین مارِ آستین بنے ہوئے تھے۔ مگر ان مٹھی بھر مومنینِ صادقین نے رسولِ خدا کی قیادت میں پے در پے ایسے اقدامات کیے جن سے عرب میں اسلام کا رعب صرف بحال ہی نہیں ہوگیا، بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔

جنگِ احزاب سے پہلے کے غزوات

ان میں سے اوّلین اقدام وہ تھا جو جنگِ اُحد کے فوراً ہی بعد کیا گیا۔ جنگ کے ٹھیک دوسرے روز، جب کہ بکثرت مسلمان زخمی تھے اور بہت سے گھروں میں عزیز ترین اقارب کی شہادت پر کُہرام برپا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی زخمی اور حضرت حمزہؓ کی شہادت پر دل فِگار تھے، حضورؐ نے اسلام کے فدائیوں کو پکارا کہ لشکرِ کفار کے تعاقُب میں چلنا ہے، تاکہ وہ کہیں راستے سے پلٹ کر پھر مدینے پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ حضورؐ کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا کہ کفارِ قریش ہاتھ آئی ہوئی فتح کا کوئی فائدہ اُٹھائے بغیر واپس تو چلے گئے ہیں، لیکن راستے میں جب کسی جگہ ٹھیریں گے تو اپنی اس حماقت پر نادم ہوں گے اور دوبارہ مدینے پر چڑھ آئیں گے۔ اس بنا پر آپؐ نے ان کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور فوراً ۶۳۰ جاں نثار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مکے کے راستے میں جب حَمْرَاءُ الاَسَد پہنچ کر آپؐ نے تین روز تک پڑاؤ کیا تو ایک ہمدرد غیر مسلم کے ذریعے سے آپؐ کو معلوم ہوگیا کہ ابوسفیان اپنے ۲۹۷۸ آدمیوں کے ساتھ مدینے سے ۳۶ میل دُور اَلرَّوحا کے مقام پر ٹھیرا ہوا تھا اور یہ لوگ فی الواقع اپنی غَلَطی کو محسوس کر کے پھر پلٹ آنا چاہتے تھے، لیکن یہ سُن کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر لیے ہوئے ان کے تعاقب میں چلے آرہے ہیں۔ اس کارروائی کا صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ قریش کے بڑھے ہوئے حوصلے پست ہو گئے، بلکہ گردوپیش کے دشمنوں کو بھی یہ معلوم ہوگیا کہ مسلمانوں کی قیادت ایک انتہائی بیدار مغز اور اُولُوالْعَزم ہستی کر رہی ہے اور مسلمان اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، دیباچہ، حاشیہ ۱۲۲)

پھر جونہی کہ بنی اَسَد نے مدینے پر چھاپا مارنے کی تیاریاں شروع کیں، حضورؐ کے مُخبروں نے بروقت آپؐ کو ان کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔ قبل اس کے کہ وہ چڑھ کر آتے، آپؐ نے حضرت ابوسَلَمہؓ (اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کے پہلے شوہر) کی قیادت میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک لشکر ان کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ یہ فوج اچانک ان کے سر پر پہنچ گئی۔ بدحواسی کے عالم میں وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کا سارا مال اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آگیا۔

اس کے بعد بنی النَّضِیر کی باری آئی۔ جس روز انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی اور اس کا راز فاش ہوا اُسی روز آپؐ نے ان کو نوٹس دے دیا کہ دس دن کے اندر مدینے سے نکل جاؤ، اس کے بعد تم میں سے جو یہاں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ منافقینِ مدینہ کے سردار عبداللہ بن اُبَیّ نے ان کو تَڑی دی کہ

ڈٹ جاؤ اور مدینہ چھوڑنے سے انکار کر دو، میں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمھاری مدد کروں گا، بنی قُرَیظَہ تمھاری مدد کریں گے، اور نجد سے بنی غَطَفان بھی تمھاری مدد کے لیے آئیں گے۔ ان باتوں میں آکر انھوں نے حضورؐ کو کہلا بھیجا کہ ہم اپنا علاقہ نہیں چھوڑیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ حضورؐ نے نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے حامیوں میں سے کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ مدد کو آتا۔ آخر کار انھوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ ان میں سے ہر تین آدمی ایک اونٹ پر جو کچھ لاد کر لے جا سکتے ہیں، لے جائیں گے اور باقی سب کچھ مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں گے۔ اس طرح مضافات مدینہ کا وہ پورا محلّہ جس میں بنی نضیر رہتے تھے، ان کے باغات اور گڑھیوں اور سروسامان سمیت مسلمانوں کے ہاتھ آگیا اور اس بدعہد قبیلے کے لوگ خَیبَر، وادی القُریٰ اور شام میں تتّر بتّر ہو گئے۔

پھر آپؐ نے بنی غَطَفان کی طرف توجہ کی جو مدینے پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ آپؐ چار سو کا لشکر لے کر نکلے اور ذات الرِّقاع کے مقام پر ان کو جالیا۔ اس اچانک حملے نے ان کے حواس باختہ کر دیے اور کسی جنگ کے بغیر وہ اپنے گھر بار اور مال اسباب چھوڑ کر پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔

اس کے بعد شعبان ۴ھ میں آپؐ ابوسفیان کے اُس چیلنج کا جواب دینے کے لیے نکلے جو اُس نے اُحُد سے پلٹتے ہوئے دیا تھا۔ خاتمۂ جنگ پر اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف رُخ کر کے اعلان کیا تھا کہ **اِنَّ مَوْعِدَ کُمْ بَدَرٌ لِلْعَامِ الْمُقْبِل** (آیندہ سال بَدر کے مقام پر ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہوگا)، اور حضورؐ نے جواب میں ایک صحابی کے ذریعے سے یہ اعلان کرا دیا تھا کہ **نَعَمْ، هِیَ بَیْنَنَا وَبَیْنَكَ مَوْعِدٌ** (ٹھیک ہے، یہ بات ہمارے اور تیرے درمیان طے ہوگئی۔) اس قرار داد کے مطابق طے شدہ وقت پر آپؐ ۱۵ سو صحابیوں کو لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اُدھر سے ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لے کر چلا، مگر مَرُّالظَّہران (موجودہ وادیِ فاطمہ) سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ حضورؐ نے بدر میں آٹھ دن اس کا انتظار کیا اور اس دَوران میں مسلمان تجارت کر کے ایک درہم کے دو درہم کماتے رہے۔ اس واقعہ سے وہ دھاک جو اُحُد میں اکھڑی تھی پہلے سے بھی زیادہ جم گئی۔ اس نے پورے عرب پر یہ بات کھول دی کہ اب تنہا قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (اس کی مزید تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۱۲۴)

اس دھاک میں ایک اور واقعے نے مزید اضافہ کیا۔ عرب اور شام کی سرحد پر دُومَۃُ الجَندَل (موجودہ الجَوف) ایک اہم مقام تھا جہاں سے عراق اور مصر و شام کے درمیان عرب کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس مقام کے لوگ قافلوں کو تنگ کرتے اور اکثر لُوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاوّل ۵ھ میں ایک ہزار کا لشکر لے کر ان کی تادیب کے لیے خود تشریف لے گئے۔ وہ آپؐ کے مقابلے کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس سے پورے شمالی عرب پر اسلام کی ہیبت بیٹھ گئی اور قبائل نے یہ سمجھ لیا کہ مدینے میں جو زبردست طاقت پیدا ہوئی ہے، اس کا مقابلہ اب ایک دو قبیلوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

عہدِ نبوی میں قبائلِ عرب کے علاقے

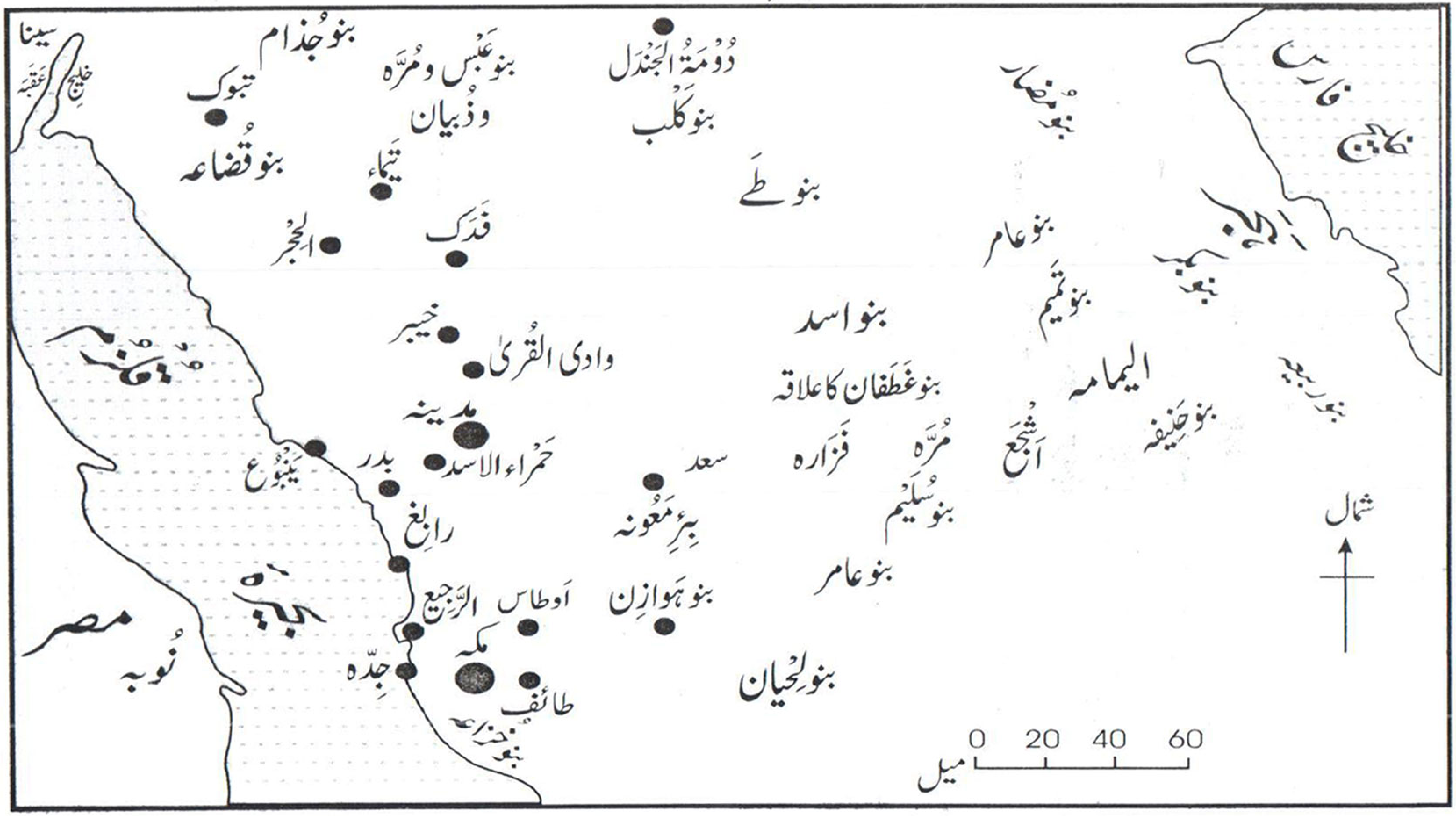

غزوۂ اَحزاب

یہ حالات تھے جن میں غزوۂ اَحزاب پیش آیا۔ یہ غزوہ دراصل عرب کے بہت سے قبائل کا ایک مشترک حملہ تھا جو مدینے کی اِس طاقت کو کچل دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی تحریک بنی النَّضِیر کے اُن لیڈروں نے کی تھی جو مدینے سے جَلا وطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔ انھوں نے دَورہ کر کے قریش اور غَطفان اور ہُذَیل اور دوسرے بہت سے قبائل کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سب مل کر بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مدینے پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے شوال ۵ ھ میں قبائلِ عرب کی اتنی بڑی جمعیت اس چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہو گئی جو اس سے پہلے عرب میں کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔ اس میں شِمال کی طرف سے بنی النَّضِیر اور بنی قَینُقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینے سے جَلاوطن ہو کر خیبر اور وادی القُریٰ میں آباد ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف سے غَطفان کے قبائل (بنو سُلَیم، فَزارہ، مُرَّہ، اَشْجَع، سَعْد اور اَسَد وغیرہ) نے پیش قدمی کی۔ اور جنوب کی طرف سے قریش اپنے حلیفوں کی ایک بھاری جمعیت لے کر آگے بڑھے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد دس بارہ ہزار تھی۔

یہ حملہ اگر اچانک ہوتا تو سخت تباہ کُن ہوتا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینۂ طیّبہ میں بے خبر بیٹھے ہوئے نہ تھے بلکہ آپؐ کے خبر رساں اور تحریک اسلامی کے ہمدرد اور متأثّرین جو تمام قبائل میں موجود تھے، آپؐ کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے برابر مُطّلَع کرتے رہتے تھے۔[1] قبل اس کے کہ یہ جَمِّ غفیر آپؐ کے شہر پہنچتا، آپؐ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شِمال غربی رُخ پر ایک خندق کھدوا لی اور کوہِ سَلْع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مُدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینے کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے (اور اب بھی ہیں) کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہ ہو سکتا تھا۔ مشرق میں حَرّات (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کشی آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف اُحُد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہو سکتا تھا اور اسی جانب حضورؐ نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا۔ یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی نقشے میں تھی ہی نہیں کہ انھیں مدینے کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا، کیونکہ اہلِ عرب اس طریقِ دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انھیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔

اس کے بعد کفار کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ گئی تھی، اور وہ یہ کہ بنی قُرَیظَہ کے یہودی قبیلے کو غدّاری پر آمادہ کریں جو مدینۂ طَیِّبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں رہتا تھا۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا جس کی رُو سے مدینے پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مُدافعت کرنے کا پابند تھا، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچے اُن گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنی قُرَیظَہ کی جانب

---

[1] یہ قوم پرست جتّھوں کے مقابلے میں ایک نظریّاتی تحریک کی فوقیت کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔ قوم پرست جتّھے صرف اپنی قوم کے افراد کی تائید و حمایت ہی پر انحصار رکھتے ہیں۔ لیکن ایک اُصُولی و نظریّاتی تحریک اپنی دعوت سے ہر سَمت میں بڑھتی ہے اور خود ان جتّھوں کے اندر سے اپنے حامی نکال لاتی ہے۔

نقشہ جنگِ احزاب

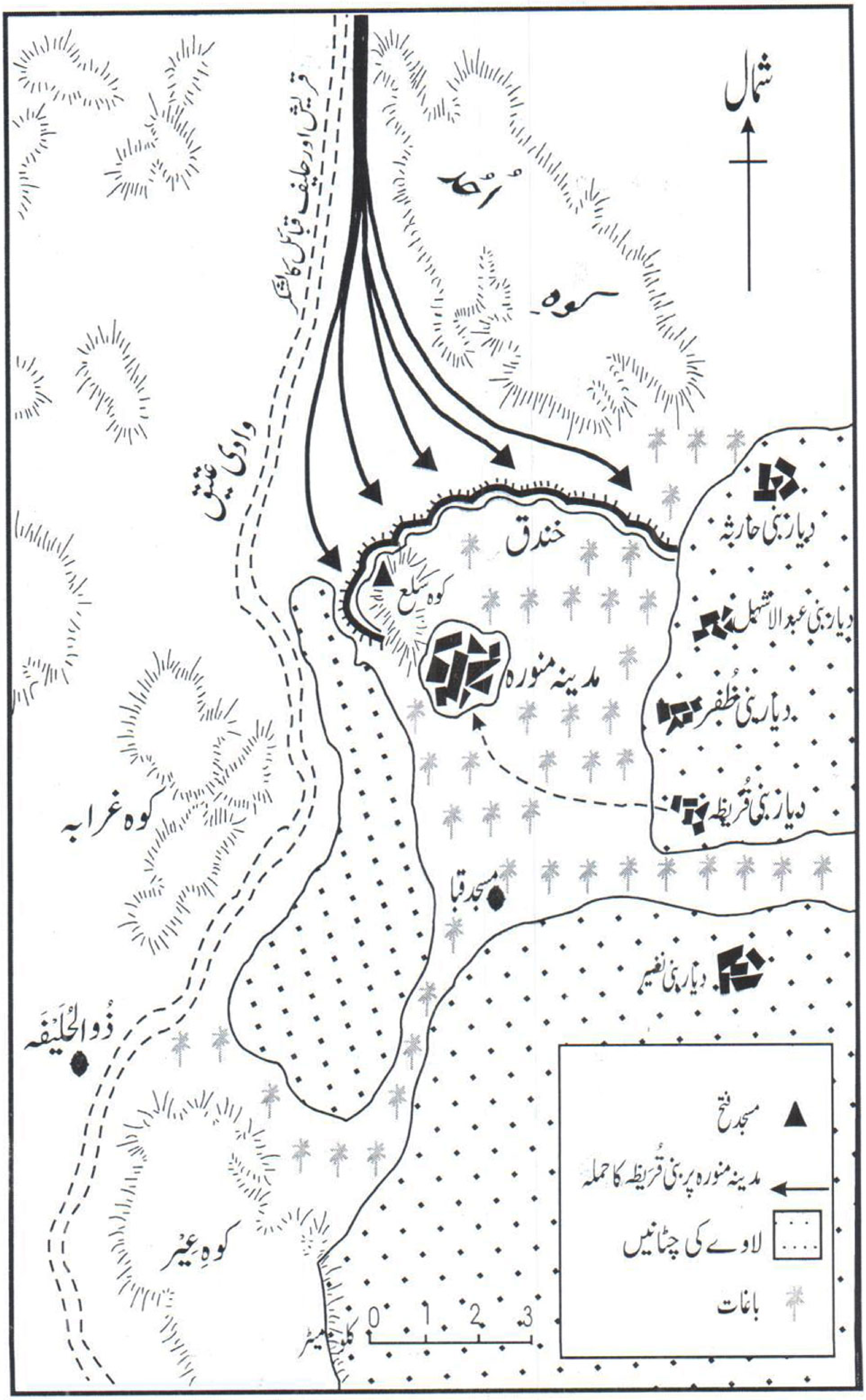

تھیں اور اُدھر مُدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ اُن کی طرف سے بنی النَّضِیر کا یہودی سردار حُیَیّ بن اَخطَب بنی قُرَیظَہ کے پاس بھیجا گیا، تاکہ انھیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرلے۔ ابتداءً انھوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ابنِ اَخطَب نے ان سے کہا کہ ''دیکھو، میں اس وقت عرب کی مُتّحِدہ طاقت اِس شخص پر چڑھا لایا ہوں، یہ اسے ختم کر دینے کا نادر موقع ہے، اس کو اگر تم نے کھو دیا تو پھر دوسرا کوئی موقع نہ مل سکے گا''، تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اَخلاق کے پاس و لحاظ پر غالب آ گئی اور بنی قُرَیظَہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپؐ کو بروقت اس کی اطلاع مل گئی اور آپؐ نے فوراً انصار کے سرداروں (سَعدؓ بن عُبَادہ، سعدؓ بن مُعاذ، عبداللہؓ بن رَواحہ اور خَوّاتؓ بن جُبَیر) کو ان کے پاس تحقیقِ حال اور فہمائش کے لیے بھیجا۔ چلتے وقت آپؐ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اگر بنی قُرَیظَہ عہد پر قائم رہیں تو آ کر سارے لشکر کے سامنے عَلَی الاعلان یہ خبر سنا دینا۔ لیکن اگر وہ نقضِ عہد پر مُصِرّ ہوں تو صرف مجھ کو اشارتاً اس کی اطلاع دے دینا، تاکہ عام مسلمان یہ بات سن کر پست ہمت نہ ہو جائیں۔ یہ حضرات وہاں پہنچے تو بنی قُرَیظَہ کو پوری خباثت پر آمادہ پایا اور انھوں نے برملا ان سے کہہ دیا کہ لَا عَقْدَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ وَّلَا عَهْدَ ''ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔'' اس جواب کو سُن کر وہ لشکرِ اسلام میں واپس آئے اور اشارتاً حضورؐ سے عرض کر دیا: عَضَلَ وقارَہ۔ یعنی قبیلہ عضل و قارہ نے رجیع کے مقام پر مبلغین اسلام کے وفد سے جو غداری کی تھی، وہی کچھ اب بنی قُرَیظَہ کر رہے ہیں۔

یہ خبر بہت جلدی مدینے کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ دونوں طرف سے گھیرے میں آ گئے تھے اور ان کے شہر کا وہ حصّہ خطرے میں پڑ گیا تھا جدھر دفاع کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور سب کے بال بچے بھی اسی جانب تھے۔ اس پر منافقین کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور انھوں نے اہلِ ایمان کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حملے شروع کر دیے۔ کسی نے کہا کہ ''ہم سے وعدے تو قیصر و کِسریٰ کے ملک فتح ہو جانے کے کیے جا رہے تھے، اور حال یہ ہے کہ ہم رفعِ حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے۔'' کسی نے یہ کہہ کر خندق کے محاذ سے رخصت مانگی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں ہمیں جا کر اُن کی حفاظت کرنی ہے۔ کسی نے یہاں تک خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حملہ آوروں سے اپنا معاملہ دُرست کرلو اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے حوالے کر دو۔ یہ ایسی شدید آزمائش کا وقت تھا جس میں ہر اس شخص کا پردہ فاش ہو گیا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی نفاق موجود تھا۔ صرف صادق و مخلص اہلِ ایمان ہی تھے جو اس کڑے وقت میں بھی فداکاری کے عزم پر ثابت قدم رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر بنی غَطفان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور ان کو اس بات پر

آمادہ کرنا چاہا کہ مدینے کے پھلوں کی پیداوار کا ⅓ حصّہ لے کر واپس چلے جائیں۔ لیکن جب انصار کے سرداروں (سعدؓ بن عُبادہ اور سعدؓ بن مُعاذ) سے آپؐ نے ان شرائطِ صلح کے متعلق مشورہ طلب کیا تو انھوں نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! یہ آپؐ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں؟ یا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے لیے اِسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے؟ یا آپؐ صرف ہمیں بچانے کے لیے یہ تجویز فرمارہے ہیں؟'' آپؐ نے جواب دیا ''میں صرف تم لوگوں کو بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متحد ہو کر تم پر پِل پڑا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ دوں۔'' اس پر دونوں سرداروں نے بالاتفاق کہا کہ ''اگر آپؐ ہماری خاطر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ یہ قبیلے ہم سے اُس وقت بھی ایک حبّہ خَراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب ہم مشرک تھے۔ اور اب تو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کا شَرَف ہمیں حاصل ہے، کیا اب یہ ہم سے خَراج لیں گے؟ ہمارے اور ان کے درمیان اب صرف تلوار ہے، یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کر دے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے معاہدے کے اس مُسَوَّدے کو چاک کر دیا جس پر ابھی فریقین کے دستخط نہ ہوئے تھے۔

اسی دَوران میں قبیلۂ غَطفان کی شاخ اَشْجَع کے ایک صاحب نُعَیمؓ بن مسعود مسلمان ہو کر حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے قبولِ اسلام کا علم نہیں ہے، آپؐ مجھ سے اس وقت جو خدمت لینا چاہیں، میں اسے انجام دے سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی تدبیر کرو۔[1] چنانچہ وہ پہلے بنی قُرَیظَہ کے پاس گئے جن سے ان کا بہت میل جول تھا، اور ان سے کہا کہ قریش اور غَطفان تو محاصرے سے تنگ آ کر واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا کچھ نہ بگڑے گا، مگر تمھیں مسلمانوں کے ساتھ اسی جگہ رہنا ہے، وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمھارا کیا بنے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصہ نہ لو جب تک اِن باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمھارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیے جائیں۔ یہ بات بنی قُرَیظَہ کے دل میں اُتر گئی اور انھوں نے مُتَّحِدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غَطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنی قُرَیظَہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آ رہے ہیں، بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمی مانگیں اور انھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ذرا ان کے ساتھ ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔ اس سے مُتَّحِدہ محاذ کے لیڈر بنی قُرَیظَہ کی طرف سے کھٹک گئے اور انھوں نے قُرَظی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اس طویل محاصرے سے اب ہم تنگ آ گئے ہیں، اب ایک فیصلہ کُن لڑائی ہو جانی چاہیے، کل تم اُدھر سے حملہ کرو اور ہم اِدھر سے یک بارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بنی قُرَیظَہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ لوگ جب تک اپنے چند نمایاں آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہ کر دیں، ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے مُتَّحِدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین آ گیا کہ نُعَیم کی بات سچی تھی۔ انھوں نے یرغمال دینے

[1] اسی موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا: اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ، یعنی جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے۔

سے انکار کر دیا اور اس سے بنی قُرَیْظہ نے سمجھ لیا کہ نُعَیم نے ہم کو ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔

اب محاصرہ ۲۵ دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اتنے بڑے لشکر کے لیے پانی اور غذا اور چارے کی فراہمی بھی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھوٹ پڑ جانے سے بھی محاصرین کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس حالت میں یکایک ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی اور کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سُجھائی دیتا تھا۔ آندھی کے زور سے دشمنوں کے خیمے اُلٹ گئے اور ان کے اندر شدید افراتفری برپا ہوگئی۔ قدرتِ خداوندی کا یہ کاری وار وہ نہ سہ سکے۔ راتوں رات ہر ایک نے اپنے گھر کی راہ لی، اور صبح جب مسلمان اُٹھے تو میدان میں ایک دشمن بھی موجود نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان کو دشمنوں سے خالی دیکھ کر فوراً ارشاد فرمایا: لن تغزو کم قریش بعد عامکم ھٰذا ولکنّکم تغزونھم، یعنی ’’اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے۔ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔‘‘ یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔ قریش ہی نہیں، سارے دشمن قبائل متحد ہو کر اسلام کے خلاف اپنا آخری داؤں چل چکے تھے۔ اس میں ہار جانے کے بعد ان میں یہ ہمت ہی باقی نہ رہی تھی کہ مدینے پر حملہ آور ہونے کی جرأت کر سکتے۔ اب حملے (offensive) کی قوت دشمنوں سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔

غزوۂ بنی قُرَیْظہ خندق سے پلٹ کر جب حضورؐ گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبریلؑ نے آکر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں، بنی قُرَیْظہ کا معاملہ باقی ہے، ان سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہی حضورؐ نے فوراً اعلان فرمایا کہ ’’جو کوئی سَمع و طاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قُرَیْظہ پر نہ پہنچ جائے۔‘‘ اس اعلان کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ کو ایک دستے کے ساتھ مُقَدِّمَۃُ الْجَیْش کے طور پر بنی قُرَیْظہ کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن یہ بدزبانی ان کو اس جرمِ عظیم کے خمیازے سے کیسے بچا سکتی تھی کہ انھوں نے عین لڑائی کے وقت معاہدہ توڑ ڈالا اور حملہ آوروں سے مل کر مدینے کی پوری آبادی کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کر دیا۔ حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں۔ لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ محاصرے کی شدت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے اور آخرِ کار انھوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کہ قبیلہ اَوس کے سردار حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کر دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ انھوں نے حضرت سعدؓ کو اس اُمید پر حَکَم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیّت میں اَوس اور بنی قُرَیْظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدّتوں سے چلے آرہے تھے، وہ ان کا لحاظ کریں گے اور انھیں بھی اسی طرح مدینے سے نکل جانے دیں گے جس طرح پہلے بنی قَیْنُقاع اور بنی النَّضِیر کو نکل جانے دیا گیا تھا۔ خود قبیلۂ اَوس کے لوگ بھی حضرت سعدؓ سے تقاضا کر رہے

تھے کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ نرمی برتیں۔ لیکن حضرت سعدؓ ابھی ابھی دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن دو یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نکل جانے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد وپیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینے پر دس بارہ ہزار کا لشکر چڑھا لائے تھے۔ اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اِس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہلِ مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قُرَیظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قُرَیظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انھیں پتا چلا کہ جنگِ احزاب میں حصّہ لینے کے لیے ان غداروں نے ۱۵ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور ۱۵ سو ڈھالیں فراہم کی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اس وقت مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جب کہ مشرکین یک بارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجایش ہی نہ رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملے میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔

معاشرتی اصلاحات

جنگِ اُحُد اور جنگِ اَحزاب کے درمیان، دو سال کا یہ زمانہ اگرچہ ایسے ہنگاموں کا زمانہ تھا جن کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کو ایک دن کے لیے بھی امن اور اطمینان نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس پوری مدت میں نئے مسلم معاشرے کی تعمیر، اور ہر پہلو میں زندگی کی اصلاح کا کام برابر جاری رہا۔ یہی زمانہ تھا جس میں مسلمانوں کے قوانینِ نکاح وطلاق قریب قریب مکمل ہو گئے، وراثت کا قانون بنا، شراب اور جُوئے کو حرام کیا گیا، اور معیشت و معاشرت کے دوسرے بہت سے پہلوؤں میں نئے ضابطے نافذ کیے گئے۔

اس سلسلے کا ایک اہم مسئلہ جو اصلاح کا تقاضا کر رہا تھا تَبنِیَت (گود لینے یا بیٹا بنانے) کا مسئلہ تھا۔ عرب کے لوگ جس بچے کو مُتَبَنّٰی بنا لیتے تھے وہ بالکل اُن کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اسے وراثت ملتی تھی۔ اس سے منہ بولی ماں اور منہ بولی بہنیں وہی خلا ملا رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور بھائی سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا اور اس باپ کے مرجانے کے بعد اس کی بیوہ کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا جس طرح سگی بہن اور حقیقی ماں کے ساتھ کسی کا نکاح حرام ہوتا ہے۔ اور یہی معاملہ اس صورت میں بھی کیا جاتا تھا جب منہ بولا بیٹا مرجائے یا اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ منہ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم قدم قدم پر نکاح اور طلاق اور وراثت کے اُن قوانین سے ٹکراتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں مقرر فرمائے تھے۔ اُن کی رُو سے جو لوگ حقیقت میں وراثت کے حق دار تھے، یہ رسم ان کا حق مار کر ایک ایسے شخص کو دلواتی تھی جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ ان کی رو سے جن عورتوں اور مردوں کے درمیان رشتۂ نکاح حلال تھا، یہ رسم ان کے باہمی نکاح کو حرام کرتی تھی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلامی قانون جن بداخلاقیوں کا سدِّ باب کرنا چاہتا تھا، یہ رسم ان کے پھیلنے میں مددگار تھی۔ کیونکہ رسم کے طور پر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدُّس پیدا کر دیا جائے،

بہرحال منہ بولی ماں، منہ بولی بہن اور منہ بولی بیٹی حقیقی ماں، بہن اور بیٹی کی طرح نہیں ہوسکتی۔ ان مصنوعی رشتوں کے رسمی تقدس پر بھروسا کر کے مردوں اور عورتوں کے درمیان جب حقیقی رشتہ داروں کا سا خلا ملا ہو تو وہ بُرے نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان وجوہ سے اسلامی قانونِ نکاح و طلاق، قانونِ وراثت اور قانونِ حُرمتِ زنا کا یہ تقاضا تھا کہ مُتَبَنّٰی کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیُّل کا قطعی اِستیصال کر دیا جائے۔

لیکن یہ تخیل محض ایک قانونی حکم کے طور پر اتنی سی بات کہہ دینے سے ختم نہیں ہوسکتا تھا کہ ''منہ بولا رشتہ کوئی حقیقی رشتہ نہیں ہے۔'' صدیوں کے جمے ہوئے تعصُّبات اور اوہام محض اقوال سے نہیں بدل جاتے۔ حکماً لوگ اس بات کو مان بھی لیتے کہ یہ رشتے حقیقی رشتے نہیں ہیں، پھر بھی منہ بولی ماں اور منہ بولے بیٹے کے درمیان، منہ بولے بھائی اور بہن کے درمیان، منہ بولے باپ اور بیٹی کے درمیان، منہ بولے خُسر اور بہو کے درمیان نکاح کو لوگ مکروہ ہی سمجھتے رہتے۔ نیز ان کے درمیان خلا ملا بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ یہ رسم عملاً توڑی جائے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس اس کو توڑیں۔ کیونکہ جو کام حضورؐ نے خود کیا ہو، اور اللہ کے حکم سے کیا ہو، اس کے متعلق کسی مسلمان کے ذہن میں کراہت کا تصور باقی نہ رہ سکتا تھا۔ اسی بنا پر جنگِ اَحزاب سے کچھ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ کیا گیا کہ آپؐ اپنے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مُطَلَّقہ بیوی سے خود نکاح کر لیں، اور اس حکم کی تعمیل آپؐ نے محاصرۂ بنی قُرَیظَہ کے زمانے میں فرمائی۔ (غالبًا تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ عدت ختم ہونے کا انتظار تھا، اور اسی دَوران میں جنگی مصروفیات پیش آ گئی تھیں۔)

نکاحِ زینبؓ پر پروپیگنڈے کا طوفان

یہ کام ہونا تھا کہ حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان یکلخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ مشرکین اور منافقین اور یہود سب آپؐ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے۔ اُحُد کے بعد اَحزاب اور بنی قُرَیظَہ تک دو سال کی مدت میں جس طرح وہ زَک پر زَک اُٹھاتے چلے گئے تھے اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں آگ لگ رہی تھی۔ وہ اس بات سے بھی مایوس ہو چکے تھے کہ اب وہ کھلے میدان میں لڑ کر کبھی آپؐ کو زیر کر سکیں گے۔ اس لیے انھوں نے اس نکاح کے معاملے کو اپنے لیے ایک خدا داد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ اب ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُس اَخلاقی برتری کو ختم کر سکیں گے جو ان کی طاقت اور اُن کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔ چنانچہ یہ افسانے تراشے گئے کہ (معاذ اللہ!) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہو کو دیکھ کر عاشق ہو گئے تھے، بیٹے کو اس تعلقِ خاطر کا علم ہو گیا، اس نے بیوی کو طلاق دے دی، اور باپ نے اس کے بعد بہو سے بیاہ رچا لیا۔ حالانکہ یہ بات صریحاً لَغو تھی۔ حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ بچپن سے جوانی تک اُن کی ساری عمر آپؐ کے سامنے گزری تھی۔ کسی وقت ان کو دیکھ کر عاشق ہو جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آپؐ نے خود اِصرار کر کے حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح کرایا تھا۔ ان کا سارا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اتنے اُونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے۔ خود حضرت زینبؓ بھی اس رشتے سے ناخوش تھیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سب مجبُور ہو گئے، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی شادی کر کے عرب میں اس امر

کی پہلی مثال پیش کر دی گئی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اُٹھا کر شرفائے قریش کے برابر لے آیا ہے۔ اگر فی الواقع حضورؐ کا کوئی میلان حضرت زینبؓ کی جانب ہوتا تو زیدؓ بن حارثہ سے ان کا نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، آپؐ خود ان سے نکاح کر سکتے تھے۔ لیکن بے حیا مخالفین نے ان سارے حقائق کے موجود ہوتے یہ عشق کے افسانے تصنیف کیے، خوب نمک مرچ لگا لگا کر ان کو پھیلایا اور اس پروپیگنڈے کا صُور اس زور سے پھونکا کہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ان کی گھڑی ہوئی رِوایات پھیل گئیں۔

پردہ کے ابتدائی احکام

یہ بات کہ دشمنوں کے تصنیف کیے ہوئے یہ افسانے مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھنے سے بھی نہ رُکے اس امر کی کھلی ہوئی علامت تھی کہ معاشرے میں شہوانیت کا عُنصُر حدِّ اعتدال سے بڑھا ہوا تھا۔ یہ خرابی اگر موجود نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ذہن ایسی پاک ہستی کے متعلق ایسے بے سروپا اور اس قدر گھناؤنے افسانوں کی طرف ادنیٰ التفات بھی کرتے، کجا کہ زبانیں ان کو دُہرانے لگتیں۔ یہ ٹھیک موقع تھا جب کہ اسلامی معاشرے میں اُن اصلاحی احکام کے نفاذ کی ابتدا کی گئی جو ''حِجاب'' (پردے) کے عنوان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ ان اصلاحات کا آغاز اس سورہ سے کیا گیا، اور ان کی تکمیل ایک سال بعد سورۂ نور میں کی گئی، جب کہ حضرت عائشہؓ پر بہتان کا فتنہ کھڑا ہوا۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، دیباچہ)

حضورؐ کی خانگی زندگی کے معاملات

اسی زمانے میں دو مسئلے اور بھی توجہ طلب تھے۔ اگرچہ بظاہر ان کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی سے تھا، مگر جو ذات اپنی جان خدا کے دین کو پروان چڑھانے کے لیے کھپا رہی تھی اور ہمہ تن اس کارِ عظیم میں منہمک تھی اس کے لیے خانگی زندگی کا سکون فراہم کرنا اور اس کو پریشانیوں سے بچانا، اور اس کو لوگوں کے شکوک وشبہات سے محفوظ رکھنا بھی خود دین ہی کے مفاد کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر ان دونوں مسئلوں کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مالی حیثیت سے انتہائی تنگ حال تھے۔ ابتدائی چار سال تک تو آپؐ کا کوئی ذریعۂ آمدنی تھا ہی نہیں۔ ۴ھ میں بنی النَّضِیر کی جلاوطنی کے بعد ان کی متروکہ زمینوں کا ایک حصّہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ کی ضروریات کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ مگر وہ آپؐ کے کنبے کے لیے کافی نہ تھا۔ اِدھر منصبِ رسالت کے فرائض اتنے بھاری تھے کہ وہ آپؐ کے جسم اور دل و دماغ کی ساری طاقتیں اور آپؐ کے اوقات کا ایک ایک لمحہ سونتے ڈال رہے تھے اور آپؐ اپنی معاش کے لیے ذرّہ برابر بھی کوئی فکر یا کوشش نہ کر سکتے تھے۔ ان حالات میں جب آپؐ کی ازواجِ مطہّراتؓ خرچ کی تنگی کے باعث آپؐ کے سکونِ طبع میں خلل انداز ہوتی تھیں تو اس سے آپؐ کے ذہن پر دُہرا بار پڑ جاتا تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے آپؐ کی چار بیویاں موجود تھیں۔ حضرت سَودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حَفصہؓ اور حضرت اُمّ سَلَمہؓ۔ اُمّ المومنین حضرت زینبؓ آپؐ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر مخالفین نے یہ اعتراض اٹھایا، اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس سے شبہات اُبھرنے لگے کہ دوسروں

کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ٹھیرا دیا گیا ہے، مگر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پانچویں بیوی کیسے کر لی۔

موضوع اور مباحث یہ مسائل تھے جو سورۂ اَحزاب کے نزول کے زمانے میں پیش آئے تھے اور انھی پر اس سورہ میں کلام فرمایا گیا ہے۔

اس کے مضامین پر غور کرنے، اور پَس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری سورت ایک خطبہ نہیں ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہو، بلکہ یہ متعدد احکام و فرامین اور خطبات پر مشتمل ہے جو اُس زمانے کے اہم واقعات کے سلسلے میں یکے بعد دیگرے نازل ہوئے اور پھر یک جا جمع کر کے ایک سورت کی شکل میں مرتّب کر دیے گئے۔ اس کے حسبِ ذیل اجزا صاف طور پر مُمَیّز نظر آتے ہیں:

۱- پہلا رُکوع غزوۂ احزاب سے کچھ پہلے کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی پَس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس رکوع کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس ضرورت کو محسوس فرما رہے تھے کہ مُتَبَنّٰی کے بارے میں جاہلیّت کے تصوُّرات اور اَوہام و رُسوم کو مٹایا جائے، اور آپؐ کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ منہ بولے رشتوں کے معاملے میں محض جذباتی بنیادوں پر جس قسم کے نازک اور گہرے تصوُّرات رکھتے ہیں وہ اس وقت تک ہرگز نہ مٹ سکیں گے جب تک آپؐ خود آگے بڑھ کر اس رسم کو نہ توڑ دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپؐ اس بنا پر سخت مُترَدِّد تھے اور قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے کہ اگر اس موقع پر آپؐ نے حضرت زیدؓ کی مُطلّقہ بیوی سے نکاح کیا تو اسلام کے خلاف ہنگامہ اُٹھانے کے لیے منافقین اور یہود اور مشرکین کو، جو پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں، ایک زبردست شوشہ ہاتھ آ جائے گا۔ اس موقع پر رکوعِ اوّل کی آیات نازل ہوئیں۔

۲- رُکوع دوم و سوم میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قُرَیظہ پر تبصرہ فرمایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی کُھلی علامت ہے کہ یہ دونوں رکوع ان لڑائیوں کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

۳- چوتھے رُکوع کے آغاز سے آیت ۳۵ تک کی تقریر دو مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو، جو اس تنگی وعُسرت کے زمانے میں بے صبر ہو رہی تھیں، اللہ تعالیٰ نے نوٹس دیا ہے کہ دنیا اور اس کی زینت، اور خدا و رسول اور آخرت میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لو۔ اگر تمھیں پہلی چیز مطلوب ہے تو صاف کہہ دو، تمھیں ایک دن کے لیے بھی اس تنگی میں مبتلا نہ رکھا جائے گا بلکہ بخوشی رخصت کر دیا جائے گا۔ اور اگر دوسری چیز پسند ہے تو صبر کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ساتھ دو۔ دوسرے حصّے میں اُس معاشرتی اصلاح کی طرف پہلا قدم اُٹھایا گیا جس کی ضرورت اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ذہن اب خود محسوس کرنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں اصلاح کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے کرتے ہوئے ازواجِ مطہراتؓ کو حکم دیا گیا کہ تبرُّجِ جاہلیّت سے پرہیز کریں، وَقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور غیر مردوں کے ساتھ بات چیت

کرنے میں سخت احتیاط ملحوظ رکھیں۔ یہ پردے کے احکام کا آغاز تھا۔

۴- آیت ۳۶ سے ۴۸ تک کا مضمون حضرت زینبؓ کے ساتھ حضورؐ کے نکاح کے سلسلے میں ہے۔اس میں اُن تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو مخالفین کی طرف سے اس نکاح پر کیے جا رہے تھے، اُن تمام شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی، مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ حضورؐ کا مرتبہ ومَقام کیا ہے، اور خود حضورؐ کو کفار ومنافقین کے جھوٹے پروپیگنڈے پر صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

۵- آیت ۴۹ میں طلاق کے قانون کی ایک دفعہ بیان ہوئی ہے۔ یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالباً انھی واقعات کے سلسلے میں کسی موقع پر نازل ہوئی تھی۔

۶- آیت ۵۰-۵۲ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کا خاص ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔اس میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ حضورؐ ان متعدّد پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں جو ازدواجی زندگی کے معاملے میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں۔

۷- آیت ۵۳-۵۵ میں معاشرتی اصلاح کا دوسرا قدم اٹھایا گیا۔ یہ حسبِ ذیل احکام پر مشتمل ہے:
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں غیر مردوں کی آمد ورفت پر پابندی، ملاقات اور دعوت کا ضابطہ، اَزواجِ مطہّراتؓ کے بارے میں یہ قانون کہ گھروں میں صرف ان کے قریبی رشتہ دار آ سکتے ہیں، باقی رہے غیر مرد، تو انھیں اگر کوئی بات کہنی ہو یا کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے کہیں یا مانگیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارے میں یہ حکم کہ وہ مسلمانوں کے لیے ماں کی طرح حرام ہیں اور حضورؐ کے بعد بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

۸- آیت ۵۶-۵۷ میں اُن چہ میگوئیوں پر سخت تنبیہ کی گئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح اور آپؐ کی خانگی زندگی پر کی جا رہی تھیں اور اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ دشمنوں کی اس عیب چینی سے اپنے دامن بچائیں اور اپنے نبیؐ پر درود بھیجیں۔ نیز یہ تلقین بھی کی گئی ہے کہ نبیؐ تو درکنار، اہلِ ایمان کو تو عام مسلمانوں پر بھی تہمتیں لگانے اور الزامات عائد کرنے سے کُلّی اجتناب کرنا چاہیے۔

۹- آیت ۵۹ میں معاشرتی اصلاح کا تیسرا قدم اٹھایا گیا ہے۔اس میں تمام مسلمان عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ جب گھروں سے باہر نکلیں تو چادروں سے اپنے آپ کو ڈھانک کر اور گھونگٹ ڈال کر نکلیں۔

اس کے بعد آخر سورت تک افواہ بازی کی اس مہم (Whispering Campaign) پر سخت زَجْر و تَوبیخ کی گئی ہے جو منافقین اور سُفَہا واَرازِل نے اُس وقت برپا کر رکھی تھی۔

آیاتہا ۷۳ رکوعاتہا ۹

سُوْرَۃُ الْاَحْزَابِ مَدَنِیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَ لَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ
عَلِیْمًا حَکِیْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّ تَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ﴿۳﴾

اَے نبیؐ[1]! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے[2]۔ پیروی کرو اُس بات کی جس کا اشارہ تمھارے رب کی طرف سے تمھیں کیا جا رہا ہے، اللہ ہر اُس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو[3]۔ اللہ پر توکّل کرو، اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے[4]۔

۱ – جیسا کہ ہم اس سورہ کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی یہ محسوس فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا اشارہ بھی یہی تھا کہ منہ بولے رشتوں کے معاملے میں جاہلیّت کے رُسوم و اَوہام پر ضرب لگانے کا یہ ٹھیک موقع ہے، اب آپؐ کو خود آگے بڑھ کر اپنے منہ بولے بیٹے (زیدؓ) کی مُطلّقہ سے نکاح کر لینا چاہیے تاکہ یہ رسم قطعی طور پر ٹوٹ جائے۔ لیکن جس وجہ سے حضورؐ اس معاملے میں قدم اُٹھاتے ہوئے جھجک رہے تھے وہ یہ خوف تھا کہ اس سے کفار و منافقین کو، جو پہلے ہی آپؐ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے، آپؐ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے ایک زبردست ہتھیار مل جائے گا۔ یہ خوف کچھ اپنی بدنامی کے اندیشے سے نہ تھا، بلکہ اس بنا پر تھا کہ اس سے اسلام کو زک پہنچے گی، دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متأثّر ہو کر بہت سے لوگ جو اسلام کی طرف میلان رکھتے ہیں بدگمان ہو جائیں گے، بہت سے غیر جانب دار لوگ دشمنوں میں شامل ہو جائیں گے، اور خود مسلمانوں میں سے کمزور عقل و ذہن کے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے حضورؐ یہ خیال کرتے تھے کہ جاہلیّت کی ایک رسم کو توڑنے کی خاطر ایسا قدم اٹھانا خلافِ مصلحت ہے جس سے اسلام کے عظیم تر مقاصد کو نقصان پہنچ جائے۔

۲ – تقریر کا آغاز کرتے ہوئے پہلے ہی فقرے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اِن اندیشوں کو رفع فرما دیا۔ ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ہمارے دین کی مَصلَحت کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں ہے، اس کو ہم زیادہ جانتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ کس وقت کیا کام کرنا چاہیے اور کون سا کام خلافِ مصلحت ہے۔ لہٰذا تم وہ طرزِ عمل اختیار نہ کرو جو کفار و منافقین کی مرضی کے مطابق ہو، بلکہ وہ کام کرو جو ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ ڈرنے کے لائق ہم ہیں نہ کہ کفار و منافقین۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي

اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دِل نہیں رکھے ہیں[۵]، نہ اس نے تم لوگوں کی اُن بیویوں کو جن سے تم ظِہار کرتے ہو تمھاری ماں بنا دیا ہے[۶]، اور نہ اس نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا حقیقی بیٹا بنایا ہے[۷]۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی برحقیقت ہے، اور وہی صحیح

۳- اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے اور مسلمانوں سے بھی اور مخالفینِ اسلام سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نبی اگر اللہ کے حکم پر عمل کر کے بدنامی کا خطرہ مول لے گا اور اپنی عزت پر دشمنوں کے حملے صبر کے ساتھ برداشت کرے گا تو اللہ سے اس کی یہ وفادارانہ خدمت چھُپی نہ رہے گی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ نبیؐ کی عقیدت میں ثابت قدم رہیں گے اور جو شکوک وشبہات میں مبتلا ہوں گے، دونوں ہی کا حال اللہ سے مخفی نہ رہے گا۔ اور کفار و منافقین اس کو بدنام کرنے کے لیے جو دَوڑ دھوپ کریں گے اس سے بھی اللہ بے خبر نہ رہے گا۔ لہٰذا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے جس جزا یا سزا کا مستحق ہوگا، وہ اسے مل کر رہے گی۔

۴- اس فقرے کے مخاطَب پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضوؐر کو ہدایت فرمائی جارہی ہے کہ جو فرض تم پر عائد کیا گیا ہے اسے اللہ کے بھروسے پر انجام دو اور دنیا بھر بھی اگر مخالف ہو تو اس کی پروانہ کرو۔ جب آدمی کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ فُلاں حکم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو پھر اسے بالکل مطمئن ہو جانا چاہیے کہ ساری خیر اور مَصلَحت اسی حکم کی تعمیل میں ہے۔ اس کے بعد حکمت و مصلحت دیکھنا اس شخص کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ اسے اللہ کے اعتماد پر صرف تعمیلِ ارشاد کرنی چاہیے۔ اللہ اس کے لیے بالکل کافی ہے کہ بندہ اپنے معاملات اُس کے سُپرد کر دے۔ وہ رہنمائی کے لیے بھی کافی ہے اور مدد کے لیے بھی، اور وہی اِس امر کا ضامن بھی ہے کہ اس کی رہنمائی میں کام کرنے والا آدمی کبھی نتائجِ بد سے دوچار نہ ہو۔

۵- یعنی ایک آدمی بیک وقت مومن اور منافق، سچا اور جھوٹا، بدکار اور نیکوکار نہیں ہوسکتا۔ اس کے سینے میں دو دل نہیں ہیں کہ ایک دل میں اخلاص ہو اور دوسرے میں خدا سے بے خوفی۔ لہٰذا ایک وقت میں آدمی کی ایک ہی حیثیت ہوسکتی ہے۔ یا تو وہ مومن ہوگا یا منافق۔ یا تو وہ کافر ہوگا یا مُسلم۔ اب اگر تم کسی مومن کو منافق کہہ دو یا منافق کو مومن، تو اس سے حقیقتِ نفس الامری نہ بدل جائے گی۔ اس شخص کی اصل حیثیت لازماً ایک ہی رہے گی۔

۶- "ظِہار" عرب کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ قدیم زمانے میں عرب کے لوگ بیوی سے لڑتے ہوئے کبھی یہ کہہ بیٹھتے تھے کہ "تیری پیٹھ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے۔" اور یہ بات جب کسی کے منہ سے نکل جاتی تھی تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب یہ عورت

السَّبِيلَ ۞ اُدْعُوهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ
تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ

طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ مُنصفانہ بات ہے[8]۔ اور اگر تمھیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں[9]۔ نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے، لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو[10]۔

اس پر حرام ہوگئی ہے کیونکہ وہ اسے ماں سے تشبیہ دے چکا ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کے ساتھ تشبیہ دے دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں تو وہی ہے جس نے آدمی کو جنا ہے۔ محض زبان سے ماں کہہ دینا حقیقت کو نہیں بدل دیتا کہ جو بیوی تھی وہ تمھارے کہنے سے ماں بن جائے۔ (یہاں ظِہار کے متعلق شریعت کا قانون بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس کا قانون سورۂ مجادلہ، آیات ۲-۴ میں بیان کیا گیا ہے۔)

۷ – یہ اصل مقصودِ کلام ہے۔ اُوپر کے دونوں فقرے اسی تیسری بات کو ذہن نشین کرنے کے لیے بطورِ دلیل ارشاد ہوئے تھے۔

۸ – اس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے جو اصلاح نافذ کی گئی وہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے کے بجائے ان کے حقیقی باپ کی نسبت سے زیدؓ بن حارثہ کہنا شروع کر دیا گیا۔ بخاری، مسلم، ترمِذی اور نَسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زیدؓ بن حارثہ کو پہلے سب لوگ زیدؓ بن محمدؐ کہتے تھے۔ یہ آیت نازل ہونے کے بعد انھیں زیدؓ بن حارِثہ کہنے لگے۔ مزید برآں اس آیت کے نُزول کے بعد یہ بات حرام قرار دے دی گئی کہ کوئی شخص اپنے حقیقی باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا نسب منسوب کرے۔ بخاری و مسلم اور ابوداؤد نے حضرت سَعدؓ بن ابی وَقّاص کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من ادعٰی الٰی غیر ابیہ وھو یعلم انہ غیر ابیہ فالجنۃ علیہ حرام۔ ''جس نے اپنے آپ کو باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا، درآنحالے کہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے، اس پر جنت حرام ہے۔'' اسی مضمون کی دوسری رِوایات بھی احادیث میں ملتی ہیں جن میں اس فعل کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

۹ – یعنی اس صورت میں بھی یہ درست نہ ہوگا کہ کسی شخص سے خواہ مخواہ اس کا نسب ملایا جائے۔

۱۰ – مطلب یہ ہے کہ کسی کو پیار سے بیٹا کہہ دینے میں کوئی مُضایقہ نہیں ہے۔ اسی طرح ماں، بیٹی، بہن، بھائی وغیرہ الفاظ بھی اگر کسی کے لیے محض اخلاقاً استعمال کر لیے جائیں تو کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اس ارادے سے یہ بات کہنا کہ جسے بیٹا یا بیٹی وغیرہ کہا جائے اس کو واقعی وہی حیثیت دے دی جائے جو ان رشتوں کی ہے، اور اس کے لیے وہی حقوق ہوں جو اِن رشتہ

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥﴾ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّاۤ

اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم [11] ہے۔

بلاشُبہ نبی تو اہلِ ایمان کے لیے اُن کی اپنی ذات پر مقدّم [12] ہے، اور نبی کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں [13]، مگر کتاب اللہ کی رُو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ

داروں کے ہیں، اور اس کے ساتھ ویسے ہی تعلقات ہوں جیسے ان رشتہ داروں کے ساتھ ہوتے ہیں، یہ یقیناً قابلِ اعتراض ہے اور اس پر گرفت ہوگی۔

۱۱ – اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ پہلے اس سلسلے میں جو غَلَطیاں کی گئی ہیں ان کو اللہ نے معاف کیا۔ ان پر اب کوئی باز پُرس نہ ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نادانستہ افعال پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ اگر بلا ارادہ کوئی ایسی بات کی جائے جس کی ظاہری صورت ایک ممنوع فعل کی سی ہو، مگر اس میں درحقیقت اس ممنوع فعل کی نیت نہ ہو، تو محض فعل کی ظاہری شکل پر اللہ تعالیٰ سزا نہ دے ڈالے گا۔

۱۲ – یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں سے اور مسلمانوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق ہے وہ تو تمام دوسرے انسانی تعلقات سے ایک بالاتر نوعیت رکھتا ہے۔ کوئی رشتہ اُس رشتے سے اور کوئی تعلق اُس تعلق سے جو نبی اور اہلِ ایمان کے درمیان ہے، ذرّہ برابر بھی کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے ان کے ماں باپ سے بھی بڑھ کر شفیق و رحیم اور ان کی اپنی ذات سے بھی بڑھ کر خیر خواہ ہیں۔ اُن کے ماں باپ اور ان کے بیوی بچے ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، ان کے ساتھ خود غرضی برت سکتے ہیں، ان کو گمراہ کر سکتے ہیں، ان سے غلطیوں کا ارتکاب کرا سکتے ہیں، ان کو جہنّم میں دھکیل سکتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے حق میں صرف وہی بات کرنے والے ہیں جس میں اُن کی حقیقی فلاح ہو۔ وہ خود اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی مار سکتے ہیں، حماقتیں کر کے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر سکتے ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے لیے وہی کچھ تجویز کریں گے جو فی الواقع ان کے حق میں نافع ہو۔ اور جب معاملہ یہ ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مسلمانوں پر یہ حق ہے کہ وہ آپؐ کو اپنے ماں باپ اور اولاد اور اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھیں، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ آپؐ سے محبّت رکھیں، اپنی رائے پر آپؐ کی رائے کو اور اپنے فیصلے پر آپؐ کے فیصلے کو مُقدّم رکھیں، اور آپؐ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے جسے بخاری و مسلم وغیرہ نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے کہ لا یؤمن احدُکم حتّٰی اکونَ احبَّ الیہ من والدہ وولدہ والنّاس اجمعین۔ ”تم میں سے کوئی

کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اُس کو اس کے باپ اور اولاد سے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوں۔"

۱۳ – اسی خصوصیّت کی بنا پر جو اُوپر مذکور ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیّت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی منہ بولی مائیں تو کسی معنیٰ میں بھی ان کی ماں نہیں ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اُسی طرح اُن کے لیے حرام ہیں جس طرح ان کی حقیقی مائیں حرام ہیں۔ یہ مخصوص معاملہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا میں اور کسی انسان کے ساتھ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اِس معنیٰ میں اُمَّہاتِ مومنین ہیں کہ ان کی تعظیم وتکریم مسلمانوں پر واجب ہے اور ان کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا تھا۔ باقی دوسرے احکام میں وہ ماں کی طرح نہیں ہیں۔ مثلاً ان کے حقیقی رشتہ داروں کے سوا باقی سب مسلمان اُن کے لیے غیر مَحْرَم تھے جن سے پردہ واجب تھا۔ ان کی صاحبزادیاں مسلمانوں کے لیے ماں جائی بہنیں نہ تھیں کہ ان سے بھی مسلمانوں کا نکاح ممنوع ہوتا۔ اُن کے بھائی بہن مسلمانوں کے لیے خالہ اور ماموں کے حکم میں نہ تھے۔ ان سے کسی غیر رشتہ دار مسلمان کو وہ میراث نہیں پہنچتی تھی جو ایک شخص کو اپنی ماں سے پہنچتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے یہ مرتبہ تمام ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جن میں لامحالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں۔ لیکن ایک گروہ نے جب حضرت علی وفاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد کو مرکزِ دین بنا کر سارا نظامِ دین انھی کے گرد گھما دیا، اور اس بنا پر دوسرے بہت سے صحابہؓ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کو بھی ہدف لعن و طعن بنایا، تو ان کی راہ میں قرآنِ مجید کی یہ آیت حائل ہوگئی جس کی رُو سے ہر اُس شخص کو انھیں اپنی ماں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایمان کا مدّعی ہو۔ آخرِ کار اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ عجیب وغریب دعویٰ کیا گیا کہ حُضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ میں سے جس کو چاہیں آپؐ کی زوجیّت پر باقی رکھیں اور جسے چاہیں آپؐ کی طرف سے طلاق دے دیں۔ ابو منصور احمد بن ابو طالب طَبْرِسی نے کتاب الاحتجاج میں یہ بات لکھی ہے اور سلیمان بن عبداللہ البحرانی نے اسے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: یا ابا الحَسَنَ انّ ھٰذا الشرف باقٍ ما دُمنا علٰی طاعة اللّٰه تعالٰی فایّتھن عصت اللّٰه تعالٰی بعدی بالخروج علیك فطلّقھا من الازواج واسقطھا من شرف امّھات المؤمنین (اے ابوالحسن! یہ شرف تو اسی وقت تک باقی ہے جب تک ہم لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں۔ لہٰذا میری بیویوں میں سے جو بھی میرے بعد تیرے خلاف خروج کر کے اللہ کی نافرمانی کرے اسے تُو طلاق دے دیجیو اور اس کو اُمّہات المومنین کے شرف سے ساقط کر دیجیو۔)

اُصولِ رِوایت کے اعتبار سے تو یہ روایت سراسر بے اصل ہے ہی، لیکن اگر آدمی اسی سورۂ احزاب کی آیات ۲۸-۲۹ اور ۵۱-۵۲ پر غور کرے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے بھی خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ آیتِ تخییر کے بعد جن ازواجِ مطہّراتؓ نے ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رفاقت کو اپنے لیے پسند کیا تھا انھیں طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کو باقی نہ رہا تھا۔ اس مضمون کی تشریح آگے حاشیہ ۴۲ و ۹۳ میں ہم نے کر دی ہے۔

علاوہ بریں ایک غیر متعصب آدمی اگر محض عقل ہی سے کام لے کر اس روایت کے مضمون پر غور کرے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ انتہائی لَغو، اور رسولِ پاکؐ کے حق میں سخت توہین آمیز اِفترا ہے۔ رسول کا مقام تو بہت بالاتر و برتر ہے، ایک معمولی شریف آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی وفات کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا اور دنیا سے رخصت

اَنۡ تَفۡعَلُوۡۤا اِلٰۤى اَوۡلِيٰٓئِكُمۡ مَّعۡرُوۡفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الۡكِتٰبِ
مَسۡطُوۡرًا ۝۶ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ
نُّوۡحٍ وَّاِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ ۖ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ
مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ۝۷ لِّيَسۡـئَلَ الصّٰدِقِيۡنَ عَنۡ صِدۡقِهِمۡ ۚ وَاَعَدَّ

اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کرسکتے ہو۔[۱۴] یہ حکم کتابِ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔

اور (اے نبیؐ!) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابنِ مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں[۱۵]۔ تاکہ سچے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے[۱۶]، اور کافروں کے لیے

وقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو تو میری طرف سے تو اسے طلاق دے دیجیو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل البیت کی محبّت کے مدّعی ہیں ان کے دلوں میں صاحب البیت کی عزت و ناموس کا پاس کتنا کچھ ہے، اور اس سے بھی گزر کر خود اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا وہ کتنا احترام کرتے ہیں۔

۱۴ – اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے، اُن کے ساتھ تو مسلمانوں کے تعلق کی نوعیّت سب سے الگ ہے۔ لیکن عام مسلمانوں کے درمیان آپس کے تعلقات اس اُصول پر قائم ہوں گے کہ رشتہ داروں کے حقوق ایک دوسرے پر عام لوگوں کی بہ نسبت مُقدّم ہیں۔ کوئی خیرات اس صورت میں صحیح نہیں ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ، بال بچوں، اور بھائی بہنوں کی ضروریات تو پوری نہ کرے اور باہر خیرات کرتا پھرے۔ زکوٰۃ سے بھی آدمی کو پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کی مدد کرنی ہوگی، پھر وہ دوسرے مستحقین کو دے گا۔ میراث لازماً ان لوگوں کو پہنچے گی جو رشتے میں آدمی سے قریب تر ہوں۔ دوسرے لوگوں کو اگر وہ چاہے تو ہِبہَ یا وقف یا وصیّت کے ذریعے سے اپنا مال دے سکتا ہے، مگر اس طرح نہیں کہ وارث محروم رہ جائیں اور سب کچھ دوسروں کو دے ڈالا جائے۔ اس حکمِ الٰہی سے وہ طریقہ بھی موقوف ہوگیا جو ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے سے شروع ہوا تھا، جس کی رُو سے محض دینی برادری کے تعلق کی بنا پر مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ وراثت تو رشتہ داری کی بنا پر ہی تقسیم ہوگی، البتہ ایک شخص ہدیے، تحفے یا وصیت کے ذریعے سے اپنے کسی دینی بھائی کی کوئی مدد کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

۱۵ – اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ تمام انبیاؑ کی طرح آپؐ سے بھی اللہ تعالیٰ ایک پُختہ عہد لے چکا ہے جس کی آپؐ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے؟ اوپر سے جو

سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی خود اطاعت کرے گا اور دوسروں سے کرائے گا، اللہ کی باتوں کو بے کم و کاست پہنچائے گا اور انھیں عملاً نافذ کرنے کی سعی و جُہد میں کوئی دریغ نہ کرے گا۔ قرآنِ مجید میں اس عہد کا ذکر متعدّد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (الشوریٰ، آیت ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمھارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوحؑ کو، اور جس کی وحی کی گئی (اے محمدؐ!) تمھاری طرف، اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو۔ اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں تفرقہ نہ کرو۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آلِ عمران، ۱۸۷)

اور یاد کرو اس بات کو کہ اللہ نے عہد لیا تھا اُن لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لوگ اس کی تعلیم کو بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ۔ (البقرہ، ۸۳)

اور یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ ...... خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الاعراف، آیات ۱۶۹-۱۷۱)

کیا اُن سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا؟...... مضبوطی کے ساتھ تھامو اُس چیز کو جو ہم نے تمھیں دی ہے اور یاد رکھو اس ہدایت کو جو اس میں ہے، توقع ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدہ، ۷)

اور اے مسلمانو! یاد رکھو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور اُس عہد کو جو اس نے تم سے لیا ہے جب کہ تم نے کہا: ''ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔''

اس عہد کو اس سِیاق و سَباق میں اللہ تعالیٰ جس وجہ سے یاد دلا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شَماتتِ اعدا کے اندیشے سے منہ بولے رشتوں کے معاملے میں جاہلیت کی رسم کو توڑتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ آپؐ کو بار بار یہ شرم لاحق ہو رہی تھی کہ معاملہ ایک خاتون سے شادی کرنے کا ہے۔ میں خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحِ معاشرہ کی خاطر یہ کام کروں، مگر دشمن یہی کہیں گے کہ یہ کام دراصل نفس پرستی کی خاطر کیا گیا ہے اور مُصلِح کا لَبادہ اس شخص نے محض فریب دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فرما رہا ہے کہ تم ہمارے مقرر کیے ہوئے پیغمبر ہو، تمام پیغمبروں کی طرح تم سے بھی ہمارا یہ پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی حکم ہم دیں گے اس کو خود بجا لاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہٰذا تم کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہ کرو، کسی سے شرم اور خوف نہ کرو، اور جو خدمت ہم تم سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تأمُّل انجام دو۔

ایک گروہ اس میثاق سے وہ میثاق مراد لیتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاؑ اور اُن کی اُمتوں سے

لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۸﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ
اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَآءَتۡكُمۡ جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا وَّجُنُوۡدًا
لَّمۡ تَرَوۡهَا‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرًا ۚ﴿۹﴾ اِذۡ جَآءُوۡكُمۡ

ع ۸ ۱۷

تو اس نے دردناک عذاب مہیّا کر ہی رکھا ہے۔[17] ع

اَے[18] لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔[19] اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔ جب وہ اُوپر سے

اس بات کے لیے لیا گیا تھا کہ وہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ اس تاویل کی بنیاد پر اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حضورؐ سے بھی یہ میثاق لیا گیا ہے کہ آپؐ کے بعد جو نبی آئے آپؐ کی اُمّت اس پر ایمان لائے گی۔ لیکن آیت کا سیاق وسباق صاف بتا رہا ہے کہ یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت آئی ہے اُس میں یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ آپؐ کے بعد بھی انبیاؑ آئیں گے اور آپؐ کی اُمت کو ان پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ مفہوم اس کا لیا جائے تو یہ آیت یہاں بالکل بے جوڑ اور بے محل ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں کوئی صراحت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہاں میثاق سے کون سا میثاق مراد ہے۔ لامحالہ اس کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم کو قرآنِ مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رُجوع کرنا ہوگا جہاں انبیاؑ سے لیے ہوئے مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر سارے قرآن میں صرف ایک ہی میثاق کا ذکر ہوتا اور وہ بعد کے آنے والے انبیاؑ پر ایمان لانے کے بارے میں ہوتا تو یہ خیال کرنا درست ہوتا کہ یہاں بھی میثاق سے مراد وہی میثاق ہے۔ لیکن قرآنِ پاک کو جس شخص نے بھی آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے میثاقوں کا ذکر ہے جو انبیا علیہم السلام اور ان کی امتوں سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا اُن مختلف مواثیق میں سے وہ میثاق یہاں مراد لینا صحیح ہوگا جو اس سیاق وسباق سے مناسبت رکھتا ہو، نہ کہ وہ میثاق جس کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ ہو۔ اسی طرح کی غلط تاویلوں سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ بعض لوگ قرآن سے ہدایت لینے نہیں بیٹھتے بلکہ اُسے ہدایت دینے بیٹھ جاتے ہیں۔

۱۶ — یعنی اللہ تعالیٰ محض عہد لے کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس عہد کے بارے میں وہ سوال کرنے والا ہے کہ اس کی کہاں تک پابندی کی گئی۔ پھر جن لوگوں نے سچائی کے ساتھ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو وفا کیا ہوگا، وہی صادق العہد قرار پائیں گے۔

۱۷ — اِس رُکوع کے مضمون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اسی سورہ کی آیات ۳۶-۴۱ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔

۱۸ — یہاں سے رکوع ۳ کے آخر تک کی آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی قُرَیظہ سے

مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ
الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ
الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱ وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ
الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲ وَ
اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ

اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے [20]۔ جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے مُنہ کو آ گئے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بُری طرح ہلا مارے گئے [21]۔

یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے [22] وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب اُن میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے لوگو! تمھارے لیے اب ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو [23]"

فارغ ہو چکے تھے۔ ان دونوں رُکوعوں میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قُریظہ کے واقعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت ان دونوں غزوات کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہییں جو ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں۔

۱۹ – یہ آندھی اُسی وقت نہیں آ گئی تھی جب کہ دشمنوں کے لشکر مدینے پر چڑھ کر آئے تھے بلکہ اُس وقت آئی تھی جب محاصرے کو تقریباً ایک مہینا گزر چکا تھا۔ نظر نہ آنے والی "فوجوں" سے مراد وہ مخفی طاقتیں ہیں جو انسانی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کام کرتی رہتی ہیں اور انسانوں کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی۔ انسان واقعات وحوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر غیر محسوس طور پر جو قوتیں کام کرتی ہیں وہ اس کے حساب میں نہیں آتیں، حالانکہ اکثر حالات میں انھی مخفی طاقتوں کی کار فرمائی فیصلہ کُن ثابت ہوتی ہے۔ یہ طاقتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اس لیے "فوجوں" سے مراد فرشتے بھی لیے جا سکتے ہیں، اگرچہ یہاں فرشتوں کی فوجیں بھیجنے کی صراحت نہیں ہے۔

۲۰ – اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طرف سے چڑھ آئے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نجد اور خیبر سے چڑھ کر آنے والے اُوپر سے آئے، اور مکۂ معظّمہ کی طرف سے آنے والے نیچے سے آئے۔

۲۱ – ایمان لانے والوں سے مراد یہاں وہ سب لوگ ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مان کر اپنے آپ کو

وَ یَسۡتَاۡذِنُ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمُ النَّبِیَّ یَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ بُیُوۡتَنَا عَوۡرَۃٌ ؕۛ وَ مَا ۱۰ مع
ہِیَ بِعَوۡرَۃٍ ۚۛ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَ لَوۡ دُخِلَتۡ عَلَیۡہِمۡ
مِّنۡ اَقۡطَارِہَا ثُمَّ سُئِلُوا الۡفِتۡنَۃَ لَاٰتَوۡہَا وَ مَا تَلَبَّثُوۡا

جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں"[۲۴] حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے،[۲۵] دراصل وہ (محاذِ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اُس وقت اِنھیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی[۲۶] تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انھیں شریکِ فتنہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں میں شامل کیا تھا، جن میں سچّے اہلِ ایمان بھی شامل تھے اور منافقین بھی۔ اس پیراگراف میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے گروہ کا مجموعی طور پر ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد کے تین پیراگرافوں میں منافقین کی روش پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پھر آخر کے دو پیراگراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنینِ صادقین کے بارے میں ہیں۔

۲۲ – یعنی اس امر کے وعدے کہ اہلِ ایمان کو اللہ کی تائید ونصرت حاصل ہوگی اور آخر کار غلبہ اُنھی کو بخشا جائے گا۔

۲۳ – اس فقرے کے دو مطلب ہیں: ظاہری مطلب یہ ہے کہ خندق کے سامنے کفّار کے مقابلے پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، شہر کی طرف پلٹ چلو۔ اور باطنی مطلب یہ ہے کہ اسلام پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، اب اپنے آبائی مذہب کی طرف پلٹ جانا چاہیے تاکہ سارے عرب کی دشمنی مول لے کر ہم نے جس خطرے میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے اُس سے بچ جائیں۔ منافقین اپنی زبان سے اس طرح کی باتیں اس لیے کہتے تھے کہ جو ان کے دام میں آ سکتا ہو اس کو تو اپنا باطنی مطلب سمجھا دیں، لیکن جو ان کی بات سُن کر چوکنّا ہو اور اس پر گرفت کرے اس کے سامنے اپنے ظاہر الفاظ کی آڑ لے کر گرفت سے بچ جائیں۔

۲۴ – یعنی جب بنو قُرَیظہ بھی حملہ آوروں کے ساتھ مل گئے تو ان منافقین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر سے نکل بھاگنے کے لیے ایک اچھا بہانہ ہاتھ آ گیا اور انھوں نے یہ کہہ کر رخصت طلب کرنی شروع کی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں، لہٰذا ہمیں جا کر اپنے بال بچوں کی حفاظت کرنے کا موقع دیا جائے۔ حالانکہ اُس وقت سارے اہلِ مدینہ کی حفاظت کے ذمہ دار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بنی قُرَیظہ کی بدعہدی سے جو خطرہ بھی پیدا ہوا تھا، اُس سے شہر اور اس کے باشندوں کو بچانے کی تدبیر کرنا حضورؐ کا کام تھا نہ کہ فوج کے ایک ایک فرد کا۔

۲۵ – یعنی اس خطرے سے بچاؤ کا انتظام تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے۔ یہ انتظام بھی دفاع کی اُس مجموعی اسکیم ہی کا ایک حصّہ تھا جس پر سالارِ لشکر کی حیثیت سے حضورؐ عمل فرما رہے تھے۔ اس لیے کوئی فوری خطرہ اس وقت درپیش نہ تھا جس کی بنا پر ان کا یہ عذر کسی درجے میں بھی معقول ہوتا۔

۲۶ – یعنی اگر شہر میں داخل ہو کر فاتح کفّار اِن منافقین کو دعوت دیتے کہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ختم کر دو۔

بِهَآ اِلَّا يَسِيۡرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدۡ كَانُوۡا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنۡ قَبۡلُ لَا يُوَلُّوۡنَ
الۡاَدۡبَارَ ؕ وَكَانَ عَهۡدُ اللّٰهِ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۱۵﴾ قُلۡ لَّنۡ يَّنۡفَعَكُمُ الۡفِرَارُ
اِنۡ فَرَرۡتُمۡ مِّنَ الۡمَوۡتِ اَوِ الۡقَتۡلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۶﴾
قُلۡ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَعۡصِمُكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ اِنۡ اَرَادَ بِكُمۡ سُوۡٓءًا اَوۡ
اَرَادَ بِكُمۡ رَحۡمَةً ؕ وَلَا يَجِدُوۡنَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيۡرًا ﴿۱۷﴾ قَدۡ يَعۡلَمُ اللّٰهُ الۡمُعَوِّقِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَالۡقَآئِلِيۡنَ
لِاِخۡوَانِهِمۡ هَلُمَّ اِلَيۡنَا ۚ وَلَا يَاۡتُوۡنَ الۡبَاۡسَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ ﴿۱۸﴾

ہونے میں کوئی تأمُّل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پُرس تو ہونی ہی تھی۔[۲۷]

اَے نبیؐ! ان سے کہو: اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمھارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لُوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمھیں مل سکے گا۔[۲۸] اِن سے کہو: کون ہے جو تمھیں اللہ سے بچا سکتا ہو اگر وہ تمھیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے ہیں۔

اللہ تم میں سے اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (جنگ کے کام میں) رُکاوٹیں ڈالنے والے ہیں، جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہماری طرف"۔[۲۹] جو لڑائی میں حصّہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو، جو

۲۷ — یعنی جنگِ اُحُد کے موقع پر جو کمزوری انھوں نے دکھائی تھی اس کے بعد شرمندگی و ندامت کا اظہار کر کے ان لوگوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اب اگر آزمایش کا کوئی موقع پیش آیا تو ہم اپنے اس قصور کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو محض باتوں سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جو شخص بھی اُس سے کوئی عہد باندھتا ہے اس کے سامنے کوئی نہ کوئی آزمایش کا موقع وہ ضرور لے آتا ہے تاکہ اس کا جھوٹ سچ کُھل جائے۔ اس لیے وہ جنگِ اُحُد کے دو ہی سال بعد اُس سے بھی زیادہ بڑا خطرہ سامنے لے آیا اور اُس نے جانچ کر دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے کیسا کچھ سچّا عہد اُس سے کیا تھا۔

أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَإِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ
تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ
الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰٓئِكَ لَمْ
يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ⑲

تمھارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں۔[۳۰] خطرے کا وقت آجائے تو اس طرح دِیدے پھِرا پھِرا کر تمھاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو، مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لیے تمھارے اِستقبال کو آجاتے ہیں۔[۳۱] یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے، اسی لیے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیے۔[۳۲] اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔[۳۳] یہ

۲۸ – یعنی اِس فرار سے کچھ تمھاری عمر بڑھ نہیں جائے گی۔ اس کا نتیجہ بہرحال یہ نہیں ہوگا کہ تم قیامت تک جیو اور رُوئے زمین کی دولت پالو۔ بھاگ کر جیو گے بھی تو زیادہ سے زیادہ چند سال ہی جیو گے اور اُتنا ہی کچھ دنیا کی زندگی کا لطف اُٹھا سکو گے جتنا تمھارے لیے مقدّر ہے۔

۲۹ – یعنی چھوڑو اس پیغمبر کا ساتھ۔ کہاں دین و ایمان اور حق و صداقت کے چکّر میں پڑے ہو؟ اپنے آپ کو خطرات اور مصائب میں مبتلا کرنے کے بجائے وہی عافیت کوشی کی پالیسی اختیار کرو جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔

۳۰ – یعنی اپنی محنتیں، اپنے اوقات، اپنی فکر، اپنے مال، غَرَض کوئی چیز بھی وہ اُس راہ میں صَرف کرنے کے لیے بخوشی تیار نہیں ہیں جس میں مومنینِ صادقین اپنا سب کچھ جھونکے دے رہے ہیں۔ جان کھپانا اور خطرے انگیز کرنا تو بڑی چیز ہے، وہ کسی کام میں بھی کُھلے دل سے اہلِ ایمان کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔

۳۱ – لغت کے اعتبار سے اس آیت کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ لڑائی سے جب تم کامیاب پلٹتے ہو تو وہ بڑے تپاک سے تمھارا استقبال کرتے ہیں اور چرَب زبانی سے کام لے کر یہ دھونس جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی بڑے مومن ہیں اور ہم نے بھی اس کام کو فروغ دینے میں حصّہ لیا ہے، لہٰذا ہم بھی مالِ غنیمت کے حق دار ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر فتح نصیب ہوتی ہے تو مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر یہ لوگ زبان کی بڑی تیزی دکھاتے ہیں اور بڑھ بڑھ کر مطالبے کرتے ہیں کہ لاؤ ہمارا حصّہ، ہم نے بھی خدمات انجام دی ہیں، سب کچھ تم ہی لوگ نہ لُوٹ لے جاؤ۔

۳۲ – یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد جو نمازیں انھوں نے پڑھیں، جو روزے رکھے، جو زکوٰتیں دیں، اور بظاہر جو نیک کام بھی کیے ان سب کو اللہ تعالیٰ کالعَدَم قرار دے دے گا اور ان کا کوئی اجر انھیں نہ دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فیصلہ اعمال کی ظاہری

يَحۡسَبُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ لَمۡ يَذۡهَبُوۡا ۚ وَاِنۡ يَّاۡتِ الۡاَحۡزَابُ يَوَدُّوۡا لَوۡ
اَنَّهُمۡ بَادُوۡنَ فِى الۡاَعۡرَابِ يَسۡاَلُوۡنَ عَنۡ اَنۡۢبَآئِكُمۡ ‌ؕ وَلَوۡ كَانُوۡا فِيۡكُمۡ مَّا
قٰتَلُوۡۤا اِلَّا قَلِيۡلًا ۲۰ ع لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ

سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اُس موقع پر یہ کہیں صحرا میں بدّوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمھارے حالات پُوچھتے رہیں۔ تاہم اگر یہ تمھارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے۔ ع

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا،[۳۴] ہر اُس شخص کے لیے

شکل پر نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس ظاہر کی تہ میں ایمان اور خلوص ہے یا نہیں۔ جب یہ چیز سرے سے ان کے اندر موجود ہی نہیں ہے تو یہ دکھاوے کے اعمال سراسر بے معنٰی ہیں۔ اِس مقام پر یہ امر گہری توجہ کا طالب ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کا اقرار کرتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، زکوٰۃ بھی دیتے تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوسرے نیک کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے، ان کے بارے میں صاف صاف فیصلہ دے دیا گیا ہے کہ یہ سرے سے ایمان لائے ہی نہیں۔ اور یہ فیصلہ صرف اس بنیاد پر دیا گیا ہے کہ کفر اور اسلام کی کشمکش میں جب کڑی آزمائش کا وقت آیا تو انھوں نے دوغلے پن کا ثبوت دیا، دین کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دی اور اسلام کی حفاظت کے لیے جان، مال اور محنت صَرف کرنے میں دریغ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فیصلے کا اصل مدار یہ ظاہری اعمال نہیں ہیں، بلکہ یہ سوال ہے کہ آدمی کی وفاداریاں کس طرف ہیں۔ جہاں خدا اور اس کے دین سے وفاداری نہیں ہے، وہاں اقرارِ ایمان اور عبادات اور دوسری نیکیوں کی کوئی قیمت نہیں۔

۳۳۔ یعنی اِن کے اعمال کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتے کہ ان کو ضائع کر دینا اللہ کو گراں گزرے۔ اور یہ لوگ کوئی زور بھی نہیں رکھتے کہ ان کے اعمال کو ضائع کرنا اُس کے لیے دشوار ہو۔

۳۴۔ جس سیاق و سباق میں یہ آیت ارشاد ہوئی ہے اس کے لحاظ سے رسولِ پاکؐ کے طرزِ عمل کو اس جگہ نمونے کے طور پر پیش کرنے سے مقصود اُن لوگوں کو سبق دینا تھا جنھوں نے جنگِ احزاب کے موقع پر مفاد پرستی و عافیت کوشی سے کام لیا تھا۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم ایمان و اسلام اور اتباعِ رسولؐ کے مدّعی تھے۔ تم کو دیکھنا چاہیے تھا کہ جس رسول کے پیروؤں میں تم شامل ہوئے ہو اُس کا اس موقع پر کیا رَوِیّہ تھا۔ اگر کسی گروہ کا لیڈر خود عافیت کوش ہو، خود آرام طلب ہو، خود اپنے ذاتی مفاد کی حفاظت کو مقدّم رکھتا ہو، خطرے کے وقت خود بھاگ نکلنے کی تیاریاں کر رہا ہو، پھر تو اس کے پیروؤں کی طرف سے اِن کمزوریوں کا اظہار معقول ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ ہر مَشَقّت جس کا آپؐ نے دوسروں سے مطالبہ کیا، اسے برداشت کرنے میں آپؐ خود سب کے ساتھ شریک تھے، بلکہ دوسروں سے بڑھ کر ہی آپؐ نے حصہ لیا۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اُٹھائی ہو اور آپؐ نے

كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝٢١ وَ لَمَّا رَاَ
الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ
اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ۝٢٢ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔[۳۵] اور سچّے مومنوں (کا حال اُس وقت یہ تھا کہ[۳۶]) جب انھوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔"[۳۷] اس واقعے نے اُن کے ایمان اور ان کی سُپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔[۳۸] ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ

نہ اٹھائی ہو۔ خندق کھودنے والوں میں آپؐ خود شامل تھے۔ بھوک اور سردی کی تکلیفیں اٹھانے میں ایک ادنیٰ مسلمان کے ساتھ آپؐ کا حصّہ بالکل برابر کا تھا۔ محاصرے کے دَوران میں آپؐ ہر وقت محاذِ جنگ پر موجود رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی دشمن کے مقابلے سے نہ ہٹے۔ بنی قُرَیظَہ کی غدّاری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے بال بچّے مبتلا تھے اُسی میں آپؐ کے بال بچے بھی مبتلا تھے۔ آپؐ نے اپنی حفاظت اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کے لیے کوئی خاص اہتمام نہ کیا جو دوسرے مسلمانوں کے لیے نہ ہو۔ جس مقصدِ عظیم کے لیے آپؐ دوسروں سے قربانیوں کا مطالبہ کر رہے تھے اس پر سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر آپؐ خود اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے۔ اس لیے جو کوئی بھی آپؐ کے اتباع کا مدّعی تھا، اسے یہ نمونہ دیکھ کر اس کی پیروی کرنی چاہیے تھی۔

یہ تو موقع و محل کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم ہے۔ مگر اس کے الفاظ عام ہیں اور اس کے منشا کو صرف اسی معنیٰ تک محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ صرف اسی لحاظ سے اُس کے رسول کی زندگی مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے، بلکہ مطلقاً اسے نمونہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ہر معاملے میں آپؐ کی زندگی کو اپنے لیے نمونے کی زندگی سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و کردار کو ڈھالیں۔

۳۵- یعنی اللہ سے غافل آدمی کے لیے تو یہ زندگی نمونہ نہیں ہے مگر اس شخص کے لیے ضرور نمونہ ہے جو کبھی کبھار اتفاقاً خدا کا نام لے لینے والا نہیں بلکہ کثرت سے اس کو یاد کرنے اور یاد رکھنے والا ہو۔ اسی طرح یہ زندگی اُس شخص کے لیے تو نمونہ نہیں ہے جو اللہ سے کوئی اُمّید اور آخرت کے آنے کی کوئی توقع نہ رکھتا ہو مگر اُس شخص کے لیے ضرور نمونہ ہے جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا اُمیدوار ہو اور جسے یہ بھی خیال ہو کہ کوئی آخرت آنے والی ہے جہاں اس کی بھلائی کا سارا انحصار ہی اس پر ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کا رَوِیّہ رسولِ خداؐ کے رَوِیّے سے کس حد تک قریب تر رہا ہے۔

۳۶- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ صحابۂ کرامؓ کے طرزِ عمل کو نمونے کے طور پر پیش فرماتا ہے تا کہ ایمان کے جھوٹے مدعیوں اور سچّے دل سے رسول کی پیروی اختیار کرنے والوں کا کردار ایک دوسرے کے

مقابلے میں پوری طرح نمایاں کر دیا جائے۔ اگرچہ ظاہری اقرارِ ایمان میں وہ اور یہ یکساں تھے۔ مسلمانوں کے گروہ میں دونوں کا شمار ہوتا تھا اور نمازوں میں دونوں شریک ہوتے تھے۔ لیکن آزمایش کی گھڑی پیش آنے پر دونوں ایک دوسرے سے چھَٹ کر الگ ہو گئے اور صاف معلوم ہو گیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مخلص وفادار کون ہیں اور محض نام کے مسلمان کون۔

۳۷- اس موقع پر آیت نمبر ۱۲ کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ وہاں بتایا گیا تھا کہ جو لوگ منافق اور دل کے روگی تھے انھوں نے دس بارہ ہزار کے لشکر کو سامنے سے اور بنی قُرَیظہ کو پیچھے سے حملہ آور ہوتے دیکھا تو پکار پکار کر کہنے لگے کہ ''سارے وعدے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے کیے تھے محض جھوٹ اور فریب نکلے۔ کہا تو ہم سے یہ گیا تھا کہ دینِ خدا پر ایمان لاؤ گے تو خدا کی تائید تمھاری پشت پر ہوگی، عرب و عجم پر تمھارا سِکّہ رَواں ہوگا، اور قیصر و کِسریٰ کے خزانے تمھارے لیے کُھل جائیں گے۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ سارا عرب ہمیں مٹا دینے پر تُل گیا ہے اور کہیں سے فرشتوں کی وہ فوجیں آتی نظر نہیں آرہیں جو ہمیں اس سیلابِ بلا سے بچا لیں۔'' اب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے وعدوں کا ایک مطلب تو وہ تھا جو اُن جھوٹے مدّعیانِ ایمان نے سمجھا تھا۔ دوسرا مفہوم وہ ہے جو اِن صادق الایمان مسلمانوں نے سمجھا۔ خطرات اُمنڈتے دیکھ کر اللہ کے وعدے تو ان کو بھی یاد آئے، مگر یہ وعدے نہیں کہ ایمان لاتے ہی انگلی ہلائے بغیر تم دنیا کے فرماں روا ہو جاؤ گے اور فرشتے آ کر تمھاری تاج پوشی کی رسم ادا کریں گے، بلکہ یہ وعدے کہ سخت آزمایشوں سے تم کو گزرنا ہوگا، مصائب کے پہاڑ تم پر ٹوٹ پڑیں گے، گراں ترین قربانیاں تمھیں دینی ہوں گی، تب کہیں جا کر اللہ کی عنایات تم پر ہوں گی اور تمھیں دنیا اور آخرت کی وہ سرفرازیاں بخشی جائیں گی جن کا وعدہ اللہ نے اپنے مومن بندوں سے کیا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ (البقرہ: آیت ۲۱۴)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں بس یونہی داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی وہ حالات تو تم پر گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی پکار اُٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد ــــ سنو اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یہ کہنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور انھیں آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم نے اُن سب لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

۳۸- یعنی اس سیلابِ بلا کو دیکھ کر ان کے ایمان مُتزلزل ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئے، اور اللہ کی فرماں برداری سے بھاگ نکلنے کے بجائے وہ اور زیادہ یقین و اطمینان کے ساتھ اپنا سب کچھ اُس کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔

اس مَقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان و تسلیم دراصل نفس کی ایک ایسی کیفیت ہے جو دین کے ہر حکم اور ہر مطالبے پر امتحان میں پڑ جاتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں ہر ہر قدم پر آدمی کے سامنے وہ مواقع آتے ہیں جہاں دین یا تو کسی چیز کا حکم دیتا ہے، یا کسی چیز سے منع کرتا ہے، یا جان اور مال اور وقت اور محنت اور خواہشاتِ نفس کی قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایسے ہر موقع پر جو

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾ ۚ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ
يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا

موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچّا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔[۳۹] انھوں نے اپنے رَوِیّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ سچّوں کو اُن کی سچّائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے، اور چاہے تو اُن کی توبہ قبول کر لے، بے شک اللہ غَفُور و رحیم ہے۔

اللہ نے کفّار کا مُنہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یُونہی پلٹ گئے، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور

شخص اطاعت سے انحراف کرے گا اُس کے ایمان و تسلیم میں کمی واقع ہو گی، اور جو شخص بھی حکم کے آگے سر جھکا دے گا اس کے ایمان و تسلیم میں اضافہ ہو گا۔ اگرچہ ابتداءً آدمی صرف کلِمۂ اسلام کو قُبول کر لینے سے مومن و مسلم ہو جاتا ہے، لیکن یہ کوئی ساکن و جامد حالت نہیں ہے جو بس ایک ہی مقام پر ٹھیری رہتی ہو، بلکہ اس میں تنزُّل اور ارتقا دونوں کے امکانات ہیں۔ خلوص اور اطاعت میں کمی اس کے تنزُّل کی موجب ہوتی ہے، یہاں تک کہ ایک شخص پیچھے ہٹتے ہٹتے ایمان کی اس آخری سرحد پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے یک سرِ مُو بھی تجاوز کر جائے تو مومن کے بجائے منافق ہو جائے۔ اس کے برعکس خلوص جتنا زیادہ ہو، اطاعت جتنی مکمل ہو اور دینِ حق کی سربلندی کے لیے لگن اور دُھن جتنی بڑھتی چلی جائے، ایمان اُسی نسبت سے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی صدیقیت کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ کمی و بیشی جو کچھ بھی ہے اَخلاقی مراتب میں ہے جس کا حساب اللہ کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا۔ بندوں کے لیے ایمان بس ایک ہی اقرار و تصدیق ہے جس سے ہر مسلمان داخلِ اسلام ہوتا ہے اور جب تک اس پر قائم رہے، مسلمان مانا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ آدھا مسلمان ہے اور یہ پاؤ، یا یہ دوگُنا مسلمان ہے اور یہ تین گُنا۔ اسی طرح قانونی حُقوق میں سب مسلمان یکساں ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو ہم زیادہ مومن کہیں اور اس کے حقوق زیادہ ہوں، اور کسی کو کم مومن قرار دیں اور اس کے حقوق کم ہوں۔ اِن اعتبارات سے ایمان کی کمی و بیشی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور دراصل اسی معنیٰ میں امام ابو حنیفہؒ نے یہ فرمایا ہے کہ الایمان لایزید ولاینقص، ”ایمان کم و بیش نہیں ہوتا۔“ (مزید

عَزِيزًا ﴿٢٥﴾ وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ
وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿٢٦﴾
وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ
اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٧﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ
تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا
جَمِيلًا ﴿٢٨﴾ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ

ع ۳ ۱۹

زبردست ہے۔ پھر اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا،[۴۰] اللہ اُن کی گڑھیوں سے انھیں اُتار لایا اور اُن کے دلوں میں اُس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو۔ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمھیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ع

اے نبیؐ![۴۱] اپنی بیویوں سے کہو: اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ

تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۲، الانفال، حاشیہ ۲۔ جلد پنجم، الفتح، حاشیہ ۷)

۳۹- یعنی کوئی اللہ کی راہ میں جان دے چکا ہے اور کوئی اس کے لیے تیار ہے کہ وقت آئے تو اس کے دین کی خاطر اپنے خون کا نذرانہ پیش کر دے۔

۴۰- یعنی یہودِ بنی قُرَیظہ۔

۴۱- یہاں سے نمبر ۳۵ تک کی آیات جنگِ احزاب اور بنی قُرَیظہ سے مُتّصل زمانے میں نازل ہوئی تھیں۔ ان کا پَس منظر ہم دیباچے میں مختصراً بیان کر آئے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ اُس زمانے کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ آپؐ کی ازواج آپؐ کے گرد بیٹھی ہیں اور آپؐ خاموش ہیں۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا: ''هُنَّ كَمَا تَرٰى يَسْأَلْنَنِي النفقة، ''یہ میرے گرد بیٹھی ہیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ یہ مجھ سے خرچ کے لیے روپیا مانگ رہی ہیں۔'' اس پر دونوں صاحبوں نے اپنی اپنی بیٹیوں کو ڈانٹا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرتی ہو اور وہ چیز مانگتی ہو جو آپؐ کے پاس نہیں ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اس وقت کیسی مالی مشکلات میں مبتلا تھے اور کفر و اسلام کی

فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۲۹﴾

تم میں سے جو نیکوکار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔[۴۲]

انتہائی شدید کش مکش کے زمانے میں خرچ کے لیے ازواجِ مطہراتؓ کے تقاضے مزاجِ مبارک پر کیا اثر ڈال رہے تھے۔

۴۲ – اس آیت کے نُزول کے وقت حضورؐ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں: حضرت سَودَہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حَفصہ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ۔ ابھی حضرت زینبؓ سے حضورؐ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ (احکام القرآن لابنُ العَرَبی، طبع مصر ۱۹۵۸ء، جلد ۳، ص ۱۵۱۳–۱۵۱۲) جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی اور فرمایا: "میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، اپنے والدین کی رائے لو، پھر فیصلہ کرو۔" پھر حضورؐ نے ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آیا ہے، اور یہ آیت ان کو سنا دی۔ انھوں نے عرض کیا: "کیا اس معاملے کو میں اپنے والدین سے پوچھوں؟ میں تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو چاہتی ہوں۔" اس کے بعد حضورؐ باقی ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک ایک کے ہاں گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی، اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔ (مُسنَدِ احمد، مسلم، نَسائی)

اِصطِلاح میں اس کو تَخیِیر کہتے ہیں، یعنی بیوی کو اس امر کا اختیار دینا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے یا اس سے جدا ہو جانے کے درمیان کسی ایک چیز کا خود فیصلہ کر لے۔ یہ تَخیِیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حضورؐ کو حکم دیا تھا۔ اگر ازواجِ مطہراتؓ میں سے کوئی خاتون عَلیحدگی کا پہلو اختیار کرتیں تو آپ سے آپ جدا نہ ہو جاتیں بلکہ حضورؐ کے جدا کرنے سے ہوتیں، جیسا کہ آیت کے الفاظ "آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں" سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن حضورؐ پر یہ واجب تھا کہ اس صورت میں ان کو جدا کر دیتے، کیونکہ نبی کی حیثیت سے آپؐ کا یہ منصب نہ تھا کہ اپنا وعدہ پورا نہ فرماتے۔ جدا ہو جانے کے بعد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُمّہات المومنین کے زُمرے سے خارج ہو جاتیں اور ان سے کسی دوسرے مسلمان کا نکاح حرام نہ ہوتا، کیونکہ وہ دنیا اور اس کی زینت ہی کے لیے تو رسولِ پاکؐ سے عَلیحدگی اختیار کرتیں جس کا حق انھیں دیا گیا تھا، اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ مقصد نکاح سے محروم ہو جانے کی صورت میں پورا نہ ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف آیت کا منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن ازواج نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو پسند کر لیا انھیں طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کے لیے باقی نہ رہا، کیونکہ تَخیِیر کے دو ہی پہلو تھے: ایک، یہ کہ دنیا کو اختیار کرتی ہو تو تمھیں جدا کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو اختیار کرتی ہو تو تمھیں جدا نہ کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ ان میں سے جو پہلو بھی کوئی خاتون اختیار کرتیں، ان کے حق میں دوسرا پہلو آپ سے آپ ممنوع ہو جاتا تھا۔

اسلامی فِقہ میں تَخیِیر دراصل تفویضِ طلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی شوہر اس ذریعے سے بیوی کو اختیار دے دیتا ہے کہ چاہے تو اس کے نکاح میں رہے ورنہ الگ ہو جائے۔ اس مسئلے میں قرآن وسنت سے اِستِنباط کر کے فقہا نے جو احکام بیان کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) یہ اختیار ایک دفعہ عورت کو دے دینے کے بعد شوہر نہ تو اسے واپس لے سکتا ہے اور نہ عورت کو اُس کے استعمال سے روک سکتا ہے۔ البتہ عورت کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اس اختیار کو استعمال ہی کرے۔ وہ چاہے تو شوہر کے ساتھ رہنے پر رضامندی

ظاہر کر دے، چاہے علیحدگی کا اعلان کر دے، اور چاہے تو کسی چیز کا اظہار نہ کرے اور اس اختیار کو یونہی ضائع ہو جانے دے۔

(۲) اس اختیار کے عورت کی طرف منتقل ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ اوّل، یہ کہ شوہر نے یا تو اسے صریح الفاظ میں طلاق کا اختیار دیا ہو، یا اگر طلاق کی تصریح نہ کی ہو تو پھر اس کی نیت یہ اختیار دینے کی ہو۔ مثلاً اگر وہ کہے: "تجھے اختیار ہے"، یا "تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے"، تو اس طرح کے کِنایات میں شوہر کی نیت کے بغیر طلاق کا اختیار عورت کی طرف منتقل نہ ہوگا۔ اگر عورت اس کا دعویٰ کرے اور شوہر بحلف یہ بیان دے کہ اس کی نیت طلاق کا اختیار دینے کی نہ تھی تو شوہر کا بیان قبول کیا جائے گا۔ اِلّا یہ کہ عورت اس امر کی شہادت پیش کر دے کہ یہ الفاظ ناچاقی اور جھگڑے کی حالت میں، یا طلاق کی باتیں کرتے ہوئے کہے گئے تھے، کیونکہ اس سِیاق وسَباق میں اختیار دینے کے معنیٰ یہی سمجھے جائیں گے کہ شوہر کی نیت طلاق کا اختیار دینے کی تھی۔ دوم، یہ کہ عورت کو معلوم ہو کہ یہ اختیار اسے دیا گیا ہے۔ اگر وہ غائب ہو تو اُسے اس کی اطلاع ملنی چاہیے، اور اگر وہ موجود ہو تو اسے یہ الفاظ سننے چاہییں۔ جب تک وہ سنے نہیں، یا اسے اس کی خبر نہ پہنچے، اختیار اس کی طرف منتقل نہ ہوگا۔

(۳) اگر شوہر کسی وقت کی تعیین کے بغیر مُطلَقاً اس کو اختیار دے تو عورت اس اختیار کو کب تک استعمال کر سکتی ہے؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس نِشَست میں شوہر اس سے یہ بات کہے اُسی نِشَست میں عورت اپنا اختیار استعمال کر سکتی ہے۔ اگر وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے اُٹھ جائے، یا کسی ایسے کام میں مشغول ہو جائے جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ وہ جواب نہیں دینا چاہتی، تو اس کا اختیار باطل ہو جائے گا۔ یہ رائے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابنِ مسعودؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، جابر بن زید، عطاؒ، مجاہدؒ، شَعْبِیؒ، نَخَعِیؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام اَوزاعیؒ، سُفیان ثَوریؒ اور ابوثَورؒ کی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا اختیار اس نِشَست تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس کے بعد بھی اسے استعمال کر سکتی ہے۔ یہ رائے حضرت حَسَن بصریؒ، قَتادہؒ اور زُہریؒ کی ہے۔

(۴) اگر شوہر وقت کی تعیین کر دے، مثلاً کہے کہ ایک مہینے یا ایک سال تک تجھے اختیار ہے، یا اتنی مدت تک تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو یہ اختیار اسی مدّت تک اس کو حاصل رہے گا۔ البتہ اگر وہ کہے کہ تو جب چاہے اس اختیار کو استعمال کر سکتی ہے، تو اس صورت میں اس کا اختیار غیر محدود ہوگا۔

(۵) عورت اگر علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو اسے واضح اور قطعی الفاظ میں اس کا اظہار کرنا چاہیے۔ مبہم الفاظ جن سے مدّعا واضح نہ ہوتا ہو، مؤثّر نہیں ہو سکتے۔

(۶) قانوناً شوہر کی طرف سے عورت کو اختیار دینے کے تین صیغے ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ کہے "تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے۔" دوسرے، یہ کہ وہ کہے "تجھے اختیار ہے۔" تیسرے، یہ کہ وہ کہے "تجھے طلاق ہے اگر تُو چاہے۔" ان میں سے ہر ایک کے قانونی نتائج الگ الگ ہیں:

الف: "تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے" کے الفاظ اگر شوہر نے کہے ہوں اور عورت اس کے جواب میں کوئی صریح بات ایسی کہے جس سے ظاہر ہو کہ وہ علیحدگی اختیار کرتی ہے، تو حَنَفِیَّہ کے نزدیک ایک طلاق بائن پڑ جائے گی۔ (یعنی اس کے بعد شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا، لیکن عدّت گزر جانے پر یہ دونوں پھر چاہیں تو باہم نکاح کر سکتے ہیں۔) اور اگر شوہر نے کہا ہو کہ "ایک طلاق کی حد تک تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے" تو اس صورت میں ایک طلاق رَجعی پڑے گی۔ (یعنی عدّت کے اندر شوہر رجوع کر سکتا ہے۔) لیکن

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا
الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰
الجزء ۲۲ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ
اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝۳۱ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ
لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ

نبیؐ کی بیویو! تم میں سے جو کسی صریح فُحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دُہرا عذاب دیا جائے گا،[۴۳] اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے[۴۴]۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی، اس کو ہم دُہرا اجر دیں گے[۴۵] اور ہم نے اس کے لیے رزقِ کریم مہیّا کر رکھا ہے۔

نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو[۴۶]۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے

اگر شوہر نے معاملہ عورت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تین طلاق کی نیت کی ہو، یا اس کی تصریح کی ہو تو اس صورت میں عورت کا اختیارِ طلاق ہی کا ہم معنیٰ ہوگا، خواہ وہ بصراحت اپنے اُوپر تین طلاق وارد کرے یا صرف ایک بار کہے کہ میں نے عَلیٰحدگی اختیار کی یا اپنے آپ کو طلاق دی۔

ب: ”تجھے اختیار ہے“ کے الفاظ کے ساتھ اگر شوہر نے عورت کو علیٰحدگی کا اختیار دیا ہو اور عورت علیٰحدگی اختیار کرنے کی تصریح کر دے تو حَنفِیّہ کے نزدیک ایک ہی طلاق بائن پڑے گی خواہ شوہر کی نیت تین طلاق کا اختیار دینے کی ہو، البتہ اگر شوہر کی طرف سے تین طلاق کا اختیار دینے کی تصریح ہو، تب عورت کے اختیارِ طلاق سے تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر شوہر نے اختیار دیتے ہوئے طلاق کی نیت کی ہو اور عورت علیٰحدگی اختیار کرے تو ایک طلاق رَجعی واقع ہوگی۔ امام مالکؒ کے نزدیک مدخولہ بیوی پر تین طلاقیں پڑ جائیں گی لیکن اگر غیر مدخولہ کے معاملے میں شوہر ایک طلاق کی نیت کا دعویٰ کرے تو اسے قبول کر لیا جائے گا۔

ج: ”تجھے طلاق ہے اگر تُو چاہے“ کہنے کی صورت میں اگر عورت طلاق کا اختیار استعمال کرے تو طلاق رَجعی ہوگی نہ کہ بائن۔

(۷) اگر مرد کی طرف سے علیٰحدگی کا اختیار دیے جانے کے بعد عورت اسی کی بیوی بن کر رہنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دے تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ یہی رائے حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عائشہؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، ابنِ عباسؓ اور ابنِ عمرؓ

کی ہے، اور اسی رائے کو جُمہور فقہا نے اختیار کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مَسرُوقؒ نے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا: خیّر رسُول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نساءَہ فاخترنہ اکان ذٰلك طلاقاً؟ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو اختیار دیا تھا اور انھوں نے حضورؐ ہی کے ساتھ رہنا پسند کر لیا تھا، پھر کیا اسے طلاق شمار کیا گیا؟'' اس معاملے میں صرف حضرت علیؓ اور زیدؓ بن ثابت کی یہ رائے منقول ہوئی ہے کہ ایک طلاق رَجعی واقع ہو گی۔ لیکن دوسری رِوایت ان دونوں بزرگوں سے بھی یہی ہے کہ کوئی طلاق واقع نہ ہو گی۔

۴۳ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نعوذ باللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ سے کسی فُحش حرکت کا اندیشہ تھا۔ بلکہ اس سے مقصود حضورؐ کی ازواج کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسلامی معاشرے میں ان کا مقام جس قدر بلند ہے اسی کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت سخت ہیں، اس لیے ان کا اَخلاقی رَوِیّہ انتہائی پاکیزہ ہونا چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ''اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا۔'' (الزُّمَر، آیت ۶۵) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! حضورؐ سے شرک کا کوئی اندیشہ تھا، بلکہ اس سے مقصود حضورؐ کو اور آپؐ کے واسطے سے عام انسانوں کو یہ احساس دلانا تھا کہ شرک کتنا خطرناک جرم ہے جس سے سخت اِحتراز لازم ہے۔

۴۴ – یعنی تم اس بُھلاوے میں نہ رہنا کہ نبی کی بیویاں ہونا تمھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکتا ہے، یا تمھارے مرتبے کچھ ایسے بلند ہیں کہ اُن کی وجہ سے تمھیں پکڑنے میں اللہ کو کوئی دشواری پیش آ سکتی ہے۔

۴۵ – گناہ پر دُہرے عذاب اور نیکی پر دُہرے اجر کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ انسانی معاشرے میں کسی بلند مرتبے پر سرفراز فرماتا ہے وہ بالعُموم لوگوں کے رہنما بن جاتے ہیں اور بندگانِ خدا کی بڑی تعداد بھلائی اور برائی میں انھی کی پیروی کرتی ہے۔ ان کی برائی تنہا انھی کی برائی نہیں ہوتی بلکہ ایک قوم کے بگاڑ کی موجب بھی ہوتی ہے اور ان کی بھلائی صرف اُنھی کی انفرادی بھلائی نہیں ہوتی بلکہ بہت سے انسانوں کی فلاح کا سبب بھی بنتی ہے۔ اس لیے جب وہ بُرے کام کرتے ہیں تو اپنے بگاڑ کے ساتھ دوسروں کے بگاڑ کی بھی سزا پاتے ہیں۔ اور جب وہ نیک کام کرتے ہیں تو انھیں اپنی نیکی کے ساتھ اس بات کی جزا بھی ملتی ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بھلائی کی راہ دکھائی۔

اس آیت سے یہ اُصول بھی نکلتا ہے کہ جہاں جتنی زیادہ حرمت ہو گی اور جس قدر زیادہ امانت کی توقع ہو گی، وہاں اسی قدر زیادہ ہتکِ حرمت اور ارتکابِ خیانت کا جرم شدید ہو گا اور اسی قدر زیادہ اس کا عذاب سخت ہو گا۔ مثلاً مسجد میں شراب پینا اپنے گھر میں شراب پینے سے شدید تر جرم ہے اور اس کی سزا زیادہ سخت ہے۔ مُحَرَّمات سے زِنا کرنا غیر عورت سے زِنا کی بہ نسبت اشدّ ہے اور اس پر زیادہ سخت عذاب ہو گا۔

۴۶ – یہاں سے آخر پیرگراف تک کی آیات وہ ہیں جن سے اسلام میں پردے کے احکام کا آغاز ہوا ہے۔ اِن آیات میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے کیا گیا ہے مگر مقصود تمام مسلمان گھروں میں اِن اصلاحات کو نافذ کرنا ہے۔ ازواجِ مطہراتؓ کو مخاطَب کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے اس پاکیزہ طرزِ زندگی کی ابتدا ہو گی تو باقی سارے مسلمان گھرانوں کی خواتین خود اس کی تقلید کریں گی، کیونکہ یہی گھر اُن کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعض لوگ صرف اس بنیاد پر کہ ان آیات کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ سے ہے، یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ یہ احکام انھی کے لیے خاص ہیں۔ لیکن آگے ان آیات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ کون سی بات ایسی ہے جو حضورؐ کی ازواج کے لیے خاص ہو اور باقی مسلمان عورتوں کے لیے مطلوب نہ ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ کا

بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿۳۲﴾

بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔[۴۷]

منشا یہی ہوسکتا تھا کہ صرف ازواجِ مطہراتؓ ہی گندگی سے پاک ہوں، اور وہی اللہ و رسولؐ کی اطاعت کریں، اور وہی نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں؟ اگر یہ منشا نہیں ہوسکتا تو پھر گھروں میں چین سے بیٹھنے اور تبرّجِ جاہلیت سے پرہیز کرنے اور غیر مردوں کے ساتھ دبی زبان سے بات نہ کرنے کا حکم ان کے لیے کیسے خاص ہوسکتا ہے اور باقی مسلمان عورتیں اس سے مستثنیٰ کیسے ہوسکتی ہیں؟ کیا کوئی معقول دلیل ایسی ہے، جس کی بنا پر ایک ہی سلسلۂ کلام کے مجموعی احکام میں سے بعض کو عام اور بعض کو خاص قرار دیا جائے؟

رہا یہ فقرہ کہ ''تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو'' تو اس سے بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ عام عورتوں کو تو بن ٹھن کر نکلنا چاہیے اور غیر مردوں سے خوب لگاوٹ کی باتیں کرنی چاہییں، البتہ تم ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرو۔ بلکہ اس کے برعکس یہ طرزِ کلام کچھ اس طرح کا ہے جیسے ایک شریف آدمی اپنے بچّے سے کہتا ہے کہ ''تم بازاری بچوں کی طرح نہیں ہو، تمھیں گالی نہ بکنی چاہیے۔'' اس سے کوئی عقل مند آدمی بھی کہنے والے کا یہ مدّعا اخذ نہ کرے گا کہ وہ صرف اپنے بچّے کے لیے گالیاں بکنے کو بُرا سمجھتا ہے، دوسرے بچوں میں یہ عیب موجود رہے تو اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

۴۷ ـ یعنی ضرورت پیش آنے پر کسی مرد سے بات کرنے میں مُضایَقَہ نہیں ہے، لیکن ایسے مواقع پر عورت کا لہجہ اور اندازِ گفتگو ایسا ہونا چاہیے جس سے بات کرنے والے مرد کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ گزر سکے کہ اس عورت سے کوئی اور توقع بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ اُس کے لہجے میں کوئی لوچ نہ ہو، اس کی باتوں میں کوئی لگاوٹ نہ ہو، اس کی آواز میں دانستہ کوئی شیرینی گُھلی ہوئی نہ ہو جو سننے والے مرد کے جذبات میں انگیخت پیدا کر دے اور اسے آگے قدم بڑھانے کی ہمّت دلائے۔ اس طرزِ گفتگو کے متعلق اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ یہ کسی ایسی عورت کو زیب نہیں دیتا جس کے دل میں خدا کا خوف اور بدی سے پرہیز کا جذبہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ فاسقات و فاجرات کا طرزِ کلام ہے نہ کہ مومناتِ مُتّقیات کا۔ اس کے ساتھ اگر سورۂ نور کی وہ آیت بھی دیکھی جائے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ (اور وہ زمین پر اس طرح پاؤں مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے اس کا علم لوگوں کو ہو) تو ربّ العالمین کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں خواہ مخواہ اپنی آواز یا اپنے زیوروں کی جھنکار غیر مردوں کو نہ سنائیں اور اگر بضرورت اجنبیوں سے بولنا پڑ جائے تو پوری احتیاط کے ساتھ بات کریں۔ اسی بنا پر عورت کے لیے اذان دینا ممنوع ہے۔ نیز اگر نمازِ باجماعت میں کوئی عورت موجود ہو اور امام کوئی غَلَطی کرے تو مرد کی طرح سبحان اللہ کہنے کی اسے اجازت نہیں ہے بلکہ اس کو صرف ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنی چاہیے تاکہ امام مُتنبّہ ہو جائے۔

اب یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلا ضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے، کیا وہ کبھی اس کو پسند کرسکتا ہے کہ عورت اسٹیج پر آ کر گائے، ناچے، تھرکے، بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سُریلے نغموں کے ساتھ فُحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں

وَقَرۡنَ فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاهِلِيَّةِ الۡاُوۡلٰى وَاَقِمۡنَ

اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو[۴۸] اور سابق دَورِ جاہلیّت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔[۴۹] نماز قائم کرو،

کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میز بان (air-hostess) بنائی جائیں اور انھیں خاص طور پر مسافروں کا دل لُبھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بَن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گُھل مِل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے برآمد کی گئی ہے؟ خدا کا نازل کردہ قرآن تو سب کے سامنے ہے۔ اس میں کہیں اس کلچر کی گنجایش نظر آتی ہو تو اس مَقام کی نشان دِہی کر دی جائے۔

۴۸ – اصل میں لفظ قَرۡنَ استعمال ہوا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے اس کو "قَرار" سے ماخوذ بتایا ہے اور بعض نے "وَقَار" سے۔ اگر اس کو قرار سے لیا جائے تو معنیٰ ہوں گے "قرار پکڑو"، "ٹِک رہو"۔ اور اگر وقار سے لیا جائے تو مطلب ہوگا "سکون سے رہو"، "چین سے بیٹھو"۔ دونوں صورتوں میں آیت کا منشا یہ ہے کہ عورت کا اصل دائرۂ عمل اس کا گھر ہے، اس کو اسی دائرے میں رہ کر اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہییں، اور گھر سے باہر صرف بضرورت ہی نکلنا چاہیے۔ یہ منشا خود آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ حافظ ابو بکر بزّارؒ حضرت اَنسؓ سے رِوایت کرتے ہیں کہ عورتوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ساری فضیلت تو مرد لُوٹ لے گئے، وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے؟ جواب میں فرمایا: من قعدت منكن في بيتها فانها تدرك عمل المجاهدين۔ "جو تم میں سے گھر میں بیٹھے گی، وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی۔" مطلب یہ ہے کہ مجاہد دل جمعی کے ساتھ اسی وقت تو خدا کی راہ میں لڑ سکتا ہے جب کہ اسے اپنے گھر کی طرف سے پورا اطمینان ہو، اس کی بیوی اس کے گھر اور بچوں کو سنبھالے بیٹھی ہو، اور اسے کوئی خطرہ اس امر کا نہ ہو کہ پیچھے وہ کوئی گُل کِھلا بیٹھے گی۔ یہ اطمینان جو عورت اسے فراہم کرے گی وہ گھر بیٹھے اس کے جہاد میں برابر کی حصّہ دار ہوگی۔ ایک اور رِوایت جو بزّار اور ترمذِی نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے نقل کی ہے اس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ: انّ المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان واقرب ما تكون بروحة ربها وهي في قعر بيتها "عورت مستور رہنے کے قابل چیز ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت سے قریب تر وہ اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے گھر میں ہو۔" (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ ۴۹)

قرآنِ مجید کے اس صاف اور صریح حکم کی موجودگی میں اس بات کی آخر کیا گنجایش ہے کہ مسلمان عورتیں کونسلوں اور پارلیمنٹوں کی ممبر بنیں، بیرونِ خانہ کی سوشل سرگرمیوں میں دَوڑتی پھریں، سرکاری دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کریں، کالجوں میں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں، مردانہ ہسپتالوں میں نرسنگ کی خدمت انجام دیں، ہوائی جہازوں اور ریل کاروں میں "مسافر نوازی" کے لیے استعمال کی جائیں، اور تعلیم و تربیت کے لیے امریکا و انگلستان بھیجی جائیں؟ عورت کے بیرونِ خانہ سرگرمیوں کے جواز میں بڑی سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جنگِ جَمَل میں حصّہ لیا تھا۔ لیکن یہ اِستدلال جو لوگ پیش کرتے ہیں انھیں شاید معلوم نہیں ہے کہ خود حضرت عائشہؓ کا اپنا خیال اس باب میں کیا تھا۔ عبداللہ بن احمد بن حَنۡبل نے زوائد الزہد میں، اور ابنِ المُنذِرؒ، ابنِ ابی شَيۡبَہ اور ابنِ سعد

نے اپنی کتابوں میں مَسرُوقؒ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ جب تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے اِس آیت (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ) پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹّا بھیگ جاتا تھا، کیونکہ اس پر انھیں اپنی وہ غلطی یاد آ جاتی تھی جو اُن سے جنگِ جَمَل میں ہوئی تھی۔

۴۹- اس آیت میں دو اہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کا سمجھنا آیت کے منشا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ایک تَبَرُّج، دوسرے جاہلیّتِ اُولیٰ۔

تَبَرُّج کے معنیٰ عَرَبی زبان میں نمایاں ہونے، ابھرنے اور کُھل کر سامنے آنے کے ہیں۔ ہر ظاہر اور مُرتَفَع چیز کے لیے عرب لفظ "بَرَج" استعمال کرتے ہیں۔ "بُرج" کو بُرج اس کے ظہور و اِرتفاع کی بنا پر ہی کہا جاتا ہے۔ بادبانی کشتی کے لیے "بارجہ" کا لفظ اسی لیے بولا جاتا ہے کہ اس کے بادبان دُور سے نمایاں ہوتے ہیں۔ عورت کے لیے جب لفظ تَبَرُّج استعمال کیا جائے تو اس کے تین مطلب ہوں گے: ایک یہ کہ وہ اپنے چہرے اور جسم کا حُسن لوگوں کو دکھائے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس اور زیور کی شان دوسروں کے سامنے نمایاں کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنی چال ڈھال اور چَٹک مَٹک سے اپنے آپ کو نمایاں کرے۔ یہی تشریح اس لفظ کی اکابرِ اہلِ لُغت اور اکابرِ مفسرین نے کی ہے۔ مجاہدؒ، قتادہؒ اور ابنِ ابی نَجِیحؒ کہتے ہیں: التبرّج المشي بتبختُر وتكسر وتغنج "تَبَرُّج کے معنیٰ ہیں ناز و ادا کے ساتھ لچکے کھاتے اور اِٹھلاتے ہوئے چلنا۔" مقاتِل کہتے ہیں: ابداء قلائدها وقرطها وعنقها "عورت کا اپنے ہار اور اپنے بُندے اور اپنا گلا نمایاں کرنا۔" اَلْمُبَرِّدؒ کا قول ہے: ان تبدی من محاسنها ما يجب عليها ستره "یہ کہ عورت اپنے وہ محاسن ظاہر کر دے جن کو اسے چھپانا چاہیے۔" ابوعُبَیدہ کی تفسیر ہے: ان تُخرج من محاسنها تستدعی به شهوة الرِّجَال "یہ کہ عورت اپنے جسم و لباس کے حسن کو نمایاں کرے جس سے مردوں کو اس کی طرف رغبت ہو۔"

جاہلیّت کا لفظ قرآنِ مجید میں اس مقام کے علاوہ تین جگہ اور استعمال ہوا ہے۔ ایک، آلِ عمران کی آیت ۱۵۴ میں، جہاں اللہ کی راہ میں لڑنے سے جی چُرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ "اللہ کے بارے میں حق کے خلاف جاہلیّت کے سے گمان رکھتے ہیں۔" دوسرے، سورۂ مائدہ، آیت ۵۰ میں، جہاں خدا کے قانون کے بجائے کسی اور قانون کے مطابق اپنے مقدّمات کا فیصلہ کرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا: "کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟" تیسرے، سورۂ فتح، آیت ۲۶ میں، جہاں کفارِ مکہ کے اس فعل کو "حَمِیّتِ جاہلیہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ انھوں نے محض تعصُّب کی بنا پر مسلمانوں کو عُمرہ نہ کرنے دیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوالدّرداءؓ نے کسی شخص سے جھگڑا کرتے ہوئے اس کو ماں کی گالی دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: "تم میں ابھی تک جاہلیّت موجود ہے۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "تین کام جاہلیت کے ہیں: دوسروں کے نسب پر طعن کرنا، ستاروں کی گردش سے فال لینا، اور مُردوں پر نوحہ کرنا۔" ان تمام استعمالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جاہلیت سے مراد اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرزِ عمل ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی اخلاق و آداب اور اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو۔ اور جاہلیّتِ اُولیٰ کا مطلب وہ برائیاں ہیں جن میں اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اور دنیا بھر کے دوسرے لوگ مبتلا تھے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل سے عورتوں کو روکنا چاہتا ہے وہ ان کا اپنے حُسن کی نمائش کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلنا ہے۔ وہ ان کو ہدایت فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو کیونکہ تمھارا اصل کام گھر میں ہے نہ کہ

الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ
لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۚ﴿۳۳﴾
وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ ؕ

زکوٰۃ دو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبیؐ سے گندگی کو دُور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔^۵۰ یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی اُن باتوں کو جو تمھارے گھروں میں

اس سے باہر۔ لیکن اگر باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس شان کے ساتھ نہ نکلو جس کے ساتھ سابق دَورِ جاہلیّت میں عورتیں نکلا کرتی تھیں۔ بَن ٹھن کر نکلنا، چہرے اور جسم کے حُسن کو زیب و زینت اور چُست لباسوں یا عُریاں لباسوں سے نمایاں کرنا، اور ناز و ادا سے چلنا ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیّت کے طور طریقے ہیں جو اسلام میں نہیں چل سکتے۔ اب یہ بات ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو ثقافت ہمارے ہاں رائج کی جا رہی ہے وہ قرآن کی رُو سے اسلام کی ثقافت ہے یا جاہلیت کی ثقافت۔ البتہ اگر کوئی اور قرآن ہمارے کارفرماؤں کے پاس آ گیا ہے جس سے اسلام کی یہ نئی روح نکال کر مسلمانوں میں پھیلائی جا رہی ہے تو بات دوسری ہے۔

۵۰ - جس سِیاق و سَباق میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں اَهْلَ الْبَيْتِ سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں۔ کیونکہ خطاب کا آغاز ہی يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ کے الفاظ سے کیا گیا ہے اور ماقبل و مابعد کی پوری تقریر میں وہی مخاطَب ہیں۔ علاوہ بریں ''اہل البیت'' کا لفظ عَرَبی زبان میں ٹھیک انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم ''گھر والوں'' کا لفظ بولتے ہیں، اور اس کے مفہوم میں آدمی کی بیوی اور اس کے بچے، دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بیوی کو مستثنیٰ کر کے ''اہلِ خانہ'' کا لفظ کوئی نہیں بولتا۔ خود قرآنِ مجید میں بھی اس مقام کے سوا دو مزید مقامات پر یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ اس کے مفہوم میں بیوی شامل، بلکہ مقدّم ہے۔ سورۂ ہود میں جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی پیدائش کی بشارت دیتے ہیں تو ان کی اہلیہ اسے سُن کر تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں: اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ''کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟ اِس گھر کے لوگو! تم پر تو اللہ کی رحمت ہے اور اس کی برکتیں ہیں۔'' سورۂ قصص میں جب حضرت موسیٰؑ ایک شیر خوار بچے کی حیثیت سے فرعون کے گھر میں پہنچتے ہیں اور فرعون کی بیوی کو کسی ایسی اَنّا کی تلاش ہوتی ہے جس کا دودھ بچہ پی لے تو حضرت موسیٰؑ کی بہن جا کر کہتی ہیں: هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ ''کیا میں تمھیں ایسے گھر والوں کا پتا دوں جو تمھارے لیے اس بچے کی پرورش کا ذمّہ لیں؟'' پس محاورہ، اور قرآن کے استعمالات، اور خود اس آیت کا سیاق و سباق، ہر چیز اس بات پر قطعی دلالت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت میں آپؐ کی ازواجِ مطہرات بھی داخل ہیں اور آپؐ کی اولاد بھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کا اصل خطاب ازواج سے ہے اور اولاد مفہومِ لفظ کے اعتبار سے اس میں شامل قرار پاتی ہے۔ اسی بنا پر ابنِ عباسؓ اور عُروہؒ بن زبیرؓ اور عکرمہؒ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اَهْلَ الْبَيْتِ سے مراد ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ''اَھْلَ الْبَیْتِ'' کا لفظ صرف ازواج کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس میں دوسرا کوئی داخل نہیں ہوسکتا، تو یہ بات بھی غلط ہوگی۔ صرف یہی نہیں کہ ''گھر والوں'' کے لفظ میں آدمی کے سب اہل وعیال شامل ہوتے ہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرمائی ہے کہ وہ بھی شامل ہیں۔ ابنِ ابی حاتم کی رِوایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: تسألنی عن رجل کان من احبّ الناس الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و کانت تحتہ ابنتہ واحبّ الناس الیہ۔ ''تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبُوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضورؐ کی وہ بیٹی تھی جو آپؐ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی۔'' اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا کہ حضورؐ نے حضرت علی اور فاطمہ اور حسن وحسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا فرمائی: اَللّٰھُمّ ھٰؤلاء اھلُ بیتی فَاَذْھِبْ عنھمُ الرّجس وطھّرھم تطھیرًا ''خدایا! یہ میرے اہلِ بیت ہیں، ان سے گندگی کو دُور کردے اور انھیں پاک کردے۔'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: میں بھی تو آپؐ کے اہلِ بیت میں سے ہوں۔ (یعنی مجھے بھی اس کپڑے میں داخل کر کے میرے حق میں دعا فرمائیے۔) حضورؐ نے فرمایا: ''تم الگ رہو، تم تو خیر ہو ہی۔'' اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث مسلم، ترمذی، احمد، ابنِ جَریر، حاکم، بَیہقی وغیرہ محدثین نے ابوسعید خُدریؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت اَنَسؓ، حضرت اُمِّ سَلَمہؓ، حضرت واثِلہؓ بن اَسْقَع اور بعض دوسرے صحابہؓ سے نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کے دونوں صاحب زادوں کو اپنا اہل البیت قرار دیا۔ لہٰذا اُن لوگوں کا خیال غلط ہے جو ان حضرات کو اس سے خارج ٹھیراتے ہیں۔

اسی طرح اُن لوگوں کی رائے بھی غلط ہے جو مذکورۂ بالا احادیث کی بنیاد پر ازواجِ مطہراتؓ کو اہل البیت سے خارج ٹھیراتے ہیں۔ اوّل تو جو چیز صراحتاً قرآن سے ثابت ہو اس کو کسی حدیث کے بل پر ردّ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے، خود ان احادیث کا مطلب بھی وہ نہیں ہے جو ان سے نکالا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض رِوایات میں جو یہ بات آئی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس چادر کے نیچے نہیں لیا جس میں حضورؐ نے ان چاروں اصحاب کو لیا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضورؐ نے ان کو اپنے ''گھر والوں'' سے خارج قرار دیا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیویاں تو اہلِ بیت میں شامل تھیں ہی، کیونکہ قرآن نے انھی کو مخاطَب کیا تھا، لیکن حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ ان دوسرے اصحاب کے متعلق ظاہرِ قرآن کے لحاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہوجائے کہ یہ اہلِ بیت سے خارج ہیں، اس لیے آپؐ نے تصریح کی ضرورت ان کے حق میں محسوس فرمائی نہ کہ ازواجِ مطہراتؓ کے حق میں۔

ایک گروہ نے اس آیت کی تفسیر میں صرف اتنا ہی ستم نہیں کیا ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ کو ''اہل البیت'' سے خارج کر کے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے لیے اس لفظ کو خاص کر دیا، بلکہ اس پر مزید ستم یہ بھی کیا ہے کہ اس کے الفاظ ''اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کردے'' سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد انبیاؑ کی طرح معصوم ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ''گندگی'' سے مراد خطا اور گناہ ہے اور ارشادِ الٰہی کی رُو سے یہ اہل البیت اس سے پاک کر دیے گئے ہیں۔ حالانکہ آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ تم سے گندگی دُور کردی گئی اور تم بالکل پاک کر دیے گئے۔ بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تم سے گندگی کو دُور کرنا اور تمھیں پاک کر دینا چاہتا ہے۔ سیاق وسباق بھی یہ نہیں بتاتا کہ یہاں مناقبِ اہلِ بیت بیان کرنے مقصود ہیں، بلکہ یہاں تو اہلِ بیت کو نصیحت کی گئی ہے کہ تم فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو، اس لیے کہ اللہ تمھیں پاک کرنا چاہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر

ع

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿٣٤﴾ ع اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ

سُنائی جاتی ہیں[51]۔ بے شک اللہ لطیف[52] اور باخبر ہے۔ ع
بالیقین[53] جو مرد اور جو عورتیں مُسلم ہیں[54]، مومن ہیں[55]، مُطیع فرمان ہیں[56]، راست باز ہیں[57]،

مطلب یہ ہے کہ تم فُلاں رَوِیّہ اختیار کرو گے تو پاکیزگی کی نعمت تمھیں نصیب ہوگی ورنہ نہیں۔ تاہم اگر یُرِیْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ اللہ نے ان کو معصوم کر دیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وضو اور غسل اور تیمّم کرنے والے سب مسلمانوں کو معصوم نہ مان لیا جائے کیونکہ ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ ”مگر اللہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے۔“ (المائدہ، آیت ۶)

۵۱ – اصل میں لفظ وَاذْكُرْنَ استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنیٰ ہیں: ”یاد رکھو“ اور ”بیان کرو“۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ کی بیویو! تم کبھی اس بات کو فراموش نہ کرنا کہ تمھارا گھر وہ ہے جہاں سے دنیا بھر کو آیاتِ الٰہی اور حکمت و دانائی کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لیے تمھاری ذمہ داری بڑی سخت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی گھر میں لوگ جاہلیت کے نمونے دیکھنے لگیں۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ نبی کی بیویو! جو کچھ تم سنو اور دیکھو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتی رہو، کیونکہ رسولؐ کے ساتھ ہر وقت کی معاشرت سے بہت سی ہدایات تمھارے علم میں ایسی آئیں گی جو تمھارے سوا کسی اور ذریعے سے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکیں گی۔

اِس آیت میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے: ایک، آیات اللہ۔ دوسرے حکمت۔ آیات اللہ سے مراد تو کتاب اللہ کی آیات ہی ہیں۔ مگر حکمت کا لفظ وسیع ہے جس میں وہ تمام دانائی کی باتیں آ جاتی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اس لفظ کا اِطلاق کتاب اللہ کی تعلیمات پر بھی ہو سکتا ہے، مگر صرف انھی کے ساتھ اس کو خاص کر دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کی آیات سنانے کے علاوہ جس حکمت کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سیرتِ پاک سے اور اپنے ارشادات سے دیتے تھے وہ بھی لامحالہ اس میں شامل ہے۔ بعض لوگ محض اس بنیاد پر کہ آیت میں مَا يُتْلٰى (جو تلاوت کی جاتی ہیں) کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آیات اللہ اور حکمت سے مراد صرف قرآن ہے، کیونکہ ”تلاوت“ کا لفظ اصطلاحاً قرآن کی تلاوت کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن یہ اِستدلال بالکل غلط ہے۔ تلاوت کے لفظ کو اصطلاح کے طور پر قرآن یا کتاب اللہ کی تلاوت کے لیے مخصوص کر دینا بعد کے لوگوں کا فعل ہے۔ قرآن میں اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۲ میں یہی لفظ جادو کے ان منتروں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ”انھوں نے پیروی کی اُس چیز کی جس کی تلاوت کرتے تھے (یعنی جسے سناتے تھے) شیاطین سلیمان کی بادشاہی کی طرف منسوب کر کے۔“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اس لفظ کو اس کے لغوی معنیٰ میں استعمال کرتا ہے، کتاب اللہ کی آیات سنانے کے لیے اصطلاحاً مخصوص نہیں کرتا۔

۵۲ – اللہ لطیف ہے، یعنی مخفی سے مخفی باتوں تک اس کا علم پہنچ جاتا ہے۔ اس سے کوئی چیز چُھپی نہیں رہ سکتی۔

وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ
وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ

صابر ہیں[۵۸]، اللہ کے آگے جُھکنے والے ہیں[۵۹]، صدقہ دینے والے ہیں[۶۰]، روزہ رکھنے والے ہیں[۶۱]، اپنی شرمگاہوں کی

۵۳ – پچھلے پیراگراف کے بعد مُتَّصِلاً یہ مضمون ارشاد فرما کر ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف کر دیا گیا ہے کہ اُوپر ازواجِ مطہرات کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اُن کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ مسلم معاشرے کو بالعُموم اپنے کردار کی اصلاح انھی ہدایات کے مطابق کرنی چاہیے۔

۵۴ – یعنی جنھوں نے اسلام کو اپنے لیے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ اب وہ اسی کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں، جن کے اندر اسلام کے دیے ہوئے طریقِ فکر اور طرزِ زندگی کے خلاف کسی قسم کی مُزاحمَت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اس کی اطاعت اور اتباع کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔

۵۵ – یعنی جن کی یہ اطاعت محض ظاہری نہیں ہے، بادِلِ ناخواستہ نہیں ہے، بلکہ دل سے وہ اسلام ہی کی رہنمائی کو حق مانتے ہیں۔ ان کا ایمان یہی ہے کہ فکر و عمل کا جو راستہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے، وہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے اور اسی کی پیروی میں ہماری فلاح ہے۔ جس چیز کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے غلط کہہ دیا ہے ان کی اپنی رائے بھی یہی ہے کہ وہ یقیناً غلط ہے، اور جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حق کہہ دیا ہے ان کا اپنا دل و دماغ بھی اسے برحق ہی یقین کرتا ہے۔ ان کے نفس اور ذہن کی حالت یہ نہیں ہے کہ قرآن اور سنّت سے جو حکم ثابت ہو اسے وہ نامناسب سمجھتے ہوں اور اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں کہ کسی طرح اسے بدل کر اپنی رائے کے مطابق، یا دنیا کے چلتے ہوئے طریقوں کے مطابق ڈھال بھی دیا جائے اور یہ الزام بھی اپنے سر نہ لیا جائے کہ ہم نے حکمِ خدا اور رسولؐ میں ترمیم کر ڈالی ہے۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی صحیح کیفیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ذاق طعم الایمان من رضی باللّٰہ ربًّا وبالاسلام دینا وبِمُحمّدٍ رسُولا۔ (مسلم)

ایمان کا لذت شناس ہو گیا وہ شخص جو راضی ہوا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو، اور اسلام ہی اس کا دین ہو، اور محمدؐ ہی اس کے رسول ہوں۔

اور ایک دوسری حدیث میں آپؐ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعًا لما جئتُ بِہٖ۔ (شرحُ السُّنّۃ)

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اُس چیز کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لایا ہوں۔

۵۶ – یعنی وہ محض مان کر رہ جانے والے بھی نہیں ہیں بلکہ عملاً اطاعت کرنے والے ہیں۔ ان کی یہ حالت نہیں ہے کہ ایمان داری کے ساتھ حق تو اُسی چیز کو مانیں جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے مگر عملاً اس کی خلاف ورزی کریں، اور اپنی مخلصانہ رائے میں تو ان سب کاموں کو بُرا ہی سمجھتے رہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے مگر اپنی عملی زندگی میں ارتکاب انھی کا کرتے چلے جائیں۔

وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً

حفاظت کرنے والے ہیں [۶۲]، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں [۶۳]، اللہ نے ان کے لیے مغفرت

۵۷ – یعنی اپنی گفتار میں بھی سچے ہیں اور اپنے معاملات میں بھی کھرے ہیں۔ جھوٹ، فریب، بدنیتی، دغا بازی اور چھل بٹے ان کی زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ ان کی زبان وہی بولتی ہے جسے اُن کا ضمیر صحیح جانتا ہے۔ وہ کام وہی کرتے ہیں جو ایمان داری کے ساتھ ان کے نزدیک راستی و صداقت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور جس سے بھی وہ کوئی معاملہ کرتے ہیں دیانت کے ساتھ کرتے ہیں۔

۵۸ – یعنی خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے اور خدا کے دین کو قائم کرنے میں جو مشکلات بھی پیش آئیں، جو خطرات بھی درپیش ہوں، جو تکلیفیں بھی اُٹھانی پڑیں اور جن نقصانات سے بھی دوچار ہونا پڑے، ان کا پوری ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ کوئی خوف، کوئی لالچ اور خواہشاتِ نفس کا کوئی تقاضا ان کو سیدھی راہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

۵۹ – یعنی وہ تکبّر اور اِستِکبار اور غُرورِ نفس سے خالی ہیں۔ وہ اِس حقیقت کا پورا شعور و احساس رکھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور بندگی سے بالاتر ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے ان کے دل اور جسم دونوں ہی اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ ان پر خدا کا خوف غالب رہتا ہے۔ ان سے کبھی وہ رَویّہ ظاہر نہیں ہوتا جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا اور خدا سے بے خوف لوگوں سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ ترتیبِ کلام کو ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اِس عام خدا ترسانہ رَوِیّے کے ساتھ خاص طور پر ''خُشوع'' سے مراد نماز ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی صدقے اور روزے کا ذکر کیا گیا ہے۔

۶۰ – اس سے مراد صرف فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ عام خیرات بھی اس میں شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کھلے دل سے اپنے مال صَرف کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی مدد کرنے میں اپنی حدِ استطاعت تک وہ کوئی دریغ نہیں کرتے۔ کوئی یتیم، کوئی بیمار، کوئی مصیبت زدہ، کوئی ضعیف و معذور، کوئی غریب و محتاج آدمی اُن کی بستیوں میں دستگیری سے محروم نہیں رہتا۔ اور اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے ضرورت پیش آجائے تو اس پر اپنے مال لُٹا دینے میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔

۶۱ – اس میں فرض اور نفل دونوں قسم کے روزے شامل ہیں۔

۶۲ – اس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زنا سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بَرَہنگی و عُریانی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ بَرَہنگی و عریانی صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی لباس کے بغیر بالکل ننگا ہو جائے۔ بلکہ ایسا لباس پہننا بھی برہنگی ہی ہے جو اتنا رقیق ہو کہ جسم اس میں سے جھلکتا ہو، یا اتنا چُست ہو کہ جسم کی ساخت اور اس کے نشیب و فراز سب اُس میں سے نمایاں نظر آتے ہوں۔

۶۳ – اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اُس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شُعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اُتر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا اس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔ کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا۔ فارغ ہوگا تو الحمدللہ کہے گا۔ سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور

وَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۳۵﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ

اور بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔[۶۴]

کسی [۶۵]مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسولؐ کسی

اٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے۔ بات چیت میں بار بار اس کی زبان سے بسم اللہ، الحمدُلِلّٰہ، اِن شاء اللہ، ماشاء اللہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ ہر نعمت ملنے پر اس کا شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طلب گار ہوگا۔ ہر مشکل میں اس سے رُجوع کرے گا۔ ہر بُرائی کا موقع سامنے آنے پر اس سے ڈرے گا۔ ہر قصور سرزد ہو جانے پر اس سے معافی چاہے گا۔ ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دعا مانگے گا۔ غرض اُٹھتے بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کاج کرتے ہوئے اس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہوگا۔ یہ چیز درحقیقت اسلامی زندگی کی جان ہے۔ دوسری جتنی بھی عبادات ہیں ان کے لیے بہر حال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں اور انھیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت جاری رہتی ہے اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض اِن خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اس کی زبان دائماً اس کے ذکر سے تر رہے۔ یہ حالت انسان کی ہو تو اس کی زندگی میں عبادات اور دینی کام ٹھیک اُسی طرح پروان چڑھتے اور نَشو و نَما پاتے ہیں جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے مزاج کے مطابق آب و ہوا میں لگا ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو زندگی اس دائمی ذکرِ خدا سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اُس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب و ہوا میں لگایا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پَل رہا ہو۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں یوں واضح فرماتے ہیں:

عن معاذ بن انس الجهني عن رسول الله صلى الله عليه و سلم ان رجلاً سأله اى المجاهدين اعظمُ اجرًا يا رسُول الله؟ قال اكثرهم لِلّٰهِ تعالٰى ذكرًا۔ قال ایُّ الصائمين اكثر اجرا؟ قال اكثرهم لِلّٰهِ عزّوجل ذكرًا۔ ثم ذكر الصلٰوة و الزكٰوة والحجّ والصَّدَقَة كل ذٰلك يقول رسول الله صلى الله عليه وسلم اكثرهم لِلّٰهِ ذكرًا ۔ (مُسندِ احمد)

مُعاذؓ بن اَنس جُہَنی رِوایَت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: جو اُن میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا: روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ فرمایا: جو ان میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ "جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو۔"

۶۴ — اس آیت میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل قدر و قیمت کن اوصاف کی ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی قدریں (basic values) ہیں جنھیں ایک فقرے کے اندر سمیٹ دیا گیا ہے۔ اِن قدروں کے لحاظ سے مرد اور عورت کے درمیان

رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ﴿۳۶﴾

معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اُس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔[۶۶]

کوئی فرق نہیں ہے۔ عمل کے لحاظ سے تو بلاشبہ دونوں صِنفوں کا دائرۂ کار الگ ہے۔ مردوں کو زندگی کے کچھ شعبوں میں کام کرنا ہے اور عورتوں کو کچھ اور شعبوں میں۔ لیکن اگر یہ اوصاف دونوں میں یکساں موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں دونوں کا مرتبہ یکساں اور دونوں کا اجر برابر ہوگا۔ اس لحاظ سے ان کے مرتبے اور اجر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ ایک نے چُولھا چکّی سنبھالا اور دوسرے نے خلافت کی مَسنَد پر بیٹھ کر احکامِ شریعت جاری کیے ایک نے گھر میں بچے پالے اور دوسرے نے میدانِ جنگ میں جا کر اللہ اور اس کے دین کے لیے جان لڑائی۔

۶۵ – یہاں سے وہ آیات شروع ہوتی ہیں جو حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے سلسلے میں نازل ہوئی تھیں۔

۶۶ – ابنِ عباسؓ، مُجاہدؒ، قَتادہ، عِکرِمہؒ اور مُقاتِلؒ بن حَیّان کہتے ہیں کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا تھا اور حضرت زینبؓ اور ان کے رشتہ داروں نے اسے نامنظور کر دیا تھا۔ ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ جب حضورؐ نے یہ پیغام دیا تو حضرت زینبؓ نے کہا: انا خیر منه نسبًا، ''میں اُس سے نسب میں بہتر ہوں۔'' ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ انھوں نے جواب میں یہ بھی کہا تھا کہ: لا ارضاه لنفسی وانا ایم قریش۔ ''میں اُسے اپنے لیے پسند نہیں کرتی، میں قریش کی شریف زادی ہوں۔'' اسی طرح کا اظہارِ ناراضامندی اُن کے بھائی عبداللہ بن جَحْش رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا۔ اس لیے کہ حضرت زیدؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی (اُمَیْمَہ بنتِ عبدالمُطَّلِب) کی صاحب زادی تھیں۔ ان لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ اتنے اُونچے گھرانے کی لڑکی، اور وہ بھی کوئی غیر نہیں بلکہ حضورؐ کی اپنی پھوپھی زاد بہن ہے، اور اس کا پیغام آپؐ اپنے آزاد کردہ غلام کے لیے دے رہے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اسے سنتے ہی حضرت زینبؓ اور ان کے سب خاندان والوں نے بلا تأمّل سرِاطاعت خم کر دیا۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح پڑھایا، خود حضرت زیدؓ کی طرف سے دس دینار اور ۶۰ دِرہم مَہر ادا کیا، چڑھاوے کے کپڑے دیے، اور کچھ سامانِ خوراک گھر کے خرچ کے لیے بھجوا دیا۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع پر نازل ہوئی ہے، مگر جو حکم اس میں بیان کیا گیا ہے وہ اسلامی آئین کا اصل الاصول ہے، اور اس کا اطلاق پورے اسلامی نظامِ زندگی پر ہوتا ہے۔ اس کی رو سے کسی مسلمان فرد، یا قوم، یا ادارے، یا عدالت، یا پارلیمنٹ، یا ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو اس میں وہ خود اپنی آزادیِ رائے استعمال کرے۔ مسلمان ہونے کے معنیٰ ہی خدا اور رسولؐ کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دستبردار ہو جانے کے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کا

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ

اے نبیؐ![۶۷] یاد کرو وہ موقع جب تم اُس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا[۶۸] کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر"۔[۶۹] اُس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ تعالیٰ کھولنا چاہتا تھا،

مسلمان بھی ہونا اور اپنے لیے اس اختیار کو محفوظ بھی رکھنا، دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ کوئی ذی عقل انسان ان دونوں رَویّوں کو جمع کرنے کا تصور نہیں کرسکتا۔ جسے مسلمان رہنا ہو اس کو لازماً حکمِ خدا و رسولؐ کے آگے جھک جانا ہو گا۔ اور جسے نہ جھکنا ہو اس کو سیدھی طرح ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ نہ مانے گا تو چاہے اپنے مسلمان ہونے کا وہ کتنا ہی ڈھول پیٹے، خدا اور خَلق دونوں کی نگاہ میں وہ منافق ہی قرار پائے گا۔

۶۷ – یہاں سے آیت ۴۸ تک کا مضمون اُس وقت نازل ہوا جب حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کر چکے تھے اور اس پر منافقین، یہود اور مشرکین نے آپؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفانِ عظیم برپا کر رکھا تھا۔ ان آیات کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات اُن دشمنوں کی تفہیم کے لیے نہیں تھے جو قصداً حضورؐ کو بدنام کرنے اور اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے جھوٹ اور بہتان اور طعن و تشنیع کی مہم چلا رہے تھے، بلکہ اصل مقصود مسلمانوں کو اُن کی اِس مہم کے اثرات سے بچانا اور ان کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات سے محفوظ کرنا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا کلام منکرین کو مطمئن نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے اگر اطمینان نصیب ہوسکتا تھا تو انھی لوگوں کو جو جانتے اور مانتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اِن بندگانِ حق کے متعلق اس وقت یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دشمنوں کے اعتراضات کہیں ان کے دلوں میں بھی شک اور ان کے دماغوں میں بھی اُلجھن نہ پیدا کر دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تمام امکانی شبہات کا ازالہ فرمایا، اور دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ بتایا کہ ان حالات میں ان کا رَوِیّہ کیا ہونا چاہیے۔

۶۸ – مراد ہیں حضرت زیدؓ، جیسا کہ آگے بصراحت بیان فرما دیا گیا ہے۔ اُن پر اللہ تعالیٰ کا احسان کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان کیا؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً یہاں اُن کا قصّہ بیان کر دیا جائے۔ یہ دراصل قبیلۂ کَلْب کے ایک شخص حارِثہ بن شَراحِیل کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سُعدیٰ بنت ثَعْلَبَہ قبیلۂ طَےکی شاخ بنی مَعْن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچّے تھے اس وقت ان کی ماں انھیں اپنے میکے لے کر گئیں۔ وہاں بنی قَیْن بن جَسْر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لُوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے گئے اُن میں حضرت زیدؓ بھی تھے۔ پھر انھوں نے طائف کے قریب عُکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خَدِیجہؓ کے بھتیجے حکِیم بن حِزام تھے۔ انھوں نے مکہ لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں نذر کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت خَدِیجہؓ کا جب نکاح ہوا تو حضورؐ نے ان کے ہاں زیدؓ کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپؐ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپؐ نے انھیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اُس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا

وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ

تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زیدؓ اُس سے اپنی

تھا۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتا چلا کہ ہمارا بچہ مکے میں ہے۔ وہ انھیں تلاش کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپؐ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپؐ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمھارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمھارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ انھوں نے کہا: یہ تو آپ نے انصاف سے بھی بڑھ کر دُرست بات فرمائی ہے۔ آپ بچے کو بُلا کر پوچھ لیجیے۔ حضورؐ نے زیدؓ کو بلایا اور ان سے کہا: اِن دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا، تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمھیں پوری آزادی ہے کہ چاہو اِن کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو میرے ساتھ رہو۔ انھوں نے جواب دیا: میں آپؐ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ ان کے باپ اور چچا نے کہا: زید! کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے، اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اِس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں اُن کا تجربہ کر لینے کے بعد میں اب دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ زیدؓ کا یہ جواب سن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضورؐ نے اسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمعِ عام میں اعلان فرمایا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنھوں نے ایک لمحہ شک و تردُّد کے بغیر آپؐ سے نبوت کا دعویٰ سنتے ہی اسے تسلیم کر لیا۔ ایک حضرت خدیجہؓ، دوسرے حضرت زیدؓ، تیسرے حضرت علیؓ اور چوتھے حضرت ابوبکرؓ۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۳۰ سال تھی اور ان کو حضورؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ سال گزر چکے تھے۔ ہجرت کے بعد ۴ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح کر دیا، اپنی طرف سے اُن کا مَہر ادا کیا، اور گھر بسانے کے لیے ان کو ضروری سامان عنایت فرمایا۔

یہی حالات ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ اِن الفاظ میں اشارہ فرما رہا ہے کہ "جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا۔"

۶۹ — یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے، اور انھوں نے بار بار شکایات پیش کرنے کے بعد آخر کار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم مان کر ان کے نکاح میں جانا قبول کر لیا تھا، لیکن وہ اپنے دل سے اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام ہیں، اُن کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں، اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کم تر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے اِزدواجی زندگی میں انھوں نے کبھی حضرت زیدؓ کو اپنے برابر کا نہ سمجھا اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدّت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔

مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰكَهَا لِكَیۡ لَا یَكُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ

حاجت پوری کر چکا[۷۱] تو ہم نے اس (مُطلّقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا[۷۲] تاکہ مومنوں پر اپنے بولے بیٹوں کی

۷۰- بعض لوگوں نے اس فقرے کا الٹا مطلب یہ نکال لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت زینبؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے، اور آپؐ کا جی چاہتا تھا کہ حضرت زیدؓ ان کو طلاق دے دیں، مگر جب انھوں نے آ کر عرض کیا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپؐ نے، معاذ اللہ! اوپری دل سے ان کو منع کیا، اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ "تم دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔" حالاں کہ اصل بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر اس سورہ کی آیات نمبر ۱، ۲، ۳ اور ۷ کے ساتھ ملا کر یہ فقرہ پڑھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت زیدؓ اور ان کی اہلیہ کے درمیان تلخی بڑھتی چلی جا رہی تھی اُسی زمانے میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اشارہ کر چکا تھا کہ زیدؓ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو ان کی مُطلّقہ خاتون سے آپؐ کو نکاح کرنا ہوگا لیکن چونکہ حضورؐ جانتے تھے کہ عرب کی اس سوسائٹی میں منہ بولے بیٹے کی مُطلّقہ سے نکاح کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے —— اور وہ بھی عین اس حالت میں جب کہ مٹھی بھر مسلمانوں کے سوا باقی سارا عرب آپؐ کے خلاف پہلے ہی خار کھائے بیٹھا تھا —— اس لیے آپؐ اس شدید آزمایش میں پڑنے سے ہچکچا رہے تھے۔ اسی بنا پر جب حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ آپؐ کا منشا یہ تھا کہ یہ شخص طلاق نہ دے تو میں اِس بلا میں پڑنے سے بچ جاؤں، ورنہ اس کے طلاق دے دینے کی صورت میں مجھے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی اور پھر مجھ پر وہ کیچڑ اُچھالی جائے گی کہ پناہ بخدا۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو اُولُوا العزمی اور رضا بالقضا کے جس بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتا تھا اُس کے لحاظ سے حضورؐ کی یہ بات اُس کو فروتر نظر آئی کہ آپؐ نے قصداً زیدؓ کو طلاق سے روکا تاکہ آپؐ اس کام سے بچ جائیں جس میں آپؐ کو بدنامی کا اندیشہ تھا، حالانکہ اللہ ایک بڑی مصلحت کی خاطر وہ کام آپؐ سے لینا چاہتا تھا۔ "تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو" کے الفاظ صاف صاف اسی مضمون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

یہی بات اس آیت کی تشریح میں امام زین العابدین حضرت علیؓ بن حسینؓ نے فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دے چکا تھا کہ زینبؓ آپ کی بیویوں میں شامل ہونے والی ہیں، مگر جب زیدؓ نے آ کر ان کی شکایت آپؐ سے کی تو آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو نہ چھوڑو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمھیں پہلے خبر دے چکا تھا کہ میں تمھارا نکاح زینبؓ سے کرنے والا ہوں۔ تم زیدؓ سے یہ بات کہتے وقت اُس بات کو چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔" (ابنِ جریر، ابنِ کثیر بحوالہ ابنِ ابی حاتم)

علامۂ آلُوسی نے بھی تفسیر رُوح المعانی میں اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ عتاب ہے ترک اَولیٰ پر۔ اس حالت میں اَولیٰ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے، یا زیدؓ سے فرما دیتے کہ تم جو کچھ کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ عتاب کا ماحَصَل یہ ہے کہ تم نے زیدؓ سے یہ کیوں کہا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو، حالانکہ میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ زینبؓ تمھاری بیویوں میں شامل ہوں گی۔"

۷۱- یعنی جب زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ان کی عدّت پوری ہوگئی۔ "حاجت پوری کر چکا" کے الفاظ سے

أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ
مَفْعُولًا ﴿٣٧﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ
لَهٗ ۚ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا
مَّقْدُورًا ﴿٣٨﴾ الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ

بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے، جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں[۷۳]۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔ نبیؐ پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو[۷۴]۔ یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاؑ کے معاملے میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں، اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے[۷۵]۔ (یہ اللہ کی سنت ہے اُن لوگوں کے لیے) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں

خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زیدؓ کی اس سے کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ اور یہ صورتِ حال محض طلاق دے دینے سے رونما نہیں ہوتی، کیونکہ عدّت کے دَوران میں شوہر کو اگر کچھ دلچسپی باقی ہو تو وہ رُجوع کر سکتا ہے، اور شوہر کی یہ حاجت بھی مُطلّقہ بیوی سے باقی رہتی ہے کہ اس کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا پتا چل جائے۔ اس لیے مُطلّقہ بیوی کے ساتھ اس کے سابق شوہر کی حاجت صرف اُسی وقت ختم ہوتی ہے جب عدّت گزر جائے۔

۷۲ – یہ الفاظ اس باب میں صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکاح خود اپنی خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر کیا تھا۔

۷۳ – یہ الفاظ اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی ضرورت اور مَصلَحَت کی خاطر کرایا تھا جو اس تدبیر کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ عرب میں منہ بولے رشتوں کے بارے میں جو غلط رُسوم رائج ہو گئی تھیں، ان کے توڑنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اللہ کا رسول خود آگے بڑھ کر ان کو توڑ ڈالے۔ لہٰذا یہ نکاح اللہ تعالیٰ نے محض نبی کے گھر میں ایک بیوی کا اضافہ کرنے کی خاطر نہیں بلکہ ایک اہم ضرورت کی خاطر کروایا۔

۷۴ – ان الفاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے تو اس طرح کا نکاح محض مباح ہے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ایک فرض تھا جو اللہ نے آپؐ پر عائد کیا تھا۔

۷۵ – یعنی انبیاؑ کے لیے ہمیشہ سے یہ ضابطہ مقرر رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم بھی آئے اس پر عمل کرنا ان کے لیے قضائے مُبرَم ہے جس سے کوئی مَفر اُن کے لیے نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر کوئی کام فرض کر دے تو اسے وہ کام کر کے ہی رہنا ہوتا ہے، خواہ ساری دنیا اس کی مخالفت پر تُل گئی ہو۔

وَلَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا ﴿۳۹﴾ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ
اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ
بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۴۰﴾ ع یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡکُرُوا اللّٰہَ ذِکۡرًا کَثِیۡرًا ﴿۴۱﴾

اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور محاسنے کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔[۷۶]
(لوگو) محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسولؐ
اور خاتم النّبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔[۷۷] ع
اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام

۷۶ – اصل الفاظ ہیں: کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا۔ اس کے دو معنیٰ ہیں: ایک یہ کہ ہر خوف اور خطرے کے مقابلے میں اللہ کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کسی اور کی بازپُرس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۷۷ – اس ایک فقرے میں اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح پر کر رہے تھے۔

اُن کا اوّلین اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے اپنی بہو سے نکاح کیا ہے حالانکہ آپؐ کی اپنی شریعت میں بھی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ "محمدؐ تمھارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں"، یعنی جس شخص کی مطلّقہ سے نکاح کیا گیا ہے وہ بیٹا تھا کب کہ اس کی مُطلّقہ سے نکاح حرام ہوتا؟ تم لوگ تو خود جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سرے سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا، اگر منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے تب بھی اس کی چھوڑی ہوئی عورت سے نکاح کر لینا زیادہ سے زیادہ بس جائز ہی ہو سکتا تھا، آخر اس کا کرنا کیا ضرور تھا۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا: "مگر وہ اللہ کے رسول ہیں"، یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمھاری رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے اس کے بارے میں تمام تعصّبات کا خاتمہ کر دیں اور اس کی حِلّت کے معاملے میں کسی شک و شبہ کی گنجایش باقی نہ رہنے دیں۔

پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا "اور وہ خاتم النّبیین ہیں"، یعنی ان کے بعد کوئی رسول تو درکنار، کوئی نبی تک آنے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح اُن کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کسر پوری کر دے، لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس رسمِ جاہلیت کا خاتمہ وہ خود ہی کر کے جائیں۔

اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ "اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔"، یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس رسمِ جاہلیت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اب اُس کی طرف سے کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لہٰذا اگر اپنے آخری نبی کے ذریعے سے اُس نے اس رسم کا خاتمہ اب نہ کرایا تو پھر کوئی دوسری ہستی

سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ
لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾
تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾

اس کی تسبیح کرتے رہو۔[۷۸] وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمھارے لیے دُعائے رحمت کرتے ہیں، تاکہ وہ تمھیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے، وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔[۷۹] جس روز وہ اس سے ملیں گے اُن کا استقبال سلام سے ہوگا[۸۰] اور ان کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر فراہم کر رکھا ہے۔

دنیا میں ایسی نہ ہوگی جس کے توڑنے سے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔ بعد کے مصلحین اگر اسے توڑیں گے بھی تو ان میں سے کسی کا فعل بھی اپنے پیچھے ایسا دائمی اور عالم گیر اقتدار نہ رکھے گا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں، اور ان میں سے کسی کی شخصیت بھی اپنے اندر اس تقدُّس کی حامل نہ ہوگی کہ کسی فعل کا محض اُس کی سنت ہونا ہی لوگوں کے دلوں سے کراہیَّت کے ہر تصور کا قَلع قَمع کر دے۔

افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں ایک گروہ نے اس آیت کی غلط تاویلات کر کے ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس لیے ختمِ نبوت کے مسئلے کی پوری توضیح اور اس گروہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی تردید کے لیے ہم نے اِس سورہ کی تفسیر کے آخر میں ایک مفصل ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔

۷۸ – اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا ہے کہ جب دشمنوں کی طرف سے اللہ کے رسولؐ پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہو اور دینِ حق کو زک پہنچانے کے لیے ذاتِ رسولؐ کو ہدف بنا کر پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا جا رہا ہو، ایسی حالت میں اہلِ ایمان کا کام نہ تو یہ ہے کہ ان بے ہودگیوں کو اطمینان کے ساتھ سنتے رہیں، اور نہ یہ کہ خود بھی دشمنوں کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں، اور نہ یہ کہ جواب میں ان سے گالم گلوچ کرنے لگیں، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ عام دنوں سے بڑھ کر اس زمانے میں خُصوصیّت کے ساتھ اللہ کو اور زیادہ یاد کریں۔ ’’اللہ کو کثرت سے یاد کرنے‘‘ کا مفہُوم حاشیہ ۶۳ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ صبح و شام تسبیح کرنے سے مراد دائماً تسبیح کرتے رہنا ہے۔ اور تسبیح کے معنیٰ اللہ کی پاکیزگی بیان کرنے کے ہیں، نہ کہ محض دانوں والی تسبیح پھرانے کے۔

۷۹ – اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ احساس دلانا ہے کہ کفار و منافقین کی ساری جلن اور کُڑھن اس رحمت ہی کی وجہ سے ہے جو اللہ کے اس رسول کی بدولت تمھارے اُوپر ہوئی ہے۔ اُسی کے ذریعے سے ایمان کی دولت تمھیں نصیب ہوئی، کفر و جاہلیّت کی تاریکیوں سے نکل کر تم اسلام کی روشنی میں آئے، اور تمھارے اندر یہ بلند اَخلاقی و اجتماعی اوصاف پیدا ہوئے جن کے باعث تم عَلانِیَہ دوسروں سے برتر نظر آتے ہو۔ اسی کا غصہ ہے جو حاسد لوگ اللہ کے رسولؐ پر نکال رہے ہیں۔ اس حالت میں کوئی ایسا رَوِیّہ اختیار نہ کر بیٹھنا جس سے تم

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ

اے نبیؐ[81]! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر[82]، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر[83]، اللہ کی اجازت

خدا کی اس رحمت سے محروم ہو جاؤ۔

صلوٰۃ کا لفظ جب عَلٰی کے صلے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ رحمت، مہربانی اور شفقت کے ہوتے ہیں۔ اور جب ملائکہ کی طرف سے انسانوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ دعائے رحمت کے ہوتے ہیں، یعنی ملائکہ انسانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ تو اِن پر فضل فرما اور اپنی عنایات سے انھیں سرفراز کر۔ ایک مفہوم يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ کا یہ بھی ہے کہ یشیع عنکم الذکر الجمیل فی عباد اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے بندوں کے درمیان ناموری عطا فرماتا ہے اور تمھیں اس درجے کو پہنچا دیتا ہے کہ خلق خدا تمھاری تعریف کرنے لگتی ہے اور ملائکہ تمھاری مدح و ثنا کے چرچے کرتے ہیں۔

۸۰ – اصل الفاظ ہیں: تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ، ''ان کا تحیّہ اس سے ملاقات کے روز سلام ہوگا۔'' اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ اللہ تعالیٰ خود السّلام علیکم کے ساتھ ان کا استقبال فرمائے گا، جیسا کہ سورۂ یٰسین میں فرمایا: سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (آیت ۵۸) دوسرے، یہ کہ ملائکہ ان کو سلام کریں گے، جیسے سورۂ نحل میں ارشاد ہوا:

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

''جن لوگوں کی رُوحیں ملائکہ اس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے، اُن سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں اپنے اُن نیک اعمال کی بدولت جو تم دنیا میں کرتے تھے۔'' (آیت ۳۲) تیسرے، یہ کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو سلام کریں گے، جیسے سورۂ یونس میں فرمایا: دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ''وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ خدایا! پاک ہے تیری ذات، ان کا تحیّہ ہوگا سلام، اور اُن کی تان ٹوٹے گی اس بات پر کہ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔'' (آیت ۱۰)

۸۱ – مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو خطاب کر کے چند کلماتِ تسکین ارشاد فرماتا ہے۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ آپ کو ہم نے یہ کچھ مراتبِ عالیہ بخشے ہیں، آپؐ کی شخصیت اس سے بہت بلند ہے کہ یہ مخالفین اپنے بہتان و افترا کے طوفان اُٹھا کر آپؐ کا کچھ بگاڑ سکیں۔ لہٰذا آپؐ نہ ان کی شرارتوں سے رنجیدہ ہوں اور نہ ان کے پروپیگنڈے کو پرکاہ کے برابر بھی کوئی وقعت دیں۔ اپنے فرائضِ منصبی ادا کیے جائیے اور انھیں جو کچھ ان کا جی چاہے بکنے دیجیے۔ اس کے ساتھ ضمناً تمام خلق کو، جس میں مومن و کافر سب شامل ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا سابقہ کسی معمولی انسان سے نہیں ہے، بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بلند ترین مقام پر سرفراز فرمایا ہے۔

۸۲ – نبیؐ کو ''گواہ'' بنانے کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے جس میں تین قسم کی شہادتیں شامل ہیں:

ایک قولی شہادت، یعنی یہ کہ اللہ کا دین جن حقائق اور اُصولوں پر مبنی ہے، نبیؐ ان کی صداقت کا گواہ بن کر کھڑا ہو اور دنیا سے صاف صاف کہہ دے کہ وہی حق ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے باطل ہے۔ خدا کی ہستی اور اس کی توحید، ملائکہ کا وجود، وحی کا

نزول، حیات بعد الموت کا وقوع اور جنت و دوزخ کا ظُہور خواہ دنیا کو کیسا ہی عجیب معلوم ہو اور دنیا ان باتوں کے پیش کرنے والے کا مذاق اڑائے یا اسے دیوانہ کہے، مگر نبی کسی کی پروا کیے بغیر اٹھے اور ہانک پکار کر کہہ دے کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے اور گمراہ ہیں وہ لوگ جو اسے نہیں مانتے۔ اسی طرح اَخلاق اور تہذیب اور تمدُّن کے جو تصورات، اقدار، اُصول اور ضابطے خدا نے اس پر منکشف کیے ہیں، انھیں اگر ساری دنیا غلط کہتی ہو اور ان کے خلاف چل رہی ہو تب بھی نبی کا کام یہ ہے کہ انھی کو عَلَی الاعلان پیش کرے اور اُن تمام خیالات اور طریقوں کو غلط قرار دے جو ان کے خلاف دنیا میں رائج ہوں۔ اسی طرح جو کچھ خدا کی شریعت میں حلال ہے نبی اس کو حلال ہی کہے خواہ ساری دنیا اسے حرام سمجھتی ہو، اور جو کچھ خدا کی شریعت میں حرام ہے نبی اس کو حرام ہی کہے، خواہ ساری دنیا اسے حلال وطیّب قرار دے رہی ہو۔

دوسرے عملی شہادت، یعنی یہ کہ نبی اپنی پوری زندگی میں اُس مسلک کا عملاً مظاہرہ کرے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ جس چیز کو وہ بُرائی کہتا ہے اُس کے ہر شائبے سے اس کی زندگی پاک ہو۔ جس چیز کو وہ بھلائی کہتا ہے اس کی اپنی سیرت میں وہ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ جس چیز کو وہ فرض کہتا ہے اسے ادا کرنے میں وہ سب سے بڑھ کر ہو۔ جس چیز کو وہ گناہ کہتا ہے اس سے بچنے میں کوئی اس کی برابری نہ کر سکے۔ جس قانونِ حیات کو وہ خدا کا قانون کہتا ہے اسے نافذ کرنے میں وہ کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے۔ اس کا اپنا اخلاق و کردار اس بات پر گواہ ہو کہ وہ اپنی دعوت میں کس قدر سچّا اور کتنا مخلص ہے۔ اور اس کی ذات اس کی تعلیم کا ایسا مجسّم نمونہ ہو جسے دیکھ کر ہر شخص معلوم کر لے کہ جس دین کی طرف وہ دنیا کو بلا رہا ہے وہ کس معیار کا انسان بنانا چاہتا ہے، کیا کردار اُس میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اور کیا نظامِ زندگی اُس سے برپا کرانا چاہتا ہے۔

تیسرے اُخروی شہادت، یعنی آخرت میں جب اللہ کی عدالت قائم ہو اس وقت نبی اس امر کی شہادت دے کہ جو پیغام اس کے سُپرد کیا گیا تھا وہ اس نے بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق واضح کر دینے میں اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اِسی شہادت پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ماننے والے کس جزا کے، اور نہ ماننے والے کس سزا کے مستحق ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت کے مقام پر کھڑا کر کے اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی ذمہ داری آپؐ پر ڈالی تھی اور وہ کیسی عظیم شخصیت ہونی چاہیے جو اس مقامِ بلند پر کھڑی ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دینِ حق کی قولی اور عملی شہادت پیش کرنے میں ذرّہ برابر بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے، تبھی تو آخرت میں آپؐ یہ شہادت دے سکیں گے کہ میں نے لوگوں پر حق پوری طرح واضح کر دیا تھا، اور تبھی اللہ کی حجت لوگوں پر قائم ہو گی۔ ورنہ اگر، معاذ اللہ! آپؐ ہی سے یہاں شہادت ادا کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو نہ آپؐ آخرت میں اُن پر گواہ ہو سکتے ہیں اور نہ منکرینِ حق کے خلاف مقدّمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس شہادت کو یہ معنیٰ پہنانے کی کوشش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں لوگوں کے اعمال پر شہادت دیں گے، اور اس سے وہ یہ اِستدلال کرتے ہیں کہ حضوؐر تمام لوگوں کے اعمال کو دیکھ رہے ہیں، ورنہ بے دیکھے شہادت کیسے دے سکیں گے۔ لیکن قرآنِ مجید کی رُو سے یہ تاویل قطعاً غلط ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ لوگوں کے اعمال پر شہادت قائم کرنے کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا ہی انتظام فرمایا ہے۔ اس غرض کے لیے اُس کے فرشتے ہر شخص کا نامۂ اعمال تیار کر رہے ہیں

(مُلاحظہ ہو: قٓ، آیات ۱۷-۱۸۔ اور الکہف، آیت ۱۴۹) اور اس کے لیے وہ لوگوں کے اپنے اعضا سے بھی گواہی لے لے گا۔ (یٰسین ۶۵۔ حٰم السجدہ ۲۰-۲۱) رہے انبیا علیہم السلام، تو ان کا کام بندوں کے اعمال پر گواہی دینا نہیں بلکہ اس بات پر گواہی دینا ہے کہ بندوں تک حق پہنچا دیا گیا تھا۔ قرآن صاف فرماتا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ (المائدہ:۱۰۹)

جس روز اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا، پھر پوچھے گا کہ تمھاری دعوت کا کیا جواب دیا گیا، تو وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں، تمام غیب کی باتوں کو جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔

اور اسی سلسلے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ جب اُن سے عیسائیوں کی گمراہی کے متعلق سوال ہوگا تو وہ عرض کریں گے:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (المائدہ:۱۱۷)

میں جب تک ان کے درمیان تھا، اسی وقت تک اُن پر گواہ تھا۔ جب آپ نے مجھے اُٹھا لیا تو آپ ہی ان پر نگراں تھے۔

یہ آیات اِس باب میں بالکل صریح ہیں کہ انبیا علیہم السلام اعمالِ خُلق کے گواہ نہیں ہوں گے۔ پھر وہ گواہ کس چیز کے ہوں گے؟ اس کا جواب قرآن اتنی ہی صراحت کے ساتھ یہ دیتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرہ، ۱۴۳)

اور اَے مسلمانو! اِسی طرح ہم نے تم کو ایک اُمّتِ وَسَط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ (النحل، ۸۹)

اور جس روز ہم ہر اُمت میں انھی کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں گے جو اُن پر گواہی دے گا اور (اے محمدؐ!) تمھیں اِن لوگوں پر گواہ کی حیثیت سے لائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اپنی نوعیت میں اُس شہادت سے مختلف نہ ہوگی جسے ادا کرنے کے لیے حضورؐ کی اُمت کو اور ہر اُمّت پر گواہی دینے والے شہدا کو بلایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ شہادت اعمال کی ہو تو ان سب کا بھی حاضر و ناظر ہونا لازم آتا ہے۔ اور اگر یہ گواہ صرف اس امر کی شہادت دینے کے لیے بلائے جائیں گے کہ خلق تک اس کے خالق کا پیغام پہنچ گیا تھا تو لامحالہ حضورؐ بھی اسی غرض کے لیے پیش ہوں گے۔

اسی مضمون کی تائید وہ احادیث بھی کرتی ہیں جن کو بخاری، مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ اور امام احمد وغیرہم نے عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، ابوالدّرداؓ، انسؓ بن مالک اور بہت سے دوسرے صحابہؓ سے نقل کیا ہے، جن کا مشترک مضمون یہ ہے کہ نبیؐ قیامت کے روز اپنے بعض اصحاب کو دیکھیں گے کہ وہ لائے جا رہے ہیں، مگر وہ آپؐ کی طرف آنے کے بجائے دوسرے رُخ پر جا رہے ہوں گے یا دھکیلے جا رہے ہوں گے۔ حضورؐ اُن کو دیکھ کر عرض کریں گے کہ خدایا! یہ تو میرے صحابی ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نہیں جانتے کہ تمھارے بعد انھوں نے کیا کرتوت کیے ہیں۔ یہ مضمون اتنے صحابہؓ سے اتنی کثیر سندوں کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ اس کی

دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ
بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ
وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ دَعْ اَذٰىهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

سے اُس کی طرف دعوت دینے والا[۸۴] بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ اور ہرگز نہ دبو کفّار و منافقین سے، کوئی پروانہ کرو ان کی اذیّت رسانی کی اور بھروسا کرلو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دے۔

صحّت میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں۔ اور اس سے یہ بات صریحاً ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے ایک ایک شخص اور اس کی ایک ایک حرکت کے شاہد قطعاً نہیں ہیں۔ رہی وہ حدیث جس میں یہ ذکر آیا ہے کہ حضورؐ کے سامنے آپؐ کی اُمت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، تو وہ کسی طرح بھی اس مضمون سے متعارض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضورؐ کو اُمت کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس کے یہ معنیٰ کب ہیں کہ حضورؐ ہر شخص کے اعمال کا عینی مشاہدہ فرما رہے ہیں۔

۸۳ — یہاں اس فرق کو ملحوظ رکھیے کہ کسی شخص کا بطورِ خود ایمان و عملِ صالح پر اچھے انجام کی بشارت دینا اور کفر و بدعملی پر بُرے انجام سے ڈرانا اَور بات ہے اور کسی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشر و نذیر بنا کر بھیجا جانا بالکل ہی ایک دوسری بات۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس منصب پر مامور ہو وہ تو اپنی بشارت اور اپنے انذار کے پیچھے لازماً ایک اقتدار رکھتا ہے جس کی بنا پر اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا کسی کام پر بشارت دینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ جس احکم الحاکمین کی طرف سے وہ بھیجا گیا ہے وہ اس کام کے پسندیدہ اور مستحقِ اجر ہونے کا اعلان کر رہا ہے، لہٰذا وہ یقیناً فرض یا واجب یا مستحب ہے اور اس کا کرنے والا ضرور اجر پائے گا۔ اور اُس کا کسی کام کے بُرے انجام کی خبر دینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ قادرِ مُطلَق اس کام سے منع کر رہا ہے لہٰذا وہ ضرور گناہ اور حرام ہے اور یقیناً اس کا مرتکب سزا پائے گا۔ یہ حیثیت کسی غیر مامور کی بشارت اور تنبیہ کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۸۴ — یہاں بھی ایک عام مبلّغ کی تبلیغ اور نبی کی تبلیغ کے درمیان وہی فرق ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ دعوت الی اللہ تو ہر مُبلّغ دیتا اور دے سکتا ہے، مگر وہ اللہ کی طرف سے اِس کام پر مامور نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نبی اللہ کے اِذن (sanction) سے دعوت دینے اٹھتا ہے۔ اس کی دعوت نری تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بھی اس کے بھیجنے والے ربّ العالمین کی فرمانروائی کا زور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے بھیجے ہوئے داعی کی مزاحمت خود اللہ کے خلاف جنگ قرار پاتی ہے، جس طرح دنیوی حکومتوں میں سرکاری کام انجام دینے والے سرکاری ملازم کی مزاحمت خود حکومت کے خلاف جنگ سمجھی جاتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۴۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے[۸۵] دو تو تمھاری طرف سے ان پر کوئی عدّت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ لہٰذا انھیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔[۸۶]

۸۵ – یہ عبارت اس باب میں صریح ہے کہ یہاں لفظِ نکاح کا اطلاق صرف عقد پر کیا گیا ہے۔ علمائے لغت میں اس امر پر بہت کچھ اختلاف ہوا ہے کہ عَرَبی زبان میں نکاح کے اصل معنیٰ کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ ان دونوں میں معناً مشترک ہے۔ تیسرا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنیٰ عقدِ تزویج کے ہیں اور وطی کے لیے اس کو مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اور چوتھا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنیٰ وطی کے ہیں اور عقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ثُبوت میں ہر گروہ نے کلامِ عرب سے شواہد پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن راغب اصفہانیؒ نے پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ اصل النکاح العقد ثم استعیر للجماع ومحال ان یکون فی الاصل للجماع ثم استعیر للعقد۔ ''لفظِ نکاح کے اصل معنیٰ عقد ہی کے ہیں۔ پھر یہ لفظ استعارتاً جماع کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اصل معنیٰ جماع کے ہوں اور استعارے کے طور پر اسے عقد کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔'' اِس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جتنے الفاظ بھی جماع کے لیے عَرَبی زبان، یا دنیا کی کسی دوسری زبان میں حقیقتاً وضع کیے گئے ہیں وہ سب فُحش ہیں۔ کوئی شریف آدمی کسی مہذب مجلس میں ان کو زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لفظ حقیقتاً اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہو اسے کوئی معاشرہ شادی بیاہ کے لیے مجاز و استعارے کے طور پر استعمال کرے۔ اس معنیٰ کو ادا کرنے کے لیے تو دنیا کی ہر زبان میں مہذّب الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں نہ کہ فحش الفاظ۔

جہاں تک قرآن اور سنت کا تعلق ہے، ان میں نکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد یا تو مُجرّد عقد ہے، یا پھر وطی بعدِ عقد۔ لیکن وطی بلا عقد کے لیے اس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی وطی کو تو قرآن اور سنت زنا اور سفاح کہتے ہیں نہ کہ نکاح۔

۸۶ – یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالبًا اسی زمانے میں طلاق کا کوئی مسئلہ پیدا ہو جانے پر نازل ہوئی تھی، اس لیے پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کے سلسلۂ بیان کے درمیان اس کو رکھ دیا گیا۔ اس ترتیب سے یہ بات خود مُترشّح ہوتی ہے کہ یہ تقریرِ ماسبق کے بعد اور تقریرِ مابعد سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

اِس آیت سے جو قانونی احکام نکلتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- آیت میں اگرچہ ''مومن عورتوں'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے بظاہر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ کتابی عورتوں کے معاملے میں قانون وہ نہیں ہے جو یہاں بیان ہوا ہے، لیکن تمام علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ معناً یہی حکم کتابیات کے بارے میں بھی ہے۔ یعنی کتابی عورت سے بھی کسی مسلمان نے نکاح کیا ہو تو اس کی طلاق، اس کے مَہر، اس کی عدّت اور اس کو مُتعۂ طلاق دینے کے جملہ احکام وہی ہیں جو مومن عورت سے نکاح کی صورت میں ہیں۔ علما کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مخصوص طور پر صرف مومن عورتوں کا ذکر جو کیا ہے اس سے مقصود دراصل اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مسلمانوں کے لیے مومن عورتیں ہی موزوں ہیں۔ یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ضرور ہے مگر مناسب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے اس اندازِ بیان سے یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہلِ ایمان سے متوقع یہی ہے کہ وہ مومن عورتوں سے نکاح کریں گے۔

۲- ''ہاتھ لگانے'' یا ''مَس'' کرنے سے مراد لغت کے اعتبار سے تو محض چھونا ہے، لیکن یہاں یہ لفظ کنایتاً مباشرت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ظاہرِ آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر شوہر نے مباشرت نہ کی ہو تو خواہ وہ عورت کے پاس تنہائی میں رہا ہو، بلکہ اسے ہاتھ بھی لگا چکا ہو تب بھی طلاق دینے کی صورت میں عدّت لازم نہ آئے۔ لیکن فقہا نے بر سبیلِ احتیاط یہ حکم لگایا ہے کہ اگر خَلْوَتِ صحیحہ ہو جائے (یعنی جس میں مباشرت ممکن ہو) تو اس کے بعد طلاق دینے کی صورت میں عدّت لازم آئے گی اور سقوطِ عدّت صرف اُس حالت میں ہوگا جب کہ خَلْوَت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔

۳- طلاق قبلِ خَلْوَت کی صورت میں عدّت ساقط ہو جانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس صورت میں مرد کا حقِ رُجوع باقی نہیں رہتا اور عورت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نکاح کر لے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حکم صرف طلاق قبلِ خلوت کا ہے۔ اگر خلوت سے پہلے عورت کا شوہر مر جائے تو اس صورت میں عدّتِ وفات ساقط نہیں ہوتی بلکہ عورت کو وہی چار مہینے دس دن کی عدّت گزارنی ہوتی ہے جو منکوحۂ مدخولہ کے لیے واجب ہے۔ (عدّت سے مراد وہ مدت ہے جس کے گزرنے سے پہلے عورت کے لیے دوسرا نکاح جائز نہ ہو۔)

۴- مَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ (تمھارے لیے ان پر کوئی عدّت لازم نہیں ہے) کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ عدّت عورت پر مرد کا حق ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ صرف مرد ہی کا حق ہے۔ دراصل اس میں دو حق اور بھی شامل ہیں: ایک، حقِ اولاد۔ دوسرے، حق اللہ یا حق الشرع۔ مرد کا حق وہ اس بنا ہے کہ اس دَوران میں اُس کو رُجوع کر لینے کا حق ہے، نیز اس بنا پر کہ اس کی اولاد کے نسب کا ثبوت اس بات پر منحصر ہے کہ عدّت کے زمانے میں عورت کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہو جائے۔ اولاد کا حق اس میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے باپ سے بچے کے نسب کا ثابت ہونا اس کے قانونی حُقوق قائم ہونے کے لیے ضروری ہے اور اس کے اَخلاقی مرتبے کا انحصار بھی اس امر پر ہے کہ اس کا نسب مُشْتَبہ نہ ہو۔ پھر اس میں حق اللہ (یا حق الشرع) اس لیے شامل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کی پروا نہ بھی ہو تو خدا کی شریعت ان حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو یہ پروانہ بھی لکھ کر دے دے

کہ میرے مرنے کے بعد یا مجھ سے طلاق لے لینے کے بعد تیرے اُوپر میری طرف سے کوئی عدّت واجب نہ ہوگی تب بھی شریعت کسی حال میں اس کو ساقط نہ کرے گی۔

۵- فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (ان کو کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو)۔اس حکم کا منشا دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر پورا کرنا ہوگا۔ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر کیا گیا تھا اور پھر خَلْوَت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اس صورت میں نصف مہر دینا واجب ہوگا، جیسا کہ سورۂ بَقَرہ کی آیت ۲۳۷ میں ارشاد ہوا ہے۔اس واجب سے زائد کچھ دینا لازم نہیں ہے مگر مستحب ہے۔ مثلاً یہ بات پسندیدہ ہے کہ نصف مہر دینے کے ساتھ مرد وہ جوڑا بھی عورت کے پاس ہی رہنے دے جو دُلھن بننے کے لیے اسے بھیجا گیا تھا، یا اور کچھ سامان اگر شادی کے موقع پر اسے دیا گیا تھا تو وہ واپس نہ لے۔ لیکن اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرنا واجب ہے، اور یہ ''کچھ نہ کچھ'' آدمی کی حیثیت اور مَقْدِرَت کے مطابق ہونا چاہیے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں فرمایا گیا ہے۔ علما کا ایک گروہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ مُتعۂ طلاق دینا بہر حال واجب ہے خواہ مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ (اسلامی فقہ کی اصطلاح میں مُتعۂ طلاق اُس مال کو کہتے ہیں جو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت عورت کو دیا جاتا ہے۔)

۶- بھلے طریقے سے رخصت کرنے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے بلکہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی تُھکّا فضیحتی کے بغیر شریفانہ طریقے سے عَلیحَدگی اختیار کر لی جائے۔ ایک آدمی کو اگر عورت پسند نہیں آئی ہے یا کوئی اور وجہِ شکایت پیدا ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ اس عورت کو نہیں رکھنا چاہتا تو بھلے آدمیوں کی طرح اسے طلاق دے اور رخصت کر دے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کے عُیوب لوگوں کے سامنے بیان کرے اور اپنی شکایتوں کے دفتر کھولے تا کہ کوئی دوسرا بھی اس عورت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن کے اس ارشاد سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مُعلّق کرنا خدائی تشریع کی حکمت و مَصْلَحَت کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس صورت میں ''بھلے طریقے سے رخصت کرنے'' کا کوئی امکان نہیں رہتا، بلکہ مرد نہ بھی چاہے تو تُھکّا فضیحتی اور بدنامی و رُسوائی ہو کر رہتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں اس امر کی کوئی گنجایش بھی نہیں ہے کہ مرد کا اختیارِ طلاق کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط ہو۔ آیت بالکل صراحت کے ساتھ ناکح کو طلاق کا اختیار دے رہی ہے اور اسی پر یہ ذمّہ داری ڈال رہی ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگانے سے پہلے عورت کو چھوڑنا چاہے تو لازماً نصف مَہْر دے کر یا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال دے کر چھوڑے۔ اس سے آیت کا مقصود صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کو کھیل بننے سے روکنے کے لیے مرد پر مالی ذمہ داری کا ایک بوجھ ڈال دیا جائے تا کہ وہ خود ہی اپنے اختیارِ طلاق کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور دو خاندانوں کے اندرونی معاملے میں کسی بیرونی مداخلت کی نوبت نہ آنے پائے، بلکہ شوہر سرے سے کسی کو یہ بتانے پر مجبور ہی نہ ہو کہ وہ بیوی کو کیوں چھوڑ رہا ہے۔

۷- ابنِ عباسؓ، سعید بن المُسَیَّبؒ، حَسن بصریؒ، علی بن الحسین (زین العابدینؒ)، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل نے آیت کے الفاظ ''جب تم نکاح کرو پھر طلاق دے دو'' سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق اُسی صورت میں واقع ہوتی ہے جب کہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا ہو۔ نکاح سے پہلے طلاق بے اثر ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص یوں کہے کہ ''اگر میں فُلاں عورت سے، یا فلاں قبیلے یا قوم

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ

اَے نبیؐ! ہم نے تمھارے لیے حلال کر دیں تمھاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں،[۸۷]

کی عورت سے، یا کسی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے"، تو یہ قول لغو و بے معنیٰ ہے، اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کی تائید میں یہ احادیث پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: لا طلاق لابن اٰدم فی ما لا یملك، "ابنِ آدم جس چیز کا مالک نہیں ہے اُس کے بارے میں طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا" (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ) اور لا طلاق قبل النکاح، "نکاح سے پہلے کوئی طلاق نہیں۔" (ابنِ ماجہ) مگر فقہا کی ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ اِس آیت اور اِن احادیث کا اطلاق صرف اِس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک غیر عورت کو جو اس کے نکاح میں نہ ہو یوں کہے کہ "تجھ پر طلاق ہے" یا "میں نے تجھے طلاق دی"۔ یہ قول بلاشبہ لغو ہے جس پر کوئی قانونی نتیجہ مُتَرَتّب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ یوں کہے کہ "اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھ پر طلاق ہے" تو یہ نکاح سے پہلے طلاق دینا نہیں ہے بلکہ دراصل وہ شخص اس امر کا فیصلہ اور اعلان کرتا ہے کہ جب وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی تو اس پر طلاق وارد ہو گی۔ یہ قول لغو و بے اثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جب بھی وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی اُسی وقت اُس پر طلاق پڑ جائے گی۔ یہ مسلک جن فقہا کا ہے ان کے درمیان پھر اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس نوعیت کے ایقاعِ طلاق کی وسعت کس حد تک ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام زُفَرؒ کہتے ہیں کہ خواہ کوئی شخص عورت یا قوم یا قبیلے کی تخصیص کرے یا مثال کے طور پر عام بات اس طرح کہے کہ "جس عورت سے بھی میں نکاح کروں اس پر طلاق ہے"، دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ ابوبکر جَصّاصؒ نے یہی رائے حضرت عمرؓ، عبداللہؓ بن مسعود، ابراہیم النخعی، مجاہد اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ سے بھی نقل کی ہے۔

سُفیان ثَوریؒ اور عثمان اَلْبَتّیؒ کہتے ہیں کہ طلاق صرف اُسی صورت میں پڑے گی جب کہنے والا یوں کہے کہ "اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے۔"

حسن بن صالحؒ، لَیث بن سعد اور عامر الشَّعْبیؒ کہتے ہیں کہ اس طرح کی طلاق عُمومیّت کے ساتھ بھی پڑ سکتی ہے بشرطیکہ اس میں کسی نوع کی تخصیص ہو۔ مثلاً آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں فلاں خاندان، یا فلاں قبیلے، یا فلاں شہر یا ملک یا قوم کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے۔"

ابنِ ابی لیلیٰ اور امام مالکؒ اوپر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مزید شرط یہ لگاتے ہیں کہ اس میں مدّت کا بھی تعیُّن ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں اس سال یا آیندہ دس سال کے اندر فلاں عورت یا فلاں گروہ کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے" تب یہ طلاق واقع ہو گی ورنہ نہیں۔ بلکہ امام مالکؒ اس پر اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ اگر یہ مدّت اتنی طویل ہو جس میں اس شخص کا زندہ رہنا متوقع نہ ہو تو اس کا قول بے اثر رہے گا۔

۸۷ — یہ دراصل جواب ہے ان لوگوں کے اعتراض کا جو کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے لوگوں کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع قرار دیتے ہیں، مگر خود انھوں نے یہ پانچویں بیوی کیسے کر لی۔ اس اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ

وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ
بَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ
وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ

اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمھاری مِلکیّت میں آئیں، اور تمھاری وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے، اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبیؐ اسے نکاح میں لینا چاہے۔[۸۸] یہ رعایت خالصتاً تمھارے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے

حضرت زینبؓ سے نکاح کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیویاںؓ موجود تھیں۔ ایک، حضرت سَودَہؓ جن سے ۳ قبلِ ہجرت میں آپؐ نے نکاح کیا تھا۔ دوسری، حضرت عائشہؓ جن سے نکاح تو ۳ قبلِ ہجرت میں ہو چکا تھا مگر ان کی رخصتی شوال ۱ھ میں ہوئی تھی۔ تیسری، حضرت حَفصہؓ جن سے شعبان ۳ھ میں آپؐ کا نکاح ہوا۔ اور چوتھی، حضرت اُمِّ سَلَمہؓ جنھیں حضورؐ نے شوال ۴ھ میں زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ اس طرح حضرت زینبؓ آپؐ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر کفار و منافقین جو اعتراض کر رہے تھے اُس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دے رہا ہے کہ اے نبیؐ! تمھاری یہ پانچوں بیویاں جنھیں مہر دے کر تم اپنے نکاح میں لائے ہو، ہم نے تمھارے لیے حلال کی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے چار کی قید لگانے والے بھی ہم ہی ہیں اور اپنے نبی کو اس قید سے مستثنیٰ کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔ اگر وہ قید لگانے کے ہم مجاز تھے تو آخر اس استثنا کے مجاز ہم کیوں نہیں ہیں۔

اس جواب کے بارے میں یہ بات پھر ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ اس سے مقصود کفار و منافقین کو مطمئن کرنا نہیں تھا بلکہ ان مسلمانوں کو مطمئن کرنا تھا جن کے دلوں میں مخالفینِ اسلام وسوسے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں چونکہ یقین تھا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نازل ہوا ہے، اس لیے قرآن کی ایک مُحکَم آیت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ نبیؐ نے چار بیویوں کے عام قانون سے اپنے آپ کو خود مستثنیٰ نہیں کر لیا ہے بلکہ یہ استثنا کا فیصلہ ہمارا کیا ہوا ہے۔

۸۸ – پانچویں بیوی کو حضورؐ کے لیے حلال کرنے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضورؐ کو چند مزید اقسام کی عورتوں سے بھی نکاح کی اجازت عطا فرمائی:

۱– وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپؐ کی مِلکیّت میں آئیں۔ اس اجازت کے مطابق حضورؐ نے غزوۂ بنی قُریظہ کے سبایا میں سے حضرت ریحانہؓ، غزوۂ بنی المُصطَلِق کے سبایا میں سے حضرت جُوَیرِیہؓ، غزوۂ خیبر کے سبایا میں سے حضرت صَفِیہؓ اور مُقَوقِس مصر کی بھیجی ہوئی حضرت ماریہ قِبطِیہؓ کو اپنے لیے مخصوص فرمایا۔ ان میں سے مُقدّم الذکر تین کو آپؐ نے آزاد

الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَ

نہیں ہے۔[89] ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حُدُود عائد کیے ہیں۔(تمھیں ان حُدُود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے) تاکہ تمھارے اُوپر کوئی تنگی نہ رہے،[90] اور

کر کے ان سے نکاح کیا تھا، لیکن حضرت ماریہؓ سے بَربِنائے مِلکِ یمین تمتّع فرمایا، ان کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا ہو۔

۲- آپؐ کی چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں میں سے وہ خواتین جنھوں نے ہجرت میں آپؐ کا ساتھ دیا ہو۔ آیت میں آپؐ کے ساتھ ''ہجرت کرنے'' کا جو ذکر آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہجرت کے سفر میں آپؐ کے ساتھ رہی ہوں، بلکہ یہ تھا کہ وہ بھی اسلام کی خاطر راہِ خدا میں ہجرت کر چکی ہوں۔ حضورؐ کو اختیار دیا گیا کہ اِن رشتہ دار مہاجر خواتین میں سے بھی آپؐ جس سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس اجازت کے مطابق آپؐ نے ۷ ھ میں حضرت اُمِّ حَبِیبہؓ سے نکاح فرمایا۔ (ضمناً اس آیت میں یہ صراحت بھی ہے کہ چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹیاں ایک مسلمان کے لیے حلال ہیں۔ اس معاملے میں اسلامی شریعت عیسائی اور یہودی، دونوں مذہبوں سے مختلف ہے۔ عیسائیوں کے ہاں کسی ایسی عورت سے نکاح نہیں ہوسکتا جس سے سات پشت تک مرد کا نسب ملتا ہو۔ اور یہودیوں کے ہاں سگی بھانجی اور بھتیجی تک سے نکاح جائز ہے۔)

۳- وہ مومن عورت جو اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہِبہ کرے، یعنی بلا مہر اپنے آپ کو حضورؐ کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہو اور حضورؐ اسے قبول کرنا پسند فرمائیں۔ اس اجازت کی بنا پر آپؐ نے شوال ۷ ھ میں حضرت میمونہؓ کو اپنی زوجیت میں لیا۔ لیکن آپؐ نے یہ پسند نہ کیا کہ مہر کے بغیر اُن کے ہِبہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ اس لیے آپؐ نے ان کی کسی خواہش اور مطالبے کے بغیر ان کو مہر عطا فرمایا۔ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے نکاح میں کوئی موہوبہ بیوی نہ تھیں۔ مگر اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپؐ نے ہبہ کرنے والی بیوی کو بھی مہر دیے بغیر نہ رکھا۔

۸۹- اس فقرے کا تعلق اگر صرف قریب کے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ دوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت اپنے آپ کو اس کے لیے ہِبہ کرے اور وہ بلا مہر اس سے نکاح کر لے۔ اور اگر اس کا تعلق اُوپر کی پوری عبارت سے مانا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی رعایت بھی صرف حضورؐ کے لیے ہے، عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کچھ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں جن میں اُمت کے دوسرے لوگ آپؐ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ قرآن وسنت کے تتبّع سے ایسے متعدّد احکام کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لیے نمازِ تہجّد فرض تھی اور باقی تمام امت کے لیے وہ نفل ہے۔ آپؐ کے لیے اور آپؐ کے خاندان والوں کے لیے صدقہ لینا حرام ہے اور کسی دوسرے کے لیے وہ حرام نہیں ہے۔ آپؐ کی میراث تقسیم نہ ہوسکتی تھی، باقی سب کی میراث کے لیے وہ احکام ہیں جو سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔ آپؐ کے لیے چار سے

زائد بیویاں حلال کی گئیں، بیویوں کے درمیان عدل آپؐ پر واجب نہیں کیا گیا، اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر نکاح کرنے کی آپؐ کو اجازت دی گئی، اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی بیویاں تمام اُمت پر حرام کر دی گئیں۔ ان میں سے کوئی خصوصیت بھی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ کے علاوہ کسی مسلمان کو حاصل ہو۔ مفسرین نے آپؐ کی ایک خُصوصیت یہ بھی بیان کی ہے کہ آپؐ کے لیے کتابیہ عورت سے نکاح ممنوع تھا، حالانکہ باقی امت کے لیے وہ حلال ہے۔

۹۰ — یہ وہ مَصْلَحت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام قاعدے سے مستثنیٰ فرمایا۔ ”تنگی نہ رہے“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ! آپؐ کی خواہشاتِ نفسانی بہت بڑھی ہوئی تھیں اس لیے آپؐ کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت دے دی گئی، تاکہ آپؐ صرف چار بیویوں تک محدود رہنے میں تنگی محسوس نہ فرمائیں۔ اس فقرے کا یہ مطلب صرف وہی شخص لے سکتا ہے جو تعصب میں اندھا ہو کر اس بات کو بھول جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۵ سال کی عمر میں ایک ایسی خاتون سے شادی کی تھی جن کی عمر اُس وقت ۴۰ سال تھی، اور پورے ۲۵ برس تک آپؐ ان کے ساتھ نہایت خوش گوار اِزدِواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر جب اُن کا انتقال ہو گیا تو آپؐ نے ایک اور سِنّ رسیدہ خاتون حضرت سَودَہؓ سے نکاح کیا اور پورے چار سال تک تنہا وہی آپؐ کی بیوی رہیں۔ اب آخر کون صاحبِ عقل اور ایمان دار آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ۵۳ سال کی عمر سے گزر جانے کے بعد یکایک حضورؐ کی خواہشاتِ نفسانی بڑھتی چلی گئیں اور آپؐ کو زیادہ سے زیادہ بیویوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ دراصل ”تنگی نہ رہے“ کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایک طرف تو اُس کارِ عظیم کو نگاہ میں رکھے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اوپر ڈالی تھی اور دوسری طرف ان حالات کو سمجھے جن میں یہ کارِ عظیم انجام دینے کے لیے آپؐ کو مامور کیا گیا تھا۔ تعصب سے ذہن کو پاک کر کے جو شخص بھی ان دونوں حقیقتوں کو سمجھ لے گا، وہ بخوبی جان لے گا کہ بیویوں کے معاملے میں آپؐ کو کُھلی اجازت دینا کیوں ضروری تھا، اور چار کی قید میں آپؐ کے لیے کیا ”تنگی“ تھی۔

حضورؐ کے سُپرد جو کام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ ایک اَن گھڑ قوم کو جو اسلامی نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ عام تہذیب وتمدُّن کے نقطۂ نظر سے بھی ناتراشیدہ تھی، ہر شعبۂ زندگی میں تعلیم و تربیَت دے کر ایک اعلیٰ درجے کی مہذب و شایستہ اور پاکیزہ قوم بنائیں۔ اس غرض کے لیے صرف مردوں کو تربیت دینا کافی نہ تھا، بلکہ عورتوں کی تربیت بھی اتنی ہی ضروری تھی۔ مگر جو اُصُولِ تمدن و تہذیب سکھانے کے لیے آپؐ مامور کیے گئے تھے اُن کی رُو سے مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اِختِلاط ممنوع تھا اور اس قاعدے کو توڑے بغیر آپؐ کے لیے عورتوں کو براہِ راست خود تربیت دینا ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر عورتوں میں کام کرنے کی صرف یہی ایک صورت آپؐ کے لیے ممکن تھی کہ مختلف عمروں اور ذہنی صلاحیتوں کی متعدّد خواتین سے آپؐ نکاح کریں، ان کو براہِ راست خود تعلیم و تربیَت دے کر اپنی مدد کے لیے تیار کریں، اور پھر اُن سے شہری اور بَدْوی اور جوان اور ادھیڑ اور بوڑھی، ہر قسم کی عورتوں کو دین سکھانے اور اَخلاق و تہذیب کے نئے اصول سمجھانے کا کام لیں۔

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی تھی کہ پرانے جاہلی نظامِ زندگی کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کر دیں۔ اس خدمت کی انجام دِہی میں جاہلی نظام کے عَلَم برداروں سے جنگ ناگزیر تھی۔ اور یہ کشمکش ایک ایسے ملک میں پیش آ رہی تھی جہاں قبائلی طرزِ زندگی اپنی مخصوص رِوایات کے ساتھ رائج تھا۔ ان حالات میں دوسری تدابیر کے ساتھ آپؐ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ آپؐ مختلف خاندانوں میں نکاح کر کے بہت سی دوستیوں کو پختہ اور بہت سی عداوتوں کو ختم کر دیں۔ چنانچہ

كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٠﴾ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ
مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ

اللہ غفور و رحیم ہے۔ تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو، اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلا لو۔ اس معاملے میں تم پر کوئی مضایقہ نہیں ہے۔

جن خواتین سے آپؐ نے شادیاں کیں ان کے ذاتی اوصاف کے علاوہ ان کے انتخاب میں یہ مَصلَحت بھی کم و بیش شامل تھی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حَفصہؓ کے ساتھ نکاح کر کے آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ اپنے تعلقات کو اور زیادہ گہرا اور مستحکم کر لیا۔ حضرت اُمِّ سَلَمہؓ اُس خاندان کی بیٹی تھیں جس سے ابوجہل اور خالدؓ بن ولید کا تعلق تھا۔ اور حضرت اُمِّ حَبیبہؓ ابوسُفیان کی بیٹی تھیں۔ ان شادیوں نے بہت بڑی حد تک اِن خاندانوں کی دشمنی کا زور توڑ دیا، بلکہ اُمِّ حبیبہؓ کے ساتھ حضورؐ کا نکاح ہونے کے بعد تو ابوسفیان پھر کبھی حضورؐ کے مقابلے پر نہ آیا۔ حضرت صَفِیّہؓ اور رَیحانہؓ یہودی خاندانوں سے تھیں۔ انھیں آزاد کر کے جب حضورؐ نے ان سے نکاح کیے تو آپؐ کے خلاف یہودیوں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ کیونکہ اُس زمانے میں عَرَبی رِوایات کے مطابق جس شخص سے کسی قبیلے کی بیٹی بیاہی جاتی تھی وہ صرف لڑکی کے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پورے قبیلے کا داماد سمجھا جاتا تھا، اور داماد سے لڑنا بڑے عار کی بات تھی۔

معاشرے کی عملی اصلاح اور اس کی جاہلانہ رُسوم کو توڑنا بھی آپؐ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ چنانچہ ایک نکاح آپؐ کو اِس مقصد کے لیے بھی کرنا پڑا، جیسا کہ اسی سورۂ احزاب میں مفصّل بیان ہو چکا ہے۔

یہ مَصلحتیں اس بات کی مقتضی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رکھی جائے۔ تاکہ جو کارِ عظیم آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا اُس کی ضروریات کے لحاظ سے آپؐ جتنے نکاح کرنا چاہیں کر لیں۔

اِس بیان سے اُن لوگوں کے خیال کی غَلَطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ تعدّدِ ازواج صرف چند خاص شخصی ضرورتوں کی خاطر ہی جائز ہے اور اُن کے ماسوا کوئی غرض ایسی نہیں ہو سکتی جس کے لیے یہ جائز ہو۔ ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک سے زائد نکاح کیے ان کی وجہ یہ نہ تھی کہ بیوی بیمار تھی، یا بانجھ تھی، یا اولادِ نرینہ نہ تھی، یا کچھ یتیموں کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان محدود شخصی ضروریات کے بغیر آپؐ نے تمام نکاح یا تو تبلیغی و تعلیمی ضروریات کے لیے کیے، یا اصلاحِ معاشرہ کے لیے، یا سیاسی و اجتماعی مقاصد کے لیے۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ نے خود تعدُّدِ ازواج کو اُن چند گنی چُنی مخصوص اغراض تک، جن کا آج نام لیا جا رہا ہے، محدود نہیں رکھا، اور اللہ کے رسولؐ نے اُن کے سوا بہت سے دوسرے مقاصد کے لیے متعدّد نکاح کیے، تو کوئی دوسرا شخص کیا حق رکھتا ہے کہ قانون میں اپنی طرف سے چند قُیود تجویز کرے اور اُوپر سے دعویٰ یہ کرے کہ یہ حد بندیاں وہ شریعت کے مطابق کر رہا ہے۔ دراصل ان ساری حد بندیوں کی جڑ یہ مغربی تخیّل ہے کہ تعدُّدِ ازواج بجائے خود ایک برائی ہے۔ اسی تخیل کی بنا پر یہ نظریہ پیدا ہوا ہے کہ یہ فعلِ حرام اگر کبھی حلال ہو بھی ہو سکتا ہے تو صرف شدید ناگزیر ضروریات کے لیے ہو سکتا ہے۔ اب اس درآمد شدہ تخیل پر اسلام کا جَعلی ٹھپّا لگانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے،

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِىْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا

اِس طرح زیادہ متوقّع ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی، اور جو کچھ بھی تم اُن کو دو گے اس پر وہ سب راضی رہیں گی۔[91] اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے، اور اللہ علیم و

قرآن و سنت اور پوری اُمتِ مسلمہ کا لٹریچر اس سے قطعاً ناآشنا ہے۔

۹۱- اس آیت سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خانگی زندگی کی الجھنوں سے نجات دلانا تھا تا کہ آپؐ پورے سُکون کے ساتھ اپنا کام کر سکیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں حضورؐ کو پورے اختیارات دے دیے کہ ازواجِ مطہراتؓ میں سے جس کے ساتھ جو برتاؤ چاہیں کریں تو اس بات کا کوئی امکان نہ رہا کہ یہ مومن خواتین آپؐ کو کسی طرح پریشان کرتیں یا آپس میں مُسابقت اور رقابت کے جھگڑے پیدا کر کے آپؐ کے لیے اُلجھنیں پیدا کرتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ اختیار پا لینے کے بعد بھی حضورؐ نے تمام ازواج کے درمیان پورا پورا عدل فرمایا، کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی، اور باقاعدہ باری مقرر کر کے آپؐ سب کے ہاں تشریف لے جاتے رہے۔ محدثین میں سے صرف ابورَزِینؒ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے صرف چار بیویوں (حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ) کو باریوں کی تقسیم میں شامل کیا تھا اور باقی ازواج کے لیے کوئی باری مقرر نہ کی تھی۔ لیکن دوسرے تمام محدثین و مفسرین اس کی تردید کرتے ہیں اور نہایت قوی رِوایات سے اس امر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس اختیار کے بعد بھی حضورؐ تمام ازواج کے ہاں باری باری سے جاتے تھے اور سب سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ بخاری، مسلم، نَسائی اور ابوداؤد وغیرہم حضرت عائشہؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ "اس آیت کے نزول کے بعد بھی حضورؐ کا طریقہ یہی رہا کہ آپؐ ہم میں سے کسی بیوی کی باری کے دن دوسری بیوی کے ہاں جاتے تو اس سے اجازت لے کر جاتے تھے۔" ابوبکر جَصّاصؒ عُروہؒ بن زبیرؓ کی رِوایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باریوں کی تقسیم میں ہم میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ اگرچہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ کسی روز اپنی سب بیویوں کے ہاں نہ جاتے ہوں، مگر جس بیوی کی باری کا دن ہوتا تھا اس کے سوا کسی دوسری بیوی کو چھوتے تک نہ تھے۔" اور یہ رِوایت بھی حضرت عائشہؓ ہی کی ہے کہ جب حضورؐ اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہوئے اور نقل و حرکت آپؐ کے لیے مُشکل ہو گئی تو آپؐ نے سب بیویوں سے اجازت طَلب کی کہ مجھے عائشہؓ کے ہاں رہنے دو، اور جب سب نے اجازت دے دی تب آپؐ نے آخری زمانہ حضرت عائشہؓ کے ہاں گزارا۔ ابنِ ابی حاتمؒ امام زُہریؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بیوی کو باری سے محروم کرنا ثابت نہیں ہے۔ اس سے صرف حضرت سودہؓ مستثنیٰ ہیں جنھوں نے خود اپنی باری بخوشی حضرت عائشہؓ کو بخش دی تھی، کیونکہ وہ بہت سِنّ رسیدہ ہو چکی تھیں۔

اس مَقام پر کسی کے دل میں یہ شبہ نہ رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ اس آیت میں اپنے نبی کے ساتھ کوئی بے جا رعایت کی تھی اور ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ فرمایا تھا۔ دراصل جن عظیم مصالح کی خاطر نبیؐ کو بیویوں کی تعداد

حَلِیْمًا ﴿۵۱﴾ لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ ط

حلیم ہے۔[۹۲] اس کے بعد تمھارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں، اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ اُن کا حُسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو،[۹۳] البتہ لونڈیوں کی تمھیں اجازت ہے۔[۹۴]

کے معاملے میں عام قاعدے سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، انھی مصالح کا تقاضا یہ بھی تھا کہ آپؐ کو خانگی زندگی کا سکون بہم پہنچایا جائے اور اُن اسباب کا سدِّباب کیا جائے جو آپؐ کے لیے پریشان خاطری کے موجب ہو سکتے ہوں۔ ازواجِ مطہراتؓ کے لیے یہ ایک بہت بڑا شرف تھا کہ انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بزرگ ترین ہستی کی زوجیت حاصل ہوئی اور اس کی بدولت اُن کو یہ موقع نصیب ہوا کہ دعوت و اصلاح کے اُس عظیم الشان کام میں آپؐ کی رفیقِ کار بنیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بننے والا تھا۔ اس مقصد کے لیے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر معمولی ایثار و قربانی سے کام لے رہے تھے اور تمام صحابۂ کرامؓ اپنی حدِ استطاعت تک قربانیاں کر رہے تھے اسی طرح ازواجِ مطہراتؓ کا بھی یہ فرض تھا کہ ایثار سے کام لیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کو تمام ازواجِ رسولؐ نے بخوشی قبول کیا۔

۹۲- یہ تنبیہ ہے ازواجِ مطہراتؓ کے لیے بھی اور دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی۔ ازواجِ مطہراتؓ کے لیے تنبیہ اس بات کی ہے کہ اللہ کا یہ حکم آ جانے کے بعد اگر وہ دل میں بھی کبیدہ خاطر ہوں گی تو گرفت سے نہ بچ سکیں گی۔ اور دوسرے لوگوں کے لیے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِزدِواجی زندگی کے متعلق کسی طرح کی بدگمانی بھی اگر انھوں نے اپنے دل میں رکھی یا فکر و خیال کے کسی گوشے میں بھی کوئی وسوسہ پالتے رہے تو اللہ سے ان کی یہ چوری چھپی نہ رہ جائے گی۔ اس کے ساتھ اللہ کی صفتِ حِلم کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ نبیؐ کی شان میں گستاخی کا تخیل بھی اگرچہ سخت سزا کا مُستَوجِب ہے، لیکن جس کے دل میں کبھی ایسا کوئی وسوسہ آیا ہو وہ اگر اسے نکال دے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی کی اُمید ہے۔

۹۳- اس ارشاد کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ جو عورتیں اوپر آیت نمبر ۵۰ میں حضورؐ کے لیے حلال کی گئی ہیں ان کے سوا دوسری کوئی عورت اب آپؐ کے لیے حلال نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جب آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ اس بات کے لیے راضی ہو گئی ہیں کہ تنگی و ترشی میں آپؐ کا ساتھ دیں اور آخرت کے لیے دنیا کو انھوں نے تج دیا ہے، اور اس پر بھی خوش ہیں کہ آپؐ جو برتاؤ بھی ان کے ساتھ چاہیں کریں، تو اب آپؐ کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی اور بیوی لے آئیں۔

۹۴- یہ آیت اس امر کی صراحت کر رہی ہے کہ منکوحہ بیویوں کے علاوہ مملوکہ عورتوں سے بھی تمتُّع کی اجازت ہے اور ان کے لیے تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ اسی مضمون کی تصریح سورۂ نساء آیت ۳، سورۂ مومنون آیت ۶، اور سورۂ معارج آیت ۳۰ میں بھی کی گئی ہے۔ ان تمام آیات میں مملوکہ عورتوں کو منکوحہ ازواج کے بالمقابل ایک الگ صِنف کی حیثیت سے بیان

ع ۶ ۱۲ ۳

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا
بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ

اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نبیؐ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔[95] نہ کھانے کا وقت

کیا گیا ہے اور پھر ان کے ساتھ اِزدِواجی تعلق کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ نیز سورۂ نساء کی آیت ۳ منکوحہ بیویوں کے لیے چار کی حد مقرر کرتی ہے، مگر نہ اُس جگہ اللہ تعالیٰ نے مملوکہ عورتوں کے لیے تعداد کی حد مقرر کی ہے اور نہ دوسری متعلقہ آیات میں ایسی کسی حد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ بلکہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ کے لیے اس کے بعد دوسری عورتوں سے نکاح کرنا، یا موجودہ بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لانا تو حلال نہیں ہے، البتہ مملوکہ عورتیں حلال ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مملوکہ عورتوں کے معاملے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کی شریعت یہ گنجایش مال دار لوگوں کو بے حساب لونڈیاں خرید خرید کر عیاشی کرنے کے لیے دیتی ہے۔ دراصل یہ تو ایک بے جا فائدہ ہے جو نفس پرست لوگوں نے قانون سے اُٹھایا ہے۔ قانون بجائے خود انسانوں کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا، اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ لوگ اس سے یہ فائدہ اُٹھائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے شریعت ایک مرد کو چار تک بیویاں کرنے کی اجازت دیتی ہے، اور اسے یہ حق بھی دیتی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لے آئے۔ یہ قانون انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا تھا۔ اب اگر کوئی شخص محض عیاشی کی خاطر یہ طریقہ اختیار کرے کہ چار بیویوں کو کچھ مدت رکھ کر طلاق دیتا اور پھر ان کی جگہ بیویوں کی دوسری کھیپ لاتا چلا جائے، تو یہ قانون کی گنجایشوں سے ناروا فائدہ اُٹھانا ہے جس کی ذمہ داری خود اسی شخص پر عائد ہوگی نہ کہ خدا کی شریعت پر۔ اسی طرح شریعت نے جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو، جب کہ ان کی قوم مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ کرنے یا فِدیہ دے کر اُن کو چھڑانے کے لیے تیار نہ ہو، لونڈی بنانے کی اجازت دی، اور جن اشخاص کی مِلکیّت میں وہ حکومت کی طرف سے دے دی جائیں اُن کو یہ حق دیا کہ ان عورتوں سے تمتّع کریں، تاکہ اُن کا وجود معاشرے کے لیے اَخلاقی فساد کا سبب نہ بن جائے۔ پھر چونکہ لڑائیوں میں گرفتار ہونے والے لوگوں کی کوئی تعداد مُعیّن نہیں ہو سکتی تھی اس لیے قانوناً اس امر کی بھی حد معیَّن نہیں کی جا سکتی تھی کہ ایک شخص بیک وقت کتنے غلام اور کتنی لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ لونڈیوں اور غلاموں کی خرید و فروخت کو بھی اس بنا پر جائز رکھا گیا کہ اگر کسی لونڈی یا غلام کا نباہ ایک مالک سے نہ ہو سکے تو وہ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل ہو سکے اور ایک ہی شخص کی دائمی ملکیت مالک و مملوک دونوں کے لیے عذاب نہ بن جائے۔ شریعت نے یہ سارے قواعد انسانی حالات و ضروریات کو ملحوظ رکھ کر سہولت کی خاطر بنائے تھے۔ اگر ان کو مال دار لوگوں نے عیاشی کا ذریعہ بنا لیا تو اس کا الزام انھی پر ہے نہ کہ شریعت پر۔

۹۵ — یہ اُس حکمِ عام کی تمہید ہے جو تقریباً ایک سال کے بعد سورۂ نُور کی آیت ۲۷ میں دیا گیا۔ قدیم زمانے میں

اِنَّهٗ ۟ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ

تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمھیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔[۹۶] مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔[۹۷] تمھاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں

اہلِ عرب بے تکلّف ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے ملنا ہوتا تو وہ دروازے پر کھڑے ہو کر پکارنے اور اجازت لے کر اندر جانے کا پابند نہ تھا۔ بلکہ اندر جا کر عورتوں اور بچّوں سے پوچھ لیتا تھا کہ صاحبِ خانہ گھر میں ہے یا نہیں۔ یہ جاہلانہ طریقہ بہت سی خرابیوں کا موجب تھا۔ اور بسا اوقات اس سے بہت گھناؤنے اخلاقی مفاسد کا بھی آغاز ہو جاتا تھا۔ اس لیے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ کوئی شخص، خواہ وہ قریبی دوست یا دُور پرے کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، آپؐ کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ پھر سورۂ نور میں اس قاعدے کو تمام مسلمانوں کے گھروں میں رائج کرنے کا عام حکم دے دیا گیا۔

۹۶ – یہ اس سلسلے کا دوسرا حکم ہے۔ جو غیر مہذّب عادات اہلِ عرب میں پھیلی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کسی دوست یا ملاقاتی کے گھر کھانے کا وقت تاک کر پہنچ جاتے۔ یا اس کے گھر آ کر بیٹھے رہتے یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو جائے۔ اس حرکت کی وجہ سے صاحبِ خانہ اکثر عجیب مشکل میں پڑ جاتا تھا۔ منہ پھوڑ کر کہے کہ میرے کھانے کا وقت ہے، آپ تشریف لے جائیے، تو بے مُروّتی ہے۔ کھلائے تو آخر اچانک آئے ہوئے کتنے آدمیوں کو کھلائے۔ ہر وقت ہر آدمی کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ جب جتنے آدمی بھی اس کے ہاں آ جائیں، ان کے کھانے کا انتظام فوراً کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے ہودہ عادت سے منع فرمایا اور حکم دے دیا کہ کسی شخص کے گھر کھانے کے لیے اُس وقت جانا چاہیے جب کہ گھر والا کھانے کی دعوت دے۔ یہ حکم صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے لیے خاص نہ تھا بلکہ اُس نمونے کے گھر میں یہ قواعد اسی لیے جاری کیے گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں عام تہذیب کے ضابطے بن جائیں۔

۹۷ – یہ ایک اور بے ہودہ عادت کی اصلاح ہے۔ بعض لوگ کھانے کی دعوت میں بلائے جاتے ہیں تو کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپس میں گفتگو کا ایسا سلسلہ چھیڑ دیتے ہیں جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انھیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ صاحبِ خانہ اور گھر کے لوگوں کو اس سے کیا زحمت ہوتی ہے۔ ناشایستہ لوگ اپنی اس عادت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تنگ کرتے رہتے تھے اور آپؐ اپنے اخلاقِ کریمانہ کی وجہ سے اس کو برداشت کرتے تھے۔ آخر کار حضرت زینبؓ کے ولیمے کے روز یہ حرکت اذیت رسانی کی حد سے گزر گئی۔ حضورؐ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ بن مالک کی رِوایت ہے کہ رات کے وقت ولیمے کی دعوت تھی۔ عام لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے، مگر دو تین حضرات بیٹھ کر باتیں کرنے میں لگ گئے۔ تنگ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے اور ازواجِ مطہراتؓ کے ہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپؐ پھر

مِنۡكُمۡ ۫ وَاللّٰهُ لَا يَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَـقِّ‌ؕ وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـئَلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِكُمۡ وَقُلُوۡبِهِنَّ‌ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمۡ اَنۡ تُؤۡذُوۡا رَسُوۡلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنۡ تَـنۡكِحُوۡۤا اَزۡوَاجَهٗ

کہتے۔ اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے[98]۔ تمھارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو[99]، اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے

پلٹ گئے اور حضرت عائشہؓ کے حُجرے میں جا بیٹھے۔ اچھی خاصی رات گزر جانے پر جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں تب آپؐ حضرت زینبؓ کے مکان میں تشریف لائے۔ اس کے بعد ناگزیر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ خود ان بُری عادات پر لوگوں کو مُتنبہ فرمائے۔ حضرت انسؓ کی رِوایت کے مطابق یہ آیات اسی موقع پر نازل ہوئی تھیں۔ (مسلم، نَسائی، ابنِ جَریر)

۹۸- یہی آیت ہے جس کو آیتِ حجاب کہا جاتا ہے۔ بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک کی رِوایت ہے کہ حضرت عمرؓ اس آیت کے نزول سے پہلے متعدّد مرتبہ حضوؐر سے عرض کر چکے تھے کہ یا رسولؐ اللہ! آپ کے ہاں بھلے اور بُرے سب ہی قسم کے لوگ آتے ہیں۔ کاش! آپ اپنی ازواجِ مطہراتؓ کو پردہ کرنے کا حکم دے دیتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ازواجِ رسولؐ سے کہا کہ ''اگر آپ کے حق میں میری بات مانی جائے تو کبھی میری نگاہیں آپ کو نہ دیکھیں۔'' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قانون سازی میں خود مختار نہ تھے، اِس لیے آپؐ اشارۂ الٰہی کے منتظر رہے۔ آخر کار یہ حکم آ گیا کہ مَحرم مردوں کے سوا (جیسا کہ آگے آیت ۵۵ میں آ رہا ہے) کوئی مرد حضوؐر کے گھر میں نہ آئے، اور جس کو بھی خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے۔ اس حکم کے بعد ازواجِ مطہّراتؓ کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکا دیے گئے، اور چونکہ حضوؐر کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا، اس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔ آیت کا آخری فقرہ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ بھی مردوں اور عورتوں کے دل پاک رکھنا چاہیں، انھیں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اب جس شخص کو بھی خدا نے بینائی عطا کی ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جو کتاب مردوں کو عورتوں سے رُو در رُو بات کرنے سے روکتی ہے، اور پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مَصلحت یہ بتاتی ہے کہ ''تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے''، اُس میں سے آخر یہ نرالی روح کیسے کشید کی جا سکتی ہے کہ مخلوط مجالس اور مخلوط تعلیم اور جُمہوری ادارات اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کا بے تکلُّف میل جول بالکل جائز ہے اور اس سے دلوں کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کو قرآن کی پیروی نہ کرنی ہو تو اس کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرے اور صاف صاف کہے کہ میں اس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ تو بڑی ہی ذلیل حرکت ہے کہ وہ قرآن کے صریح احکام کی خلاف ورزی بھی کرے اور پھر ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی کہے

مِنۡۢ بَعۡدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمۡ كَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمًا ﴿۵۳﴾ اِنۡ تُبۡدُوۡا
شَيۡـئًا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴿۵۴﴾ لَا جُنَاحَ
عَلَيۡهِنَّ فِىۡۤ اٰبَآئِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآئِهِنَّ وَلَاۤ اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ
اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتۡ
اَيۡمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيۡنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا ﴿۵۵﴾

نکاح کرو،[۱۰۰] یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم[۱۰۱] ہے۔

ازواجِ نبیؐ کے لیے اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے،[۱۰۲] ان کے میل جول کی عورتیں[۱۰۳] اور ان کے مملوک[۱۰۴] گھروں میں آئیں۔ (اے عورتو!) تمھیں اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔[۱۰۵]

کہ یہ اسلام کی ''روح'' ہے جو میں نے نکال لی ہے۔ آخر وہ اسلام کی کون سی روح ہے جو قرآن و سنت کے باہر کسی جگہ ان لوگوں کو مل جاتی ہے؟

۹۹– یہ اشارہ ہے اُن الزام تراشیوں کی طرف جو اس زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کی جا رہی تھیں اور کفار و منافقین کے ساتھ بعض ضعیف الایمان مسلمان بھی ان میں حصہ لینے لگے تھے۔

۱۰۰– یہ تشریح ہے اُس ارشاد کی جو آغازِ سورہ میں گزر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اہلِ ایمان کی مائیں ہیں۔

۱۰۱– یعنی اگر حضورؐ کے خلاف دل میں بھی کوئی بُرا خیال کوئی شخص رکھے گا، یا آپؐ کی ازواج کے متعلق کسی کی نیت میں بھی کوئی بُرائی چھپی ہوگی، تو اللہ تعالیٰ سے وہ چھپی نہ رہے گی اور وہ اس پر سزا پائے گا۔

۱۰۲– تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور حواشی نمبر ۳۸ تا ۴۲۔ اس سلسلے میں علامہ آلوسیؒ کی یہ تشریح بھی قابلِ ذکر ہے کہ ''بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کے حکم میں وہ سب رشتہ دار آجاتے ہیں جو ایک عورت کے لیے حرام ہوں، خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا رضاعی۔ اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلۂ والدین ہیں۔ یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کر دیا گیا کہ بھانجوں اور بھتیجوں کا ذکر آجانے کے بعد اُن کے ذکر کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ بھی ہے۔'' (روح المعانی)

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ
وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُۥ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا
وَالْءَاخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ
وَالْمُؤْمِنَٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَٰنًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٨﴾ ع

ع ۷

اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر دُرود بھیجتے ہیں،[۱۰۶] اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر دُرود و سلام بھیجو۔[۱۰۷]

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیّت دیتے ہیں ان پر دُنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور اُن کے لیے رُسوا کُن عذاب مہیّا کر دیا ہے۔[۱۰۸] اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیّت دیتے ہیں اُنھوں نے ایک بڑے بہتان[۱۰۹] اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔ ع

۱۰۳ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ نمبر ۴۳۔

۱۰۴ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ نمبر ۴۴۔

۱۰۵ — اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس حکمِ قطعی کے آجانے کے بعد آیندہ کسی ایسے شخص کو گھروں میں بے حجاب آنے کی اجازت نہ دی جائے جو اِن مستثنیٰ رشتہ داروں کے دائرے سے باہر ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ خواتین کو یہ رَوِش ہرگز نہ اختیار کرنی چاہیے کہ وہ شوہر کی موجودگی میں تو پردے کی پابندی کریں مگر جب وہ موجود نہ ہو تو غیر محرم مردوں کے سامنے پردہ اٹھا دیں۔ ان کا یہ فعل چاہے ان کے شوہر سے چھپا رہ جائے، خدا سے تو نہیں چھپ سکتا۔

۱۰۶ — اللہ کی طرف سے اپنے نبی پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپؐ پر بے حد مہربان ہے، آپؐ کی تعریف فرماتا ہے، آپؐ کے کام میں برکت دیتا ہے، آپؐ کا نام بلند کرتا ہے اور آپؐ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرماتا ہے۔ ملائکہ کی طرف سے آپؐ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپؐ سے غایت درجے کی محبّت رکھتے ہیں اور آپؐ کے حق میں اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپؐ کو زیادہ سے زیادہ بلند مرتبے عطا فرمائے، آپؐ کے دین کو سر بلند کرے، آپؐ کی شریعت کو فروغ بخشے اور آپؐ کو مقامِ محمود پر پہنچائے۔ سیاق و سباق پر نگاہ ڈالنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ بات کس لیے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا جب دشمنانِ اسلام اس دینِ مبین کے فروغ پر اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے حضورؐ کے خلاف الزامات کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور

اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کیچڑ اچھال کر وہ آپؐ کے اُس اَخلاقی اثر کو ختم کر دیں گے جس کی بدولت اسلام اور مسلمانوں کے قدم روز بروز بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ان حالات میں یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو یہ بتایا کہ کفار و مشرکین اور منافقین میرے نبی کو بدنام کرنے اور نیچا دکھانے کی جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں، آخرِ کار وہ منہ کی کھائیں گے، اس لیے کہ میں اس پر مہربان ہوں اور ساری کائنات کا نظم ونسق جن فرشتوں کے ذریعے سے چل رہا ہے وہ سب اس کے حامی اور ثناخواں ہیں۔ وہ اس کی مَذمّت کر کے کیا پا سکتے ہیں جب کہ میں اس کا نام بلند کر رہا ہوں اور میرے فرشتے اس کی تعریفوں کے چرچے کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اوچھے ہتھیاروں سے اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں جب کہ میری رحمتیں اور برکتیں اس کے ساتھ ہیں اور میرے فرشتے شب و روز دعا کر رہے ہیں کہ ربّ العالمین! محمدؐ کا مرتبہ اور زیادہ اونچا کر اور اس کے دین کو اور زیادہ فروغ دے۔

۱۰۷ - دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اے لوگو جن کو محمدؐ رسول اللہ کی بدولت راہِ راست نصیب ہوئی ہے، تم ان کی قدر پہچانو اور ان کے احسانِ عظیم کا حق ادا کرو۔ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، اس شخص نے تمھیں علم کی روشنی دی۔ تم اَخلاق کی پستیوں میں گرے ہوئے تھے، اس شخص نے تمھیں اُٹھایا اور اس قابل بنایا کہ آج محسودِ خلائق بنے ہوئے ہو۔ تم وحشت اور حیوانیت میں مبتلا تھے، اس شخص نے تم کو بہترین انسانی تہذیب سے آراستہ کیا۔ کفر کی دنیا اسی لیے اس شخص پر خار کھا رہی ہے کہ اس نے یہ احسانات تم پر کیے، ورنہ اس نے کسی کے ساتھ ذاتی طور پر کوئی بُرائی نہ کی تھی۔ اس لیے اب تمھاری احسان شناسی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جتنا بُغض وہ اس خیرِ مجسّم کے خلاف رکھتے ہیں اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ مَحبّت تم اس سے رکھو، جتنی وہ اس سے نفرت کرتے ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے گرویدہ ہو جاؤ، جتنی وہ اس کی مَذمّت کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کی تعریف کرو، جتنے وہ اس کے بدخواہ ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے خیر خواہ بنو اور اس کے حق میں وہی دعا کرو جو اللہ کے فرشتے شب و روز اس کے لیے کر رہے ہیں کہ اے ربِّ دوجہاں! جس طرح تیرے نبیؐ نے ہم پر بے پایاں احسانات فرمائے ہیں، تو بھی ان پر بے حد و بے حساب رحمت فرما، ان کا مرتبہ دُنیا میں بھی سب سے زیادہ بلند کر اور آخرت میں بھی انھیں تمام مُقرّبین سے بڑھ کر تقرّب عطا فرما۔

اس آیت میں مسلمانوں کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے: ایک، صَلُّوْا عَلَیْہِ۔ دوسرے، سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

صَلٰوۃ کا لفظ جب عَلٰی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے تین معنیٰ ہوتے ہیں: ایک، کسی پر مائل ہونا، اس کی طرف مَحبّت کے ساتھ متوجہ ہونا اور اُس پر جُھکنا۔ دوسرے، کسی کی تعریف کرنا۔ تیسرے، کسی کے حق میں دعا کرنا۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جائے گا تو ظاہر ہے کہ تیسرے معنیٰ میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ کا کسی اَور سے دعا کرنا قطعاً ناقابلِ تصور ہے۔ اس لیے لامحالہ وہ صرف پہلے دو معنوں میں ہوگا۔ لیکن جب یہ لفظ بندوں کے لیے بولا جائے گا، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، تو وہ تینوں معنوں میں ہوگا۔ اس میں مَحبّت کا مفہوم بھی ہوگا، مَدح وثنا کا مفہوم بھی اور دعائے رحمت کا مفہوم بھی۔ لہٰذا اہلِ ایمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صَلُّوْا عَلَیْہِ کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے گرویدہ ہو جاؤ، ان کی مدح وثنا کرو، اور اُن کے لیے دعا کرو۔

سَلٰمٌ کا لفظ بھی دو معنیٰ رکھتا ہے: ایک، ہر طرح کی آفات اور نقائص سے محفوظ رہنا، جس کے لیے ہم اُردو میں سلامتی کا لفظ بولتے ہیں۔ دوسرے، صلح اور عدمِ مخالفت۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کہنے کا ایک مطلب یہ ہے

کہ تم ان کے حق میں کامل سلامتی کی دعا کرو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح دل و جان سے اُن کا ساتھ دو، اُن کی مُخالفت سے پرہیز کرو، اور ان کے سچے فرماں بردار بن کر رہو۔

یہ حکم جب نازل ہوا تو متعدّد صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! سلام کا طریقہ تو آپؐ ہمیں بتا چکے ہیں (یعنی نماز میں السّلام علیك ایّھا النبی ورحمة اللّٰه و برکاتهٗ اور ملاقات کے وقت السّلام علیك یا رسول اللّٰه کہنا) مگر آپؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضورؐ نے بہت سے لوگوں کو مختلف مواقع پر جو درود سکھائے ہیں، وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

کَعب بن عُجرہؓ: اَللّٰھمّ صَلِّ علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انك حمیدٌ مجید وبارِكْ علی محمد وعلی اٰلِ محمّد کما بارکت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انك حمید مجید۔ یہ درود تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرت کَعب بن عُجرہؓ سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی، ابنِ ماجہ، امام احمد، ابنِ ابی شَیبَہ، عبدالرَّزّاق، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ جَریر نے روایت کیا ہے۔

ابنِ عباسؓ: ان سے بھی بہت خفیف فرق کے ساتھ وہی درود مروی ہے جو اوپر نقل ہوا ہے۔ (ابنِ جَریر)

ابوحُمَید ساعِدیؓ: اَللّٰھم صَلِّ علی محمّد وازواجه وذرّیّته کما صلّیت علی ابراھیم وبارك علی محمّد وازواجه وذرّیّته کما بارکت علی اٰل ابراھیم انك حمیدٌ مجید۔ (مالک، احمد، بخاری، مسلم، نَسائی، ابوداؤد، ابنِ ماجہ)

ابومسعود بدریؓ: اَللّٰھم صَلِّ علی محمد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم وبارك علی محمّد وعلی اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم فی العالمین انك حمید مجید۔ (مالک، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی، احمد، ابنِ جَریر، ابنِ حِبّان، حاکم)

ابوسعید خُدریؓ: اللّٰھمّ صَلِّ علی محمد عبدِك و رسولِك کما صلّیت علی ابراھیم وبارك علی محمّد وعلی اٰلِ محمّد کما بارکت علی ابراھیم۔ (احمد، بخاری، نَسائی، ابن ماجہ)

بُرَیدَۃ الخُزاعی: اللّٰھم اجعل صلوٰتك ورحمتك وبرکاتك علی محمد وعلی اٰل محمّدٍ کما جعلتھا عَلی ابراھیم انك حمید مجید۔ (احمد، عبد بن حُمَید، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

ابوہُرَیرہؓ: اللّٰھمّ صل علی محمّد وعلی اٰل محمّدٍ وبارِك علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت و بارکت علی ابراھیم واٰل ابراھیم فی العالمین انك حمید مجید۔ (نَسائی)

طلحہؓ: اللّٰھُمّ صلِّ علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم انك حمید مجید وبارك علی محمد وعلی اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم انك حمید مجید۔ (ابنِ جریر)

یہ تمام درود الفاظ کے اختلاف کے باوجود معنیٰ میں متفق ہیں۔ ان کے اندر چند اہم نِکات ہیں جنھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

اوّلاً، ان سب میں حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ مجھ پر درود بھیجنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے

دُعا کرو کہ اے خدا! تو محمدؐ پر درود بھیج۔ نادان لوگ جنھیں معنیٰ کا شعور نہیں ہے اس پر فوراً یہ اعتراض جَڑ دیتے ہیں کہ یہ تو عجیب بات ہوئی، اللہ تعالیٰ تو ہم سے فرمار ہا ہے کہ تم میرے نبی پر درود بھیجو، مگر ہم الٹا اللہ سے کہتے ہیں کہ تو درود بھیج۔ حالانکہ دراصل اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ تم مجھ پر ''صلوٰۃ'' کا حق ادا کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکتے، اس لیے اللہ ہی سے دعا کرو کہ وہ مجھ پر صلوٰۃ فرمائے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم حضورؐ کے مراتب بلند نہیں کر سکتے، اللہ ہی بلند کر سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے، اللہ ہی ان کا اجر دے سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے رفعِ ذکر کے لیے اور آپؐ کے دین کو فروغ دینے کے لیے خواہ کتنی ہی کوشش کریں، اللہ کے فضل اور اس کی توفیق و تائید کے بغیر اُس میں کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ حتّٰی کہ حضورؐ کی محبّت و عقیدت بھی ہمارے دل میں اللہ ہی کی مدد سے جا گزیں ہو سکتی ہے ورنہ شیطان نہ معلوم کتنے وساوس دل میں ڈال کر ہمیں آپؐ سے منحرف کر سکتا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذالك۔ لہٰذا حضورؐ پر صلوٰۃ کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ سے آپؐ پر صلوٰۃ کی دُعا کی جائے۔ جو شخص اللّٰھُمَّ صَلِّ علٰی محمّدٍ کہتا ہے وہ گویا اللہ کے حضور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ خدایا! تیرے نبی پر صلوٰۃ کا جو حق ہے اسے ادا کرنا میرے بس میں نہیں ہے، تُو ہی میری طرف سے اس کو ادا کر اور مجھ سے اس کے ادا کرنے میں جو خدمت چاہے لے لے۔

ثانیاً، حضورؐ کی شانِ کرم نے یہ گوارا نہ فرمایا کہ تنہا اپنی ہی ذات کو اس دعا کے لیے مخصوص فرما لیں، بلکہ اپنے ساتھ اپنی آل اور ازواج اور ذُرّیّت کو بھی آپؐ نے شامل کر لیا۔ ازواج اور ذرّیّت کے معنیٰ تو ظاہر ہیں۔ رہا آل کا لفظ، تو وہ محض حضورؐ کے خاندان والوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں وہ سب لوگ آجاتے ہیں جو آپؐ کے پَیرو ہوں اور آپؐ کے طریقے پر چلیں۔ عَرَبی لغت کی رو سے آل اور اہل میں فرق یہ ہے کہ کسی شخص کی آل وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے ساتھی، مددگار اور مُتّبِع ہوں، خواہ وہ اس کے رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔ اور کسی شخص کے اہل وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے رشتہ دار ہوں، خواہ وہ اس کے ساتھی اور متبع ہوں یا نہ ہوں۔ قرآنِ مجید میں ۱۴ مقامات پر آلِ فرعون کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان میں سے کسی جگہ بھی آل سے مراد محض فرعون کے خاندان والے نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں اس کے ساتھی تھے۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: سورۂ بَقرہ آیات ۴۹-۵۰۔ آلِ عمران: ۱۱۔ الاعراف: ۱۳۰۔ المومن: ۴۶) پس آلِ محمدؐ سے ہر وہ شخص خارج ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر نہ ہو، خواہ وہ خاندانِ رسالت ہی کا ایک فرد ہو، اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتا ہو، خواہ وہ حضورؐ سے کوئی دور کا بھی نسبی تعلق نہ رکھتا ہو، البتہ خاندانِ رسالت کے وہ افراد بدرجۂ اَولیٰ آلِ محمدؐ ہیں جو آپؐ سے نسبی تعلق بھی رکھتے ہیں اور آپؐ کے پیرو بھی ہیں۔

ثالثاً، ہر درود جو حضورؐ نے سکھایا ہے اس میں یہ بات ضرور شامل ہے کہ آپؐ پر ویسی ہی مہربانی فرمائی جائے جیسی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر فرمائی گئی ہے۔ اس مضمون کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں علما نے کی ہیں، مگر کوئی تاویل دل کو نہیں لگتی۔ میرے نزدیک صحیح تاویل یہ ہے (والعلم عند اللّٰہ) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر ایک خاص کرم فرمایا ہے جو آج تک کسی پر نہیں فرمایا، اور وہ یہ ہے کہ تمام وہ انسان جو نبوت اور وحی اور کتاب کو ماخذِ ہدایت مانتے ہیں وہ حضرت ابراہیمؑ کی پیشوائی پر متفق ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ لہٰذا نبیؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جس

طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاؑ کے پیروؤں کا مَرجَع بنایا ہے، اسی طرح مجھے بھی بنا دے۔ اور کوئی ایسا شخص جو نبوت کا ماننے والا ہو، میری نبوت پر ایمان لانے سے محروم نہ رہ جائے۔

یہ امر کہ حضورؐ پر دُرود بھیجنا سنتِ اسلام ہے، جب آپؐ کا نام آئے اس کا پڑھنا مستحب ہے، اور خُصوصاً نماز میں اس کا پڑھنا مسنون ہے، اس پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے۔ اس امر پر بھی اجماع ہے کہ عمر میں ایک مرتبہ حضورؐ پر درود بھیجنا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اس کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد درود کے مسئلے میں علما کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ نماز میں آخری مرتبہ جب آدمی تشہُّد پڑھتا ہے، اس میں صلوٰۃ علی النبی پڑھنا فرض ہے، اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی۔ صحابہؓ میں سے ابنِ مسعودؓ، ابومسعود انصاریؓ، ابنِ عمرؓ، جابرؓ بن عبداللہ، تابعین میں سے شَعبیؒ، امام محمد باقرؒ، محمد بن کعب قُرظیؒ اور مُقاتِل بن حَیّانؒ، اور فقہا میں سے اسحاق بن رَاہَوَیہؒ کا بھی یہی مسلک تھا، اور آخر میں امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اسی کو اختیار کرلیا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، اور جُمہور علما کا مسلک یہ ہے کہ درود عمر میں صرف ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ یہ کلمۂ شہادت کی طرح ہے کہ جس نے ایک مرتبہ اللہ کی الٰہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرلیا، اس نے فرض ادا کر دیا۔ اسی طرح جس نے ایک دفعہ درود پڑھ لیا، وہ فریضۂ صلوٰۃ علی النبی سے سَبُک دوش ہوگیا۔ اس کے بعد نہ کلمہ پڑھنا فرض ہے نہ درود۔

ایک اور گروہ نماز میں اس کا پڑھنا مطلقاً واجب قرار دیتا ہے۔ مگر تشہُّد کے ساتھ اس کو مُقیَّد نہیں کرتا۔

ایک دوسرے گروہ کے نزدیک ہر دعا میں اس کا پڑھنا واجب ہے۔ کچھ اور لوگ اس کے قائل ہیں کہ جب بھی حضورؐ کا نام آئے، دُرود پڑھنا واجب ہے۔ اور ایک گروہ کے نزدیک ایک مجلس میں حضورؐ کا ذکر خواہ کتنی ہی مرتبہ آئے، درود پڑھنا بس ایک دفعہ واجب ہے۔

یہ اختلافات صرف وجوب کے معاملے میں ہیں۔ باقی رہی دُرود کی فضیلت، اور اس کا موجبِ اجر وثواب ہونا، اور اس کا ایک بہت بڑی نیکی ہونا، تو اس پر ساری امت متفق ہے۔ اس میں کسی ایسے شخص کو کلام نہیں ہوسکتا جو ایمان سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہو۔ درود تو فطری طور پر ہر اس مسلمان کے دل سے نکلے گا جسے یہ احساس ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بعد ہمارے سب سے بڑے محسن ہیں۔ اسلام اور ایمان کی جتنی قدر انسان کے دل میں ہوگی اتنی ہی زیادہ قدر اس کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کی بھی ہوگی، اور جتنا زیادہ آدمی ان احسانات کا قدر شناس ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حضورؐ پر درود بھیجے گا۔ پس درحقیقت کثرتِ دُرود ایک پیمانہ ہے جو ناپ کر بتا دیتا ہے کہ دینِ محمدؐ سے ایک آدمی کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے اور نعمتِ ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ من صَلّٰی عَلَیَّ صلوٰۃ لم تزل الملٰٓئکۃ تصلّی علیہ ما صلّٰی عَلَیَّ۔ (احمد وابنِ ماجہ) ’’جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے، ملائکہ اس پر دُرود بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا رہے۔‘‘ من صلّٰی علیّ واحدۃ صلی اللّٰہ علیہ عشرًا۔ (مسلم) ’’جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے، اللہ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے۔‘‘

اولی الناس بی یوم القیامۃ اکثرھم علیّ صلٰوۃ (ترمِذی) ’’قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا۔‘‘ البخیل الذی ذکرتُ عندہ فلم یصلّ عَلَیَّ (ترمِذی) بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔‘‘

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں کے لیے اَللّٰھمَّ صَلِّ علٰی فلان، یاصلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ـــــ یا اسی طرح کے دوسرے الفاظ کے ساتھ صلٰوۃ جائز ہے یا نہیں، اس میں علما کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ جس میں قاضی عِیاضؒ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اسے مطلقاً جائز رکھتا ہے۔ ان لوگوں کا اِستِدلال یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود غیر انبیا پر صلٰوۃ کی متعدّد مقامات پر تصریح کی ہے۔ مثلاً اُولٰٓئِكَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ (البقرہ: ۱۵۷) خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّیهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَیۡهِمۡ (التوبہ: ۱۰۳) هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡكُمۡ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (الاحزاب: ۴۳) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدّد مواقع پر لفظِ صلٰوۃ کے ساتھ غیرِ انبیا کو دُعا دی ہے۔ مثلاً ایک صحابی کے لیے آپؐ نے دعا فرمائی کہ اَللّٰھمَّ صَلِّ علٰی اٰل ابی اوفٰی۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی بیوی کی درخواست پر فرمایا: صلی اللّٰہ علیكِ وَعلٰی زوجِكِ۔ جو لوگ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوتے، ان کے حق میں آپؐ فرماتے: اَللّٰھمَّ صَلِّ علیھم۔ حضرت سعدؓ بن عُبادہ کے حق میں آپؐ نے فرمایا، اَللّٰھمّ اجعل صَلٰوتك ورحمتك علٰی اٰل سَعد بن عُبادۃ۔ اور مومن کی روح کے متعلق حضورؐ نے خبر دی کہ ملائکہ اس کے حق میں دعا کرتے ہیں: صلی اللّٰہ علیك وعلٰی جسدك۔ لیکن جُمہورِ امت کے نزدیک ایسا کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے تو دُرست تھا مگر ہمارے لیے درست نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب یہ اہلِ اسلام کا شِعار بن چکا ہے کہ وہ صلٰوۃ وسلام کو انبیا علیہم السلام کے لیے خاص کرتے ہیں، اس لیے غیرِ انبیا کے لیے اس کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ اپنے ایک عامل کو لکھا تھا کہ ’’میں نے سنا ہے کچھ واعظین نے یہ نیا طریقہ شروع کیا ہے کہ وہ صلٰوۃ علی النبی کی طرح اپنے سرپرستوں اور حامیوں کے لیے بھی صلٰوۃ کا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ میرا یہ خط پہنچنے کے بعد ان لوگوں کو اس فعل سے روک دو اور انھیں حکم دو کہ وہ صلٰوۃ کو انبیاؑ کے لیے مخصوص رکھیں اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں دعا پر اکتفا کریں۔‘‘ (رُوح المَعانی) اکثریت کا یہ مسلک بھی ہے کہ حضورؐ کے سوا کسی نبی کے لیے بھی ’’صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ کے الفاظ کا استعمال درست نہیں ہے۔

۱۰۸ – اللہ کو اذیّت دینے سے مراد دو چیزیں ہیں: ایک، یہ کہ اس کی نافرمانی کی جائے، اس کے مقابلے میں کفر و شرک اور دَہریّت کا رَوِیّہ اختیار کیا جائے، اور اس کے حرام کو حلال کر لیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ اس کے رسولؐ کو اذیت دی جائے۔ کیونکہ جس طرح رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اسی طرح رسولؐ پر طعن خدا پر طعن ہے، رسولؐ کی مُخالَفت خدا کی مخالفت ہے، اور رسولؐ کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

۱۰۹ – یہ آیت بہتان کی تعریف متعین کر دیتی ہے، یعنی جو عیب آدمی میں نہ ہو، یا جو قصور آدمی نے نہ کیا ہو، وہ اس کی طرف منسوب کرنا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ابوداؤد اور ترمِذی کی رِوایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا: غیبت کیا ہے؟ فرمایا: ذکرك اخاك بمَا یکرہ ’’تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔‘‘ عرض کیا گیا: اور اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو؟ فرمایا: ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہٗ وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتّہ۔ ’’اگر

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ

اَے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں[110]۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور

اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تُو نے اس کی غیبت کی۔ اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تُو نے اس پر بہتان لگایا۔'' یہ فعل صرف ایک اَخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنے والی ہو۔ بلکہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں بھی جھوٹے الزامات لگانے کو جرم مُستلزِم سزا قرار دیا جائے۔

۱۱۰- اصل الفاظ ہیں: يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ۔ جِلباب عَرَبی زبان میں بڑی چادر کو کہتے ہیں۔ اور اِدْنَاء کے اصل معنٰی قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں، مگر جب اس کے ساتھ عَلٰی کا صِلہ آئے تو اس میں ارخاء، یعنی اُوپر سے لٹکا لینے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے بعض مترجمین و مفسرین مغربی مذاق سے مغلوب ہو کر اس لفظ کا ترجمہ صرف ''لپیٹ لینا'' کرتے ہیں، تاکہ کسی طرح چہرہ چھپانے کے حکم سے بچ نکلا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا مقصود اگر وہی ہوتا جو یہ حضرات بیان کرنا چاہتے ہیں تو وہ يُدْنِيْنَ اِلَيْهِنَّ فرماتا۔ جو شخص بھی عربی زبان جانتا ہو وہ کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ کے معنٰی محض لپیٹ لینے کے ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کے الفاظ یہ معنٰی لینے میں اور زیادہ مانع ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں مِن تبعیض کے لیے ہے، یعنی چادر کا ایک حصہ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ لپیٹی جائے گی تو پوری چادر لپیٹی جائے گی، نہ کہ اس کا محض ایک حصہ۔ اس لیے آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر اُن کا ایک حصّہ، یا ان کا پلّو اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں، جسے عُرفِ عام میں گھونگٹ ڈالنا کہتے ہیں۔

یہی معنٰی عہدِ رسالت سے قریب ترین زمانے کے اکابر مفسرین بیان کرتے ہیں۔ ابنِ جَریر اور ابن المُنْذِر کی روایت ہے کہ محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے حضرت عَبِیدۃ السَّلمانیؒ سے اس آیت کا مطلب پوچھا۔ (یہ حضرت عَبِیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان ہو چکے تھے مگر حاضرِ خدمت نہ ہو سکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدینہ آئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھیں فقہ اور قضا میں قاضی شُرَیحؒ کا ہم پلّہ مانا جاتا تھا۔) انھوں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی چادر اُٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانک کر صرف ایک آنکھ کُھلی رکھی۔ ابنِ عباسؓ بھی قریب قریب یہی تفسیر کرتے ہیں۔ اُن کے جو اقوال ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے نقل کیے ہیں، ان میں وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لیے گھروں سے نکلیں تو اپنی چادروں کے پلّو اوپر سے ڈال کر اپنا منہ چھپا لیں اور صرف آنکھیں کھلی رکھیں۔'' یہی تفسیر قَتَادَہ اور سُدّی نے بھی اس آیت کی بیان کی ہے۔

عہدِ صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد جتنے بڑے بڑے مفسرین تاریخِ اسلام میں گزرے ہیں انھوں نے بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب

بیان کیا ہے۔امام ابنِ جَریر طَبَریؒ کہتے ہیں: یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ، ”یعنی شریف عورتیں اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھروں سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھُلے ہوئے ہوں، بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصّہ لٹکا لیا کریں، تاکہ کوئی فاسق ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے۔“ (جامع البیان، جلد ۲۲، ص ۳۳)

علّامہ ابوبکر جَصّاصؒ کہتے ہیں: ”یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے اپنا چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت سَتر اور عِفّت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ مُشتبہ سیرت وکردار کے لوگ اسے دیکھ کر کسی طمع میں مبتلا نہ ہوں۔“ (احکام القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۵۸)

علامہ زَمَخشَریؒ کہتے ہیں: یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ، یعنی ”وہ اپنے اُوپر اپنی چادروں کا ایک حصّہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔“ (الکَشّاف، جلد ۲، ص ۲۲۱)

علّامہ نظام الدین نَیشاپُوریؒ کہتے ہیں: یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ، یعنی اپنے اوپر چادر کا ایک حصّہ لٹکا لیں۔ اس طرح عورتوں کو سر اور چہرہ ڈھانکنے کا حکم دیا گیا ہے۔“ (غرائب القرآن، جلد ۲۲، ص ۳۲)

امام رازیؒ کہتے ہیں: ”اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدکار عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی، حالانکہ چہرہ سَتر میں داخل نہیں ہے، اس سے کوئی شخص یہ توقع نہیں کرسکتا کہ وہ اپنا ستر غیر کے سامنے کھولنے پر راضی ہوگی۔ اس طرح ہر شخص جان لے گا کہ یہ باپردہ عورتیں ہیں، ان سے زِنا کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔“ (تفسیرِ کبیر، جلد ۶، ص ۵۹۱)

ضمناً ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے: ”اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو۔“ یہ الفاظ اُن لوگوں کے قول کی قطعی تردید کردیتے ہیں جو خدا سے بے خوف ہو کر بے تکلُّف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی صُلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ گیلڑ تھیں۔ یہ لوگ تعصّب میں اندھے ہو کر یہ بھی نہیں سوچتے کہ اولادِ رسولؐ کے نسب سے انکار کر کے وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اِس کی کیسی سخت جواب دِہی انھیں آخرت میں کرنی ہوگی۔ تمام معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خَدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ ہی نہ تھیں بلکہ تین اور بیٹیاں بھی تھیں۔ حضورؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاقؒ حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”ابراہیمؓ کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد انھی کے بطن سے پیدا ہوئی اور ان کے نام یہ ہیں: قاسمؓ، اور طاہرؓ وطَیِّبؓ، اور زینبؓ، اور رُقیّہؓ اور اُمِّ کُلثومؓ اور فاطمہؓ۔“ (سیرت ابنِ ہِشام، جلد اول، ص ۲۰۲) مشہور ماہرِ علمِ اَنساب ہِشام بن محمد بن السَّائب کَلْبی کا بیان ہے کہ: ”مکہ میں نبوت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے، پھر زینبؓ، پھر رُقیّہؓ، پھر اُمِّ کلثومؓ۔ (طَبَقاتِ ابنِ سَعد، جلد اول، ص ۱۳۳) ابنِ حَزمؒ نے جوامع السیرۃ میں لکھا ہے کہ حضرت خَدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی چار لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی حضرت زینبؓ، ان سے چھوٹی رُقیّہؓ، ان سے چھوٹی فاطمہؓ، اور ان سے چھوٹی اُمِّ کلثومؓ۔ (ص ۳۸-۳۹) طَبَریؒ، ابنِ سَعدؒ، ابوجعفر محمد بن حبیبؒ صاحب کتابِ المُحَبَّر اور ابنِ عبدالبرؒ صاحبِ کتاب الاِستیعاب، مستند حوالوں سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے دو شوہر گزر چکے تھے۔ ایک ابوہالہ تمیمی جس سے ان کے ہاں ہِندؓ بن ابو ہالہ پیدا ہوئے۔ دوسرے عتیق بن عائذ مخزومی جس سے ان کے ہاں ایک

فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ
الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ
لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾

نہ ستائی جائیں[۱۱۱]۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے[۱۱۲]۔

اگر منافقین، اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے[۱۱۳]، اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں[۱۱۴]، اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمھیں اُٹھا کھڑا کریں گے، پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمھارے ساتھ رہ سکیں گے۔

لڑکی ہند نامی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کا نکاح حضورؐ سے ہوا اور تمام علمائے انساب متفق ہیں کہ آپؐ کی صُلب سے ان کے ہاں وہ چاروں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام اُوپر مذکور ہوئے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: طَبَری، جلد ۲، ص ۴۱۱ طبقاتِ ابنِ سعد، جلد ۸، ص ۱۴ تا ۱۶۔ کتاب المُحَبَّر، ص ۷۸، ۷۹، ۴۵۲۔ الاِستیعاب جلد ۲، ص ۷۱۸) اِن تمام بیانات کو قرآنِ مجید کی یہ تصریح قطعی الثبوت بنا دیتی ہے کہ حضورؐ کی ایک ہی صاحبزادی نہ تھیں بلکہ کئی صاحبزادیاں تھیں۔

۱۱۱ – ”پہچان لی جائیں“ سے مراد یہ ہے کہ ان کو اس سادہ اور حیادار لباس میں دیکھ کر ہر دیکھنے والا جان لے کہ وہ شریف اور باعِصمت عورتیں ہیں، آوارہ اور کھلاڑی نہیں ہیں کہ کوئی بدکردار انسان ان سے اپنے دل کی تمنّا پوری کرنے کی اُمید کر سکے۔ ”نہ ستائی جائیں“ سے مراد یہ ہے کہ ان کو نہ چھیڑا جائے، ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

اس مَقام پر ذرا ٹھیر کر یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ قرآن کا یہ حکم، اور وہ مقصدِ حکم جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان کر دیا ہے، اسلامی قانونِ معاشرت کی کیا روح ظاہر کر رہا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نور، آیت ۳۱ میں یہ ہدایت گزر چکی ہے کہ عورتیں اپنی آرایش و زیبایش کو فلاں فلاں قسم کے مردوں اور عورتوں کے سوا کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ ”اور زمین پر پاؤں مارتی ہوئی بھی نہ چلیں کہ لوگوں کو اُس زینت کا علم ہو جو انھوں نے چھپا رکھی ہے۔“ اُس حکم کے ساتھ اگر سورۂ احزاب کی اِس آیت کو ملا کر پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں چادر اوڑھنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے اس کا منشا اجنبیوں سے زینت چھپانا ہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ منشا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب کہ چادر بجائے خود سادہ ہو، ورنہ ایک مُزَیَّن اور جاذِبِ نظر کپڑا لپیٹ لینے سے تو یہ منشا اُلٹا اور فوت ہو جائے گا۔ اس پر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ صرف چادر لپیٹ کر زینت چھپانے ہی کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ یہ بھی فرما رہا ہے کہ عورتیں چادر کا ایک حصہ اپنے اُوپر سے لٹکا لیا کریں۔ کوئی معقول آدمی اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں لے سکتا کہ اس سے مقصود گھونگٹ ڈالنا ہے تاکہ جسم و لباس کی زینت چھپنے کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی چُھپ جائے۔ پھر اس حکم کی عِلّت اللہ تعالیٰ خود یہ بیان فرماتا ہے کہ یہ وہ مناسب ترین طریقہ ہے جس سے یہ مسلمان خواتین پہچان لی جائیں گی اور اذیت سے محفوظ رہیں گی۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر

ہو جاتی ہے کہ یہ ہدایت اُن عورتوں کو دی جا رہی ہے جو مردوں کی چھیڑ چھاڑ اور ان کی نظر بازی اور ان کے شہوانی التفات سے لذت اندوز ہونے کے بجائے اس کو اپنے لیے تکلیف دِہ اور اذیت ناک محسوس کرتی ہیں، جو معاشرے میں اپنے آپ کو آبرو باختہ شمعِ انجمن قسم کی عورتوں میں شمار نہیں کرانا چاہتیں، بلکہ عفت مآب چراغِ خانہ ہونے کی حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہیں۔ ایسی شریف اور نیک خواتین سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم فی الواقع اس حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہو اور مردوں کی ہوس ناک توجُّہات حقیقت میں تمھارے لیے موجبِ لذت نہیں بلکہ موجب اذیت ہیں تو پھر اس کے لیے مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ تم خوب بناؤ سنگھار کر کے پہلی رات کی دلھن بن کر گھروں سے نکلو اور دیکھنے والوں کی حریص نگاہوں کے سامنے اپنا حُسن اچھی طرح نکھار نکھار کر پیش کرو، بلکہ اس غرض کے لیے تو مناسب ترین طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ تم ایک سادہ چادر میں اپنی ساری آرایش و زیبایش کو چھپا کر نکلو، اپنے چہرے پر گھونگٹ ڈالو، اور اس طرح چلو کہ زیور کی جھنکار بھی لوگوں کو تمھاری طرف متوجہ نہ کرے۔ جو عورت باہر نکلنے سے پہلے بن ٹھن کر تیار ہوتی ہے اور اس وقت تک گھر سے قدم نہیں نکالتی جب تک سات سنگھار نہ کر لے، اس کی غرض اس کے سوا آخر اَور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ دنیا بھر کے مردوں کے لیے اپنے آپ کو جنت نگاہ بنانا چاہتی ہے اور انھیں خود دعوتِ التفات دیتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ یہ کہتی ہے کہ دیکھنے والوں کی بھوکی نگاہیں اسے تکلیف دیتی ہیں، اس کے بعد اگر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ''معاشرے کی بیگم'' اور ''مقبولِ عام خاتون'' ہونے کی حیثیت سے معروف نہیں ہونا چاہتی بلکہ عفت مآب گھر گرہستن بن کر رہنا چاہتی ہے تو یہ ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ انسان کا قول اس کی نیت متعین نہیں کرتا بلکہ اس کی اصل نیت وہ ہوتی ہے جو اس کے عمل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا جو عورت جاذبِ نظر بن کر غیر مردوں کے سامنے جاتی ہے اس کا یہ عمل خود ظاہر کر دیتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے فتنے کے طالب لوگ اس سے وہی توقعات وابستہ کرتے ہیں جو ایسی عورت سے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ قرآن عورتوں سے کہتا ہے کہ تم بیک وقت چراغِ خانہ اور شمعِ انجمن نہیں بن سکتی ہو۔ چراغِ خانہ بننا ہے تو اُن طور طریقوں کو چھوڑ دو جو شمعِ انجمن بننے کے لیے موزوں ہیں، اور وہ طرزِ زندگی اختیار کرو جو چراغِ خانہ بننے میں مددگار ہوسکتا ہے۔

کسی شخص کی ذاتی رائے خواہ قرآن کے موافق ہو یا اس کے خلاف، اور وہ قرآن کی ہدایت کو اپنے لیے ضابطۂ عمل کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے، بہرحال اگر وہ تعبیر کی بددیانتی کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ قرآن کا منشا سمجھنے میں غَلَطی نہیں کرسکتا۔ وہ اگر منافق نہیں ہے تو صاف صاف یہ مانے گا کہ قرآن کا منشا وہی ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو خلاف ورزی بھی وہ کرے گا یہ تسلیم کر کے کرے گا کہ وہ قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے یا قرآن کی ہدایت کو غلط سمجھتا ہے۔

۱۱۲ – یعنی پہلے جاہلیّت کی حالت میں جو غلطیاں کی جاتی رہی ہیں اللہ اپنی مہربانی سے ان کو معاف کر دے گا، بشرطیکہ اب صاف صاف ہدایت مل جانے کے بعد تم اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لو اور جان بُوجھ کر اس کی خلاف ورزی نہ کرو۔

۱۱۳ – ''دل کی خرابی'' سے مراد یہاں دو قسم کی خرابیاں ہیں: ایک یہ کہ آدمی اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کا بدخواہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آدمی بدنیتی، آوارگی اور مجرمانہ ذہنیت میں مبتلا ہو اور اس کے ناپاک رجحانات اس کی حرکات و سکنات سے پُھوٹے پڑتے ہوں۔

۱۱۴ – اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانے اور ان کے حوصلے پست کرنے کے لیے آئے دن

مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ
فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ ع
يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا
يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ
اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا

ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بُری طرح مارے جائیں گے۔ یہ اللہ کی سنّت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آرہی ہے، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔[۱۱۵]

لوگ تم سے پُوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی۔[۱۱۶] کہو: اُس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ تمھیں کیا خبر، شاید کہ وہ قریب ہی آ لگی ہو۔ بہر حال یہ یقینی امر ہے کہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیّا کر دی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کوئی حامی و مددگار

مدینے میں اس طرح کی خبریں اڑایا کرتے تھے کہ فُلاں جگہ مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی ہے اور فُلاں جگہ مسلمانوں کے خلاف بڑی طاقت جمع ہو رہی ہے اور عنقریب مدینے پر اچانک حملہ ہونے والا ہے۔ اس کے ساتھ اُن کا ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ وہ خاندانِ نبوت اور شرفائے مسلمین کی خانگی زندگی کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑتے اور پھیلاتے تھے تاکہ اس سے عوام میں بدگمانیاں پیدا ہوں اور مسلمانوں کے اَخلاقی اثر کو نقصان پہنچے۔

۱۱۵ – یعنی یہ اللہ کی شریعت کا ایک مستقل ضابطہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے اور ریاست میں اس طرح کے مفسدین کو کبھی پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ جب بھی کسی معاشرے اور ریاست کا نظام خدائی شریعت پر قائم ہوگا اُس میں ایسے لوگوں کو پہلے مُتنبّہ کر دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی روش بدل دیں، اور پھر جب وہ باز نہ آئیں گے تو سختی کے ساتھ ان کا اِستیصال کر ڈالا جائے گا۔

۱۱۶ – رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال عُموماً کفار و منافقین کیا کرتے تھے۔ اور اس سے ان کا مقصد علم حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ دل لگی اور اِستہزا کے طور پر یہ بات پوچھا کرتے تھے۔ دراصل ان کو آخرت کے آنے کا یقین نہ تھا۔ قیامت کے تصور کو وہ محض ایک خالی خولی دھمکی سمجھتے تھے۔ وہ قیامت کے آنے کی تاریخ اس لیے دریافت نہیں کرتے تھے کہ اس کے آنے سے پہلے وہ اپنے معاملات درست کر لینے کا ارادہ رکھتے ہوں، بلکہ ان کا اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے

وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ
اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا
وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ
الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا

ع ۸ ۵

نہ پاسکیں گے۔ جس روز ان کے چہرے آگ پر اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے، اُس وقت وہ کہیں گے کہ "کاش! ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔" اور کہیں گے: "اے رب ہمارے! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہمیں راہِ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب! ان کو دُہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔[117]"ع

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو،[118] اُن لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنھوں نے موسیٰؑ کو اذیّتیں دی تھیں، پھر اللہ نے اُن کی بنائی ہوئی باتوں سے اُس کی براءت فرمائی اور وہ

تمھیں نیچا دکھانے کے لیے یہ کچھ کیا ہے اور آج تک تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہو، اب ذرا ہمیں بتاؤ تو سہی کہ آخر وہ قیامت کب برپا ہوگی جب ہماری خبر لی جائے گی۔

۱۱۷ – یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذَیل مقامات مُلاحظہ ہوں: اَعراف: ۱۸۷۔ النازعات: ۴۲-۴۶۔ سبا: ۳۱۔ الملک: ۲۵-۲۷۔ المطفّفین، ۱۰-۱۷۔ الحِجر: ۲-۳۔ الفرقان: ۲۷-۲۹۔ حٰم السجدہ: ۲۷-۲۹۔

۱۱۸ – یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ قرآنِ مجید میں "اے لوگو جو ایمان لائے ہو" کے الفاظ سے کہیں تو سچّے اہلِ ایمان کو خطاب کیا گیا ہے، اور کہیں مسلمانوں کی جماعت بحیثیتِ مجموعی مخاطَب ہے جس میں مومن اور منافق اور ضعیف الایمان سب شامل ہیں، اور کہیں رُوئے سُخَن خالص منافقین ہی کی طرف ہے۔ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر جب مخاطَب کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ان کو شرم دلانا ہوتا ہے کہ تم لوگ دعویٰ تو ایمان لانے کا کرتے ہو اور حرکتیں تمھاری یہ کچھ ہیں۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے ہر جگہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد کون لوگ ہیں۔ یہاں سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ مخاطب عام مسلمان ہیں۔

وَ کَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ وَجِیۡہًا ﴿۶۹﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ
وَ قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا ﴿۷۰﴾ یُّصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ
ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا ﴿۷۱﴾ اِنَّا
عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ
یَّحۡمِلۡنَہَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَ حَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا

اللہ کے نزدیک باعزّت تھا۔[119] اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمھارے اعمال دُرست کر دے گا اور تمھارے قصُوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے، اُس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اُسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اُٹھا لیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور

۱۱۹- دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اے مسلمانو! تم یہودیوں کی سی حرکتیں نہ کرو۔ تمھاری روش اپنے نبیؐ کے ساتھ وہ نہ ہونی چاہیے جو بنی اسرائیل کی رَوِش موسٰی علیہ السلام کے ساتھ تھی۔'' بنی اسرائیل خود مانتے ہیں کہ حضرت موسٰیؑ ان کے سب سے بڑے محسن تھے۔ جو کچھ بھی یہ قوم بنی، انھی کی بدولت بنی۔ ورنہ مصر میں اس کا انجام ہندوستان کے شُودروں سے بھی بدتر ہوتا۔ لیکن اپنے اس مُحسنِ اعظم کے ساتھ اس قوم کا جو سلوک تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے بائبل کے حسبِ ذیل مقامات پر صرف ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے:

کتابِ خُروج۔ ۵: ۲۰-۲۱۔ ۱۴: ۱۱-۱۲۔ ۱۶: ۲-۳۔ ۱۷: ۳-۴۔

کتابِ گنتی۔ ۱۱: ۱-۱۵۔ ۱۴: ۱-۱۰۔ ۱۶ مکمل۔ ۲۰: ۲-۵۔

قرآنِ مجید بنی اسرائیل کی اسی مُحسن کُشی کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو مُتنبّہ کر رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچو، ورنہ پھر اُسی انجام کے لیے تیار ہو جاؤ جو یہودی دیکھ چکے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔

یہی بات متعدّد مواقع پر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمائی ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں میں کچھ مال تقسیم کر رہے تھے۔ اس مجلس سے جب لوگ باہر نکلے تو ایک شخص نے کہا: ''محمدؐ نے اس تقسیم میں خدا اور آخرت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا۔'' یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سُن لی اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آج آپؐ پر یہ باتیں بنائی گئی ہیں۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: رحمۃ اللّٰہ علی موسٰی فانہٗ اُوذی باکثر من ھٰذا فصبر ''اللہ کی رحمت ہو موسٰیؑ پر۔ انھیں اس سے زیادہ اذیتیں دی گئیں اور

جَهُوۡلًا ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ
وَالۡمُشۡرِكٰتِ وَيَتُوۡبَ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۷۳﴾ ع

ع ۹ ۵ ۶

جاہل ہے۔[۱۲۰] اِس بارِ امانت کو اُٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ منافق مَردوں اور عورتوں، اور مُشرک مَردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مَردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے، اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ ع

انھوں نے صبر کیا۔" (مُسنَدِ احمد، ترمذی، ابوداؤد)

۱۲۰ ـ کلام کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے اور اس حیثیت میں ہوتے ہوئے اگر وہ دنیا کی زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ کر بے فکری کے ساتھ غلط رَوِیّہ اختیار کرتا ہے تو کس طرح اپنے ہاتھوں خود اپنا مستقبل خراب کرتا ہے۔

اس جگہ "امانت" سے مراد وہی "خلافت" ہے جو قرآنِ مجید کی رُو سے انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت ومَعصِیَت کی جو آزادی بخشی ہے، اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اُسے اپنی بے شمار مخلوقات پر تَصَرُّف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں، اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمّہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرزِ عمل پر اجر کا اور غلط طرزِ عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کیے ہیں بلکہ اللہ نے اسے دیے ہیں، اور ان کے صحیح وغلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جواب دِہ ہے، اس لیے قرآنِ مجید میں دوسرے مَقامات پر ان کو "خلافت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہاں انھی کے لیے "امانت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

یہ امانت کتنی اہم اور گراں بار ہے، اس کا تصور دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آسمان و زمین اپنی ساری عظمت کے باوجود اور پہاڑ اپنی زبردست جسامت ومتانت کے باوجود اس کے اُٹھانے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے، مگر انسان ضعیف البُنیان نے اپنی ذرا سی جان پر یہ بھاری بوجھ اُٹھا لیا ہے۔

زمین وآسمان کے سامنے اس بارِ امانت کا پیش کیا جانا، اور ان کا اسے اُٹھانے سے انکار کرنا اور ڈر جانا ہوسکتا ہے کہ لُغوی معنیٰ میں ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بات استعارے کی زبان میں ارشاد ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات کے ساتھ جو تعلق ہے اسے ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ زمین اور سورج اور چاند اور پہاڑ جس طرح ہمارے لیے گونگے، بہرے اور بے جان ہیں، ضروری نہیں ہے کہ اللہ کے لیے بھی وہ ایسے ہی ہوں۔ اللہ اپنی ہر مخلوق سے بات کرسکتا ہے اور وہ اس کو جواب دے سکتی ہے۔ اس کی کیفیت کا سمجھنا ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ فی الواقع اللہ نے ان کے سامنے یہ بارِ گراں پیش کیا ہو اور وہ اسے دیکھ کر کانپ اُٹھے ہوں اور انھوں نے اپنے مالک وخالق سے یہ عرض کیا ہو کہ ہم تو سرکار کے بے اختیار خادم ہی بن کر رہنے میں

اپنی خیر پاتے ہیں، ہماری یہ ہمت نہیں ہے کہ نافرمانی کی آزادی لے کر اُس کا حق ادا کر سکیں اور حق ادا نہ کرنے کی صورت میں حضور کی سزا برداشت کر سکیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے پوری نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور نوعیت کا وجود بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا ہو اور اس نے یہ اختیارات سنبھالنے پر خود آمادگی ظاہر کی ہو۔ اس بات کو ناممکن قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کو دائرۂ امکان سے خارج قرار دینے کا فیصلہ تو وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے ذہن و فکر کی استعداد کا غلط اندازہ لگا بیٹھا ہو۔

البتہ یہ امر بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات محض تمثیلی انداز میں فرمائی ہو اور صورتِ معاملہ کی غیر معمولی اہمیّت کا تصور دلانے کے لیے اِس طرح کا نقشہ پیش کیا گیا ہو کہ گویا ایک طرف زمین و آسمان اور ہمالہ جیسے پہاڑ کھڑے ہیں اور دوسری طرف ۵-۶ فٹ کا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ:

> ''میں اپنی ساری مخلوقات میں سے کسی ایک کو یہ طاقت بخشنا چاہتا ہوں کہ وہ میری خدائی میں رہتے ہوئے خود اپنی رضا و رغبت سے میری بالاتری کا اقرار اور میرے احکام کی اطاعت کرنا چاہے تو کرے، ورنہ وہ میرا انکار بھی کر سکے گا اور میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بھی لے کر اٹھ سکے گا۔ یہ آزادی دے کر میں اُس سے اِس طرح چُھپ جاؤں گا کہ گویا میں کہیں موجود نہیں ہوں۔ اور اس آزادی کو عمل میں لانے کے لیے میں اس کو وسیع اختیارات دوں گا، بڑی قابلیتیں عطا کروں گا، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو بالا دستی بخش دوں گا، تاکہ وہ کائنات میں جو ہنگامہ بھی برپا کرنا چاہے کر سکے۔ اس کے بعد میں ایک وقتِ خاص پر اس کا حساب لوں گا۔ جس نے میری بخشی ہوئی آزادی کو غلط استعمال کیا ہوگا، اسے وہ سزا دوں گا جو میں نے کبھی اپنی کسی مخلوق کو نہیں دی ہے، اور جس نے نافرمانی کے سارے مواقع پا کر بھی میری فرماں برداری ہی اختیار کی ہوگی اسے وہ بلند مرتبے عطا کروں گا جو میری کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ اب بتاؤ، تم میں سے کون اس امتحان گاہ میں اترنے کو تیار ہے؟''

یہ تقریر سُن کر پہلے تو ساری کائنات میں سنّاٹا چھا جاتا ہے۔ پھر ایک سے ایک بڑھ کر گراں ڈِیل مخلوق گھٹنے ٹیک کر التجا کرتی چلی جاتی ہے کہ اُسے اِس کڑے امتحان سے معاف رکھ جائے۔ آخرِ کار یہ مشتِ اُستخواں اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب! میں یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس امتحان کو پاس کر کے تیری سلطنت کا سب سے اُونچا عہدہ مل جانے کی جو اُمید ہے اُس کی بنا پر میں اُن سب خطرات کو انگیز کر جاؤں گا جو اس آزادی و خود مختاری میں پوشیدہ ہیں۔

یہ نقشہ اپنی چشمِ تصوّر کے سامنے لا کر ہی آدمی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں کس نازک مَقام پر کھڑا ہوا ہے۔ اب جو شخص اس امتحان گاہ میں بے فکرا بن کر رہتا ہے اور کوئی احساس نہیں رکھتا کہ وہ کتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، اور دنیا کی زندگی میں اپنے لیے کوئی رَوِیّہ انتخاب کرتے وقت جو فیصلے وہ کرتا ہے ان کے صحیح یا غلط ہونے سے کیا نتائج نکلنے والے ہیں، اسی کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں ظَلوم و جَہول قرار دے رہا ہے۔ وہ جَہول ہے، کیونکہ اس احمق نے اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ لیا ہے۔ اور وہ ظَلوم ہے، کیونکہ وہ خود اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے اور اپنے ساتھ نہ معلوم کتنے اور لوگوں کو لے ڈوبنا چاہتا ہے۔

ضمیمہ

بسلسلۂ حاشیہ نمبر ۷۷

ختمِ نُبوّت

ایک گروہ، جس نے اِس دَور میں نئی نبوت کا فتنۂ عظیم کھڑا کیا ہے، لفظ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کے معنیٰ ''نبیوں کی مہر'' کرتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو انبیاؑ بھی آئیں گے وہ آپؐ کی مُہر لگنے سے نبی بنیں گے، یا بالفاظِ دیگر، جب تک کسی کی نبوت پر آپؐ کی مہر نہ لگے وہ نبی نہ ہو سکے گا۔

لیکن جس سلسلۂ بیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو اِس لفظ کا یہ مفہُوم لینے کی قطعاً کوئی گنجایش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر یہی اس کے معنیٰ ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں، مقصودِ کلام کے بھی خلاف ہو جاتا ہے۔[1] آخر اس بات کا کیا تُک ہے کہ اُوپر سے تو نکاحِ زینبؓ پر معترضین کے اعتراضات اور ان کے پیدا کیے ہوئے شُکوک وشُبہات کا جواب دیا جا رہا ہو اور یکایک یہ بات کہہ ڈالی جائے کہ محمدؐ نبیوں کی مُہر ہیں، آیندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مُہر لگ کر بنے گا۔ اس سِیاق وسَباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ بالکل بے تُکی ہے، بلکہ اس سے وہ استدلال الٹا کمزور ہو جاتا ہے جو اُوپر سے معترضین کے جواب میں چلا آ رہا ہے۔ اس صورت میں تو معترضین کے لیے یہ کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپؐ یہ کام اِس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اِس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت ہے تو آپؐ کے بعد آپؐ کی مُہر لگ لگ کر جو انبیاؑ آتے رہیں گے، ان میں سے کوئی اسے مٹا دے گا۔

ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ ''خاتم النّبیّین'' کے معنی افضل النّبیّین کے ہیں، یعنی نبوت کا دروازہ تو کُھلا ہوا ہے، البتہ کمالاتِ نبوت حضورؐ پر ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مفہُوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اُوپر ہم نے بیان کی ہے۔ سیاق وسباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ الٹا اس کے خلاف پڑتا ہے۔ کفار و منافقین کہہ سکتے تھے کہ حضرت! کم تر درجے کے ہی سہی، بہر حال آپؐ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے۔ پھر کیا ضرور تھا کہ اس رسم کو بھی آپؐ ہی مٹا کر تشریف لے جاتے۔

لُغت کی رُو سے خاتَمَ النّبیّین کے معنیٰ

پس جہاں تک سیاق وسباق کا تعلق ہے، وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النّبیین کے معنیٰ سلسلۂ نبوت کو

---

[1] سلسلۂ بیان کو سمجھنے کے لیے اس سورہ کے حواشی نمبر ۶۷ تا ۷۹ نگاہ میں رہنے چاہییں۔

ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے، لغت بھی اِسی معنیٰ کی مقتضی ہے۔عَرَبی لُغت اور محاورے کی رو سے ''ختم'' کے معنیٰ مُہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے، اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنیٰ ہیں فَرَغَ مِنَ الْعَمَلِ، ''کام سے فارغ ہو گیا۔''

خَتَمَ الْاِنَاءَ کے معنیٰ ہیں: ''برتن کا منہ بند کر دیا اور اور اس پر مُہر لگا دی تا کہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو۔''

خَتَمَ الْکِتَابَ کے معنیٰ ہیں: ''خط بند کر کے اس پر مہر لگا دی تا کہ خط محفوظ ہو جائے۔''

خَتَمَ عَلَی الْقَلْبِ، ''دل پر مُہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے۔''

خِتَامُ کُلِّ مَشْرُوْبٍ، ''وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے۔''

خَاتِمَۃُ کُلِّ شَیْءٍ، عاقبتہ واٰخرتہ، ''ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت۔''

خَتَمَ الشَّیْءَ بلغ اٰخرہ، ''کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا۔'' اسی معنیٰ میں ختمِ قرآن بولتے ہیں اور اسی معنیٰ میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خَاتَمُ الْقَوْمِ اٰخرھم، ''خاتَم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی۔'' (مُلاحظہ ہو: لِسان العرب، قامُوس اور اقرب الموارد[1])

---

[1] یہاں ہم نے لُغت کی صرف تین کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔لیکن بات انھی تین کتابوں پر منحصر نہیں ہے۔عربی زبان کی کوئی معتبر لُغت اُٹھا کر دیکھ لی جائے، اس میں لفظ خاتم کی یہی تشریح ملے گی۔لیکن منکرینِ ختمِ نبوت خدا کے دین میں نقب لگانے کے لیے لُغت کو چھوڑ کر اس بات کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی شخص کو خاتم الشعرا، یا خاتم الفقہا یا خاتم المفسرین کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس شخص کو یہ لقب دیا گیا ہے اس کے بعد کوئی شاعر یا فقیہ یا مفسر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فن کے کمالات اُس شخص پر ختم ہو گئے۔حالانکہ مبالغے کے طور پر اس طرح کے القاب کا استعمال یہ معنیٰ ہرگز نہیں رکھتا کہ لُغت کے اعتبار سے خاتم کے اصل معنیٰ ہی کامل یا افضل کے ہو جائیں اور ''آخری'' کے معنیٰ میں یہ لفظ استعمال کرنا سرے سے غلط قرار پائے۔یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو زبان کے قواعد سے ناواقف ہو۔کسی زبان میں بھی یہ قاعدہ نہیں ہے کہ اگر کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنیٰ کے بجائے کبھی کبھی مجازاً کسی دوسرے معنیٰ میں بولا جاتا ہو تو وہی معنیٰ اس کے اصل معنیٰ بن جائیں اور لُغت کی رُو سے جو اس کے حقیقی معنیٰ ہیں ان میں اس کا استعمال ممنوع ہو جائے۔آپ کسی عرب کے سامنے جب کہیں گے کہ جَاءَ خاتم القوم، تو وہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لے گا کہ قبیلے کا فاضل و کامل آدمی آ گیا، بلکہ اس کا مطلب وہ یہی لے گا کہ پورا کا پورا قبیلہ آ گیا ہے حتّٰی کہ آخری آدمی جو رہ گیا تھا وہ بھی آ گیا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ خاتَم الشعرا، خاتَم الفقہا اور خاتَم المحدثین وغیرہ القاب جو بعض لوگوں کو دیے گئے ہیں ان کے دینے والے انسان تھے اور انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ جس شخص کو وہ کسی صفت کے اعتبار سے خاتَم کہہ رہا ہے اس کے بعد پھر کوئی اس صفت کا حامل پیدا نہیں ہوگا۔اسی وجہ سے انسانی کلام میں ان القاب کی حیثیت مبالغے اور اعترافِ کمال سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں

اسی بنا پر تمام اہلِ لُغت اور اہلِ تفسیر نے بالاتفاق خاتم النّبیین کے معنٰی آخر النّبیین کے لیے ہیں۔ عربی لُغت ومحاورے کی رُو سے خاتم کے معنٰی ڈاک خانے کی مُہر کے نہیں ہیں جسے لگا لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مُہر ہے جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

ختمِ نُبوّت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

قرآن کے سیاق وسباق اور لُغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہُوم ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کانت بنواسرائیل تسوسھم الانبیاء۔ کلما ھلک نبی خلفہ نبی، وانہ لانبی بعدی وسیکون خلفاء۔ (بخاری، کتاب المناقب، باب ماذکرعن بنی اسرائیل)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت انبیاؑ کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، بلکہ خلفا ہوں گے۔

(۲) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنٰی بیتًا فاحسنہ واجملہ الّا موضع لبنۃ من زاویۃٍ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون ھلّا وُضِعَتْ ھٰذہ اللبنۃ، فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین۔
(بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النّبیین)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاؑ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھُوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النّبیین ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی آئے۔)

اسی مضمون کی چار حدیثیں مسلم، کتاب الفضائل، باب خاتم النّبیین میں ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ زائد ہیں: فَجِئْتُ فختمت الانبیاء، ''پس میں آیا اور میں نے انبیاؑ کا سلسلہ ختم کر دیا۔''
یہی حدیث انھی الفاظ میں ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل النبی، اور کتاب الآداب، باب الامثال میں ہے۔

سکتی۔ لیکن جب اللہ تعالٰی کسی شخص کے متعلق یہ کہہ دے کہ فلاں صفت اُس پر ختم ہوگئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے بھی انسانی کلام کی طرح مجازی کلام سمجھ لیں۔ اللہ نے اگر کسی کو خاتم الشعرا کہہ دیا ہوتا تو یقیناً اس کے بعد کوئی شاعر نہیں ہوسکتا تھا۔ اور اس نے جسے خاتم النّبیین کہہ دیا، غیر ممکن ہے کہ اس کے بعد کوئی نبی ہو سکے۔ اس لیے کہ اللہ عالم الغیب ہے اور انسان عالم الغیب نہیں ہیں۔ اللہ کا کسی کو خاتم النّبیین کہنا اور انسانوں کا کسی کو خاتم الشعرا اور خاتم الفقہا وغیرہ کہہ دینا آخر ایک درجے میں کیسے ہوسکتا ہے۔

مُسنَدِ ابوداؤد طَیالسی میں یہ حدیث جابرؓ بن عبداللہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں آئی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: ختم بی الانبیاء، ''میرے ذریعے سے انبیاؑ کا سلسلہ ختم کیا گیا۔''

مُسنَدِ احمد میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ اس مضمون کی احادیث حضرت اُبَیؓ بن کعبؓ، حضرت ابوسعید خُدرِیؓ اور حضرت ابوہُرَیرہؓ سے نقل کی گئی ہیں۔

(۳) ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال فُضِّلْتُ علی الانبیاء بستٍّ، اعطیت جوامع الکلم، ونصرت بالرعب، واُحلّت لی الغنائم، وجعلت لی الارض مسجدًا وطهورًا، واُرسلتُ الی الخلق کافة، وختم بی النبیّون۔ (مسلم۔ تِرْمِذی۔ ابنِ ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے چھ باتوں میں انبیاؑ پر فضیلت دی گئی ہے: (۱) مجھے جامع و مختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی (۲) مجھے رعب کے ذریعے سے نُصرت بخشی گئی (۳) میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کیے گئے۔ (۴) میرے لیے زمین کو مسجد بھی بنا دیا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔ (یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں میں ہی نہیں بلکہ رُوئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے، اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمّم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جا سکتی ہے اور غسل کی حاجت بھی۔) (۵) مجھے تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا۔ (۶) اور میرے اُوپر انبیاؑ کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

(۴) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی (تِرْمِذی، کتاب الرُّؤیا، باب ذہاب النبوۃ۔ مُسنَدِ احمد، مَرویّاتِ اَنَسؓ بن مالک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

(۵) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انا محمد وانا احمد، وانا الماحی الذی یُمحٰی بی الکفر، وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی عقبی، وانا العاقب الذی لیس بعدہٗ نبی۔ (بخاری و مسلم، کتاب الفضائل، باب اسماء النبی۔ تِرْمِذی، کتاب الآداب، باب اسماء النبی۔ مُؤطّا، کتاب اسماء النبی۔ المستدرک للحاکم، کتاب التاریخ، باب اسماء النبی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد ہوں۔ میں احمد ہوں۔ میں ماحی ہوں، کہ میرے ذریعے سے کفر مَحو کیا جائے گا۔ میں حاشر ہوں، کہ میرے بعد لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے۔ (یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی آنی ہے۔) اور میں عاقب ہوں، اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

(۶) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ لم یبعث نبیًّا الاحذر امته الدّجّال وانا اٰخر الانبیاء وانتم اٰخر الامم وهو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجّال کے خُروج سے نہ ڈرایا ہو (مگر ان کے زمانے میں وہ نہ

خارج فیکم لامحالة
(ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب الدَّجّال)

آیا)۔ اب میں آخری نبی ہوں اورتم آخری امت ہو۔ لامحالہ اب اس کو تمھارے اندر ہی نکلنا ہے۔

(۷) عن عبدالرحمٰن بن جبیر قال سمعت عبدالله بن عمرو بن العاص یقول خرج علینا رسول الله صلی الله علیه وسلم یومًا کالمودّع فقال انا محمّد النبی الامی ثلاثًا ولانبی بعدی۔ (مُسندِ احمد، مَرویّاتِ عبداللہ بن عَمْرؓو بن العاص)

عبدالرحمٰن بن جُبَیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہؓ بن عَمرؓو بن عاصؓ کو یہ کہتے سنا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر ہمارے درمیان تشریف لائے، اس انداز سے کہ گویا آپؐ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: ''میں محمد نبیِ اُمّی ہوں۔'' پھر فرمایا: ''اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

(۸) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا نبوة بعدی الا المبشرات۔ قیل وما المبشرات یا رسول الله؟ قال الرؤیا الحسنة ۔ او قال الرؤیا الصالحة۔
(مُسندِ احمد، مَرویّاتِ ابو الطفیلؓ۔ نَسائی۔ ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد کوئی نُبُوّت نہیں ہے، صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں۔'' عرض کیا گیا: ''وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں یا رسول اللہ؟'' فرمایا: ''اچھا خواب''، یا فرمایا ''صالح خواب۔'' (یعنی وحی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اشارہ ملے گا بھی تو بس اچھے خواب کے ذریعے سے مل جائے گا۔)

(۹) قال النبی صلی الله علیه وسلم لو کان بعدی نبیّ لکان عمر بن الخطاب۔
(ترمِذی، کتاب المناقب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ بن الخطّاب ہوتے۔

(۱۰) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لِعَلیّ انت منّی بمنزلة هارون من موسٰی، الا انه لانبی بعدی۔
(بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہؓ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: میرے ساتھ تمھاری نسبت وہی ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

بخاری و مسلم نے یہ حدیث غزوۂ تبوک کے ذکر میں بھی نقل کی ہے۔ مُسندِ احمد میں اس مضمون کی دو حدیثیں حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص سے رِوایَت کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا آخری فقرہ یوں ہے: الا انه لا نبوة بعدی، ''مگر میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔'' ابوداؤد طَیالسیؒ، امام احمدؒ اور محمد بن اسحاقؒ نے اس سلسلے میں جو تفصیلی رِوایات نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جاتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مدینۂ طیّبہ کی حفاظت ونگرانی کے لیے اپنے پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ منافقین نے اس پر طرح طرح کی باتیں ان کے بارے میں کہنی شروع کر دیں۔ انھوں نے جا کر حضورؐ سے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟'' اس موقع پر حضورؐ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ''تم میرے ساتھ وہی نسبت

رکھتے ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ رکھتے تھے۔" یعنی جس طرح حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا تھا اسی طرح میں تم کو مدینے کی حفاظت کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ حضرت ہارونؑ کے ساتھ یہ تشبیہ کہیں بعد میں کسی فتنے کی موجب نہ بن جائے، اس لیے فوراً آپؐ نے یہ تصریح فرما دی کہ میرے بعد کوئی شخص نبی ہونے والا نہیں ہے۔

(۱۱) عن ثوبان قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ...... وانہ سیکون فی اُمّتی کذّابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔
(ابوداؤد، کتاب الفتن)

ثَوبانؓ سے رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ...... اور یہ کہ میری اُمت میں تیس کذّاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا، حالانکہ میں خاتم النّبیّین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ابوداؤد نے کتاب المَلاحِم میں حضرت ابوہُریرہؓ سے روایت کی ہے۔ تِرمِذی نے بھی حضرت ثَوبانؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ دونوں رِوایتیں نقل کی ہیں، اور دوسری رِوایت کے الفاظ یہ ہیں: حتی یبعث دجالون کذابون قریب من ثلاثین کلھم یزعم انہ رسول اللّٰہ، "یہاں تک کہ اٹھیں گے تیس کے قریب جھوٹے فریبی، جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"

(۱۲) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یُکلّمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن من امتی احد فعمر۔
(بخاری، کتاب المناقب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے جو بنی اسرائیل گزرے ہیں، ان میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جن سے کلام کیا جاتا تھا، بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں۔ میری امت میں اگر کوئی ہوا تو وہ عمرؓ ہوگا۔

مسلم میں اس مضمون کی جو حدیث ہے اس میں یکلّمون کے بجائے محدَّثون کا لفظ ہے۔ لیکن مُکلَّم اور محدَّث، دونوں کے معنیٰ ایک ہی ہیں، یعنی ایسا شخص جو مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہو، یا جس کے ساتھ پردۂ غیب سے بات کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے بغیر مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہونے والے بھی اس امت میں اگر کوئی ہوتے تو وہ حضرت عمرؓ ہوتے۔

(۱۳) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لانبی بعدی ولا امة بعد امتی۔
(بَیہَقی، کتاب الرُّؤیا، طَبَرانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت (یعنی کسی نئے آنے والے نبی کی امت) نہیں۔

(۱۴) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم فانی اٰخر الانبیاء وان مسجدی اٰخر المساجد۔ (مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلوٰۃ بمسجد مکہ والمدینہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَیں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (یعنی مسجد نبوی) ہے۔[1]

---

[1] منکرین ختمِ نبوت اس حدیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جس طرح حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخر المساجد فرمایا، حالانکہ وہ آخری

یہ احادیث بکثرت صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بکثرت محدّثین نے ان کو بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر، مختلف طریقوں سے، مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپؐ آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے، اور آپؐ کے بعد جو لوگ بھی رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ دجال و کذاب[1] ہیں۔ قرآن کے الفاظ ''خاتم النّبیین'' کی اس سے زیادہ مستند و معتبر اور قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ رسولِ پاکؐ کا ارشاد تو بجائے خود سند و حُجّت ہے۔ مگر جب وہ قرآن کی ایک نَصّ کی شرح کر رہا ہو تب تو وہ اور بھی زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اَور کون ہو سکتا ہے کہ وہ ختمِ نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم اُسے قبول کرنا کیا معنٰی قابلِ التفات بھی نہ سمجھیں؟

مسجد نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی بے شمار مسجدیں دنیا میں بنی ہیں، اسی طرح جب آپؐ نے فرمایا کہ میں آخر الانبیاء ہوں تو اس کے معنٰی بھی یہی ہیں کہ آپؐ کے بعد نبی آتے رہیں گے، البتہ فضیلت کے اعتبار سے آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کی مسجد آخری مسجد ہے۔ لیکن درحقیقت اسی طرح کی تاویلیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کے کلام کو سمجھنے کی اہلیّت سے محروم ہو چکے ہیں۔ صحیح مسلم کے جس مقام پر یہ حدیث وارد ہوئی ہے اس کے سلسلے کی تمام احادیث کو ایک نظر ہی آدمی دیکھ لے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخری مسجد کس معنٰی میں فرمایا ہے۔ اس مقام پر حضرت ابوہُریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور ام المومنین حضرت میمونہؓ کے حوالے سے جو روایات امام مسلمؒ نے نقل کی ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں صرف تین مساجد ایسی ہیں جن کو عام مساجد پر فضیلت حاصل ہے، جن میں نماز پڑھنا دوسری مساجد میں نماز پڑھنے سے ہزار گُنا زیادہ ثواب رکھتا ہے، اور اسی بنا پر صرف انھی تین مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کر کے جانا جائز ہے، باقی کسی مسجد کا یہ حق نہیں ہے کہ آدمی دوسری مسجدوں کو چھوڑ کر خاص طور پر اُس میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کرے۔ ان میں سے پہلی مسجد، مسجد الحرام ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ دوسری مسجد، مسجدِ اقصیٰ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ اور تیسری مسجد، مدینۂ طیّبہ کی مسجدِ نبویؐ ہے جس کی بِنا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ حضورؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اب چونکہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اس لیے میری اس مسجد کے بعد دنیا میں کوئی چوتھی مسجد ایسی بننے والی نہیں ہے جس میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں سے زیادہ ہو اور جس کی طرف نماز کی غرض سے سفر کر کے جانا درست ہو۔

1. منکرینِ ختمِ نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلے میں اگر کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو وہ یہ روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لانبی بعدہٗ'' یہ تو کہو کہ حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں، مگر یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔'' لیکن اوّل تو حضورؐ کے صاف صاف ارشادات کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کے کسی قول کو پیش کرنا ہی سخت گستاخی و بے ادبی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عائشہؓ کی طرف جس رِوایت میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے وہ بجائے خود غیر مستند ہے۔ اسے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں کسی قابلِ ذکر محدّث نے نقل نہیں کیا ہے۔ تفسیر کی ایک کتاب دُرِّ منثُور اور لُغتِ حدیث کی ایک کتاب تکملۂ مجمع البحار سے اس کو نقل کیا جاتا ہے مگر اس کی سند کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ ایسی ایک ضعیف ترین رِوایت اور وہ بھی ایک صحابیہ کے قول کو لا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن ارشادات کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے جنھیں تمام اکابر محدثین نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کا اِجماع

قرآن وسنّت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابۂ کرامؓ کے اِجماع کی ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی رِوایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، اُن سب کے خلاف صحابۂ کرامؓ نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

اِس سلسلے میں خُصوصیّت کے ساتھ مُسَیْلَمۂ کذّاب کا معاملہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اُسے حضورؐ کے ساتھ شریکِ نبوت بنایا گیا ہے۔ اُس نے حضورؐ کی وفات سے پہلے جو عریضہ آپؐ کو لکھا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

من مُسَیْلمة رسول اللّٰه الٰی محمدٍ رسول اللّٰه سلام علیك فانی اُشْرِکتُ فی الامر معك۔ (طَبَری، جلد دوم، ص ۳۹۹، طبع مصر)

مُسَیلِمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف! آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ میں آپ کے ساتھ نبوت کے کام میں شریک کیا گیا ہوں۔

علاوہ بریں مؤرّخ طَبَریؒ نے یہ روایت بیان کی ہے کہ مُسَیلِمہ کے ہاں جو اذان دی جاتی تھی، اس میں اشھد انّ محمدًا رسول اللّٰہ کے الفاظ بھی کہے جاتے تھے۔ اس صریح اقرارِ رسالتِ محمّدی کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملت قرار دیا گیا اور اس سے جنگ کی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بنوحَنِیفہ نیک نیتی کے ساتھ (in good faith) اُس پر ایمان لائے تھے اور انھیں واقعی اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود شریکِ رسالت کیا ہے۔ نیز قرآن کی آیات کو اُن کے سامنے مُسَیلِمہ پر نازل شدہ آیات کی حیثیت سے ایک ایسے شخص نے پیش کیا تھا جو مدینۂ طَیِّبہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کر کے گیا تھا۔ (البِدَایہ والنِّہایہ لابنِ کثیر، جلد ۵، ص ۵۱) مگر اس کے باوجود صحابۂ کرامؓ نے ان کو مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ پھر یہ کہنے کی بھی گنجایش نہیں کہ صحابہؓ نے ان کے خلاف اِرتِداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کے جرم میں جنگ کی تھی۔ اسلامی قانون کی رُو سے باغی مسلمانوں کے خلاف اگر جنگ کی نوبت آئے تو ان کے اسیرانِ جنگ غلام نہیں بنائے جاسکتے۔ بلکہ مسلمان تو درکنار، ذِمّی بھی اگر باغی ہوں تو گرفتار ہونے کے بعد ان کو غلام بنانا جائز نہیں ہے۔ لیکن مُسَیلِمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے اعلان فرمایا کہ اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جائے گا۔ اور جب وہ لوگ اَسیر ہوئے تو فی الواقع ان کو غلام بنایا گیا۔ چنانچہ انھی میں سے ایک لونڈی حضرت علیؓ کے حصّے میں آئی جس کے بطن سے تاریخِ اسلام کی مشہور شخصیت محمد بن حَنَفِیَّہ[1] نے جنم لیا۔ (البِدَایہ والنِّہایہ، جلد ۶، ص ۳۱۶، ۳۲۵) اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہؓ نے جس جُرم کی بنا پر ان سے جنگ کی تھی وہ بغاوت کا جرم نہ تھا بلکہ یہ جرم تھا کہ ایک شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا اور دوسرے لوگ اس کی نبوت پر ایمان لائے۔ یہ کارروائی حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد ہوئی ہے، حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں ہوئی ہے، اور صحابہؓ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی ہے۔ اِجماعِ صحابہؓ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

---

[1] حَنَفِیَّہ سے مراد ہے قبیلۂ بنوحَنِیفہ کی عورت۔

تمام علمائے اُمّت کا اِجماع

اجماعِ صحابہ کے بعد چوتھے نمبر پر مسائلِ دین میں جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے وہ دَورِ صحابہؓ کے بعد کے علمائے اُمت کا اجماع ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علما اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ جو بھی آپؐ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اس کو مانے، وہ کافر خارج از ملّتِ اسلام ہے۔ اس سلسلے کے بھی چند شواہد مُلاحظہ ہوں:

(۱) امام ابوحنیفہؒ (۸۰ھ-۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا: "مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں۔" اس پر امامِ اعظمؒ نے فرمایا کہ "جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے گا، وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ لا نبی بعدی" (مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ لابنِ احمد المکّی، ج ۱، ص ۱۶۱- مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

(۲) علامہ ابنِ جَرِیر طَبَرِیؒ (۲۲۴ھ-۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیرِ قرآن میں آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کا مطلب بیان کرتے ہیں: الذی ختم النبوة فطبع علیها فلا تفتح لاحد بعدهٗ الی قیام الساعة "جس نے نبوت کو ختم کر دیا اور اس پر مُہر لگا دی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا۔" (تفسیر ابنِ جَرِیر، جلد ۲۲، صفحہ ۱۲)

(۳) امام طَحَاوِیؒ (۲۳۹ھ-۳۲۱ھ) اپنی کتاب "عقیدۂ سَلفِیّہ" میں سَلَف صالحین، اور خُصوصاً امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسُف اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: "اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برگزیدہ بندے، چیدہ نبی اور پسندیدہ رسول ہیں اور وہ خاتم الانبیا، امام الاتقیا، سَیّد المرسلین اور حبیبِ ربّ العالَمین ہیں، اور ان کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہشِ نفس کی بندگی ہے۔" (شرح الطَّحاویہ فی العقیدۃ السَّلَفِیّہ، دارالمعارف مصر، صفحات ۱۵، ۸۷، ۹۶، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۲)

(۴) علّامہ ابنِ حَزْم اَنْدُلُسیؒ (۳۸۴ھ-۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: "یقیناً وحی کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عَزَّ وَجَلَّ فرما چکا ہے کہ محمدؐ نہیں ہیں تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ، وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔" (اَلمُحلّٰی، ج ۱، ص ۲۶)

(۵) امام غَزَّالیؒ (۴۵۰ھ-۵۰۵ھ) فرماتے ہیں[1]:

لوفتح هٰذا الباب (ای باب انکار کون الاجماع حجة) انجر الی امور شنیعة وهو	اگر یہ دروازہ (یعنی اجماع کو حجت ماننے سے انکار کا دروازہ) کھول دیا جائے تو بڑی قبیح باتوں تک

[1] امام غَزَّالیؒ کی اس رائے کو ہم ان کی اصل عبادت کے ساتھ اس لیے نقل کر رہے ہیں کہ منکرینِ ختمِ نبوت نے اس حوالے کی صحت کو بڑے زور شور سے چیلنج کیا ہے۔

قٰلَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ۫ وَ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۴﴾ بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰىهُ بَلۡ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ

رسولؐ نے کہا: میرا رب ہر اُس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے، وہ سمیع اور علیم ہے۔[٦]

وہ کہتے ہیں: ”بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اِس کی مَن گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے۔[٧]

٦ - یعنی رسول نے کبھی اس جھوٹے پروپیگنڈے اور سرگوشیوں کی اس مہم (whispering campaign) کا جواب اس کے سوا نہ دیا کہ ”تم لوگ جو کچھ باتیں بناتے ہو، سب خدا سنتا اور جانتا ہے، خواہ زور سے کہو، خواہ چپکے چپکے کانوں میں پھونکو۔“ وہ کبھی بے انصاف دشمنوں کے مقابلے میں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر نہ اُتر آیا۔

٧ - اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکے کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپؐ کے مقابلے میں پروپیگنڈے کی ایک مہم شروع کی جائے، اور ہر اس شخص کو، جو مکے میں زیارت کے لیے آئے، آپؐ کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپؐ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ مہینے جاری رہتی تھی، مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیے جاتے تھے، جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادُوگر ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے، اور کہتا ہے خدا کا کلام ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ اجی! وہ کلام کیا ہے، دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پلندا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ تخیلات اور تُک بندیاں ہیں، جن کا نام اس نے کلامِ الٰہی رکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے۔ صداقت کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا کہ جم کر کوئی ایک قطعی اور جچی تُلی رائے ظاہر کرتے۔ لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا، وہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انھوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ آپؐ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی، وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدّت ہی کے اندر ہو گئی۔ ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو، وہ کون ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہے، اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے۔ ہم کوئی بچّے تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دلچسپ مثال طُفیل بن عَمرو دَوسی کا قصّہ ہے، جسے ابنِ اسحاق نے خود ان کی رِوایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلۂ دَوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبیؐ کے خلاف خوب میرے کان بھرے، یہاں تک کہ میں آپؐ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ

پس آپؐ انبیاءؑ کے خاتم ہیں...... اور ابنِ عباسؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اِس آیت میں) یہ فیصلہ فرمادیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔" (جلد ۳، ص ۱۵۸)

(۷) علّامہ زَمَخشَری (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ) تفسیر کَشّاف میں لکھتے ہیں: "اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کیسے ہوئے جب کہ حضرت عیسٰیؑ آخر زمانے میں نازل ہوں گے؟ تو میں کہوں گا کہ آپؐ کا آخری نبی ہونا اس معنٰی میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا، اور عیسٰی علیہ السلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جاچکے تھے، اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدیہ کے پَیرو اور آپؐ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے، گویا کہ وہ آپؐ ہی کی اُمت کے ایک فرد ہیں۔" (جلد ۲، ص ۲۱۵)

(۸) قاضی عِیَاضؒ (مُتوَفّٰی ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں: "جو شخص خود اپنے حق میں نبوت کا دعویٰ کرے، یا اس بات کو جائز رکھے کہ آدمی نبوت کا اکتساب کرسکتا ہے اور صفائی قلب کے ذریعے سے مرتبۂ نبوت کو پہنچ سکتا ہے، جیسا کہ بعض فلسفی اور غالی صوفی کہتے ہیں، اور اسی طرح جو شخص نبوت کا دعویٰ تو نہ کرے مگر یہ دعویٰ کرے کہ اس پر وحی آتی ہے...... ایسے سب لوگ کافر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے والے ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے خبر دی ہے کہ آپؐ خاتم النّبیین ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر پہنچائی ہے کہ آپؐ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی طرف آپؐ کو بھیجا گیا ہے۔ اور تمام اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر مفہوم پر محمول ہے، اس کے معنٰی ومفہوم میں کسی تاویل و تخصیص کی گنجایش نہیں ہے۔ لہٰذا اِن تمام گروہوں کے کافر ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں، بربنائے اجماع بھی اور بربنائے نقل بھی۔" (شفا، جلد ۲، ص ۲۷۰ - ۲۷۱)

(۹) علامہ شُہرِستانیؒ (مُتوَفّٰی ۵۴۸ھ) اپنی مشہور کتاب اَلمِلَل والنِّحَل میں لکھتے ہیں: "اور اسی طرح جو کہے...... کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے (بجز عیسٰی علیہ السلام کے) تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے۔" (جلد ۳، ص ۲۴۹)

(۱۰) امام رازیؒ (۵۴۳ھ - ۶۰۶ھ) اپنی تفسیرِ کبیر میں آیتِ خاتم النّبیین کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس سلسلہ بیان میں وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو وہ اگر نصیحت اور توضیحِ احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اُسے پورا کرسکتا ہے۔ مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو وہ اپنی اُمت پر زیادہ شفیق ہوتا ہے اور اس کو زیادہ واضح رہنمائی دیتا ہے کیونکہ اس کی مثال اُس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی وسرپرست اُس کے بعد نہیں ہے۔" (جلد ۶، ص ۵۸۱)

(۱۱) علامہ بَیضاویؒ (مُتوَفّٰی ۶۵۸ھ) اپنی تفسیر انوار التّنزیل میں لکھتے ہیں: "یعنی آپؐ انبیاءؑ میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے ان کا سلسلہ ختم کردیا، یا جس سے انبیاءؑ کے سلسلے پر مُہر کردی گئی۔ اور عیسٰی علیہ السلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا اس ختمِ نبوت میں قادح نہیں ہے کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپؐ ہی کے دین پر ہوں گے۔" (جلد ۴، ص ۱۶۴)

(۱۲) علامہ حافظ الدین النّسَفیؒ (مُتوَفّٰی ۷۱۰ھ) اپنی تفسیر "مَدارِک التّنزیل" میں لکھتے ہیں: "اور آپؐ خاتم النّبیّین ہیں......

یعنی نبیوں میں سب سے آخری۔ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا۔ رہے عیسیٰؑ، تو وہ ان انبیاؑ میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے، گویا کہ وہ آپؐ کی اُمت کے افراد میں سے ہیں۔'' (ص ۴۷۱)

(۱۳) علامہ علاء الدین بغدادی (مُتوَفّٰی ۷۲۵ھ) اپنی تفسیر ''خازِن'' میں لکھتے ہیں: وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ، یعنی اللہ نے آپؐ پر نبوت ختم کر دی، اب نہ آپؐ کے بعد کوئی نبوت ہے نہ آپؐ کے ساتھ کوئی اس میں شریک...... وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا، یعنی یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔'' (ص ۴۷۱-۴۷۲)

(۱۴) علّامہ ابنِ کثیرؒ (مُتوَفّٰی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں: ''پس یہ آیت اس باب میں نَصِّ صریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جب آپؐ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول بدرجۂ اَولیٰ نہیں ہے، کیوں کہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوت کا منصب عام، ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا...... حضورؐ کے بعد جو شخص بھی اس مَقام کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجّال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے، خواہ وہ کیسے ہی خرقِ عادت اور شُعبدے اور جادو اور طِلِسم اور کرشمے بنا کر لے آئے ...... یہی حیثیت ہر اُس شخص کی ہے جو قیامت تک اس منصب کا مدّعی ہو۔'' (جلد ۳، ص ۴۹۳-۴۹۴)

(۱۵) علامہ جلال الدّین سُیُوطیؒ (مُتوَفّٰی ۹۱۱ھ) تفسیر جلالَین میں لکھتے ہیں: ''وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا، یعنی اللہ اس بات کو جانتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور عیسیٰؑ جب نازل ہوں گے تو آپؐ کی شریعت ہی کے مطابق عمل کریں گے۔'' (ص ۷۶۸)

(۱۶) علامہ ابنِ نُجَیمؒ (مُتوَفّٰی ۹۷۰ھ) اُصُولِ فقہ کی مشہور کتاب اَلْاَشْبَاہ وَالنَّظَائِر، کتاب السِّیَر، باب الرِّدَّہ میں لکھتے ہیں: ''اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ اُن باتوں میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔'' (ص ۱۷۹)

(۱۷) مُلّا علی قاریؒ (مُتوَفّٰی ۱۰۱۶ھ) شرحِ فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔'' (ص ۲۰۲)

(۱۸) شیخ اسماعیل حَقّیؒ (مُتوَفّٰی ۱۱۳۷ھ) تفسیر رُوح البَیان میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عاصم نے لفظ خاتَم ''ت'' کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنیٰ ہیں آلۂ ختم کے جس سے مُہر کی جاتی ہے۔ جیسے طابع اس چیز کو کہتے ہیں جس سے ٹھپّا لگایا جائے۔ مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انبیاؑ میں سب سے آخر تھے جن کے ذریعے سے نبیوں کے سلسلے پر مُہر لگا دی گئی۔ فارسی میں اسے ''مُہرِ پیغمبراں'' کہیں گے یعنی آپؐ سے نبوت کا دروازہ سربمہر کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی قاریوں نے اسے ''ت'' کے زیر کے ساتھ خاتِم پڑھا ہے، یعنی آپؐ مُہر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اس کو ''مُہر کُنندۂ پیغمبراں'' کہیں گے۔ اس طرح یہ لفظ بھی خاتَم کا ہم معنیٰ ہی ہے ...... اب آپؐ کی امت کے علما آپؐ سے صرف وِلایَت ہی کی میراث پائیں گے، نبوت کی میراث آپؐ کی ختمیّت کے باعث ختم ہو چکی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپؐ کے

بعد نازل ہونا آپؐ کے خاتم النّبیّین ہونے میں قادح نہیں ہے، کیونکہ خاتم النّبیّین ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جائے گا...... اور عیسیٰؑ آپؐ سے پہلے نبی بنائے جاچکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے پیرو کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ آپؐ ہی کے قبلے کی طرف رخ کرکے نماز پڑھیں گے۔ آپؐ کی اُمت کے ایک فرد کی طرح ہوں گے۔ نہ اُن کی طرف وحی آئے گی اور نہ وہ نئے احکام دیں گے۔ بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہوں گے...... اور اہلِ سُنّت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا: لا نبی بعدی۔ اب جو کوئی کہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے نَصّ کا انکار کیا۔ اور اسی طرح اُس شخص کی بھی تکفیر کی جائے گی جو اس میں شک کرے، کیونکہ حجت نے حق کو باطل سے مُمیّز کر دیا ہے۔ اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے، اس کا دعویٰ باطل کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔'' (جلد ۲۲، ص ۱۸۸)

(۱۹) فتاویٰ عالمگیری، جسے بارھویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علمانے مُرتّب کیا تھا، اس میں لکھا ہے: ''اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔'' (جلد ۲، ص ۲۶۳)

(۲۰) علامہ شَوکانی (مُتوَفّٰی ۱۲۵۵ھ) اپنی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں: ''جُمہور نے لفظِ خاتِم کو ''ت'' کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم نے زبر کے ساتھ۔ پہلی قِراءت کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپؐ نے انبیا کو ختم کیا، یعنی سب کے آخر میں آئے۔ اور دوسری قِراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ ان کے لیے مہر کی طرح ہوگئے جس کے ذریعے سے ان کا سلسلہ سربمُہر ہوگیا اور جس کے شمول سے ان کا گروہ مزیّن ہوا۔'' (جلد ۴، ص ۲۷۵)

(۲۱) علامہ آلُوسی (متوفّٰی ۱۲۷۰ھ) تفسیر رُوح المعانی میں لکھتے ہیں: ''نبی کا لفظ رسول کی بہ نسبت عام ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النّبیّین ہونے سے خود بخود لازم آتا ہے کہ آپؐ خاتم المرسلین بھی ہوں۔ اور آپؐ کے خاتمِ انبیا ورُسل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں وصفِ نبوت سے آپؐ کے متصف ہونے کے بعد اب جِنّ واِنس میں سے ہر ایک کے لیے نبوت کا وصف منقطع ہوگیا۔'' (جلد ۲۲، ص ۳۲) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص وحیِ نبوت کا مدّعی ہو، اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔'' (جلد ۲۲، ص ۳۸) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النّبیّین ہونا ایک ایسی بات ہے جسے کتاب اللہ نے صاف صاف بیان کیا، سنت نے واضح طور پر اس کی تصریح کی، اور اُمت نے اس پر اجماع کیا۔ لہٰذا جو اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرے اسے کافر قرار دیا جائے گا۔'' (جلد ۲۲، ص ۳۹)

یہ ہندوستان سے لے کر مراکش اور اَندَلُس تک، اور تُرکی سے لے کر یمن تک ہر مسلمان ملک کے اکابر علما وفقہا اور محدّثین ومفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہم نے ان کے ناموں کے ساتھ ان کے سِنینِ ولادت ووفات بھی دے دیے ہیں، جن سے

ہر شخص بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک تاریخ اسلام کی ہر صدی کے اکابر اُن میں شامل ہیں۔ اگرچہ ہم چودھویں صدی کے علمائے اسلام کی تصریحات بھی نقل کر سکتے تھے، مگر ہم نے قصداً انھیں اس لیے چھوڑ دیا کہ اُن کی تفسیر کے جواب میں ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اِس دَور کے مدعیِ نبوت کی ضد میں ختمِ نبوت کے یہ معنیٰ بیان کیے ہیں۔ اس لیے ہم نے پہلے علما کی تحریریں نقل کی ہیں جو ظاہر ہے کہ آج کے کسی شخص سے کوئی ضد نہ رکھ سکتے تھے۔ اِن تحریروں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی سے آج تک پوری دنیائے اسلام مُتَّفَقَہ طور پر '' خاتم النّبیّین'' کے معنیٰ '' آخری نبی'' ہی سمجھتی رہی ہے، حضورؐ کے بعد نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا مُتَّفَق عَلَیہ عقیدہ رہا ہے، اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اُس کے دعوے کو مانے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اب یہ دیکھنا ہر صاحبِ عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خاتم النّبیین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے، جو قرآن کی عبارت کے سِیاق وسَباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دی ہے، جس پر صحابۂ کرامؓ کا اِجماع ہے، اور جسے صحابۂ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف مانتے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے مدّعی کے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجایش باقی رہ جاتی ہے، اور ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان تسلیم کیا جا سکتا ہے جنھوں نے بابِ نبوت کے مفتوح ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب حریم نبوت میں داخل بھی ہو گئے ہیں اور یہ لوگ ان کی نبوت پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں تین باتیں اور قابلِ غور ہیں:

کیا اللہ کو ہمارے ایمان سے کوئی دشمنی ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے یہ اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر وایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اُس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے ایک نازک معاملے میں تو اللہ تعالیٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدرجۂ اَولیٰ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف اس کی تصریح فرماتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اس کا کُھلا کُھلا اعلان کراتا اور حضورؐ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی امت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاؑ آئیں گے اور تمھیں ان کو ماننا ہوگا۔ آخر اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہمارے دین وایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضورؐ کے بعد نبوت کا دروازہ تو کُھلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی ہوتا جس پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہ ہو سکتے، مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسولؐ، دونوں ایسی باتیں فرما دیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری امت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

اب اگر بفرضِ محال نبوت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آ بھی جائے تو ہم بے خوف وخطر اس کا انکار کر دیں گے۔

خطرہ ہوسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باز پُرس ہی کا تو ہوسکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسرِعدالت لاکر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ! اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا۔ لیکن اگر نبوت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی مدّعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کون سا ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش کرسکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے، اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کرکے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے کیا ایک عقل مند آدمی اس پر اعتماد کرکے کفر کی سزا کا خطرہ مول لے سکتا ہے؟

اب نبی کی آخر ضرورت کیا ہے؟

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اُس شخص میں پیدا ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عملِ صالح میں ترقی کرکے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے، اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیا پر انبیا نہیں بھیجے جاتے۔

قرآنِ مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرّر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آئی ہے تو پتا چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاؑ مبعوث ہوئے ہیں:

اوّل یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اِس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بُھلا دی گئی ہو، یا اس میں تحریف ہوگئی ہو، اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعے سے مکمل تعلیم وہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیلِ دین کے لیے مزید انبیا کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔

قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدّنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپؐ کی بِعثَت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپؐ کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیا آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپؐ لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپؐ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اِس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپؐ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری صورت بھی ختم ہو گئی۔

پھر قرآنِ مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضورؐ کے ذریعے سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لٰہذا تکمیلِ دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضورؐ کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کون سی ہے جس کے لیے آپؐ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اُس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جائے، اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنّت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیا کی۔

نئی نبوت اب اُمّت کے لیے رحمت نہیں بلکہ لعنت ہے

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آئے گا فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اُٹھ کھڑا ہو گا۔ جو اس کو مانیں گے وہ ایک اُمت قرار پائیں گے اور جو اس کو نہ مانیں گے وہ لامحالہ دوسری اُمت ہوں گے۔ اِن دونوں امتوں کا اختلاف محض فُرُوعی اختلاف نہ ہو گا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا ایسا بنیادی اختلاف ہو گا جو اُنھیں اُس وقت تک جمع نہ ہونے دے گا جب تک ان میں سے کوئی اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے، کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذِ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہو گا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو گا۔

ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اُس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختمِ نبوت اُمتِ مسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اِس امت کا ایک دائمی اور عالم گیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفریق کا موجب ہو سکتا ہو۔ اب جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و رہبر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذِ ہدایت کی طرف رُجوع کرنے کا قائل نہ ہو وہ اس برادری کا فرد ہے

اور ہر وقت ہوسکتا ہے۔ یہ وحدت اس امت کو کبھی نصیب نہ ہوسکتی تھی اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا۔ کیونکہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دُنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے، اور جب اس نبی کے ذریعے سے دین کی تکمیل بھی کر دی جائے، اور جب اس نبی کی تعلیم کو پوری طرح محفوظ بھی کر دیا جائے، تو نبوت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے، تاکہ اس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو کر تمام دُنیا میں ہمیشہ کے لیے اہلِ ایمان کی ایک ہی اُمت بن سکے اور بلاضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس اُمت میں بار بار تفرقہ نہ برپا ہوتا رہے۔ نبی خواہ ''ظِلّی'' ہو یا ''بُرُوزی''، اُمّتی ہو یا صاحبِ شریعت اور صاحبِ کتاب، بہر حال جو شخص نبی ہوگا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوگا، اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ماننے والے ایک اُمت بنیں اور نہ ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اس حالت میں تو ناگزیر ہے جب کہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو۔ مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو کفر و ایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے اور انھیں کبھی ایک امت نہ بننے دے۔ لہٰذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سنت اور اِجماع سے ثابت ہے، عقل بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے۔

''مسیحِ مَوعُود'' کی حقیقت

نئی نبوت کی طرف بلانے والے حضرات عام طور پر ناواقف مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ احادیث میں ''مسیحِ مَوعُود'' کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اور مسیح نبی تھے، اس لیے اُن کے آنے سے ختمِ نبوت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ختمِ نبوت بھی برحق اور اس کے باوجود مسیحِ موعود کا آنا بھی برحق۔

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مسیحِ مَوعُود'' سے مراد عیسٰیؑ ابنِ مریم نہیں ہیں۔ ان کا تو انتقال ہو چکا۔ اب جس کے آنے کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ مَثِیلِ مسیح، یعنی حضرت عیسٰیؑ کے مانند ایک مسیح ہے، اور وہ فلاں شخص ہے جو آ چکا ہے۔ اُس کا ماننا عقیدۂ ختمِ نبوت کے خلاف نہیں ہے۔

اِس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہم یہاں پورے حوالوں کے ساتھ وہ مستند روایات نقل کیے دیتے ہیں جو اس مسئلے کے متعلق حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان احادیث کو دیکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور آج اس کو کیا بنایا جا رہا ہے۔

احادیث در باب نزولِ عیسٰی ابنِ مریم علیہ السلام

(۱) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ — حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللّٰہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الحرب ویفیض المال حتّٰی لایقبلہٗ احدٌ حتّٰی تکون السجدۃ الواحدۃ خیرًا من الدّنیا وما فیھا (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسٰی ابنِ مریم۔ مسلم، باب بیانِ نزولِ عیسٰی ۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی نزولِ عیسٰی۔ مُسندِ احمد، مرویّات ابو ہریرہؓ)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اُتریں گے تمھارے درمیان ابنِ مریمؑ حاکم عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور خنزیر کو ہلاک کر دیں گے[1]، اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے (دُوسری روایت میں حرب کے بجائے جزیہ کا لفظ ہے، یعنی جزیہ ختم کر دیں گے[2]) اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا، اور (حالت یہ ہوجائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور) ایک سجدہ کر لینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔

(۲) ایک اور روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لا تقوم الساعۃ حتّٰی ینزل عیسٰی ابن مریم ...... "قیامت قائم نہ ہوگی جب تک نازل نہ ہولیں عیسٰی ابنِ مریمؑ ...... اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اُوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ (بخاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب۔ ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدّجّال)

(۳) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم (بخاری، کتاب احادیث الانبیا، باب نزول عیسٰی۔ مسلم، باب بیان نزولِ عیسٰی۔ مُسندِ احمد، مرویّاتِ ابی ہریرہؓ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیسے ہو گے تم، جب کہ تمھارے درمیان ابنِ مریمؑ اُتریں گے اور تمھارا امام اُس وقت خود تم میں سے ہوگا۔[3]

---

۱ صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اِکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسٰیؑ) کو صلیب پر "لعنت" کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفّارہ بن گیا۔ اور انبیاؑ کی امتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیّت یہ ہے کہ انھوں نے صرف اِس عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی حتّٰی کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاؑ کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسٰی علیہ السلام آ کر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا، تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو نہ اپنے پیروؤں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیّت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

۲ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس وقت ملّتوں کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک ملّتِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہوگی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے احادیث نمبر ۵ و ۱۵ دلالت کر رہی ہیں۔

۳ یعنی نماز میں حضرت عیسٰیؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہوگا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔

(۴) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ینزل عیسٰی ابن مریم فیقتل الخنزیر ویمحوا الصلیب و تجمع لہ الصلوٰۃ ویعطی المال حتی لایقبل ویضع الخراج وینزل الرّوحاء فیحجّ منھا، اویعتمر، او یجمعھما۔ (مُسْنَدِ احمد، بسلسلۂ مَروّیاتِ ابی ہُریرہؓ۔ مسلم، کتاب الحج، باب جواز التمتّع فی الحج والقِران)

حضرت ابوہریرہؓ سے رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عیسیٰ ابنِ مریمؑ نازل ہوں گے، پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا اور وہ خَراج ساقط کر دیں گے اور رَوحا[1] کے مقام پر منزل کر کے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یا دونوں کو جمع کریں گے۔[2] راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے ان میں سے کون سی بات فرمائی تھی۔

(۵) عن ابی ھریرۃ (بعد ذکر خروج الدجال) فبینما ھم یعدّون للقتال یسوّون الصّفوف اذا اقیمت الصّلوٰۃ فینزل عیسٰی ابن مریم فامّھم فاذا راٰہ عدو اللّٰہ یذوب کما یذوب الملح فی الماء فلو ترکہ لا نذاب حتّٰی یھلک ولٰکن یقتلہ اللّٰہ بیدہ فیریھم دمہ فی حربتہ۔ (مِشکوٰۃ، کتاب الفتن، باب المَلاحم، بحوالۂ مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے رِوایت ہے (دجّال کے خُروج کا ذکر کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا) اس اثنا میں کہ مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے، صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے تکبیرِ اقامت کہی جا چکی ہوگی کہ عیسیٰ ابنِ مریمؑ نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن (یعنی دجال) ان کو دیکھتے ہی اس طرح گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گُھلتا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اس کو اُس کے حال ہی پر چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گُھل کر مر جائے۔ مگر اللہ اس کو اُن کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور وہ اپنے نیزے میں اُس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔

(۶) عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لیس بینی وبینہ نبی (یعنی عیسٰی) وانہ نازل فاذا رأیتموہ فاعرفوہ رجل مربوع الی الحمرۃ والبیاض، ممصرتین کان رأسہ یقطر وَان لم یصبہ بلل فیقاتل الناس علی الاسلام فیدقِ الصلیب ویقتل الخنزیر

حضرت ابوہریرہؓ سے رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اور اُن (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اُترنے والے ہیں، پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں، رنگ مائل بہ سرخی و سپَیدی ہے، دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔

---

۱ مدینے سے ۳۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

۲ واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کو مثیلِ مسیح قرار دیا گیا ہے، انھوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عمرہ۔

ویضع الجزیة ویھلك اللّٰہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام ویھلك المسیح الدجال فیمکث فی الارض اربعین سنة ثم یتوفی فیصلی علیہ المسلمون۔ (ابوداؤد، کتاب المَلَاحم، باب خروج الدّجّال۔ مُسْنَدِ احمد، مَرویّاتِ ابوہُریرہؓ)

ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالانکہ وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، اور اللہ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام مِلّتوں کو مٹا دے گا، اور وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے، اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھیریں گے۔ پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔

(۷) عن جابر بن عبداللّٰہ قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ...... فینزل عیسٰی بن مریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم فیقول امیرھم تعال فصلِّ فیقول لا ان بعضکم علٰی بعض امراء تکرمة اللّٰہ ھٰذہ الامة۔ (مسلم، بیان نُزولِ عیسٰی ابنِ مریم۔ مُسْنَدِ احمد بسلسلۂ مَرویّاتِ جابرؓ بن عبداللہ)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ...... پھر عیسٰی ابنِ مریمؑ نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا کہ آئیے، آپ نماز پڑھائیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو۔[1] یہ وہ اُس عزت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اِس اُمّت کو دی ہے۔

(۸) عن جابر بن عبداللّٰہ (فی قصة ابن صیّاد) فقال عمر بن الخطاب ائذن لی فاقتلہ یا رسول اللّٰہ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان یکن ھو فلست صاحبہ انما صاحبہ عیسٰی ابن مریم علیہ الصلٰوة والسلام، وان لا یکن فلیس لك ان تقتل رجلا من اھل العھد۔ (مشکٰوۃ، کتاب الفتن، باب قصۂ ابنِ صَیّاد، بحوالہ شرح السُّنّۃ بَغَوی)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ (قصۂ ابنِ صَیّاد کے سلسلے میں) رِوایت کرتے ہیں کہ پھر عمرؓ بن خَطّاب نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو بلکہ اسے تو عیسٰی ابن مریمؑ ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمھیں اہلِ عہد (یعنی ذِمّیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(۹) عن جابر بن عبداللّٰہ (فی قصّة الدجّال) فاذا ھم بعیسٰی ابن مریم علیہ السلام فتقام الصلٰوة فیقال لہ تقدم یاروح

حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے رِوایت ہے کہ (دجّال کا قصہ بیان کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اُس وقت یکایک عیسٰی ابنِ مریمؑ علیہ السلام

[1] یعنی تمھارا امیر خود تم ہی میں سے ہونا چاہیے۔

اللّٰہ فیقول لیتقدم امامکم فلیصلِّ بکم فاذا صلی صلٰوۃ الصبح خرجوا الیہ قال فحین یری الکذاب ینماث کما ینماث الملح فی الماء فیمشی الیہ فیقتلہٗ حتّٰی ان الشجر والحجر ینادی یا روح اللّٰہ ھذا الیھودیُّ، فلا یترک ممن کان یتبعہ احدا الا قتلہٗ۔ (مُسْنَدِ احمد، بسلسلۂ روایاتِ جابرؓ بن عبداللہ)

مسلمانوں کے درمیان آ جائیں گے۔ پھر نماز کھڑی ہو گی اور ان سے کہا جائے گا کہ اے رُوح اللہ! آگے بڑھیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تمھارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے، وہی نماز پڑھائے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمان دجّال کے مقابلے پر نکلیں گے۔ فرمایا: جب وہ کذّاب حضرت عیسیٰؑ کو دیکھے گا تو گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اسے قتل کر دیں گے، اور حالت یہ ہو گی کہ درخت اور پتھر پکار اُٹھیں گے کہ اے روح اللہ! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ دجّال کے پیروؤں میں سے کوئی نہ بچے گا جسے وہ (یعنی عیسیٰؑ) قتل نہ کر دیں۔

(۱۰) عن النواس بن سمعان (فی قصة الدجّال) فبینما ھو کذٰلك اذ بعث اللّٰہ المسیح بن مریم فینزل عند المنارۃ البیضاء شرقی دمشق بین مھروذتین واضعًا کفیه علٰی اجنحة ملکین اذا طأطأ راسهٗ قطر واذا رفعه تحدر منه جمان کاللؤلؤ فلا یحل لکافر یجد ریح نفسه الا مات ونفسه ینتھی الٰی حیث ینتھی طرفه فیطلبه حتّٰی یدرکه بباب لُدٍّ فیقتلهٗ۔ (مسلم، ذکر الدجال۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خُروج الدجال۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی فتنۃ الدجال۔ ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال)

حضرت نَوّاس بن سَمْعان کِلابی (قصّۂ دجال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں: اس اثنا میں کہ دجال یہ کچھ کر رہا ہو گا، اللہ تعالیٰ مسیحؑ ابنِ مریم کو بھیج دے گا اور وہ دِمَشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس، زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اُتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہو گا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی —— اور وہ ان کی حدِّ نظر تک جائے گی —— وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابنِ مریم دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ[1] کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

(۱۱) عن عبد اللّٰہ بن عمر وقال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یخرج الدجال

حضرت عبداللہ بن عَمْرُوؓ بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجّال میری اُمّت

[1] واضح رہے کہ لُدّ (Lydda) فلسطین میں ریاستِ اسرائیل کے دار السلطنت تَلّ اَبِیْب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈّا بنا رکھا ہے۔

فی امتی فیمکث اربعین (لا ادری اربعین یومًا او اربعین شهرًا او اربعین عامًا) فیبعث اللّٰه عیسٰی ابن مریم کانه عروة بن مسعود فیطلبه فیهلکه ثم یمکث الناس سبع سنین لیس بین اثنین عداوة۔ (مسلم، ذکر الدجال)

میں نکلے گا اور چالیس (میں نہیں جانتا چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال[1]) رہے گا۔ پھر اللہ عیسٰیؑ ابنِ مریم کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عُروہؓ بن مسعود (ایک صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ وہ اس کا پیچھا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے، پھر سات سال تک لوگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔

(۱۲) عن حذیفة بن اسید الغفاری قال اطلع النبی صلی اللّٰه علیه وسلم علینا ونحن نتذاکر قال ما تذکرون قالوا نذکر الساعة قال انها لن تقوم حتّٰی ترون قبلها عشر اٰیات فذکر الدخان والدجال والدابة وطلوع الشمس من مغربها ونزول عیسٰی ابن مریم ویاجوج وماجوج وثلثة خسوف، خسف بالمشرق وخسف بالمغرب، وخسف بجزیرة العرب واٰخر ذٰلك نار تخرج من الیمن تطرد الناس الٰی محشرهم ۔ (مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعہ۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب امارات الساعہ)

حُذَیفہؓ بن اَسِید الغِفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا: کیا بات ہو رہی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا: وہ ہرگز قائم نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں۔ پھر آپؐ نے وہ دس نشانیاں یہ بتائیں: (۱) دُھواں، (۲) دجّال، (۳) دابّۃ الارض، (۴) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، (۵) عیسٰیؑ ابنِ مریم کا نزول، (۶) یاجوج و ماجوج، (۷) تین بڑے خَسَف[2]، ایک مشرق میں، (۸) دوسرا مغرب میں، (۹) تیسرا جزیرۃ العرب میں، (۱۰) سب سے آخر میں ایک زبردست آگ جو یمن سے اٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔

(۱۳) عن ثوبان مولٰی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم عصابتان من امتی احرزهما اللّٰه تعالٰی من النار۔ عصابة تغزو الهند، وعصابة تکون مع عیسٰی ابن مریم علیه السلام۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثَوبانؓ رِوایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ”میری امت کے دو لشکر ایسے ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچالیا۔ ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو عیسٰیؑ ابن مریمؑ کے

[1] یہ حضرت عبداللہؓ بن عَمروؓ بن عاص کا اپنا قول ہے۔
[2] زمین دھنس جانا (landslide)

(نسائی، کتاب الجہاد۔ مُسندِ احمد، بسلسلۂ روایاتِ ثوبانؓ)

ساتھ ہوگا۔"

(۱۴) عن مُجمِّع بن جارية قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يقتل ابنُ مريم الدّجّال بباب لُدّ۔

(مُسندِ احمد۔ ترمذی، ابواب الفتن)

مُجمِّعؓ بن جاریہ انصاری کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ابنِ مریمؑ دجّال کو لُدّ کے دروازے پر قتل کریں گے۔

(۱۵) عن ابی اُمامة الباهلی (فی حدیث طویل فی ذکر الدجال) فبینما امامهم قد تقدم یصلّی بهم الصبح اذ نزل علیهم عیسٰی ابن مریم فرجع ذٰلك الامام ینکص یمشی قهقریٰ لیتقدم عیسٰی فیضع عیسٰی یده بین کتفیه ثم یقول له تقدم فصل فانها لك اقیمت فیصلّی بهم امامهم فاذا انصرف قال عیسٰی علیه السلام افتحوا الباب فیفتح ووراءه الدجال ومعه سبعون الف یهودی کلهم ذوسیف محلی وساج فاذا نظرالیه الدجال ذاب کما یذوب الملح فی الماء وینطلق هاربًا ویقول عیسٰی ان لی فیك ضربة لن تسبقنی بها فیدرکه عند باب اللُّدِّ الشرقی فیهزم الله الیهود ...... وتملأ الارض من المسلم کما یملأ الاناء من الماء وتکون الکلمة واحدة فلا یعبد الا الله تعالٰی۔

(ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجّال)

ابو اُمامہ باہلیؓ (ایک طویل حدیث میں دجال کا ذکر کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ عین اس وقت جب مسلمانوں کا امام صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا، عیسٰیؑ ابنِ مریم اُن پر اتر آئیں گے۔ امام پیچھے پلٹے گا تاکہ عیسٰیؑ آگے بڑھیں، مگر عیسٰیؑ اس کے شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ نہیں تم ہی نماز پڑھاؤ کیونکہ یہ تمھارے لیے ہی کھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسٰی علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو، چنانچہ وہ کھولا جائے گا۔ باہر دجال ۷۰ ہزار مُسلّح یہودیوں کے ساتھ موجود ہوگا۔ جونہی کہ عیسٰی علیہ السلام پر اس کی نظر پڑے گی، وہ اس طرح گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گُھلتا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا۔ عیسٰیؑ کہیں گے: میرے پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو بچ کر نہ جاسکے گا۔ پھر وہ اسے لُد کے مشرقی دروازے پر جالیں گے اور اللہ یہودیوں کو ہرا دے گا...... اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی جیسے برتن پانی سے بھر جائے۔ سب دنیا کا کلِمہ ایک ہوجائے گا اور اللہ تعالٰی کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔

(۱۶) عن عثمان بن ابی العاص قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ...... وینزل عیسٰی ابن مریم

عثمانؓ بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے ...... اور عیسٰی ابنِ مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے وقت

علیہ السلام عند صلٰوۃ الفجر فیقول له امیرھم یا روح اللّٰه تقدم صلّ، فیقول ھٰذہ الامة بعضھم امراء علی بعض فیتقدم امیرھم فیصلی، فاذا قضٰی صلٰوتهٗ اخذ عیسٰی حربتهٗ فیذھب نحو الدجال فاذا یراہ الدجال ذاب کما یذوب الرصاص فیضع حربته بین شندوبته فیقتلهٗ وینھزم اصحابه لیس یومئذ شیٌ یواری منھم احدا حتّٰی ان الشجر لیقول یا مومن ھٰذا کافر ویقول الحجر یا مومن ھٰذا کافر ۔
(مُسندِ احمد۔ طَبرانی۔ حاکم)

اتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ اے روح اللہ! آپ نماز پڑھائیے۔ وہ جواب دیں گے کہ اس اُمت کے لوگ خود ہی ایک دوسرے پر امیر ہیں۔ تب مسلمانوں کا امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھائے گا۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسیٰؑ اپنا حربہ لے کر دجّال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب ان کو دیکھے گا تو اس طرح پگھلے گا جیسے سیسا پگھلتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنے حربے سے اس کو ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے، مگر کہیں انھیں چُھپنے کو جگہ نہ ملے گی، حتّٰی کہ درخت پکاریں گے: اے مومن! یہ کافر یہاں موجود ہے، اور پتھر پکاریں گے کہ اے مومن! یہ کافر یہاں موجود ہے۔

(۱۷) عن سمرة بن جُنْدُب عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم (فی حدیث طویل) فیصبح فیھم عیسٰی ابن مریم فیھزمه اللّٰه وجنودہ حتّٰی ان اجذم الحائط واصل الشجر لینادی یا مومن ھٰذا کافرٌ یستتربی فتعال اقتله۔ (مُسندِ احمد۔ حاکم)

سَمُرہؓ بن جُندُب (ایک طویل حدیث میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایت کرتے ہیں: پھر صبح کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسیٰؑ ابن مریم آ جائیں گے اور اللہ دجال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا، یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اٹھیں گی کہ اے مومن! یہ کافر میرے پیچھے چُھپا ہوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔

(۱۸) عن عمران بن حصین انّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال لا تزال طائفة من امتی علی الحق ظاھرین علی من ناوأھم حتّٰی یاتی امر اللّٰه تبارك وتعالٰی وینزل عیسٰی ابن مریم علیه السلام ۔
(مُسندِ احمد)

عمرانؓ بن حُصَین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری ہوگا، یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ آ جائے اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہو جائیں۔

(۱۹) عن عائشةؓ (فی قصّة الدجّال) فینزل عیسٰی علیه السلام فیقتله ثم یمکث عیسٰی علیه السلام فی الارض اربعین

حضرت عائشہؓ (دجال کے قصے میں) روایت کرتی ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام

سنة امامًا عادلاً وَحَكَمًا مُقسطًا ۔ (مُسندِ احمد)

چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکمِ منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔

(۲۰) عن سفينة مولٰی رسول الله صلی الله عليه وسلم (فی قصّة الدجّال) فينزل عيسٰی عليه السلام فيقتله الله تعالٰی عند عقبة اَفِيق ۔ (مُسندِ احمد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سَفِینہ (دجّال کے قصے میں) روایت کرتے ہیں: پھر عیسٰی علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالٰی دجّال کو اَفِیق[1] کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔

(۲۱) عن حذيفة (فی ذكر الدجّال) فلما قاموا يصلّون نزل عيسٰی ابن مريم امامهم فصلّی بهم فلما انصرف قال هٰكذا افرجوا بينی و بين عدو الله...... ويسلط الله عليهم المسلمين فيقتلونهم حتّٰی ان الشجر والحجر لينادی يا عبدالله يا عبدالرحمٰن يا مسلم هٰذا اليهودی فاقتلهم فيفنيهم الله تعالٰی ويظهر المسلمون فيكسرون الصليب ويقتلون الخنزير ويضعون الجزية ۔ (مُستدرک حاکم۔ مسلم میں بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ آئی ہے۔ اور حافظ ابنِ حَجَر نے فتح الباری، جلد ۶، ص ۴۵۰ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

حضرت حُذَیفہؓ بن یَمان (دجّال کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کرتے ہیں: پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں گے تو اُن کی آنکھوں کے سامنے عیسٰیؑ ابنِ مریم اُتر آئیں گے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے۔ پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ میرے اور اس دشمنِ خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ...... اور اللہ دجال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو مسلط کر دے گا اور مسلمان انھیں خوب ماریں گے، یہاں تک کہ درخت اور پتھر پکار اُٹھیں گے: اے عبداللہ! اے عبدالرحمٰن! اے مسلمان! یہ رہا ایک یہودی، مار اِسے۔ اس طرح اللہ ان کو فنا کر دے گا اور مسلمان غالب ہوں گے اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ ساقط کر دیں گے۔

یہ جملہ ۲۱ رِوایات ہیں جو ۱۴ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے، لیکن طولِ کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ رِوائیتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

---

[1] اَفِیق، جسے آج کل فِیق کہتے ہیں، شام اور اسرائیل کی سرحد پر موجودہ ریاست شام کا آخری شہر ہے۔ اس کے آگے مغرب کی جانب چند میل کے فاصلے پر طَبَرِیّہ نامی جھیل ہے جس میں سے دریائے اُرْدُن نکلتا ہے، اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فٹ تک گہرائی میں اُتر کر اس مَقام پر پہنچتا ہے جہاں سے دریائے اُرْدُن طَبَرِیّہ میں سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عَقَبۂ اَفِیق (افِیق کی گھاٹی) کہتے ہیں۔

ان احادیث سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی ''مسیحِ موعود'' یا ''مثیلِ مسیح'' یا ''بُروزِ مسیح'' کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اِس امر کی کوئی گنجایش ہے کہ کوئی شخص اِس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ میں ہی وہ مسیح ہوں جس کے آنے کی سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں اُن عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو اَب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لاحاصل ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں یا زندہ کہیں موجود ہیں۔ بالفرض وہ وفات ہی پا چکے ہوں تو اللہ انھیں زندہ کر کے اُٹھا لانے پر قادر ہے،[1] ورنہ یہ بات بھی اللہ کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات میں کہیں ہزار ہا سال تک زندہ رکھے اور جب چاہے دنیا میں واپس لے آئے۔ بہر حال اگر کوئی شخص حدیث کو مانتا ہو تو اُسے یہ ماننا پڑے گا کہ آنے والے وہی عیسیٰ ابنِ مریمؑ ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص حدیث کو نہ مانتا ہو تو وہ سرے سے کسی آنے والے کی آمد کا قائل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ احادیث کے سوا کسی اَور چیز پر مبنی نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب مذاق ہے کہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ تو لے لیا جائے احادیث سے اور پھر انھی احادیث کی اس تصریح کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ آنے والے عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ ہوں گے نہ کہ کوئی مثیلِ مسیح۔

دوسری بات جو اتنی ہی وضاحت کے ساتھ اِن احادیث سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریم کا یہ دوبارہ نُزول نبی مقرر ہو کر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہوگا۔ نہ ان پر وحی نازل ہوگی، نہ وہ خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام یا نئے احکام لائیں گے، نہ وہ شریعتِ محمدیؐ میں کوئی اضافہ یا کوئی کمی کریں گے، نہ اُن کو تجدیدِ دین کے لیے دنیا میں لایا جائے گا، نہ وہ آ کر لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیں گے، اور نہ وہ اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائیں گے۔[2] وہ صرف

---

[1] جو لوگ اس بات کا انکار کرتے ہیں انھیں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۹ مُلاحظہ فرمالینی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بندے کو ۱۰۰ برس تک مُردہ رکھا اور پھر زندہ کر دیا: فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ۔

[2] علمائے اسلام نے اس مسئلے کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ علامہ تفتازانی (۷۲۲ھ-۷۹۲ھ) شرح عقائدِ نَسَفی میں لکھتے ہیں:

ثبت انہ اٰخر الانبیاء ...... فان قیل قد روی فی الحدیث نزول عیسٰی علیہ السلام بعدہٗ قلنا نعم لکنّہ یتابع محمدًا علیہ السلام لأن شریعتہ قد نسخت فلا یکون الیہ وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفۃ رسول اللّٰہ علیہ السلام۔ (طبع مصر، ص ۱۳۵)	یہ ثابت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں...... اگر کہا جائے کہ آپؐ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر احادیث میں آیا ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہاں، آیا ہے، مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے، کیونکہ ان کی شریعت تو منسوخ ہو چکی ہے اس لیے نہ ان کی طرف وحی ہوگی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔

ایک کارِخاص کے لیے بھیجے جائیں گے، اور وہ یہ ہوگا کہ دجّال کے فتنے کا اِستیصال کر دیں۔ اس غرض کے لیے وہ ایسے طریقے سے نازل ہوں گے کہ جن مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا انھیں اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ عیسٰیؑ ابنِ مریم ہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں۔ وہ آکر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے، جو بھی مسلمانوں کا امام اُس وقت ہوگا اسی کے پیچھے نماز پڑھیں گے[1] اور جو بھی اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا، اسی کو آگے رکھیں گے، تاکہ اِس شبہ کی کوئی ادنیٰ سی گنجایش بھی نہ رہے کہ وہ اپنی سابق پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض انجام دینے کے لیے واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر۔ پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آکر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خود بخود اس امر کا اعلان ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں، اور اس بنا پر ان کی آمد سے مُہرِ نبوت کے ٹوٹنے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔

اُن کا آنا بلاتشبیہ اسی نوعیت کا ہوگا جیسے ایک صدرِ ریاست کے دَور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی کوئی خدمت انجام دے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک صدر کے دَور میں کسی سابق صدر کے محض آ جانے سے آئین نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دو صورتوں میں آئین کی خلاف ورزی لازم آتی ہے: ایک، یہ کہ سابق صدر آکر پھر سے فرائضِ صدارت سنبھالنے کی کوشش کرے۔ دوسرے، یہ کہ کوئی شخص اس کی سابق صدارت کا بھی انکار کر دے،

اور یہی بات علامہ آلُوسیؒ تفسیر رُوح المعانی میں کہتے ہیں:

ثم انه علیه السلام حین ینزل باق علٰی نبوته السابقة لم یعزل عنها بحال لکنه لایتعبد بها لنسخها فی حقه وحق غیره وتکلیفه باحکام هذه الشریعة اصلاً وفرعًا فلا یکون الیه علیه السلام وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفة لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم و حاکما من حکام ملته بین امته۔ (جلد ۲۲،ص ۳۲)	پھر، عیسٰی علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو وہ اپنی سابق نبوت پر باقی ہوں گے، بہرحال اس سے معزول تو نہ ہو جائیں گے، مگر وہ اپنی پچھلی شریعت کے پیرو نہ ہوں گے کیونکہ وہ ان کے اور دوسرے سب لوگوں کے حق میں منسوخ ہو چکی ہے، اور اب وہ اُصول اور فُروع میں اِس شریعت کی پیروی پر مکلّف ہوں گے، لہٰذا اُن پر نہ اب وحی آئے گی اور نہ انھیں احکام مقرر کرنے کا اختیار ہوگا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور آپؐ کی اُمت میں ملّتِ محمدیہ کے حاکموں میں سے ایک حاکم کی حیثیت سے کام کریں گے۔

امام رازیؒ اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

انتهاء الانبیاء الی مبعث محمد صلی اللّٰه علیه وسلم فعند مبعثه انتهت تلك المدة فلا یبعد ان یصیر (ای عیسٰی ابن مریم) بعد نزوله تبعًا لمُحمّد (تفسیر کبیر، ج ۳،ص ۳۴۳)	انبیاؑ کا دَور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت تک تھا۔ جب آپؐ مبعوث ہو گئے تو انبیاؑ کی آمد کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نازل ہونے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے۔

[1] اگرچہ دو رِوایتوں (نمبر ۵ و ۲۱) میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نازل ہونے کے بعد پہلی نماز خود پڑھائیں گے،

کیونکہ یہ اُن تمام کاموں کے جواز کو چیلنج کرنے کا ہم معنیٰ ہوگا جو اس کے دَورِ صدارت میں انجام پائے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہ ہو تو بجائے خود سابق صدر کی آمد آئینی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی۔ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی کا بھی ہے کہ ان کے محض آجانے سے ختمِ نبوت نہیں ٹوٹتی۔ البتہ اگر وہ آکر پھر نبوت کا منصب سنبھال لیں اور فرائضِ نبوت انجام دینے شروع کردیں، یا کوئی شخص ان کی سابق نبوت کا بھی انکار کردے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے آئینِ نبوت کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ احادیث نے پوری وضاحت کے ساتھ دونوں صورتوں کا سدِّباب کردیا ہے۔ ایک طرف وہ تصریح کرتی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ اور دوسری طرف وہ خبر دیتی ہیں کہ عیسیٰؑ ابنِ مریم دوبارہ نازل ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان کی یہ آمدِ ثانی منصبِ نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے نہ ہوگی۔

اسی طرح ان کی آمد سے مسلمانوں کے اندر کفر و ایمان کا بھی کوئی نیا سوال پیدا نہ ہوگا۔ اُن کی سابقہ نبوت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہوجائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی اُس نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور آپ کی ساری اُمت ابتدا سے ان کی مومن ہے۔ یہی حیثیت اُس وقت بھی ہوگی۔ مسلمان کسی تازہ نبوت پر ایمان نہ لائیں گے، بلکہ عیسیٰؑ ابنِ مریم کی سابقہ نبوت ہی پر ایمان رکھیں گے جس طرح آج رکھتے ہیں۔ یہ چیز نہ آج ختمِ نبوت کے خلاف ہے نہ اُس وقت ہوگی۔

آخری بات جو اِن احادیث سے، اور بکثرت دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دجّال، جس کے فتنۂ عظیم کا اِستیصال کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کو بھیجا جائے گا، یہودیوں میں سے ہوگا اور اپنے آپ کو ''مسیح'' کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصورات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل پَے در پَے تنزل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخرِ کار بابِل اور اَسیریا کی سلطنتوں نے ان کو غلام بنا کر زمین میں تِتّر بِتّر کردیا، تو انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو خوشخبری دینی شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک ''مسیح'' آنے والا ہے جو ان کو اس ذلت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشین گوئیوں کی بنا پر یہودی ایک مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لڑ کر ملک فتح کرے، بنی اسرائیل کو ملک ملک سے لاکر فلسطین میں جمع کردے، اور ان کی ایک زبردست سلطنت قائم کردے۔ لیکن ان کی اِن توقعات کے خلاف جب حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام خدا کی طرف سے مسیح ہو کر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور انھیں ہلاک کرنے کے درپے ہوگئے۔ اُس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اُس مسیحِ مَوعُود (Promised Messiah) کے منتظر ہیں جس کے آنے کی خوش خبریاں ان کو دی گئی تھیں۔ اُن کا لٹریچر اس آنے والے دَور کے سہانے خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔ تَلمُود اور ربّیوں کے ادبیات میں اُس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اُس کی خیالی لذت کے سہارے صدیوں سے یہودی جی رہے ہیں اور یہ اُمید لیے بیٹھے ہیں کہ یہ مسیحِ مَوعُود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہوگا جو دریائے نیل سے دریائے فُرات تک کا علاقہ (جسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں) انھیں واپس دلائے گا، اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لاکر اس ملک میں پھر سے جمع کردے گا۔

لیکن بیشتر اور قوی تر روایات (نمبر ۳، ۷، ۹، ۱۵، ۱۶) یہی کہتی ہیں کہ وہ نماز میں امامت کرانے سے انکار کریں گے اور جو اس وقت مسلمانوں کا امام ہوگا اسی کو آگے بڑھائیں گے۔ اسی بات کو محدثین اور مفسرین نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔

اب اگر کوئی شخص مشرقِ وسطیٰ کے حالات پر ایک نگاہ ڈالے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے پَس منظر میں ان کو دیکھے تو وہ فوراً یہ محسوس کرے گا کہ اُس دجّالِ اکبر کے ظہور کے لیے اسٹیج بالکل تیار ہو چکا ہے جو حضورؐ کی دی ہوئی خبروں کے مطابق یہودیوں کا ''مسیحِ موعُود'' بن کر اُٹھے گا۔ فلسطین کے بڑے حصّے سے مسلمان بے دخل کیے جا چکے ہیں اور وہاں اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی ہے۔ اس ریاست میں دنیا بھر کے یہودی کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں۔ امریکا، برطانیہ اور فرانس نے اس کو ایک زبردست جنگی طاقت بنا دیا ہے۔ یہودی سرمایے کی بے پایاں امداد سے یہودی سائنس داں اور ماہرینِ فُنون اُس کو روز افزوں ترقی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی یہ طاقت گرد و پیش کی مسلمان قوموں کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن گئی ہے۔ اس ریاست کے لیڈروں نے اپنی اس تمنا کو کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے کہ وہ اپنی ''میراث کا ملک'' حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کی یہودی سلطنت کا جو نقشہ وہ ایک مدت سے کُھلّم کُھلّا شائع کر رہے ہیں، اُسے مقابل کے صفحے پر مُلاحَظہ فرمائیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پورا شام، پورا لُبنان، پورا اُرْدُن اور تقریباً سارا عراق لینے کے علاوہ ترکی سے اسکندرون، مصر سے سینا اور ڈیلٹا کا علاقہ، اور سعودی عرب سے بالائی حجاز و نجد کا علاقہ لینا چاہتے ہیں جس میں مدینۂ منورہ بھی شامل ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آیندہ کسی عالَم گیر جنگ کی ہڑبونگ سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ٹھیک اس موقع پر وہ دجّالِ اکبر اُن کا مسیحِ مَوعُود بن کر اُٹھے گا جس کے ظہور کی خبر دینے ہی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اُس زمانے میں مسلمانوں پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ ایک دن ایک سال کے برابر محسوس ہوگا۔ اسی بنا پر آپؐ فتنۂ مسیحِ دجّال سے خود بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے اور اپنی اُمت کو بھی پناہ مانگنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اِس مسیحِ دجّال کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مَثیلِ مسیح کو نہیں بلکہ اُس اصلی مسیح کو نازل فرمائے گا جسے دو ہزار برس پہلے یہودیوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا اور جسے وہ اپنی دانست میں صلیب پر چڑھا کر ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اس حقیقی مسیح کے نزول کی جگہ ہندوستان یا افریقا یا امریکا میں نہیں بلکہ دِمَشْق میں ہوگی، کیونکہ یہی مَقام اُس وقت عین محاذِ جنگ پر ہوگا۔ براہِ کرم دوسرے صفحے پر نقشہ مُلاحَظہ فرمائیے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسرائیل کی سرحد سے دِمَشْق بمشکل ۵۰-۶۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں، ان کا مضمون اگر آپ کو یاد ہے تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہ ہوگی کہ مسیح دجال ۷۰ ہزار یہودیوں کا لشکر لے کر شام میں گُھسے گا اور دِمَشْق کے سامنے جا پہنچے گا۔ ٹھیک اس نازک موقع پر دِمَشْق کے مشرقی حصّے میں ایک سفید مینار کے قریب حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریم صبح دَم نازل ہوں گے اور نمازِ فجر کے بعد مسلمانوں کو اس کے مقابلے پر لے کر نکلیں گے۔ اُن کے حملے سے دجال پسپا ہو کر اَفِیق کی گھاٹی سے (مُلاحَظہ ہو: حدیث نمبر ۲۱) اسرائیل کی طرف پلٹے گا اور وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ آخرِ کار لُدّ کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر وہ ان کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ (حدیث نمبر ۱۰، ۱۴، ۱۵) اس کے بعد یہودی چُن چُن کر قتل کیے جائیں گے اور ملّتِ یہود کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (حدیث نمبر ۹، ۱۵، ۲۱) عیسائیت بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے اظہارِ حقیقت ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گی (حدیث نمبر ۱، ۲، ۴، ۶)، اور تمام ملّتیں ایک ہی ملت مسلمہ میں ضم ہو جائیں گی۔ (حدیث نمبر ۶، ۱۵)

یہ ہے وہ حقیقت جو کسی اشتباہ کے بغیر احادیث میں صاف نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اس امر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ ''مسیحِ مَوعُود'' کے نام سے جو کاروبار ہمارے ملک میں پھیلایا گیا ہے، وہ ایک جَعل سازی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

وہ یہودی ریاست جس کا خواب اسرائیل کے لیڈر دیکھ رہے ہیں

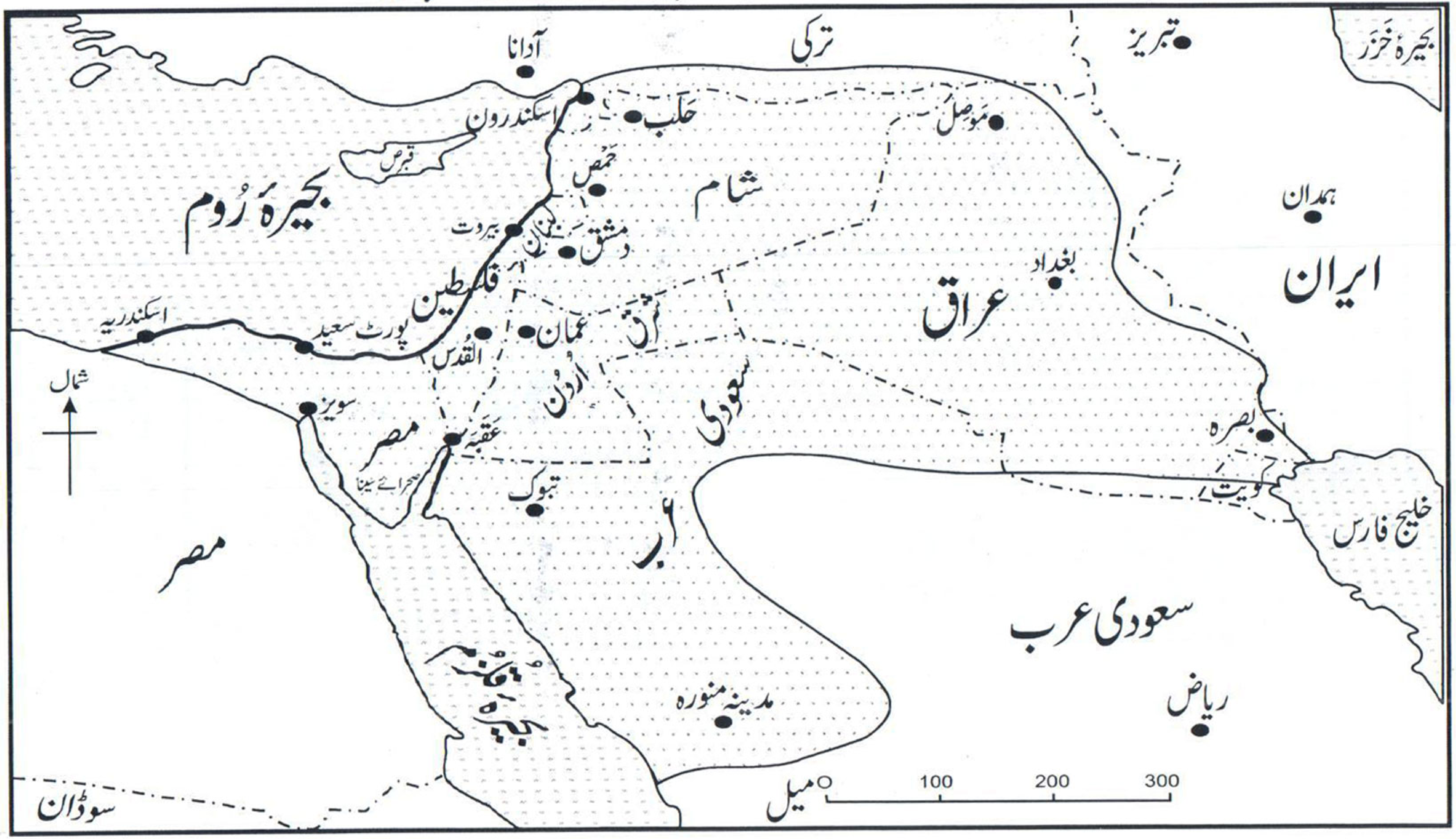

حقیقی مسیحؑ کے نُزُول کا مقام

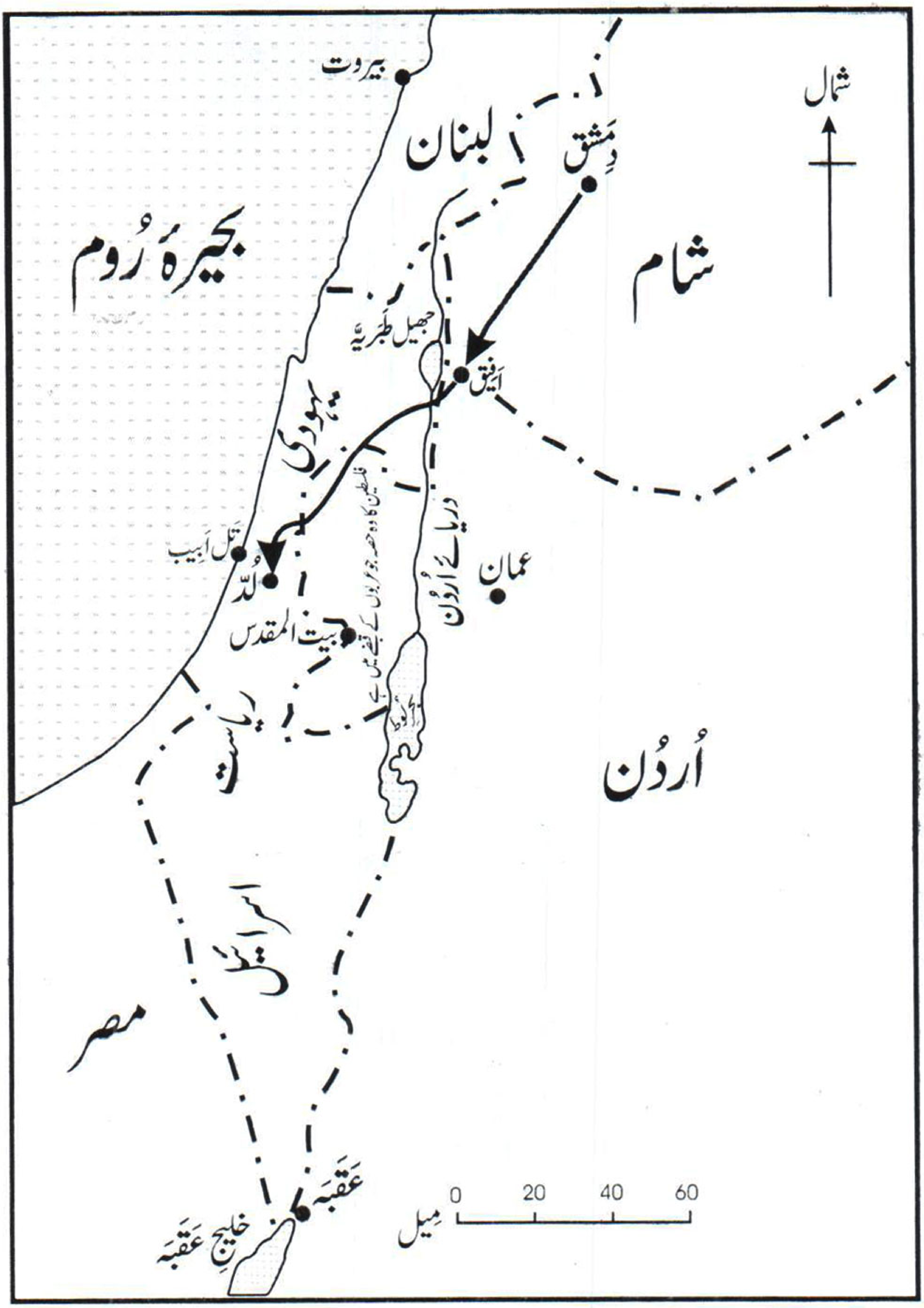

اس جَعل سازی کا سب سے زیادہ مُضحکہ انگیز پہلو یہ ہے کہ جو صاحب اپنے آپ کو ان پیشین گوئیوں کا مصداق قرار دیتے ہیں، انھوں نے خود عیسیٰؑ ابنِ مریم بننے کے لیے یہ دلچسپ تاویل فرمائی ہے:

''اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہینِ احمدیہ کے تیسرے حصّے میں میرا نام مریم رکھا۔ پھر جیسا کہ براہینِ احمدیہ سے ظاہر ہے، دو برس تک صفتِ مریمیت میں مَیں نے پرورش پائی...... پھر...... مریمؑ کی طرح عیسیٰؑ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا، اور آخر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اُس الہام کے جو سب سے آخر براہینِ احمدیہ کے حصۂ چہارم میں درج ہے، مجھے مریم سے عیسیٰؑ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابنِ مریم ٹھیرا۔'' (کشتیِ نوح، ص ۸۷، ۸۸، ۸۹)

یعنی پہلے مریم بنے، پھر خود ہی حاملہ ہوئے، پھر اپنے پیٹ سے آپ عیسیٰؑ ابنِ مریم بن کر تَوَلُّد ہو گئے! اس کے بعد یہ مشکل پیش آئی کہ عیسیٰؑ ابنِ مریم کا نُزول تو احادیث کی رُو سے دِمَشق میں ہونا تھا جو کئی ہزار برس سے شام کا ایک مشہور و معروف مَقام ہے اور آج بھی دنیا کے نقشے پر اسی نام سے موجود ہے۔ یہ مشکل ایک دوسری پُرلطف تاویل سے یوں رفع کی گئی:

''واضح ہو کہ دِمَشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر منجانبِ اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبے کا نام دِمَشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطّبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پَیرو ہیں...... یہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطّبع لوگ اس میں سُکونت رکھتے ہیں دِمَشق سے ایک مُشابہت اور مناسبت رکھتا ہے۔'' (حاشیۂ ازالۂ اَوہام، ص ۶۳ تا ۷۳)

پھر ایک اور اُلجھن یہ باقی رہ گئی کہ احادیث کی رُو سے ابنِ مریم کو ایک سفید مَنارَہ کے پاس اترنا تھا۔ چنانچہ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ مسیح صاحب نے آکر اپنا مَنارَہ خود بنوا لیا۔ اب اسے کون دیکھتا ہے کہ احادیث کی رُو سے مَنارَہ وہاں ابنِ مریمؑ کے نزول سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا، اور یہاں وہ مسیحِ مَوعُود صاحب کی تشریف آوری کے بعد تعمیر کیا گیا۔

آخری اور زبردست اُلجھن یہ تھی کہ احادیث کی رُو سے تو عیسیٰؑ ابن مریم کو لُدّ کے دروازے پر دجّال کو قتل کرنا تھا۔ اِس مشکل کو رفع کرنے کی فکر میں پہلے طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں۔ کبھی تسلیم کیا گیا کہ لُدّ بیت المَقدِس کے دیہات میں سے ایک گاؤں کا نام ہے۔ (ازالۂ اَوہام، شائع کردہ انجمن احمدیہ لاہور، بتقطیع خُرد، ص ۲۲۰) پھر کہا گیا کہ ''لُدّ اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو بے جا جھگڑا کرنے والے ہوں...... جب دجّال کے بے جا جھگڑے کمال تک پہنچ جائیں گے تب مسیحِ مَوعُود ظہور کرے گا اور اس کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دے گا۔'' (ازالۂ اَوہام، ص ۷۳۰) لیکن جب اس سے بھی بات نہ بنی تو صاف کہہ دیا گیا کہ لُد سے مراد لُدھیانہ ہے اور اس کے دروازے پر دجال کے قتل سے مراد یہ ہے کہ اشرار کی مُخالَفت کے باوجود وہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ (الھدیٰ، ص ۹۱)

اِن تاویلات کو جو شخص بھی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹے بہروپ (false impersenation) کا صریح ارتکاب ہے جو عَلَی الاعلان کیا گیا ہے۔

تفہیم القرآن

سبا

(۳۴)

سبا

نام آیت ۱۵ کے فقرے لَقَدْ کَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْکَنِھِمْ اٰیَۃٌ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں سَبا کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس کے نُزول کا ٹھیک زمانہ کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یا تو وہ مکہ کا دَورِ مُتوسّط ہے یا دَورِ اوّل۔ اور اگر دَورِ مُتوسّط ہے تو غالباً اس کا ابتدائی زمانہ ہے جب کہ ظلم وستم کی شدت شروع نہ ہوئی تھی اور ابھی صرف تضحیک و اِستہزا، افواہی جنگ، جھوٹے الزامات اور وسوسہ اندازیوں سے اسلام کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

موضوع اور مضمون اس سورہ میں کفار کے اُن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت پر اور خود آپؐ کی نبوت پر زیادہ تر طنز و تمسخر اور بے ہودہ الزامات کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ اُن اعتراضات کا جواب کہیں تو ان کو نقل کر کے دیا گیا ہے، اور کہیں تقریر سے خود یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کس اعتراض کا جواب ہے۔ جوابات اکثر و بیشتر تفہیم و تذکیر اور اِستدلال کے انداز میں ہیں، لیکن کہیں کہیں کفار کو ان کی ہٹ دھرمی کے بُرے انجام سے ڈرایا بھی گیا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ اور قومِ سَبا کے قصّے اس غرض کے لیے بیان کیے گئے ہیں کہ تمھارے سامنے تاریخ کی یہ دونوں مثالیں موجود ہیں۔ ایک طرف حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی طاقتیں بخشیں اور وہ شوکت و حشمت عطا کی جو پہلے کم ہی کسی کو ملی ہے، مگر یہ سب کچھ پا کر وہ کِبر و غُرور میں مبتلا نہ ہوئے بلکہ اپنے رب کے خلاف بغاوت کرنے کے بجائے اس کے شکر گزار بندے ہی بنے رہے۔ اور دوسری طرف سَبا کی قوم ہے جسے اللہ نے جب اپنی نعمتوں سے نوازا تو وہ پھول گئی اور آخرِ کار اس طرح پارہ پارہ ہوئی کہ اس کے بس افسانے ہی اب دنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔ ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر خود رائے قائم کر لو کہ توحید و آخرت کے یقین اور شکرِ نعمت کے جذبے سے جو زندگی بنتی ہے وہ زیادہ بہتر ہے یا وہ زندگی جو کفر و شرک اور انکارِ آخرت اور دنیا پرستی کی بنیاد پر بنتی ہے۔

ایاتہا ۵۴ سُوْرَةُ سَبَاٍ مَّكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ لَهُ
الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱﴾ يَعْلَمُ
مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ
مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ﴿۲﴾

حمد اُس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک[۱] ہے، اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد[۲] ہے۔ وہ دانا اور باخبر[۳] ہے۔ جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اُس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے، ہر چیز کو وہ جانتا ہے، وہ رحیم اور غفور[۴] ہے۔

۱- حمد کا لفظ عَرَبی زبان میں تعریف اور شکر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں دونوں معنیٰ مراد ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا مالک ہے تو لامحالہ اس کائنات میں جمال و کمال اور حکمت و قدرت اور صنّاعی و کاریگری کی جو شان بھی نظر آتی ہے اس کی تعریف کا مستحق وہی ہے۔ اور اس کائنات میں رہنے والا جس چیز سے بھی کوئی فائدہ یا لُطف و لذت حاصل کر رہا ہے اس پر خدا ہی کا شکر اسے ادا کرنا چاہیے۔ کوئی دوسرا جب ان اشیا کی مِلکیّت میں شریک نہیں ہے تو اُسے نہ حمد کا استحقاق پہنچتا ہے نہ شکر کا۔

۲- یعنی جس طرح اس دنیا کی ساری نعمتیں اُسی کی بخشش ہیں اسی طرح آخرت میں بھی جو کچھ کسی کو ملے گا اُسی کے خزانوں سے اور اسی کی عطا سے ملے گا، اس لیے وہاں بھی وہی تعریف کا مستحق بھی ہے اور شکر کا مستحق بھی۔

۳- یعنی اس کے سارے کام کمال درجے حکمت و دانائی پر مبنی ہیں، جو کچھ کرتا ہے بالکل ٹھیک کرتا ہے۔ اور اسے اپنی ہر مخلوق کے متعلق پورا علم ہے کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، کیا اس کی ضروریات ہیں، کیا کچھ اس کی مَصلَحت کے لیے مناسب ہے، کیا اس نے اب تک کیا ہے اور آگے کیا اس سے صادر ہونے والا ہے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا سے بے خبر نہیں ہے بلکہ اسے ذرّے ذرّے کی حالت پوری طرح معلوم ہے۔

۴- یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کی سلطنت میں اگر کوئی شخص یا گروہ اس کے خلاف بغاوت کرنے کے باوجود پکڑا نہیں

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ
لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا
فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۳﴾ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ

منکرین کہتے ہیں: کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آ رہی ہے![5] کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آ کر رہے گی۔[6] اُس سے ذرّہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں۔ نہ ذرّے سے بڑی اور نہ اُس سے چھوٹی، سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔[7] اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں۔

جا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ دنیا اندھیر نگری اور اللہ تعالیٰ اس کا چوپٹ راجا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور درگزر سے کام لینا اس کی عادت ہے۔ عاصی اور خاطی کو قصور سرزد ہوتے ہی پکڑ لینا، اس کا رزق بند کر دینا، اس کے جسم کو مفلوج کر دینا، اس کو آناً فاناً ہلاک کر دینا، سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، مگر وہ ایسا کرتا نہیں ہے۔ یہ اس کی شانِ رحیمی کا تقاضا ہے کہ قادرِ مُطلَق ہونے کے باوجود وہ نافرمان بندوں کو ڈھیل دیتا ہے، سنبھلنے کی مہلت عطا کرتا ہے، اور جب بھی وہ باز آ جائیں، معاف کر دیتا ہے۔

۵ – یہ بات وہ طنز اور تمسخر کے طور پر چندرا چندرا کر کہتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ بہت دنوں سے یہ پیغمبر صاحب قیامت کے آنے کی خبر سنا رہے ہیں، مگر کچھ خبر نہیں کہ وہ آتے آتے کہاں رہ گئی۔ ہم نے اتنا کچھ انھیں جھٹلایا، اتنی گستاخیاں کیں، ان کا مذاق تک اُڑایا، مگر وہ قیامت ہے کہ کسی طرح نہیں آ چکتی۔

۶ – پروردگار کی قسم کھاتے ہوئے اس کے لیے ''عالم الغیب'' کی صفت استعمال کرنے سے خود بخود اس امر کی طرف اشارہ ہو گیا کہ قیامت کا آنا تو یقینی ہے مگر اس کے آنے کا وقت خدائے عالم الغیب کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ یہی مضمون قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: الاعراف: ۱۸۷۔ طٰہٰ: ۱۵۔ لقمان: ۳۴۔ الاحزاب: ۶۳۔ الملک: ۲۵-۲۶۔ النازعات: ۴۲ تا ۴۴۔

۷ – یہ امکانِ آخرت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ جیسا کہ آگے آیت ۷ میں آ رہا ہے، منکرینِ آخرت جن وجوہ سے زندگی بعدِ موت کو بعید از عقل سمجھتے تھے ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ جب سارے انسان مر کر مٹّی میں رَل مِل جائیں گے اور ان کا ذرّہ ذرّہ منتشر ہو جائے گا تو کس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ بے شمار اجزا پھر سے اکٹھے ہوں اور ان کو جوڑ کر ہم دوبارہ اپنے انھی اجسام

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۴﴾ وَ الَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ
اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾
وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ
رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴿۶﴾

اُن کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے، ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے[8]۔ اے نبیؐ! علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے[9]۔

کے ساتھ پیدا کر دیے جائیں۔ اس شبہ کو یہ کہہ کر رفع کیا گیا ہے کہ ہر ذرّہ جو کہیں گیا ہے، خدا کے دفتر میں اس کا اندراج موجود ہے اور خدا کو معلوم ہے کہ کیا چیز کہاں گئی ہے۔ جب وہ دوبارہ پیدا کرنے کا ارادہ کرے گا تو اسے ایک ایک انسان کے اجزائے جسم کو سمیٹ لانے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی۔

۸ – اُوپر آخرت کے امکان کی دلیل تھی، اور یہ اُس کے وجوب کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا وقت ضرور آنا ہی چاہیے جب ظالموں کو ان کے ظلم کا اور صالحوں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیا جائے۔ عقل یہ چاہتی ہے اور انصاف یہ تقاضا کرتا ہے کہ جو نیکی کرے اسے انعام ملے اور جو بدی کرے وہ سزا پائے۔ اب اگر تم دیکھتے ہو کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں نہ ہر بد کو اس کی بدی کا اور نہ ہر نیک کو اس کی نیکی کا پورا بدلہ ملتا ہے، بلکہ بسا اوقات بدی اور نیکی کے اُلٹے نتائج بھی نکل آتے ہیں، تو تمھیں تسلیم کرنا چاہیے کہ عقل اور انصاف کا یہ لازمی تقاضا کسی وقت ضرور پورا ہونا چاہیے۔ قیامت اور آخرت اُسی وقت کا نام ہے۔ اُس کا آنا نہیں بلکہ نہ آنا عقل کے خلاف اور انصاف سے بعید ہے۔

اس سلسلے میں ایک اَور نکتہ بھی اوپر کی آیات سے واضح ہوتا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ مغفرت اور رزقِ کریم ہے۔ اور جو لوگ خدا کے دین کو نیچا دکھانے کے لیے مُعاندانہ جِدّ و جُہد کریں ان کے لیے بدترین قسم کا عذاب ہے۔ اس سے خود بخود یہ ظاہر ہو گیا کہ جو شخص سچے دل سے ایمان لائے گا اس کے عمل میں اگر کچھ خرابی بھی ہو تو وہ رزقِ کریم چاہے نہ پائے مگر مغفرت سے محروم نہ رہے گا۔ اور جو شخص کافر تو ہو مگر دینِ حق کے مقابلے میں عناد و مخالفت کی روش بھی اختیار نہ کرے وہ عذاب سے تو نہ بچے گا مگر بدترین عذاب اس کے لیے نہیں ہے۔

۹ – یعنی یہ معاندین تمھارے پیش کردہ حق کو باطل ثابت کرنے کے لیے خواہ کتنا ہی زور لگائیں، ان کی یہ تدبیریں

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ
كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ ﴿۷﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ
بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ
الْبَعِيْدِ ﴿۸﴾ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ

منکرین لوگوں سے کہتے ہیں: ''ہم بتائیں تمھیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمھارے جسم کا ذرّہ ذرّہ منتشر ہو چکا ہوگا، اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیے جاؤ گے؟ نہ معلوم، یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے[۱۰]۔''

نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بُری طرح بہکے ہوئے ہیں[۱۱]۔ کیا اِنھوں نے کبھی اُس آسمان و زمین کو نہیں دیکھا جو انھیں آگے اور پیچھے سے

کامیاب نہیں ہوسکتیں، کیونکہ ان باتوں سے وہ جہلا ہی کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ علم رکھنے والے لوگ ان کے فریب میں نہیں آتے۔

۱۰ – قریش کے سردار اس بات کو خوب جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا تسلیم کرنا عوام الناس کے لیے سخت مشکل ہے، کیونکہ ساری قوم آپؐ کو صادق القول جانتی تھی اور کبھی ساری عمر کسی نے آپؐ کی زبان سے کوئی جھوٹی بات نہ سنی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے سامنے اپنا الزام اس شکل میں پیش کرتے تھے کہ یہ شخص جب زندگی بعدِ موت جیسی اَنہونی بات زبان سے نکالتا ہے تو لامحالہ اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا: یا تو (معاذ اللہ!) یہ شخص جان بُوجھ کر ایک جھوٹی بات کہہ رہا ہے، یا پھر یہ مجنون ہے۔ لیکن یہ مجنون والی بات بھی اتنی ہی بے سر و پا تھی جتنی جھوٹ والی بات تھی۔ اس لیے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی ایک کمال درجے کے عاقل و فہیم آدمی کو مجنون مان سکتا تھا، ورنہ آنکھوں دیکھتے کوئی شخص جیتی مکھی کیسے نگل لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بے ہودہ بات کے جواب میں کسی استدلال کی ضرورت محسوس نہ فرمائی اور کلام صرف ان کے اس اچنبھے پر کیا جو زندگی بعدِ موت کے امکان پر وہ ظاہر کرتے تھے۔

۱۱ – یہ ان کی بات کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نادانو! عقل تو تمھاری ماری گئی ہے کہ جو شخص حقیقتِ حال سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے اس کی بات نہیں مانتے اور سرپٹ اُس راستے پر چلے جا رہے ہو جو سیدھا جہنّم کی طرف جاتا ہے،

وَ الْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْهِمْ
کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۹ ؑ

گھیرے ہوئے ہے؟ ہم چاہیں تو انھیں زمین میں دھنسا دیں، یا آسمان کے کچھ ٹکڑے ان پر گرا دیں[12]۔ درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رُجوع کرنے والا ہو[13]۔ ؑ

مگر تمھاری حماقت کی طغیانی کا عالَم یہ ہے کہ اُلٹا اُس شخص کو مجنون کہتے ہو جو تمھیں بچانے کی فکر کر رہا ہے۔

۱۲ — یہ ان کی بات کا دوسرا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ کفارِ قریش جن وُجوہ سے زندگی بعدِ موت کا انکار کرتے تھے ان میں تین چیزیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں: ایک، یہ کہ وہ خدا کے محاسبے اور باز پُرس کو نہیں ماننا چاہتے تھے کیونکہ اسے مان لینے کے بعد دنیا میں من مانی کرنے کی آزادی ان سے چھن جاتی تھی۔ دوسرے، یہ کہ وہ قیامت کے وقوع اور نظامِ عالَم کے درہم برہم ہو جانے اور پھر سے ایک نئی کائنات بننے کو ناقابلِ تصور سمجھتے تھے۔ تیسرے، یہ کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سیکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں اور جن کی ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو کر زمین، ہوا اور پانی میں پراگندہ ہو چکی ہوں ان کا دوبارہ جسم و جان کے ساتھ جی اُٹھنا ان کے نزدیک بالکل بعید از امکان تھا۔ اُوپر کا جواب ان تینوں پہلوؤں پر حاوی ہے، اور مزید برآں اس میں ایک سخت تنبیہ بھی مضمر ہے۔ ان مختصر سے فقروں میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اس زمین و آسمان کو اگر کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہوتا تو تمھیں نظر آتا کہ یہ کوئی کھلونا نہیں ہے، اور نہ یہ نظام اتفاقاً بن گیا ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اسے ایک قادرِ مطلق ہستی نے کمال درجے حکمت کے ساتھ بنایا ہے۔ ایسے ایک حکیمانہ نظام میں یہ تصور کرنا کہ یہاں کسی کو عقل و تمیز اور اختیارات عطا کرنے کے بعد اسے غیر ذمّہ دار اور غیر جواب دِہ چھوڑا جا سکتا ہے، سراسر ایک لغو بات ہے۔

(۲) اس نظام کو جو شخص بھی دیدۂ بینا کے ساتھ دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ قیامت کا آ جانا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ زمین اور آسمان جن بندشوں پر قائم ہیں ان میں ایک ذرا سا اُلٹ پھیر بھی ہو جائے تو آناً فاناً قیامت برپا ہو سکتی ہے۔ اور یہی نظام اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جس نے آج یہ دنیا بنا رکھی ہے، وہ ایک دوسری دنیا پھر بنا سکتا ہے۔ اُس کے لیے ایسا کرنا مشکل ہوتا تو یہی دنیا کیسے بن کھڑی ہوتی۔

(۳) تم نے آخر خالقِ ارض و سما کو کیا سمجھ رکھا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کے دوبارہ پیدا کیے جانے کو اس کی قدرت سے باہر خیال کر رہے ہو۔ جو لوگ مرتے ہیں ان کے جسم پارہ پارہ ہو کر خواہ کتنے ہی منتشر ہو جائیں، رہتے تو اسی زمین و آسمان کے حدود میں ہیں۔ اس سے کہیں باہر تو نہیں چلے جاتے۔ پھر جس خدا کے یہ زمین و آسمان ہیں اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ مٹی اور پانی اور ہوا میں جو چیز جہاں بھی ہے اسے وہاں سے نکال لائے۔ تمھارے جسم میں اب جو کچھ موجود ہے وہ بھی تو اُسی کا جمع کیا ہوا ہے اور اسی مٹی، ہوا اور پانی میں سے

وَ لَقَدۡ اٰتَيۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا ؕ يٰجِبَالُ اَوِّبِىۡ مَعَهٗ وَالطَّيۡرَ ۚ
وَاَلَـنَّا لَـهُ الۡحَدِيۡدَ ۙ﴿۱۰﴾ اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرۡ فِى السَّرۡدِ

ہم نے داؤدؑ کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا[۱۴]۔ (ہم نے حکم دیا کہ) اے پہاڑو! اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو (اور یہی حکم ہم نے) پرندوں کو دیا[۱۵]۔ ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا اِس ہدایت کے ساتھ کہ زِرہیں بنا اور ان کے حلقے ٹھیک اندازے[۱۶] پر رکھ۔ (اے آلِ داؤدؑ!)

نکال کر لایا گیا ہے۔ ان اجزا کی فراہمی اگر آج ممکن ہے تو کل کیوں غیر ممکن ہو جائے گی۔

ان تین دلیلوں کے ساتھ اس کلام میں یہ تنبیہ بھی پوشیدہ ہے کہ تم ہر طرف سے خدا کی خدائی میں گھرے ہوئے ہو۔ جہاں بھی جاؤ گے یہی کائنات تم پر محیط ہوگی۔ خدا کے مقابلے میں کوئی جائے پناہ تم نہیں پا سکتے۔ اور خدا کی قدرت کا حال یہ ہے کہ جب وہ چاہے تمھارے قدموں کے نیچے یا سر کے اُوپر سے جو بلا چاہے تم پر نازل کر سکتا ہے۔ جس زمین کو آغوشِ مادر کی طرح تم اپنے لیے جائے سکون پاتے ہو اور اطمینان سے اس پر گھر بنائے بیٹھے ہو، تمھیں کچھ پتا نہیں کہ اس کی سطح کے نیچے کیا قوتیں کام کر رہی ہیں اور کب وہ کوئی زلزلہ لا کر اسی زمین کو تمھارے لیے مرقد بنا دیتی ہیں۔ جس آسمان کے نیچے تم اس اطمینان کے ساتھ چل پھر رہے ہو گویا کہ یہ تمھارے گھر کی چھت ہے، تمھیں کیا معلوم کہ اسی آسمان سے کب کوئی بجلی گر پڑتی ہے، یا ہلاکت خیز بارش ہو جاتی ہے، یا اور کوئی ناگہانی آفت آ جاتی ہے۔ اس حالت میں تمھاری خدا سے یہ بے خوفی اور فکرِ عاقبت سے یہ غفلت اور ایک خیر خواہ کی نصیحت کے مقابلے میں یہ یاوہ گوئی بجز اس کے اور کیا معنیٰ رکھتی ہے کہ تم اپنی شامت ہی کو دعوت دے رہے ہو۔

۱۳ – یعنی جو شخص کسی قسم کا تعصّب نہ رکھتا ہو، جس میں کوئی ہٹ دھرمی اور ضد نہ پائی جاتی ہو، بلکہ جو اخلاص کے ساتھ اپنے خدا سے طالبِ ہدایت ہو، وہ تو آسمان و زمین کے اس نظام کو دیکھ کر بڑے سبق لے سکتا ہے۔ لیکن جس کا دل خدا سے پھرا ہوا ہو، وہ کائنات میں سب کچھ دیکھے گا مگر حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی اسے سُجھائی نہ دے گی۔

۱۴ – اشارہ ہے اُن بے شمار عنایات کی طرف جن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو نوازا تھا۔ وہ بَیت اللَّحم کے رہنے والے قبیلۂ یہوداہ کے ایک معمولی نوجوان تھے۔ فِلِستیوں کے خلاف ایک معرکے میں جالوت جیسے گراں ڈِیل دشمن کو قتل کر کے یکا یک وہ بنی اسرائیل کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ اسی واقعے سے ان کا عُروج شروع ہوا، یہاں تک کہ طالوت کی وفات کے بعد پہلے وہ حَبرُون (موجودہ الخلیل) میں یہودیہ کے فرماں روا بنائے گئے، پھر چند سال بعد تمام قبائلِ بنی اسرائیل نے مل کر ان کو اپنا بادشاہ منتخب کیا، اور اُنھوں نے یروشلم کو فتح کر کے اسے دولتِ اسرائیل کا پایۂ تخت بنایا۔ یہ انھی کی قیادت تھی جس کی بدولت تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی خدا پرست سلطنت وجود میں آئی جس کے حُدود خلیج عَقَبہ سے دریائے فُرات کے مغربی کناروں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان عنایات پر مزید وہ فضلِ خداوندی ہے جو علم و حکمت، عدل و انصاف، اور خدا ترسی و بندگیِ حق کی صورت میں ان کو نصیب ہوا۔

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ⑪ وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ
غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ ؕ وَمِنَ
الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ
اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ ⑫ یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا

نیک عمل کرو، جو کچھ تم کرتے ہو اُس کو میں دیکھ رہا ہوں۔

اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک[17]۔ ہم نے اُس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا[18] اور ایسے جِنّ اس کے تابع کر دیے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے[19]۔ اُن میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھاتے۔ وہ اُس کے لیے بناتے تھے جو کچھ

(تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۷۳۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷)

۱۵ – یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ انبیاء آیت ۷۹ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۱)

۱۶ – یہ مضمون بھی سورۂ انبیاء آیت ۸۰ میں گزر چکا ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جا چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۲)

۱۷ – یہ مضمون بھی سورۂ انبیاء آیت ۸۱ میں گزر چکا ہے اور اس کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۴-۷۵)

۱۸ – بعض قدیم مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ زمین سے ایک چشمہ حضرت سلیمانؑ کے لیے پھوٹ نکلا تھا جس میں سے پانی کے بجائے پگھلا ہوا تانبا بہتا تھا۔ لیکن آیت کی دوسری تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں تانبے کو پگھلانے اور اس سے طرح طرح کی چیزیں بنانے کا کام اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا کہ گویا وہاں تانبے کے چشمے بہ رہے تھے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۴-۷۵)

۱۹ – یہ جِنّ جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے، آیا یہ دہقانی اور کوہستانی انسان تھے یا واقعی وہی جِنّ تھے جو ایک پوشیدہ مخلوق کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف ہیں، اس مسئلے پر بھی سورۂ انبیاء اور سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۵۔ النمل، حاشیہ ۲۳-۴۵-۵۲)

يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَتَمَاثِيۡلَ وَجِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ

وہ چاہتا، اُونچی عمارتیں، تصویریں[20]، بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی

۲۰ – اصل میں لفظ تَمَاثِیۡلَ استعمال ہوا ہے جو تِمۡثَال کی جمع ہے۔ تمثال عَرَبی زبان میں ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شے کے مشابہ بنائی جائے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔ التمثال اسم للشیٔ المصنوع مشبھا بخلق من خلق اللہ۔ (لِسان العرب) ''تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو۔'' التمثال کل ما صوّر علٰی صورۃ غیرہٖ من حیوان وغیر حیوان (تفسیرِ کشّاف) ''تمثال ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو، خواہ وہ جان دار ہو یا بے جان۔'' اس بنا پر قرآنِ مجید کے اس بیان سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جو ''تماثیل'' بنائی جاتی تھیں وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر یا ان کے مجسّمے ہی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پھول پتیاں اور قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش ونگار ہوں جن سے حضرت سلیمانؑ نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کرایا ہو۔

غلط فہمی کا منشا بعض مفسرین کے یہ بیانات ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے انبیاؑ اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی تھیں۔ یہ باتیں ان حضرات نے بنی اسرائیل کی رِوایات سے اخذ کرلیں اور پھر ان کی توجیہ یہ کی کہ پچھلی شریعتوں میں اس قسم کی تصویریں بنانا ممنوع نہ تھا۔ لیکن ان رِوایات کو بلا تحقیق نقل کرتے ہوئے ان بزرگوں کو یہ خیال نہ رہا کہ حضرت سلیمانؑ جس شریعتِ موسوی کے پیرو تھے اس میں بھی انسانی اور حیوانی تصاویر اور مجسّمے اُسی طرح حرام تھے جس طرح شریعتِ محمدؐیہ میں حرام ہیں۔ اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو حضرت سلیمانؑ سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر انھوں نے آنجناب کو شرک و بت پرستی اور جادوگری اور زِنا کے بدترین الزامات سے مُتَّہَم کیا ہے، اس لیے ان کی رِوایات پر اعتماد کرکے اس جلیل القدر پیغمبر کے بارے میں کوئی ایسی بات ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے جو خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت کے خلاف پڑتی ہو۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاؑ بھی آئے ہیں وہ سب تورات کے پیرو تھے اور ان میں سے کوئی بھی نئی شریعت نہ لایا تھا جو تورات کے قانون کی ناسخ ہوتی۔ اب تورات کو دیکھیے تو اس میں بار بار بصراحت یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسّمے قطعاً حرام ہیں:

> ''تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مُورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں، یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔'' (خُروج، باب ۲۰، آیت ۴)

> ''تم اپنے لیے بُت نہ بنانا اور نہ کوئی تراشی ہوئی مُورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اُسے سجدہ کرو۔'' (اَحبار، باب ۲۶، آیت ۱)

> ''تا نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مُورت اپنے لیے بنا لو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اُڑنے والے پرند یا زمین کے رینگنے والے جان دار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہے، ملتی ہو۔'' (اِستِثنا، باب ۴، آیت ۱۶-۱۸)

''لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر، جو خداوند کے نزدیک مکروہ ہے، اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔'' (استثنا، باب ۲۷، آیت ۱۵)

ان صاف اور صریح احکام کے بعد یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انبیاؑ اور ملائکہ کی تصویریں یا ان کے مجسّمے بنانے کا کام جنّوں سے لیا ہوگا۔ اور یہ بات آخر اُن یہودیوں کے بیان پر اعتماد کر کے کیسے تسلیم کر لی جائے جو حضرت سلیمانؑ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی مشرک بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کرنے لگے تھے۔ (۱-سلاطین، باب ۱۱)

تاہم مفسرین نے تو بنی اسرائیل کی یہ رِوایات نقل کرنے کے ساتھ اس امر کی صَراحت کر دی تھی کہ شریعتِ محمدیہؐ میں یہ فعل حرام ہے اس لیے اب کوئی شخص حضرت سلیمانؑ کی پیروی میں تصویریں اور مجسّمے بنانے کا مجاز نہیں ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے بعض لوگوں نے، جو اہلِ مغرب کی تقلید میں مصوّری و بت تراشی کو حلال کرنا چاہتے ہیں، قرآنِ مجید کی اس آیت کو اپنے لیے دلیل ٹھیرا لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایک پیغمبر نے یہ کام کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب میں اس کے اس فعل کا ذکر کیا ہے اور اس پر کسی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں فرمایا ہے تو اسے لازماً حلال ہی ہونا چاہیے۔

ان مقلدینِ مغرب کا یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے: اول، یہ کہ لفظِ تماثیل جو قرآنِ مجید میں استعمال کیا گیا ہے، انسانی اور حیوانی تصاویر کے معنیٰ میں صریح نہیں ہے، بلکہ اس کا اطلاق غیر جان دار اشیا کی تصویروں پر بھی ہوتا ہے، اس لیے محض اس لفظ کے سہارے یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ قرآن کی رُو سے انسانی اور حیوانی تصاویر حلال ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہایت کثیر التعداد اور قوی الاسناد اور متواتر المعنیٰ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی رُوح اشیا کی تصویریں بنانے اور رکھنے کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اس معاملے میں جو ارشادات حضورؐ سے ثابت ہیں اور جو آثار اکابرِ صحابہؓ سے منقول ہوئے ہیں انھیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) عن عائشة أُمّ المؤمنين ان أُمّ حبيبة وأُمّ سلمة ذكرتا كنيسة رأينها بالحبشة فيها تصاوير فذكرتا للنبى صلى الله عليه وسلم فقال ان اولٰئك اذا كان فيهم الرجل الصالح فمات بَنَوا علٰى قبره مسجدا وصوّروا فيه تلك الصور فاولٰئك شرار الخلق عند الله يوم القيٰمة۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ۔ مسلم، کتاب المساجد۔ نَسائی، کتاب المساجد)

اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت اُمّ حَبیبہؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمَہؓ نے حبش میں ایک کَنیسہ دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ اس کا ذکر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضورؐ نے فرمایا: ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی صالح شخص ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد وہ اس کی قبر پر ایک عبادت گاہ بناتے اور اس میں یہ تصویریں بنا لیا کرتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے روز اللہ کے نزدیک بدترین خلائق قرار پائیں گے۔

(۲) عن ابى جُحَيفَة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن المصور (بخاری،

ابو جُحَیفہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصور پر لعنت فرمائی ہے۔

کتاب البیوع، کتاب الطّلاق وکتاب اللباس)

(۳) عن ابی زرعه قال دخلتُ مع ابی هريرة دارًا بالمدينة فرأى اعلاها مصّورًا يصور قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ومن اظلم ممن ذهب يخلق كخلقى فليخلقوا حبّة وليخلقوا ذرة۔ (بخاری، کتاب اللّباس۔ مُسَندِ احمد اور مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ مَروان کا گھر تھا)

ابوزُرعَہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوہُریرہؓ کے ساتھ ایک مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مکان کے اُوپر ایک مصور تصویریں بنا رہا ہے۔ اس پر حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرے۔ یہ لوگ ایک دانہ یا ایک چیونٹی تو بنا کر دکھائیں۔

(۴) عن ابی محمد الهذلی عن علی قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم فی جنازة فقال ايكم ينطلق الى المدينة فلا يَدَعُ بها وثنًا الا كسره ولا قبرًا الا سوّاه ولا صورة الا لطخها۔ فقال رجل انا يا رسول الله فانطلق فهاب اهل المدينة۔ فرجع۔ فقال علیّ انا انطلق يا رسول الله۔ قال فانطلق، فانطَلَقَ ثم رجع۔ فقال يا رسول الله لم اَدَعْ بها وثنًا الا كسرته ولا قبرًا الّا سويته ولا صورة الا لطختها۔ ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من عاد لصنعة شئ من هٰذا فقد كفر بما انزل على محمدٍ۔ (مُسَندِ احمد۔ مسلم، کتاب الجنائز اور نَسائی، کتاب الجنائز میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث منقول ہوئی ہے۔)

ابومحمد ہُذَلی حضرت علیؓ سے رِوایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک تھے۔ آپؐ نے فرمایا: تم لوگوں میں سے کون ہے جو جا کر مدینے میں کوئی بُت نہ چھوڑے جسے توڑ نہ دے اور کوئی قبر نہ چھوڑے جس زمین کے برابر نہ کر دے اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے مٹا نہ دے۔ ایک شخص نے عرض کیا: میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ چنانچہ وہ گیا مگر اہلِ مدینہ کے خوف سے یہ کام کیے بغیر پلٹ آیا۔ پھر حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ! میں جاتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: اچھا تم جاؤ۔ حضرت علیؓ گئے اور واپس آ کر انھوں نے عرض کیا کہ میں نے کوئی بت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو، کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے زمین کے برابر نہ کر دیا ہو اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو۔ اس پر حضوؐر نے فرمایا: اب اگر کسی شخص نے ان چیزوں میں سے کوئی چیز بنائی تو اُس نے اُس تعلیم سے کفر کیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ہے۔

(۵) عن ابن عباس عن النبی صلى الله

ابنِ عباسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایت

علیہ وسلم...... ومن صور صورۃ عذب وکلف ان ینفخ فیھا ولیس بنافخ۔ (بخاری، کتاب التعبیر۔ ترمذی، ابواب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔ مسندِ احمد)

کرتے ہیں...... اور جس شخص نے تصویر بنائی اُسے عذاب دیا جائے گا اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں رُوح پھونکے اور وہ نہ پھونک سکے گا۔

(۶) عن سعید بن ابی الحسن قال کنت عند ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما اذ اتاہ رجل فقال یا ابا عباس انی انسان انما معیشتی من صنعۃ یدی وانی اصنع ھٰذہ التصاویر۔ فقال ابن عباس لا احدّثک اِلا ما سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم یقول۔ سمعتہ یقول من صور صورۃً فان اللّٰہ معذبہ حتّٰی ینفخ فیھا الروح ولیس بنافخ فیھا ابدًا۔ فربا الرجل ربوۃً شدیدۃ واصفر وجھہ۔ فقال ویحك ان ابیت الا ان تصنع فعلیك بھٰذا الشجر کل شئ لیس فیہ روح۔ (بخاری، کتاب البُیوع۔ مسلم، کتاب اللّباس۔ نسائی، کتاب الزّینۃ۔ مُسندِ احمد)

سعید بنِ ابی الحَسَن کہتے ہیں کہ میں ابنِ عباسؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ اے ابو عباسؓ! میں ایک ایسا شخص ہوں جو اپنے ہاتھ سے روزی کماتا ہوں اور میرا روزگار یہ تصویریں بنانا ہے۔ ابنِ عباسؓ نے جواب دیا کہ میں تم سے وہی بات کہوں گا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنی ہے۔ میں نے حضورؐ سے یہ بات سنی ہے کہ جو شخص تصویر بنائے گا اللہ اُسے عذاب دے گا اور اسے نہ چھوڑے گا جب تک وہ اس میں روح نہ پھونکے، اور وہ کبھی روح نہ پھُونک سکے گا۔ یہ بات سن کر وہ شخص سخت بَرافروختہ ہوا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس پر ابنِ عباسؓ نے کہا: بندۂ خدا! اگر تجھے تصویر بنانی ہی ہے تو اس درخت کی بنا، یا کسی ایسی چیز کی بنا جس میں روح نہ ہو۔

(۷) عن عبداللّٰہ بن مسعود قال سمعت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول ان اشدّ الناس عذابًا عند اللّٰہ یوم القیٰمۃ المصوّرون۔ (بخاری، کتاب اللّباس۔ مسلم، کتاب اللّباس۔ نسائی، کتاب الزّینہ۔ مُسندِ احمد)

عبد اللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ کے ہاں سخت ترین سزا پانے والے مصور ہوں گے۔

(۸) عن عبداللّٰہ بن عمر ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ان الذین یصنعون ھٰذہ الصّور یعذبون یوم القیٰمۃ یقال لھم احیوا ما خلقتم۔ (بخاری، کتاب اللباس۔ مسلم، کتاب اللّباس۔

عبد اللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اسے زندہ کرو۔

نَسائی، کتاب الزینۃ۔ مُسْنَدِ احمد)

(۹) عن عائشة رضی الله عنها انها اشترت نمرقة فيها تصاوير فقام النبی صلی الله عليه وسلم بالباب ولم يدخل فقلت اتوب الی الله ممّا اذنبت قال ما هٰذه النمرقة قلت لتجلس عليها وتوسدها قال ان اصحاب هٰذه الصور يعذبون يوم القيٰمة يقال لهم احيوا ما خلقتم و ان الملائكة لا تدخل بيتًا فيه الصورة (بخاری، کتاب اللباس۔ مسلم، کتاب اللباس۔ نَسائی، کتاب الزینۃ۔ ابنِ ماجہ، کتاب التجارات۔ مُوَطّا، کتاب الاِسْتِئذان)

حضرت عائشہؓ سے رِوایت ہے کہ انھوں نے ایک تکیہ خریدا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دروازے ہی میں کھڑے ہو گئے۔ اندر داخل نہ ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں خدا سے توبہ کرتی ہوں ہر اس گناہ پر جو میں نے کیا ہو۔ حضورؐ نے فرمایا: یہ تکیہ کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا: یہ اس غرض کے لیے ہے کہ آپؐ یہاں تشریف رکھیں اور اس پر ٹیک لگائیں۔ فرمایا: ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے، اس کو زندہ کرو۔ اور ملائکہ (یعنی ملائکۂ رحمت) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔

(۱۰) عن عائشة قالت دخل عَلَیَّ رسول الله صلی الله عليه وسلم وانا متسترة بقرام فيه صورة فتلوّن وجهه ثم تناول الستر فهتكه ثم قال ان من اشد الناس عذابًا يوم القيٰمة الذين يشبهون بخلق الله۔ (مسلم، کتاب اللباس۔ بخاری، کتاب اللباس۔ نَسائی، کتاب الزینۃ)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویر تھی۔ آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پھر آپؐ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا: قیامت کے روز سخت ترین عذاب جن لوگوں کو دیا جائے گا، ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱۱) عن عائشة قالت قدم رسول الله صلی الله عليه وسلم من سفر وقد سترت علٰی بابی درنوكًا فيه الخيل ذوات الاجنحة فامرنی فنزعته۔ (مسلم، کتاب اللباس۔ نَسائی، کتاب الزینۃ)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے اور میں نے اپنے دروازے پر ایک پردہ لٹکا رکھا تھا، جس میں پردار گھوڑوں کی تصویریں تھیں۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ اسے اتار دو اور میں نے اتار دیا۔

(۱۲) عن جابر قال نهٰی رسول الله صلی الله عليه وسلم عن الصورة فی البيت ونهٰی

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا کہ گھر میں تصویر

ان یصنع ذالك (ترمذی، ابواب اللباس)

رکھی جائے اور اس سے بھی منع فرما دیا کہ کوئی شخص تصویر بنائے۔

(۱۳) عن ابن عباس عن ابی طلحة عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لا تدخل الملائکة بیتا فیہ کلب ولا صورة (بخاری، کتاب اللباس)

ابنِ عباسؓ ابوطلحہ انصاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ملائکہ (یعنی ملائکۂ رحمت) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا پلا ہوا ہو اور نہ ایسے گھر میں جس میں تصویر ہو۔

(۱۴) عن عبداللّٰہ بن عمر قال وعد النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم جبریل فراث علیہ حتی اشتد علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فخرج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلقیہ فشکا الیہ ما وجد فقال لہٗ اِنّا لا ندخل بیتًا فیہ صورة ولا کلب۔

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریلؑ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا وعدہ کیا مگر بہت دیر لگ گئی اور وہ نہ آئے۔ حضورؐ کو اس سے پریشانی ہوئی اور آپؐ گھر سے نکلے تو وہ مل گئے۔ آپؐ نے ان سے شکایت کی تو انھوں نے کہا: ہم کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تصویر ہو۔

(بخاری، کتاب اللباس۔ اس مضمون کی متعدّد روایات بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی، ابنِ ماجہ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے متعدّد صحابہ سے نقل کی ہیں۔)

ان روایات کے مقابلے میں کچھ روایتیں ایسی بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں تصاویر کے معاملے میں رخصت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ابوطلحہؓ انصاری کی یہ روایت کہ جس کپڑے میں تصویر کڑھی ہوئی ہو اس کا پردہ لٹکانے کی اجازت ہے (بخاری، کتاب اللباس)، اور حضرت عائشہؓ کی یہ روایت کہ تصویر دار کپڑے کو پھاڑ کر جب انھوں نے گدّا بنا لیا تو حضورؐ نے اسے بچھانے سے منع نہ فرمایا (مسلم، کتاب اللباس)، اور سالمؒ بن عبداللہؓ بن عمرؓ کی یہ روایت کہ مُمانعت اس تصویر کی ہے جو نمایاں مَقام پر نصب کی گئی ہو، نہ کہ اس تصویر کی جو فرش کے طور پر بچھا دی گئی ہو۔ (مُسندِ احمد) لیکن ان میں سے کوئی حدیث بھی دراصل ان احادیث کی تردید نہیں کرتی جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ جہاں تک تصویر بنانے کا تعلق ہے اُس کا جواز ان میں سے کسی حدیث سے بھی نہیں نکلتا۔ یہ احادیث صرف اِس مسئلے سے بحث کرتی ہیں کہ اگر کسی کپڑے پر تصویر بنی ہوئی ہو اور آدمی اس کو لے چکا ہو تو کیا کرے۔ اس باب میں ابوطلحہؓ انصاری والی روایت کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ بکثرت دوسری صحیح احادیث سے ٹکراتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر دار کپڑا لٹکانے سے نہ صرف منع فرمایا ہے بلکہ اسے پھاڑ دیا ہے۔ نیز خود حضرت ابوطلحہؓ کا اپنا عمل جو ترمذی اور مُؤطّا میں منقول ہوا ہے وہ یہ ہے کہ تصویر دار پردہ لٹکانا تو درکنار، وہ ایسا فرش بچھانے میں بھی کراہت محسوس کرتے تھے جس میں تصاویر ہوں۔ رہیں حضرت عائشہؓ اور سالمؒ بن عبداللہؓ کی روایات، تو ان سے صرف اتنا جواز نکلتا ہے کہ اگر تصویر احترام کی جگہ پر نہ ہو بلکہ ذلت کے ساتھ فرش میں رکھی جائے اور اسے پامال کیا جائے تو وہ قابلِ برداشت ہے۔ ان احادیث سے آخر اُس پوری ثقافت کا جواز کیسے نکالا جا سکتا ہے جو تصویر کشی اور مجسمہ سازی کے آرٹ کو تہذیبِ انسانی کا قابلِ فخر کمال قرار دیتی ہے اور اسے مسلمانوں میں رواج دینا چاہتی ہے۔

تصاویر کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرِ کار اُمت کے لیے جو ضابطہ چھوڑا ہے اس کا پتا اکابرِ صحابہؓ کے اُس طرزِ عمل سے چلتا ہے جو انھوں نے اس باب میں اختیار کیا۔ اسلام میں یہ اُصول مسلّم ہے کہ معتبر اسلامی ضابطہ وہی ہے جو تمام تدریجی احکام اور ابتدائی رخصتوں کے بعد حضورؐ نے اپنے آخر عہد میں مقرر کر دیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد اکابرِ صحابہؓ کا کسی طریقے پر عمل درآمد کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسی طریقے پر حضورؐ نے اُمت کو چھوڑا تھا۔ اب دیکھیے کہ تصویروں کے ساتھ اس مقدّس گروہ کا کیا برتاؤ تھا:

قال عمر رضی اللّٰہ عنہ اِنّا لا ندخل کنائسکم من اجل التماثیل التی فیھا الصُّوَر۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمھارے کنیسوں میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں۔

کان ابن عباس یصلی فی بیعۃ الا بیعۃ فیھا تماثیل۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

ابنِ عباسؓ گرجا میں نماز پڑھ لیتے تھے، مگر کسی ایسے گرجا میں نہیں جس میں تصویریں ہوں۔

عن ابی الھیاج الاسدی، قال لی عَلِیّ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالًا الاطمستہ ولا قبرًا مشرفًا الا سویتہ ولا صورۃ الا طمستھا۔ (مسلم، کتاب الجنائز۔ نسائی، کتاب الجنائز)

ابو الہَیّاج اَسَدی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے مجھ سے کہا: کیا نہ بھیجوں میں تم کو اُس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ اور وہ یہ ہے کہ تم کوئی مجسّمہ نہ چھوڑو جسے توڑ نہ دو، اور کوئی اُونچی قبر نہ چھوڑو جسے زمین کے برابر نہ کر دو، اور کوئی تصویر نہ چھوڑو جسے مٹا نہ دو۔

عن حنش الکنانی عن علی انہ بعث عامل شرطتہ فقال لہ اتدری علی ما ابعثک؟ علی ما بعثنی علیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان انحت کل صورۃ وان اسوی کل قبر۔ (مُسنَدِ احمد)

حَنَش الکِنانی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی پولیس کے کوتوال سے کہا کہ تم جانتے ہو میں کس مہم پر تمھیں بھیج رہا ہوں؟ اُس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ میں ہر تصویر کو مٹا دوں اور ہر قبر کو زمین کے برابر کر دوں۔

اسی ثابت شدہ اسلامی ضابطے کو فقہائے اسلام نے تسلیم کیا ہے اور اسے قانونِ اسلامی کی ایک دفعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عَینیؒ توضیح کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”ہمارے اصحاب (یعنی فقہائے احناف) اور دوسرے فقہا کہتے ہیں کہ کسی جان دار چیز کی تصویر بنانا حرام ہی نہیں، سخت حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے، خواہ بنانے والے نے اسے کسی ایسے استعمال کے لیے بنایا ہو جس میں اس کی تذلیل ہو، یا کسی دوسری غرض کے لیے۔ ہر حالت میں تصویر کشی حرام ہے کیوں کہ اس میں اللہ کی تخلیق سے مُشابہَت ہے۔ اسی طرح تصویر خواہ کپڑے میں ہو یا فرش میں ہو یا دینار یا درہم یا پیسے میں یا کسی برتن میں

یا دیوار میں، بہرحال اس کا بنانا حرام ہے۔ البتہ جان دار کے سوا کسی دوسری چیز مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔ ان تمام اُمور میں تصویر کے سایہ دار ہونے یا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہی رائے امام مالکؒ، سُفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے علما کی ہے۔ قاضی عِیاضؒ کہتے ہیں کہ اس سے لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں۔ مگر امام مالکؒ ان کے خریدنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔'' (عُمدۃ القاری، ج ۲۲، ص ۷۰۔ اسی مسلک کو امام نَوَوِیؒ نے شرح مسلم میں زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ مُلاحظہ ہو: شرح نَوَوِی، مطبوعہ مصر، ج ۱۴، ص ۸۱-۸۲)

یہ تو ہے تصویر سازی کا حکم۔ رہا دوسرے کی بنائی ہوئی تصویر کے استعمال کا مسئلہ، تو اس کے بارے میں فقہائے اسلام کے مسالک علامہ ابنِ حَجَرؒ نے اس طرح نقل کیے ہیں:

''مالکی فقیہ ابنِ عَرَبیؒ کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ پڑتا ہو اس کے حرام ہونے پر تو اِجماع ہے قطعِ نظر اس سے کہ وہ تحقیر کے ساتھ رکھی گئی ہو یا نہ۔ اس اجماع سے صرف لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں...... ابنِ عَرَبیؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ نہ پڑتا ہو وہ اگر اپنی حالت پر باقی رہے (یعنی آئینہ کی پرچھائیں کی طرح نہ ہو بلکہ چھپی ہوئی تصویر کی طرح ثابت وقائم ہو) تو وہ بھی حرام ہے، خواہ اسے حقارت کے ساتھ رکھا گیا ہو یا نہ۔ البتہ اگر اس کا سر کاٹ دیا گیا ہو یا اس کے اجزا الگ الگ کر دیے گئے ہوں تو اس کا استعمال جائز ہے...... امام الحرمین نے ایک مسلک یہ نقل کیا ہے کہ پردے یا تکیے پر اگر تصویر ہو تو اس کے استعمال کی اجازت ہے، مگر دیوار یا چھت میں جو تصویر لگائی جائے وہ ممنوع ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا اعزاز ہوگا، بخلاف اس کے پردے اور تکیے کی تصویر حقارت سے رہے گی...... ابنِ اَبی شَیبَہؒ نے عِکرِمہؒ سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ تابعین کے علما یہ رائے رکھتے تھے کہ فرش اور تکیے میں تصویر کا ہونا اُس کے لیے باعثِ ذلّت ہے۔ نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اُونچی جگہ پر جو تصویر لگائی گئی ہو وہ حرام ہے اور قدموں میں جسے پامال کیا جاتا ہو وہ جائز ہے۔ یہی رائے ابنِ سِیرینؒ، سالمؒ بن عبداللہؒ، عِکرِمہ بن خالدؒ اور سعید بن جُبَیرؒ سے بھی منقول ہے۔'' (فتح الباری، ج ۱۰، ص ۳۰۰)

اس تفصیل سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات، صحابۂ کرامؓ کے عمل اور فقہائے اسلام کے مُتَّفَقَہ فتاویٰ کی رُو سے ایک مُسَلَّم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متأثّر لوگوں کی مُوشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

اس سلسلے میں چند باتیں اور بھی سمجھ لینی ضروری ہیں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے:

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو اور دستی تصویر میں تصویر ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی فرق ہے وہ طریقِ تصویر سازی کے لحاظ سے ہے، اور اس لحاظ سے شریعت نے احکام میں

کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

بعض لوگ یہ اِستِدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کا حکم محض شرک و بت پرستی کو روکنے کی خاطر دیا گیا تھا، اور اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے، لہٰذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے۔ لیکن یہ اِستِدلال بالکل غلط ہے۔ اوّل، تو احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہیں۔ دوسرے، یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آج خود برعظیم ہند و پاکستان میں کروڑوں بت پرست مشرکین موجود ہیں، دنیا کے مختلف خِطّوں میں طرح طرح سے شرک ہو رہا ہے، عیسائی اہلِ کتاب بھی حضرت عیسٰیؑ اور حضرت مریمؑ اور اپنے متعدّد اولیا کی تصاویر اور مجسّموں کو پوج رہے ہیں، حتّٰی کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہییں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں، یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسّمے جن کو معبُود بنا لیا گیا ہو، باقی دوسری تصویروں اور مجسّموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام وارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی، بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر اُن بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں، ڈِکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصویر کو دنیا میں شَہْوانیّت پھیلانے کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر زمانے سے زیادہ برسرِ عُروج ہے۔ تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لیے بھی بکثرت استعمال کی جاتی رہی ہیں اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جا رہی ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے اِستِیصال کی خاطر دیا ہے، اصلاً غلط ہے۔ شارع نے مُطلَقاً جان دار اشیا کی تصویر کو روکا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے مُتَّبِع ہیں تو ہمیں عَلَی الاطلاق اس سے رُک جانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی عِلّتِ حکم خود تجویز کر کے اُس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں۔

بعض لوگ چند بظاہر بالکل ''بے ضرر'' قسم کی تصاویر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ آخر ان میں کیا خطرہ ہے، یہ تو شرک اور شہوانیت اور فساد انگیزی اور سیاسی پروپیگنڈے اور ایسے ہی دوسرے مَفاسِد سے قطعی پاک ہیں، پھر ان کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس معاملے میں لوگ پھر وہی غَلَطی کرتے ہیں کہ پہلے عِلّتِ حکم خود تجویز کر لیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ جب فُلاں چیز میں یہ عِلّت نہیں پائی جاتی تو وہ کیوں ناجائز ہے۔ علاوہ بریں یہ لوگ اسلامی شریعت کے اس قاعدے کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ حلال اور حرام کے درمیان ایسی دُھندلی اور مُبہَم حد بندیاں قائم نہیں کرتی جن سے آدمی یہ فیصلہ نہ کر سکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اُس حد کو پار کر گیا ہے، بلکہ ایسا واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہے جسے ہر شخص روزِ روشن کی طرح دیکھ سکتا ہو۔ تصاویر کے درمیان یہ حد بندی قطعی واضح ہے کہ جان داروں کی تصویریں حرام اور بے جان اشیا کی تصویریں حلال ہیں۔ اس خطِ امتیاز میں کسی اِشتِباہ کی گنجایش نہیں ہے۔ جسے احکام کی پیروی کرنی ہو وہ صاف صاف جان سکتا ہے کہ اس کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔

رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ
الشَّکُوۡرُ ﴿۱۳﴾ فَلَمَّا قَضَیۡنَا عَلَیۡہِ الۡمَوۡتَ مَا دَلَّہُمۡ عَلٰی مَوۡتِہٖۤ اِلَّا
دَآبَّۃُ الۡاَرۡضِ تَاۡکُلُ مِنۡسَاَتَہٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ
کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ الۡغَیۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِی الۡعَذَابِ الۡمُہِیۡنِ ﴿ؕ۱۴﴾

بھاری دیگیں[۲۱] ـــــــــ اَے آلِ داؤد! عمل کرو شکر کے طریقے پر[۲۲]، میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔

پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جِنّوں کو اس کی موت کا پتا دینے والی کوئی چیز اُس گُھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جِنوں پر یہ بات کُھل گئی[۲۳] کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذِلّت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے[۲۴]۔

لیکن اگر جان داروں کی تصاویر میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھیرایا جاتا تو دونوں قسم کی تصاویر کی کوئی بڑی سے بڑی فہرست بیان کر دینے کے بعد بھی جواز و عَدَمِ جواز کی سرحد کبھی واضح نہ ہو سکتی اور بے شمار تصویروں کے بارے میں یہ اِشتِباہ باقی رہ جاتا کہ انھیں حدِ جواز کے اندر سمجھا جائے یا باہر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے شراب کے بارے میں اسلام کا یہ حکم کہ اس سے قطعی اجتناب کیا جائے ایک صاف حد قائم کر دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی اتنی مقدار استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے جس سے نشہ پیدا ہو تو حلال اور حرام کے درمیان کسی جگہ بھی حدِّ فاصل قائم نہ کی جا سکتی اور کوئی شخص بھی فیصلہ نہ کر سکتا کہ کس حد تک وہ شراب پی سکتا ہے اور کہاں جا کر اسے رُک جانا چاہیے۔ (مزید تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: رسائل و مسائل، حصّہ اوّل، ص ۱۵۲ تا ۱۵۵)

۲۱ ـ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں بہت بڑے پیمانے پر مہمان نوازی ہوتی تھی۔ بڑے بڑے حوض جیسے لگن اس لیے بنائے گئے تھے کہ ان میں لوگوں کے لیے کھانا نکال کر رکھا جائے اور بھاری دیگیں اس لیے بنوائی گئی تھیں کہ ان میں بیک وقت ہزاروں آدمیوں کا کھانا پک سکے۔

۲۲ ـ یعنی شکر گزار بندوں کی طرح کام کرو۔ جو شخص نعمت دینے والے کا احسان محض زبان سے مانتا ہو، مگر اس کی نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہو، اس کا محض زبانی شکریہ بے معنی ہے۔ اصل شکر گزار بندہ وہی ہے جو زبان سے بھی نعمت کا اعتراف کرے، اور اس کے ساتھ مُنعِم کی عطا کردہ نعمتوں سے وہی کام بھی لے جو مُنعِم کی مرضی کے مطابق ہو۔

۲۳ ـ اصل الفاظ ہیں: تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ۔ اس فقرے کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو ہم نے اُوپر متن میں کیا ہے۔ اور

دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جِنّوں کا حال کھل گیا یا منکشف ہوگیا۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خود جنّوں کو پتا چل گیا کہ غیب دانی کے متعلق ان کا زَعم غلط ہے۔ دوسری صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ عام لوگ جو جنوں کو غیب داں سمجھتے تھے، ان پر یہ راز فاش ہوگیا کہ وہ کوئی علم غیب نہیں رکھتے۔

۲۴ — موجودہ زمانے کے بعض مفسرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا بیٹا رُحُبعام چونکہ نالائق اور عیش پسند تھا اور خوشامدی مُصاحبوں میں گھِرا ہوا تھا، اس لیے اپنے جلیل القدر والد کی وفات کے بعد وہ اُس بارِ عظیم کو نہ سنبھال سکا جو اس پر آ پڑا تھا۔ اس کی جانشینی کے تھوڑی مدّت بعد ہی سلطنت کا قَصر دھڑام سے زمین پر آ رہا اور گرد و پیش کے جن سرحدی قبائل (یعنی جِنّوں) کو حضرت سلیمانؑ نے اپنی قوتِ قاہرہ سے خادم بنا رکھا تھا وہ سب قابو سے نکل گئے۔ لیکن یہ تأویل کسی طرح بھی قرآن کے الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن کے الفاظ جو نقشہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ پر ایسی حالت میں موت طاری ہوئی جب کہ وہ ایک عصا کے سہارے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ اس عصا کی وجہ سے ان کا بے جان جسم اپنی جگہ قائم رہا اور جِنّ یہ سمجھتے ہوئے ان کی خدمت میں لگے رہے کہ وہ زندہ ہیں۔ آخرِ کار جب عصا کو گُھن لگ گیا اور وہ اندر سے کھوکھلا ہوگیا تو اُن کا جسم زمین پر گر گیا اور اُس وقت جِنّوں کو پتا چلا کہ اُن کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس صاف اور صریح بیانِ واقعہ کو آخر یہ معنیٰ پہنانے کی کیا معقول وجہ ہے کہ گُھن سے مراد حضرت سلیمانؑ کے بیٹے کی نالائقی ہے، اور عصا سے مراد اُن کا اقتدار ہے، اور ان کے مُردہ جسم کے گر جانے سے مراد ان کی سلطنت کا پارہ پارہ ہوجانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر یہی مضمون بیان کرنا ہوتا تو کیا اس کے لیے عربِی مبین میں الفاظ موجود نہ تھے کہ اس ہیر پھیر کے ساتھ اسے بیان کیا جاتا؟ یہ پہیلیوں کی زبان آخر قرآنِ مجید میں کہاں استعمال کی گئی ہے؟ اور اس زمانے کے عام عرب جو اس کلام کے اوّلین مخاطَب تھے، یہ پہیلی کیسے بُوجھ سکتے تھے؟

پھر اس تأویل کا سب سے زیادہ عجیب حصّہ یہ ہے کہ اس میں جنّوں سے مراد وہ سرحدی قبائل لیے گئے ہیں جنھیں حضرت سلیمانؑ نے اپنی خدمت میں لگا رکھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان قبائل میں سے کون غیب دانی کا مدّعی تھا اور کس کو مشرکین غیب داں سمجھتے تھے؟ آیت کے آخری الفاظ کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر پڑھے تو وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جِنّ سے مراد یہاں لازماً کوئی ایسا گروہ ہے جو یا تو خود غیب دانی کا دعویٰ رکھتا تھا، یا لوگ اس کو غیب داں سمجھتے تھے، اور اس گروہ کے غیب سے ناواقف ہونے کا راز اس واقعے نے فاش کر دیا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کو زندہ سمجھتے ہوئے خدمت میں لگے رہے، حالانکہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ قرآنِ مجید کا یہ بیان اس کے لیے کافی تھا کہ ایک ایمان دار آدمی اس کو دیکھ کر اپنے اس خیال پر نظرِ ثانی کر لیتا کہ جِنّ سے مراد سرحدی قبائل ہیں۔ لیکن جو لوگ مادّہ پرست دنیا کے سامنے جِنّ نامی ایک پوشیدہ مخلوق کا وجود تسلیم کرتے ہوئے شرماتے ہیں وہ قرآن کی اس تصریح کے باوجود اپنی تأویل پر مُصِرّ ہیں۔

قرآن میں متعدِّد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ مشرکینِ عرب جِنّوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے، انھیں اللہ کی اولاد سمجھتے تھے اور ان سے پناہ مانگا کرتے تھے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ (الانعام: ۱۰۰) اور انھوں نے جِنّوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا لیا، حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِىۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ ‌ۚ جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ وَّشِمَالٍ ە

سَبا[25] کے لیے اُن کے اپنے مَسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی،[26] دو باغ دائیں اور بائیں۔[27]

وَجَعَلُوۡا بَيۡنَهٗ وَبَيۡنَ الۡجِنَّةِ نَسَبًا (الصّافّات: ۱۵۸)	اور انھوں نے اللہ کے اور جنّوں کے درمیان نسبی تعلق تجویز کر لیا۔
وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ يَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ (الجن: ۶)	اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جِنّوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

انھی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ جنوں کو عالم الغیب سمجھتے تھے اور غیب کی باتیں جاننے کے لیے اُن کی طرف رُجوع کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی عقیدے کی تردید کے لیے یہ واقعہ سنا رہا ہے اور اس سے مقصود کفارِ عرب کو یہ احساس دلانا ہے کہ تم لوگ خواہ مخواہ جاہلیّت کے غلط عقائد پر اصرار کیے چلے جا رہے ہو حالانکہ تمھارے یہ عقائد بالکل بے بنیاد ہیں۔ (مزید توضیح کے لیے آگے حاشیہ نمبر ۶۳ بھی مُلاحظہ ہو۔)

۲۵ – سلسلۂ بیان کو سمجھنے کے لیے رُکوعِ اوّل کے مضمون کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اُس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفارِ عرب آخرت کی آمد کو بعید از عقل سمجھتے تھے اور جو رسولؐ اس عقیدے کو پیش کر رہا تھا اس کے متعلق کُھلّم کُھلّا یہ کہہ رہے تھے کہ ایسی عجیب باتیں کرنے والا آدمی یا تو مجنون ہوسکتا ہے، یا پھر وہ جان بُوجھ کر اِفتِرا پردازی کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پہلے چند عقلی دلائل ارشاد فرمائے جن کی تشریح ہم حواشی نمبر ۷-۸-۱۲ میں کر چکے ہیں۔ اس کے بعد رُکوعِ دوم میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کا قصّہ اور پھر سَبا کا قصّہ ایک تاریخی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جس سے مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ہے کہ روئے زمین پر خود نوعِ انسانی کی اپنی سرگزشت قانونِ مکافات کی شہادت دے رہی ہے۔ انسان اپنی تاریخ کو غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے جس کا سارا کارخانہ اندھا دُھند چل رہا ہو بلکہ اس پر ایک سمیع و بصیر خدا فرماں روائی کر رہا ہے جو شکر کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ایک معاملہ کرتا ہے اور ناشکری و کافر نعمتی کی راہ چلنے والوں کے ساتھ بالکل ہی ایک دوسرا معاملہ فرماتا ہے۔ کوئی سبق لینا چاہے تو اسی تاریخ سے یہ سبق لے سکتا ہے کہ جس خدا کی سلطنت کا یہ مزاج ہے اس کی خدائی میں نیکی اور بدی کا انجام کبھی یکساں نہیں ہوسکتا۔ اس کے عدل و انصاف کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب نیکی کا پورا اجر اور بدی کا پورا بدلہ دیا جائے۔

۲۶ – یعنی اس امر کی نشانی کہ جو کچھ ان کو میسّر ہے وہ کسی کا عَطیّہ ہے نہ کہ ان کا اپنا آفریدہ۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی بندگی و عبادت اور شکر و سپاس کا مستحق وہ خدا ہے جس نے ان کو یہ نعمتیں دی ہیں نہ کہ وہ جن کا کوئی حصّہ ان نعمتوں کی بخشش میں نہیں ہے۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی دولت لازوال نہیں ہے بلکہ جس طرح آئی ہے اسی طرح جا بھی سکتی ہے۔

۲۷ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے ملک میں بس دو ہی باغ تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سبا کی پوری سرزمین گلزار بنی ہوئی تھی۔ آدمی جہاں بھی کھڑا ہوتا اسے اپنے دائیں جانب بھی باغ نظر آتا اور بائیں جانب بھی۔

كُلُوا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ
غَفُوْرٌ ۞۱۵ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ
بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ
قَلِيْلٍ ۞۱۶ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا
الْكَفُوْرَ ۞۱۷ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى
ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا

کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رِزق اور شکر بجالاؤ اُس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ، اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے[۲۸]۔ آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا[۲۹] اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انھیں دیے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں[۳۰]۔ یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا، اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔

اور ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی، نمایاں بستیاں بسادی تھیں اور اُن میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں[۳۱]۔ چلو پھرو اِن راستوں میں رات دن

۲۸ – یعنی بندگی و شکر گزاری کے بجائے انھوں نے نافرمانی و نمک حرامی کی رَوِش اختیار کر لی۔

۲۹ – اصل میں لفظ سَيْلَ الْعَرِمِ استعمال کیا گیا ہے۔ عَرِم جُنوبی عرب کی زبان کے لفظ عرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ''بند'' کے ہیں۔ یمن کے کھنڈروں میں جو قدیم کُتبات موجودہ زمانے میں دستیاب ہوئے ہیں ان میں یہ الفاظ اِس معنیٰ میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ۵۴۲ء یا ۵۴۳ء کا ایک کتبہ جو یمن کے حبشی گورنر اَبْرَہَہ نے سَدِّ مآرب کی مرمّت کرانے کے بعد نصب کرایا تھا، اس میں وہ اس لفظ کو بار بار بند کے معنیٰ میں استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا سَيْلَ الْعَرِم سے مراد وہ سیلاب ہے جو کسی بند کے ٹوٹنے سے آئے۔

۳۰ – یعنی سیل العَرِم کے آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ برباد ہو گیا۔ سَبا کے لوگوں نے پہاڑوں کے درمیان بند باندھ باندھ کر جو نہریں جاری کی تھیں وہ سب ختم ہو گئیں اور آب پاشی کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس کے بعد وہی علاقہ جو کبھی جنت نظیر بنا ہوا تھا خُودرَو جنگلی درختوں سے بھر گیا اور اس میں کھانے کے قابل اگر کوئی چیز باقی رہ گئی تو وہ محض جھاڑی بُوٹی کے بیر تھے۔

اٰمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ

پورے امن کے ساتھ۔ مگر انھوں نے کہا: "اے ہمارے رب! ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے۔"[۳۲] انھوں نے اپنے اُوپر آپ ظلم کیا۔ آخرِ کار ہم نے انھیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انھیں بالکل تتر بتّر کر ڈالا۔[۳۳] یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو۔[۳۴] اُن کے معاملے میں ابلیس نے اپنا

۳۱- "برکت والی بستیوں" سے مراد شام و فلسطین کا علاقہ ہے جسے قرآنِ مجید میں عموماً اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: الاعراف، آیت ۱۳۷۔ بنی اسرائیل، آیت ۱۔ الانبیاء، آیات ۷۱ و ۸۱)

"نمایاں بستیوں" سے مراد ہیں ایسی بستیاں جو شاہراہِ عام پر واقع ہوں، گوشوں میں چُھپی ہوئی نہ ہوں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بستیاں بہت زیادہ فاصلے پر نہ تھیں بلکہ متصل تھیں۔ ایک بستی کے آثار ختم ہونے کے بعد دوسری بستی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔

سفر کی مسافتوں کو ایک اندازے پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ یمن سے شام تک کا پورا سفر مسلسل آباد علاقے میں طے ہوتا تھا جس کی ہر منزل سے دوسری منزل تک کی مسافت معلوم و متعیّن تھی۔ آباد علاقوں کے سفر اور غیر آباد صحرائی علاقوں کے سفر میں یہی فرق ہوتا ہے۔ صحرا میں مسافر جب تک چاہتا ہے چلتا ہے اور جب تھک جاتا ہے تو کسی جگہ پڑاؤ کر لیتا ہے۔ بخلاف اس کے آباد علاقوں میں راستے کی ایک بستی سے دوسری بستی تک کی مسافت جانی بُوجھی اور متعیّن ہوتی ہے۔ مسافر پہلے سے پروگرام بنا سکتا ہے کہ راستے کے کن کن مقامات پر وہ ٹھیرتا ہوا جائے گا، کہاں دوپہر گزارے گا اور کہاں رات بسر کرے گا۔

۳۲- ضروری نہیں ہے کہ انھوں نے زبان ہی سے یہ دعا کی ہو۔ دراصل جو شخص بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ خدایا! میں اِن نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں۔ اور اسی طرح جو قوم اللہ کے فضل سے غلط فائدہ اٹھاتی ہے وہ گویا اپنے رب سے یہ دعا کرتی ہے کہ اے پروردگار! یہ نعمتیں ہم سے سلب کر لے کیونکہ ہم ان کے قابل نہیں ہیں۔

علاوہ بریں رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (خدایا! ہمارے سفر دُور دراز کر دے) کے الفاظ سے کچھ یہ بات بھی مُترشّح ہوتی ہے کہ شاید سَبا کی قوم کو اپنی آبادی کی کثرت کھٹکنے لگی تھی اور دوسری نادان قوموں کی طرح اس نے بھی اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ سمجھ کر انسانی نسل کی افزایش کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

۳۳- یعنی سبا کی قوم ایسی منتشر ہوئی کہ اس کی پراگندگی ضرب المَثَل ہو گئی۔ آج بھی اہلِ عرب اگر کسی گروہ کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تفرقوا ایدی سبا، "وہ تو ایسے پراگندہ ہو گئے جیسے سبا کی قوم پراگندہ ہوئی تھی۔" اللہ تعالیٰ کی

ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ
عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ
هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾ ع

گمان صحیح پایا اور انھوں نے اُسی کی پیروی کی، بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن[۳۵] تھا۔ ابلیس کو اُن پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ اس لیے ہوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے۔[۳۶] تیرا رب ہر چیز پر نگران[۳۷] ہے۔ ع

طرف سے جب زوالِ نعمت کا دَور شروع ہوا تو سبا کے مختلف قبیلے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ غسّانیوں نے اُردُن اور شام کا رُخ کیا۔ اَوس و خزرَج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خُزاعہ نے جِدّے کے قریب تِہامہ کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ اَزْد کا قبیلہ عُمّان میں جا کر آباد ہوا۔ لَخم اور جُذام اور کِندہ بھی نکلنے پر مجبُور ہوئے۔ حتّٰی کہ ''سبا'' نام کی کوئی قوم ہی دنیا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔

۳۴- اس سِیاق وسَباق میں صابر و شاکر سے مراد ایسا شخص یا گروہ ہے جو اللہ کی طرف سے نعمتیں پا کر آپے سے باہر نہ ہو جائے، نہ خوشحالی پر پُھولے اور نہ اُس خدا کو بھول جائے جس نے یہ سب کچھ اسے عطا کیا ہے۔ ایسا انسان اُن لوگوں کے حالات سے بہت کچھ سبق لے سکتا ہے جنھوں نے عُروج و ترقی کے مواقع پا کر نافرمانی کی روش اختیار کی اور اپنے انجامِ بد سے دوچار ہو کر رہے۔

۳۵- تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے سے قومِ سَبا میں ایک عُنصُر ایسا موجود تھا جو دوسرے معبُودوں کو ماننے کے بجائے خدائے واحد کو مانتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اثری تحقیقات کے سلسلے میں یمن کے کھنڈروں سے جو کَتبات ملے ہیں ان میں سے بعض اس قلیل عُنصُر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ۶۵۰ ق م کے لگ بھگ زمانے کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ مملکتِ سَبا کے متعدّد مَقامات پر ایسی عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں جو ذُوسَموی یا ذُوسماوی (یعنی رب السماء) کی عبادت کے لیے مخصوص تھیں۔ بعض مقامات پر اس معبود کا نام ملکن ذسموی (وہ بادشاہ جو آسمانوں کا مالک ہے) لکھا گیا ہے۔ یہ عُنصُر مسلسل صدیوں تک یمن میں موجود رہا۔ چنانچہ ۳۷۸ء کے ایک کتبے میں بھی الٰہ ذو سموی کے نام سے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر ۴۶۵ء کے ایک کتبے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: بنصر وردا الٰھن بعل سمین وارضین (یعنی اس خدا کی مدد اور تائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے)۔ اسی زمانے کے ایک اَور کتبے میں جس کی تاریخ ۴۵۸ء ہے، اسی خدا کے لیے رحمٰن کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں: بردا رحمنن (یعنی رحمٰن کی مدد سے)۔

۳۶- یعنی ابلیس کو یہ طاقت حاصل نہ تھی کہ اُن کا ارادہ تو خدا کی فرماں برداری کرنے کا ہو مگر وہ زبردستی ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں نافرمانی کی راہ پر کھینچ لے گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی قدرت اس کو دی تھی وہ صرف اس حد تک تھی کہ وہ انھیں

بہکائے اور ایسے تمام لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے جو خود اس کی پیروی کرنا چاہیں۔ اور اس اِغوا کے مواقع ابلیس کو اس لیے عطا کیے گئے تا کہ آخرت کے ماننے والوں اور اس کی آمد میں شک رکھنے والوں کا فرق کھل جائے۔

دوسرے الفاظ میں یہ ارشادِ ربّانی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ عقیدۂ آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو اس دنیا میں انسان کو راہِ راست پر قائم رکھنے کی ضامن ہو سکتی ہو۔ اگر کوئی شخص یہ نہ مانتا ہو کہ اسے مرکر دوبارہ اٹھنا ہے اور اپنے خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہے، تو وہ لازماً گمراہ و بدراہ ہو کر رہے گا، کیونکہ اس کے اندر سرے سے وہ احساسِ ذمہ داری پیدا ہی نہ ہو سکے گا جو آدمی کو راہِ راست پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ اسی لیے شیطان کا سب سے بڑا حربہ، جس سے وہ آدمی کو اپنے پھندے میں پھانستا ہے، یہ ہے کہ وہ اسے آخرت سے غافل کرتا ہے۔ اُس کے اِس فریب سے جو شخص بچ نکلے وہ کبھی اس بات پر راضی نہ ہو گا کہ اپنی اصل دائمی زندگی کے مفاد کو دنیا کی اس عارضی زندگی کے مفاد پر قربان کر دے۔ بخلاف اس کے جو شخص شیطان کے دام میں آ کر آخرت کا منکر ہو جائے، یا کم از کم اُس کی طرف سے شک میں پڑ جائے، اُسے کوئی چیز اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ جو نقد سَودا اِس دنیا میں ہو رہا ہے اُس سے صرف اس لیے ہاتھ اُٹھا لے کہ اُس سے کسی بعد کی زندگی میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ دنیا میں جو شخص بھی کبھی گمراہ ہوا ہے اسی انکارِ آخرت یا شک فی الآخرۃ کی وجہ سے ہوا ہے، اور جس نے بھی راست رَوی اختیار کی ہے اس کے صحیح طرزِ عمل کی بنیاد ایمان بالآخرۃ ہی پر قائم ہوئی ہے۔

۳۷- قومِ سبا کی تاریخ کی طرف یہ اشارات جو قرآنِ مجید میں کیے گئے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلومات بھی ہماری نگاہ میں رہیں جو اس قوم کے متعلق دوسرے تاریخی ذرائع سے فراہم ہوئی ہیں۔

تاریخ کی رُو سے ''سَبا'' جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمدؒ، ابنِ جَرِیرؒ، ابنِ ابی حاتمؒ، ابنِ عبدالبرّؒ اور ترمذِیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ رِوایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسبِ ذیل قبیلے پیدا ہوئے: کِنْدہ، حِمْیَر، اَزْد، اَشْعَرِیِّیْن، مَذْحِج، اَنْمار (جس کی دو شاخیں ہیں: خَثْعَم اور بَجِیْلہ)، عامِلہ، جُذَام، لَخْم اور غَسّان۔

بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شُہرہ تھا۔ ۲۵۰۰ قبلِ مسیح میں اُور کے کتبات اس کا ذکر سابوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور اَشُّور (اَسیریا) کے کتبات میں، اور اسی طرح بائبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: زَبور، ۷۲: ۱۵۔ یَرمیاہ، ۶: ۲۰۔ حِزقی اِیل ۲۷: ۲۲۔ ۳۸: ۱۳۔ ایّوب ۶: ۱۹) یونان و روم کے مؤرخین و جغرافیہ نویس تھیوفراسٹس (۲۸۸ قبلِ مسیح) کے وقت سے مسیحؑ کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔

اس کا وطن عرب کا جنوبی مغربی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبلِ مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شُہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمانؑ (۹۶۵-۹۲۶ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی

کا پھر زور ہو گیا، اور اس نے اَلْمقہ (چاند دیوتا)، عَشْتَر (زُہرہ) ذاتِ حَمِیم اور ذاتِ بعدان (سورج دیوی)، ہوبس، حرمتم یا حریمت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ اَلْمقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا، اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے۔ یمن میں بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں، اور خُصوصاً اَلْمقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعے پر ان کے شکریے ادا کیے جاتے تھے۔

آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً ۳ ہزار کتبات فراہم ہوئے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عَرَبی رِوایات اور رومی و یونانی تواریخ کی فراہم کردہ معلومات کو اگر جمع کر لیا جائے تو اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اس کی تاریخ مرتّب کی جا سکتی ہے۔ اِن معلومات کی رو سے اس کی تاریخ کے اہم ادوار حسبِ ذیل ہیں:

(۱) ۶۵۰ ق م سے پہلے کا دَور۔ اس زمانے میں مُلوکِ سبا کا لقب مُکَرِّبِ سبا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مُقَرِّب کا ہم معنٰی تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (Priest-Kings) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایۂ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مآرِب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خَرِیبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی دَور میں مآرِب کے مشہور بند کی بِنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

(۲) ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کا دور۔ اس دور میں سبا کے بادشاہوں نے مکَرِّب کا لقب چھوڑ کر مَلِک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا، جس کے معنٰی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولرزم کا رنگ غالب ہو گیا۔ اس زمانے میں ملوکِ سبا نے صرواح کو چھوڑ کر مآرِب کو اپنا دار السلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مَقام سمندر سے ۳۹۰۰ فٹ کی بلندی پر صَنعا سے ۶۰ میل جانبِ مشرق واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت دے رہے ہیں کہ یہ کبھی ایک بڑی متمدِّن قوم کا مرکز تھا۔

(۳) ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک کا دَور۔ اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حِمْیَر کا قبیلہ غالب ہو گیا جو قومِ سبا ہی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں دوسرے تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اس دَور میں مآرِب کو اجاڑ کر رَیدان پایۂ تخت بنایا گیا جو قبیلۂ حِمْیَر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مُدَوَّر پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب علاقے میں ایک چھوٹا سا قبیلۂ حِمیر کے نام سے آباد ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص تصور تک نہیں کر سکتا کہ یہ اُسی قوم کی یادگار ہے جس کے ڈنکے کبھی دنیا بھر میں بجتے تھے۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصے کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ یمنت اور یمنات کا استعمال ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوبی مغربی کونے پر عسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حَضْرَمَوت تک واقع ہے۔ یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

(۴) ۳۰۰ء کے بعد سے آغازِ اسلام تک کا دَور۔ یہ قومِ سبا کی تباہی کا دَور ہے۔ اس دَور میں ان کے ہاں مسلسل

خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی، تجارت برباد ہوئی، زراعت نے دم توڑا، اور آخرِ کار آزادی تک ختم ہوگئی۔ پہلے رَیدانیوں، حِمیَریوں، اور ہَمدانیوں کی باہمی نزاعات سے فائدہ اُٹھا کر ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہوگئی مگر مآرِب کے مشہور بند میں رَخنے پڑنے شروع ہو گئے، یہاں تک کہ آخرِ کار ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر اُوپر قرآنِ مجید کی آیات میں کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اَبْرَہَہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مَرَمّتیں ہوتی رہیں، لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہوسکی اور نہ آب پاشی اور زراعت کا وہ نظام جو درہم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہوسکا۔ ۵۲۳ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونُواس نے نَجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم وستم برپا کیا جس کا ذکر قرآنِ مجید میں اصحاب الاُخدود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حَبَش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہوگئی اور اس نے سارا ملک فتح کرلیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے اَبْرَہَہ نے کعبہ کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی، حبشی اثر میں لانے کے لیے ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چند روز قبل) مکۂ معظّمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآنِ مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخرِ کار ۵۷۵ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ۶۲۸ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کرلیا۔

قومِ سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا: ایک زراعت، دوسرے تجارت۔ زراعت کو انھوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعے سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظامِ آب پاشی بابِل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہ نکلتے تھے۔ انھی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انھوں نے تالاب بنالیے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآنِ مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس نظامِ آب پاشی کا سب سے بڑا مَخزَنِ آب وہ تالاب تھا جو شہرِ مآرِب کے قریب کوہِ بلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مگر جب اللہ کی نظرِ عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا یہاں تک کہ ملک کا پورا نظامِ آب پاشی تباہ ہوکر رہ گیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کرسکا۔

تجارت کے لیے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدّت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کے بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقا کے زنگی غلام، بندر، شتر مرغ کے پَر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عُود، عَنبَر، مُشک، مُرّ، قرفہ، قصب الذَّرِیرہ، سلیخہ اور دوسری اُن خوشبودار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنھیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے: ایک بحری، دوسرا برّی۔ بحری تجارت کا اِجارہ ہزار سال تک انھی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا، کیونکہ بحرِ اَحمر کی موسمی ہواؤں، زیرِ آب چٹانوں، اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے،

اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اُرْدُن اور مصر کے بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ بَرّی راستے عدن اور حضرَموت سے مآرِب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جِدّہ، یثرِب، العُلا، تبوک اور اَیلہ سے گزرتی ہوئی پیٹرا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس بَرّی راستے پر، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدودِ شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شب و روز اُن کے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حِمیَری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ مشرقِ اوسط میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقت ور سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہوا کہ عرب تاجر اپنی اِجارہ داری کے باعث مشرق کے اموالِ تجارت کی من مانی قیمتیں وُصول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اس تجارت پر قبضہ کریں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرماں روا بطلیموس ثانی (۲۸۵-۲۴۶ ق م) نے اُس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو ۱۷ سو برس پہلے فرعون سِسوستریِس نے دریائے نیل کو بحرِ اَحمر سے ملانے کے لیے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعے سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحرِ اَحمر میں داخل ہوا۔ لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر نہ ہو سکی۔ پھر جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقت ور تجارتی بیڑا بحرِ اَحمر میں لے آئے اور اس کی پشت پر انھوں نے ایک جنگی بیڑا بھی لا کر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں، ان میں جہازوں کی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کیا، اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیے۔ حتّٰی کہ ایک وقت وہ آ گیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلُّط قائم ہو گیا۔ اسی سلسلے میں رومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم ساز باز بھی کر لیا جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہو گئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف بَرّی تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر بہت سے اسباب نے رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے نَبطیوں نے پیٹرا سے العُلا تک بالائی حجاز اور اُرْدُن کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر ۱۰۶ء میں رومیوں نے نَبطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام و اُردُن کے تمام علاقے ان کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی مُتّحِدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اُٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے یہاں تک کہ آخرِ کار انھوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عُروج سے گرا کر اُس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سُن سُن کر یونان و روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹرابو لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں، اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ پلینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف بہی چلی جا رہی ہے، یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں، اور ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات، کھیتیوں اور مواشی سے بھرا

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا

(اے نبیؐ! ان مشرکین سے) کہو کہ پکار دیکھو اپنے اُن معبُودوں کو[۳۸] جنھیں تم اللہ کے سوا اپنا معبُود سمجھے بیٹھے ہو۔[۳۹] وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرّہ برابر چیز کے مالک ہیں نہ زمین میں۔ وہ آسمان و زمین کی مِلکیّت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے۔ اور اللہ کے حُضور کوئی شَفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجُز اُس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو۔[۴۰] حتّٰی کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دُور ہوگی تو وہ (سفارش کرنے والوں سے)

ہوا ہے۔ آرٹی میڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کے بجائے دار چینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انھوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صَنعا کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت (skyscraper) تعمیر کی جو قصرِ غُمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔ یہ سب کچھ بس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شاملِ حال رہا۔ آخرِ کار جب انھوں نے کفرانِ نعمت کی حد کر دی تو ربِّ قدیر کی نظرِ عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

۳۸- پچھلے دو رُکوعوں میں آخرت کے متعلق مشرکین کے غلط تصورات پر کلام فرمایا گیا تھا۔ اب تقریر کا رُخ تردیدِ شرک کے مضمون کی طرف پھر رہا ہے۔

۳۹- یعنی اللہ تو یوں اشخاص اور اقوام اور سلطنتوں کی قسمتیں بناتا اور بگاڑتا ہے، جیسا کہ ابھی تم داؤد و سلیمان علیہما السلام اور قومِ سَبا کے ذکر میں سُن چکے ہو۔ اب ذرا اپنے ان بناوٹی معبُودوں کو پکار کر دیکھ لو، کیا ان میں بھی یہ طاقت ہے کہ کسی کے اقبال کو اِدبار سے، یا اِدبار کو اقبال سے بدل سکیں؟

۴۰- یعنی کسی کا خود مالک ہونا، یا مِلکیّت میں شریک ہونا، یا مددگارِ خدا ہونا تو درکنار، ساری کائنات میں کوئی ایسی ہستی تک نہیں پائی جاتی جو اللہ تعالیٰ کے حضور کسی کے حق میں بطورِ خود سفارش کر سکے۔ تم لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ کچھ

مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿٢٣﴾ قُلْ مَنْ
يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ
لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٤﴾ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ

پوچھیں گے کہ تمھارے رب نے کیا جواب دیا۔ وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے۔[۴۱]

(اَے نبیؐ!) اِن سے پوچھو: "کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟" کہو: "اللہ۔[۴۲] اب لامحالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کُھلی گمراہی میں پڑا ہُوا ہے۔"[۴۳] ان سے کہو: "جو قصور ہم نے

خدا کے پیارے ایسے ہیں، یا خدا کی خدائی میں کچھ بندے ایسے زور آور ہیں کہ وہ اَڑ بیٹھیں تو خدا کو ان کی سفارش ماننی ہی پڑے گی۔ حالانکہ وہاں حال یہ ہے کہ اجازت لیے بغیر کوئی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جس کو اجازت ملے گی صرف وہی کچھ عرض کر سکے گا۔ اور جس کے حق میں سِفارش کرنے کی اجازت ملے گی اسی کے حق میں عرض معروض کی جا سکے گی۔ (اسلامی عقیدۂ شَفاعت اور مشرکانہ عقیدۂ شَفاعت کے فرق کو سمجھنے کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حواشی ۵-۲۳، ہود، حواشی ۸۴-۱۰۶، النحل، حواشی ۶۴-۷۹۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۶، الانبیاء، حاشیہ ۲۷، الحج، حاشیہ ۱۲۵)

۴۱ — یہاں اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب قیامت کے روز کوئی سِفارش کرنے والا کسی کے حق میں سفارش کی اجازت طلب کرے گا۔ اِس نقشے میں یہ کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ طلبِ اجازت کی درخواست بھیجنے کے بعد شافع اور مشفوع دونوں نہایت بے چینی کے عالم میں ڈرتے اور کانپتے ہوئے جواب کے منتظر کھڑے ہیں۔ آخرِ کار جب اُوپر سے اجازت آ جاتی ہے اور شافع کے چہرے سے مشفوع بھانپ جاتا ہے کہ معاملہ کچھ اطمینان بخش ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے اور وہ آگے بڑھ کر شافع سے پوچھتا ہے: "کیا جواب آیا؟" شافع جواب دیتا ہے کہ ٹھیک ہے، اجازت مل گئی ہے۔ اس بیان سے جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ نادانو! جس بڑے دربار کی شان یہ ہے اُس کے متعلق تم کس خیالِ خام میں پڑے ہوئے ہو کہ وہاں کوئی اپنے زور سے تم کو بخشوا لے گا یا کسی کی یہ مجال ہوگی کہ وہاں مچل کر بیٹھ جائے اور اللہ سے کہے کہ یہ تو میرے مُتوسّل ہیں، انھیں تو بخشنا ہی پڑے گا۔

۴۲ — سوال اور جواب کے درمیان ایک لطیف خلا ہے۔ مخاطَب مشرکین تھے جو صرف یہی نہیں کہ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے بلکہ یہ بھی جانتے اور مانتے تھے کہ رزق کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے۔ اب جو اُن کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ بتاؤ کون تمھیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے، تو وہ مشکل میں پڑ گئے۔ اللہ کے سوا کسی اَور کا نام لیتے ہیں تو خود اپنے اور اپنی قوم کے عقیدے کے خلاف بات کہتے ہیں۔ ہٹ دھرمی کی بنا پر ایسی بات کہہ بھی دیں تو ڈرتے ہیں کہ خود اپنی قوم کے لوگ ہی اس کی تردید کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور اگر تسلیم کر لیتے ہیں کہ اللہ ہی رزق

أَجْرَمْنَا وَلَا نُسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢٥﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۗ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿٢٦﴾ قُلْ أَرُونِيَ

کیا ہو اس کی کوئی باز پُرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔[۴۴]" کہو: "ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔[۴۵]" اِن سے کہو: "ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی وہ

دینے والا ہے تو فوراً دوسرا سوال یہ سامنے آجاتا ہے کہ پھر یہ دوسرے کس مرض کی دوا ہیں جنھیں تم نے خدا بنا رکھا ہے؟ رزق تو دے اللہ، اور پوجے جائیں یہ، آخر تمھاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔ اس دوگُونہ مشکل میں پڑ کر وہ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ نہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے، نہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا معبُود رازق ہے۔ پوچھنے والا جب دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کچھ نہیں بولتے، تو وہ خود اپنے سوال کا جواب دیتا ہے کہ "اللہ"۔

۴۳ - اس فقرے میں حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ اُوپر کے سوال و جواب کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ جو اللہ ہی کی بندگی و پرستش کرتا ہے وہ ہدایت پر ہو اور جو اس کے سوا دوسروں کی بندگی بجا لاتا ہے وہ گمراہی میں مبتلا ہو۔ اس بنا پر بظاہر تو اس کے بعد کہنا یہ چاہیے تھا کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہ ہو۔ لیکن اس طرح دوٹوک بات کہہ دینا حق گوئی کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی درست ہوتا، حکمتِ تبلیغ کے لحاظ سے دُرست نہ ہوتا۔ کیونکہ جب کسی شخص کو مخاطب کر کے آپ صاف صاف گمراہ کہہ دیں اور خود اپنے برسرِ ہدایت ہونے کا دعویٰ کریں تو وہ ضد میں مبتلا ہو جائے گا اور سچائی کے لیے اس کے دل کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اللہ کے رسول چونکہ مُجرَّد حق گوئی کے لیے نہیں بھیجے جاتے بلکہ ان کے سُپرد یہ کام بھی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ حکیمانہ طریقے سے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کریں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے نبیؐ! اس سوال و جواب کے بعد اب تم ان لوگوں سے صاف کہہ دو کہ تم سب گمراہ ہو اور ہدایت پر صرف ہم ہیں۔ اس کے بجائے تلقین یہ فرمائی گئی کہ انھیں اب یوں سمجھاؤ۔ ان سے کہو: ہمارے اور تمھارے درمیان یہ فرق تو کھل گیا کہ ہم اُسی کو معبُود مانتے ہیں جو رزق دینے والا ہے، اور تم اُن کو معبُود بنا رہے ہو جو رزق دینے والے نہیں ہیں۔ اب یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم اور تم دونوں بیک وقت راہِ راست پر ہوں۔ اس صریح فرق کے ساتھ تو ہم میں سے ایک ہی راہِ راست پر ہو سکتا ہے، اور دوسرا لامحالہ گمراہ ٹھیرتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا تمھارا اپنا کام ہے کہ دلیل کس کے برسرِ ہدایت ہونے کا فیصلہ کر رہی ہے اور کون اس کی رو سے گمراہ ہے۔

۴۴ - اوپر کی بات سامعین کو پہلے ہی سوچنے پر مجبور کر چکی تھی۔ اس پر مزید ایک فقرہ یہ فرما دیا گیا تاکہ وہ اور زیادہ تفکر سے کام لیں۔ اِس سے ان کو یہ احساس دلایا گیا کہ ہدایت اور گمراہی کے اس معاملے کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا ہم میں سے ہر ایک کے اپنے مفاد کا تقاضا ہے۔ فرض کرو کہ ہم گمراہ ہیں تو اپنی اس گمراہی کا خمیازہ ہم ہی بُھگتیں گے، تم پر اس کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ اس لیے یہ ہمارے اپنے مفاد کا تقاضا ہے کہ کوئی عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے خوب سوچ لیں کہ کہیں ہم غلط راہ پر تو نہیں جا رہے ہیں۔

الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً

کون ہستیاں ہیں جنھیں تم نے اس کے ساتھ شریک لگا رکھا ہے۔[۴۶]" ہرگز نہیں، زبردست اور دانا تو بس وہ اللہ ہی ہے۔

اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۴۷]

یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ وہ (قیامت کا) وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچّے ہو؟[۴۸] کہو: تمھارے لیے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی بھر کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ ایک

اِسی طرح تم کو بھی ہماری کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی ہی خیر خواہی کی خاطر ایک عقیدے پر جمنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ کہیں تم کسی باطل نظریّے پر تو اپنی زندگی کی ساری پونجی نہیں لگا رہے ہو۔ اس معاملے میں اگر تم نے ٹھوکر کھائی تو تمھارا اپنا ہی نقصان ہوگا، ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔

۴۵ – یہ اس معاملے پر غور کرنے کے لیے آخری اور سب سے بڑا محرک ہے جس کی طرف سامعین کی توجہ دلائی گئی ہے۔ بات اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی کہ اس زندگی میں ہمارے اور تمھارے درمیان حق و باطل کا اختلاف ہے اور ہم میں سے کوئی ایک ہی حق پر ہے، بلکہ اس کے آگے حقیقتِ نفس الامری یہ بھی ہے کہ ہمیں اور تمھیں، دونوں ہی کو اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اور رب وہ ہے جو حقیقت کو بھی جانتا ہے اور ہم دونوں گروہوں کے حالات سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ وہاں جا کر نہ صرف اس امر کا فیصلہ ہوگا کہ ہم میں اور تم میں سے حق پر کون تھا اور باطل پر کون۔ بلکہ اس مقدّمے کا فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ ہم نے تم پر حق واضح کرنے کے لیے کیا کچھ کیا اور تم نے باطل پرستی کی ضد میں آ کر ہماری مخالفت کس کس طرح کی۔

۴۶ – یعنی قبل اس کے کہ تم اِن معبودوں کے بھروسے پر اتنا بڑا خطرہ مول لو، ذرا مجھے یہیں بتا دو کہ ان میں سے کون اتنا زور آور ہے کہ اللہ کی عدالت میں وہ تمھارا حمایتی بن کر اُٹھ سکتا ہو اور تمھیں اس کی گرفت سے بچا سکتا ہو۔

۴۷ – یعنی تم صرف اِسی شہر، یا اِسی ملک، یا اِسی زمانے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے

اور ہمیشہ کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہو۔ مگر یہ تمھارے ہم عصر اہلِ وطن تمھاری قدر ومنزلت کو نہیں سمجھتے اور ان کو احساس نہیں ہے کہ کیسی عظیم ہستی کی بِعثَت سے ان کو نوازا گیا ہے۔

یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنے ملک یا اپنے زمانے کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک پوری نوعِ بَشَری کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں، قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ مثلاً:

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ (الانعام:۱۹)	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اُس کے ذریعے سے میں تم کو مُتنبّہ کروں اور ہر اس شخص کو جسے یہ پہنچے۔
قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (الاعراف:۱۵۸)	اے نبیؐ! کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔
وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ (الانبیاء:۱۰۷)	اور اے نبیؐ! ہم نے نہیں بھیجا تم کو، مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت کے طور پر۔
تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۙ (الفرقان:۱)	بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے مُتنبّہ کرنے والا ہو۔

یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہت سی احادیث میں مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً:

بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ (مُسْنَدِ احمد، مَرْوِیّاتِ ابوموسیٰ اَشْعَرِیؓ)	میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔
امّا انا فارسلتُ الی الناس کلھم عامۃ وکان من قبلی انما یُرْسَلُ الی قومہٖ۔ (مُسْنَدِ احمد، مَرْوِیّاتِ عبداللہ بن عَمْروؓ بن عاص)	میں عُمومیّت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرا ہے وہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔
وکان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس عامۃ (بخاری ومسلم، مِن حدیثِ جابرؓ بن عبداللہ)	پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔
بعثت انا والساعۃ کھاتین یعنی اصبعین (بخاری ومسلم)	میری بِعثَت اور قیامت اِس طرح ہیں، یہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو اُنگلیاں اٹھائیں۔

مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی حائل نہیں ہے اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں ہے۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے اور قیامت تک میں ہی نبی رہنے والا ہوں۔

۴۸ — یعنی جس وقت کے متعلق ابھی تم نے کہا ہے کہ "ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک

النصف ع ۳/۹

وَّلَا تَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ع وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ بِهٰذَا
الۡقُرۡاٰنِ وَلَا بِالَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ ‌ؕ وَلَوۡ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ مَوۡقُوۡفُوۡنَ
عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۖۚ يَرۡجِعُ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضِ اۨلۡقَوۡلَ‌ ۚ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ
اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا لَوۡلَاۤ اَنۡتُمۡ لَكُنَّا مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۳۱﴾

گھڑی بھر پہلے اسے لاسکتے ہو[۴۹]۔ ع

یہ کافر کہتے ہیں کہ ”ہم ہرگز اِس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں[۵۰] گے۔“ کاش تم دیکھو اِن کا حال اُس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اُس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ ”اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہو[۵۱]تے۔“

فیصلہ کردے گا“، وہ وقت آخر کب آئے گا؟ ایک مدّت سے ہمارا اور تمھارا مُقدّمہ چل رہا ہے۔ ہم تمھیں بار بار جھٹلا چکے ہیں اور کھُلّم کھُلّا تمھاری مخالفت کیے جارہے ہیں۔ اب اس کا فیصلہ کیوں نہیں کرڈالا جاتا؟

۴۹ – دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے تمھاری خواہشات کے تابع نہیں ہیں کہ کسی کام کے لیے جو وقت تم مقرر کرو اُسی وقت پر وہ اُس کام کو کرنے کا پابند ہو۔ اپنے معاملات کو وہ اپنی ہی صوابدید کے مطابق انجام دیتا ہے۔ تم اسے کیا سمجھ سکتے ہو کہ اللہ کی اسکیم میں نوعِ انسانی کو کب تک اس دنیا کے اندر کام کرنے کا موقع ملنا ہے، کتنے اشخاص اور کتنی قوموں کی کس کس طرح آزمایش ہونی ہے، اور کون سا وقت اِس کے لیے موزوں ہے کہ اِس دفتر کو لپیٹ دیا جائے اور تمام اولین و آخرین کو محاسبے کے لیے طلب کرلیا جائے۔ اس کام کا جو وقت اللہ ہی کی اسکیم میں مقرر ہے، اسی وقت پر یہ کام ہوگا۔ نہ تمھارے تقاضوں سے وہ وقت ایک سیکنڈ پہلے آئے گا اور نہ تمھاری التجاؤں سے وہ ایک سیکنڈ کے لیے ٹل سکے گا۔

۵۰ – مراد ہیں کفارِ عرب جو کسی آسمانی کتاب کو نہیں مانتے تھے۔

۵۱ – یعنی عوام الناس، جو آج دنیا میں اپنے لیڈروں، سرداروں، پیروں اور حاکموں کے پیچھے آنکھیں بند کیے چلے جارہے ہیں، اور ان کے خلاف کسی ناصح کی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، یہی عوام جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ حقیقت کیا تھی اور ان کے یہ پیشوا انھیں کیا باور کرا رہے تھے، اور جب انھیں یہ پتا چل جائے گا کہ ان رہنماؤں کی پیروی انھیں کس انجام سے دوچار کرنے والی ہے، تو یہ اپنے ان بزرگوں پر پلٹ پڑیں گے اور چیخ چیخ کر کہیں گے کہ کم بختو! تم نے ہمیں گمراہ کیا، تم ہماری ساری مصیبتوں کے ذمہ دار ہو، تم ہمیں نہ بہکاتے تو ہم خدا کے رسولوں کی بات مان لیتے۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ
عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ
الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا

وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: ”کیا ہم نے تمھیں اُس ہدایت سے روکا تھا جو تمھارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔“[52] وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے: ”نہیں، بلکہ شب و روز کی مکّاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیرائیں۔“[53] آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے

---

۵۲ – یعنی وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی طاقت نہ تھی جس سے ہم چند انسان تم کروڑوں انسانوں کو زبردستی اپنی پیروی پر مجبور کر دیتے۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے تو ہماری سرداریوں اور پیشوائیوں اور حکومتوں کا تختہ اُلٹ سکتے تھے۔ ہماری فوج تو تم ہی تھے۔ ہماری دولت اور طاقت کا سرچشمہ تو تمھارے ہی ہاتھ میں تھا۔ تم نذرانے اور ٹیکس نہ دیتے تو ہم مفلس تھے۔ تم ہمارے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے تو ہماری پیری ایک دن نہ چلتی۔ تم زندہ باد کے نعرے نہ مارتے تو کوئی ہمارا پوچھنے والا نہ ہوتا۔ تم ہماری فوج بن کر دنیا بھر سے ہمارے لیے لڑنے پر تیار نہ ہوتے تو ایک انسان پر بھی ہمارا بس نہ چل سکتا تھا۔ اب کیوں نہیں مانتے کہ دراصل تم خود اُس راستے پر نہ چلنا چاہتے تھے جو رسولوں نے تمھارے سامنے پیش کیا تھا۔ تم اپنی اغراض اور خواہشات کے بندے تھے اور تمھارے نفس کی یہ مانگ رسولوں کی بتائی ہوئی راہِ تقویٰ کے بجائے ہمارے ہاں پوری ہوتی تھی۔ تم حرام و حلال سے بے نیاز ہو کر عیشِ دنیا کے طالب تھے اور وہ ہمارے پاس ہی تمھیں نظر آتا تھا۔ تم ایسے پِیروں کی تلاش میں تھے جو تمھیں ہر طرح کے گناہوں کی کُھلی چھوٹ دیں اور کچھ نذرانہ لے کر خدا کے ہاں تمھیں بخشوا دینے کی خود ذمہ داری لے لیں۔ تم ایسے پنڈتوں اور مولویوں کے طلب گار تھے جو ہر شرک اور ہر بدعت اور تمھارے نفس کی ہر دل پسند چیز کو عین حق ثابت کر کے تمھارا دل خوش کریں اور اپنا کام بنائیں۔ تم کو ایسے جَعل سازوں کی ضرورت تھی جو خدا کے دین کو بدل کر تمھاری خواہشات کے مطابق ایک نیا دین گھڑیں۔ تم کو ایسے لیڈر درکار تھے جو کسی نہ کسی طرح تمھاری دنیا بنا دیں خواہ عاقبت بگڑے یا دُرست ہو۔ تم کو ایسے حاکم مطلوب تھے جو خود بدکردار اور بددیانت ہوں اور ان کی سرپرستی میں تمھیں ہر قسم کے گناہوں اور بدکرداریوں کی چھوٹ ملی رہے۔ اس طرح ہمارے اور تمھارے درمیان برابر کے لین دین کا سودا ہوا تھا۔ اب تم کہاں یہ ڈھونگ رچانے چلے ہو کہ گویا تم بڑے معصوم لوگ تھے اور ہم نے زبردستی تمھیں بگاڑ دیا تھا۔

۵۳ – دُوسرے الفاظ میں ان عوام کا جواب یہ ہوگا کہ تم اس ذمّہ داری میں ہم کو برابر کا شریک کہاں ٹھیرائے دے رہے ہو۔

النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ
الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ مَاۤ
اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا
بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ
اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۳۵﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ

تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال اُن کے تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں؟

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں[۵۴] مانتے۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں[۵۵]۔ اے نبیؐ! ان سے کہو: میرا رب جسے چاہتا

کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے اپنی چال بازیوں، فریب کاریوں اور جھوٹے پروپیگنڈوں سے کیا طِلسم باندھ رکھا تھا، اور رات دن خلقِ خدا کو پھانسنے کے لیے کیسے کیسے جتن تم کیا کرتے تھے۔ معاملہ صرف اتنا ہی تو نہیں ہے کہ تم نے ہمارے سامنے دنیا پیش کی اور ہم اس پر ریجھ گئے۔ امرِ واقعہ یہ بھی تو ہے کہ تم شب و روز کی مکاریوں سے ہم کو بے وقوف بناتے تھے اور تم میں سے ہر شکاری روز ایک نیا جال بُن کر طرح طرح کی تدبیروں سے اللہ کے بندوں کو اس میں پھانستا تھا۔

قرآنِ مجید میں پیشواؤں اور پیروؤں کے اس جھگڑے کا ذکر مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ تفصیل کے لیے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: اَعراف، آیات ۳۸-۳۹۔ ابراہیم: ۲۱۔ القصص: ۶۳۔ الاحزاب: ۶۶-۶۸۔ المومن: ۴۷-۴۸۔ حٰم السجدہ: ۲۹۔

۵۴ – یہ بات قرآنِ مجید میں بکثرت مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ انبیا علیہم السلام کی دعوت کا مقابلہ سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر اُن خوش حال طبقوں نے کیا ہے جو دولت و حشمت اور نُفوذ و اقتدار کے مالک تھے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: الانعام: ۱۲۳۔ الاَعراف: ۶۰-۶۶-۷۵-۸۸-۹۰۔ ہود: ۲۷۔ بنی اسرائیل: ۱۶۔ المومنون: ۲۴-۳۳ تا ۳۸-۴۶-۴۷۔ الزُّخرُف: ۲۳۔

۵۵ – اُن کا اِستدلال یہ تھا کہ ہم تم سے زیادہ اللہ کے پیارے اور پسندیدہ لوگ ہیں جبھی تو اس نے ہم کو اُن نعمتوں سے

ع ۴

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ لَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع وَمَآ
اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِى
الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ

ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا عطا کرتا ہے، مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے۔[۵۶] ع یہ تمھاری دولت اور تمھاری اولاد نہیں ہے جو تمھیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے[۵۷]۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے اُن کے عمل کی دُہری جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔[۵۸] رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ

نوازا ہے جن سے تم محروم ہو، یا کم از کم ہم سے فروتر ہو۔ اگر اللہ ہم سے راضی نہ ہوتا تو یہ سروسامان اور یہ دولت و حشمت ہمیں کیوں دیتا۔ اب یہ بات ہم کیسے باور کرلیں کہ اللہ یہاں تو ہم پر نعمتوں کی بارش کر رہا ہے اور آخرت میں جا کر ہمیں عذاب دے گا۔ عذاب ہونا ہے تو ان پر ہونا ہے جو یہاں اس کی نوازشوں سے محروم ہیں۔

قرآنِ مجید میں دنیا پرستوں کی اس غلط فہمی کا بھی جگہ جگہ ذکر کرکے اس کی تردید کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: البقرہ: ۱۲۶-۲۱۲۔ التوبہ: ۵۵-۶۹۔ ہود: ۳-۲۷۔ الرعد: ۲۶۔ الکہف: ۳۴ تا ۴۳۔ مریم: ۷۳ تا ۷۷۔ طٰہٰ: ۱۳۱۔ المومنون: ۵۵ تا ۶۱۔ الشعرا: ۱۱۱۔ القصص: ۷۶ تا ۸۳۔ الروم: ۹۔ المدثر: ۱۱ تا ۲۶۔ الفجر: ۱۵ تا ۲۰۔

۵۶ - یعنی دنیا میں رزق کی تقسیم کا انتظام جس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اُس کو یہ لوگ نہیں سمجھتے اور اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ جسے اللہ کشادہ رزق دے رہا ہے وہ اُس کا محبُوب ہے، اور جسے تنگی کے ساتھ دے رہا ہے وہ اس کے غضب میں مبتلا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص ذرا آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے نظر آ سکتا ہے کہ بسا اوقات بڑے ناپاک اور گھناؤنے کردار کے لوگ نہایت خوش حال ہوتے ہیں، اور بہت سے نیک اور شریف انسان، جن کے کردار کی خوبی کا ہر شخص معترف ہوتا ہے، تنگ دستی میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اب آخر کون صاحبِ عقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کو یہ پاکیزہ اَخلاق کے لوگ ناپسند ہیں اور وہ شریر و خبیث لوگ ہی اسے بھلے لگتے ہیں۔

۵۷ - اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی صحیح ہیں۔ ایک، یہ کہ اللہ سے قریب کرنے والی چیز مال اور اولاد نہیں ہے بلکہ ایمان و عملِ صالح ہے۔ دوسرے، یہ کہ مال اور اولاد صرف اُس مومنِ صالح انسان ہی کے لیے ذریعۂ تقرّب بن سکتے ہیں جو اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت سے خداشناس اور نیک کردار بنانے کی کوشش کرے۔

أُولَٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ﴿٣٨﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ
يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ وَيَقْدِرُ لَهُۥ ۚ وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ
يُخْلِفُهُۥ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّٰزِقِينَ ﴿٣٩﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ
لِلْمَلَٰٓئِكَةِ أَهَٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا۟ يَعْبُدُونَ ﴿٤٠﴾ قَالُوا۟ سُبْحَٰنَكَ

کرتے ہیں، تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

اَے نبیؐ! ان سے کہو: ''میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کُھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔[59] جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اُس کی جگہ وہی تم کو اَور دیتا ہے، وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے۔[60]

اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا: ''کیا یہ لوگ تمھاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟''[61] تو وہ جواب دیں گے کہ ''پاک ہے آپ کی ذات،

---

۵۸ – اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ ان کی یہ نعمت لازوال ہوگی اور اِس اجر کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ کیونکہ جس عیش کے کبھی ختم ہو جانے کا خطرہ ہو اس سے انسان پوری طرح مطمئن ہو کر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کب یہ سب کچھ چھن جائے۔

۵۹ – اس مضمون کو بتکرار بیان کرنے سے مقصود اس بات پر زور دینا ہے کہ رزق کی کمی وبیشی اللہ کی مَشِیَّت سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ اس کی رضا سے۔ مشیّتِ الٰہی کے تحت اچھے اور بُرے ہر طرح کے انسانوں کو رزق مل رہا ہے۔ خدا کا اقرار کرنے والے بھی رزق پا رہے ہیں اور اس کا انکار کرنے والے بھی۔ نہ رزق کی فراوانی اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی خدا کا پسندیدہ بندہ ہے، اور نہ اس کی تنگی اس امر کی علامت ہے کہ آدمی اس کا مغضوب ہے۔ مشیّت کے تحت ایک ظالم اور بے ایمان آدمی پھلتا پھولتا ہے، حالانکہ ظلم اور بے ایمانی خدا کو پسند نہیں ہے۔ اور اس کے برعکس مشیّت ہی کے تحت ایک سچّا اور ایمان دار آدمی نقصان اُٹھاتا اور تکلیفیں سہتا ہے، حالانکہ یہ صفات خدا کو پسند ہیں۔ لہٰذا وہ شخص سخت گمراہ ہے جو مادّی فوائد ومنافع کو خیر وشر کا پیمانہ قرار دیتا ہے۔ اصل چیز خدا کی رضا ہے اور وہ اُن اَخلاقی اوصاف سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ ان اوصاف کے ساتھ اگر کسی کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں تو یہ بلاشبہ خدا کا فضل ہے جس پر شکر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ایک شخص اَخلاقی اوصاف کے لحاظ سے خدا کا باغی ونافرمان بندہ ہو اور اس کے ساتھ دنیا کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہو تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ سخت باز پُرس اور بدترین عذاب کے لیے تیار ہو رہا ہے۔

اَنۡتَ وَلِيُّنَا مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ بَلۡ كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ ۚ اَكۡثَرُهُمۡ بِهِمۡ
مُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾ فَالۡيَوۡمَ لَا يَمۡلِكُ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ نَّفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَ
نَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ بِهَا

ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ اِن لوگوں سے۔[۶۲] دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جِنّوں کی عبادت کرتے تھے، ان میں سے اکثر اُنھی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔[۶۳]" (اُس وقت ہم کہیں گے کہ) آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے کہ اب چکھو اس عذابِ جہنّم کا مزا جسے

۶۰ — رازق، صانع، مُوجِد، مُعطی اور ایسی ہی دوسری بہت سی صفات ایسی ہیں جو اصل میں تو اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں مگر مجازاً بندوں کی طرف بھی منسوب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہم ایک شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے فلاں شخص کے روزگار کا بندوبست کر دیا، یا اس نے یہ عَطِیَّہ دیا، یا اس نے فلاں چیز بنائی یا ایجاد کی۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یعنی جن جن کے متعلق تم گمان رکھتے ہو کہ وہ روزی دینے والے ہیں اُن سب سے بہتر روزی دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

۶۱ — قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دَور کے مشرکین فرشتوں کو دیوی اور دیوتا قرار دے کر ان کے بت بناتے اور ان کی پَرَستِش کرتے رہے ہیں۔ کوئی بارش کا دیوتا ہے تو کوئی بجلی کا اور کوئی ہوا کا۔ کوئی دولت کی دیوی ہے تو کوئی علم کی اور کوئی موت و ہلاکت کی۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ قیامت کے روز ان فرشتوں سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم ہی ان لوگوں کے معبود بنے ہوئے تھے؟ اِس سوال کا مطلب دریافتِ حال نہیں ہے بلکہ اس میں یہ معنیٰ پوشیدہ ہیں کہ کیا تم ان کی اس عبادت سے راضی تھے؟ کیا تم نے یہ کہا تھا کہ لوگو! ہم تمہارے معبُود ہیں، تم ہماری پوجا کیا کرو؟ یا تم نے یہ چاہا تھا کہ یہ لوگ تمھاری پوجا کریں؟ قیامت میں یہ سوال صرف فرشتوں ہی سے نہیں بلکہ تمام اُن ہستیوں سے کیا جائے گا جن کی دنیا میں عبادت کی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا ہے:

وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَيَقُوۡلُ ءَاَنۡتُمۡ اَضۡلَلۡتُمۡ عِبَادِىۡ هٰٓؤُلَاۤءِ اَمۡ هُمۡ ضَلُّوا السَّبِيۡلَ ؕ (آیت ۱۷)

جس روز اللہ تعالیٰ اِن لوگوں کو اور ان ہستیوں کو جن کی یہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں جمع کرے گا، پھر پوچھے گا: کیا تم نے میرے اِن بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟

۶۲ — یعنی وہ جواب دیں گے کہ حضور کی ذات اس سے مُنَزَّہ اور بالاتر ہے کہ کوئی دوسرا خدائی و معبُودیّت میں آپ کا شریک ہو۔ ہمارا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم اِن سے اور ان کے افعال سے بری الذّمہ ہیں۔ ہم تو حضور کے

تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا
رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا
هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا
جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ
يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ؕ ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ

تم جھٹلایا کرتے تھے۔

اِن لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سُنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ "یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو اُن معبُودوں سے برگشتہ کردے جن کی عبادت تمھارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔" اور کہتے ہیں کہ "یہ (قرآن) محض ایک جھُوٹ ہے گھڑا ہوا۔" اِن کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ "یہ تو صریح جادو ہے۔" حالانکہ نہ ہم نے اِن لوگوں کو پہلے کوئی کتاب دی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی مُتنبّہ کرنے والا بھیجا[۶۴] تھا۔ اِن سے پہلے

بندے ہیں۔

۶۳ – اس فقرے میں جنّ سے مراد شیاطینِ جنّ ہیں۔ فرشتوں کے اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو یہ ہمارے نام لے کر، اور اپنے تخیُّلات کے مطابق ہماری صورتیں بنا کر گویا ہماری عبادت کرتے تھے، لیکن دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ شیاطین کی بندگی کر رہے تھے، کیونکہ شیاطین ہی نے ان کو یہ راستہ دکھایا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا حاجت روا سمجھو اور ان کے آگے نذر و نیاز پیش کرو۔

یہ آیت صریح طور پر اُن لوگوں کے خیال کی غَلَطی واضح کر دیتی ہے جو "جنّ" کو پہاڑی علاقے کے باشندوں یا دہقانوں اور صحرائیوں کے معنٰی میں لیتے ہیں۔ کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی اس آیت کو پڑھ کر یہ تصور کر سکتا ہے کہ لوگ کوہستانی اور صحرائی اور دیہاتی آدمیوں کی عبادت کیا کرتے تھے اور انھی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

اس آیت سے عبادت کے بھی ایک دوسرے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت صرف پرستش اور پوجا پاٹ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ کسی کے حکم پر چلنا اور اس کی بے چون و چرا اطاعت کرنا بھی عبادت ہی ہے۔ حتّٰی کہ اگر آدمی کسی پر لعنت بھیجتا ہو (جیسا کہ شیطان پر بھیجتا ہے) اور پھر بھی پیروی اسی کے طریقے کی کیے جا رہا ہو تب بھی وہ اس کی عبادت

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا
رُسُلِيْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝۴۵ ع قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ
تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۣ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ
جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۝۴۶ قُلْ

ع ۵

گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ جو کچھ ہم نے انھیں دیا تھا اُس کے عُشرِ عَشیر کو بھی یہ نہیں پہنچے ہیں۔ مگر جب انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔[65] ع

اے نبیؐ! ان سے کہو کہ "میں تمھیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمھارے صاحب میں آخر ایسی کون سی بات ہے جو جُنون کی ہو؟[66] وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو مُتنبّہ کرنے والا ہے۔[67]" ان سے کہو:

کا مرتکب ہے۔ (اس کی دوسری مثالوں کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۱۴۵، المائدہ، ۹۱۔ جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۲۷، القصص، حاشیہ ۸۶)

۶۴ – یعنی اس سے پہلے نہ کوئی کتاب خدا کی طرف سے ایسی آئی ہے اور نہ کوئی رسول ایسا آیا ہے جس نے آ کر اِن کو یہ تعلیم دی ہو کہ یہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی و پرستش کیا کریں۔ اس لیے یہ لوگ کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ سراسر جہالت کی بنا پر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید کا انکار کر رہے ہیں۔ اِس کے لیے ان کے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

۶۵ – یعنی مکے کے لوگ تو اُس قوت و شوکت اور اُس خوش حالی کے عُشرِ عَشیر کو بھی نہیں پہنچے ہیں جو اُن قوموں کو حاصل تھی۔ مگر دیکھ لو کہ جب انھوں نے ان حقائق کو ماننے سے انکار کیا جو انبیا علیہم السّلام نے ان کے سامنے پیش کیے تھے، اور باطل پر اپنے نظامِ زندگی کی بنیاد رکھی تو آخرِ کار وہ کس طرح تباہ ہوئیں اور ان کی قوت و دولت ان کے کسی کام نہ آ سکی۔

۶۶ – یعنی اغراض اور خواہشات اور تعصُّبات سے پاک ہو کر خالصتاً للہ غور کرو۔ ہر شخص الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ سوچے اور دو دو چار چار آدمی سر جوڑ کر بھی بے لاگ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر کے تحقیق کریں کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آج تم اُس شخص کو مجنون ٹھیرا رہے ہو جسے کل تک تم اپنے درمیان نہایت دانا آدمی سمجھتے تھے۔ آخر نبوت سے تھوڑی ہی مدّت پہلے کا تو واقعہ تھا کہ تعمیرِ کعبہ کے بعد حَجرِ اَسوَد نصب کرنے کے مسئلے پر جب قبائلِ قریش باہم لڑ پڑے تھے تو تم ہی لوگوں نے بالاتفاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکم تسلیم کیا تھا اور انھوں نے ایسے طریقے سے اس جھگڑے کو چُکایا تھا جس پر تم سب مطمئن ہو گئے تھے۔ جس شخص کی عقل و دانش کا یہ تجربہ تمھاری ساری قوم کو ہو چکا ہے، اب کیا بات ایسی ہو گئی کہ تم اسے مجنون کہنے لگے؟

مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ
عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۴۷﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ
الْغُیُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا
یُعِیْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِیْ ۚ وَاِنِ
اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْۤ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ﴿۵۰﴾

"اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تم ہی کو مبارک رہے[۶۸]۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے[۶۹]۔" ان سے کہو: "میرا رب (مجھ پر) حق کا القا کرتا ہے[۷۰] اور وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔" کہو: "حق آ گیا ہے اور اب باطل کے کیے کچھ نہیں ہو سکتا۔" کہو: "اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے، اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں جو میرا رب میرے اوپر نازل کرتا ہے، وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے[۷۱]۔"

ہٹ دھرمی اور ضد کی بات تو دوسری ہے، مگر کیا واقعی تم اپنے دلوں میں بھی وہی کچھ سمجھتے ہو جو اپنی زبانوں سے کہتے ہو؟

۶۷ – یعنی کیا یہی وہ قصور ہے جس کی بنا پر تم اسے جُنون کا مریض ٹھیراتے ہو؟ کیا تمھارے نزدیک عقل مند وہ ہے جو تمھیں تباہی کے راستے پر جاتے دیکھ کر کہے کہ شاباش، بہت اچھے جا رہے ہو، اور مجنون وہ ہے جو تمھیں بُرا وقت آنے سے پہلے خبردار کرے اور فساد کی جگہ صَلاح کی راہ بتائے۔

۶۸ – اصل الفاظ ہیں: مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ۔ اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو اُوپر ہم نے ترجمہ میں بیان کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمھاری بھلائی کے سوا میں اور کچھ نہیں چاہتا، میرا اجر بس یہی ہے کہ تم درست ہو جاؤ۔ اس مضمون کو دوسری جگہ قرآنِ مجید میں یوں ادا کیا گیا ہے:

قُلْ مَاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِیْلًا (الفرقان: ۵۷)

اَے نبیؐ! ان سے کہو: میں اس کام پر تم سے کوئی اجر اس کے سوا نہیں مانگتا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔

۶۹ – یعنی الزام لگانے والے جو کچھ چاہیں الزام لگاتے رہیں، مگر اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ گواہ ہے کہ میں ایک بے غرض انسان ہوں، یہ کام اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّ
قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّ قَدْ
كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ

کاش! تم دیکھو اِنھیں اُس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے، بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔[۷۲] اُس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔[۷۳] حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آ سکتی ہے۔[۷۴] اِس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلا تحقیق دُور دُور

۷۰ — اصل الفاظ ہیں يَقْذِفُ بِالْحَقِّ۔ اس کے ایک معنیٰ یہ ہیں کہ وحی کے ذریعے سے وہ علمِ حق میرے اُوپر اِلقا کرتا ہے۔ اور دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ حق کو غالب کر رہا ہے، باطل کے سر پر حق کی ضرب لگا رہا ہے۔

۷۱ — اس زمانے کے بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ اِستدلال کیا ہے کہ اس کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گمراہ ہو سکتے تھے، بلکہ ہو جایا کرتے تھے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے خود حضورؐ ہی کی زبان سے یہ کہلوا دیا کہ اگر میں گمراہ ہوتا ہوں تو اپنی گمراہی کا خود ذمّہ دار ہوتا ہوں اور راہِ راست پر میں بس اُس وقت ہوتا ہوں جب میرا رب مجھ پر وحی (یعنی آیاتِ قرآنی) نازل کرتا ہے۔ اس غلط تاویل سے یہ ظالم گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضورؐ کی زندگی، معاذ اللہ! ہدایت وضلالت کا مجموعہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے کفار کے سامنے حضورؐ سے یہ اعتراف اس لیے کروایا تھا کہ کہیں کوئی شخص آپؐ کو بالکل ہی راہِ راست پر سمجھ کر آپؐ کی مکمل پیروی نہ اختیار کر بیٹھے۔ حالانکہ جو شخص بھی سلسلۂ کلام پر غور کرے گا وہ جان لے گا کہ یہاں ''اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں'' کے الفاظ اس معنیٰ میں نہیں کہے گئے ہیں کہ معاذ اللہ! حضورؐ فی الواقع گمراہ ہو جاتے تھے، بلکہ پوری بات اس معنیٰ میں کہی گئی ہے کہ ''اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں، جیسا کہ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو، اور میرا یہ نبوت کا دعویٰ اور میری یہ دعوتِ توحید اسی گمراہی کا نتیجہ ہے جیسا کہ تم گمان کر رہے ہو، تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہی پڑے گا، اس کی ذمّہ داری میں تم نہ پکڑے جاؤ گے۔ لیکن اگر میں ہدایت پر ہوں، جیسا کہ در حقیقت ہوں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی آتی ہے، جس کے ذریعے سے مجھے راہِ راست کا علم حاصل ہو گیا ہے۔ میرا رب قریب ہی موجود ہے اور سب کچھ سُن رہا ہے، اسے معلوم ہے کہ میں گمراہ ہوں یا اس کی طرف سے ہدایت یافتہ۔''

۷۲ — یعنی قیامت کے روز ہر مجرم اس طرح پکڑا جائے گا کہ گویا پکڑنے والا قریب ہی کہیں چھپا کھڑا تھا، ذرا اس نے بھاگنے کی کوشش کی اور فوراً ہی دھر لیا گیا۔

۷۳ — مراد یہ ہے کہ اُس تعلیم پر ایمان لے آئے جو رسولؐ نے دنیا میں پیش کی تھی۔

۷۴ — یعنی ایمان لانے کی جگہ تو دنیا تھی اور وہاں سے اب یہ بہت دور نکل آئے ہیں۔ عالمِ آخرت میں پہنچ جانے

بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ
بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾ ع

ع ۶ ۱۲

کی کوڑیاں لایا کرتے تھے۔[۷۵] اُس وقت جس چیز کی یہ تمنّا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیے جائیں گے جس طرح اِن کے پیش رَو ہم مشرب محروم ہو چکے ہوں گے۔ یہ بڑے گمراہ کُن شک میں پڑے ہوئے تھے۔[۷۶] ع

کے بعد اب توبہ و ایمان کا موقع کہاں مل سکتا ہے۔

۷۵ – یعنی رسولؐ اور تعلیماتِ رسولؐ اور اہلِ ایمان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے، آوازے کستے اور فقرے چُست کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ شخص ساحر ہے۔ کبھی کہتے مجنون ہے۔ کبھی توحید کا مذاق اُڑاتے اور کبھی آخرت کے تخیل پر باتیں چھانٹتے۔ کبھی یہ افسانہ تراشتے کہ رسولؐ کو کوئی اور سکھا تا پڑھاتا ہے اور کبھی ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے کہ یہ محض اپنی نادانی کی وجہ سے رسولؐ کے پیچھے لگ گئے ہیں۔

۷۶ – درحقیقت شرک اور دہریت اور انکارِ آخرت کے عقائد کوئی شخص بھی یقین کی بنا پر اختیار نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یقین صرف علم سے حاصل ہوتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ علم حاصل نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے، یا بہت سے خدا ہیں، یا خدائی کے اختیارات میں بہت سی ہستیوں کو دخل حاصل ہے، یا آخرت نہیں ہونی چاہیے۔ پس جس نے بھی دنیا میں یہ عقائد اختیار کیے ہیں اس نے محض قیاس و گمان پر ایک عمارت کھڑی کر لی ہے جس کی اصل بنیاد شک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ شک انھیں سخت گمراہی کی طرف لے گیا ہے۔ انھیں خدا کے وجود میں شک ہوا۔ انھیں توحید کی صداقت میں شک ہوا۔ انھیں آخرت کے آنے میں شک ہوا۔ حتّٰی کہ اس شک کو انھوں نے یقین کی طرح دلوں میں بٹھا کر انبیاؑ کی کوئی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کی پوری مہلتِ عمل ایک غلط راستے میں کھپا دی۔

تفہیم القرآن

فاطر

(۳۵)

فاطر

نام پہلی آیت ہی میں لفظ ''فَاطِرِ'' اس سورہ کا عنوان قرار دیا گیا ہے جس کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ یہ وہ سورت ہے جس میں فاطر کا لفظ آیا ہے۔ دوسرا نام ''الملائکہ'' بھی ہے، اور یہ لفظ بھی پہلی آیت ہی میں وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نُزُول اندازِ کلام کی اندرونی شہادت سے مُتَرَشّح ہوتا ہے کہ اس سورت کے نزول کا زمانہ غالبًا مکۂ معظمہ کا دَورِ متوسط ہے، اور اس کا بھی وہ حصّہ جس میں مخالفت اچھی خاصی شدّت اختیار کر چکی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی بُری سے بُری چالیں چلی جا رہی تھیں۔

موضوع و مضمون کلام کا مدّعا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید کے مقابلے میں جو رَوِیَّہ اِس وقت اہلِ مکہ اور اُن کے سرداروں نے اختیار کر رکھا تھا اس پر ناصحانہ انداز میں اُن کو تنبیہ و ملامت بھی کی جائے اور معلّمانہ انداز میں فہمایش بھی۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ نادانو! یہ نبی جس راہ کی طرف تم کو بُلا رہا ہے اس میں تمھارا اپنا بھلا ہے۔ اس پر تمھارا غصّہ، اور تمھاری مکاریاں اور چال بازیاں، اور اس کو ناکام کرنے کے لیے تمھاری تدبیریں دراصل اُس کے خلاف نہیں بلکہ تمھارے اپنے خلاف پڑ رہی ہیں۔ اس کی بات نہ مانو گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑو گے، اس کا کچھ نہ بگاڑو گے۔ وہ جو کچھ تم سے کہہ رہا ہے اس پر غور تو کرو، آخر اس میں غلط کیا بات ہے۔ وہ شرک کی تردید کرتا ہے۔ تم خود آنکھیں کھول کر دیکھو، کیا شرک کے لیے دنیا میں کوئی معقول بنیاد موجود ہے؟ وہ توحید کی دعوت دیتا ہے۔ تم خود عقل سے کام لے کر غور کرو، کیا اللہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے سوا کہیں کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جو خدائی صفات اور اختیارات رکھتی ہو؟ وہ تم سے کہتا ہے کہ تم اس دنیا میں غیر ذمّہ دار نہیں ہو، بلکہ تمھیں اپنے خدا کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اَور زندگی ہے جس میں ہر ایک کو اپنے کیے کا نتیجہ دیکھنا ہو گا۔ تم خود سوچو کہ اس پر تمھارے شبہات اور اچنبھے کس قدر بے اصل ہیں۔ کیا تمھاری آنکھیں رات دن اعادۂ خلق کا مشاہدہ نہیں کر رہی ہیں؟ پھر تمھارا ہی اعادہ اُس خدا کے لیے کیوں ناممکن ہو جس نے تم کو ایک ذرا سے نطفے سے پیدا کر دیا۔ کیا تمھاری عقل یہ گواہی نہیں دیتی کہ بھلے اور بُرے کو یکساں نہ ہونا چاہیے؟ پھر تم ہی بتاؤ کہ معقول بات کیا ہے؟ یہ کہ بھلے اور بُرے کا انجام یکساں ہو، یعنی مٹّی میں ملنا اور فنا ہو جانا؟ یا یہ کہ بھلے کو بھلا اور بُرے کو بُرا

بدلہ ملے؟ اب اگر ان سراسر معقول اور مبنی بر حقیقت باتوں کو تم نہیں مانتے اور جھوٹے خداؤں کی بندگی نہیں چھوڑتے اور اپنے آپ کو غیر ذمّہ دار سمجھتے ہوئے شُترِ بے مہار ہی کی طرح دنیا میں جینا چاہتے ہو تو اس میں نبیؐ کا کیا نقصان ہے۔ شامت تو تمھاری اپنی ہی آئے گی۔ نبیؐ پر صرف سمجھانے کی ذمہ داری تھی، اور وہ اس نے ادا کر دی۔

سلسلۂ کلام میں بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپؐ جب نصیحت کا حق پوری طرح ادا کر رہے ہیں تو گمراہی پر اصرار کرنے والوں کے راہِ راست قبول نہ کرنے کی کوئی ذمّے داری آپؐ کے اوپر عائد نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ آپؐ کو یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ جو لوگ نہیں ماننا چاہتے، ان کے رَوِیّے پر نہ آپؐ غمگین ہوں، اور نہ انھیں راہِ راست پر لانے کی فکر میں اپنی جان گُھلائیں۔ اس کے بجائے آپؐ اپنی توجّہات اُن لوگوں پر صَرف کریں جو بات سننے کے لیے تیار ہیں۔

ایمان قبول کرنے والوں کو بھی اسی سلسلے میں بڑی بشارتیں دی گئی ہیں تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں اور وہ اللہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے راہِ حق میں ثابت قدم رہیں۔

آیاتہا ۴۵ سُوْرَۃُ فَاطِرٍ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے[1]، (ایسے فرشتے) جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں[2]۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے[3]۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے

۱ – اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیا علیہم السلام کے درمیان پیغام رسانی کی خدمت انجام دیتے ہیں، اور یہ بھی کہ تمام کائنات میں اللہ جَلَّ شانُہٗ کے احکام لے جانا اور اُن کو نافذ کرنا انھی فرشتوں کا کام ہے۔ ذکر کا مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ہے کہ یہ فرشتے جن کو مشرکین دیوی اور دیوتا بنائے بیٹھے ہیں، اِن کی حیثیت اللہ وحدہٗ لاشریک کے فرماں بردار خادموں سے زائد کچھ نہیں ہے۔ جس طرح کسی بادشاہ کے خدّام اس کے احکام کی تعمیل کے لیے دوڑے پھرتے ہیں اسی طرح یہ فرشتے کائنات کے فرماں روائے حقیقی کی خدمت کے لیے اُڑے پھرتے ہیں۔ ان خادموں کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ سارے اختیارات اصل فرماں روا کے ہاتھ میں ہیں۔

۲ – ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان فرشتوں کے بازوؤں اور پروں کی کیفیت کیا ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے دوسرے الفاظ کے بجائے وہ لفظ استعمال فرمایا ہے جو انسانی زبان میں پرندوں کے بازوؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے تو یہ تصور ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان کا یہی لفظ اصل کیفیت سے قریب تر ہے۔ دو دو اور تین تین اور چار چار بازوؤں کے ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے مختلف درجے کی طاقتیں عطا فرمائی ہیں اور جس سے جیسی خدمت لینی مطلوب ہے، اس کو ویسی ہی زبردست سُرعتِ رفتار اور قوتِ کار سے آراستہ فرمایا گیا ہے۔

۳ – ان الفاظ سے یہ مُترشّح ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بازوؤں کی انتہائی تعداد چار ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتوں کو اس سے بھی زیادہ بازو عطا فرمائے ہیں۔ حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلؑ کو ایک مرتبہ اس شکل میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔ (بخاری، مسلم، ترمذی) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے جبریلؑ کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے ان کے چھ سو بازو تھے اور وہ پورے اُفق پر چھائے ہوئے تھے۔

رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ
مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ڮ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳ وَاِنْ

کھول دے اسے کوئی روکنے والانہیں اور جسے وہ بند کر دے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والانہیں[4]۔ وہ زبردست اور حکیم ہے[5]۔

لوگو! تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انھیں یاد رکھو[6]۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمھیں آسمان اور زمین سے[7] رزق دیتا ہو؟ ـــــ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں، آخر تم کہاں سے[8] دھوکا کھا رہے ہو[9]؟ اب اگر

(ترمذی)

۴ – اس کا مقصود بھی مشرکین کی اس غلط فہمی کو رفع کرنا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے کوئی انھیں روزگار دلانے والا اور کوئی ان کو اولاد عطا فرمانے والا اور کوئی ان کے بیماروں کو تندرستی بخشنے والا ہے۔ شرک کے یہ تمام تصوّرات بالکل بے بنیاد ہیں اور خالص حقیقت صرف یہ ہے کہ جس قسم کی رحمت بھی بندوں کو پہنچتی ہے محض اللہ عزَّ وجَلَّ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کے عطا کرنے پر قادر ہے اور نہ روک دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید اور احادیث میں بکثرت مَقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے تاکہ انسان دَر دَر کی بھیک مانگنے اور ہر آستانے پر ہاتھ پھیلانے سے بچے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں ہے۔

۵ – زبردست ہے، یعنی سب پر غالب اور کامل اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ کوئی اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے۔ جو فیصلہ بھی وہ کرتا ہے سراسر حکمت کی بنا پر کرتا ہے۔ کسی کو دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ حکمت اسی کی مقتضی ہے۔ اور کسی کو نہیں دیتا تو اس لیے نہیں دیتا کہ اسے دینا حکمت کے خلاف ہے۔

۶ – یعنی احسان فراموش نہ بنو۔ نمک حرامی نہ اختیار کرو۔ اس حقیقت کو نہ بھول جاؤ کہ تمھیں جو کچھ بھی حاصل ہے، اللہ کا دیا ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ فقرہ اس بات پر مُتنَبِّہ کر رہا ہے کہ جو شخص بھی اللہ کے سوا کسی کی بندگی و پرستش کرتا ہے، یا کسی نعمت کو اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کی عطا و بخشش سمجھتا ہے، یا کسی نعمت کے ملنے پر اللہ کے سوا کسی اور کا شکر بجا لاتا ہے، یا کوئی نعمت مانگنے کے لیے اللہ کے سوا کسی اَور سے دعا کرتا ہے، وہ بہت بڑا احسان فراموش ہے۔

۷ – پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے کلام کا موقع و محل خود بھر رہا ہے۔

يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ
الْاُمُوْرُ ۝۴ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا ٝ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ

(اے نبی!) یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں[۸] (تو یہ کوئی نئی بات نہیں)، تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، اور سارے معاملات آخرِ کار اللہ ہی کی طرف رُجوع ہونے والے ہیں[۹]۔

لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے[۱۰]، لہٰذا دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالے[۱۱] اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمھیں اللہ کے بارے میں دھوکا دینے پائے[۱۲]۔ درحقیقت شیطان تمھارا دشمن ہے اس لیے تم بھی

اس کو سمجھنے کے لیے یہ نقشہ چشمِ تصوّر کے سامنے لائیے کہ تقریر مشرکین کے سامنے ہو رہی ہے۔ مقرر حاضرین سے پوچھتا ہے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہو اور جو زمین و آسمان سے تمھاری رزق رسانی کا سامان کر رہا ہو؟ یہ سوال اُٹھا کر مُقرّر چند لمحے جواب کا انتظار کرتا ہے۔ مگر دیکھتا ہے کہ سارا مجمع خاموش ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی خالق و رازق ہے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حاضرین کو بھی اس امر کا اقرار ہے کہ خالق و رازق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ تب مقرر کہتا ہے کہ معبُود بھی پھر اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ آخر تمھیں یہ دھوکا کہاں سے لگ گیا کہ خالق و رازق تو ہو صرف اللہ، مگر معبُود بن جائیں اس کے سوا دوسرے۔

۸ – یعنی تمھاری اس بات کو نہیں مانتے کہ اللہ کے سوا عبادت کا مستحق کوئی نہیں ہے، اور تم پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ تم نبوت کا ایک جھوٹا دعویٰ لے کر کھڑے ہو گئے ہو۔

۹ – یعنی فیصلہ لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ جسے وہ جھوٹا کہہ دیں وہ حقیقت میں جھوٹا ہو جائے۔ فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ آخرِ کار بتا دے گا کہ جھوٹا کون تھا اور جو حقیقت میں جھوٹے ہیں انھیں ان کا انجام بھی دکھا دے گا۔

۱۰ – وعدے سے مراد آخرت کا وعدہ ہے جس کی طرف اوپر کے اس فقرے میں اشارہ کیا گیا تھا کہ تمام معاملات آخرِ کار اللہ کے حضور پیش ہونے والے ہیں۔

۱۱ – یعنی اِس دھوکے میں کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے، اس کے بعد کوئی آخرت نہیں ہے جس میں اعمال کا حساب ہونے والا ہو۔ یا اس دھوکے میں کہ اگر کوئی آخرت ہے بھی تو جو اس دنیا میں مزے کر رہا ہے وہ وہاں بھی مزے کرے گا۔

۱۲ – ”بڑے دھوکے باز“ سے مراد یہاں شیطان ہے، جیسا کہ آگے کا فقرہ بتا رہا ہے۔ اور ”اللہ کے بارے میں“ دھوکا دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کو تو یہ باور کرائے کہ خدا سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اور کچھ لوگوں کو اس غلط فہمی میں ڈالے کہ خدا ایک دفعہ بس دنیا کو حرکت دے کر الگ جا بیٹھا ہے، اب اسے اپنی بنائی ہوئی اس کائنات سے عملاً کوئی سروکار نہیں ہے۔

عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا یَدۡعُوۡا حِزۡبَہٗ لِیَکُوۡنُوۡا مِنۡ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ ؕ﴿۶﴾
اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۬ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا
ع ۱ ۷ ۱۳ الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ٪﴿۷﴾ اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ
عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ

اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لیے بلا رہا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں۔ جو لوگ کفر کریں[۱۳] گے ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اُن کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔[۱۴] ع

(بھلا[۱۵] کچھ ٹھکانا ہے اُس شخص کی گمراہی کا) جس کے لیے اُس کا بُرا عمل خوش نما بنا دیا گیا ہو اور وہ اُسے اچھا سمجھ رہا ہو؟[۱۶] حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے

اور کچھ لوگوں کو یہ چکما دے کہ خدا کائنات کا انتظام تو بے شک کر رہا ہے، مگر اس نے انسانوں کی رہنمائی کرنے کا کوئی ذمّہ نہیں لیا ہے، اس لیے یہ وحی و رسالت محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ اور کچھ لوگوں کو یہ جھوٹے بھروسے دلائے کہ اللہ بڑا غفورٌ رحیم ہے، تم خواہ کتنے ہی گناہ کرو، وہ بخش دے گا، اور اس کے کچھ پیارے ایسے ہیں کہ ان کا دامن تھام لو تو بیڑا پار ہے۔

۱۳ – یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی اِس دعوت کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔

۱۴ – یعنی اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا اور جو نیک عمل انھوں نے کیے ہوں گے ان کا محض برابر سرابر ہی اجر دے کر نہ رہ جائے گا بلکہ انھیں بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

۱۵ – اُوپر کے دو پیراگراف عوام الناس کو خطاب کر کے ارشاد ہوئے تھے۔ اب اس پیراگراف میں اُن عَلَم برداران ِ ضلالت کا ذکر ہو رہا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

۱۶ – یعنی ایک بگڑا ہوا آدمی تو وہ ہوتا ہے جو بُرا کام تو کرتا ہے مگر یہ جانتا اور مانتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے بُرا کر رہا ہے۔ ایسا شخص سمجھانے سے بھی دُرست ہو سکتا ہے اور کبھی خود اس کا اپنا ضمیر بھی ملامت کر کے اسے راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی صرف عادتیں ہی بگڑی ہیں، ذہن نہیں بگڑا۔ لیکن ایک دوسرا شخص ایسا ہوتا ہے جس کا ذہن بگڑ چکا ہوتا ہے، جس میں بُرے اور بھلے کی تمیز باقی نہیں رہتی، جس کے لیے گناہ کی زندگی ایک مرغوب اور تابناک زندگی ہوتی ہے، جو نیکی سے گِھن کھاتا ہے اور بدی کو عین تہذیب و ثقافت سمجھتا ہے، جو صَلاح و تقویٰ کو دقیانوسیت اور فسق و فُجور کو ترقی پسندی خیال کرتا ہے، جس کی نگاہ میں ہدایت گمراہی اور گمراہی سراسر ہدایت بن جاتی ہے۔ ایسے شخص پر کوئی نصیحت کار گر نہیں ہوتی۔ وہ نہ خود اپنی حماقتوں پر مُتنبّہ

مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ

راہِ راست دِکھا دیتا ہے۔ پس (اے نبیؐ!) خواہ مخواہ تمھاری جان ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گُھلے۔[۱۷]

ہوتا ہے اور نہ کسی سمجھانے والے کی بات سُن کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی کے پیچھے پڑنا لا حاصل ہے۔ اسے ہدایت دینے کی فکر میں اپنی جان گُھلانے کے بجائے داعیِ حق کو ان لوگوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے جن کے ضمیر میں ابھی زندگی باقی ہو اور جنھوں نے اپنے دل کے دروازے حق کی آواز کے لیے بند نہ کر لیے ہوں۔

۱۷ – پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان یہ ارشاد کہ ''اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے'' صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ جو لوگ اس حد تک اپنے ذہن کو بگاڑ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے اور انھی راہوں میں بھٹکنے کے لیے انھیں چھوڑ دیتا ہے جن میں بھٹکتے رہنے پر وہ خود مُصِر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت سمجھا کر اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لے آنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ لہٰذا اُن کے معاملے میں صبر کر لو اور جس طرح اللہ کو ان کی پروا نہیں رہی ہے تم بھی ان کے حال پر غم کھانا چھوڑ دو۔

اِس مقام پر دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں: ایک یہ کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ عامّۃ النّاس نہیں تھے بلکہ مکۂ معظّمہ کے وہ سردار تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر جھوٹ، ہر فریب اور ہر مکر سے کام لے رہے تھے۔ یہ لوگ درحقیقت حضورؐ کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے۔ خوب جانتے تھے کہ آپؐ کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں اور آپؐ کے مقابلے میں وہ خود کن جہالتوں اور اخلاقی خرابیوں کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھ لینے کے بعد ٹھنڈے دل سے ان کا فیصلہ یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو نہیں چلنے دینا ہے۔ اور اس غرض کے لیے انھیں کوئی اوچھے سے اوچھا ہتھیار اور کوئی ذلیل سے ذلیل ہتھکنڈا استعمال کرنے میں باک نہ تھا۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر اور آپس میں مشورے کر کر کے آئے دن ایک نیا جھوٹ تصنیف کریں اور اسے کسی شخص کے خلاف پھیلائیں وہ دنیا بھر کو دھوکا دے سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو تو وہ جھوٹا جانتے ہیں اور خود ان سے تو یہ بات چُھپی ہوئی نہیں ہوتی کہ جس شخص پر انھوں نے ایک الزام لگایا ہے وہ اُس سے بَری ہے۔ پھر اگر وہ شخص جس کے خلاف یہ جھوٹے ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہوں، ان کے جواب میں کبھی صداقت و راست بازی سے ہٹ کر کوئی بات نہ کرے تو ان ظالموں سے یہ بات بھی کبھی چھپی نہیں رہ سکتی کہ ان کا مدِّمقابل ایک سچّا اور کھرا انسان ہے۔ اس پر بھی جن لوگوں کو اپنے کرتوتوں پر ذرا شرم نہ آئے اور وہ سچائی کا مقابلہ مسلسل جھوٹ سے کرتے ہی چلے جائیں ان کی یہ رَوِش خود ہی اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ اللہ کی پھٹکار ان پر پڑ چکی ہے اور ان میں بُرے بھلے کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔

دوسری بات جسے اس موقع پر سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر محض اپنے رسولِ پاکؐ کو اُن کے معاملے کی اصل حقیقت سمجھانا ہوتا تو وہ خفیہ طور پر صرف آپؐ ہی کو سمجھا سکتا تھا۔ اس غرض کے لیے وحیِ جلی میں عَلَی الاعلان اُس کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ قرآنِ مجید میں اسے بیان کرنے اور دنیا بھر کو سُنا دینے کا مقصود دراصل عوام النّاس کو مُتنبّہ کرنا تھا کہ جن لیڈروں اور پیشواؤں کے پیچھے تم آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہو وہ کیسے بگڑے ہوئے ذہن کے لوگ ہیں اور اُن کی بیہودہ حرکات کس طرح

إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌۢ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝٨ وَاللّٰهُ الَّذِيٓ أَرْسَلَ الرِّيٰحَ
فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ إِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا ۚ كَذٰلِكَ النُّشُورُ ۝٩ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ
جَمِيعًا ۚ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ

جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس کو خوب جانتا ہے۔[18] وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پھر وہ بادل اُٹھاتی ہیں، پھر ہم اسے ایک اُجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اسی زمین کو جِلا اُٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اُٹھنا بھی اسی طرح ہوگا۔[19]

جو کوئی عِزّت چاہتا ہو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ عزّت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔[20] اُس کے ہاں جو چیز اُوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے، اور عملِ صالح اس کو اُوپر چڑھاتا ہے۔[21]

منہ سے پکار پکار کر بتا رہی ہیں کہ اُن پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے۔

۱۸ – اس فقرے میں آپ سے آپ یہ دھمکی پوشیدہ ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ انھیں اِن کرتوتوں کی سزا دے گا۔ کسی حاکم کا کسی مجرم کے متعلق یہ کہنا کہ میں اس کی حرکتوں سے خوب واقف ہوں، صرف یہی معنیٰ نہیں دیتا کہ حاکم کو اس کی حرکتوں کا علم ہے، بلکہ اس میں یہ تنبیہ لازماً مضمر ہوتی ہے کہ میں اس کی خبر لے کر رہوں گا۔

۱۹ – یعنی یہ نادان لوگ آخرت کو بعید از امکان سمجھتے ہیں اور اسی لیے اپنی جگہ اِس خیال میں مگن ہیں کہ دنیا میں یہ خواہ کچھ کرتے رہیں بہرحال وہ وقت کبھی آنا نہیں ہے جب انھیں جواب دہی کے لیے خدا کے حضور حاضر ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ محض ایک خیالِ خام ہے جس میں یہ مبتلا ہیں۔ قیامت کے روز تمام اگلے پچھلے مَرے ہوئے انسان اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر بالکل اُسی طرح یکایک جی اُٹھیں گے، جس طرح ایک بارش ہوتے ہی سُونی پڑی ہوئی زمین یکایک لہلہا اُٹھتی ہے اور مدّتوں کی مَری ہوئی جڑیں سرسبز و شاداب ہو کر زمین کی تہوں میں سے سر نکالنا شروع کر دیتی ہیں۔

۲۰ – یہ بات ملحوظ رہے کہ قریش کے سردار نبیؐ کے مقابلے میں جو کچھ بھی کر رہے تھے اپنی عزت اور اپنے وقار کی خاطر کر رہے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات چل گئی تو ہماری بڑائی ختم ہو جائے گی، ہمارا اثر و رُسوخ مٹ جائے گا اور ہماری جو عزت سارے عرب میں بنی ہوئی ہے وہ خاک میں مل جائے گی۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے کفر و بغاوت کر کے جو عزت تم نے بنا رکھی ہے، یہ تو ایک جھوٹی عزت ہے جس کے لیے خاک ہی میں ملنا مقدر ہے۔ حقیقی عزت اور پائدار عزت جو دنیا سے لے کر عُقبیٰ تک کبھی ذلت آشنا نہیں ہو سکتی، صرف خدا کی بندگی میں ہی میسر آ سکتی ہے۔ اُس کے ہو جاؤ گے تو وہ تمھیں مل

وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ﴿۱۰﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ

رہے وہ لوگ جو بے ہودہ چال بازیاں کرتے ہیں[۲۲]، اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور اُن کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے۔

اللہ[۲۳] نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ[۲۴] سے، پھر تمھارے جوڑے بنا دیے (یعنی مرد اور عورت)۔ کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔

جائے گی۔ اور اُس سے منہ موڑو گے تو ذلیل وخوار ہو کر رہو گے۔

۲۱ — یہ ہے عزت حاصل کرنے کا اصل ذریعہ۔ اللہ کے ہاں جھوٹے اور خبیث اور مفسدانہ اقوال کو کبھی عُروج نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں تو صرف وہ قول عروج پاتا ہے جو سچا ہو، پاکیزہ ہو، حقیقت پر مبنی ہو، اور جس میں نیک نیتی کے ساتھ ایک صالح عقیدے اور ایک صحیح طرزِ فکر کی ترجمانی کی گئی ہو۔ پھر جو چیز ایک پاکیزہ کلمے کو عروج کی طرف لے جاتی ہے وہ قول کے مطابق عمل ہے۔ جہاں قول بڑا پاکیزہ ہو مگر عمل اس کے خلاف ہو وہاں قول کی پاکیزگی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ محض زبان کے پھاگ اُڑانے سے کوئی کلمہ بلند نہیں ہوتا۔ اُسے عروج پر پہنچانے کے لیے عملِ صالح کا زور درکار ہوتا ہے۔

اِس مَقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآنِ مجید قولِ صالح اور عملِ صالح کو لازم وملزوم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ کوئی عمل محض اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے صالح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی پشت پر عقیدۂ صالحہ نہ ہو۔ اور کوئی عقیدۂ صالحہ ایسی حالت میں معتبر نہیں ہو سکتا جب تک کہ آدمی کا عمل اس کی تائید وتصدیق نہ کر رہا ہو۔ ایک شخص اگر زبان سے کہتا ہے کہ میں صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کو معبود مانتا ہوں، مگر عملاً وہ غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کے قول کی تکذیب کر دیتا ہے۔ ایک شخص اگر زبان سے کہتا ہے کہ میں شراب کو حرام مانتا ہوں، مگر عملاً وہ شراب پیتا ہے تو اس کا محض قول نہ خلق کی نگاہ میں مقبول ہو سکتا ہے نہ خدا کے ہاں اسے کوئی قُبولیت نصیب ہو سکتی ہے۔

۲۲ — یعنی باطل اور خبیث کلمے لے کر اُٹھتے ہیں، ان کو چالاکیوں سے، فریب کاریوں سے اور نظر فریب اِستدلالوں سے فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور اُن کے مقابلے میں کلمۂ حق کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی بُری سے بُری تدبیر استعمال کرنے سے بھی نہیں چُوکتے۔

۲۳ — یہاں سے پھر رُوئے سُخن عوام الناس کی طرف پھرتا ہے۔

۲۴ — یعنی انسان کی آفرینش پہلے براہِ راست مٹی سے کی گئی، پھر اس کی نسل نطفے سے چلائی گئی۔

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ
فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ
لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ

کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔[۲۵] اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے۔[۲۶] اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں ہیں۔[۲۷] ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے، پینے میں خوش گوار، اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے۔ مگر دونوں سے تم تروتازہ گوشت حاصل کرتے ہو،[۲۸] پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو،[۲۹] اور اسی پانی میں تم

---

۲۵ – یعنی جو شخص بھی دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کے متعلق پہلے ہی یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ اسے دنیا میں کتنی عمر پانی ہے۔ کسی کی عمر دراز ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، اور چھوٹی ہوتی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کے فیصلے کی بنا پر ہوتی ہے۔ بعض نادان لوگ اس کے جواب میں یہ اِستدلال پیش کرتے ہیں کہ پہلے نوزائیدہ بچوں کی موتیں بکثرت واقع ہوتی تھیں اور اب علمِ طِبّ کی ترقی نے ان اموات کو روک دیا ہے۔ اور پہلے لوگ کم عمر پاتے تھے، اب وسائلِ علاج بڑھ جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عمریں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ دلیل قرآنِ مجید کے اس بیان کی تردید میں صرف اس وقت پیش کی جا سکتی تھی جب کہ کسی ذریعے سے ہم کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے تو فُلاں شخص کی عمر مثلاً دو سال لکھی تھی اور ہمارے طبّی وسائل نے اُس میں ایک دن کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح کا کوئی علم اگر کسی کے پاس نہیں ہے تو وہ کسی معقول بنیاد پر قرآن کے اِس ارشاد کا مُعارضہ نہیں کر سکتا۔ محض یہ بات کہ اعداد و شمار کی رُو سے اب بچوں کی شرحِ اموات گھٹ گئی ہے، یا پہلے کے مقابلے میں اب لوگ زیادہ عمر پا رہے ہیں، اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ انسان اب اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو بدلنے پر قادر ہو گیا ہے۔ آخر اس میں کیا عقلی اِستبعاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں پیدا ہونے والے انسانوں کی عمریں مختلف طور پر مقرر فرمائی ہوں، اور یہ بھی اللہ عَزَّ وجَلَّ ہی کا فیصلہ ہو کہ فلاں زمانے میں انسان کو فلاں امراض کے علاج کی قدرت عطا کی جائے گی اور فُلاں دَور میں انسان کو بقائے حیات کے فُلاں ذرائع بخشے جائیں گے۔

۲۶ – یعنی اتنی بے شمار مخلوق کے بارے میں اتنا تفصیلی علم اور فرد فرد کے بارے میں اتنے مفصّل احکام اور فیصلے کرنا اللہ کے لیے کوئی دشوار کام نہیں ہے۔

۲۷ – یعنی ایک وہ ذخیرہ جو سمندروں میں ہے۔ دوسرا وہ ذخیرہ جو دریاؤں، چشموں اور جھیلوں میں ہے۔

۲۸ – یعنی آبی جانوروں کا گوشت۔

فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ يُوْلِجُ الَّيْلَ
فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ڮ كُلٌّ
يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا
يَسْمَعُوْا دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ
الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾ ع

دیکھتے ہو کہ کشتیاں اُس کا سینہ چیرتی جارہی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اُس کے شکر گزار بنو۔ وہ دن کے اندر رات کو اور رات کے اندر دن کو پروتا ہوا لے آتا ہے۔[۳۰] چاند اور سورج کو اُس نے مُسَخّر کر رکھا ہے۔[۳۱] یہ سب کچھ ایک وقتِ مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ وہی اللہ (جس کے یہ سارے کام ہیں) تمھارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اُسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ ایک پرِکاہ[۳۲] کے مالک بھی نہیں ہیں۔ انھیں پکارو تو وہ تمھاری دعائیں سُن نہیں سکتے اور سُن لیں تو ان کا تمھیں کوئی جواب نہیں دے سکتے۔[۳۳] اور قیامت کے روز وہ تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے۔[۳۴] حقیقتِ حال کی ایسی صحیح خبر تمھیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔[۳۵] ع

---

۲۹ – یعنی موتی، مُونگے، اور بعض دریاؤں سے ہیرے اور سونا۔

۳۰ – یعنی دن کی روشنی آہستہ آہستہ گھٹنی شروع ہوتی ہے اور رات کی تاریکی بڑھتے بڑھتے آخرِ کار پوری طرح چھا جاتی ہے۔ اسی طرح رات کے آخر میں پہلے اُفق پر ہلکی سی روشنی نمودار ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ روزِ روشن نکل آتا ہے۔

۳۱ – ایک ضابطے کا پابند بنا رکھا ہے۔

۳۲ – اصل میں لفظ قِطْمِیْر استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ پتلی سی جِھلّی ہے جو کھجور کی گُٹھلی پر ہوتی ہے۔ لیکن اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ مشرکین کے معبود کسی حقیر سے حقیر چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اسی لیے ہم نے لفظی ترجمہ چھوڑ کر مرادی ترجمہ کیا ہے۔

۳۳ – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمھاری دعا کے جواب میں پکار کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمھاری دُعا قبول کی گئی یا

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ
يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾ وَلَا
تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا

لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو[۳۶] اور اللہ تو غنی و حمید ہے[۳۷]۔ وہ چاہے تو تمھیں ہٹا کر کوئی نئی خلقت تمھاری جگہ لے آئے، ایسا کرنا اللہ کے لیے کچھ بھی دُشوار نہیں[۳۸]۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا[۳۹]۔ اور اگر کوئی لدا ہُوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے گا تو

نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمھاری درخواستوں پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ایک شخص اگر اپنی درخواست کسی ایسے شخص کے پاس بھیج دیتا ہے جو حاکم نہیں ہے تو اس کی درخواست رائگاں جاتی ہے، کیونکہ وہ جس کے پاس بھیجی گئی ہے اس کے ہاتھ میں سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں ہے، نہ رَدّ کرنے کا اختیار اور نہ قبول کرنے کا اختیار۔ البتہ اگر وہی درخواست اُس ہستی کے پاس بھیجی جائے جو واقعی حاکم ہو، تو اس پر لازماً کوئی نہ کوئی کارروائی ہوگی، قطعِ نظر اس سے کہ وہ قبول کرنے کی شکل میں ہو یا رَدّ کرنے کی شکل میں۔

۳۴ — یعنی وہ صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے ان سے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ہم خدا کے شریک ہیں، تم ہماری عبادت کیا کرو۔ بلکہ ہمیں یہ خبر بھی نہ تھی کہ یہ ہم کو اللہ ربّ العالمین کا شریک ٹھیرا رہے ہیں اور ہم سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کی کوئی دعا ہمیں نہیں پہنچی اور ان کی کسی نذر و نیاز کی ہم تک رسائی نہیں ہوئی۔

۳۵ — خبردار سے مراد اللہ تعالیٰ خود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرا کوئی شخص تو زیادہ سے زیادہ عقلی استدلال سے شرک کی تردید اور مشرکین کے معبُودوں کی بے اختیاری بیان کرے گا۔ مگر ہم حقیقتِ حال سے براہِ راست باخبر ہیں۔ ہم علم کی بنا پر تمھیں بتا رہے ہیں کہ لوگوں نے جن جن کو بھی ہماری خدائی میں بااختیار ٹھیرا رکھا ہے وہ سب بے اختیار ہیں۔ ان کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے جس سے وہ کسی کا کوئی کام بنا سکیں یا بگاڑ سکیں۔ اور ہم براہِ راست یہ جانتے ہیں کہ قیامت کے روز مشرکین کے یہ معبُود خود ان کے شرک کی تردید کریں گے۔

۳۶ — یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ خدا تمھارا محتاج ہے، تم اسے خدا نہ مانو گے تو اس کی خدائی نہ چلے گی، اور تم اس کی بندگی و عبادت نہ کرو گے تو اس کا کوئی نقصان ہو جائے گا۔ نہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ تم اس کے محتاج ہو۔ تمھاری زندگی ایک لمحے کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتی اگر وہ تمھیں زندہ نہ رکھے اور وہ اسباب تمھارے لیے فراہم نہ کرے جن کی بدولت تم دنیا میں زندہ رہتے ہو اور کام کر سکتے ہو۔ لہٰذا تمھیں اُس کی طاعت و عبادت اختیار کرنے کی جو تاکید کی جاتی ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ خدا کو اس کی احتیاج ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ اِسی پر تمھاری اپنی دنیا اور آخرت کی فلاح کا انحصار ہے۔ ایسا نہ کرو گے تو اپنا ہی سب کچھ بگاڑ لو گے، خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ

اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصّہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا، چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔[۴۰] (اے نبیؐ!) تم صرف انھی لوگوں کو مُتنبِّہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے

۳۷ - ”غنی“ سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے، ہر ایک سے مُستغنی اور بے نیاز ہے، کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ اور ”حمید“ سے مراد یہ ہے کہ وہ آپ سے آپ محمود ہے، کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے مگر حمد (شکر اور تعریف) کا استحقاق اسی کو پہنچتا ہے۔ ان دونوں صفات کو ایک ساتھ اس لیے لایا گیا ہے کہ محض غنی تو وہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی دولت مندی سے کسی کو نفع نہ پہنچائے۔ اس صورت میں وہ غنی تو ہو گا مگر حمید نہ ہو گا۔ حمید وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ وہ کسی سے خود تو کوئی فائدہ نہ اُٹھائے مگر اپنی دولت کے خزانوں سے دوسروں کو ہر طرح کی نعمتیں عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ان دونوں صفات میں کامل ہے، اس لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ محض غنی نہیں ہے، بلکہ ایسا غنی ہے جسے ہر تعریف اور شکر کا استحقاق پہنچتا ہے، کیوں کہ وہ تمھاری اور تمام موجوداتِ عالم کی حاجتیں پوری کر رہا ہے۔

۳۸ - یعنی تم کچھ اپنے بَل بُوتے پر اُس کی زمین میں نہیں دندنا رہے ہو۔ اُس کا ایک اشارہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ تمھیں یہاں سے چلتا کرے اور کسی اور قوم کو تمھاری جگہ اٹھا کھڑا کرے۔ لہٰذا اپنی اوقات پہچانو اور وہ رَوِش اختیار نہ کرو جس سے آخرِ کار قوموں کی شامت آیا کرتی ہے۔ خدا کی طرف سے جب کسی کی شامت آتی ہے تو ساری کائنات میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے اور اس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے روک سکے۔

۳۹ - ”بوجھ“ سے مراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، اور ہر ایک پر صرف اس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمّہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داری کا بار خود اپنے اُوپر لے لے اور اسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوا دے۔ یہ بات یہاں اس بنا پر فرمائی جا رہی ہے کہ مکۂ معظّمہ میں جو لوگ اسلام قُبول کر رہے تھے اُن سے اُن کے مشرک رشتہ دار اور بَرادری کے لوگ کہتے تھے کہ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور دینِ آبائی پر قائم رہو، عذاب ثواب ہماری گردن پر۔

۴۰ - اُوپر کے فقرے میں اللہ کے قانونِ عدل کا بیان ہے کہ وہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو نہ پکڑے گا، بلکہ ہر ایک کو اس کے اپنے ہی گناہ کا ذمّہ دار ٹھیرائے گا۔ اور اس فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ آج یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری ذمّہ داری پر کفر و مَعصِیَت کا ارتکاب کرو، قیامت کے روز ہم تمھارا بارِ گناہ اپنے اُوپر لے لیں گے، وہ دراصل محض ایک جھوٹا بھروسا دلا رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی اور لوگ دیکھ لیں گے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں تو ہر ایک کو اپنی پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے منہ موڑ لے گا اور کوئی کسی کا ذرّہ برابر بوجھ بھی اپنے اُوپر لینے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَ
اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ⑱ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ⑲ وَ لَا الظُّلُمٰتُ
وَ لَا النُّوْرُ ۙ⑳ وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ ۚ㉑ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا
الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ

ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں[۴۱]۔ جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔ اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دُھوپ کی تپش ایک جیسی ہے۔ اور نہ زندے اور مُردے مُساوی ہیں[۴۲]۔ اللہ جسے چاہتا ہے سُنواتا ہے، مگر (اے نبیؐ!) تم اُن لوگوں کو نہیں سُنا سکتے

۴۱ – بالفاظِ دیگر ہٹ دھرم اور ہیکڑ لوگوں پر تمھاری تنبیہات کارگر نہیں ہو سکتیں۔ تمھارے سمجھانے سے تو وہی لوگ راہِ راست پر آ سکتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہے اور جو اپنے مالکِ حقیقی کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہیں۔

۴۲ – اِن تمثیلات میں مومن اور کافر کے حال اور مستقبل کا فرق بتایا گیا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو حقائق سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے اور کچھ نہیں دیکھتا کہ کائنات کا سارا نظام اور خود اس کا اپنا وجود کس صداقت کی طرف اشارے کر رہا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کی آنکھیں کھلی ہیں اور وہ صاف دیکھ رہا ہے کہ اس کے باہر اور اندر کی ہر چیز خدا کی توحید اور اس کے حضور انسان کی جواب دہی پر گواہی دے رہی ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو جاہلانہ اَوہام اور مفروضات و قیاسات کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے اور پیغمبر کی روشن کی ہوئی شمع کے قریب بھی پھٹکنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کی آنکھیں کھلی ہیں اور پیغمبر کی پھیلائی ہوئی روشنی سامنے آتے ہی اس پر یہ بات بالکل عیاں ہو گئی ہے کہ مشرکین اور کفار اور دہریّے جن راہوں پر چل رہے ہیں وہ سب تباہی کی طرف جاتی ہیں اور فلاح کی راہ صرف وہ ہے جو خدا کے رسولؐ نے دکھائی ہے۔ اب آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ دنیا میں ان دونوں کا رَوِیّہ یکساں ہو اور دونوں ایک ساتھ ایک ہی راہ پر چل سکیں؟ اور آخر یہ بھی کیسے ممکن ہے کہ دونوں کا انجام یکساں ہو اور دونوں ہی مر کر فنا ہو جائیں، نہ ایک کو بدراہی کی سزا ملے، نہ دوسرا راست رَوی کا کوئی انعام پائے؟ ''ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی نہیں ہے'' کا اشارہ اِسی انجام کی طرف ہے کہ ایک اللہ کے سایۂ رحمت میں جگہ پانے والا ہے اور دوسرا جہنّم کی تپش میں جُھلسنے والا ہے۔ تم کس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ آخر کار دونوں ایک ہی انجام سے دوچار ہوں گے۔ آخر میں مومن کو زندہ سے اور ہٹ دھرم کافروں کو مُردہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی مومن وہ ہے جس کے اندر احساس و اِدراک اور فہم و شعور موجود ہے اور اس کا ضمیر اُسے بھلے اور بُرے کی تمیز سے ہر وقت آگاہ کر رہا ہے۔ اور اس کے برعکس جو شخص کفر کے تعصب میں پوری طرح غرق

مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿٢٢﴾ إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ﴿٢٣﴾ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ
بَشِيرًا وَّنَذِيرًا ۚ وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٤﴾ وَإِنْ
يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِيْنَ

جو قبروں میں مدفون ہیں۔[43] تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔[44] ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی اُمّت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی مُتنبّہ کرنے والا نہ آیا ہو۔[45] اب اگر یہ لوگ تمھیں جُھٹلاتے ہیں تو اِن سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جُھٹلا چکے ہیں۔ اُن کے پاس ان کے رسول کُھلے دلائل[46] اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب[47] لے کر آئے تھے۔ پھر جن لوگوں نے

ہو چکا ہے اس کا حال اُس اندھے سے بھی بدتر ہے جو تاریکی میں بھٹک رہا ہو، اس کی حالت تو اُس مُردے کی سی ہے جس میں کوئی حِس باقی نہ رہی ہو۔

۴۳ — یعنی اللہ کی مَشِیّت کی تو بات ہی دوسری ہے، وہ چاہے تو پتھروں کو سَماعت بخش دے، لیکن رسول کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ جن لوگوں کے سینے ضمیر کے مَدفن بن چکے ہوں ان کے دلوں میں اپنی بات اُتار سکے اور جو بات سننا ہی نہ چاہتے ہوں اُن کے بہرے کانوں کو صدائے حق سنا سکے۔ وہ تو انھی لوگوں کو سنا سکتا ہے جو معقول بات پر کان دھرنے کے لیے تیار ہوں۔

۴۴ — یعنی تمھارا کام لوگوں کو خبردار کر دینے سے زائد کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی ہوش میں نہیں آتا اور اپنی گمراہیوں ہی میں بھٹکتا رہتا ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اندھوں کو دکھانے اور بہروں کو سنانے کی خدمت تمھارے سُپرد نہیں کی گئی ہے۔

۴۵ — یہ بات قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر فرمائی گئی ہے کہ دنیا میں کوئی اُمّت ایسی نہیں گزری ہے جس کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث نہ فرمائے ہوں۔ سورۂ رَعد میں فرمایا: وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ (آیت ۷) سورۂ حِجر میں فرمایا: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ۔ (آیت ۱۰) سورۂ نَحل میں فرمایا: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا (آیت ۳۶) سورۂ شُعَراء میں فرمایا: وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ۔ (آیت ۲۰۸) مگر اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہییں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اوّل یہ کہ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں تک پہنچ سکتی ہو وہاں کے لیے وہی نبی کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر بستی اور ہر ہر قوم میں الگ الگ ہی انبیاؑ بھیجے جائیں۔ دوم یہ کہ ایک نبی کی دعوت و ہدایت کے آثار اور اس کی رہنمائی

ع ۳ ۱۲ ۱۵

كَفَرُوا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۲۶﴾ع اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ
جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾ وَمِنَ
النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ

نہ مانا، ان کو میں نے پکڑ لیا، اور دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ع

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سُرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔[۴۸]

کے نُقوشِ قدم جب تک محفوظ رہیں اُس وقت تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر نسل اور ہر پشت کے لیے الگ نبی بھیجا جائے۔

۴۶ – یعنی ایسے دلائل جو اس بات کی صاف شہادت دیتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔

۴۷ – صحیفوں اور کتاب میں غالبًا یہ فرق ہے کہ صحیفے زیادہ تر نصائح اور اخلاقی ہدایات پر مشتمل ہوتے تھے، اور کتاب ایک پوری شریعت لے کر آتی تھی۔

۴۸ – اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ خدا کی پیدا کردہ کائنات میں کہیں بھی یک رنگی و یکسانی نہیں ہے۔ ہر طرف تَنوُّع ہی تَنوُّع ہے۔ ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی سے طرح طرح کے درخت نکل رہے ہیں، اور ایک درخت کے دو پھل تک اپنے رنگ، جسامت اور مزے میں یکساں نہیں ہیں۔ ایک ہی پہاڑ کو دیکھو تو اس میں کئی کئی رنگ تمھیں نظر آئیں گے اور اس کے مختلف حصوں کی مادّی ترکیب میں بڑا فرق پایا جائے گا۔ انسانوں اور جانوروں میں ایک ماں باپ کے دو بچّے تک یکساں نہ ملیں گے۔ اِس کائنات میں اگر کوئی مزاجوں اور طبیعتوں اور ذہنیتوں کی یکسانی ڈھونڈے اور وہ اختلافات دیکھ کر گھبرا اُٹھے جن کی طرف اوپر (آیات نمبر ۱۹ تا ۲۲ میں) اشارہ کیا گیا ہے تو یہ اس کے اپنے فہم کی کوتاہی ہے۔ یہی تَنوُّع اور اختلاف تو پتا دے رہا ہے کہ اس کائنات کو کسی زبردست حکیم نے بے شمار حکمتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کا بنانے والا کوئی بے نظیر خلّاق اور بے مثل صَنّاع ہے جو ہر چیز کا کوئی ایک ہی نمونہ لے کر نہیں بیٹھ گیا ہے، بلکہ اس کے پاس ہر شے کے لیے نئے سے نئے ڈیزائن اور بے حد وحساب ڈیزائن ہیں۔ پھر خاص طور پر انسانی طبائع اور اَذہان کے اختلاف پر کوئی شخص غور کرے تو اسے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، بلکہ درحقیقت حکمتِ تخلیق کا شاہکار ہے۔ اگر تمام انسان پیدایشی طور پر اپنی اُفتادِ طبع اور اپنی خواہشات، جذبات، میلانات اور طرزِ فکر کے لحاظ

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ غَفُوۡرٌ ﴿۲۸﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔[۴۹] بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔[۵۰]

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انھیں

سے یکساں بنا دیے جاتے اور کسی اختلاف کی کوئی گنجایش نہ رکھی جاتی تو دنیا میں انسان کی قسم کی ایک نئی مخلوق پیدا کرنا ہی سرے سے لا حاصل ہو جاتا۔ خالق نے جب اس زمین پر ایک ذمہ دار مخلوق اور اختیارات کی حامل مخلوق وجود میں لانے کا فیصلہ کیا تو اس فیصلے کی نوعیّت کا لازمی تقاضا یہی تھا کہ اس کی ساخت میں ہر قسم کے اختلافات کی گنجایش رکھی جاتی۔ یہ چیز اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ انسان کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک عظیم الشان حکیمانہ منصوبے کا نتیجہ ہے اور ظاہر ہے کہ حکیمانہ منصوبہ جہاں بھی پایا جائے گا وہاں لازماً اس کے پیچھے ایک حکیم ہستی کارفرما ہوگی۔ حکیم کے بغیر حکمت کا وجود صرف ایک احمق ہی فرض کر سکتا ہے۔

۴۹ – یعنی جو شخص اللہ کی صفات سے جتنا زیادہ ناواقف ہوگا وہ اس سے اتنا ہی بے خوف ہوگا اور اس کے برعکس جس شخص کو اللہ کی قدرت، اس کے علم، اس کی حکمت، اس کی قہّاری و جبّاری، اور اس کی دوسری صفات کی جتنی معرفت حاصل ہوگی، اتنا ہی وہ اس کی نافرمانی سے خوف کھائے گا۔ پس درحقیقت اس آیت میں علم سے مراد فلسفہ و سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ درسی عُلوم نہیں ہیں، بلکہ صفاتِ الٰہی کا علم ہے، قطعِ نظر اس سے کہ آدمی خواندہ ہو یا ناخواندہ۔ جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ علّامۂ دَہر بھی ہو تو اِس علم کے لحاظ سے جاہلِ محض ہے۔ اور جو شخص خدا کی صفات کو جانتا ہے اور اس کی خَشیّت اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اَن پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اس آیت میں لفظ ''عُلَمَا'' سے وہ اِصطِلاحی علما بھی مراد نہیں ہیں جو قرآن و حدیث اور فقہ و کلام کا علم رکھنے کی بنا پر علمائے دین کہے جاتے ہیں۔ وہ اس آیت کے مِصداق صرف اُسی صورت میں ہوں گے جب کہ ان کے اندر خدا ترسی موجود ہو۔ یہی بات حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فرمائی ہے کہ لیس العلم عن کثرۃ الحدیث ولکن العلم عن کثرۃ الخشیۃ۔ ''علم کثرتِ حدیث کی بنا پر نہیں ہے بلکہ خوفِ خدا کی کثرت کے لحاظ سے ہے۔'' اور یہی بات حضرت حَسَن بصریؒ نے فرمائی ہے کہ العالم من خشی الرحمٰن بالغیب و رغب فیما رغب اللّٰہ فیہ وزھد فیما سخط اللّٰہ فیہ۔ ''عالم وہ ہے جو اللہ سے بے دیکھے ڈرے، جو کچھ اللہ کو پسند ہے اس کی طرف وہ راغب ہو، اور جس چیز سے اللہ ناراض ہے اس سے وہ کوئی دلچسپی نہ رکھے۔''

۵۰ – یعنی وہ زبردست تو ایسا ہے کہ نافرمانوں کو جب چاہے پکڑ لے، کسی میں یارا نہیں کہ اس کی پکڑ سے بچ نکلے، مگر یہ اس کی شانِ عَفو و درگزر ہے جس کی بنا پر ظالموں کو مُہلت ملے جا رہی ہے۔

رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ
أُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾ وَالَّذِيْٓ
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ

رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقّع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا۔ (اس تجارت میں انھوں نے اپنا سب کچھ اس لیے کھپایا ہے) تاکہ اللہ اُن کے اجر پورے کے پورے اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور قدر دان ہے۔[۵۲] (اے نبیؐ!) جو کتاب ہم نے تمھاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجی ہے وہی حق ہے، تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے اُن کتابوں کی جو اِس سے پہلے آئی تھیں۔[۵۳] بے شک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔[۵۴] پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جنھیں ہم نے (اِس

۵۱ – اہلِ ایمان کے اس عمل کو تجارت سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ آدمی تجارت میں اپنا سرمایہ اور محنت و قابلیت اس امید پر صَرف کرتا ہے کہ نہ صرف اصل واپس ملے گا، اور نہ صرف وقت اور محنت کی اُجرت ملے گی، بلکہ کچھ مزید مُنافعہ بھی حاصل ہوگا۔ اسی طرح ایک مومن بھی خدا کی فرماں برداری میں، اس کی بندگی و عبادت میں، اور اس کے دین کی خاطر جِدّ و جُہد میں، اپنا مال، اپنے اوقات، اپنی محنتیں اور قابلیتیں اس امید پر کھپا دیتا ہے کہ نہ صرف ان سب کا پورا پورا اجر ملے گا بلکہ اللہ اپنے فضل سے مزید بہت کچھ عنایت فرمائے گا۔ مگر دونوں تجارتوں میں فرق اور بہت بڑا فرق اس بنا پر ہے کہ دنیوی تجارت میں محض نفع ہی کی امید نہیں ہوتی، گھاٹے اور دِیوالے تک کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو تجارت ایک مخلص بندہ اپنے خدا کے ساتھ کرتا ہے، اس میں کسی خسارے کا اندیشہ نہیں۔

۵۲ – یعنی مخلص اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اُس تنگ دل آقا کا سا نہیں ہے جو بات بات پر گرفت کرتا ہو اور ایک ذرا سی خطا پر اپنے ملازم کی ساری خدمتوں اور وفاداریوں پر پانی پھیر دیتا ہو۔ وہ فیّاض اور کریم آقا ہے۔ جو بندہ اس کا وفادار ہو، اس کی خطاؤں پر چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ بھی خدمت اس سے بَن آئی ہو اس کی قدر فرماتا ہے۔

۵۳ – مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی نرالی بات نہیں پیش کر رہی ہے جو پچھلے انبیاؑ کی لائی ہوئی تعلیمات کے خلاف ہو، بلکہ اسی اَزَلی و اَبَدی حق کو پیش کر رہی ہے جو ہمیشہ سے تمام انبیاؑ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔

۵۴ – اللہ کی ان صفات کو یہاں بیان کرنے کا مقصود اِس حقیقت پر مُتنبِّہ کرنا ہے کہ بندوں کے لیے خیر کس چیز میں

اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ
وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ
الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ

وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔[۵۵] اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی بیچ کی راس ہے، اور کوئی اللہ کے اِذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔[۵۶] ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے۔[۵۷] وہاں انھیں سونے کے کنگنوں اور

ہے، اور ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کیا اصول موزوں ہیں، اور کون سے ضابطے ٹھیک ان کی مَصلَحت کے مطابق ہیں، اِن اُمور کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، کیونکہ بندوں کی فطرت اور اس کے تقاضوں سے وہی باخبر ہے، اور ان کے حقیقی مَصالح پر وہی نگاہ رکھتا ہے۔ بندے خود اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتے جتنا ان کا خالق ان کو جانتا ہے۔ اس لیے حق وہی ہے اور وہی ہوسکتا ہے جو اس نے وحی کے ذریعے سے بتا دیا ہے۔

۵۵ – مراد ہیں مسلمان، جو پوری نوعِ انسانی میں سے چھانٹ کر نکالے گئے ہیں، تاکہ وہ کتاب اللہ کے وارث ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُسے لے کر اٹھیں۔ اگرچہ کتاب پیش تو کی گئی ہے سارے انسانوں کے سامنے، مگر جنھوں نے آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیا وہی اس شَرَف کے لیے منتخب کر لیے گئے کہ قرآن جیسی کتابِ عظیم کے وارث اور محمدِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رسولِ عظیم کی تعلیم و ہدایت کے امین بنیں۔

۵۶ – یعنی یہ مسلمان سب کے سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں، بلکہ یہ تین طبقوں میں تقسیم ہوگئے ہیں:

(۱) اپنے نفس پر ظلم کرنے والے: یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان داری کے ساتھ اللہ کا رسول تو مانتے ہیں، مگر عملاً کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اللہ کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے۔ مومن ہیں مگر گناہ گار ہیں۔ مجرم ہیں مگر باغی نہیں ہیں۔ ضعیف الایمان ہیں مگر منافق اور دل و دماغ سے کافر نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کو ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ہونے کے باوجود وارثینِ کتاب میں داخل اور خدا کے چُنے ہوئے بندوں میں شامل کیا گیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ باغیوں اور منافقوں اور قلب و ذہن کے کافروں پر ان اوصاف کا اِطلاق نہیں ہوسکتا۔ تینوں دَرجات میں سے اس درجے کے اہلِ ایمان کا ذکر سب سے پہلے اس لیے کیا گیا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے امت میں کثرت انھی کی ہے۔

(۲) بیچ کی راس: یہ وہ لوگ ہیں جو اس وراثت کا حق کم و بیش ادا تو کرتے ہیں مگر پوری طرح نہیں کرتے۔ فرماں بردار بھی ہیں اور خطا کار بھی۔ اپنے نفس کو بالکل بے لگام تو انھوں نے نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اسے خدا کا مطیع بنانے کی اپنی حد تک کوشش کرتے ہیں، لیکن کبھی یہ اس کی باگیں ڈھیلی بھی چھوڑ دیتے ہیں اور گناہوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اس طرح اِن کی زندگی اچھے

اور بُرے، دونوں طرح کے اعمال کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ یہ تعداد میں پہلے گروہ سے کم اور تیسرے گروہ سے زیادہ ہیں اس لیے ان کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

(۳) نیکیوں میں سبقت کرنے والے: یہ وارثینِ کتاب میں صفِ اوّل کے لوگ ہیں۔ یہی دراصل اِس وراثت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ یہ اتباعِ کتاب وسنت میں بھی پیش پیش ہیں، خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں بھی پیش پیش، دین حق کی خاطر قربانیاں کرنے میں بھی پیش پیش، اور بھلائی کے ہر کام میں پیش پیش۔ یہ دانستہ مَعصِیَت کرنے والے نہیں ہیں، اور نادانستہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر مُتَنَبِّہ ہوتے ہی ان کی پیشانیاں شرم سے عرق آلود ہو جاتی ہیں۔ ان کی تعداد اُمّت میں پہلے دونوں گروہوں سے کم ہے، اس لیے ان کا آخر میں ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وراثت کا حق ادا کرنے کے معاملے میں ان کو اوّلیّت کا شَرَف حاصل ہے۔

''یہی بہت بڑا فضل ہے۔'' اس فقرے کا تعلق اگر قریب ترین فقرے سے مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیکیوں میں سبقت کرنا ہی بڑا فضل ہے اور جو لوگ ایسے ہیں وہ اُمّتِ مسلمہ میں سب سے افضل ہیں۔ اور اس فقرے کا تعلق پہلے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ کتاب اللہ کا وارث ہونا اور اس وراثت کے لیے چُن لیا جانا بڑا فضل ہے، اور خدا کے تمام بندوں میں وہ بندے سب سے افضل ہیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اس انتخاب میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

۵۷ – مُفَسِّرین میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اس فقرے کا تعلق قریب ترین دونوں فقروں سے ہے، یعنی نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہی بڑی فضیلت رکھتے ہیں اور وہی اِن جنتوں میں داخل ہوں گے۔ رہے پہلے دو گروہ، تو ان کے بارے میں سکوت فرمایا گیا ہے تاکہ وہ اپنے انجام کے معاملے میں فکرمند ہوں اور اپنی موجودہ حالت سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ اس رائے کو علامہ زَمَخشَرِی نے بڑے زور کے ساتھ بیان کیا ہے اور امام رازیؒ نے اس کی تائید کی ہے۔

لیکن مفسرین کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ اس کا تعلق اُوپر کی پوری عبارت سے ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمّت کے یہ تینوں گروہ بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، خواہ مُحاسبے کے بغیر یا مُحاسبے کے بعد، خواہ ہر مواخذہ سے محفوظ رہ کر یا کوئی سزا پانے کے بعد۔ اسی تفسیر کی تائید قرآن کا سیاق وسباق کرتا ہے، کیونکہ آگے چل کر وارثینِ کتاب کے بِالمقابل دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنّم کی آگ ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے اس کتاب کو مان لیا ہے ان کے لیے جنت ہے اور جنھوں نے اس پر ایمان لانے سے انکار کیا ہے ان کے لیے جہنّم۔ پھر اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کرتی ہے جسے حضرت ابوالدّرداءؓ نے روایت کیا ہے اور امام احمدؒ، ابنِ جَرِیرؒ، ابنِ ابی حاتمؒ، طَبَرانیؒ، بَیہَقیؒ اور بعض دوسرے محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں:

فاما الذین سبقوا فاولٰئک الذین یدخلون الجنة بغیر حساب، وامّا الذینَ اقتصدوا فاولٰئک الذین یُحاسَبون حسابًا یسیرا، وامّا الذین ظلموا انفسھم فاولٰئک یُحبَسُون طول

جو لوگ نیکیوں میں سبقت لے گئے ہیں، وہ جنت میں کسی حساب کے بغیر داخل ہوں گے۔ اور جو بیچ کی راس رہے ہیں، ان سے مُحاسَبَہ ہوگا مگر ہلکا مُحاسَبَہ۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے، تو وہ محشر کے پورے طویل عرصے میں روک رکھے جائیں گے، پھر

مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٣٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ﴿٣٤﴾ۙ

موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا، وہاں ان کا لباس ریشم ہوگا، اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا[58]، یقیناً ہمارا رب معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے[59]،

المحشر ثم هم الذين يتلقّاهم الله برحمته فهم الذين يقولون الحمد لِلّٰه الذی اذهب عنا الحزن ۔

انھی کو اللہ اپنی رحمت میں لے لے گا، اور یہی لوگ ہیں جو کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔

اس حدیث میں حضورؐ نے اس آیت کی پوری تفسیر خود بیان فرما دی ہے اور اہلِ ایمان کے تینوں طبقوں کا انجام الگ الگ بتا دیا ہے۔ بیچ کی راس والوں سے ”ہلکا محاسبہ“ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو تو ان کے کفر کے علاوہ ان کے ہر ہر جرم اور گناہ کی جُداگانہ سزا بھی دی جائے گی، مگر اس کے برعکس اہلِ ایمان میں جو لوگ اچھے اور بُرے دونوں طرح کے اعمال لے کر پہنچیں گے ان کی نیکیوں اور ان کے گناہوں کا مجموعی محاسبہ ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہر نیکی کی الگ جزا اور ہر قصور کی الگ سزا دی جائے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اہلِ ایمان میں سے جن لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہوگا وہ محشر کے پورے عرصے میں روک رکھے جائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنّم میں نہیں ڈالے جائیں گے بلکہ ان کو ”تابرخاستِ عدالت“ کی سزا دی جائے گی، یعنی روزِ حشر کی پوری طویل مدّت (جو نہ معلوم کتنی صدیوں کے برابر طویل ہوگی) اُن پر اپنی ساری سختیوں کے ساتھ گزر جائے گی، یہاں تک کہ آخرکار اللہ ان پر رحم فرمائے گا اور خاتمۂ عدالت کے وقت حکم دے گا کہ اچھا، انھیں بھی جنت میں داخل کر دو۔ اِسی مضمون کے متعدّد اقوال محدثین نے بہت سے صحابہ، مثلاً حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عائشہ، حضرت ابوسعید خُدری اور حضرت براء ابنِ عازب رضی اللہ عنہم سے نقل کیے ہیں، اور ظاہر ہے کہ صحابہ ایسے معاملات میں کوئی بات اس وقت تک نہیں کہہ سکتے تھے جب تک انھوں نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو نہ سُنا ہو۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے ”اپنے نفس پر ظلم کیا ہے“، ان کے لیے صرف ”تابرخاستِ عدالت“ ہی کی سزا ہے اور اُن میں سے کوئی جہنم میں جائے گا ہی نہیں۔ قرآن اور حدیث میں متعدّد ایسے جرائم کا ذکر ہے جن کے مرتکب کو ایمان بھی جہنم میں جانے سے نہیں بچا سکتا۔ مثلاً جو مومن کسی مومن کو عمداً قتل کر دے اس کے لیے جہنم کی سزا کا اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرما دیا ہے۔ اسی طرح قانونِ وراثت کی خداوندی حُدود کو توڑنے والوں کے لیے بھی قرآنِ مجید میں جہنم کی وعید فرمائی گئی ہے۔ سُود کی حرمت کا حکم آ جانے کے بعد پھر سود خواری کرنے والوں کے لیے بھی صاف صاف اعلان فرمایا گیا ہے کہ وہ اصحاب النار ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اور کبائر کے مرتکبین کے لیے بھی احادیث میں تصریح ہے کہ وہ جہنّم میں جائیں گے۔

۵۸ – ہر قسم کا غم۔ دنیا میں جن فکروں اور پریشانیوں میں ہم مبتلا تھے ان سے بھی نجات ملی، عُقبیٰ میں اپنے انجام کی جو

الَّذِیْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا
یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقْضٰی
عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ
كَفُوْرٍ ۚ ﴿۳۶﴾ وَ هُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا
غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ
تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِیْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ ﴿۳۷﴾ ع

ع ۱۱ / ۱۲

جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھیرا دیا،[۶۰] اب یہاں نہ ہمیں کوئی مشقّت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے۔[۶۱]

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے[۶۲] اُن کے لیے جہنّم کی آگ ہے۔ نہ اُن کا قصّہ پاک کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ اُن کے لیے جہنّم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی۔ اِس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اُس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو۔ وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ ”اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں، اُن اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے۔“ (انھیں جواب دیا جائے گا:) ”کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟[۶۳] اور تمھارے پاس مُتنبّہ کرنے والا بھی آ چکا تھا۔ اب مزا چکھو۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے۔“ ع

فکر لاحق تھی وہ بھی ختم ہوئی، اور اب آگے چین ہی چین ہے، کسی رنج و اَلَم کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔

۵۹ – یعنی ہمارے قصور اُس نے معاف فرما دیے اور عمل کی جو تھوڑی سی پونجی ہم لائے تھے اس کی ایسی قدر فرمائی کہ اپنی جنت اس کے بدلے میں ہمیں عطا فرما دی۔

۶۰ – یعنی دنیا ہماری سفرِ حیات کی ایک منزل تھی جس سے ہم گزر آئے ہیں، اور میدانِ حشر بھی اس سفر کا ایک مرحلہ تھا جس سے ہم گزر لیے ہیں، اب ہم اُس جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے نکل کر پھر کہیں جانا نہیں ہے۔

۶۱ – بالفاظِ دیگر ہماری تمام محنتوں اور تکلیفوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب یہاں ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا پڑتا جس کے انجام دینے میں ہم کو مَشقَّت پیش آتی ہو اور جس سے فارغ ہو کر ہم تھک جاتے ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ۝۳۸ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ
فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے، وہ تو سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے[۶۴]۔ اب جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اُسی پر ہے[۶۵]، اور کافروں کو اُن کا کفر اِس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا

---

۶۲ – یعنی اس کتاب کو ماننے سے انکار کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔

۶۳ – اس سے مراد ہر وہ عمر ہے جس میں آدمی اس قابل ہو سکتا ہو کہ اگر وہ نیک و بد اور حق و باطل میں امتیاز کرنا چاہے تو کر سکے، اور گمراہی چھوڑ کر ہدایت کی طرف رُجوع کرنا چاہے تو کر سکے۔ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے اگر کوئی شخص مر چکا ہو تو اس آیت کی رُو سے اُس پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ البتہ جو اس عمر کو پہنچ چکا ہو وہ اپنے عمل کے لیے لازماً جواب دِہ قرار پائے گا، اور پھر اس عمر کے شروع ہو جانے کے بعد جتنی مدت بھی وہ زندہ رہے اور سنبھل کر راہِ راست پر آنے کے لیے جتنے مواقع بھی اسے ملتے چلے جائیں اتنی ہی اس کی ذمّہ داری شدید تر ہوتی چلی جائے گی، یہاں تک کہ جو شخص بڑھاپے کو پہنچ کر بھی سیدھا نہ ہو اس کے لیے کسی عذر کی گنجایش باقی نہ رہے گی۔ یہی بات ہے جو ایک حدیث میں حضرت ابو ہُریرہؓ اور حضرت سَہل بن سَعد ساعدی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمائی ہے کہ جو شخص کم عمر پائے اس کے لیے تو عذر کا موقع ہے، مگر ۶۰ سال اور اس سے اوپر عمر پانے والے کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ (بخاری، احمد، نَسائی، ابنِ جَریر اور ابنِ ابی حاتم وغیرہ)

۶۴ – اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس نے پچھلی نسلوں اور قوموں کے گزر جانے کے بعد اب تم کو اُن کی جگہ اپنی زمین میں بسایا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس نے تمھیں زمین میں تصرُّف کے جو اختیارات دیے ہیں وہ اس حیثیت سے نہیں ہیں کہ تم ان چیزوں کے مالک ہو، بلکہ اس حیثیت سے ہیں کہ تم اصل مالک کے خلیفہ ہو۔

۶۵ – اگر پہلے فقرے کا یہ مطلب لیا جائے کہ تم کو پچھلی قوموں کا جانشین بنایا ہے تو اس فقرے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جس نے گُزشتہ قوموں کے انجام سے کوئی سبق نہ لیا اور وہی کفر کا رویّہ اختیار کیا جس کی بدولت وہ قومیں تباہ ہو چکی ہیں، وہ اپنی اِس حماقت کا نتیجۂ بد دیکھ کر رہے گا۔ اور اگر اس فقرے کا مطلب یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے زمین میں اختیارات عطا کیے ہیں تو اس فقرے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جو اپنی حیثیتِ خلافت کو بھول کر خود مختار بن بیٹھا یا جس نے اصل مالک کو چھوڑ کر کسی اور کی بندگی اختیار کر لی وہ اپنی اِس باغیانہ رَوِش کا بُرا انجام دیکھ لے گا۔

إِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾ قُلْ
أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا
خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ۚ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا
فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا
غُرُورًا ﴿٤٠﴾ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَ

غضب اُن پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں۔

(اَے نبیؐ!) ان سے کہو: "کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے اُن شریکوں[۶۶] کو جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ، انھوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے؟" (اگر یہ نہیں بتا سکتے تو ان سے پُوچھو:) کیا ہم نے انھیں کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے اس شرک کے لیے) کوئی صاف سَنَد رکھتے[۶۷] ہوں؟ نہیں، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دیے جارہے ہیں۔[۶۸] حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے، اور

۶۶ – "اپنے شریک" کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا گیا ہے کہ درحقیقت وہ خدا کے شریک تو ہیں نہیں، مشرکین نے ان کو اپنے طور پر اُس کا شریک بنا رکھا ہے۔

۶۷ – یعنی کیا ہمارا لکھا ہوا کوئی پروانہ اِن کے پاس ایسا ہے جس میں ہم نے یہ تحریر کیا ہو کہ فلاں فلاں اشخاص کو ہم نے بیماروں کو تندرست کرنے، یا بے روزگاروں کو روزگار دلوانے، یا حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے اختیارات دیے ہیں، یا فلاں فلاں ہستیوں کو ہم نے اپنی زمین کے فلاں حصوں کا مختارِ کار بنا دیا ہے اور ان علاقوں کے لوگوں کی قسمتیں بنانا اور بگاڑنا اب اُن کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا ہمارے بندوں کو اب انھی سے دعائیں مانگنی چاہییں اور انھی کے حضور نذریں اور نیازیں چڑھانی چاہییں، اور جو نعمتیں بھی ملیں اُن پر انھی "چھوٹے خداؤں" کا شکر بجا لانا چاہیے۔ ایسی کوئی سند اگر تمھارے پاس ہے تو لاؤ اسے پیش کرو۔ اور اگر نہیں ہے تو خود ہی سوچو کہ یہ مشرکانہ عقائد اور اعمال آخر تم نے کس بنیاد پر ایجاد کر لیے ہیں۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ زمین اور آسمان میں کہیں تمھارے ان بناوٹی معبودوں کے شریکِ خدا ہونے کی کوئی علامت پائی جاتی ہے؟ تم اس کے جواب میں کسی علامت کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ خدا نے اپنی کسی کتاب میں یہ فرمایا ہے، یا تمھارے پاس یا اِن بناوٹی معبودوں کے پاس خدا کا دیا ہوا

لَئِنۡ زَالَتَاۤ اِنۡ اَمۡسَكَهُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
حَلِيۡمًا غَفُوۡرًا ﴿۴۱﴾ وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَهُمۡ
نَذِيۡرٌ لَّيَكُوۡنُنَّ اَهۡدٰى مِنۡ اِحۡدَى الۡاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ
نَذِيۡرٌ مَّا زَادَهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرَا ۙ﴿۴۲﴾ اسۡتِكۡبَارًا فِى الۡاَرۡضِ
وَمَكۡرَ السَّيِّـئِ ؕ وَلَا يَحِيۡقُ الۡمَكۡرُ السَّيِّـئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ ؕ فَهَلۡ

اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انھیں تھامنے والا نہیں ہے۔[69] بے شک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے۔[70]

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبر دار کرنے والا ان کے ہاں آ گیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہوتے۔[71] مگر جب خبر دار کرنے والا ان کے پاس آ گیا تو اس کی آمد نے اِن کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں اور زیادہ اِستکبار کرنے لگے اور بُری بُری چالیں چلنے لگے حالانکہ بُری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ

کوئی پروانہ ایسا موجود ہے جو اس امر کی شہادت دیتا ہو کہ خدا نے خود انھیں وہ اختیارات عطا فرمائے ہیں جو تم ان کی طرف منسوب کر رہے ہو؟ تم وہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اب آخر وہ چیز کیا ہے جس کی بنا پر تم اپنے یہ عقیدے بنائے بیٹھے ہو؟ کیا تم خدائی کے مالک ہو کہ خدا کے اختیارات جس جس کو چاہو بانٹ دو؟

۶۸ – یعنی یہ پیشوا اور پیر، یہ پنڈت اور پروہت، یہ کاہن اور واعظ، یہ مُجاوِر اور ان کے ایجنٹ محض اپنی دُکان چمکانے کے لیے عوام کو اُلّو بنا رہے ہیں اور طرح طرح کے قصے گھڑ گھڑ کر لوگوں کو یہ جھوٹے بھروسے دلا رہے ہیں کہ خدا کو چھوڑ کر فلاں فلاں ہستیوں کے دامن تھام لو گے تو دنیا میں تمھارے سارے کام بن جائیں گے اور آخرت میں تم چاہے کتنے ہی گناہ سمیٹ کر لے جاؤ، وہ اللہ سے تمھیں بخشوا لیں گے۔

۶۹ – یعنی یہ اتھاہ کائنات اللہ تعالیٰ کے قائم رکھنے سے قائم ہے۔ کوئی فرشتہ یا جنّ یا نبی یا ولی اس کو سنبھالے ہوئے نہیں ہے۔ کائنات کا سنبھالنا تو درکنار، یہ بے بس بندے تو اپنے وجود کو سنبھالنے پر بھی قادر نہیں۔ ہر ایک اپنی پیدائش اور اپنے بقا کے لیے ہر آن اللہ جَلَّ شانُہٗ کا محتاج ہے۔ ان میں سے کسی کے متعلق یہ سمجھنا کہ خدائی کی صفات اور اختیارات میں اس کا کوئی حصہ ہے، خالص حماقت اور فریب خوردگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْۤا
اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾ وَلَوْ
يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ

اِس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی اِن کے ساتھ بھی برتا جائے؟[۷۲] یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سُنّت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔ کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِنھیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقت ور تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر کہیں وہ لوگوں کو اُن کے کیے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی مُتنفِّس کو جیتا نہ چھوڑتا۔

۷۰ – یعنی یہ سراسر اللہ کا حِلم اور اس کی چشم پوشی ہے کہ اتنی بڑی گستاخیاں اس کی جناب میں کی جا رہی ہیں اور پھر بھی وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کر رہا ہے۔

۷۱ – یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت سے پہلے عرب کے لوگ عُموماً اور قُریش کے لوگ خُصوصاً یہود و نصاریٰ کی بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ اُن کے اس قول کا ذکر اس سے پہلے سورۂ انعام (آیات ۱۵۶-۱۵۷) میں بھی گزر چکا ہے اور آگے سورۂ صافّات (۱۶۷ تا ۱۶۹) میں بھی آ رہا ہے۔

۷۲ – یعنی اللہ کا یہ قانون اِن پر بھی جاری ہو جائے کہ جو قوم اپنے نبی کو جھٹلاتی ہے وہ تباہ کر کے رکھ دی جاتی ہے۔

وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ ع

ع ۵ ۱۷

مگر وہ انھیں ایک مقرر وقت تک کے لیے مُہلت دے رہا ہے۔ پھر جب ان کا وقت آن پُورا ہو گا تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا۔ ع

تفہیم القرآن

یٰسٓ

(۳۶)

یٰسٓین

نام

آغاز ہی کے دو حرفوں کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزُول

اندازِ بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول یا تو مکہ کے دَورِ متوسّط کا آخری زمانہ ہے، یا پھر یہ زمانۂ قیامِ مکہ کے آخری دَور کی سورتوں میں سے ہے۔

موضوع و مضمون

کلام کا مدّعا کفارِ قریش کو نبوتِ محمدیؐ پر ایمان نہ لانے اور ظلم واِستِہزاء سے اس کا مقابلہ کرنے کے انجام سے ڈرانا ہے۔ اس میں اِنذار کا پہلو غالب اور نمایاں ہے مگر بار بار انذار کے ساتھ اِستِدلال سے تفہیم بھی کی گئی ہے۔

استدلال تین اُمور پر کیا گیا ہے:

توحید پر آثارِ کائنات اور عقل عام سے،

آخرت پر آثارِ کائنات، عقلِ عام اور خود انسان کے اپنے وجود سے،

اور رسالتِ محمدیؐ کی صداقت پر اس بات سے کہ آپؐ تبلیغِ رسالت میں یہ ساری مَشقّت محض بے غَرَضانہ برداشت کر رہے تھے، اور اس امر سے کہ جن باتوں کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے وہ سراسر معقول تھیں اور انھیں قبول کرنے میں لوگوں کا اپنا بھلا تھا۔

اِس اِستِدلال کی قوت پر زَجر وتَوبیخ اور ملامت وتنبیہ کے مضامین نہایت زوردار طریقے سے بار بار ارشاد ہوئے ہیں، تاکہ دلوں کے قفل ٹوٹیں اور جن کے اندر قبولِ حق کی تھوڑی سی صلاحیت بھی ہو وہ مُتأثّر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

امام احمد، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ اور طَبَرانی وغیرہ نے مَعقِلؓ بن یَسار سے رِوایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یٰسٓ قلب القراٰن، یعنی یہ سورہ قرآن کا دل ہے۔ یہ اُسی طرح کی تشبیہ ہے جس طرح سورۂ فاتحہ کو اُمّ القرآن فرمایا گیا ہے۔ فاتحہ کو اُمّ القرآن قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اُس میں قرآنِ مجید کی پوری تعلیم کا خلاصہ آ گیا ہے۔ اور یٰسٓین کو قرآن کا دھڑکتا ہوا دل اس لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ قرآن کی دعوت کو نہایت پُرزور طریقے سے پیش کرتی ہے جس سے جمود ٹوٹتا اور روح میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

اِنھی حضرت مَعقِلؓ بن یَسار سے امام احمد، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ نے یہ رِوایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اقرءوا سورۃ یٰسٓ علی موتاکم "اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰسٓین پڑھا کرو"۔ اس کی مَصلَحت یہ ہے کہ مرتے وقت مسلمان کے ذہن میں نہ صرف یہ کہ تمام اسلامی عقائد تازہ ہو جائیں، بلکہ خُصوصیّت کے ساتھ اُس کے سامنے عالَمِ آخرت کا پورا نقشہ بھی آ جائے اور وہ جان لے کہ حیاتِ دنیا کی منزل سے گزر کر اب آگے کن منزلوں سے اس کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اس مصلحت کی تکمیل کے لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر عَرَبی داں آدمی کو سورۂ یٰسٓین سنانے کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی سُنا دیا جائے تاکہ تذکیر کا حق پوری طرح ادا ہو جائے۔

آیاتہا ۸۳ سُوْرَةُ يٰسٓ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳﴾ عَلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا

یٰسٓ[1]۔ قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو[2]، سیدھے راستے پر ہو، (اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے[3]، تاکہ تم خبردار کرو ایک ایسی قوم کو

۱ – ابنِ عباسؓ، عِکرمہؒ، ضحّاکؒ، حَسَن بصریؒ اور سُفیان بن عُیَیْنَہؒ کا قول ہے کہ اس کے معنٰی ہیں: ''اے انسان'' یا ''اے شخص''۔ اور بعض مفسرین نے اسے ''یا سیّد'' کا مخفف بھی قرار دیا ہے۔ اس تاویل کی رُو سے ان الفاظ کے مخاطَب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۲ – اس طرح کلام کا آغاز کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت میں کوئی شک تھا اور آپؐ کو یقین دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو یہ بات فرمانے کی ضرورت پیش آئی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کفارِ قریش پوری شدت کے ساتھ حضورؐ کی نبوت کا انکار کر رہے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے کسی تمہید کے بغیر تقریر کا آغاز ہی اس فقرے سے فرمایا کہ ''تم یقیناً رسولوں میں سے ہو''، یعنی وہ لوگ سخت غلط کار ہیں جو تمھاری نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ پھر اس بات پر قرآن کی قسم کھائی گئی ہے، اور قرآن کی صِفَت میں لفظِ ''حکیم'' استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے نبی ہونے کا کُھلا ہوا ثبوت یہ قرآن ہے جو سراسر حکمت سے لبریز ہے۔ یہ چیز خود شہادت دے رہی ہے کہ جو شخص ایسا حکیمانہ کلام پیش کر رہا ہے وہ یقیناً خدا کا رسول ہے۔ کوئی انسان ایسا کلام تصنیف کر لینے پر قادر نہیں ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو لوگ جانتے ہیں وہ ہرگز اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے کہ یہ کلام آپؐ خود گھڑ گھڑ کر لا رہے ہیں، یا کسی دوسرے انسان سے سیکھ سیکھ کر سنا رہے ہیں۔ (اِس مضمون کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حواشی ۲۰-۲۱-۲۲-۴۴-۴۵، بنی اسرائیل، ۱۰۴-۱۰۵۔ جلد سوم، النور، دیباچہ، الشعراء، حاشیہ ۱، النمل، حاشیہ ۹۳، القصص، ۶۲-۶۳-۶۴-۱۰۲ تا ۱۰۹، العنکبوت، ۸۸ تا ۹۱، الروم، تاریخی پَس منظر، حواشی ۱-۲-۳)

۳ – یہاں قرآن کے نازل کرنے والے کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ وہ غالب اور زبردست ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ رحیم ہے۔ پہلی صفت بیان کرنے سے مقصود اس حقیقت پر مُتنبّہ کرنا ہے کہ یہ قرآن کسی بے زور ناصح کی نصیحت نہیں ہے جسے تم نظر انداز کر دو تو تمھارا کچھ نہ بگڑے، بلکہ یہ اُس مالکِ کائنات کا فرمان ہے جو سب پر غالب ہے، جس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اور جس کی پکڑ سے بچ جانے کی قدرت کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اور دوسری صفت بیان کرنے سے مقصود یہ احساس دلانا ہے کہ یہ سراسر اس کی مہربانی ہے کہ اس نے تمھاری ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنا رسول بھیجا اور یہ کتابِ عظیم نازل کی، تاکہ تم گمراہیوں سے

مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝٦ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى
اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٧ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا
فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝٨ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ
اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ

جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔[۴]
اِن میں سے اکثر لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں، اسی لیے وہ ایمان نہیں لاتے۔[۵] ہم نے اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں، اس لیے وہ سر اُٹھائے کھڑے ہیں۔[۶] ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار اُن کے پیچھے۔ ہم نے انھیں ڈھانک دیا ہے، انھیں

بچ کر اُس راہِ راست پر چل سکو جس سے تمھیں دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل ہوں۔

۴ – اس آیت کے دو ترجمے ممکن ہیں۔ ایک وہ جو اُوپر مَتن میں کیا گیا ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم ڈراؤ ایک قوم کے لوگوں کو اُسی بات سے، جس سے ان کے باپ دادا ڈرائے گئے تھے، کیونکہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔" پہلا مطلب اگر لیا جائے تو باپ دادا سے مراد زمانۂ قریب کے باپ دادا ہوں گے، کیونکہ زمانۂ بعید میں تو عرب کی سرزمین میں متعدّد انبیاءؑ آ چکے تھے۔ اور دوسرا مطلب اختیار کرنے کی صورت میں مراد یہ ہوگی کہ قدیم زمانے میں جو پیغام انبیاءؑ کے ذریعے سے اس قوم کے آباو اَجداد کے پاس آیا تھا اس کی اب پھر تجدید کرو، کیونکہ یہ لوگ اسے فراموش کر گئے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں ترجموں میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے اور معنٰی کے لحاظ سے دونوں اپنی اپنی جگہ دُرست ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قوم کے اسلاف پر جو زمانہ ایسا گزرا تھا جس میں کوئی خبردار کرنے والا ان کے پاس نہیں آیا، اُس زمانے میں اپنی گمراہی کے وہ کس طرح ذمہ دار ہو سکتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی نبی دنیا میں بھیجتا ہے تو اس کی تعلیم و ہدایت کے اثرات دُور دُور تک پھیلتے ہیں اور نسلاً بعدَ نسلٍ چلتے رہتے ہیں۔ یہ آثار جب تک باقی رہیں اور نبی کے پیروؤں میں جب تک ایسے لوگ اُٹھتے رہیں جو ہدایت کی شمع روشن کرنے والے ہوں، اس وقت تک زمانے کو ہدایت سے خالی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور جب اس نبی کی تعلیم کے اثرات بالکل مٹ جائیں یا ان میں مکمل تحریف ہو جائے تو دوسرے نبی کی بِعثَت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت سے پہلے عرب میں حضرت ابراہیم و اسماعیل اور حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کی تعلیم کے اثرات ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگ اس قوم میں اٹھتے رہے تھے، یا باہر سے آتے رہے تھے جو ان اثرات کو تازہ کرتے رہتے تھے۔ جب یہ اثرات مٹنے کے قریب ہو گئے اور اصل تعلیم میں بھی تحریف ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو مبعوث فرما دیا اور

لَا يُبْصِرُوْنَ ۝٩ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ

اب انہیں کچھ نہیں سُوجھتا[7]۔ ان کے لیے یکساں ہے، تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، یہ نہ مانیں گے[8]۔ تم تو اُسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے۔

ایسا انتظام فرمایا کہ آپؐ کی ہدایت کے آثار نہ مٹ سکتے ہیں اور نہ مُحرَّف ہو سکتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۃ السجدہ، حاشیہ نمبر ۵)

۵ – یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے رہے تھے اور جنھوں نے طے کر لیا تھا کہ آپؐ کی بات بہر حال مان کر نہیں دینی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ''یہ لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اس لیے یہ ایمان نہیں لاتے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نصیحت پر کان نہیں دھرتے اور خدا کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعے سے اِتمامِ حُجّت ہو جانے پر بھی انکار اور حق دشمنی کی رَوِش ہی اختیار کیے چلے جاتے ہیں، ان پر خود ان کی اپنی شامتِ اعمال مسلط کر دی جاتی ہے اور پھر انھیں توفیقِ ایمان نصیب نہیں ہوتی۔ اسی مضمون کو آگے چل کر اس فقرے میں کھول دیا گیا ہے کہ ''تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے۔''

۶ – اس آیت میں ''طَوق'' سے مراد ان کی اپنی ہٹ دھرمی ہے جو ان کے لیے قبولِ حق میں مانع ہو رہی تھی۔ ''ٹھوڑیوں تک جکڑے جانے'' اور ''سر اُٹھائے کھڑے ہونے'' سے مراد وہ گردن کی اکڑ ہے جو تکبُّر اور نَخوَت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو ان کی گردن کا طَوق بنا دیا ہے، اور جس کِبر و نَخوَت میں یہ مبتلا ہیں اس کی وجہ سے ان کی گردنیں اس طرح اکڑ گئی ہیں کہ اب خواہ کوئی روشن سے روشن حقیقت بھی ان کے سامنے آ جائے، یہ اس کی طرف التفات کر کے نہ دیں گے۔

۷ – ایک دیوار آگے اور ایک پیچھے کھڑی کر دینے سے مراد یہ ہے کہ اسی ہٹ دھرمی اور اِستکبار کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ لوگ نہ پچھلی تاریخ سے کوئی سبق لیتے ہیں، اور نہ مستقبل کے نتائج پر کبھی غور کرتے ہیں۔ ان کے تعصُّبات نے ان کو ہر طرف سے اس طرح ڈھانک لیا ہے اور ان کی غلط فہمیوں نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیے ہیں کہ انھیں وہ کُھلے کُھلے حقائق نظر نہیں آتے جو ہر سلیم الطبع اور بے تعصب انسان کو نظر آ رہے ہیں۔

۸ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس حالت میں تبلیغ کرنا بے کار ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری تبلیغِ عام ہر طرح کے انسانوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اور کچھ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا ذکر آگے کی آیت میں آ رہا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں سے جب سابقہ پیش آئے اور تم دیکھ لو کہ وہ انکار و اِستکبار اور عناد و مخالفت پر جمے ہوئے ہیں تو ان کے پیچھے نہ پڑو۔ مگر ان کی اس رَوِش سے دل شکستہ و مایوس ہو کر اپنا کام چھوڑ بھی نہ بیٹھو، کیونکہ تمھیں نہیں معلوم کہ اسی ہجومِ خَلق کے درمیان وہ خدا کے بندے کہاں ہیں جو نصیحت قبول کرنے والے اور خدا سے ڈر کر راہِ راست پر آ جانے والے ہیں۔ تمھاری تبلیغ کا اصل مقصود اِسی دوسری قسم کے

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ⑪ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا
قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ⑫ ع
وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ⑬ ج

وقف غفران — ع ۱۸/۲ — وقف لازم

اُسے مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دے دو۔

ہم یقیناً ایک روز مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انھوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں، اور جو کچھ آثار انھوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں[9]۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کُھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔ ع

انھیں مثال کے طور پر اُس بستی والوں کا قصّہ سناؤ، جب کہ اُس میں رسول آئے تھے[10]۔

انسانوں کو تلاش کرنا اور انھیں چھانٹ چھانٹ کر نکال لینا ہے۔ ہٹ دھرموں کو چھوڑتے جاؤ، اور اس قیمتی متاع کو سمیٹتے چلے جاؤ۔

۹ – اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا نامۂ اعمال تین قسم کے اندراجات پر مشتمل ہے: ایک، یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی اچھا یا بُرا عمل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے۔ دوسرے، اپنے گردوپیش کی اشیا اور خود اپنے جسم کے اعضا پر جو نقوش (impressions) بھی انسان مُرتَسم کرتا ہے وہ سب کے سب ثبت ہو جاتے ہیں، اور یہ سارے نقوش ایک وقت اس طرح اُبھر آئیں گے کہ اس کی اپنی آواز سُنی جائے گی، اس کے اپنے خیالات اور نیتوں اور ارادوں کی پوری داستان اس کی لوحِ ذہن پر لکھی نظر آئے گی، اور اس کے ایک ایک اچھے اور بُرے فعل اور اس کی تمام حرکات وسکنات کی تصویریں سامنے آجائیں گی۔ تیسرے، اپنے مرنے کے بعد اپنی آیندہ نسل پر، اپنے معاشرے پر اور پوری انسانیت پر اپنے اچھے اور بُرے اعمال کے جو اثرات وہ چھوڑ گیا ہے وہ جس وقت تک اور جہاں جہاں تک کارفرما رہیں گے وہ سب اس کے حساب میں لکھے جاتے رہیں گے۔ اپنی اولاد کو جو بھی اچھی یا بُری تربِیَت اس نے دی ہے، اپنے معاشرے میں جو بھلائیاں یا برائیاں بھی اس نے پھیلائی ہیں، اور انسانیت کے حق میں جو پھول یا کانٹے بھی وہ بو گیا ہے ان سب کا پورا ریکارڈ اس وقت تک تیار کیا جاتا رہے گا جب تک اس کی لگائی ہوئی یہ فصل دنیا میں اپنے اچھے یا بُرے پھل لاتی رہے گی۔

۱۰ – قدیم مفسرین بالعموم اس طرف گئے ہیں کہ اس بستی سے مراد شام کا شہر انطاکیہ ہے اور جن رسولوں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے انھیں حضرت عیسیٰؑ نے تبلیغ کے لیے بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں قصّے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اُن میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں انطیخش اس علاقے کا بادشاہ تھا۔ لیکن یہ سارا قصہ ابنِ عباسؓ، قتادہؒ، عکرمہؒ، کعبِ احبارؒ اور وہبؒ بن مُنَبِّہ وغیرہ بزرگوں نے عیسائیوں کی غیر مستند روایات سے اخذ کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے بالکل بے بنیاد ہے۔ انطاکیہ میں سُلوقی خاندان (Seleucid Dynasty) کے ۱۳ بادشاہ انتیوکس (Antiochus) کے نام سے گزرے ہیں اور اس نام کے آخری فرماں روا

اِذۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡهِمُ اثۡنَیۡنِ فَكَذَّبُوۡهُمَا فَعَزَّزۡنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوۡۤا اِنَّاۤ
اِلَیۡكُمۡ مُّرۡسَلُوۡنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۙ وَمَاۤ اَنۡزَلَ

ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے اور انھوں نے دونوں کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے تیسرا مدد کے لیے بھیجا اور ان سب نے کہا: "ہم تمھاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں۔" بستی والوں نے کہا: "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان[11]، اور خدائے رحمٰن نے ہرگز

کی حکومت، بلکہ خود اس خاندان کی حکومت بھی ۶۵ قبلِ مسیح میں ختم ہوگئی تھی۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانے میں اَنطاکیہ سمیت شام و فلسطین کا پورا علاقہ رومیوں کے زیرِ نگیں تھا۔ پھر عیسائیوں کی کسی مستند روایت سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ خود حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنے حَواریوں میں سے کسی کو تبلیغ کے لیے اَنطاکیہ بھیجا ہو۔ اس کے برعکس بائبل کی کتابِ اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ صلیب کے چند سال بعد عیسائی مبلغین پہلی مرتبہ وہاں پہنچے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہو، نہ اللہ کے رسول نے مامور کیا ہو، وہ اگر بطورِ خود تبلیغ کے لیے نکلے ہوں تو کسی تاویل کی رُو سے بھی وہ اللہ کے رسول قرار نہیں پا سکتے۔ علاوہ بریں بائبل کے بیان کی رُو سے اَنطاکیہ پہلا شہر ہے جہاں کثرت سے غیر اسرائیلیوں نے دینِ مسیحؑ کو قبول کیا اور مسیحی کلیسا کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ حالانکہ قرآن جس بستی کا ذکر یہاں کر رہا ہے وہ کوئی ایسی بستی تھی جس نے رسولوں کی دعوت کو ردّ کر دیا اور بالآخر عذابِ الٰہی کی شکار ہوئی۔ تاریخ میں اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اَنطاکیہ پر ایسی کوئی تباہی نازل ہوئی ہو جسے انکارِ رسالت کی بنا پر عذاب قرار دیا جا سکتا ہو۔

ان وجوہ سے یہ بات ناقابلِ قبول ہے کہ اس بستی سے مراد انطاکیہ ہے۔ بستی کا تعین نہ قرآن میں کیا گیا ہے، نہ کسی صحیح حدیث میں، بلکہ یہ بات بھی کسی مستند ذریعے سے معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسول کون تھے اور کس زمانے میں بھیجے گئے تھے۔ قرآنِ مجید جس غرض کے لیے یہ قصّہ یہاں بیان کر رہا ہے اسے سمجھنے کے لیے بستی کا نام اور رسولوں کے نام معلوم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قصّے کے بیان کرنے کی غرض قریش کے لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ تم ہٹ دھرمی، تعصّب اور انکارِ حق کی اُسی روش پر چل رہے ہو جس پر اُس بستی کے لوگ چلے تھے، اور اسی انجام سے دوچار ہونے کی تیاری کر رہے ہو جس سے وہ دوچار ہوئے۔

۱۱ — دوسرے الفاظ میں ان کا کہنا یہ تھا کہ تم چونکہ انسان ہو اس لیے خدا کے بھیجے ہوئے رسول نہیں ہو سکتے۔ یہی خیال کفارِ مکہ کا بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول نہیں ہیں، کیونکہ وہ انسان ہیں:

وَقَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ (الفرقان: ۷)	وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔
وَاَسَرُّوا النَّجۡوَى ۖ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۖ	اور یہ ظالم لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○ (الانبیاء: ۳)

یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم جیسے ایک بشر کے سوا آخر اور کیا ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے اس جادو کے شکار ہو جاؤ گے؟

قرآنِ مجید کفارِ مکہ کے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ کوئی نئی جہالت نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ ان لوگوں سے ظاہر ہو رہی ہو، بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام جہلا اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو بشر ہے وہ رسول نہیں ہوسکتا اور جو رسول ہے وہ بشر نہیں ہوسکتا۔ قومِ نوحؑ کے سرداروں نے جب حضرت نوحؑ کی رسالت کا انکار کیا تھا تو یہی کہا تھا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚ (المومنون: ۲۴)

یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا، اور چاہتا ہے کہ تم پر اپنی فضیلت جمائے۔ حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا۔ ہم نے تو یہ بات کبھی اپنے باپ دادا سے نہیں سنی (کہ انسان رسول بن کر آئے)۔

قومِ عاد نے یہی بات حضرت ہودؑ کے متعلق کہی تھی:

هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۙ وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۙ (المومنون: ۳۳-۳۴)

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ کھاتا ہے وہی کچھ جو تم کھاتے ہو، اور پیتا ہے وہی کچھ جو تم پیتے ہو۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت کر لی تو تم بڑے گھاٹے میں رہے۔

قومِ ثمود نے حضرت صالحؑ کے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ:

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ (القمر: ۲۴)

کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی اختیار کر لیں؟

اور یہی معاملہ قریب قریب تمام انبیاؑ کے ساتھ پیش آیا کہ کفار نے کہا: اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا، ''تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر۔'' اور انبیاؑ نے ان کو جواب دیا کہ: اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ''واقعی ہم تمھاری طرح بشر کے سوا کچھ نہیں ہیں، مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے عنایت فرماتا ہے۔'' (ابراہیم: ۱۰-۱۱)

اس کے بعد قرآنِ مجید کہتا ہے کہ یہی جاہلانہ خیال ہر زمانے میں لوگوں کو ہدایت قبول کرنے سے باز رکھتا رہا ہے اور اسی بنا پر قوموں کی شامت آئی ہے:

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ

کیا اِنھیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنھوں نے اس سے پہلے کفر کیا تھا اور پھر اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور آگے ان کے لیے دردناک عذاب ہے؟ یہ سب کچھ

الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ
اِنَّاۤ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَ مَا عَلَیْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۷﴾

کوئی چیز نازل نہیں کی [۱۲] ہے، تم محض جھوٹ بولتے ہو۔''

رسولوں نے کہا: ''ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں، اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمّہ داری نہیں [۱۳] ہے۔''

بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا٘ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا (التغابن: ۶)

اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں لے کر آتے رہے مگر انھوں نے کہا: ''کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟'' اسی بنا پر انھوں نے کفر کیا اور منہ پھیر گئے۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۹۴)

لوگوں کے پاس جب ہدایت آئی تو کوئی چیز انھیں ایمان لانے سے روکنے والی اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے کہا: ''کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا؟''

پھر قرآنِ مجید پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ اللہ نے ہمیشہ انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی فرشتہ، یا بَشَرِیّت سے بالاتر کوئی ہستی:

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ۝ (الانبیاء: ۷-۸)

ہم نے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی کرتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ اور ہم نے ان کو ایسے جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ جینے والے تھے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَیَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ یَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ (الفرقان: ۲۰)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے تھے وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۹۵)

اے نبیؐ! ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ان پر فرشتے ہی کو رسول بنا کر نازل کرتے۔

قَالُوۡۤا اِنَّا تَطَيَّرۡنَا بِكُمۡ‌ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهُوۡا لَنَرۡجُمَنَّكُمۡ وَلَيَمَسَّنَّكُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوۡا طَآئِرُكُمۡ مَّعَكُمۡ‌ؕ اَئِنۡ ذُكِّرۡتُمۡ‌ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ

بستی والے کہنے لگے: "ہم تو تمھیں اپنے لیے فالِ بد سمجھتے ہیں[۱۴]۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے۔"

رسولوں نے جواب دیا: "تمھاری فالِ بد تو تمھارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے[۱۵]۔ کیا یہ باتیں تم اِس لیے کرتے ہو کہ تمھیں نصیحت کی گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے

۱۲ – یہ ایک اور جہالت ہے جس میں کفارِ مکہ بھی مبتلا تھے، آج کے نام نہاد عقلیّت پسند لوگ بھی مبتلا ہیں، اور قدیم ترین زمانے سے ہر زمانے کے منکرینِ وحی و رسالت اس میں مبتلا رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سرے سے انسانی ہدایت کے لیے کوئی وحی نازل نہیں کرتا۔ اس کو صرف عالَمِ بالا کے معاملات سے دلچسپی ہے۔ انسانوں کا معاملہ اس نے خود انسانوں ہی پر چھوڑ رکھا ہے۔

۱۳ – یعنی ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جو پیغام تم تک پہنچانے کے لیے ربّ العالمین نے ہمارے سُپرد کیا ہے وہ تمھیں پہنچا دیں۔ اس کے بعد تمھیں اختیار ہے کہ مانو یا نہ مانو۔ یہ ذمہ داری ہم پر نہیں ڈالی گئی ہے کہ تمھیں زبردستی منوا کر ہی چھوڑیں۔ اور اگر تم نہ مانو گے تو تمھارے کفر میں ہم نہیں پکڑے جائیں گے بلکہ اپنے اس جرم کی جواب دہی تم کو خود ہی کرنی پڑے گی۔

۱۴ – اس سے اُن لوگوں کا مطلب یہ تھا کہ تم ہمارے لیے منحوس ہو، تم نے آ کر ہمارے معبُودوں کے خلاف جو باتیں کرنی شروع کی ہیں، ان کی وجہ سے دیوتا ہم سے ناراض ہو گئے ہیں، اور اب جو آفت بھی ہم پر نازل ہو رہی ہے وہ تمھاری بدولت ہی ہو رہی ہے۔ ٹھیک یہی باتیں عرب کے کفار و منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کرتے تھے: وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ۔ "اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمھاری بدولت ہے۔" (النساء: ۷۸) اسی لیے قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر ان لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ ایسی ہی جاہلانہ باتیں قدیم زمانے کے لوگ بھی اپنے انبیاؑ کے متعلق کہتے رہے ہیں۔ قومِ ثمود اپنے نبی سے کہتی تھی: اطَّيَّرۡنَا بِكَ وَبِمَنۡ مَّعَكَ، "ہم نے تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو منحوس پایا ہے۔" (النمل: ۴۷) اور یہی رَوِیّہ فرعون کی قوم کا بھی تھا کہ فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ‌ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ۔ "جب ان پر اچھی حالت آتی تو کہتے کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے، اور اگر کوئی مصیبت اُن پر آ پڑتی تو اسے موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔" (الاعراف: ۱۳۱)

۱۵ – یعنی کوئی کسی کے لیے منحوس نہیں ہے۔ ہر شخص کا نَوِشتۂ تقدیر اس کی اپنی ہی گردن میں لٹکا ہوا ہے۔ بُرائی دیکھتا

قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَةِ رَجُلٌ یَّسۡعٰی
قَالَ یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا یَسۡـَٔلُکُمۡ
اَجۡرًا وَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۳ الجزء

وَمَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾

لوگ ہو۔[16]"

اِتنے میں شہر کے دُور دراز گوشے سے ایک شخص دَوڑتا ہوا آیا اور بولا: "اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی اختیار کر لو۔ پیروی کرو اُن لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں[17]۔ آخر کیوں نہ میں اُس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا[18] ہے؟

ہے تو اپنے نصیب کی دیکھتا ہے اور بھلائی دیکھتا ہے تو وہ بھی اس کے اپنے ہی نصیب کی ہوتی ہے۔ وَكُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیۡ عُنُقِهٖ، "ہر شخص کا پروانۂ خیر و شر ہم نے اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے۔" (بنی اسرائیل: ۱۳)

۱۶- یعنی دراصل تم بھلائی سے بھاگنا چاہتے ہو اور ہدایت کے بجائے گمراہی تمھیں پسند ہے، اس لیے حق اور باطل کا فیصلہ دلیل سے کرنے کے بجائے اَوہام و خُرافات کے سہارے یہ بہانے بازیاں کر رہے ہو۔

۱۷- اس ایک فقرے میں اُس بندۂ خدا نے نبوت کی صداقت کے سارے دلائل سمیٹ کر رکھ دیے۔ ایک نبی کی صداقت دو ہی باتوں سے جانچی جاسکتی ہے: ایک، اس کا قول و فعل۔ دوسرے، اس کا بے غرض ہونا۔ اس شخص کے اِستِدلال کا منشا یہ تھا کہ اوّل تو یہ لوگ سراسر معقول بات کہہ رہے ہیں اور ان کی اپنی سیرت بالکل بے داغ ہے۔ دوسرے، کوئی شخص اس بات کی نشان دہی نہیں کر سکتا کہ اس دین کی دعوت یہ اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر دے رہے ہیں۔ اس کے بعد کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان کی بات کیوں نہ مانی جائے۔ اس شخص کا یہ استدلال نقل کر کے قرآنِ مجید نے لوگوں کے سامنے ایک معیار رکھ دیا کہ نبی کی نبوت کو پرکھنا ہو تو اِس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل بتا رہا ہے کہ وہ راہِ راست پر ہیں۔ اور پھر ان کی سَعی و جُہد کے پیچھے کسی ذاتی غرض کا بھی نام و نشان تک نہیں ہے۔ پھر کوئی معقول انسان اُن کی بات کو رَدّ آخر کس بنیاد پر کرے گا۔

۱۸- اس فقرے کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ اِستِدلال کا شاہکار ہے، اور دوسرے حصے میں حکمتِ تبلیغ کا کمال دکھایا گیا ہے۔ پہلے حصّے میں وہ کہتا ہے کہ خالق کی بندگی کرنا تو سراسر عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ نامعقول بات اگر کوئی ہے تو وہ یہ کہ آدمی اُن کی بندگی کرے جنھوں نے اسے پیدا نہیں کیا ہے، نہ یہ کہ وہ اس کا بندہ بن کر رہے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ دوسرے حصّے میں وہ اپنی قوم کے لوگوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ مرنا آخر تم کو بھی ہے، اور اُسی خدا کی طرف جانا ہے جس کی بندگی اختیار کرنے پر تمھیں اعتراض

ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ
شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّیْۤ
اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ
قَوْمِیْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾

کیا میں اُسے چھوڑ کر دوسرے معبُود بنالوں؟ حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ اُن کی شفاعت میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھُڑا ہی سکتے ہیں۔[19] اگر میں ایسا کروں[20] تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں تو تمھارے رب پر ایمان[21] لے آیا، تم بھی میری بات مان لو۔"

(آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور) اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ "داخل ہو جا جنّت میں۔"[22] اُس نے کہا: "کاش! میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی اور مجھے باعزّت لوگوں میں داخل فرمایا۔"[23]

ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اس سے منہ موڑ کر تم کس بھلائی کی توقع کر سکتے ہو۔

۱۹ – یعنی نہ وہ خدا کے ایسے چہیتے ہیں کہ میں صریح جرم کروں اور وہ محض اُن کی سِفارِش پر مجھے معاف کر دے۔ اور نہ ان کے اندر اتنا زور ہے کہ خدا مجھے سزا دینا چاہے اور وہ اپنے بَل بُوتے پر مجھے چھڑا لے جائیں۔

۲۰ – یعنی یہ جانتے ہوئے بھی اگر میں ان کو معبُود بناؤں۔

۲۱ – اس فقرے میں پھر حکمتِ تبلیغ کا ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ یہ کہہ کر اُس شخص نے اُن لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ جس رب پر میں ایمان لایا ہوں وہ محض میرا ہی رب نہیں ہے بلکہ تمھارا رب بھی ہے۔ اس پر ایمان لا کر میں نے غَلَطی نہیں کی ہے بلکہ اس پر ایمان نہ لا کر تم ہی غلطی کر رہے ہو۔

۲۲ – یعنی شہادت نصیب ہوتے ہی اس شخص کو جنت کی بشارت دے دی گئی۔ جونہی کہ وہ موت کے دروازے سے گزر کر دوسرے عالَم میں پہنچا، فرشتے اس کے استقبال کو موجود تھے اور انھوں نے اسے خوشخبری دے دی کہ فردوسِ بَریں اس کی منتظر ہے۔ اس فقرے کی تاویل میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ قَتادَہؒ کہتے ہیں کہ "اللہ نے اسی وقت اسے جنت میں داخل کر دیا اور وہ وہاں زندہ ہے، رزق پا رہا ہے۔" اور مُجاہدؒ کہتے ہیں کہ "یہ بات ملائکہ نے اس سے بشارت کے طور پر کہی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بعد جب تمام اہلِ ایمان جنت میں داخل ہوں گے تو وہ بھی اُن کے ساتھ داخل ہو گا۔"

وَ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا
مُنۡزِلِيۡنَ ﴿٢٨﴾ اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ خٰمِدُوۡنَ ﴿٢٩﴾
يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ ۚ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ
يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿٣٠﴾ اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ اَنَّهُمۡ
اِلَيۡهِمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿٣١﴾ وَ اِنۡ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ﴿٣٢﴾ ع

وقف غفران

ع ٢

اس کے بعد اُس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اُتارا۔ ہمیں لشکر بھیجنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ بس ایک دھماکا ہوا اور یکا یک وہ سب بُجھ کر رہ گئے۔[24] افسوس بندوں کے حال پر! جو رسول بھی ان کے پاس آیا، اس کا وہ مذاق ہی اُڑاتے رہے۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے؟[25] ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے۔ ع

٢٣ – یہ اُس مردِ مومن کے کمالِ اَخلاق کا ایک نمونہ ہے۔ جن لوگوں نے اسے ابھی ابھی قتل کیا تھا اُن کے خلاف کوئی غصہ اور جذبۂ انتقام اس کے دل میں نہ تھا کہ وہ اللہ سے ان کے حق میں بددعا کرتا۔ اس کے بجائے وہ اب بھی ان کی خیر خواہی کیے جا رہا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے دل میں اگر کوئی تمنّا پیدا ہوئی تو وہ بس یہ تھی کہ کاش! میری قوم میرے اِس انجام نیک سے باخبر ہو جائے اور میری زندگی سے نہیں تو میری موت ہی سے سبق لے کر راہِ راست اختیار کر لے۔ وہ شریف انسان اپنے قاتلوں کے لیے بھی جہنّم نہ چاہتا تھا بلکہ یہ چاہتا تھا کہ وہ ایمان لا کر جنت کے مستحق بنیں۔ اسی کی تعریف کرتے ہوئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ نصح قومه حيًا وميتًا ''اس شخص نے جیتے جی بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور مر کر بھی۔''

اس واقعے کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو در پردہ اس حقیقت پر مُتنبّہ فرمایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان بھی اُسی طرح تمھارے سچے خیر خواہ ہیں جس طرح وہ مردِ مومن اپنی قوم کا خیر خواہ تھا۔ یہ لوگ تمھاری تمام ایذا رسانیوں کے باوجود تمھارے خلاف کوئی ذاتی عِناد اور کوئی جذبۂ انتقام نہیں رکھتے۔ ان کو دشمنی تم سے نہیں بلکہ تمھاری گمراہی سے ہے۔ یہ تم سے صرف اس لیے لڑ رہے ہیں کہ تم راہِ راست پر آ جاؤ۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

یہ آیت بھی من جملہ اُن آیات کے ہے جن سے حیاتِ بَرزخ کا صریح ثبوت ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد سے قیامت تک کا زمانہ خالص عَدم اور کامل نیستی کا زمانہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض کم علم لوگ گمان کرتے ہیں، بلکہ اس زمانے میں

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا
فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا
فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ
اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا

اِن[۲۶] لوگوں کے لیے بے جان زمین ایک نشانی ہے[۲۷]۔ ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلّہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں۔ ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے، تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔ یہ سب کچھ اِن کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے[۲۸]۔ پھر کیا یہ شکرادا نہیں کرتے[۲۹]؟ پاک ہے وہ ذات[۳۰] جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ

جسم کے بغیر روح زندہ رہتی ہے، کلام کرتی اور کلام سنتی ہے، جذبات و احساسات رکھتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے، اور اہلِ دنیا کے ساتھ بھی اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مرنے کے بعد اس مردِ مومن کو جنت کی بشارت کیسے دی جاتی اور وہ اپنی قوم کے لیے یہ تمنا کیسے کرتا کہ کاش وہ اس کے انجام نیک سے باخبر ہو جائے۔

۲۴ – ان الفاظ میں ایک لطیف طنز ہے۔ اپنی طاقت پر اُن کا گھمنڈ اور دینِ حق کے خلاف ان کا جوش و خروش گویا ایک شعلۂ جوّالا تھا جس کے متعلق اپنے زعم میں وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ان تینوں انبیا اور ان پر ایمان لانے والوں کو بھسم کر ڈالے گا۔ لیکن اس شعلے کی بساط اس سے زیادہ کچھ نہ نکلی کہ خدا کے عذاب کی ایک ہی چوٹ نے اس کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔

۲۵ – یعنی ایسے مٹے کہ ان کا کہیں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ جو گرا پھر نہ اٹھا۔ دنیا میں آج کوئی ان کا نام لیوا تک نہیں ہے۔ ان کی تہذیب اور ان کے تمدّن ہی کا نہیں، ان کی نسلوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

۲۶ – پچھلے دو رُکوعوں میں کفارِ مکہ کو انکار و تکذیب اور مخالفتِ حق کے اس رویے پر ملامت کی گئی تھی جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔ اب تقریر کا رُخ اُس بنیادی نزاع کی طرف پھرتا ہے جو اُن کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کشمکش کی اصل وجہ تھی، یعنی توحید و آخرت کا عقیدہ، جسے حضورؐ پیش کر رہے تھے اور کفار ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں پے در پے چند دلائل دے کر لوگوں کو دعوتِ غور و فکر دی جا رہی ہے کہ دیکھو، کائنات کے یہ آثار جو عَلانیہ تمھاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، کیا اُس حقیقت کی صاف صاف نشان دہی نہیں کرتے جسے یہ نبی تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے؟

۲۷ – یعنی اس امر کی نشانی کہ توحید ہی حق ہے اور شرک سراسر بے بنیاد ہے۔

۲۸ – اس فقرے کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے: ''تاکہ یہ کھائیں اُس کے پھل اور وہ چیزیں جو ان کے اپنے ہاتھ بناتے ہیں''، یعنی وہ مصنوعی غذائیں جو قدرتی پیداوار سے یہ لوگ خود تیار کرتے ہیں، مثلاً روٹی، سالن، مُربّے، اچار، چٹنیاں اور بے شمار دوسری چیزیں۔

۲۹ – ان مختصر فقروں میں زمین کی روئیدگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آدمی شب و روز اس زمین کی پیداوار کھا رہا ہے اور اپنے نزدیک اِسے ایک معمولی بات سمجھتا ہے۔ لیکن اگر وہ غفلت کا پردہ چاک کر کے نگاہِ غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ اس فرشِ خاک سے لہلہاتی کھیتیوں اور سرسبز باغوں کا اُگنا اور اس کے اندر چشموں اور نہروں کا رواں ہونا کوئی کھیل نہیں ہے جو آپ سے آپ ہوئے جا رہا ہو بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت و قدرت اور ربوبیت کارفرما ہے۔ زمین کی حقیقت پر غور کیجیے، جن مادّوں سے یہ مرکّب ہے اُن کے اندر بجائے خود کسی نَشو و نُما کی طاقت نہیں ہے۔ یہ سب مادّے فرداً فرداً بھی اور ہر ترکیب و آمیزش کے بعد بھی بالکل غیر نامی ہیں اور اس بنا پر ان کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بے جان زمین کے اندر سے نباتی زندگی کا ظہور آخر کیسے ممکن ہوا؟ اس کی تحقیق آپ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ چند بڑے بڑے اسباب ہیں جو اگر پہلے فراہم نہ کر دیے گئے ہوتے تو یہ زندگی سرے سے وجود میں نہ آ سکتی تھی:

اوّلاً، زمین کے مخصوص خِطّوں میں اس کی اوپری سطح پر بہت سے ایسے مادّوں کی تہ چڑھائی گئی جو نباتات کی غذا بننے کے لیے موزوں ہو سکتے تھے اور اس تہ کو نرم رکھا گیا تاکہ نباتات کی جڑیں اس میں پھیل کر اپنی غذا چوس سکیں۔

ثانیاً، زمین پر مختلف طریقوں سے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا گیا تاکہ غذائی مادّے اس میں تحلیل ہو کر اس قابل ہو جائیں کہ نباتات کی جڑیں ان کو جذب کر سکیں۔

ثالثاً، اُوپر کی فضا میں ہوا پیدا کی گئی جو آفاتِ سماوی سے زمین کی حفاظت کرتی ہے، جو بارش لانے کا ذریعہ بنتی ہے، اور اپنے اندر وہ گیسیں بھی رکھتی ہے جو نباتات کی زندگی اور ان کے نَشو و نُما کے لیے درکار ہیں۔

رابعاً، سورج اور زمین کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا کہ نباتات کو مناسب درجۂ حرارت اور موزوں موسم مل سکیں۔

یہ چار بڑے بڑے اسباب (جو بجائے خود بے شمار ضمنی اسباب کا مجموعہ ہیں) جب پیدا کر دیے گئے تب نباتات کا وجود میں آنا ممکن ہوا۔ پھر یہ سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد نباتات پیدا کیے گئے اور ان میں سے ہر ایک کا تخم ایسا بنایا گیا کہ جب اسے مناسب زمین، پانی، ہوا اور موسم میسر آئے تو اس کے اندر نباتی زندگی کی حرکت شروع ہو جائے۔ مزید برآں اسی تخم میں یہ انتظام بھی کر دیا گیا کہ ہر نَوع کے تخم سے لازماً اسی نَوع کا بُوٹا اپنی تمام نوعی اور موروثی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہو۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید کاریگری یہ کی گئی کہ نباتات کی دس بیس یا سو پچاس نہیں بلکہ بے حد و حساب قِسمیں پیدا کی گئیں اور ان کو اس طرح بنایا گیا کہ وہ اُن بے شمار اقسام کے حیوانات اور بنی آدم کی غذا، دوا، لباس، اور اَن گنت دوسری ضرورتوں کو پورا کر سکیں جنھیں نباتات کے بعد زمین پر وجود میں لایا جانے والا تھا۔

اس حیرت انگیز انتظام پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اگر ہٹ دھرمی اور تعصّب میں مبتلا نہیں ہے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ نہیں ہوسکتا۔ اس میں صریح طور پر ایک حکیمانہ منصوبہ کام کر رہا ہے جس کے تحت زمین، پانی، ہوا

تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

زمین کی نباتات میں سے ہوں، یا خود اِن کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے، یا اُن اشیا میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔[۳۱]

اور موسم کی مناسبتیں نباتات کے ساتھ، اور نباتات کی مناسبتیں حیوانات اور انسانوں کی حاجات کے ساتھ انتہائی نزاکتوں اور باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قائم کی گئی ہیں۔ کوئی ہوش مند انسان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسی ہمہ گیر مناسبتیں محض اتفاقی حادثہ کے طور پر قائم ہو سکتی ہیں۔ پھر یہی انتظام اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ بہت سے خداؤں کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک ہی ایسے خدا کا انتظام ہے اور ہو سکتا ہے جو زمین، ہوا، پانی، سورج، نباتات، حیوانات اور نوعِ انسانی، سب کا خالق و رب ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے خدا الگ الگ ہوتے تو آخر کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا جامع، ہمہ گیر اور گہری حکیمانہ مناسبتیں رکھنے والا منصوبہ بن جاتا اور لاکھوں کروڑوں برس تک اتنی باقاعدگی کے ساتھ چلتا رہتا۔

توحید کے حق میں یہ اِستِدلال پیش کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ؟ یعنی کیا یہ لوگ ایسے احسان فراموش اور نمک حرام ہیں کہ جس خدا نے یہ سب کچھ سروسامان ان کی زندگی کے لیے فراہم کیا ہے، اس کے یہ شکر گزار نہیں ہوتے اور اس کی نعمتیں کھا کھا کر دوسروں کے شکریے ادا کرتے ہیں؟ اس کے آگے نہیں جھکتے اور ان جھوٹے معبودوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جنھوں نے ایک تنکا بھی اِن کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟

۳۰ — یعنی ہر شائبۂ نَقص و عیب سے پاک، ہر غلطی اور کمزوری سے پاک، اور اس بات سے پاک کہ کوئی اس کا شریک و سہیم ہو۔ مشرکین کے عقائد کی تردید کرتے ہوئے بالعُموم قرآنِ مجید میں یہ الفاظ اس لیے استعمال کیے جاتے ہیں کہ شرک کا ہر عقیدہ اپنی حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر کسی نہ کسی نَقص اور کسی نہ کسی کمزوری اور عیب کا الزام ہے۔ اللہ کے لیے شریک تجویز کرنے کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ ایسی بات کہنے والا دراصل یہ سمجھتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ تنہا اپنی خدائی کا کام چلانے کے قابل نہیں ہے، یا وہ مجبور ہے کہ اپنی خدائی میں کسی دوسرے کو شریک کرے، یا کچھ دوسری ہستیاں آپ سے آپ ایسی طاقت ور ہیں کہ وہ خدائی کے نظام میں دخل دے رہی ہیں اور خدا ان کی مداخلت برداشت کر رہا ہے، یا معاذ اللہ! وہ انسانی بادشاہوں کی سی کمزوریاں رکھتا ہے جن کی بنا پر وزیروں، درباریوں، منہ چڑھے مُصاحبوں، اور چہیتے شہزادوں اور شہزادیوں کا ایک لشکر کا لشکر اسے گھیرے ہوئے ہے اور خدائی کے بہت سے اختیارات ان کے درمیان بٹ کر رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ جاہلانہ تصوّرات اگر ذہنوں میں موجود نہ ہوتے تو سرے سے شرک کا خیال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں جگہ جگہ یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن تمام عُیوب ونقائص اور کمزوریوں سے پاک اور مُنزَّہ ہے جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

۳۱ — یہ توحید کے حق میں ایک اور استدلال ہے، اور یہاں پھر پیش پاافتادہ حقائق ہی میں سے بعض کو لے کر بتایا جا رہا ہے کہ شب و روز جن اشیا کا تم مشاہدہ کرتے اور یونہی غور و خوض کیے بغیر گزر جاتے ہو انھی کے اندر حقیقت کا سراغ دینے والے نشانات موجود ہیں۔ عورت اور مرد کا جوڑ تو خود انسان کا اپنا سببِ پیدایش ہے۔ حیوانات کی نسلیں بھی نر و مادہ کے اِزدِواج سے

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ
تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ؕ﴿۳۸﴾

اِن کے لیے ایک اَور نشانی رات ہے، ہم اُس کے اُوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو اِن پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ۳۲ اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ ۳۳ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ اور

چل رہی ہیں۔ نباتات کے متعلق بھی انسان جانتا ہے کہ اُن میں تزویج کا اُصول کام کر رہا ہے۔ حتّٰی کہ بے جان مادّوں تک میں مختلف اشیا جب ایک دوسرے سے جوڑ کھاتی ہیں تب کہیں اُن سے طرح طرح کے مرکبات وجود میں آتے ہیں۔ خود مادّے کی بنیادی ترکیب منفی اور مثبت برقی توانائی کے اِرتباط سے ہوئی ہے۔ یہ تزویج، جس کی بدولت یہ ساری کائنات وجود میں آئی ہے، حکمت و صنّاعی کی ایسی باریکیاں اور پیچیدگیاں رکھتی ہے اور اس کے اندر ہر دو زوجین کے درمیان ایسی مناسبتیں پائی جاتی ہیں کہ بے لاگ عقل رکھنے والا کوئی شخص نہ تو اس چیز کو ایک اتفاقی حادثہ کہہ سکتا ہے اور نہ یہ مان سکتا ہے کہ مختلف خداؤں نے ان بے شمار اَزواج کو پیدا کر کے ان کے درمیان اس حکمت کے ساتھ جوڑ لگائے ہوں گے۔ اَزواج کا ایک دوسرے کے لیے جوڑ ہونا اور ان کے اِزدِواج سے نئی چیزوں کا پیدا ہونا خود وحدتِ خالق کی صریح دلیل ہے۔

۳۲- رات اور دن کی آمد و رفت بھی انھی پیش پا اُفتادہ حقائق میں سے ہے جنھیں انسان محض اس بنا پر کہ وہ معمولاً دنیا میں پیش آ رہے ہیں، کسی التفات کا مستحق نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اگر وہ اس بات پر غور کرے کہ دن کیسے گزرتا ہے اور رات کس طرح آتی ہے، اور دن کے جانے اور رات کے آنے میں کیا حکمتیں کارفرما ہیں تو اسے خود محسوس ہو جائے کہ یہ ایک ربِّ قدیر و حکیم کے وجود اور اس کی یکتائی کی روشن دلیل ہے۔ دن کبھی نہیں جا سکتا اور رات کبھی نہیں آ سکتی جب تک زمین کے سامنے سے سورج نہ ہٹے۔ دن کے ہٹنے اور رات کے آنے میں جو انتہائی باقاعدگی پائی جاتی ہے وہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ سورج اور زمین کو ایک ہی اٹل ضابطے نے جکڑ رکھا ہو۔ پھر اس رات اور دن کی آمد و رفت کا جو گہرا تعلق زمین کی مخلوقات کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ کسی نے یہ نظام کمال درجے کی دانائی کے ساتھ بالارادہ قائم کیا ہے۔ زمین پر انسان اور حیوان اور نباتات کا وجود، بلکہ یہاں پانی اور ہوا اور مختلف معدنیات کا وجود بھی دراصل نتیجہ ہے اس بات کا کہ زمین کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے، اور پھر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ زمین کے مختلف حصّے تسلسل کے ساتھ مقرر وقفوں کے بعد سورج کے سامنے آتے اور اس کے سامنے سے ہٹتے رہیں۔ اگر زمین کا فاصلہ سورج سے بہت کم یا بہت زیادہ ہوتا، یا اس کے ایک حصّے پر ہمیشہ رات رہتی اور دوسرے حصّے پر ہمیشہ دن رہتا، یا شب و روز کا اُلٹ پھیر بہت تیز یا بہت سُست ہوتا، یا بے قاعدگی کے ساتھ اچانک کبھی دن نکل آتا اور کبھی رات چھا جاتی، تو ان تمام صورتوں میں اس کُرے پر کوئی زندگی ممکن نہ ہوتی، بلکہ غیر زندہ مادّوں کی شکل و ہیئت بھی موجودہ شکل سے بہت مختلف ہوتی۔ دل کی آنکھیں بند نہ ہوں تو آدمی اس نظام کے اندر ایک ایسے خدا کی کارفرمائی صاف دیکھ سکتا ہے جس نے اس زمین پر اس خاص قسم کی مخلوقات کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور ٹھیک ٹھیک اس کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کے درمیان یہ نسبتیں قائم کیں۔

وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾ لَا
الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ

چاند، اُس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کردی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سُوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے[۳۴]۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے[۳۵] اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے[۳۶]۔

خدا کا وجود اور اس کی توحید اگر کسی شخص کے نزدیک بعید از عقل ہے تو وہ خود ہی سوچ کر بتائے کہ اس کاریگری کو بہت سے خداؤں کی طرف منسوب کرنا، یا یہ سمجھنا کہ کسی اندھے بہرے قانونِ فطرت کے تحت یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا ہے، کس قدر عقل سے بعید ہونا چاہیے۔ کسی ثبوت کے بغیر محض قیاس و گمان کی بنیاد پر جو شخص یہ دوسری سراسر نامعقول توجیہات مان سکتا ہے وہ جب یہ کہتا ہے کہ کائنات میں نظم اور حکمت اور مقصدیت کا پایا جانا خدا کے ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہے تو ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ شخص کسی نظریّے یا عقیدے کو قبول کرنے کے لیے کسی درجے میں بھی، کافی یا ناکافی، عقلی ثبوت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

۳۳- ٹھکانے سے مراد وہ جگہ بھی ہو سکتی ہے جہاں جا کر سورج کو آخرِ کار ٹھیر جانا ہے اور وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب وہ ٹھیر جائے گا۔ اس آیت کا صحیح مفہوم انسان اسی وقت متعین کر سکتا ہے، جب کہ اسے کائنات کے حقائق کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو جائے۔ لیکن انسانی علم کا حال یہ ہے کہ وہ ہر زمانے میں بدلتا رہا ہے اور آج جو کچھ اسے بظاہر معلوم ہے اس کے بدل جانے کا ہر وقت امکان ہے۔ سورج کے متعلق قدیم زمانے کے لوگ عینی مشاہدے کی بنا پر یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ پھر مزید تحقیق و مشاہدہ کے بعد یہ نظریّہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جگہ ساکن ہے اور نظامِ شمسی کے سیّارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہ نظریّہ بھی مستقل ثابت نہ ہوا۔ بعد کے مشاہدات سے پتا چلا کہ نہ صرف سورج، بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثوابت (fixed stars) کہا جاتا ہے، ایک رخ پر چلے جا رہے ہیں۔ ثوابت کی رفتار کا اندازہ ۱۰ سے لے کر ۱۰۰ میل فی سیکنڈ تک کیا گیا ہے۔ اور سورج کے متعلق موجودہ زمانے کے ماہرینِ فلکیات کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظامِ شمسی کو لیے ہوئے ۲۰ کلومیٹر (تقریباً ۱۲ میل) فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، لفظ ''اِسٹار'' اور لفظ ''سَن'')

۳۴- یعنی مہینے کے دَوران میں چاند کی گردش ہر روز بدلتی رہتی ہے۔ ایک دن وہ ہِلال بن کر طُلوع ہوتا ہے پھر روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدرِ کامل بن جاتا ہے۔ اِس کے بعد روز گھٹتا چلا جاتا ہے حتّٰی کہ آخرِ کار پھر اپنی ابتدائی ہِلالی شکل پر واپس پہنچ جاتا ہے۔ یہ چکر لاکھوں برس سے پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے اور چاند کی ان مقرر منزلوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اسی وجہ سے انسان حساب لگا کر ہمیشہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کس روز چاند کس منزل میں ہوگا۔ اگر اس کی حرکت کسی ضابطے کی پابند نہ ہوتی تو یہ حساب لگانا ممکن نہ ہوتا۔

۳۵- اس فقرے کے دو مطلب لیے جا سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک، یہ کہ سورج میں یہ طاقت نہیں ہے کہ چاند کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے، یا خود اس کے مدار میں داخل ہو کر اس سے جا ٹکرائے۔ دوسرا، یہ کہ جو اوقات چاند کے طلوع و ظہور کے لیے

وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي

سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔[۳۷]

اِن کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے اِن کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں

مقرر کردیے گئے ہیں اُن میں سورج کبھی نہیں آ سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ رات کو چاند چمک رہا ہو اور یکایک سورج اُفق پر آ جائے۔

۳۶ – یعنی ایسا بھی کبھی نہیں ہوتا کہ دن کی مقررہ مدّت ختم ہونے سے پہلے رات آ جائے اور جو اوقات دن کی روشنی کے لیے مقرر ہیں، اُن میں وہ اپنی تاریکیاں لیے ہوئے یکایک آ موجود ہو۔

۳۷ – فَلَکٌ کا لفظ عربی زبان میں سیاروں کے مدار (orbit) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم سَمَاء (آسمان) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ یہ ارشاد کہ ”سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں“، چار حقیقتوں کی نشان دِہی کرتا ہے: ایک، یہ کہ نہ صرف سورج اور چاند، بلکہ تمام تارے اور سیّارے اور اَجرامِ فلکی متحرک ہیں۔ دوسرے، یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا فلک، یعنی ہر ایک کی حرکت کا راستہ یا مدار الگ ہے۔ تیسرے، یہ کہ افلاک تاروں کو لیے ہوئے گردش نہیں کر رہے ہیں بلکہ تارے افلاک میں گردش کر رہے ہیں۔ اور چوتھے، یہ کہ افلاک میں تاروں کی حرکت اس طرح ہو رہی ہے جیسے کسی سیّال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہو۔

ان آیات کا اصل مقصد علمِ ہیئت کے حقائق بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لے کر آسمان تک جدھر بھی وہ نگاہ ڈالے گا اس کے سامنے خدا کی ہستی اور اس کی یکتائی کے بے حد وحساب دلائل آئیں گے اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دَہریّت اور شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی۔ ہماری یہ زمین جس نظامِ شمسی میں شامل ہے اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز، سورج زمین سے ۳ لاکھ گنا بڑا ہے، اور اس کے بعید ترین سیّارے نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم ۲ ارب ۷۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ بلکہ اگر پلُوٹو کو بعید ترین سیّارہ مانا جائے تو وہ سورج سے ۴ ارب ۶۰ کروڑ میل دُور تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظامِ شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس کہکشاں (galaxy) میں ہمارا یہ نظامِ شمسی شامل ہے اس میں تقریباً ۳ ہزار ملین (تین ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں، اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ۴ سال صَرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً ۲۰ لاکھ لولبی سحابیوں (spiral nebulae) میں سے ایک ہے، اور ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی ۱۰ لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ رہے بعید ترین اجرامِ فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں، ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں ۱۰ کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا سا حصّہ ہے جو اب تک انسانی مشاہدے میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائعِ مشاہدہ فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔

الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ
نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ
مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ

سوار کر دیا،[۳۸] اور پھر اِن کے لیے ویسی ہی کشتیاں اَور پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔[۳۹] ہم چاہیں تو اِن کو غرق کر دیں، کوئی اِن کی فریاد سننے والا نہ ہو اور کسی طرح یہ نہ بچائے جاسکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انھیں پار لگاتی اور ایک وقتِ خاص تک زندگی سے مُتَمَتِّع ہونے کا موقع دیتی ہے۔[۴۰]

اِن لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اُس انجام سے جو تمھارے آگے آرہا ہے

تمام معلومات جو اس وقت تک کائنات کے متعلق بہم پہنچی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا عالَم اِسی مادّے سے بنا ہوا ہے جس سے ہماری یہ چھوٹی سی ارضی دنیا بنی ہے اور اس کے اندر وہی ایک قانون کام کر رہا ہے جو ہماری زمین کی دنیا میں کارفرما ہے، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم اس زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دُور دراز دنیاؤں کے مُشاہَدے کرتے اور ان کے فاصلے ناپتے اور ان کی حرکات کے حساب لگاتے۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ہی خدا کی تخلیق اور ایک ہی فرماں روا کی سلطنت ہے؟ پھر جو نظم، جو حکمت، جو صَنّاعی اور جو مناسبت اِن لاکھوں کہکشانوں اور ان کے اندر گھومنے والے اربوں تاروں اور سیّاروں میں پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر کیا کوئی صاحبِ عقل انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو گیا ہے؟ اس نظم کے پیچھے کوئی ناظم، اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم، اس صنعت کے پیچھے کوئی صانع، اور اس مناسبت کے پیچھے کوئی منصوبہ ساز نہیں ہے؟

۳۸ – بھری ہوئی کشتی سے مراد ہے حضرت نوحؑ کی کشتی۔ اور نسلِ انسانی کو اُس پر سوار کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کشتی میں بظاہر تو حضرت نوحؑ کے چند ساتھی ہی بیٹھے ہوئے تھے مگر درحقیقت قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان اس پر سوار تھے۔ کیوں کہ طوفانِ نوحؑ میں ان کے سوا باقی پوری اولادِ آدم کو غرق کر دیا گیا تھا اور بعد کی انسانی نسل صرف انھی کشتی والوں سے چلی۔

۳۹ – اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ تاریخ میں پہلی کشتی جو بنی وہ حضرت نوحؑ والی کشتی تھی۔ اُس سے پہلے انسان کو دریاؤں اور سمندروں کے عُبور کرنے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔ اس طریقے کی تعلیم سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو دی۔ اور جب اُن کی بنائی ہوئی کشتی پر سوار ہو کر اللہ کے کچھ بندے طوفان سے بچ نکلے تو آیندہ ان کی نسل نے بحری سفروں کے لیے کشتیاں بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۴۰ – پچھلی نشانیوں کا ذکر دلائلِ توحید کی حیثیت سے کیا گیا تھا، اور اِس نشانی کا ذکر یہ احساس دلانے کے لیے

وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ
اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا
مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ
لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾

اور تمھارے پیچھے گزر چکا ہے[۴۱]، شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سُنی اَن سُنی کر جاتے ہیں)۔ اِن کے سامنے اِن کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے یہ اس کی طرف اِلتفات نہیں کرتے[۴۲]۔ اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمھیں عطا کیا ہے اُس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرو تو یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں: ''کیا ہم اُن کو کھلائیں جنھیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو[۴۳]۔''

فرمایا گیا ہے کہ انسان کو فطرت کی طاقتوں پر تصرُّف کے جو اختیارات بھی حاصل ہیں وہ اللہ کے دیے ہوئے ہیں، اُس کے اپنے حاصل کیے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ان طاقتوں پر تصرف کے جو طریقے اس نے دریافت کیے ہیں وہ بھی اللہ کی رہنمائی سے اس کے علم میں آئے ہیں، اس کے اپنے معلوم کیے ہوئے نہیں ہیں۔ انسان کا اپنا بل بُوتا یہ نہ تھا کہ اپنے زور سے وہ اِن عظیم طاقتوں کو مسخر کرتا اور نہ اس میں یہ صلاحیت تھی کہ خود اَسرارِ فطرت کا پتا چلا لیتا اور ان قوتوں سے کام لینے کے طریقے جان سکتا۔ پھر جن قوتوں پر بھی اللہ نے اس کو اقتدار عطا کیا ہے اُن پر اس کا قابو اسی وقت تک چلتا ہے جب تک اللہ کی مرضی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے لیے مسخر رہیں۔ ورنہ جب مرضیِ الٰہی کچھ اور ہوتی ہے تو وہی طاقتیں جو انسان کی خدمت میں لگی ہوتی ہیں، اچانک اس پر پلٹ پڑتی ہیں اور آدمی اپنے آپ کو ان کے سامنے بالکل بے بس پاتا ہے۔ اس حقیقت پر مُتنبِّہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بحری سفر کے معاملے کو محض بطورِ نمونہ پیش کیا ہے۔ نوعِ انسانی پوری کی پوری طوفان میں ختم ہو جاتی اگر اللہ تعالیٰ کشتی بنانے کا طریقہ حضرت نوحؑ کو نہ سُجھا دیتا اور اُن پر ایمان لانے والے لوگ اس میں سوار نہ ہو جاتے۔ پھر نوعِ انسانی کے لیے تمام رُوئے زمین پر پھیلنا اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ اللہ سے کشتی سازی کے اُصولوں کا علم پا کر لوگ دریاؤں اور سمندروں کو عُبور کرنے کے لائق ہو گئے۔ مگر اُس ابتدا سے چل کر آج کے عظیم الشان جہازوں کی تعمیر تک انسان نے جتنی کچھ ترقی کی ہے اور جہاز رانی کے فن میں جتنا کچھ بھی کمال حاصل کیا ہے اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دریا اور سمندر، سب اس کے قابو میں آ گئے ہیں اور ان پر اسے مکمل غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ آج بھی خدا کا پانی خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور جب وہ چاہتا ہے انسان کو اُس کے جہازوں سمیت اس میں غرق کر دیتا ہے۔

۴۱ – یعنی جو تم سے پہلے کی قومیں دیکھ چکی ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا
صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً
وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ

[۴۴] یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پُوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو[۴۵]۔" دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھما کا ہے جو یکایک اِنھیں عین اُس حالت میں دھر لے گا جب یہ (اپنے دُنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے، اور اُس وقت یہ وصیّت تک نہ کرسکیں گے، نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے[۴٦]۔ ع پھر ایک صُور پھُونکا جائے گا اور یکایک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے

۴۲ – آیات سے مراد کتاب اللہ کی آیات بھی ہیں جن کے ذریعے سے انسانوں کو نصیحت کی جاتی ہے، اور وہ آیات بھی مراد ہیں جو آثارِ کائنات اور خود انسان کے وجود اور اس کی تاریخ میں موجود ہیں جو انسان کو عبرت دلاتی ہیں، بشرطیکہ وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو۔

۴۳ – اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کفر نے صرف ان کی عقل ہی اندھی نہیں کی ہے بلکہ ان کی اَخلاقی حس کو بھی مُردہ کر دیا ہے۔ وہ نہ خدا کے بارے میں صحیح تفکُّر سے کام لیتے ہیں، نہ خلق کے ساتھ صحیح طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ان کے پاس ہر نصیحت کا الٹا جواب ہے۔ ہر گمراہی اور بداَخلاقی کے لیے ایک اَوندھا فلسفہ ہے۔ ہر بھلائی سے فرار کے لیے ایک گھڑا گھڑایا بہانہ موجود ہے۔

۴۴ – توحید کے بعد دوسرا مسئلہ جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان نزاع برپا تھی وہ آخرت کا مسئلہ تھا۔ اس کے متعلق عقلی دلائل تو آگے چل کر خاتمۂ کلام پر دیے گئے ہیں، مگر دلائل دینے سے پہلے یہاں اس مسئلے کو لے کر عالَمِ آخرت کا ایک عبرتناک نقشہ اُن کے سامنے کھینچا گیا ہے تاکہ انھیں یہ معلوم ہو کہ جس چیز کا وہ انکار کر رہے ہیں وہ ان کے انکار سے ٹلنے والی نہیں ہے، بلکہ لامحالہ ایک روز اِن حالات سے انھیں دوچار ہونا ہے۔

۴۵ – اس سوال کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ لوگ فی الواقع قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے، اور اگر مثلاً ان کو یہ بتا دیا جاتا کہ وہ فُلاں سنہ میں فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو پیش آئے گی تو ان کا شک رفع ہو جاتا اور وہ اسے مان لیتے۔ دراصل اس طرح کے سوالات وہ محض کج بحثی کے لیے چیلنج کے انداز میں کرتے تھے اور اُن کا مدّعا یہ کہنا تھا کہ کوئی قیامت ویامت نہیں آنی ہے، تم خواہ مخواہ ہمیں اس کے ڈراوے دیتے ہو۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ قیامت فلاں روز آئے گی، بلکہ انھیں یہ بتایا گیا کہ وہ آئے گی اور اس شان سے آئے گی۔

مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ
مَّرْقَدِنَا ۜٚ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ
كَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

وقف لازم
وقف غفران
وقف منزل

کے لیے اپنی قبروں سے نکل پڑیں[۴۷] گے۔ گھبرا کر کہیں گے: "ارے، یہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اُٹھا کھڑا کیا؟"[۴۸] ـــــ "یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچّی تھی"[۴۹]۔ ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔

۴۶ ـ یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ قیامت آہستہ آہستہ آرہی ہے اور لوگ دیکھ رہے ہیں کہ وہ آرہی ہے۔ بلکہ وہ اس طرح آئے گی کہ لوگ پورے اطمینان کے ساتھ اپنی دنیا کے کاروبار چلا رہے ہیں اور ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ تصور موجود نہیں ہے کہ دنیا کے خاتمے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ اس حالت میں اچانک ایک زور کا کڑاکا ہوگا اور جو جہاں تھا وہیں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

حدیث میں حضرت عبداللہ بن عَمْروؓ اور حضرت ابو ہُریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ لوگ راستوں پر چل رہے ہوں گے، بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہوں گے، اپنی مجلسوں میں بیٹھے گفتگوئیں کر رہے ہوں گے۔ ایسے میں یکایک صُور پھونکا جائے گا۔ کوئی کپڑا خرید رہا تھا تو ہاتھ سے کپڑا رکھنے کی نوبت نہ آئے گی کہ ختم ہو جائے گا۔ کوئی اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لیے حوض بھرے گا اور ابھی پلانے نہ پائے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔ کوئی کھانا کھانے بیٹھے گا اور لقمہ اُٹھا کر منہ تک لے جانے کی بھی اسے مہلت نہ ملے گی۔

۴۷ ـ صُور کے متعلق تفصیلی کلام کے لیے مُلاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸۔ پہلے صُور اور دوسرے صُور کے درمیان کتنا زمانہ ہوگا، اس کے متعلق کوئی معلومات ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ زمانہ سیکڑوں اور ہزاروں برس طویل ہو۔ حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اسرافیلؑ صُور پر منہ رکھے عرش کی طرف دیکھ رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب پھونک مارنے کا حکم ہوتا ہے۔ یہ صور تین مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلا نفخة الفَزَع، جو زمین و آسمان کی ساری مخلوق کو سہما دے گا۔ دوسرا نفخة الصَّعق جسے سنتے ہی سب ہلاک ہو کر گر جائیں گے۔ پھر جب اللہ واحد صمد کے سوا کوئی باقی نہ رہے گا تو زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی اور اسے عُکاظی بِساط کی طرح ایسا سپاٹ کر دیا جائے گا کہ اس میں کوئی ذرا سی سَلوٹ تک نہ رہے گی۔ پھر اللہ اپنی خلق کو بس ایک جھڑکی دے گا جسے سنتے ہی ہر شخص جس جگہ مر کر گرا تھا اسی جگہ وہ اس بدلی ہوئی زمین پر اٹھ کھڑا ہوگا، اور یہی نفخة القیام لربّ العالمین ہے۔ اسی مضمون کی تائید قرآنِ مجید کے بھی متعدد اشارات سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حواشی ۵۶ ـ ۵۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۸۲ ـ ۸۳۔

۴۸ ـ یعنی اُس وقت انھیں یہ احساس نہ ہوگا کہ وہ مر چکے تھے اور اب ایک مدتِ دراز کے بعد دوبارہ زندہ کر کے

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ
اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ
عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾
سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾
اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ

آج کسی[۵۰] پر ذرّہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور تمھیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے عمل تم کرتے رہے تھے ـــــ آج جنّتی لوگ مزے کرنے میں مشغول ہیں[۵۱]، وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں مَسندوں پر تکیے لگائے ہوئے، ہر قسم کی لذیذ چیزیں کھانے پینے کو ان کے لیے وہاں موجود ہیں، جو کچھ وہ طلب کریں اُن کے لیے حاضر ہے، ربِّ رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے ـــــ اور اَے مجرمو! آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ[۵۲]۔ آدم کے بچو! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمھارا

اٹھائے گئے ہیں، بلکہ وہ اس خیال میں ہوں گے کہ ہم سوئے پڑے تھے، اب یکایک کسی خوفناک حادثے کی وجہ سے ہم جاگ اٹھے ہیں اور بھاگے جا رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۱۸، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸)

۴۹ – یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ جواب دینے والا کون ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ دیر بعد خود انھی لوگوں کی سمجھ میں معاملے کی اصل حقیقت آجائے اور وہ آپ ہی اپنے دلوں میں کہیں کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ تو وہی چیز ہے جس کی خبر خدا کے رسول ہمیں دیتے تھے اور ہم اسے جھٹلایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہلِ ایمان ان کی غلط فہمی رفع کریں اور ان کو بتائیں کہ یہ خواب سے بیداری نہیں بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جواب قیامت کا پورا ماحول ان کو دے رہا ہو، یا فرشتے ان کو حقیقتِ حال سے مُطّلع کریں۔

۵۰ – یہ وہ خطاب ہے جو اللہ تعالیٰ کفار و مشرکین اور فُسّاق و مجرمین سے اُس وقت فرمائے گا جب وہ اُس کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔

۵۱ – اس کلام کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ صالح اہلِ ایمان میدانِ حشر میں روک کر نہیں رکھے جائیں گے بلکہ ابتدا ہی میں ان کو بلا حساب، یا ہلکی حساب فہمی کے بعد جنت میں بھیج دیا جائے گا، کیونکہ ان کا ریکارڈ صاف ہوگا۔ انھیں دَورانِ عدالت میں انتظار کی تکلیف دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں جواب دِہی کرنے والے

وقف غفران

عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝٦٠ وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝٦١

کُھلا دشمن ہے، اور میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے؟[۵۳]

مجرموں کو بتائے گا کہ دیکھو، جن صالح لوگوں کو تم دنیا میں بے وقوف سمجھ کر ان کا مذاق اُڑاتے تھے، وہ اپنی عقلمندی کی بدولت آج جنت کے مزے لُوٹ رہے ہیں، اور تم جو اپنے آپ کو بڑا زِیرک و فرزانہ سمجھ رہے تھے، یہاں کھڑے اپنے جرائم کی جواب دِہی کر رہے ہو۔

۵۲ – اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ مومنین صالحین سے الگ ہو جاؤ، کیونکہ دنیا میں چاہے تم ان کی قوم اور ان کے کنبے اور برادری کے لوگ رہے ہو، مگر یہاں اب تمھارا ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں ہے۔ اور دوسرا مفہوم یہ کہ تم آپس میں الگ الگ ہو جاؤ۔ اب تمھارا کوئی جتّھا قائم نہیں رہ سکتا۔ تمھاری سب پارٹیاں توڑ دی گئیں۔ تمھارے تمام رشتے اور تعلقات کاٹ دیے گئے۔ تم میں سے ایک ایک شخص کو اب تنہا اپنی ذاتی حیثیت میں اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔

۵۳ – یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے ”عبادت“ کو اطاعت کے معنیٰ میں استعمال فرمایا ہے۔ ہم اس سے پہلے تفہیم القرآن میں متعدّد مقامات پر اس مضمون کی تشریح کر چکے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ: ۱۷۰ النساء، حاشیہ ۱۴۵، الانعام، حاشیہ ۸۷-۱۰۷۔ جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱، ابراہیم، حاشیہ ۳۲۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۰۔ مریم: حاشیہ ۲۷، القصص، حاشیہ ۸۶۔ جلد چہارم، سورۂ سبا، حاشیہ ۶۳) اس سلسلہ میں وہ نفیس بحث بھی قابلِ مُلاحظہ ہے جو اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ کے معنیٰ ہیں: لَا تُطِيْعُوْهُ (اس کی اطاعت نہ کرو۔) اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کو محض سجدہ کرنا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کرنا بھی ممنوع ہے۔ لہٰذا طاعت عبادت ہے۔“ اس کے بعد امام صاحب یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر عبادت بمعنیٰ طاعت ہے تو کیا آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ میں ہم کو رسول اور اُمرا کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے؟ پھر اس سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ: ”ان کی اطاعت، جب کہ اللہ کے حکم سے ہو تو وہ اللہ ہی کی عبادت اور اسی کی اطاعت ہوگی۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ملائکہ نے اللہ کے حکم سے آدم کو سجدہ کیا اور یہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ تھی۔ امرا کی اطاعت ان کی عبادت صرف اُس صورت میں ہوگی جب کہ ایسے معاملات میں اُن کی اطاعت کی جائے جن میں اللہ نے ان کی اطاعت کا اِذن نہیں دیا ہے۔“ پھر فرماتے ہیں: ”اگر کوئی شخص تمھارے سامنے آئے اور تمھیں کسی چیز کا حکم دے تو دیکھو کہ اس کا یہ حکم اللہ کے حکم کے موافق ہے یا نہیں۔ موافق نہ ہو تو شیطان اس شخص کے ساتھ ہے۔ اگر اس حالت میں تم نے اس کی اطاعت کی تو تم نے اس کی اور اس کے شیطان کی عبادت کی۔ اسی طرح اگر تمھارا نفس تمھیں کسی کام کے کرنے پر اُکسائے تو دیکھو کہ شرع کی رُو سے وہ کام کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اجازت نہ ہو تو تمھارا نفس خود شیطان ہے یا شیطان اس کے ساتھ ہے۔ اگر تم نے اس کی پیروی کی تو تم اس کی عبادت کے مرتکب ہوئے۔“ آگے چل کر وہ پھر فرماتے ہیں: ”مگر شیطان کی عبادت کے مراتب مختلف ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کرتا ہے اور اس کے اعضا کے ساتھ اس کی زبان بھی اس کی مُوافقت کرتی ہے اور دل بھی اس میں شریک ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اعضا و جوارح سے تو آدمی ایک کام

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾
هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ
اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

مگر اس کے باوجود اس نے تم میں سے ایک گروہِ کثیر کو گمراہ کر دیا۔[۵۴] کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے؟ یہ وہی جہنّم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا۔ جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اُس کی پاداش میں اب اِس کا ایندھن بنو۔

آج ہم اِن کے منہ بند کیے دیتے ہیں، اِن کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔[۵۵]

کرتا ہے مگر دل اور زبان اس کام میں شریک نہیں ہوتے۔ بعض لوگ ایک گناہ کا ارتکاب اس حال میں کرتے ہیں کہ دل اُن کا اس پر راضی نہیں ہوتا اور زبان ان کی اللہ سے مغفرت کر رہی ہوتی ہے اور وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم یہ بُرا کام کر رہے ہیں۔ یہ محض ظاہری اعضا سے شیطان کی عبادت ہے۔ کچھ اور لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ٹھنڈے دل سے جرم کرتے ہیں اور زبان سے بھی اپنے اس فعل پر خوشی و اطمینان کا اظہار کرتے ہیں...... یہ ظاہر و باطن دونوں میں شیطان کے عابد ہیں۔" (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۰۳-۱۰۴)

۵۴ – یعنی اگر تم عقل سے محروم رکھے گئے ہوتے اور پھر اپنے رب کو چھوڑ کر اپنے دشمن کی بندگی کرتے تو تمھارے لیے عذر کی کوئی گنجایش تھی۔ لیکن تمھارے پاس تو خدا کی دی ہوئی عقل موجود تھی جس سے تم اپنی دنیا کے سارے کام چلا رہے تھے، اور تمھیں خدا نے پیغمبروں کے ذریعے سے مُتنبّہ بھی کر دیا تھا۔ اس پر بھی جب تم اپنے دشمن کے فریب میں آئے اور وہ تمھیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اپنی اس حماقت کی ذمّہ داری سے تم کسی طرح بَری نہیں ہو سکتے۔

۵۵ – یہ حکم اُن ہیکڑ مجرموں کے معاملے میں دیا جائے گا جو اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کریں گے، گواہیوں کو بھی جھٹلا دیں گے، اور نامۂ اعمال کی صحّت بھی تسلیم نہ کریں گے۔ تب اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ اچھا، اپنی بکواس بند کرو، اور دیکھو کہ تمھارے اپنے اعضائے بدن تمھارے کرتوتوں کی کیا روداد سناتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں صرف ہاتھوں اور پاؤں کی شہادت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ مگر دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں، ان کے کان، ان کی زبانیں اور ان کے جسم کی کھالیں بھی پوری داستان سنا دیں گی کہ وہ ان سے کیا کام لیتے رہے ہیں: يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ

وَ لَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰۤی اَعۡیُنِہِمۡ فَاسۡتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی
یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۶۶﴾ وَ لَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰہُمۡ عَلٰی مَکَانَتِہِمۡ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا
مُضِیًّا وَّ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۶۷﴾ ع وَ مَنۡ نُّعَمِّرۡہُ نُنَکِّسۡہُ فِی الۡخَلۡقِ ؕ اَفَلَا

ہم چاہیں تو اِن کی آنکھیں مُوند دیں، پھر یہ راستے کی طرف لپک کر دیکھیں، کہاں سے اِنھیں راستہ سُجھائی دے گا؟ ہم چاہیں تو اِنھیں اِن کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر کے رکھ دیں کہ یہ نہ آگے چل سکیں نہ پیچھے پلٹ سکیں۔[56] ع جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں، اس کی ساخت کو ہم اُلٹ ہی دیتے ہیں،[57] کیا (یہ حالات دیکھ کر)

وَاَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ۔ (النور، آیت ۲۴) حَتّٰۤی اِذَا مَا جَآءُوۡهَا شَهِدَ عَلَيۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَاَبۡصَارُهُمۡ وَجُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (حٰمٓ السجدہ، آیت ۲۰) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کے منہ بند کر دیں گے، اور دوسری طرف سورۂ نور کی آیت میں فرماتا ہے کہ ان کی زبانیں گواہی دیں گی، اِن دونوں باتوں میں تطابُق کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ منہ بند کر دینے سے مراد ان کا اختیارِ کلام سلب کر لینا ہے، یعنی اس کے بعد وہ اپنی زبان سے اپنی مرضی کے مطابق بات نہ کر سکیں گے۔ اور زبانوں کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ ان کی زبانیں خود یہ داستان سنانا شروع کر دیں گی کہ ہم سے اِن ظالموں نے کیا کام لیا تھا، کیسے کیسے کفر بکے تھے، کیا کیا جھوٹ بولے تھے، کیا کیا فتنے برپا کیے تھے، اور کس کس موقع پر انھوں نے ہمارے ذریعے سے کیا باتیں کی تھیں۔

۵۶ – قیامت کا نقشہ کھینچنے کے بعد اب انھیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ قیامت تو خیر تمھیں دُور کی چیز نظر آتی ہے، مگر ذرا ہوش میں آ کر دیکھو کہ خود اِس دنیا میں، جس کی زندگی پر تم پھولے ہوئے ہو، تم کس طرح اللہ کے دستِ قدرت میں بے بس ہو۔ یہ آنکھیں جن کی بینائی کے طفیل تم اپنی دنیا کے سارے کام چلا رہے ہو، اللہ کے ایک اشارے سے اندھی ہو سکتی ہیں۔ یہ ٹانگیں جن کے بل پر تم یہ ساری دَوڑ دھوپ دکھا رہے ہو، اللہ کے ایک حکم سے ان پر اچانک فالج گر سکتا ہے۔ جب تک اللہ کی دی ہوئی یہ طاقتیں کام کرتی رہتی ہیں، تم اپنی خودی کے زُعم میں مدہوش رہتے ہو، مگر جب ان میں سے کوئی ایک طاقت بھی جواب دے جاتی ہے تو تمھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ تمھاری بساط کتنی ہے۔

۵۷ – ساخت اُلٹ دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑھاپے میں آدمی کی حالت بچوں کی سی کر دیتا ہے۔ اُسی طرح وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوتا ہے۔ اُسی طرح دوسرے اُسے اُٹھاتے بٹھاتے اور سہارا دے کر چلاتے ہیں۔ اُسی طرح دوسرے اس کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ اُسی طرح وہ اپنے کپڑوں میں اور اپنے بستر پر رفعِ حاجت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح وہ ناسمجھی کی باتیں کرتا

يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الْقَوْلُ
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَاۤ
اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ
وَ مِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ لَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ

انھیں عقل نہیں آتی؟

ہم نے اس (نبیؐ) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے۔[۵۸] یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب، تاکہ وہ ہر اُس شخص کو خبردار کردے جو زندہ ہو[۵۹] اور انکار کرنے والوں پر حُجّت قائم ہو جائے۔

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں[۶۰] میں سے اِن کے لیے مویشی پیدا کیے، اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے انھیں اس طرح اِن کے بس میں کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی پر یہ سوار ہوتے ہیں، کسی کا یہ گوشت کھاتے ہیں، اور اُن کے اندر اِن کے لیے طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں۔

ہے جس پر لوگ ہنستے ہیں۔ غرض جس کمزوری کی حالت سے اس نے دنیا میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا، اختتامِ زندگی پر وہ اسی حالت کو پہنچ جاتا ہے۔

۵۸ — یہ اس بات کا جواب ہے کہ کفار توحید و آخرت اور زندگی بعدِ موت اور جنت و دوزخ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو محض شاعری قرار دے کر اپنے نزدیک بے وزن ٹھیرانے کی کوشش کرتے تھے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۱۴۲)

۵۹ — زندہ سے مراد سوچنے اور سمجھنے والا انسان ہے، جس کی حالت پتھر کی سی نہ ہو کہ آپ اس کے سامنے خواہ کتنی ہی معقولیت کے ساتھ حق اور باطل کا فرق بیان کریں اور کتنی ہی دردمندی کے ساتھ اس کو نصیحت کریں، وہ نہ کچھ سنے، نہ سمجھے اور نہ اپنی جگہ سے سرکے۔

۶۰ — ”ہاتھوں“ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بطور اِستعارہ استعمال ہوا ہے۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ معاذ اللہ!

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ
يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

وقف لازم

پھر کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے؟[۶۱] یہ سب کچھ ہوتے ہوئے اِنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ اُمید رکھتے ہیں کہ اِن کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ اُلٹے اُن کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں۔[۶۲] اچھا، جو باتیں یہ بنا رہے ہیں وہ تمھیں رنجیدہ نہ کریں، اِن کی چھپی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں۔[۶۳]

وہ ذاتِ پاک جسم رکھتی ہے اور انسانوں کی طرح ہاتھوں سے کام کرتی ہے۔ بلکہ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے خود بنایا ہے، ان کی تخلیق میں کسی دوسرے کا ذرّہ برابر دخل نہیں ہے۔

۶۱ — نعمت کو مُنْعِم کے سوا کسی اور کا عَطِیّہ سمجھنا، اس پر کسی اور کا احسان مند ہونا، اور مُنْعِم کے سوا کسی اور سے نعمت پانے کی اُمید رکھنا یا نعمت طلب کرنا، یہ سب کفرانِ نعمت ہے۔ اسی طرح یہ بھی کفرانِ نعمت ہے کہ آدمی مُنْعِم کی دی ہوئی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے۔ لہٰذا ایک مشرک اور کافر اور منافق اور فاسق انسان، محض زبان سے شکر کے الفاظ ادا کر کے خدا کا شاکر بندہ قرار نہیں پا سکتا۔ کفارِ مکہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ اِن جانوروں کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ ان کے پیدا کرنے میں دوسرے معبودوں کا کوئی دخل ہے۔ مگر یہ سب کچھ ماننے کے باوجود جب وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر اپنے معبودوں کے شکریے بجا لاتے اور ان کے آگے نذریں اور نیازیں پیش کرتے اور ان سے مزید نعمتوں کی دعائیں مانگتے اور ان کے لیے قربانیاں کرتے تھے تو خدا کے لیے ان کا زبانی شکر بالکل بے معنٰی ہو جاتا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ ان کو کافرِ نعمت اور احسان فراموش قرار دے رہا ہے۔

۶۲ — یعنی وہ جھوٹے معبُود بے چارے خود اپنی بقا اور اپنی حفاظت اور اپنی ضروریات کے لیے اِن عبادت گزاروں کے محتاج ہیں۔ یہ ان کے لشکر نہ ہوں تو اُن غریبوں کی خدائی ایک دن نہ چلے۔ یہ اُن کے حاضر باش غلام بنے ہوئے ہیں۔ یہ اُن کی بارگاہیں بنا اور سجا رہے ہیں۔ یہ اُن کے لیے پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہیں۔ یہ خلقِ خدا کو ان کا گرویدہ بناتے ہیں۔ یہ ان کی حمایت میں لڑتے اور جھگڑتے ہیں۔ تب کہیں اُن کی خدائی چلتی ہے۔ ورنہ ان کا کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو۔ وہ اصلی خدا نہیں ہیں کہ کوئی اس کو مانے یا نہ مانے، وہ اپنے زور پر آپ ساری کائنات کی فرماں روائی کر رہا ہے۔

۶۳ — خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور کُھلی اور چُھپی باتوں کا اشارہ اس طرف ہے کہ کفارِ مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار جو آپؐ کے خلاف جھوٹ کے طوفان اٹھا رہے تھے، وہ اپنے دلوں میں جانتے، اور اپنی نجی محفلوں میں مانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات وہ لگا رہے ہیں وہ سراسر بے اصل ہیں۔ وہ لوگوں کو آپؐ کے خلاف بدگمان کرنے کے لیے آپؐ کو شاعر،

اَوَلَمۡ يَرَ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِىَ خَلۡقَهٗ ؕ قَالَ مَنۡ يُّحۡىِ الۡعِظَامَ

کیا ۶۴ انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ ۶۵
اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے ۶۶ اور اپنی پیدایش کو بھول جاتا ہے۔ ۶۷ کہتا ہے "کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا

کاہن، ساحر، مجنون اور نہ معلوم کیا کیا کہتے تھے، مگر خود ان کے ضمیر اس بات کے قائل تھے، اور آپس میں وہ ایک دوسرے کے سامنے اقرار کرتے تھے کہ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں جو محض آپؐ کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے وہ گھڑ رہے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ ان لوگوں کی بے ہودہ باتوں پر رنجیدہ نہ ہو۔ سچائی کا مقابلہ جھوٹ سے کرنے والے آخرِ کار اس دنیا میں بھی ناکام ہوں گے اور آخرت میں بھی اپنا بُرا انجام دیکھ لیں گے۔

۶۴ – اب کفار کے اُس سوال کا اِستدلالی جواب دیا جا رہا ہے جو آیت ۴۸ میں نقل کیا گیا تھا۔ اُن کا یہ سوال کہ "قیامت کی دھمکی کب پوری ہوگی" کچھ اس غرض کے لیے نہ تھا کہ وہ قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے، بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ مرنے کے بعد انسانوں کے دوبارہ اُٹھائے جانے کو بعید از اِمکان، بلکہ بعید از عقل سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے سوال کے جواب میں اِمکانِ آخرت کے دلائل ارشاد ہو رہے ہیں۔

ابنِ عباسؓ، قَتادہؒ اور سعید بن جُبیرؒ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کفارِ مکہ کے سرداروں میں سے ایک شخص قبرستان سے کسی مُردے کی ایک بوسیدہ ہڈی لیے ہوئے آ گیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے توڑ کر اور اس کے منتشر اجزا ہوا میں اُڑا کر آپؐ سے کہا: اے محمدؐ! تم کہتے ہو کہ مُردے پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ بتاؤ، ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ اس کا جواب فوراً ان آیات کی صورت میں دیا گیا۔

۶۵ – یعنی وہ نطفہ جس میں محض ایک ابتدائی جرثومۂ حیات کے سوا کچھ نہ تھا، اس کو ترقی دے کر ہم نے اس حد تک پہنچایا کہ وہ نہ صرف جانوروں کی طرح چلنے پھرنے اور کھانے پینے لگا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس میں شعور و تعقُّل اور بحث و اِستدلال اور تقریر و خطابت کی وہ قابلیتیں پیدا ہو گئیں جو کسی حیوان کو نصیب نہیں ہیں، حتّٰی کہ اب وہ اپنے خالق کے بھی منہ آنے لگا ہے۔

۶۶ – یعنی ہمیں مخلوقات کی طرح عاجز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس طرح انسان کسی مُردے کو زندہ نہیں کر سکتا، اُسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔

۶۷ – یعنی یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہم نے بے جان مادّہ سے وہ ابتدائی جرثومۂ حیات پیدا کیا جو اس کا ذریعۂ تخلیق بنا، اور پھر اس جرثومے کو پرورش کر کے اسے یہاں تک بڑھا لائے کہ آج وہ ہمارے سامنے باتیں چھانٹنے کے قابل ہوا ہے۔

وَ هِيَ رَمِيمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَ هُوَ
بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۙ﴿٧٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ
نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٨٠﴾ اَوَ لَيْسَ الَّذِي خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۚ وَ هُوَ
الْخَلّٰقُ الْعَلِيمُ ﴿٨١﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُولَ لَهٗ
كُنْ فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِي بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ
وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٣﴾ ع

وقف غفران

ع ۵ ۱۲

جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟" اس سے کہو: انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انھیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔ وہی جس نے تمھارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چُولھے روشن کرتے ہو۔[۶۸] کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اِس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں، جب کہ وہ ماہر خلّاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا، اور وہ ہو جاتی ہے۔ پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے، اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ ع

۶۸ - یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ہرے بھرے درختوں میں وہ آتش گیر مادّہ رکھا ہے جس کی بدولت تم لکڑیوں سے آگ جلاتے ہو۔ یا پھر یہ اشارہ ہے مَرخ اور عَفار نامی اُن دو درختوں کی طرف جن کی ہری بھری ٹہنیوں کو لے کر اہلِ عرب ایک دوسرے پر مارتے تھے تو ان سے آگ جھڑنے لگتی تھی۔ قدیم زمانے میں عرب کے بدّو آگ جلانے کے لیے یہی چقماق استعمال کیا کرتے تھے اور ممکن ہے آج بھی کرتے ہوں۔

تفہیم القرآن

الصّٰفّٰت

(۳۷)

الصّافّات

نام پہلی ہی آیت کے لفظ وَالصّٰٓفّٰتِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نُزُول مضامین اور طرزِ کلام سے مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ سورت غالبًا مکّی دَور کے وسط میں، بلکہ شاید اس دورِ مُتوسّط کے بھی آخری زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ پَسِ منظر میں مخالفت پوری شدت کے ساتھ برپا ہے اور نبی واصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دل شکن حالات سے سابقہ درپیش ہے۔

موضوع و مضمون اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت کا جواب جس تمسخر اور استہزا کے ساتھ دیا جا رہا تھا، اور آپؐ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کرنے سے جس شدّت کے ساتھ انکار کیا جا رہا تھا، اُس پر کفارِ مکہ کو نہایت پُرزور طریقے سے تنبیہ کی گئی ہے اور آخر میں انھیں صاف صاف خبردار کر دیا گیا ہے کہ عنقریب یہی پیغمبرؐ، جس کا تم مذاق اُڑا رہے ہو، تمھارے دیکھتے دیکھتے تم پر غالب آ جائے گا، اور تم اللہ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صَحن میں اُترا ہوا پاؤ گے۔ (آیات نمبر ۱۷۱ تا ۱۷۹) یہ نوٹس اُس زمانے میں دیا گیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مسلمان (جن کو ان آیات میں اللہ کا لشکر کہا گیا ہے) بُری طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد ملک چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بمشکل ۴۰-۵۰ صحابہؓ مکے میں رہ گئے تھے اور انتہائی بے بسی کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔ اِن حالات میں ظاہر اسباب کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ غلبہ آخرِ کار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت کو نصیب ہوگا۔ بلکہ دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک مکے کی گھاٹیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ فتحِ مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آ گیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

تنبیہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں تفہیم اور ترغیب کا حق بھی پورے توازُن کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحّت پر مختصر دل نشین دلائل دیے ہیں، مشرکین کے عقائد پر تنقید کر کے بتایا ہے کہ وہ کیسی لغو باتوں پر ایمان لائے بیٹھے ہیں، اِن گمراہیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان و عملِ صالح کے نتائج کس قدر شان دار ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں پچھلی تاریخ کی مثالیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاؑ کے ساتھ اور ان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے۔ کس کس طرح اس نے اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور کس طرح ان کے جھٹلانے والوں کو سزا دی ہے۔

جو تاریخی قصّے اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ کا یہ اہم واقعہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اِکلوتے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس میں صرف اُن کفارِ قریش ہی کے لیے سبق نہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اپنے نسبی تعلق پر فخر کرتے پھرتے تھے، بلکہ اُن مسلمانوں کے لیے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے تھے۔ یہ واقعہ سُنا کر انھیں بتا دیا گیا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی روح کیا ہے، اور اُسے اپنا دین بنا لینے کے بعد ایک مومنِ صادق کو کس طرح اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

سورہ کی آخری آیات محض کفار کے لیے تنبیہ ہی نہ تھیں بلکہ اُن اہلِ ایمان کے لیے بشارت بھی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید وحمایت میں انتہائی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انھیں یہ آیات سُنا کر خوش خبری دے دی گئی کہ آغازِ کار میں جن مصائب سے انھیں سابقہ پیش آ رہا ہے ان پر گھبرائیں نہیں، آخرِ کار غلبہ انھی کو نصیب ہوگا، اور باطل کے وہ عَلَم بردار جو اِس وقت غالب نظر آ رہے ہیں، انھی کے ہاتھوں مغلوب ومفتوح ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے بتا دیا کہ یہ محض خالی تسلّی نہ تھی، بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشگی خبر دے کر ان کے دل مضبوط کیے گئے تھے۔

---

۱۸۲ آیاتہا

سُوْرَۃُ الصّٰٓفّٰتِ مَکِّیَّۃٌ

۵ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

المنزل ۶

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴿۲﴾ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ﴿۳﴾
اِنَّ اِلٰـھَکُمْ لَوَاحِدٌ ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم! پھر اُن کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں، پھر اُن کی قسم جو کلامِ نصیحت سنانے والے ہیں[۱]، تمہارا معبودِ حقیقی بس ایک ہی ہے[۲] ــــــ وہ جو زمین اور آسمانوں کا اور

۱ ــ مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان تینوں گروہوں سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں۔ اور یہی تفسیر حضرات عبداللہؓ بن مسعود، ابنِ عباسؓ، قتادہؒ، مَسروقؒ، سعید بن جُبیرؒ، عِکرِمہؒ، مجاہدؒ، سُدّیؒ، ابنِ زیدؒ اور ربیعؒ بن اَنس سے منقول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی دوسری تفسیریں بھی کی ہیں، مگر موقع و محل سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔

اس میں "قطار در قطار صف باندھنے" کا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام فرشتے جو نظامِ کائنات کی تدبیر کر رہے ہیں، اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی اطاعت و بندگی میں صف بستہ ہیں اور اس کے فرامین کی تعمیل کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔ اس مضمون کا اِعادہ آگے چل کر پھر آیت ۱۶۵ میں کیا گیا ہے، جس میں فرشتے خود اپنے متعلق کہتے ہیں: وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ۔

"ڈانٹنے اور پھٹکارنے" سے مراد بعض مفسرین کی رائے میں یہ ہے کہ کچھ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ہانکتے اور بارش کا انتظام کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ مفہوم بھی غلط نہیں ہے، لیکن آگے کے مضمون سے جو مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انھی فرشتوں میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے جو نافرمانوں اور مجرموں کو پھٹکارتا ہے اور اس کی یہ پھٹکار صرف لفظی ہی نہیں ہوتی بلکہ انسانوں پر وہ حوادثِ طبیعی اور آفاتِ تاریخی کی شکل میں برستی ہے۔

"کلامِ نصیحت سنانے" سے مراد یہ ہے کہ انھی فرشتوں میں وہ بھی ہیں جو امرِ حق کی طرف توجہ دلانے کے لیے تذکیر کی خدمت انجام دیتے ہیں، حوادثِ زمانہ کی شکل میں بھی جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کرتے ہیں، اور اُن تعلیمات کی صورت میں بھی جو اُن کے ذریعے سے انبیاؑ پر نازل ہوتی ہیں، اور ان اُلہامات کی صورت میں بھی جو اُن کے واسطے سے نیک انسانوں پر ہوتے ہیں۔

۲ ــ یہ وہ حقیقت ہے جس پر مذکورہ صفات کے حامل فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جو اللہ کی بندگی میں چل رہا ہے، اور اس کائنات کے وہ سارے مظاہر جو اللہ کی بندگی سے انحراف کرنے کے بُرے نتائج انسانوں کے سامنے لاتے ہیں، اور اس کائنات کے اندر یہ انتظام کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پے در پے ایک ہی حقیقت کی یاد دہانی مختلف طریقوں سے کرائی جا رہی ہے، یہ سب چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسانوں کا "اِلٰہ" صرف

مَا بَيۡنَهُمَا وَرَبُّ الۡمَشَارِقِ ۝۵ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا
بِزِيۡنَةِ الۡكَوَاكِبِ ۝۶ وَحِفۡظًا مِّنۡ كُلِّ شَيۡطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷

تمام اُن چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، اور سارے مشرقوں[۳] کا مالک۔[۴]
ہم نے آسمانِ دُنیا[۵] کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطانِ سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔[۶]

ایک ہی ہے۔

''الٰہ'' کے لفظ کا اِطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے: ایک، وہ معبود جس کی بالفعل بندگی و عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرے، وہ معبود جو فی الحقیقت اِس کا مستحق ہو کہ اُس کی بندگی و عبادت کی جائے۔ یہاں الٰہ کا لفظ دوسرے معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے معنٰی میں تو انسانوں نے دوسرے بہت سے الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ''الٰہ'' کا ترجمہ ''معبودِ حقیقی'' کیا ہے۔

۳ — سورج ہمیشہ ایک ہی مَطلَع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طُلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طالع نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کے مختلف حصوں پر مختلف اوقات میں اس کا طُلوع ہوا کرتا ہے۔ ان وجوہ سے مشرق کے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ رَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ (المعارج: ۴۰)

۴ — ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرماں روا ہی انسانوں کا اصل معبود ہے، اور وہی درحقیقت معبُود ہو سکتا ہے، اور اسی کو معبُود ہونا چاہیے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ رب (یعنی مالک اور حاکم اور مُربّی و پروردگار) کوئی ہو اور الٰہ (عبادت کا مستحق) کوئی اَور ہو جائے۔ عبادت کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ آدمی کا نفع و ضرر، اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا پورا ہونا، اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا، بلکہ بجائے خود اس کا وجود و بقا ہی جس کے اختیار میں ہے، اُس کی بالاتری تسلیم کرنا اور اس کے آگے جھکنا آدمی کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اس وجہ کو آدمی سمجھ لے تو خود بخود اس کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ اختیارات والے کی عبادت نہ کرنا اور بے اختیار کی عبادت کرنا، دونوں صریح خلافِ عقل و فطرت ہیں۔ عبادت کا استحقاق پہنچتا ہی اس کو ہے جو اقتدار رکھتا ہے۔ رہیں بے اقتدار ہستیاں، تو وہ نہ اِس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے، اور نہ ان کی عبادت کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے، کیونکہ ہماری کسی درخواست پر کوئی کارروائی کرنا سرے سے ان کے اختیار میں ہے ہی نہیں۔ ان کے آگے عاجزی و نیاز مندی کے ساتھ جھکنا اور ان سے دعا مانگنا بالکل ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے جائے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے بجائے جو دوسرے سائلین وہاں درخواستیں لیے کھڑے ہوں اُنھی میں سے کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔

۵ — آسمانِ دنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دُوربین کی مدد کے بغیر ہم برَہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالَم مختلف طاقتوں کی دوربینوں سے نظر آتے ہیں، اور جن عالَموں تک ابھی ہمارے وسائلِ مشاہدہ کی رسائی

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝٨ دُحُوْرًا
وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝٩ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ
ثَاقِبٌ ۝١٠ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ

یہ شیاطین مَلاءِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سُن سکتے، ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اُڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔[7]

اب اِن سے پُوچھو، ان کی پیدایش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟[8]

نہیں ہوئی ہے، وہ سب دُور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ "سماء" کسی متعیّن چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعُموم یہ لفظ اور اُس کے ہم معنٰی الفاظ عالَم بالا کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔

٦ – یعنی عالَم بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے، اور اس کے مختلف خِطّے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں کہ کسی شیطانِ سرکش کا ان حدوں سے گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر تارے اور ہر سیّارے کا اپنا ایک دائرہ اور کُرہ (Sphere) ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن حقیقت میں اس خلا کے اندر بے حد وحساب خِطّے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گُوناگوں مشکلات سے کیا جاسکتا ہے جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسایے، چاند تک پہنچنے میں پیش آ رہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق، یعنی جِنّوں کے لیے بھی عالَمِ بالا کی طرف صُعُود کرنے میں مانع ہیں۔

٧ – اس مضمون کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اُس وقت عرب میں کہانت کا بڑا چرچا تھا۔ جگہ جگہ کاہن بیٹھے پیشین گوئیاں کر رہے تھے، غیب کی خبریں دے رہے تھے، گم شدہ چیزوں کے پتے بتا رہے تھے، اور لوگ اپنے اگلے پچھلے حال دریافت کرنے کے لیے ان کی طرف رُجوع کر رہے تھے۔ ان کاہنوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جِنّ اور شیاطین ان کے قبضے میں ہیں اور وہ انھیں ہر طرح کی خبریں لا لا کر دیتے ہیں۔ اس ماحول میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے اور آپؐ نے قرآنِ مجید کی آیات سنانی شروع کیں جن میں پچھلی تاریخ اور آیندہ پیش آنے والے حالات کی خبریں دی گئی تھیں، اور ساتھ ساتھ آپؐ نے یہ بھی بتایا کہ ایک فرشتہ یہ آیات میرے پاس لاتا ہے، تو آپؐ کے مخالفین نے فوراً آپؐ کے اُوپر کاہن کی پھبتی کَس دی اور لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اِن کا تعلّق بھی دوسرے کاہنوں کی طرح کسی شیطان سے ہے جو عالَم بالا سے کچھ سُن گُن لے کر اِن کے پاس آ جاتا ہے اور یہ اُسے وحیِ الٰہی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ارشاد فرما رہا ہے کہ شیاطین کی تو رسائی ہی

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿١١﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿١٢﴾ وَاِذَا
ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿١٣﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿١٤﴾

اِن کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔[9] تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں

عالَمِ بالا تک نہیں ہو سکتی۔ وہ اِس پر قادر نہیں ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ (یعنی گروہِ ملائکہ) کی باتیں سُن سکیں اور لا کر کسی کو خبریں دے سکیں۔ اور اگر اتفاقاً کوئی ذرا سی بِھنک کسی شیطان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو قبل اس کے کہ وہ اُسے لے کر نیچے آئے، ایک تیز شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعے سے کائنات کا جو عظیم الشان نظام چل رہا ہے وہ شیاطین کی دراندازی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ اُس میں دخل دینا تو درکنار، اس کی معلومات حاصل کرنا بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲)

۸ – یہ کفارِ مکہ کے اُس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمھارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمھارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان، اور یہ بے شمار اشیا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمھاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔

۹ – یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے۔ مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے۔

لیس دار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسانِ اوّل کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی اور پھر آگے نسلِ انسانی اُسی پہلے انسان کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان لیس دار گارے سے بنا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا سارا مادّۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزا سے مُرکّب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخرِ کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلّے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔

پس بِنائے اِستدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قُبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمھارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اسی مٹی سے تمھاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہو گی؟

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا
وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾ قُلْ نَعَمْ
وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ
يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ
الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ع ۱

اور کہتے ہیں: ”یہ تو صریح جادو ہے[10]، بھلا کہیں ایسا ہوسکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اُٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آبا و اجداد بھی اُٹھائے جائیں گے؟“ ان سے کہو: ہاں، اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو[11]۔

بس ایک ہی جِھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں[12] گے۔ اُس وقت یہ کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے — ”یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جُھٹلایا کرتے[13] تھے۔“ ع (حکم ہوگا:) گھیر لاؤ سب ظالموں[14] اور ان کے ساتھیوں[15]

۱۰ – یعنی عالمِ طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مُردے اٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ یا پھر یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔

۱۱ – یعنی اللہ جو کچھ بھی تمھیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اس نے چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آگئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمھیں اُٹھا کھڑا کرے گا۔

۱۲ – یعنی جب یہ بات ہونے کا وقت آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جِھڑکی سوتوں کو جگا اُٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ ”جِھڑکی“ کا لفظ یہاں بہت معنیٰ خیز ہے۔ اس سے بَعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے ہیں، یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے: ”اُٹھ جاؤ“ اور بس آن کی آن میں وہ سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

وَ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝۲۲ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ
الْجَحِيْمِ ۝۲۳ وَ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۝۲۴ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۝۲۵ الربع
بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ۝۲۶ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

اور اُن معبُودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے[16]، پھر ان سب کو جہنّم کا راستہ دکھاؤ۔ اور ذرا اِنھیں ٹھیراؤ، اِن سے کچھ پوچھنا ہے۔ "کیا ہوگیا تمھیں، اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ ارے، آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں[17]!" اس کے بعد یہ ایک دوسرے کی طرف

۱۳ – ہوسکتا ہے کہ یہ بات اُن سے اہلِ ایمان کہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو، ہوسکتا ہے کہ میدانِ حشر کا سارا ماحول اُس وقت زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خود انھی لوگوں کا دوسرا ردِّ عمل ہو۔ یعنی اپنے دلوں میں وہ اپنے آپ ہی کو مخاطب کر کے کہیں کہ دنیا میں ساری عمر تم یہ سمجھتے رہے کہ کوئی فیصلے کا دن نہیں آنا ہے، اب آ گئی تمھاری شامت، جس دن کو جھٹلاتے تھے وہی سامنے آ گیا۔

۱۴ – ظالم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنھوں نے دوسروں پر ظلم کیا ہو، بلکہ قرآن کی اِصطِلاح میں ہر وہ شخص ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت وسرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کی ہو۔

۱۵ – اصل میں لفظ "اَزْوَاجٌ" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ان کی وہ بیویاں بھی ہوسکتی ہیں جو اس بغاوت میں ان کی رفیق تھیں، اور وہ سب لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو انھی کی طرح باغی وسرکش اور نافرمان تھے۔ علاوہ بریں اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتھوں کی شکل میں جمع کیے جائیں گے۔

۱۶ – اس جگہ معبُودوں سے مراد دو قسم کے معبُود ہیں: ایک، وہ انسان اور شیاطین جن کی اپنی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اُن کی بندگی کریں۔ دوسرے، وہ اصنام اور شجر وحَجَر وغیرہ جن کی پرستش دنیا میں کی جاتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کے معبُود تو خود مجرمین میں شامل ہوں گے اور انھیں سزا کے طور پر جہنم کا راستہ دکھایا جائے گا۔ اور دوسری قسم کے معبُود اپنے پرستاروں کے ساتھ اس لیے جہنّم میں ڈالے جائیں گے کہ وہ انھیں دیکھ کر ہر وقت شرمندگی محسوس کریں اور اپنی حماقتوں کا ماتم کرتے رہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری قسم کے معبود وہ بھی ہیں جنھیں دنیا میں پُوجا تو گیا ہے، مگر خود ان کا اپنا ایما ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی پرستش کی جائے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے رہے، مثلاً فرشتے، انبیا اور اولیا۔ اس قسم کے معبود ظاہر ہے کہ اُن معبُودوں میں شامل نہ ہوں گے جنھیں اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا۔

۱۷ – پہلا فقرہ مجرمین کو خطاب کر کے ارشاد ہوگا۔ اور دوسرا فقرہ اُن عام حاضرین کی طرف رُخ کر کے فرمایا جائے گا جو اُس وقت جہنّم کی طرف مجرمین کی روانگی کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ اُس وقت حالت کیا ہوگی۔

يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿٢٨﴾
قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ
مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ
رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿٣١﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿٣٢﴾

مُڑیں گے اور باہم تکرار شروع کر دیں گے۔ (پیروی کرنے والے اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے: ”تم ہمارے پاس سیدھے رُخ سے آتے تھے۔“[18] وہ جواب دیں گے: ”نہیں، بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے۔ ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ آخر کار ہم اپنے رب کے اِس فرمان کے مستحق ہو گئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں۔ سو ہم نے تم کو بہکایا، ہم خود بہکے ہوئے تھے۔“[19]

بڑے بڑے ہیکڑ مجرمین کے کَس بَل نکلے چکے ہوں گے اور کسی مُزاحمت کے بغیر وہ کان دبائے جہنّم کی طرف جا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی ہز میجسٹی دھکے کھا رہے ہوں گے اور درباریوں میں سے کوئی ”اعلیٰ حضرت“ کو بچانے کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ کہیں کوئی فاتحِ عالَم اور کوئی ڈکٹیٹر انتہائی ذلّت کے ساتھ چلا جا رہا ہو گا اور اس کا لشکرِ جرّار خود اسے سزا کے لیے پیش کر دے گا۔ کہیں کوئی پیر صاحب یا گُرو جی یا ہولی فادر واصلِ بجہنم ہو رہے ہوں گے اور مریدوں میں سے کسی کو یہ فکر نہ ہو گی کہ حضرتِ والا کی توہین نہ ہونے پائے۔ کہیں کوئی لیڈر صاحب کَس مَپُرسی کے عالَم میں جہنّم کی طرف رواں دواں ہوں گے اور دنیا میں جو لوگ ان کی کبریائی کے جھنڈے اُٹھائے پھرتے تھے وہ سب وہاں اُن کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں گے۔ حد یہ ہے کہ جو عاشق دنیا میں اپنے معشوق پر جان چھڑکتے تھے انھیں بھی اس کے حالِ بد کی کوئی پروا نہ ہو گی۔ اس حالت کا نقشہ کھینچ کر اللہ تعالیٰ دراصل یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان اور انسان کے جو تعلقات اپنے رب سے بغاوت پر مبنی ہیں، وہ کس طرح آخرت میں ٹوٹ کر رہ جائیں گے، اور یہاں جو لوگ ہمچو ما دیگرے نیست کے غُرور میں مبتلا ہیں، وہاں ان کا تکبُّر کس طرح خاک میں مل جائے گا۔

۱۸- اصل الفاظ ہیں: كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ”تم ہمارے پاس یمین کی راہ سے آتے تھے۔“ یمین کا لفظ عَرَبی زبان میں متعدّد مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اگر اس کو قوت و طاقت کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے، اس لیے تم اپنے زور سے ہم کو گمراہی کی طرف کھینچ لے گئے۔ اگر اس کو خیر اور بھلائی کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ تم نے خیر خواہ بن کر ہمیں دھوکا دیا۔ تم ہمیں یقین دلاتے رہے کہ جس راہ پر تم ہمیں چلا رہے ہو یہی حق اور بھلائی کی راہ ہے۔ اس لیے ہم تمھارے فریب میں آ گئے۔ اور اگر اسے قسم کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔

فَاِنَّهُمۡ يَوۡمَئِذٍ فِى الۡعَذَابِ مُشۡتَرِكُوۡنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفۡعَلُ
بِالۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمۡ كَانُوۡۤا اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ
يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ ۙ وَيَقُوۡلُوۡنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوۡۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ
مَّجۡنُوۡنٍ ﴿۳۶﴾ ؕ بَلۡ جَآءَ بِالۡحَقِّ وَصَدَّقَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّكُمۡ
لَذَآئِقُوا الۡعَذَابِ الۡاَلِيۡمِ ﴿۳۸﴾ ۚ وَمَا تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۹﴾ ۙ
اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۴۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ رِزۡقٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۴۱﴾ ۙ

اِس طرح وہ سب اُس روز عذاب میں مشترک ہوں گے [20] ہم مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا: "اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے" تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے اور کہتے تھے: "کیا ہم ایک شاعرِ مجنون کی خاطر اپنے معبُودوں کو چھوڑ دیں؟" حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی۔ [21] (اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً دردناک سزا کا مزا چکھنے والے ہو۔ اور تمھیں جو بدلہ بھی دیا جارہا ہے انھی اعمال کا دیا جارہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ مگر اللہ کے چیدہ بندے (اس انجامِ بد سے) محفوظ ہوں گے۔ ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے، [22]

۱۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارُم، سورۂ سبا، حواشی ۵۱-۵۲-۵۳۔

۲۰ – یعنی پیرو بھی اور پیشوا بھی، گمراہ کرنے والے بھی اور گمراہ ہونے والے بھی، ایک ہی عذاب میں شریک ہوں گے۔ نہ پیرووں کا یہ عذر مسموع ہوگا کہ وہ خود گمراہ نہیں ہوئے تھے بلکہ انھیں گمراہ کیا گیا تھا۔ اور نہ پیشواؤں کی اِس معذرت کو قبول کیا جائے گا کہ گمراہ ہونے والے خود ہی راہِ راست کے طالب نہ تھے۔

۲۱ – رسولوں کی تصدیق کے تین معنیٰ ہیں اور تینوں ہی یہاں مراد بھی ہیں۔ ایک، یہ کہ اُس نے کسی سابق رسول کی مخالفت نہ کی تھی کہ اُس رسول کے ماننے والوں کے لیے اُس کے خلاف تعصّب کی کوئی معقول وجہ ہوتی، بلکہ وہ خدا کے تمام پچھلے رسولوں کی تصدیق کرتا تھا۔ دوسرے، یہ کہ وہ کوئی نئی اور نرالی بات نہیں لایا تھا بلکہ وہی بات پیش کرتا تھا جو ابتدا سے خدا کے تمام رسول پیش کرتے چلے آرہے تھے۔ تیسرے، یہ کہ وہ اُن تمام خبروں کا صحیح مصداق تھا جو پچھلے رسولوں نے اُس کے بارے میں دی تھیں۔

۲۲ – یعنی ایسا رزق جس کی تمام خوبیاں بتائی جاچکی ہیں، جس کے ملنے کا انھیں یقین ہے، جس کے متعلق انھیں یہ بھی

فَوَاكِهُ ۚ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿۴۲﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿۴۳﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ
مُّتَقَابِلِينَ ﴿۴۴﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿۴۵﴾ بَيْضَاءَ

ہر طرح کی لذیذ چیزیں[۲۳]۔ اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ شراب[۲۴] کے چشموں[۲۵] سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں[۲۶] گے چمکتی ہوئی شراب،

اطمینان ہے کہ وہ ہمیشہ ملتا رہے گا، جس کے بارے میں یہ خطرہ لگا ہوا نہیں ہے کہ کیا خبر، ملے یا نہ ملے۔

۲۳ – اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جنت میں کھانا غذا کے طور پر نہیں بلکہ لذت کے لیے ہوگا۔ یعنی وہاں کھانا اِس غرض کے لیے نہ ہوگا کہ جسم کے تحلیل شدہ اجزا کی جگہ دوسرے اجزا غذا کے ذریعے سے فراہم کیے جائیں، کیونکہ اُس اَبدی زندگی میں سرے سے اجزائے جسم تحلیل ہی نہ ہوں گے، نہ آدمی کو بھوک لگے گی جو اس دنیا میں تحلیل کے عمل کی وجہ سے لگتی ہے، اور نہ جسم اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے غذا مانگے گا۔ اسی بنا پر جنت کے ان کھانوں کے لیے ''فواکہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں تَغذِیَہ کے بجائے تَلَذُّذ کا پہلو نمایاں ہے۔

۲۴ – اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے، بلکہ صرف کأس (ساغر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن عَرَبی زبان میں کاس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے۔ جس پیالے میں شراب کے بجائے دودھ یا پانی ہو، یا جس پیالے میں کچھ نہ ہو، اسے کأس نہیں کہتے۔ کأس کا لفظ صرف اسی وقت بولا جاتا ہے جب اس میں شراب ہو۔

۲۵ – یعنی وہ شراب اُس قسم کی نہ ہوگی جو دنیا میں پھلوں اور غلّوں کو سڑا کر کشید کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ قُدرَتی طور پر چشموں سے نکلے گی اور نہروں کی شکل میں بہے گی۔ سورۂ محمد میں اسی مضمون کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ۔ ''اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لیے لذت ہوں گی۔''

۲۶ – یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ شراب کے یہ ساغر لے کر جنتیوں کے درمیان گردش کون کرے گا۔ اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر ارشاد ہوئی ہے: وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ''اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے اُن کے خادم لڑکے، ایسے خوبصورت جیسے صدف میں چھُپے ہوئے موتی۔'' (الطّور، آیت ۲۴) وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ''اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہنے والے ہیں۔ تم انھیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی بکھیر دیے گئے ہیں۔'' (الدہر، آیت ۱۹) پھر اس کی مزید تفصیل حضرت اَنَسؓ اور حضرت سَمُرَہؓ بن جُندُب کی اُن رِوایات میں ملتی ہے جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہیں۔ اُن میں بتایا گیا ہے کہ ''مشرکین کے بچے اہلِ جنت کے خادم ہوں گے۔'' (ابوداؤد طیالسی، طَبرانی، بزّار) یہ رِوایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں، لیکن متعدّد دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بچے سِنّ رُشد کو نہیں پہنچے ہیں وہ جنت میں جائیں گے۔ پھر یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن بچوں کے والدین جنتی ہوں گے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہیں گے، تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾
وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾
فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ

جو پینے والوں کے لیے لذّت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضَرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔[۲۷] اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی[۲۸]، خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی[۲۹]، ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلّی۔[۳۰]

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجّہ ہو کر حالات پوچھیں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا:

اس کے بعد لامحالہ وہ بچے رہ جاتے ہیں جن کے ماں باپ جنّتی نہ ہوں گے۔ سو اُن کے متعلق یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ وہ اہلِ جنت کے خادم بنا دیے جائیں۔ (اس کے متعلق تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: فتح الباری اور عُمدۃ القاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ رسائل ومسائل، جلد سوم، ص ۱۷۷ تا ۱۸۷)

۲۷ – یعنی وہ شراب اُن دونوں قسم کی خرابیوں سے خالی ہوگی جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہیں۔ دنیا کی شراب میں ایک قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے قریب آتے ہی پہلے تو اس کی بدبُو اور سڑاند ناک میں پہنچتی ہے۔ پھر اس کا مزا آدمی کے ذائقے کو تلخ کرتا ہے۔ پھر حلق سے اُترتے ہی وہ پیٹ پکڑ لیتی ہے۔ پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دَورانِ سر لاحق ہوتا ہے۔ پھر وہ جگر کو مُتاثّر کرتی ہے اور آدمی کی صحّت پر اس کے بُرے اثرات مُترتّب ہوتے ہیں۔ پھر جب اس کا نشہ اترتا ہے تو آدمی خُمار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سب جسمانی ضرر ہیں۔ دوسری قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اسے پی کر آدمی بہکتا ہے، اَول فَول بکتا ہے اور عَربدہ کرتا ہے۔ یہ شراب کے عقلی نقصانات ہیں۔ دنیا میں انسان صرف سُرور کی خاطر شراب کے یہ سارے نقصانات برداشت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت کی شراب میں سُرور تو پوری طرح ہوگا (لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ)، لیکن ان دونوں قسم کی خرابیوں میں سے کوئی خرابی بھی اس میں نہ ہوگی۔

۲۸ – یعنی اپنے شوہر کے سوا کسی اور کی طرف نگاہ نہ کرنے والی۔

۲۹ – بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سنِّ رُشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہلِ جنت کی خدمت کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہلِ جنت کے لیے حوریں بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۰ – اصل الفاظ ہیں كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ”گویا وہ چھپے ہوئے یا محفوظ رکھے ہوئے انڈے ہیں۔“ ان الفاظ

اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۙ﴿۵۱﴾ یَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا
مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ
مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ
كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ۙ﴿۵۶﴾ وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ﴿۵۷﴾
اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ ۙ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۵۹﴾

''دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے کہا کرتا تھا: کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟[۳۱] کیا واقعی جب ہم مر چکے ہوں گے اور مٹّی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟ اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں؟'' یہ کہہ کر جونہی وہ جُھکے گا تو جہنم کی گہرائی میں اس کو دیکھ لے گا اور اس سے خطاب کر کے کہے گا: ''خدا کی قسم! تُو تو مجھے تباہ ہی کر دینے والا تھا۔ میرے رب کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو آج میں بھی اُن لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہیں۔[۳۲] اچھا، تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ موت جو ہمیں آنی تھی، وہ بس پہلے آ چکی؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں ہونا؟[۳۳]''

کی مختلف تعبیرات اہلِ تفسیر نے بیان کی ہیں۔ مگر صحیح تفسیر وہی ہے جو حضرت اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب حضورؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ ان کی نرمی و نزاکت اُس جھلّی جیسی ہوگی جو انڈے کے چھلکے اور اس کے گُودے کے درمیان ہوتی ہے۔ (ابنِ جَرِیر)

۳۱- یعنی تم بھی ایسے ضعیف الاعتقاد نکلے کہ زندگی بعدِ موت جیسی بعید از عقل بات کو مان بیٹھے۔

۳۲- اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخرت میں انسان کی سَماعت اور بینائی اور گویائی کس پیمانے کی ہوگی۔ جنت میں بیٹھا ہوا ایک آدمی جب چاہتا ہے، کسی ٹیلی ویژن کے آلے کے بغیر بس یونہی جُھک کر ایک ایسے شخص کو دیکھ لیتا ہے جو اس سے نہ معلوم کتنے ہزار میل کے فاصلے پر جہنّم میں مبتلائے عذاب ہے۔ پھر یہی نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، بلکہ ان کے درمیان کسی ٹیلیفون یا ریڈیو کے توسُّط کے بغیر براہِ راست کلام بھی ہوتا ہے۔ وہ اتنے طویل فاصلے سے بات کرتے ہیں اور ایک دوسرے

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿٦١﴾
اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً
لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ
رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا
الْبُطُوْنَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ

یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زَقّوم[34] کا درخت؟ ہم نے اُس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے۔[35] وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اُس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔[36] جہنّم کے لوگ اُسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ اور اس کے بعد

کی بات سُنتے ہیں۔

۳۳- اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ اپنے اُس دوزخی یار سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ جنّتی شخص اپنے آپ سے کلام کرنے لگتا ہے اور یہ تین فقرے اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو ہر توقع اور ہر اندازے سے برتر حالت میں پا کر انتہائی حیرت واِستِعجاب اور وفورِ مَسرَّت کے ساتھ آپ ہی آپ بول رہا ہو۔ اِس طرح کے کلام میں کوئی خاص شخص مخاطَب نہیں ہوتا، اور نہ اس کلام میں جو سوالات آدمی کرتا ہے ان سے درحقیقت کوئی بات کسی سے پوچھنا مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں آدمی کے اپنے ہی احساسات کا اظہار اس کی زبان سے ہونے لگتا ہے۔ وہ جنّتی شخص اُس دوزخی سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ محسوس کرتا ہے کہ میری خوش قسمتی مجھے کہاں لے آئی ہے۔ اب نہ موت ہے نہ عذاب ہے۔ ساری کُلفتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور مجھے حیاتِ جاوِداں نصیب ہو چکی ہے۔ اسی احساس کی بنا پر وہ بے ساختہ بول اُٹھتا ہے: کیا اب ہم اس مرتبے کو پہنچ گئے ہیں؟

۳۴- زَقّوم ایک قسم کا درخت ہے جو تِہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزا اس کا تلخ ہوتا ہے، بُو ناگوار ہوتی ہے، اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رَس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ غالبًا یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔

۳۵- یعنی منکرین یہ بات سُن کر قرآن پر طعن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر استہزا کا ایک نیا موقع پا لیتے ہیں۔

إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ ﴿٦٨﴾ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ
ضَالِّينَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلَىٰ آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ
أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِم مُّنذِرِينَ ﴿٧٢﴾
فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِينَ ﴿٧٣﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ
الْمُخْلَصِينَ ﴿٧٤﴾ وَلَقَدْ نَادَانَا نُوحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ ﴿٧٥﴾ وَنَجَّيْنَاهُ

ع ۲ / ۵۲ / ۶

ان کی واپسی اُسی آتشِ دوزخ کی طرف[۳۷] ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انھی کے نقشِ قدم پر دوڑ چلے[۳۸]۔ حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے اور اُن میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ اُن تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بد انجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنھیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے۔ ع

ہم کو (اس سے پہلے)[۳۹] نوحؑ نے پکارا تھا[۴۰]، تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے

وہ اس پر ٹھٹّھا مار کر کہتے ہیں: لو اب نئی سنو، جہنّم کی دہکتی ہوئی آگ میں درخت اُگے گا۔

۳۶- کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شیطان کا سر کس نے دیکھا ہے جو زَقّوم کے شگوفوں کو اس سے تشبیہ دی گئی۔ دراصل یہ تخیلی نوعیت کی تشبیہ ہے اور عام طور پر ہر زبان کے ادب میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم ایک عورت کی انتہائی خوب صورتی کا تصور دلانے کے لیے کہتے ہیں: وہ پری ہے۔ اور انتہائی بدصورتی بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں: وہ چڑیل ہے یا بُھتنی ہے۔ کسی شخص کی نورانی شکل کی تعریف میں کہا جاتا ہے: وہ فرشتہ صورت ہے۔ اور کوئی نہایت بھیانک ہیئت کذائی میں سامنے آئے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ وہ شیطان بنا چلا آ رہا ہے۔

۳۷- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دوزخ جب بھوک پیاس سے بے تاب ہونے لگیں گے تو انھیں اس مقام کی طرف ہانک دیا جائے گا جہاں زَقّوم کے درخت اور کھَولتے ہوئے پانی کے چشمے ہوں گے۔ پھر جب وہ وہاں سے کھا پی کر فارغ ہو جائیں گے تو انھیں دوزخ کی طرف واپس لایا جائے گا۔

۳۸- یعنی انھوں نے خود اپنی عقل سے کام لے کر کبھی نہ سوچا کہ باپ دادا سے جو طریقہ چلا آ رہا ہے وہ دُرست بھی ہے یا نہیں۔ بس آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر ہو لیے جس پر دوسروں کو چلتے دیکھا۔

۳۹- اس مضمون کا تعلق پچھلے رُکوع کے آخری فقروں سے ہے۔ ان پر غور کرنے سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ قصّے

وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾ وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ
الْبٰقِيْنَ ﴿٧٧﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٧٨﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ
فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٩﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِنَّهٗ
مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨١﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٨٢﴾ وَ اِنَّ
مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿٨٣﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٤﴾ اِذْ

وقف لازم

اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے بچالیا[41]، اور اسی کی نسل کو باقی رکھا[42]، اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوحؑ پر تمام دنیا والوں میں[43]۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔ اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کر آیا[44]۔ جب

یہاں کس غرض سے سنائے جا رہے ہیں۔

۴۰ – اس سے مراد وہ فریاد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے مدت ہائے دراز تک اپنی قوم کو دعوتِ دینِ حق دینے کے بعد آخرِ کار مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ اس فریاد کے الفاظ سورۂ قمر میں اس طرح آئے ہیں: فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ، "اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا ہوں، اب تو میری مدد کو پہنچ۔" (آیت ۱۰)

۴۱ – یعنی اُس شدید اذیّت سے جو ایک بدکردار اور ظالم قوم کی مسلسل مخالفت سے اُن کو پہنچ رہی تھی۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اُس کربِ عظیم سے بچایا گیا، اسی طرح آخرِ کار ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو بھی اِس کربِ عظیم سے بچالیں گے جس میں اہلِ مکہ نے ان کو مبتلا کر رکھا ہے۔

۴۲ – اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ جو لوگ حضرت نوحؑ کی مخالفت کر رہے تھے ان کی نسل دنیا سے ناپید کر دی گئی اور حضرت نوحؑ ہی کی نسل باقی رکھی گئی۔ دوسرے، یہ کہ تمام نسلِ انسانی ختم کر دی گئی اور آگے صرف حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد سے دنیا آباد کی گئی۔ عام طور پر مفسرین نے اِسی دوسرے معنیٰ کو اختیار کیا ہے، مگر قرآنِ مجید کے الفاظ اس معنیٰ میں صریح نہیں ہیں، اور حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۴۳ – یعنی آج دنیا میں حضرت نوحؑ کی بُرائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ طوفانِ نوحؑ کے بعد سے آج تک ہزار ہا برس سے دنیا ان کا ذکرِ خیر ہی کر رہی ہے۔

قَالَ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَا ذَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفۡكًا اٰلِهَةً دُوۡنَ
اللّٰهِ تُرِيۡدُوۡنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظۡرَةً
فِى النُّجُوۡمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّىۡ سَقِيۡمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوۡا عَنۡهُ مُدۡبِرِيۡنَ ﴿۹۰﴾

اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا:[۴۵] "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھُوٹ گھڑے ہوئے معبُود چاہتے ہو؟ آخر اللہ رب العالمین کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے؟[۴۶]"
[۴۷] پھر اس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی[۴۸] اور کہا: میری طبیعت خراب ہے۔[۴۹] چنانچہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر

۴۴ – رب کے حُضور آنے سے مراد اس کی طرف رُجوع کرنا اور سب سے منہ موڑ کر اُسی کا رخ کرنا ہے۔ اور "قلبِ سلیم" کے معنیٰ "صحیح سلامت دل" کے ہیں۔ یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی اور اَخلاقی خرابیوں سے پاک ہو، جس میں کفر و شرک اور شُکوک وشبہات کا شائبہ تک نہ ہو، جس میں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو، جس میں کوئی اینچ پیچ اور الجھاؤ نہ ہو، جو ہر قسم کے بُرے مَیلانات اور ناپاک خواہشات سے بالکل صاف ہو، جس کے اندر کسی کے لیے بغض وحسد یا بدخواہی نہ پائی جاتی ہو، جس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔

۴۵ – حضرت ابراہیمؑ کے اِس قصے کی مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حواشی ۵۰ تا ۵۵۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۲۶ – ۲۷، الانبیاء، حواشی ۵۱ تا ۶۶، الشعراء، حواشی ۵۰ تا ۶۴، العنکبوت، حواشی ۲۵ تا ۴۸۔

۴۶ – یعنی اللہ تعالیٰ کو آخر تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ یہ لکڑی پتھر کے معبُود اس کے ہم جنس ہو سکتے ہیں؟ یا اس کی صفات اور اس کے اختیارات میں شریک ہو سکتے ہیں؟ اور کیا تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اس کے ساتھ اتنی بڑی گستاخی کر کے تم اس کی پکڑ سے بچ رہ جاؤ گے؟

۴۷ – اب ایک خاص واقعے کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کی تفصیلات سورۂ انبیاء (آیات ۵۱ تا ۷۳) اور سورۂ عنکبوت (آیات ۱۶ تا ۲۷) میں گزر چکی ہیں۔

۴۸ – ابن ابی حاتمؒ نے مشہور تابعی مفسر قَتَادَہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اہلِ عرب نَظَرَ فِي النُّجُوْمِ (اس نے تاروں پر نگاہ ڈالی) کے الفاظ محاورے کے طور پر اس معنیٰ میں بولا کرتے ہیں کہ اُس شخص نے غور کیا، یا وہ شخص سوچنے لگا۔ علامہ ابنِ کثیرؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ویسے بھی یہ بات اکثر مشاہدے میں آتی ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے کوئی غور طلب معاملہ آتا ہے تو وہ آسمان کی طرف، یا اوپر کی جانب کچھ دیر دیکھتا رہتا ہے، پھر سوچ کر جواب دیتا ہے۔

۴۹ – یہ اُن تین باتوں میں سے ایک ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زندگی میں یہ تین جھوٹ بولے تھے۔ حالانکہ اس بات کو جھوٹ، یا خلافِ واقعہ کہنے کے لیے پہلے کسی ذریعے سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۹۱ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۹۲
فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ۹۳ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ۹۴ قَالَ
اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۹۵ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۹۶ قَالُوا
ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ۹۷ فَاَرَادُوْا بِهٖ

چلے گئے۔[۵۰] اُن کے پیچھے وہ چُپکے سے اُن کے معبُودوں کے مَندِر میں گُھس گیا اور بولا: ’’آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں[۵۱]؟ کیا ہو گیا، آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟‘‘ اس کے بعد وہ اُن پر پِل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ (واپس آکر) وہ لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے۔[۵۲] اس نے کہا: ’’کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پُوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور اُن چیزوں کو بھی جنھیں تم بناتے ہو۔‘‘ انھوں نے آپس میں کہا: ’’اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔‘‘ انھوں نے اس کے خلاف

اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی اور انھوں نے محض بہانے کے طور پر یہ بات بنا دی تھی۔ اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو خواہ مخواہ اسے جھوٹ آخر کس بنا پر قرار دے دیا جائے۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم تفہیم القرآن جلد سوم (الانبیاء، حاشیہ ۶۰) میں کر چکے ہیں، اور مزید بحث رسائل و مسائل، جلد دوم (صفحہ ۳۵ تا ۳۹) میں کی گئی ہے۔

۵۰ – یہ فقرہ خود بخود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ صورتِ معاملہ دراصل کیا تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے لوگ اپنے کسی میلے میں جا رہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان والوں نے اُن سے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہو گا۔ انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی ہو گی کہ میری طبیعت خراب ہے، میں نہیں چل سکتا۔ اب اگر یہ بات بالکل ہی خلافِ واقعہ ہوتی تو ضرور گھر کے لوگ اُن سے کہتے کہ اچھے خاصے بھلے چنگے ہو، بلاوجہ بہانہ بنا رہے ہو۔ لیکن جب وہ اس عذر کو قبول کر کے انھیں پیچھے چھوڑ گئے تو اس سے خود ہی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ضرور اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کو نزلہ، کھانسی، یا کوئی اور ایسی ہی نمایاں تکلیف ہو گی جس کی وجہ سے گھر والے انھیں چھوڑ جانے پر راضی ہو گئے۔

۵۱ – اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مَندِر میں بتوں کے سامنے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی ہوں گی۔

۵۲ – یہاں قصہ مختصر کر کے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اس کی جو تفصیل دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب انھوں نے آ کر اپنے مندر میں دیکھا کہ سارے بت ٹوٹے پڑے ہیں تو پوچھ گچھ شروع کی۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان بُت پرستی کے خلاف ایسی ایسی باتیں کرتا رہا ہے۔ اس پر مجمع نے کہا کہ پکڑ لاؤ اُسے۔ چنانچہ ایک گروہ دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا، اور انھیں مجمع کے سامنے لے آیا۔

كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ
سَيَهْدِيْنِ ﴿٩٩﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠٠﴾ فَبَشَّرْنٰهُ
بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ

ایک کارروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے انھی کو نیچا دکھا دیا۔[۵۳]

ابراہیمؑ نے کہا:[۵۴] ''میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں،[۵۵] وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اے پروردگار! مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔''[۵۶] (اس دُعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بُردبار) لڑکے کی بشارت دی۔[۵۷] وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دَوڑ دُھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا: ''بیٹا! میں

۵۳ – سورۂ انبیاء (آیت ۶۹) میں الفاظ یہ ہیں: قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ کے لیے۔) اور سورۂ عنکبوت (آیت ۲۴) میں ارشاد ہوا ہے: فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (پھر اللہ نے اس کو آگ سے بچالیا۔) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا تھا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں اُس سے بسلامت نکال دیا۔ آیت کے یہ الفاظ کہ ''انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انھیں نیچا دکھا دیا''، اس معنی میں نہیں لیے جاسکتے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنا چاہا تھا مگر نہ پھینک سکے۔ بلکہ مذکورۂ بالا آیات کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے ان کا صاف مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ میں پھینک کر انھیں ہلاک کر دینا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے، اور ان کے معجزانہ طریقے سے بچ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی برتری ثابت ہوگئی اور مشرکین کو اللہ نے نیچا دکھا دیا۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے اصل مقصود قریش کے لوگوں کو اس بات پر مُتنبّہ کرنا ہے کہ جن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو اُن کا طریقہ وہ نہ تھا جو تم نے اختیار کر رکھا ہے، بلکہ وہ تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ اب اگر تم اِن کو نیچا دکھانے کے لیے وہ چالیں چلو گے جو حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے اُن کے ساتھ چلی تھیں تو آخرِ کار نیچا تم ہی دیکھو گے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا تم نہیں دکھا سکتے۔

۵۴ – یعنی آگ سے بسلامت نکل آنے کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ نے ملک سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو چلتے وقت یہ الفاظ کہے۔

۵۵ – اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی خاطر نکل رہا ہوں کیونکہ اسی کا ہو جانے کی وجہ سے میری قوم میری دشمن ہوگئی ہے ورنہ کوئی دنیوی جھگڑا میرے اور اس کے درمیان نہ تھا کہ اس کی بنا پر مجھے اپنا وطن چھوڑنا پڑ رہا ہو۔ نیز یہ کہ میرا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے جس کا رخ کروں۔ تن بتقدیر بس اللہ کے بھروسے پر نکل رہا ہوں۔ جدھر وہ لے جائے گا اسی طرف چلا جاؤں گا۔

۵۶ – اس دعا سے خود بخود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اُس وقت بے اولاد تھے۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف ایک بیوی اور ایک بھتیجے (حضرت لوطؑ) کو لے کر

اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ

خواب میں دیکھتا ہوں کہ مَیں تجھے ذبح کر رہا ہوں،[58] اب تُو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟[59]" اُس نے کہا: "ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے[60] اُسے کر ڈالیے، آپ اِن شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔" آخر کو جب

ملک سے نکلے تھے۔ اس وقت فطرتاً آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ کوئی صالح اولاد عطا فرمائے جو اس غریب الوطنی کی حالت میں آپ کا غم غلط کرے۔

۵۷ – اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ دُعا کرتے ہی یہ بشارت دے دی گئی۔ قرآنِ مجید ہی میں ایک دوسرے مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ۔ "شکر ہے اُس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔" (سورۂ ابراہیم، آیت ۳۹) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اس بشارت کے درمیان سالہا سال کا فصل تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی (پیدائش، ۱۶:۱۶)، اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت سو برس کی۔ (۵:۲۱)

۵۸ – یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ انھوں نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے، بلکہ یہ دیکھا تھا کہ وہ اُسے ذبح کر رہے ہیں۔ اگرچہ اُس وقت وہ خواب کا مطلب یہی سمجھے تھے کہ وہ صاحبزادے کو ذبح کر دیں۔ اسی بنا پر وہ ٹھنڈے دل سے بیٹا قربان کر دینے کے لیے بالکل تیار ہو گئے تھے۔ مگر خواب دکھانے میں جو باریک نکتہ اللہ تعالیٰ نے ملحوظ رکھا تھا اُسے آگے کی آیت نمبر ۱۰۵ میں اس نے خود کھول دیا ہے۔

۵۹ – صاحبزادے سے یہ بات پوچھنے کا مدّعا یہ نہ تھا کہ تُو راضی ہو تو خدا کے فرمان کی تعمیل کروں ورنہ نہ کروں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جس صالح اولاد کی انھوں نے دعا مانگی تھی، وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے۔ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان قربان کر دینے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ دعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اَخلاقی و روحانی حیثیت سے بھی ان کا سپوت ہے۔

۶۰ – یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پیغمبر باپ کے خواب کو بیٹے نے محض خواب نہیں بلکہ خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اب اگر یہ فی الواقع حکم نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراحتاً یا اشارتاً اس امر کی تصریح فرما دیتا کہ فرزندِ ابراہیمؑ نے غلط فہمی سے اس کو حکم سمجھ لیا۔ لیکن پورا سیاق و سباق ایسے کسی اشارے سے خالی ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انبیاؑ کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات سے ایک اتنا بڑا قاعدہ خدا کی شریعت میں شامل ہو سکتا ہو، وہ اگر مبنی بر حقیقت نہ ہوتی بلکہ محض ایک غلط فہمی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید نہ فرماتا۔ قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے والے کے لیے یہ تسلیم کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی بھول چوک بھی صادر ہو سکتی ہے۔

اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ ﴿۱۰۳﴾ وَ نَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدۡ صَدَّقۡتَ
الرُّءۡيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ
الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۰۶﴾ وَ فَدَيۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۰۷﴾ وَ تَرَكۡنَا عَلَيۡهِ

اِن دونوں نے سرِتسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بَل گرا دیا[61] اور ہم نے نِدا دی[62] کہ "اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کر دکھایا[63]۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں[64]۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی[65]"۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چُھڑا لیا[66]۔ اور اس کی تعریف و توصیف

۶۱ – یعنی حضرت ابراہیمؑ نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو چت نہیں لٹایا بلکہ اَوندھے منہ لٹایا، تاکہ ذبح کرتے وقت بیٹے کا چہرہ دیکھ کر کہیں مَحبّت و شفقت ہاتھ میں لرزش پیدا نہ کر دے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ نیچے کی طرف سے ہاتھ ڈال کر چھری چلائیں۔

۶۲ – نَحویوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں "اور" بمعنیٰ "تو" ہے، یعنی فقرہ یوں ہے کہ "جب ان دونوں نے سرِتسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا تو ہم نے نِدا دی۔" لیکن ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں لفظ "جب" کا جواب محذوف ہے اور اس کو ذہنِ سامع پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ بات اتنی بڑی تھی کہ اسے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے تصور ہی کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہوگا کہ بوڑھا باپ اپنے ارمانوں سے مانگے ہوئے بیٹے کو محض ہماری خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور بیٹا بھی گلے پر چُھری چلوانے کے لیے راضی ہے، تو یہ منظر دیکھ کر کیسا کچھ دریائے رحمت نے جوش مارا ہوگا، اور مالک کو ان باپ بیٹوں پر کیسا کچھ پیار آیا ہوگا، اس کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ میں اُس کی کیفیت جتنی کچھ بھی بیان کی جائے گی وہ اس کو ادا نہیں کرے گی بلکہ اس کی اصلی شان سے کچھ گھٹ کر ہی ہوگی۔

۶۳ – یعنی ہم نے تمھیں یہ تو نہیں دکھایا تھا کہ تم نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے اور اُس کی جان نکل گئی ہے، بلکہ یہ دکھایا تھا کہ تم ذبح کر رہے ہو۔ تو وہ خواب تم نے پورا کر دکھایا۔ اب ہمیں تمھارے بچے کی جان لینی مطلوب نہیں ہے۔ اصل مدّعا جو کچھ تھا، وہ تمھاری اس آمادگی اور تیاری سے حاصل ہو گیا ہے۔

۶۴ – یعنی جو لوگ احسان کی رَوِش اختیار کرتے ہیں ان کے اوپر آزمائشیں ہم اس لیے نہیں ڈالا کرتے کہ انھیں خواہ مخواہ تکلیفوں میں ڈالیں اور رنج و غم میں مبتلا کریں۔ بلکہ یہ آزمائشیں ان کی فضیلتوں کو اُبھارنے کے لیے اور انھیں بڑے مرتبے عطا کرنے کے لیے ان پر ڈالی جاتی ہیں، اور پھر آزمائش کی خاطر جس مخمصے میں ہم انھیں ڈالتے ہیں اس سے بخیریت اُن کو نکلوا بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو، بیٹے کی قربانی کے لیے تمھاری آمادگی و تیاری ہی بس اس کے لیے کافی ہوگئی کہ تمھیں وہ مرتبہ عطا کر دیا جائے جو ہماری خوشنودی پر واقعی بیٹا قربان کر دینے والے کو مل سکتا تھا۔ اس طرح ہم نے تمھارے بچے کی جان بھی بچا دی اور تمھیں یہ

فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ ﴿۱۰۹﴾ كَذٰلِكَ نَجْزِی
الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَ بَشَّرْنٰهُ
بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ بٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَ عَلٰۤی اِسْحٰقَ ؕ

ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیمؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔ اور اسے اور اسحاقؑ کو برکت دی[۶۷]

مرتبۂ بلند بھی عطا کر دیا۔

۶۵ – یعنی مقصود تمہارے ہاتھ سے تمہارے بچے کو ذبح کرا دینا نہ تھا، بلکہ اصل مقصود تمہارا امتحان لینا تھا کہ تم ہمارے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز تر تو نہیں رکھتے۔

۶۶ – ''بڑی قربانی'' سے مراد، جیسا کہ بائبل اور اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے، ایک مینڈھا ہے جو اُس وقت اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے پیش کیا، تاکہ بیٹے کے بدلے اس کو ذبح کر دیں۔ اسے بڑی قربانی کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ وہ ابراہیمؑ جیسے وفادار بندے کے لیے فرزندِ ابراہیمؑ جیسے صابر و جاں نثار لڑکے کا فدیہ تھا، اور اسے اللہ تعالیٰ نے ایک بے نظیر قربانی کی نیت پوری کرنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے ''بڑی قربانی'' قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سنّت جاری کر دی کہ اُسی تاریخ کو تمام اہلِ ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری و جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعے کی یاد تازہ کرتے رہیں۔

۶۷ – یہاں پہنچ کر یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے جن صاحبزادے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے آپ کو خود اس قربانی کے لیے پیش کر دیا تھا، وہ کون تھے۔ سب سے پہلے اس سوال کا جواب ہمارے سامنے بائبل کی طرف سے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

> ''خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اُسے کہا: اَے ابرہام!...... تو اپنے بیٹے اِضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریّاہ کے مُلک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ، پر جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔'' (پیدائش، ۲۲: ۱-۲)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اِکلوتے تھے۔ حالانکہ خود بائبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحاقؑ اِکلوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائبل ہی کی حسبِ ذیل تصریحات مُلاحظہ ہوں:

> ''اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔

اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ، خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے، سو تو میری لونڈی کے پاس جا، شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو مُلکِ کَنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اُس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اُسے دی کہ اُس کی بیوی بنے اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔" (پیدائش، ۱۶: ۱-۳)

"اور خداوند کے فرشتے نے اُس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اُس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔" (۱۶: ۱۱)

"اور جب اِبرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب اِبرام چھیاسی برس کا تھا۔" (۱۶: ۱۶)

"اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے...... اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا...... تو اُس کا نام اِضحاق رکھنا...... جو اگلے سال اِسی وقتِ مُعَیَّن پر سارہ سے پیدا ہوگا...... تب ابرہام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو اور...... گھر کے سب مردوں کو لیا اور اُسی روز خدا کے حکم کے مطابق اُن کا ختنہ کیا۔ ابرہام نِنّانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا، اور جب اُس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا۔" (پیدائش، ۱۷: ۱۵-۲۵)

"اور جب اُس کا بیٹا اِضحاق اُس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔" (پیدائش، ۲۱: ۵)

اس سے بائبل کی تضاد بیانی صاف کُھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسماعیلؑ ہی حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اِکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاقؑ کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی تھی۔ کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اسلامی رِوایات کو دیکھتے ہیں اور ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مفسرین نے صحابہؓ و تابعینؒ کی جو رِوایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاقؑ تھے، اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں:

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عباسؓ بن عبد المُطَّلِب، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہُرَیرہؓ، قَتَادَہؒ، عِکْرِمَہؒ، حَسَن بصریؒ، سعید بن جُبَیرؒ، مجاہدؒ، شَعبیؒ، مَسْرُوقؒ، مکحولؒ، زُہریؒ، عطاؒ، مُقاتلؒ، سُدِّیؒ، کعبِ اَحبارؒ، زید بن اسلمؒ وغیرہم۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے۔ اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں:

حضرت ابو بکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت معاویہؓ، عِکْرِمہؒ، مُجاہدؒ، یوسف بن مہرانؒ، حَسَن بصریؒ، محمد بن کعب القُرَظیؒ، شَعْبیؒ، سعید بن المُسَیَّبؒ، ضَحّاکؒ، محمد بن علی بن حسینؒ (محمد الباقر)، ربیع بن اَنَسؒ، احمد بن حنبلؒ وغیرہم۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابُل کیا جائے تو متعدِّد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول

منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عبّاسؓ سے عکرِمہؒ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاقؑ تھے۔ مگر انھی سے عطاء بن ابی رَباحؒ یہ بات نقل کرتے ہیں کہ زعمت الیھود انہ اسحٰق و کذبت الیھود (یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحاقؑ تھے، مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں۔) اسی طرح حضرت حَسَن بصریؒ سے ایک رِوایت یہ ہے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عَمْرو بن عُبَیدؒ کہتے ہیں کہ حسن بصریؒ کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا، وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔

اِس اختلافِ رِوایات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ علمائے اسلام میں سے بعض پورے جَزْم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحاق علیہ السلام کے حق میں رائے دیتے ہیں، مثلاً ابنِ جَرِیر اور قاضی عِیاض۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، مثلاً ابنِ کثیرؒ۔ اور بعض مُذَبذَب ہیں، مثلاً جلال الدین سُیُوطیؒ۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک و شبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

۱- اُوپر قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کے لیے دُعا کی تھی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی۔ فَحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دُعا اُس وقت کی گئی تھی جب آپ بے اولاد تھے۔ اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی وہ آپ کا پَہلوٹا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی قرآن ہی کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ تھے نہ کہ حضرت اسحاقؑ۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَهَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ۔ (ابراہیم، آیت ۳۹)

۲- قرآنِ مجید میں جہاں حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی گئی ہے وہاں اُن کے لیے غلامٍ عَلیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: وَ بَشَّرُوۡهُ بِغُلٰمٍ عَلِیۡمٍ (الذاریات، ۲۸) لَا تَوۡجَلۡ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیۡمٍ (الحِجر، ۵۳) مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اُس کے لیے غلام حلیم (بُردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی دو نمایاں صفات الگ الگ تھیں۔ اور ذبح کا حکم غلامِ علیم کے لیے نہیں بلکہ غلامِ حلیم کے لیے تھا۔

۳- قرآنِ مجید میں حضرت اسحاقؑ کی پیدایش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوبؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ۔ (ہود، ۷۱) اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدایش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا، اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں، تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ علامہ ابنِ جَرِیرؒ اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحاقؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہو گیا" تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے سامنے آٹھ دس برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان صاحبِ اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ

استعمال کیے گئے ہوں گے۔

۴- اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ ''ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔'' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا، بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی۔ پھر جب وہ باپ کے ساتھ دَوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ پھر جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اَور بیٹے اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیبِ واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحاقؑ نہ تھے، بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابنِ جَریرؒ اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں کہ پہلے صرف حضرت اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ ''ہم نے اس کو اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔'' بلکہ یوں فرماتا کہ ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمھارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے۔

۵- معتبر رِوایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے فدیے میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا، اس کے سینگ خانۂ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجّاج بن یوسُف نے حرم میں ابنِ زبیرؓ کا محاصرہ کیا اور خانۂ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابنِ عباسؓ اور عامر شَعْبی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انھوں نے خود خانۂ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں۔ (ابنِ کثیر) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکۂ معظّمہ میں پیش آیا تھا، اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا، اسی لیے تو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

۶- یہ بات صدیوں سے عرب کی رِوایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ مِنٰی میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف رِوایت ہی نہ تھی بلکہ اُس وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مَناسکِ حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آ رہا تھا کہ اُسی مَقامِ مِنٰی میں جا کر لوگ اُسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ نے بھی اس طریقے کو جاری رکھا، حتّٰی کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذِی الحجہ کو مِنٰی میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار برس کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیلؑ ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحاقؑ۔ حضرت اسحاقؑ کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود اُمّتِ مُسلِمہ میں حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا۔ یہودیوں نے اگر حضرت اسماعیلؑ کو اس شرف سے محروم کر کے اپنے دادا حضرت اسحاقؑ کی طرف اسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہِ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کر لیا؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علّامۂ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعبِ اَحْبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں

ع ۳ ۷

وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِہِمَا مُحۡسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ مُبِیۡنٌ ﴿۱۱۳﴾ ع

اب ان دونوں کی ذرّیّت میں سے کوئی مُحسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔ ۶۸ ع

مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مُندرَجات ان کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ انھیں سُن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور سب رَطب و یابِس جو وہ بیان کرتے تھے انھیں رِوایت کرنے لگے۔ حالانکہ اِس اُمّت کو ان کے اس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔''

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قُرَظیؒ کی ایک رِوایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے یا حضرت اسماعیلؑ۔ اُس وقت ایک ایسے صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علما میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا: ''امیرالمومنین! خدا کی قسم وہ اسماعیلؑ ہی تھے، اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے۔'' (ابنِ جَریر) ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈے کا اثر تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا، اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر مُتعصّب رہے ہیں، اس لیے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو، جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالے سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصّب کارفرما ہے۔

۶۸ – یہ فقرہ اُس پورے مقصد پر روشنی ڈالتا ہے جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کا یہ قصہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹوں کی نسل سے دو بہت بڑی قومیں پیدا ہوئیں۔ ایک بنی اسرائیل، جن کے گھر سے دنیا کے دو بڑے مذہب (یہودیت اور نَصرانیت) نکلے اور انھوں نے رُوئے زمین کے بہت بڑے حصّے کو حلقہ بگوش بنایا۔ دوسرے بنی اسماعیل جو نُزولِ قرآن کے وقت تمام اہلِ عرب کے مقتدا و پیشوا تھے، اور اُس وقت مکۂ معظّمہ کے قبیلۂ قریش کو اُن میں سب سے زیادہ اہم مقام حاصل تھا۔ نسلِ ابراہیمی کی ان دونوں شاخوں کو جو کچھ بھی عُروج نصیب ہوا وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ان دو عظیم المرتبت صاحبزادوں کے ساتھ انتساب کی بدولت ہوا، ورنہ دنیا میں نہ معلوم ایسے ایسے کتنے خاندان پیدا ہوئے ہیں اور گوشۂ گمنامی میں جا پڑے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ اس خاندان کی تاریخ کا سب سے زیادہ زرّین کارنامہ سنانے کے بعد ان دونوں گروہوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ تمھیں دنیا میں یہ جو کچھ شرف نصیب ہوا ہے وہ خدا پرستی اور اخلاص و فِدویّت کی اُن شان دار رِوایات کی وجہ سے ہوا ہے جو تمھارے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام نے قائم کی تھیں۔ وہ انھیں بتاتا ہے کہ ہم نے اُن کو جو برکت عطا فرمائی اور ان پر اپنے فضل و کرم کی جو بارشیں برسائیں، یہ کوئی اندھی بانٹ نہ تھی کہ بس یونہی ایک شخص اور اس کے دو لڑکوں کو چھانٹ کر نواز دیا گیا ہو، بلکہ انھوں نے اپنے مالکِ حقیقی کے ساتھ اپنی وفاداری کے کچھ ثبوت دیے تھے اور ان کی بنا پر وہ اِن عنایات کے مستحق بنے تھے۔ اب تم لوگ محض اس فخر کی بنا پر کہ تم ان کی اولاد ہو، ان عنایات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ ہم تو یہ دیکھیں گے کہ تم میں سے مُحسن کون ہے اور ظالم کون۔ پھر جو جیسا ہوگا، اُس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں گے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ
الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا
الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَتَرَكْنَا
عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاِنَّ
اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور ہم نے موسیٰؑ و ہارونؑ پر احسان کیا، اُن کو اور ان کی قوم کو کربِ عظیم سے نجات[۶۹] دی، اُنھیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے، اُن کو نہایت واضح کتاب عطا کی، انھیں راہِ راست دکھائی، اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکرِ خیر باقی رکھا۔ سلام ہے موسیٰؑ اور ہارونؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

اور الیاسؑ بھی یقیناً مُرسلین میں سے[۷۰] تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟

۶۹ — یعنی اس شدید مصیبت سے جس میں وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں مبتلا تھے۔

۷۰ — حضرت الیاس علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کا ذکر قرآنِ مجید میں صرف دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہ مقام، اور دوسرا سورۂ اَنعام آیت ۸۵۔ موجودہ زمانے کے محققین ان کا زمانہ ۸۷۵ اور ۸۵۰ ق م کے درمیان متعیّن کرتے ہیں۔ وہ جِلْعاد کے رہنے والے تھے (قدیم زمانے میں جِلْعاد اس علاقے کو کہتے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اُرْدُن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یَرْمُوک کے جنوب میں واقع ہے۔) بائبل میں ان کا ذکر ایلیّاہ تِشْبی (Elijah the Tishbite) کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے مختصر حالات حسبِ ذیل ہیں:

حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رَحُبْعام (Rehoboam) کی نا اہلی کے باعث بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک حصہ جو بیت المقدس اور جنوبی فلسطین پر مشتمل تھا، آلِ داؤد کے قبضے میں رہا، اور دوسرا حصہ جو شمالی فلسطین پر مشتمل تھا، اس میں ایک مستقل ریاست اسرائیل کے نام سے قائم ہو گئی اور بعد میں سامریہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اگرچہ حالات دونوں ہی ریاستوں کے دِگرگُوں تھے، لیکن اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے ایسے سخت بگاڑ کی راہ پر چل پڑی

تھی جس کی بدولت اس میں شرک و بت پرستی، ظلم وستم اور فسق و فجور کا زور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب اسرائیل کے بادشاہ اَخی اَب (Ahab) نے صَیدا (موجودہ لُبنان) کے بادشاہ کی لڑکی ایزبل (Jezebel) سے شادی کر لی تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس مشرک شہزادی کے اثر میں آ کر اخی اب خود بھی مشرک ہو گیا، اس نے سامریہ میں بَعْل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا، خدائے واحد کی پرستش کے بجائے بَعْل کی پرستش رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اسرائیل کے شہروں میں علانیہ بَعْل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔

یہی زمانہ تھا جب حضرت الیاس علیہ السلام یکایک منظرِ عام پر نمودار ہوئے اور انھوں نے جِلْعاد سے آ کر اَخی اَب کو نوٹس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے مُلک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا، حتّٰی کہ اوس تک نہ پڑے گی۔ خدا کے نبی کا یہ قول حرف بحرف صحیح ثابت ہوا اور ساڑھے تین سال تک بارش بالکل بند رہی۔ آخرِ کار اَخی اَب کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت الیاسؑ کو تلاش کرا کے بلوایا۔ انھوں نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اسرائیل کے باشندوں کو اللہ ربّ العالَمین اور بَعْل کا فرق اچھی طرح بتا دیں۔ اس غرض کے لیے انھوں نے حکم دیا کہ ایک مجمعِ عام میں بَعْل کے پجاری بھی آ کر اپنے معبُود کے نام پر قربانی کریں اور میں بھی اللہ ربّ العالَمین کے نام پر قربانی کروں گا۔ دونوں میں سے جس کی قربانی بھی انسان کے ہاتھوں سے آگ لگائے بغیر غیبی آگ سے بھسم ہو جائے اس کے معبُود کی سچّائی ثابت ہو جائے گی۔ اخی اب نے یہ بات قبول کر لی۔ چنانچہ کوہِ کَرمِل (Carmel) پر بَعْل کے ساڑھے آٹھ سو پُجاری جمع ہوئے اور اسرائیلیوں کے مجمعِ عام میں ان کا اور حضرت الیاس علیہ السلام کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں بَعْل پرستوں نے شکست کھائی اور حضرت الیاسؑ نے سب کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ بَعْل ایک جھوٹا خدا ہے، اصل خدا وہی ایک اکیلا خدا ہے جس کے نبی کی حیثیت سے وہ مامور ہو کر آئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت الیاسؑ نے اسی مجمعِ عام میں بَعْل کے پُجاریوں کو قتل کرا دیا، اور پھر بارش کے لیے دعا کی جو فوراً قبول ہوئی، یہاں تک کہ پورا ملک اسرائیل سیراب ہو گیا۔

لیکن ان معجزات کو دیکھ کر بھی زن مرید اَخی اَب اپنی بت پرست بیوی کے شکنجے سے نہ نکلا۔ اس کی بیوی اِیزبِل حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی اور اس سے قسم کھالی کہ جس طرح بَعْل کے پجاری قتل کیے گئے ہیں اسی طرح الیاس علیہ السلام بھی قتل کیے جائیں گے۔ اِن حالات میں حضرت الیاسؑ کو ملک چھوڑنا پڑا اور چند سال تک وہ کوہِ سینا کے دامن میں پناہ گزیں رہے۔ اس موقع پر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو فریاد کی تھی اسے بائبل ان الفاظ میں نقل کرتی ہے:

”بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مذبحوں کو ڈھا دیا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک مَیں ہی اکیلا بچا ہوں۔ سو وہ میری جان لینے کے دَرپے ہیں۔“ (۱-سلاطین ۱۹: ۱۰)

اُسی زمانے میں بیت المَقدِس کی یہودی ریاست کے فرماں روا یہورام (Jehoram) نے اسرائیل کے بادشاہ اَخی اَب کی بیٹی سے شادی کر لی، اور اس مشرک شہزادی کے اثر سے وہی تمام خرابیاں جو اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھیں، یہودیہ کی ریاست میں بھی پھیلنے لگیں۔ حضرت الیاسؑ نے یہاں بھی فریضۂ نبوت ادا کیا اور یہورام کو ایک خط لکھا جس کے یہ الفاظ بائبل میں نقل ہوئے ہیں:

”خداوند تیرے باپ داؤد کا خدا یوں فرماتا ہے: اس لیے کہ تُو نہ اپنے باپ یہُوسفط کی راہوں پر اور نہ

اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا وَّ تَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمۡ وَرَبَّ

کیا تم بَعۡل[۷۱] کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو، اُس اللہ کو جو تمھارا اور تمھارے اگلے پچھلے

یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا، بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہ پر چلا ہے اور یہوداہ اور (یروشلیم) یروشلم کے باشندوں کو زناکار بنایا جیسا اَخی اَب کے خاندان نے کیا تھا اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے اچھے تھے، قتل بھی کیا، سو دیکھ! خداوند تیرے لوگوں کو اور تیرے بیٹوں اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو بڑی آفتوں سے مارے گا اور تو انتڑیوں کے مرض کے سبب سے سخت بیمار ہو جائے گا، یہاں تک کہ تیری انتڑیاں اُس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی جائیں گی۔" (۲-تواریخ، ۲۱: ۱۲-۱۵)

اس خط میں حضرت الیاسؑ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ پہلے یہورام کی ریاست بیرونی حملہ آوروں کی تاخت سے تباہ ہوئی اور اس کی بیویوں تک کو دشمن پکڑ لے گئے، پھر وہ خود انتڑیوں کے مرض سے ہلاک ہوا۔

چند سال کے بعد حضرت الیاسؑ پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انھوں نے اَخی اَب کو، اور اس کے بعد اس کے بیٹے اَخزیاہ کو راہِ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کی، مگر جو بدی سامریہ کے شاہی خاندان میں گھر کر چکی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ آخرِ کار حضرت کی بددعا سے اَخی اَب کا گھرانا ختم ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے بائبل کے حسبِ ذیل ابواب مُلاحَظہ ہوں: ۱-سلاطین، باب ۱۷-۱۸-۱۹-۲۱، ۲-سلاطین، باب ۱-۲، ۲-تواریخ، باب ۲۱۔

۷۱ - بَعۡل کے لُغوی معنیٰ آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متعدِّد مقامات پر خود قرآنِ مجید میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸، سورۂ نساء آیت ۱۲۷، سورۂ ہود آیت ۷۲، اور سورۂ نور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنیٰ میں استعمال کرتی تھیں، اور انھوں نے ایک خاص دیوتا کو بَعۡل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فنیقی قوم (Phoenicians) کا سب سے بڑا نر دیوتا بَعۡل تھا اور اس کی بیوی عَستارات (Ashtoreth) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بَعۡل سے مراد سورج ہے یا مُشتری، اور عَستارات سے مراد چاند ہے یا زُہرہ۔ بہر حال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابِل سے لے کر مصر تک پورے مشرقِ اوسط میں بَعۡل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خُصوصاً لبنان اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بُری طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقِ اُردُن میں آ کر آباد ہوئے، اور تورات کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کر کے انھوں نے اِن مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے، تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشَعؑ بن نُون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اَخلاقی و دینی زوال رونما ہونا شروع ہو گیا تھا:

"اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بَعلیم کی پرستش کرنے لگے...... اور وہ خداوند کو چھوڑ کر

اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ
يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا

آبا و اجداد کا رب ہے؟" مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا، سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں، بجز اُن بندگانِ خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا۔[۷۲] اور الیاسؑ کا ذکرِ خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔[۷۳] سلام ہے الیاسؑ پر۔[۷۴] ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ واقعی وہ ہمارے مومن بندوں

بَعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے۔" (قُضاۃ ۲: ۱۱-۱۳)

"سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حِتّیوں اور اَموریوں اور فِرِزّیوں اور حَوِیّوں اور یَبُوسیوں کے درمیان بس گئے اور اُن کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں اُن کے بیٹوں کو دینے اور اُن کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔" (قُضاۃ ۳: ۵-۶)

اُس زمانہ میں بَعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گُھس چکی تھی کہ بائبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں عَلانیہ بَعل کا مذبَح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مَذبَح توڑ دیا۔ دوسرے روز ایک مجمعِ کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اَڈّے کو توڑا تھا۔ (قُضاۃ ۶: ۲۵-۳۲) اس صورتِ حال کو آخرِ کار حضرت سموئیل، طالوت، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعُموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر اُبھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بَعل پرستی کے سیلاب میں بہ گئی۔

۷۲ – یعنی اس سزا سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہوں گے جنھوں نے حضرت الیاسؑ کو نہ جھٹلایا اور جن کو اللہ نے اُس قوم میں سے اپنی بندگی کے لیے چھانٹ لیا۔

۷۳ – حضرت الیاس علیہ السلام کو ان کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے جیسا کچھ ستایا اُس کی داستان اُوپر گزر چکی ہے، مگر بعد میں وہ ان کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کم ہی لوگوں کو انھوں نے اُن سے بڑھ کر جلیل القدر مانا ہو گا۔ اُن کے ہاں مشہور ہو گیا کہ الیاس علیہ السلام ایک بگولے میں آسمان پر زندہ اُٹھا لیے گئے ہیں (۲-سلاطین، باب دوم)، اور یہ کہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ چنانچہ بائبل کی کتاب مَلاکی میں لکھا ہے:

"دیکھو، خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں اِیلیّاہ نبی کو تمھارے پاس بھیجوں گا۔" (۴: ۵)

حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کی بِعثت کے زمانے میں یہودی بالعُموم تین آنے والوں کے منتظر تھے: ایک، حضرت الیاسؑ۔

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ
اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ ع

ع ۴۵ ۸

میں سے تھا۔

اور لوطؑ بھی اُنھی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔[۷۵] پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا۔ آج تم شب و روز اُن کے اُجڑے دِیار پر سے گزرتے ہو۔[۷۶] کیا تم کو عقل نہیں آتی؟ ع

دوسرے، مسیحؑ۔ تیسرے، ''وہ نبی'' (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔ جب حضرت یحییٰؑ کی نبوت شروع ہوئی اور انھوں نے لوگوں کو اِصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جا کر پوچھا: کیا تم مسیح ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: کیا تم اِیلیّاہ ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: کیا تم ''وہ نبی'' ہو؟ انھوں نے کہا: میں وہ بھی نہیں ہوں۔ تب انھوں نے کہا: اگر تم نہ مسیح ہو، نہ اِیلیّاہ ہو، نہ وہ نبی، تو پھر تم بپتسمہ کیوں دیتے ہو؟ (یُوحنّا، ۱: ۱۹-۲۶) پھر کچھ مدت بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا غُلغُلہ بلند ہوا تو یہودیوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ شاید اِیلیّاہ نبی آ گئے ہیں۔ (مَرقُس ۶: ۱۴-۱۵) خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حَواریوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ اِیلیّاہ نبی آنے والے ہیں۔ مگر حضرت نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ ''اِیلیّاہ تو آ چکا، اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا۔'' اس سے حَواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰؑ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاسؑ۔ (مَتّی، ۱۱: ۱۴ اور مَتّی، ۱۷: ۱۰-۱۳)

۷۴ — اصل میں الفاظ ہیں: سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ۔ اس کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیاسؑ کا دوسرا نام ہے، جس طرح حضرت ابراہیمؑ کا دوسرا نام ابراہام تھا۔ اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ اہلِ عرب میں عِبرانی اَسما کے مختلف تلفُّظ رائج تھے، مثلاً میکال اور میکائیل اور میکائین ایک ہی فرشتے کو کہا جاتا تھا۔ ایسا ہی معاملہ حضرت الیاسؑ کے نام کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں ایک ہی پہاڑ کا نام طُورِ سینا بھی آیا ہے اور طُورِ سینین بھی۔

۷۵ — اس سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے جو ہجرت کا حکم آنے پر اپنے شوہرِ نامدار کے ساتھ نہ گئی بلکہ اپنی قوم کے ساتھ رہی اور مبتلائے عذاب ہوئی۔

۷۶ — اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قریش کے تاجر شام و فلسطین کی طرف جاتے ہوئے شب و روز اس علاقے سے گزرتے تھے جہاں قومِ لوطؑ کی تباہ شدہ بستیاں واقع تھیں۔

وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾
فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْ
لَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ النصف

اور یقیناً یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔[۷۷] یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا،[۷۸] پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی۔ آخرِ کار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔[۷۹] اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا[۸۰] تو روزِ قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔[۸۱]

۷۷ – یہ تیسرا موقع ہے جہاں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ یونس اور سورۂ انبیا میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۸۲ تا ۸۵)

۷۸ – اصل میں لفظ اَبَقَ استعمال ہوا ہے، جو عَرَبی زبان میں صرف اُس وقت بولا جاتا ہے جب کہ غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جائے۔ الاباق هرب العبد من سیّدہٖ "اِباق کے معنٰی ہیں غلام کا اپنے آقا سے فرار ہو جانا۔" (لِسان العرب)

۷۹ – ان فقروں پر غور کرنے سے جو صورتِ واقعہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) حضرت یونسؑ جس کشتی میں سوار ہوئے تھے وہ اپنی گنجایش سے زیادہ بھری ہوئی (overloaded) تھی۔

(۲) قرعہ اندازی کشتی میں ہوئی، اور غالباً اس وقت ہوئی جب بحری سفر کے دوران میں یہ محسوس ہوا کہ بوجھ کی زیادتی کے سبب سے تمام مسافروں کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ لہٰذا قرعہ اس غرض کے لیے ڈالا گیا کہ جس کا نام قرعے میں نکلے، اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔

(۳) قرعے میں حضرت یونسؑ ہی کا نام نکلا، وہ سمندر میں پھینک دیے گئے اور ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا۔

(۴) اِس ابتلا میں حضرت یونسؑ اس لیے مبتلا ہوئے کہ وہ اپنے آقا (یعنی اللہ تعالیٰ) کی اجازت کے بغیر اپنے مقامِ ماموریت سے فرار ہو گئے تھے۔ اس معنٰی پر لفظ اَبَقَ بھی دلالت کرتا ہے جس کی تشریح اُوپر حاشیہ نمبر ۷۸ میں گزر چکی ہے، اور اسی معنٰی پر لفظ مُلِیْم بھی دلالت کرتا ہے۔ مُلِیْم ایسے قصور وار آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے قصور کی وجہ سے آپ ہی ملامت کا مستحق ہو گیا ہو، خواہ اسے ملامت کی جائے یا نہ کی جائے۔ (یقال قد الام الرجل اذا اتٰی ما یلام علیه من الامر وان لم یُلَم۔ ابنِ جَرِیر)

۸۰ – اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام پہلے ہی

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿١٤٥﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿١٤٦﴾

آخرکار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا[82]۔ اور اُس پر ایک بیل دار درخت اُگا دیا[83]۔

خدا سے غافل لوگوں میں سے نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو دائماً اللہ کی تسبیح کرنے والے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو انھوں نے اللہ ہی کی طرف رُجوع کیا اور اس کی تسبیح کی۔ سورۂ انبیا میں ارشاد ہوا ہے: فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ پس اُن تاریکیوں میں اُس نے پکارا: ’’نہیں ہے کوئی خدا مگر تُو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں قصوروار ہوں۔‘‘

۸۱ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی اور حضرت یونسؑ قیامت تک اس کے پیٹ میں زندہ رہتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک اس مچھلی کا پیٹ ہی حضرت یونسؑ کی قبر بنا رہتا۔ مشہور مفسر قَتادَہؒ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ (ابنِ جَرِیر)

۸۲ – یعنی جب حضرت یونسؑ نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور وہ ایک بندۂ مومن وقانت کی طرح اس کی تسبیح میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے اُن کو ساحل پر اُگل دیا۔ ساحل ایک چٹیل میدان تھا جس میں کوئی روئیدگی نہ تھی، نہ کوئی ایسی چیز تھی جو حضرت یونسؑ پر سایہ کرتی، نہ وہاں غذا کا کوئی سامان موجود تھا۔

اِس مَقام پر بہت سے عقلیّت کے مدّعی حضرات یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں جا کر کسی انسان کا زندہ نکل آنا غیر ممکن ہے۔ لیکن پچھلی ہی صدی کے اواخر میں اِس نام نہاد عقلیّت کے گڑھ (انگلستان) کے سواحل سے قریب ایک واقعہ پیش آ چکا ہے جو ان کے دعوے کی تردید کر دیتا ہے۔ اگست ۱۸۹۱ء میں ایک جہاز (Star of the East) پر کچھ مچھیرے وہیل کے شکار کے لیے گہرے سمندر میں گئے۔ وہاں انھوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو، جو ۲۰ فٹ لمبی، ۵ فٹ چوڑی اور سو ٹن وزنی تھی، سخت زخمی کر دیا۔ مگر اس سے جنگ کرتے ہوئے جیمز بارٹلے نامی ایک مچھیرے کو اُس کے ساتھیوں کی آنکھوں کے سامنے مچھلی نے نگل لیا۔ دوسرے روز وہی مچھلی اس جہاز کے لوگوں کو مری ہوئی مل گئی۔ انھوں نے بمشکل اسے جہاز پر چڑھایا اور پھر طویل جِدّوجُہد کے بعد جب اس کا پیٹ چاک کیا تو بارٹلے اس کے اندر سے زندہ برآمد ہو گیا۔ یہ شخص مچھلی کے پیٹ میں پورے ۶۰ گھنٹے رہا تھا۔ (اُردو ڈائجسٹ، فروری ۱۹۶۴ء) غور کرنے کی بات ہے کہ اگر معمولی حالات میں فطری طور پر ایسا ہونا ممکن ہے تو غیر معمولی حالات میں اللہ تعالیٰ کے معجزے کے طور پر ایسا ہونا کیوں غیر ممکن ہے؟

۸۳ – اصل الفاظ ہیں: شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ۔ یقطین عَرَبی زبان میں ایسے درخت کو کہتے ہیں جو کسی تنے پر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ بیل کی شکل میں پھیلتا ہے، جیسے کَدُّو، تربوز، ککڑی وغیرہ۔ بہرحال وہاں کوئی ایسی بیل معجزانہ طریقے پر پیدا کر دی گئی تھی جس کے پتّے حضرت یونسؑ پر سایہ بھی کریں اور جس کے پھل ان کے لیے بیک وقت غذا کا کام بھی دیں اور پانی کا کام بھی۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

اس کے بعد ہم نے اُسے ایک لاکھ، یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا،[۸۴] وہ ایمان لائے اور ہم نے ایک وقتِ خاص تک انھیں باقی رکھا۔[۸۵]

۸۴ - ''ایک لاکھ یا اس سے زائد'' کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی تعداد میں شک تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان کی بستی کو دیکھتا تو یہی اندازہ کرتا کہ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہی ہوگی، کم نہ ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ یہ وہی بستی تھی جس کو چھوڑ کر حضرت یونسؑ بھاگے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد عذاب آتا دیکھ کر جو ایمان اُس بستی کے لوگ لے آئے تھے اس کی حیثیت صرف توبہ کی تھی جسے قبول کر کے عذاب اُن پر سے ٹال دیا گیا تھا۔ اب حضرت یونس علیہ السلام دوبارہ ان کی طرف بھیجے گئے تاکہ وہ نبی پر ایمان لا کر باقاعدہ مسلمان ہو جائیں۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے سورۂ یونس، آیت ۹۸ نگاہ میں رہنی چاہیے۔

۸۵ - حضرت یونسؑ کے اس قصے کے متعلق سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس پر بعض لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے مفسرین کے اقوال بھی نقل کر دیے جائیں۔

مشہور مفسر قَتَادَہؒ سورۂ یونس، آیت ۹۸ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''کوئی بستی ایسی نہیں گزری ہے جو کفر کر چکی ہو اور عذاب آ جانے کے بعد ایمان لائی ہو اور پھر اسے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس سے صرف قومِ یونسؑ مستثنیٰ ہے۔ انھوں نے جب اپنے نبی کو تلاش کیا اور نہ پایا، اور محسوس کیا کہ عذاب قریب آ گیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں میں توبہ ڈال دی۔'' (ابنِ کثیر، جلد ۲، ص ۴۳۳)

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ آلُوسیؒ لکھتے ہیں: ''اس قوم کا قصہ یہ ہے کہ یُونس علیہ السلام مَوصِل کے علاقے میں نینویٰ کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ یہ کافر و مشرک لوگ تھے۔ حضرت یونسؑ نے ان کو اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی دعوت دی۔ انھوں نے انکار کیا اور جھٹلایا۔ حضرت یونسؑ نے ان کو خبر دی کہ تیسرے دن ان پر عذاب آ جائے گا، اور تیسرا دن آنے سے پہلے آدھی رات کو وہ بستی سے نکل گئے۔ پھر دن کے وقت جب عذاب اس قوم کے سروں پر پہنچ گیا...... اور انھیں یقین ہو گیا کہ سب ہلاک ہو جائیں گے تو انھوں نے اپنے نبی کو تلاش کیا، مگر نہ پایا۔ آخرکار وہ سب اپنے بال بچوں اور جانوروں کو لے کر صحرا میں نکل آئے اور ایمان و توبہ کا اظہار کیا...... پس اللہ نے ان پر رحم کیا اور ان کی دعا قبول کر لی۔'' (رُوح المعانی، جلد ۱۱، ص ۱۷۰)

سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ آلُوسیؒ لکھتے ہیں: ''حضرت یُونسؑ کا اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل جانا ہجرت کا فعل تھا، مگر انھیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔'' (رُوح المعانی، جلد ۱۷، ص ۷۷) پھر وہ حضرت یونسؑ کی دُعا کے فقرہ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں: ''یعنی میں قصوروار تھا کہ انبیا کے طریقے کے

خلاف، حکم آنے سے پہلے، ہجرت کرنے میں جلدی کر بیٹھا۔ یہ حضرت یُونُس علیہ السلام کی طرف سے اپنے گناہ کا اعتراف اور توبہ کا اظہار تھا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کی اس مصیبت کو دُور فرما دے۔" (رُوح المعانی، جلد ۱۷، ص ۷۸)

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا حاشیہ اس آیت پر یہ ہے کہ "وہ اپنی قوم پر، جب کہ وہ ایمان نہ لائی خفا ہو کر چل دیے اور قوم پر سے عذاب ٹل جانے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لیے ہمارے حکم کا انتظار نہ کیا۔" (بیان القرآن)

اسی آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حاشیے میں فرماتے ہیں: "قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصے میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکمِ الٰہی کا انتظار نہ کیا اور وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا...... اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ، اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بے شک میں نے جلدی کی کہ تیرے حکم کا انتظار کیے بدون بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔"

سورۂ صافّات کی آیاتِ بالا کی تشریح میں امام رازیؒ لکھتے ہیں: "حضرت یونسؑ کا قصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس قوم کو جس نے انھیں جھٹلایا تھا، ہلاک کرنے کا وعدہ فرمایا، یہ سمجھے کہ یہ عذاب لامحالہ نازل ہونے والا ہے، اس لیے انھوں نے صبر نہ کیا اور قوم کو دعوت دینے کا کام چھوڑ کر نکل گئے، حالانکہ ان پر واجب تھا کہ دعوت کا کام برابر جاری رکھتے، کیونکہ اس امر کا امکان باقی تھا کہ اللہ ان لوگوں کو ہلاک نہ کرے۔" (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۵۸)

علّامہ آلُوسیؒ اِذۡ اَبَقَ اِلَی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ پر لکھتے ہیں: "اَبَق کے اصل معنیٰ آقا کے ہاں سے غلام کے فرار ہونے کے ہیں۔ چونکہ حضرت یونُسؑ اپنے رب کے اِذن کے بغیر اپنی قوم سے بھاگ نکلے تھے، اس لیے اس لفظ کا اِطلاق ان پر دُرست ہوا۔" پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: "جب تیسرا دن ہوا تو حضرت یونسؑ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نکل گئے۔ اب جوان کی قوم نے ان کو نہ پایا تو وہ اپنے بڑے اور چھوٹے اور جانوروں، سب کو لے کر نکلے، اور نُزولِ عذاب ان سے قریب تھا، پس انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور زاری کی اور معافی مانگی اور اللہ نے انھیں معاف کر دیا۔" (روح المعانی، جلد ۲۳، ص ۱۳۰)

مولانا شبیر احمد صاحبؒ وَ هُوَ مُلِیۡمٌ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "الزام یہی تھا کہ خطائے اجتہادی سے حکمِ الٰہی کا انتظار کیے بغیر بستی سے نکل پڑے اور عذاب کے دن کی تعیین کر دی۔"

پھر سورۂ القلم کی آیت فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَ لَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ پر مولانا شبیر احمد صاحبؒ کا حاشیہ یہ ہے: "یعنی مچھلی کے پیٹ میں جانے والے پیغمبر (حضرت یونس علیہ السلام) کی طرح مکذّبین کے معاملے میں تنگ دلی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کیجیے۔" اور اسی آیت کے فقرہ وَ هُوَ مَکۡظُوۡمٌ پر حاشیہ تحریر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں: "یعنی قوم کی طرف سے غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ جھنجلا کر شتابیِ عذاب کی دُعا، بلکہ پیشین گوئی کر بیٹھے۔"

مفسرین کے ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تین قصور تھے جن کی وجہ سے حضرت یُونُسؑ پر عتاب ہوا: ایک، یہ کہ انھوں نے عذاب کے دن کی خود ہی تعیین کر دی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہ ہوا تھا۔ دوسرے، یہ کہ وہ دن آنے سے پہلے ہجرت کر کے ملک سے نکل گئے، حالانکہ نبی کو اس وقت تک اپنی جگہ نہ چھوڑنی چاہیے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آجائے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةَ
اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾
وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾
مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ
سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

پھر ذرا اِن لوگوں سے پوچھو:[۸۶] کیا (اِن کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمھارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور اِن کے لیے ہوں بیٹے[۸۷]! کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سُن رکھو! دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کرلیں؟ تمھیں کیا ہوگیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو۔ کیا تمھیں ہوش نہیں آتا۔ یا پھر تمھارے پاس اپنی اِن باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے، تو لاؤ اپنی وہ کتاب، اگر تم سچّے ہو۔[۸۸]

تیسرے، یہ کہ جب اس قوم پر سے عذاب ٹل گیا تو واپس نہ گئے۔

۸۶ – یہاں سے ایک دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ پہلا مضمون آیت نمبر ۱۱ سے شروع ہوا تھا جس میں کفارِ مکہ کے سامنے یہ سوال رکھا گیا تھا: ''ان سے پوچھو، کیا ان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا اُن چیزوں کا جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں۔'' اب انھی کے سامنے یہ دوسرا سوال پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے سوال کا منشا کفار کو اُن کی اِس گمراہی پر مُتَنَبّہ کرنا تھا کہ وہ زندگی بعدِ موت اور جزا وسزا کو غیر ممکن الوقوع سمجھتے تھے اور اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اب یہ دوسرا سوال اُن کی اِس جہالت پر مُتَنَبّہ کرنے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے تھے اور قیاسی گھوڑے دوڑا کر جس کا چاہتے تھے، اللہ سے رشتہ جوڑ دیتے تھے۔

۸۷ – روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قریش، جُہَینَہ، بنی سَلِمہ، خُزاعہ، بنی مُلَیح اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: النساء، آیت ۱۱۷۔ النحل آیات ۵۷-۵۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۴۰۔ الزخرف، آیات ۱۶ تا ۱۹۔ النجم، آیات ۲۱ تا ۲۷۔

۸۸ – یعنی ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں: یا تو ایسی بات مشاہدے کی

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ
لَمُحْضَرُوْنَ ۙ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ
بِفٰتِنِيْنَ ۙ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ
مَّعْلُوْمٌ ۙ﴿۱۶۴﴾ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۚ﴿۱۶۵﴾ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

انھوں نے اللہ اور ملائکہ[89] کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مُجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں (اور وہ کہتے ہیں کہ) ”اللہ اُن صفات سے پاک ہے جو اُس کے خالص بندوں کے سوا دوسرے لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پس تم اور تمھارے یہ معبُود، اللہ سے کسی کو پھیر نہیں سکتے مگر صرف اُس کو جو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جُھلسنے والا ہو۔[90] اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے،[91] اور ہم صف بستہ خدمت گار ہیں اور تسبیح کرنے والے ہیں۔“

بنا پر کہی جاسکتی ہے، یا پھر اس طرح کا دعویٰ کرنے والے کے پاس کوئی کتابِ الٰہی ہونی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہو کہ ملائکہ میری بیٹیاں ہیں۔ اب اگر اس عقیدے کے قائلین نہ مشاہدے کا دعویٰ کرسکتے ہیں، اور نہ کوئی کتابِ الٰہی ایسی رکھتے ہیں جس میں یہ بات کہی گئی ہو، تو اس سے بڑی جہالت وحماقت اور کیا ہوسکتی ہے کہ محض ہوائی باتوں پر ایک دینی عقیدہ قائم کرلیا جائے اور خداوندِ عالَم کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو صریحاً مضحکہ انگیز ہیں۔

۸۹ — اصل میں ملائکہ کے بجائے الجِنّہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن بعض اکابر مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں جِنّ کا لفظ اپنے لغوی مفہوم (پوشیدہ مخلوق) کے لحاظ سے ملائکہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہی ہیں۔ اور بعد کا مضمون اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں اَلْجِنَّۃ کے لفظ کو ملائکہ کے معنیٰ میں لیا جائے۔

۹۰ — اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے: ”پس تم اور تمھاری یہ عبادت، اس پر تم کسی کو فتنے میں نہیں ڈال سکتے مگر صرف اُس کو جو......“ اس دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اے گمراہو! یہ جو تم ہماری پرستش کررہے ہو اور ہمیں اللہ ربّ العالَمین کی اولاد قرار دے رہے ہو، اس سے تم ہم کو فتنے میں نہیں ڈال سکتے۔ اس سے تو کوئی ایسا احمق ہی فتنے میں پڑسکتا ہے جس کی شامت سر پر سوار ہو۔ دوسرے الفاظ میں گویا فرشتے اپنے ان پرستاروں سے کہہ رہے

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿١٦٧﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٦٨﴾ لَكُنَّا
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿١٦٩﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٧٠﴾ وَلَقَدْ
سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾
وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿١٧٤﴾
وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧٥﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿١٧٦﴾

یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش! ہمارے پاس وہ ''ذِکر'' ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے[۹۲]۔ مگر (جب وہ آ گیا) تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب اِنھیں (اِس رَوِش کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔ اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا[۹۳]۔ پس اے نبیؐ! ذرا کچھ مدّت تک اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے[۹۴]۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟

ہیں کہ ''بُرو ایں دام بر مرغِ دِگر نِہ۔''

۹۱ – یعنی اللہ کی اولاد ہونا تو درکنار، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے جس کا جو درجہ اور مرتبہ مقرر ہے اس سے ذرّہ برابر تجاوُز تک کرنے کی مجال ہم نہیں رکھتے۔

۹۲ – یہی مضمون سورۂ فاطر، آیت ۴۲ میں گزر چکا ہے۔

۹۳ – اللہ کے لشکر سے مراد وہ اہلِ ایمان ہیں جو اللہ کے رسول کی پیروی کریں اور اس کا ساتھ دیں۔ نیز وہ غیبی طاقتیں بھی اس میں شامل ہیں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اہلِ حق کی مدد فرماتا ہے۔

اس امداد اور غلبہ کے معنیٰ لازماً یہی نہیں ہیں کہ ہر زمانے میں اللہ کے ہر نبی اور اس کے پیروؤں کو سیاسی غلبہ ہی حاصل ہو، بلکہ اس غلبے کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک سیاسی غلبہ بھی ہے۔ جہاں اِس نوعیت کا اِستیلا اللہ کے نبیوں کو حاصل نہیں ہوا ہے، وہاں بھی ان کا اَخلاقی تفوّق ثابت ہو کر رہا ہے۔ جن قوموں نے ان کی بات نہیں مانی ہے اور ان کی دی ہوئی ہدایات کے خلاف راستہ اختیار کیا ہے وہ آخرِ کار برباد ہو کر رہی ہیں۔ جہالت و ضلالت کے جو فلسفے بھی لوگوں نے گھڑے اور زندگی کے جو بگڑے ہوئے اطوار بھی زبردستی رائج کیے گئے وہ سب کچھ مدّت تک زور دکھانے کے بعد آخرِ کار اپنی موت آپ مر گئے۔ مگر جن حقیقتوں کو ہزارہا برس سے اللہ کے نبی حقیقت و صداقت کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں، وہ پہلے بھی اٹل تھیں

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ
عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ
رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

ع ۵

جب وہ اِن کے صَحن میں آ اُترے گا تو وہ دن اُن لوگوں کے لیے بہت بُرا ہوگا جنھیں مُتنبِّہ کیا جاچکا ہے۔ بس ذرا اِنھیں کچھ مدّت کے لیے چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود دیکھ لیں گے۔

پاک ہے تیرا رب، عزّت کا مالک، اُن تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ اور سلام ہے مرسلین پر، اور ساری تعریف اللہ ربّ العالمین ہی کے لیے ہے۔ ع

اور آج بھی اٹل ہیں۔ انھیں اپنی جگہ سے کوئی ہلا نہیں سکا ہے۔

۹۴ – یعنی کچھ زیادہ مدّت نہ گزرے گی کہ اپنی شکست اور تمھاری فتح کو یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ بات جس طرح فرمائی گئی تھی اُسی طرح پوری ہوئی۔ اِن آیات کے نزول پر بمشکل ۱۴-۱۵ سال گزرے تھے کہ کفارِ مکہ نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فاتحانہ داخلہ اپنے شہر میں دیکھ لیا، اور پھر اس کے چند سال بعد انھی لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اسلام نہ صرف عرب پر، بلکہ روم و ایران کی عظیم سلطنتوں پر بھی غالب آ گیا۔

تفہیم القرآن

صٓ

(۳۸)

صٓ

نام
آغاز ہی کے حرف صٓ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول
جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، بعض رِوایات کی رُو سے یہ سورت اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکۂ معظّمہ میں عَلانِیَہ دعوت کا آغاز کیا تھا اور قریش کے سرداروں میں اس پر کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کا زمانۂ نُزول تقریباً نبوت کا چوتھا سال قرار پاتا ہے۔ بعض دوسری رِوایات اسے حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے بعد کا واقعہ بتاتی ہیں، اور معلوم ہے کہ وہ ہجرتِ حبشہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ ایک اور سلسلۂ رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو طالب کے آخری مرض کے زمانے میں وہ معاملہ پیش آیا تھا جس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ اسے اگر صحیح مانا جائے تو اس کا زمانۂ نُزول نبوت کا دسواں یا گیارھواں سال ہے۔

تاریخی پَس منظر
امام احمدؒ، نَسائیؒ، تِرْمِذیؒ، ابنِ جَرِیرؒ، ابنِ ابی شَیْبہؒ، ابنِ ابی حاتمؒ اور محمد بن اسحاقؒ وغیرہ نے جو رِوایات نقل کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابو طالب بیمار ہوئے اور قریش کے سرداروں نے محسوس کیا کہ اب یہ اِن کا آخری وقت ہے تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر شیخ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ ہمارا اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چُکا جائیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے اور ان کے بعد ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں اور عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں کہ جب تک شیخ زندہ تھا، یہ لوگ اس کا لحاظ کرتے رہے، اب اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کے بھتیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور تقریباً ۲۵ سردارانِ قریش، جن میں ابو جَہل، ابوسُفیان، اُمَیَّہ بن خَلَف، عاص بن وائل، اَسْوَد بن المُطَّلِب، عُقْبَہ بن ابی مُعَیط، عُتْبہ اور شَیْبہ شامل تھے، ابو طالب کے پاس پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں، پھر کہا: ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اس کے دین پر چھوڑے دیتے ہیں۔ وہ جس معبُود کی عبادت کرنا چاہے کرے، ہمیں اس سے کوئی تعرّض نہیں۔ مگر وہ ہمارے معبُودوں کی مَذمّت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبُودوں کو چھوڑ دیں۔ اس شرط پر آپ ہم سے اس کی صلح کرا دیں۔ ابو طالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپؐ سے کہا کہ بھتیجے! یہ تمھاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تاکہ تمھارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ پھر انھوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سردارانِ قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: چچا جان! میں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابعِ فرمان اور عجم ان کا باج گزار

ہو جائے۔[1] یہ سن کر پہلے تو وہ لوگ سٹپٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کہہ کر ایسے ایک مفید کلمے کو رد کر دیں۔ پھر کچھ سنبھل کر بولے: تم ایک کلمہ کہتے ہو، ہم ایسے دس کلمے کہنے کو تیار ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اس پر وہ سب یک بارگی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ باتیں کہتے ہوئے نکل گئے جو اِس سورت کے ابتدائی حصّے میں اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہیں۔

ابنِ سعدؒ نے طَبَقات میں یہ سارا قصہ اُسی طرح بیان کیا ہے جس طرح اوپر مذکور ہوا، مگر اُن کی رِوایَت کے مطابق یہ ابو طالب کے مَرَضِ وفات کا نہیں بلکہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب حضورؐ نے دعوتِ عام کی ابتدا کی تھی اور مکے میں پے در پے یہ خبریں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں کہ آج فُلاں آدمی مسلمان ہوا اور کل فُلاں۔ اُس وقت سردارانِ قریش یکے بعد دیگرے کئی وفد ابو طالب کے پاس لے کر پہنچے تھے تاکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تبلیغ سے روک دیں، اور انھی وفود میں سے ایک وفد کے ساتھ یہ گفتگو ہوئی تھی۔

زَمَخشَری، رازِی، نَیسابُوری اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ وفد ابو طالب کے پاس اُس وقت گیا تھا جب حضرت عمرؓ کے ایمان لانے پر سردارانِ قریش بوکھلا گئے تھے۔ لیکن کتبِ روایت میں سے کسی میں اس کا حوالہ ہمیں نہیں مل سکا ہے اور نہ ان مفسرین نے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ہے۔ تاہم اگر یہ صحیح ہو تو یہ ہے سمجھ میں آنے والی بات۔ اس لیے کہ کفارِ قریش پہلے ہی یہ دیکھ کر گھبرائے ہوئے تھے کہ اسلام کی دعوت لے کر اُن کے درمیان سے ایک ایسا شخص اُٹھا ہے جو اپنی شرافت، بے داغ سیرت اور دانائی وسنجیدگی کے اعتبار سے ساری قوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور پھر اس کا دستِ راست ابوبکرؓ جیسا آدمی ہے جسے مکہ اور اس کے اطراف کا بچہ بچہ ایک نہایت شریف، راست باز اور ذکی انسان کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اب جو انھوں نے دیکھا ہو گا کہ عمرؓ بن خَطّاب جیسا جری اور صاحبِ عزم آدمی بھی ان دونوں سے جا ملا ہے تو یقیناً انھیں محسوس ہوا ہو گا کہ خطرہ حدِّ برداشت سے گزرتا جا رہا ہے۔

---

[1] حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک رِوایَت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اریدھم علی کلمۃ واحدۃ یقولونھا تدین لھم بھا العرب وتؤدّی الیھم بھا العجم الجزیۃ۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: ادعوھم الٰی ان یتکلموا بکلمۃ تدین لھم بھا العرب ویملکون بھا العجم۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابو طالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم۔ اور ایک رِوایَت کے الفاظ یہ ہیں: ارأیتم ان اعطیتکم کلمۃ تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب ودانت لکم بھا العجم۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود مُدّعا سب کا یکساں ہے، یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمھارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب وعجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمھاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اِس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اُسی میں تم کو پڑا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟

موضوع اور مَباحِث اُوپر جس مجلس کا ذکر کیا گیا ہے، اُسی پر تبصرے سے اس سورت کا آغاز ہوا ہے۔ کفار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کو بنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان لوگوں کے انکار کی اصل وجہ دعوتِ اسلامی کا کوئی نَقص نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا تکبُّر اور حسد اور تقلیدِ اَعمٰی پر اصرار ہے۔ یہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنی ہی بَرادری کے ایک آدمی کو خدا کا نبی مان کر اُس کی پیروی قبول کرلیں۔ یہ اُنھی جاہلانہ تخیلات پر جمے رہنا چاہتے ہیں جن پر انھوں نے اپنے قریب کے زمانے کے لوگوں کو پایا ہے، اور جب اس جَہالت کے پردے کو چاک کر کے ایک شخص ان کے سامنے اصل حقیقت کو پیش کرتا ہے تو یہ اس پر کان کھڑے کرتے ہیں اور اسے عجیب بات بلکہ نرالی اور اَنہونی بات قرار دیتے ہیں۔ اِن کے نزدیک توحید اور آخرت کا تخیل محض ناقابلِ قبول ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا تخیُّل ہے جس کا بس مذاق ہی اُڑایا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ کے ابتدائی حصّے میں بھی اور آخری فقروں میں بھی کفار کو صاف صاف مُتَنَبِّہ کیا ہے کہ جس شخص کا تم آج مذاق اُڑا رہے ہو اور جس کی رہنمائی قبول کرنے سے تم کو آج سخت انکار ہے، عنقریب وہی غالب آ کر رہے گا اور وہ وقت دُور نہیں ہے جب اِسی شہرِ مکہ میں، جہاں تم اس کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو، اس کے آگے تم سب سرنگوں نظر آؤ گے۔

پھر پے در پے ۹ پیغمبروں کا ذکر کر کے، جن میں حضرت داوٗدؑ و سلیمانؑ کا قصہ زیادہ مفصَّل ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بات سامعین کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اُس کا قانونِ عدل بالکل بے لاگ ہے، اس کے ہاں انسان کا صحیح رَوِیَّہ ہی مقبول ہے، بے جا بات خواہ کوئی بھی کرے وہ اس پر گرفت کرتا ہے، اور اس کے ہاں وہی لوگ پسند کیے جاتے ہیں جو لغزش پر اصرار نہ کریں بلکہ اس پر مُتَنَبِّہ ہوتے ہی تائب ہو جائیں اور دنیا میں آخرت کی جواب دِہی کو یاد رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں۔

اس کے بعد فرماں بردار بندوں اور سرکش بندوں کے اُس انجام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو وہ عالَمِ آخرت میں دیکھنے والے ہیں، اور اس سلسلے میں کفار کو دو باتیں خاص طور پر بتائی گئی ہیں: ایک، یہ کہ آج جن سرداروں اور پیشواؤں کے پیچھے جاہل لوگ اندھے بن کر ضلالت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں، کل وہی جہنّم میں اپنے پیروؤں سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے اور دونوں ایک دوسرے کو کوس رہے ہوں گے۔ دوسرے، یہ کہ آج جن اہلِ ایمان کو یہ لوگ ذلیل وخوار سمجھ رہے ہیں، کل یہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ اُن کا جہنّم میں کہیں نام و نشان تک نہیں ہے اور یہ خود اُس کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

آخر میں قصۂ آدم اور ابلیس کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اس سے مقصود کفارِ قریش کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے جھکنے سے جو تکبر تمھیں مانع ہو رہا ہے، وہی تکبُّر آدمؑ کے آگے جھکنے سے ابلیس کو بھی مانع ہوا تھا۔ خدا نے جو مرتبہ آدمؑ کو دیا تھا اُس پر ابلیس نے حسد کیا اور حکمِ خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کر کے لعنت کا مستحق ہوا۔ اسی طرح جو مرتبہ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے اس پر تم حسد کر رہے ہو اور اس بات کے لیے تیار نہیں ہو کہ جسے خدا نے رسول مقرر کیا ہے اس کی اطاعت کرو، اس لیے جو انجام ابلیس کا ہونا ہے وہی آخرِ کار تمھارا بھی ہونا ہے۔

آیاتها ۸۸

سُورَۃُ صٓ مَکِّیَّۃٌ

رکوعاتها ۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ؕ﴿۱﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ
وَّ شِقَاقٍ ﴿۲﴾ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّ لَاتَ حِیۡنَ
مَنَاصٍ ﴿۳﴾ وَ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ ۫ وَ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ

صٓ،[1] قسم ہے نصیحت بھرے[2] قرآن کی، بلکہ یہی لوگ، جنھوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبّر اور ضد میں مبتلا ہیں۔[3] اِن سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں (اور جب اُن کی شامت آئی ہے) تو وہ چیخ اُٹھے ہیں، مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا۔

اِن لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجّب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود اِنھی میں سے آگیا۔[4] منکرین کہنے لگے کہ

۱ - اگرچہ تمام حُروفِ مُقطَّعات کی طرح ص کے مفہوم کا تعیُّن بھی مشکل ہے، لیکن ابنِ عباسؓ اور ضحّاکؒ کا یہ قول بھی کچھ دل کو لگتا ہے کہ اس سے مراد ہے: صادقٌ فی قولِہٖ، یا صَدَقَ محمّدٌ۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں، جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ صاد کے حرف کو ہم اردو میں بھی اسی سے ملتے جلتے معنٰی میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: میں اس پر صاد کرتا ہوں، یعنی اس کی تصدیق کرتا ہوں، یا اسے صحیح قرار دیتا ہوں۔

۲ - اصل الفاظ ہیں: ذِی الذِّکۡرِ۔ اس کے دو معنٰی ہو سکتے ہیں: ایک، ذی شرف، یعنی قرآنِ بزرگ۔ دوسرے، ذی التذکیر، یعنی نصیحت سے لبریز قرآن، یا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والا اور غفلت سے چونکانے والا قرآن۔

۳ - اگر ص کی وہ تاویل قبول کی جائے جو ابنِ عباسؓ اور ضحّاکؒ نے بیان کی ہے تو اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ ”قسم ہے اس قرآنِ بزرگ، یا اس نصیحت سے لبریز قرآن کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچّی بات پیش کر رہے ہیں، مگر جو لوگ انکار پر جمے ہوئے ہیں وہ دراصل ضد اور تکبر میں مبتلا ہیں۔“ اور اگر ص کو اُن حُروفِ مُقطَّعات میں سے سمجھا جائے جن کا مفہوم متعین نہیں کیا جاسکتا، تو پھر قسم کا جواب محذوف ہے جس پر ”بلکہ“ اور اس کے بعد کا فقرہ خود روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی پوری عبارت پھر یوں ہوگی کہ ”اِن منکرین کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ جو دین ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اُس میں کوئی خلل ہے، یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اظہارِ حق میں کوئی کوتاہی کی ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف ان کی جھوٹی شیخی، ان کی جاہلانہ نخوت اور ان کی ہٹ دھرمی ہے، اور اس پر یہ نصیحت بھرا قرآن شاہد ہے جسے دیکھ کر ہر غیر متعصّب آدمی تسلیم کرے گا کہ اس میں فہمایش کا حق پوری طرح ادا کر دیا گیا ہے۔“

هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا
لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝۵ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى
اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝۶ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ
اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝۷ ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا ؕ

"یہ ساحر[5] ہے، سخت جھوٹا ہے، کیا اِس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" اور سردارانِ قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے[6] کہ "چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبُودوں کی عبادت پر۔ یہ بات[7] تو کسی اور ہی غرض سے کہی جارہی ہے[8]۔ یہ بات ہم نے زمانۂ قریب کی ملّت میں کسی سے نہیں سُنی[9]۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا؟"

۴ – یعنی یہ ایسے احمق لوگ ہیں کہ جب ایک دیکھا بھالا آدمی خود اِن کی اپنی جنس، اپنی قوم اور اپنی ہی برادری میں سے ان کو خبردار کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تو ان کو یہ عجیب بات معلوم ہوئی۔ حالانکہ عجیب بات اگر ہوتی تو یہ ہوتی کہ انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے آسمان سے کوئی اور مخلوق بھیج دی جاتی، یا ان کے درمیان یکایک ایک اجنبی آدمی کہیں باہر سے آ کھڑا ہوتا اور نبوت کرنی شروع کر دیتا۔ اُس صورت میں تو بلاشبہ یہ لوگ بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ یہ عجیب حرکت ہمارے ساتھ کی گئی ہے، بھلا جو انسان ہی نہیں ہے وہ ہمارے حالات اور جذبات اور ضروریات کو کیا جانے گا کہ ہماری رہنمائی کر سکے، یا جو اجنبی آدمی اچانک ہمارے درمیان آ گیا ہے اس کی صداقت کو آخر ہم کیسے جانچیں اور کیسے معلوم کریں کہ یہ بھروسے کے قابل آدمی ہے یا نہیں، اس کی سیرت و کردار کو ہم نے کب دیکھا ہے کہ اس کی بات کا اعتبار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔

۵ – حضورؐ کے لیے ساحر کا لفظ وہ لوگ اس معنیٰ میں بولتے تھے کہ یہ شخص کچھ ایسا جادو کرتا ہے جس سے آدمی دیوانہ ہو کر اِس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ کسی تعلق کے کٹ جانے اور کوئی نقصان پہنچ جانے کی پروا نہیں کرتا۔ باپ کو بیٹا اور بیٹے کو باپ چھوڑ بیٹھتا ہے۔ بیوی شوہر کو چھوڑ دیتی ہے اور شوہر بیوی سے جدا ہو جاتا ہے۔ ہجرت کی نوبت آئے تو دامن جھاڑ کر وطن سے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ کاروبار بیٹھ جائے اور ساری برادری بائیکاٹ کر دے تو اسے بھی گوارا کر لیتا ہے۔ سخت سے سخت جسمانی اذیتیں بھی انگیز کر جاتا ہے، مگر اس شخص کا کلمہ پڑھنے سے کسی طرح باز نہیں آتا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵)

۶ – اشارہ ہے اُن سرداروں کی طرف جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُن کر ابوطالب کی مجلس سے اٹھ گئے تھے۔

۷ – یعنی حضورؐ کا یہ کہنا کہ کلمۂ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ کے قائل ہو جاؤ تو عرب و عجم سب تمھارے تابعِ فرمان ہو جائیں گے۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝٨ اَمْ
عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝٩ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۣ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝١٠

اصل بات یہ ہے کہ یہ میرے ''ذِکر'' پر شک کر رہے ہیں[10]، اور یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انھوں نے میرے عذاب کا مزا چکّھا نہیں ہے۔ کیا تیرے داتا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے اِن کے قبضے میں ہیں؟ کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں؟ اچھا تو یہ عالَمِ اسباب کی بلندیوں پر چڑھ کر دیکھیں[11]!

۸ – اُن کا مطلب یہ تھا کہ اس دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے، دراصل یہ دعوت اس غرض سے دی جا رہی ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابعِ فرمان ہو جائیں اور یہ ہم پر اپنا حکم چلائیں۔

۹ – یعنی قریب کے زمانے میں ہمارے اپنے بزرگ بھی گزرے ہیں، عیسائی اور یہودی بھی ہمارے ملک اور آس پاس کے ملکوں میں موجود ہیں، اور مجوسیوں سے ایران و عراق اور مشرقی عرب بھرا پڑا ہے۔ کسی نے بھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ انسان بس ایک اللہ رب العالمین کو مانے اور دوسرے کسی کو نہ مانے۔ آخر ایک اکیلے خدا پر کون اکتفا کرتا ہے۔ اللہ کے پیاروں کو تو سب ہی مان رہے ہیں۔ اُن کے آستانوں پر جا کر ماتھے رگڑ رہے ہیں۔ نذریں اور نیازیں دے رہے ہیں۔ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کہیں سے اولاد ملتی ہے۔ کہیں سے رزق ملتا ہے۔ کسی آستانے پر جو مراد مانگو بر آتی ہے۔ اُن کے تصرّفات کو ایک دنیا مان رہی ہے اور اُن سے فیض پانے والے بتا رہے ہیں کہ اِن درباروں سے لوگوں کی کس کس طرح مشکل کُشائی و حاجت روائی ہوتی ہے۔ اب اِس شخص سے ہم یہ نرالی بات سُن رہے ہیں، جو کبھی کسی سے نہ سنی تھی، کہ ان میں سے کسی کا بھی خدائی میں کوئی حصہ نہیں اور پوری کی پوری خدائی بس ایک اکیلے اللہ ہی کی ہے۔

۱۰ – بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَے محمد (صلی اللہ علیک وسلم)! یہ لوگ دراصل تمھیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ مجھے جھٹلا رہے ہیں۔ تمھاری صداقت پر تو پہلے بھی انھوں نے شک نہیں کیا تھا۔ آج یہ شک جو کیا جا رہا ہے یہ دراصل میرے ''ذکر'' کی وجہ سے ہے۔ مَیں نے ان کو نصیحت کرنے کی خدمت جب تمھارے سُپرد کی تو یہ اُسی شخص کی صداقت میں شک کرنے لگے جس کی راست بازی کی پہلے قسمیں کھایا کرتے تھے۔ یہی مضمون سورۂ اَنعام آیت ۳۳ میں بھی گزر چکا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۲۱)

۱۱ – یہ کفار کے اِس قول کا جواب ہے کہ ''کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا''۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ نبی ہم کس کو بنائیں اور کسے نہ بنائیں، اس کا فیصلہ کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔ یہ لوگ آخر کب سے اِس فیصلے کے مختار ہو گئے۔ اگر یہ اس کے مختار بننا چاہتے ہیں تو کائنات کی فرماں روائی کے منصب پر قبضہ کرنے کے لیے عرش پر پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ جسے یہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھیں اُس پر وحی نازل ہو اور جسے ہم مستحق سمجھتے ہیں اس پر وہ نازل نہ ہو۔ یہ مضمون

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ﴿١١﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ
نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿١٢﴾ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ
لْـَٔيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ﴿١٣﴾ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ
عِقَابِ ﴿١٤﴾ ع وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ
فَوَاقٍ ﴿١٥﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿١٦﴾

ع ۱۴/۱۰

یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اِسی جگہ شکست کھانے والا ہے۔[12] اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم، اور عاد، اور میخوں والا فرعون[13]، اور ثمود، اور قومِ لوطؑ، اور اَیکہ والے جُھٹلا چکے ہیں۔ جتھے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جُھٹلایا اور میری عُقُوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا۔ع یہ لوگ بھی بس ایک دھماکے کے منتظر ہیں جس کے بعد کوئی دوسرا دھماکا نہ ہوگا۔[14] اور یہ کہتے ہیں کہ اَے ہمارے رب! یوم الحساب سے پہلے ہی ہمارا حصّہ ہمیں جلدی سے دے دے۔[15]

متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے، کیونکہ کفارِ قریش بار بار کہتے تھے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے نبی بن گئے، کیا خدا کو قریش کے بڑے بڑے سرداروں میں سے کوئی اس کام کے لیے نہ ملا تھا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۱۰۰۔ الزُّخرُف، آیات ۳۱-۳۲)

۱۲ – ''اِسی جگہ'' کا اشارہ مکۂ معظّمہ کی طرف ہے۔ یعنی جہاں یہ لوگ یہ باتیں بنا رہے ہیں، اِسی جگہ ایک دن یہ شکست کھانے والے ہیں اور یہیں وہ وقت آنے والا ہے جب یہ منہ لٹکائے اُسی شخص کے سامنے کھڑے ہوں گے جسے آج یہ حقیر سمجھ کر نبی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

۱۳ – فرعون کے لیے ''ذِی الْاَوْتَادِ'' (میخوں والا) یا تو اس معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے کہ اس کی سلطنت ایسی مضبوط تھی گویا میخ زمین پر ٹُھکی ہوئی ہو۔ یا اس بنا پر کہ اس کے کثیر التعداد لشکر جہاں ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹُھکی نظر آتی تھیں۔ یا اس بنا پر کہ وہ جس سے ناراض ہوتا تھا اسے میخیں ٹھونک کر عذاب دیا کرتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ میخوں سے مراد اَہرامِ مصر ہوں جو زمین کے اندر میخ کی طرح ٹُھکے ہوئے ہیں۔

۱۴ – یعنی عذاب کا ایک ہی کڑکا انھیں ختم کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ کسی دوسرے کڑکے کی حاجت پیش نہ آئے گی۔ دوسرا مفہوم اس فقرے کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد پھر انھیں کوئی افاقہ نصیب نہ ہوگا، اتنی دیر کی بھی مُہلت نہ ملے گی جتنی دیر اُونٹنی کا دودھ نچوڑتے وقت ایک دفعہ سونتے ہوئے تھن میں دوبارہ سونتنے تک دُودھ اُترنے میں لگتی ہے۔

اِصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَيۡدِ‌ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾
اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِىِّ وَالۡاِشۡرَاقِۙ ﴿۱۸﴾ وَالطَّيۡرَ

اَے نبیؐ! صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں[16]، اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤدؑ کا قصہ بیان کرو[17] جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔[18] ہر معاملے میں اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مُسَخَّر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے

۱۵ – یعنی اللہ کے عذاب کا حال تو ہے وہ جو ابھی بیان کیا گیا، اور اِن نادانوں کا حال یہ ہے کہ یہ نبی سے مذاق کے طور پر کہتے ہیں کہ جس یوم الحساب سے تم ہمیں ڈراتے ہو اُس کے آنے تک ہمارے معاملے کو نہ ٹالو بلکہ ہمارا حساب ابھی چُکوا دو، جو کچھ بھی ہمارے حصّے کی شامت لکھی ہے وہ فوراً ہی آ جائے۔

۱۶ – اشارہ ہے کفارِ مکہ کی اُن باتوں کی طرف جن کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کی یہ بکواس کہ یہ شخص ساحر اور کذّاب ہے، اور ان کا یہ اعتراض کہ اللہ میاں کے پاس رسول بنانے کے لیے کیا بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا، اور یہ الزام کہ اس دعوتِ توحید سے اس شخص کا مقصد کوئی مذہبی تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کی نیت کچھ اور ہی ہے۔

۱۷ – اس فقرے کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ’’ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کرو۔‘‘ پہلے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس قصّے میں اِن لوگوں کے لیے ایک سبق ہے۔ اور دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مراد یہ ہے کہ اس قصّے کی یاد خود تمھیں صبر کرنے میں مدد دے گی۔ چونکہ یہ قصّہ بیان کرنے سے دونوں ہی باتیں مقصود ہیں، اس لیے الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو دونوں مفہوموں پر دلالت کرتے ہیں۔ (حضرت داؤدؑ کے قصّے کی تفصیلات اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکی ہیں: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۷۳۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۷-۶۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۰ تا ۷۳، النمل، حواشی ۱۸ تا ۲۰۔ جلد چہارم، سَبا، حواشی ۱۴ تا ۱۶)

۱۸ – اصل الفاظ ہیں: ذَاالۡاَیۡدِ، ’’ہاتھوں والا‘‘۔ ہاتھ کا لفظ صرف عَرَبی زبان ہی میں نہیں، دوسری زبانوں میں بھی قوت و قدرت کے لیے اِستِعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے لیے جب ان کی صفت کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ وہ ’’ہاتھوں والے‘‘ تھے تو اس کا مطلب لازماً یہی ہوگا کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک تھے۔ اِن قوتوں سے بہت سی قوتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ مثلاً جسمانی طاقت، جس کا مظاہرہ انھوں نے جالُوت سے جنگ کے موقع پر کیا تھا۔ فوجی اور سیاسی طاقت، جس سے انھوں نے گرد و پیش کی مشرک قوموں کو شکست دے کر ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی۔ اَخلاقی طاقت، جس کی بدولت انھوں نے بادشاہی میں فقیری کی اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے اور اس کے حُدود کی پابندی کرتے رہے۔ اور عبادت کی طاقت، جس کا حال یہ تھا کہ حکومت و فرماں روائی اور جہاد فی سبیل اللہ کی مصروفیتوں کے باوجود، صحیحین کی رِوایت کے مطابق، وہ ہمیشہ ایک دن بیچ روزہ رکھتے تھے اور روزانہ ایک تہائی رات نماز میں گزارتے تھے۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوالدرداؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت داؤدؑ کا ذکر آتا

مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ
الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۙ﴿۲۱﴾ اِذْ
دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى
بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَاۗءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾
اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۣ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۣ

وقفِ لازم

سمٹ آتے اور سب کے سب اُس کی تسبیح کی طرف متوجّہ ہو جاتے تھے۔[19] ہم نے اس کی سلطنت مضبُوط کر دی تھی، اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کُن بات کہنے کی صلاحیّت بخشی تھی۔[20] پھر تمھیں کچھ خبر پہنچی ہے اُن مقدّمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر اُس کے بالا خانے میں گُھس آئے تھے؟[21] جب وہ داؤدؑ کے پاس پہنچے تو وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا۔[22] انھوں نے کہا: ”ڈریے نہیں، ہم دو فریقِ مقدّمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے، بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں راہِ راست بتایئے۔ یہ میرا بھائی ہے،[23] اِس کے پاس ننّانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دُنبی ہے۔

تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ، ”وہ سب سے زیادہ عبادت گزار آدمی تھے۔“

۱۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۱۔

۲۰ – یعنی ان کا کلام الجھا ہوا نہ ہوتا تھا کہ ساری تقریر سُن کر بھی آدمی نہ سمجھ سکے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں، بلکہ وہ جس معاملے پر بھی گفتگو کرتے، اس کے تمام بنیادی نکات کو مُنقّح کر کے رکھ دیتے، اور اصل فیصلہ طلب مسئلے کو ٹھیک ٹھیک متعیّن کر کے اس کا بالکل دو ٹوک جواب دے دیتے تھے۔ یہ بات کسی شخص کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک وہ عقل و فہم اور قادر الکلامی کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچا ہوا نہ ہو۔

۲۱ – حضرت داؤدؑ کا ذکر جس غرض کے لیے اس مقام پر کیا گیا ہے اس سے مقصود دراصل یہی قصّہ سنانا ہے جو یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اُن کی جو صفاتِ عالیہ بطورِ تمہید بیان کی گئی ہیں ان کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ داؤد علیہ السلام، جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے، کس مرتبے کے انسان تھے۔

۲۲ – گھبرانے کی وجہ یہ تھی کہ دو آدمی فرماں روائے وقت کے پاس اُس کی خلوَت گاہ میں سیدھے راستے سے جانے کے بجائے یکایک دیوار چڑھ کر جا پہنچے تھے۔

فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَ عَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ
بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ
لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ
وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ﴿۲۴﴾ السجدۃ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا

اِس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دُنبی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبالیا۔[۲۴] " داؤدؑ نے جواب دیا: " اِس شخص نے اپنی دُنبیوں کے ساتھ تیری دُنبی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا،[۲۵] اور واقعہ یہ ہے کہ مِل جُل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں، بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور عملِ صالح کرتے ہیں، اور ایسے لوگ کم ہی ہیں۔" (یہ بات کہتے کہتے) داؤدؑ سمجھ گیا کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے، چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رُجوع کر لیا۔[۲۶] تب ہم نے اس کا وہ قصور معاف کیا اور یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے

۲۳ — بھائی سے مراد حقیقی بھائی نہیں بلکہ دینی اور قومی بھائی ہے۔

۲۴ — آگے کی بات سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی ضروری ہے کہ اِستغاثہ کا یہ فریق یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ اس شخص نے میری وہ ایک دُنبی چھین لی اور اپنی دُنبیوں میں مِلا لی، بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مجھ سے میری دُنبی مانگ رہا ہے، اور اس نے گفتگو میں مجھے دبالیا ہے، کیونکہ یہ بڑی شخصیت کا آدمی ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں، میں اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتا کہ اس کا مطالبہ ردّ کر دوں۔

۲۵ — یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ حضرت داؤدؑ نے ایک ہی فریق کی بات سُن کر اپنا فیصلہ کیسے دے دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب مدّعی کی شکایت پر مدّعا علیہ خاموش رہا اور اس کی تردید میں کچھ نہ بولا تو یہ خود ہی اس کے اقرار کا ہم معنیٰ تھا۔ اس بنا پر حضرت داؤدؑ نے یہ رائے قائم کی کہ واقعہ وہی کچھ ہے جو مدّعی بیان کر رہا ہے۔

۲۶ — اس امر میں اختلاف ہے کہ اس مقام پر سجدۂ تلاوت واجب ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہاں سجدہ واجب نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک نبی کی توبہ ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ وجوب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں ابنِ عباسؓ سے تین روایتیں محدثین نے نقل کی ہیں۔ عِکرِمہ کی رِوایت یہ ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا: "یہ اُن آیات میں سے نہیں ہے جن پر سجدہ لازم ہے

لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ

تقرّب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔[۲۷] (ہم نے اس سے کہا:) "اے داؤدؑ! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے،

مگر میں نے اس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرتے دیکھا ہے۔" (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مُسندِ احمد) دوسری رِوایت جو اُن سے سعید بن جُبَیرؒ نے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "سورۂ ص میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور فرمایا: داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور پر سجدہ کیا تھا اور ہم شکر کے طور پر سجدہ کرتے ہیں"، یعنی اس بات پر کہ ان کی توبہ قبول ہوئی۔ (نَسائی) تیسری رِوایت جو مجاہدؒ نے ان سے نقل کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ "یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے راہِ راست دکھائی تھی، لہٰذا تم ان کے طریقے کی پیروی کرو۔" اب چونکہ حضرت داؤدؑ بھی ایک نبی تھے اور انھوں نے اس موقع پر سجدہ کیا تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اقتدا میں یہاں سجدہ فرمایا۔ (بخاری) یہ تین بیانات تو حضرت ابنِ عباسؓ کے ہیں۔ اور حضرت ابوسعید خُدریؓ کا بیان یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبے میں سورۂ ص پڑھی اور جب آپؐ اس آیت پر پہنچے تو آپؐ نے منبر پر سے اُتر کر سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ سب حاضرین نے بھی کیا۔ پھر ایک دوسرے موقع پر اسی طرح آپؐ نے یہی سورہ پڑھی تو اس آیت کو سنتے ہی لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: "یہ ایک نبی کی توبہ ہے، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ سجدے کے لیے تیار ہو گئے ہو"—— یہ فرما کر آپؐ منبر سے اُترے اور سجدہ کیا اور سب حاضرین نے بھی کیا۔ (ابوداؤد) ان رِوایات سے اگرچہ وجوبِ سجدہ کی قطعی دلیل تو نہیں ملتی، لیکن کم از کم اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اکثر سجدہ فرمایا ہے، اور سجدہ نہ کرنے کی بہ نسبت یہاں سجدہ کرنا بہرحال افضل ہے۔ بلکہ ابنِ عباسؓ کی تیسری رِوایت، جو ہم نے اوپر بخاری کے حوالے سے نقل کی ہے، عَدَمِ وجوب کی بہ نسبت وجوب کے حکم کا پلڑا جھکا دیتی ہے۔

ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خَرَّ رَاكِعًا (رُکوع میں گر پڑا) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، مگر تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد خَرَّ سَاجِدًا (سجدے میں گر پڑا) ہے۔ اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب نے یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ نماز یا غیر نماز میں آیتِ سجدہ سُن کر یا پڑھ کر آدمی سجدے کے بجائے صرف رُکوع بھی کر سکتا ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے رُکوع کا لفظ استعمال کر کے سجدہ مراد لیا ہے تو معلوم ہوا کہ رکوع سجدے کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ فُقہائے شافعیہ میں سے امام خَطّابی کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ رائے اگرچہ بجائے خود صحیح اور معقول ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے عمل میں ہم کو ایسی کوئی نظیر نہیں ملی کہ آیتِ سجدہ پر سجدہ کرنے کے بجائے رُکوع ہی کر لینے پر اِکتفا کیا گیا ہو۔ لہٰذا اس رائے پر عمل صرف اُس صورت میں کرنا چاہیے جب سجدہ کرنے میں کوئی اَمر مانع ہو۔ اسے معمول بنا لینا دُرست نہیں ہے، اور خود امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ اسے معمول بنایا جائے، بلکہ وہ صرف اس کے جواز کے قائل ہیں۔

۲۷ – اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤدؑ سے قصور تو ضرور ہوا تھا، اور وہ کوئی ایسا قصور تھا جو دُنبیوں والے مُقدّمے سے کسی طرح کی مماثلت رکھتا تھا اِسی لیے اُس کا فیصلہ سناتے ہوئے معاً ان کو یہ خیال آیا کہ یہ میری آزمائش ہوئی ہے، لیکن اُس

فَاحۡكُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ بِالۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الۡهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ
الَّذِيۡنَ يَضِلُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا نَسُوۡا يَوۡمَ الۡحِسَابِ ﴿۲۶﴾ ع

لٰہذا تُو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔[۲۸]'' ع

قصور کی نوعیت ایسی شدید نہ تھی کہ اسے معاف نہ کیا جاتا، یا اگر معاف کیا بھی جاتا تو وہ اپنے مرتبۂ بلند سے گرا دیے جاتے۔ اللہ تعالیٰ یہاں خود تصریح فرما رہا ہے کہ جب انھوں نے سجدے میں گر کر توبہ کی تو نہ صرف یہ کہ انھیں معاف کر دیا گیا، بلکہ دنیا اور آخرت میں ان کو جو بلند مقام حاصل تھا اُس میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

۲۸ — یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندیِ دَرَجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل اُن سے صادر ہوا تھا اُس کے اندر خواہشِ نفس کا کچھ دخل تھا، اس کا حاکمانہ اِقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا، اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرماں روا کو زیب نہ دیتا تھا۔

یہاں پہنچ کر تین سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں: اول، یہ کہ وہ فعل کیا تھا؟ دوسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے اِس طرح پردے پردے ہی میں اس کی طرف کیوں اشارہ کیا؟ تیسرے، یہ کہ اِس سِیاق وسَباق میں اس کا ذکر کس مُناسبت سے کیا گیا ہے؟

جن لوگوں نے بائبل (عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابِ مقدّس) کا مُطالَعہ کیا ہے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں حضرت داؤدؑ پر اُورِیّاہ حِتّی (Uriah the Hittite) کی بیوی سے زنا کرنے، اور پھر اُورِیّاہ کو ایک جنگ میں قصداً ہلاک کروا کر اُس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا صاف صاف الزام لگایا گیا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی عورت، جس نے ایک شخص کی بیوی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت داؤدؑ کے حوالے کیا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کی ماں تھی۔ یہ پورا قصہ بائبل کی کتابِ سموئیل دوم، باب ۱۱ - ۱۲ میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے یہ بائبل میں درج ہو چکا تھا۔ دُنیا بھر کے یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو بھی اپنی اِس کتابِ مقدس کی تلاوت کرتا، یا اسے سُنتا تھا، وہ اس قصے سے نہ صرف واقف تھا بلکہ اس پر ایمان بھی لاتا تھا۔ انھی لوگوں کے ذریعے سے یہ دنیا میں مشہور ہوا، اور آج تک حال یہ ہے کہ مغربی ممالک میں بنی اسرائیل اور عبرانی مذہب کی تاریخ پر کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی جاتی جس میں حضرت داؤدؑ کے خلاف اِس الزام کو دُہرایا نہ جاتا ہو۔ اس مشہور قصے میں یہ بات بھی درج ہے کہ:

''خداوند نے ناتَن کو داؤدؑ کے پاس بھیجا۔ اُس نے اس کے پاس آ کر اس سے کہا: کسی شہر میں دو شخص تھے۔

ایک امیر، دوسرا غریب۔ اُس امیر کے پاس بہت سے ریوڑ اور گلّے تھے۔ پر اُس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اس نے خرید کر پالا تھا، اور وہ اُس کے اور اُس کے بال بچوں کے ساتھ بڑھی تھی۔ وہ اُسی کے نوالے میں سے کھاتی اور اس کے پیالے سے پیتی اور اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کے لیے بطور بیٹی کے تھی۔ اور اُس امیر کے ہاں کوئی مسافر آیا۔ سو اُس نے اُس مسافر کے لیے جو اُس کے ہاں آیا تھا، پکانے کو اپنے ریوڑ اور گلّے میں سے کچھ نہ لیا بلکہ اُس غریب کی بھیڑ لے لی اور اُس شخص کے لیے، جو اُس کے ہاں آیا تھا، پکائی۔ تب داؤد کا غضب اُس شخص پر بشدت بھڑکا اور اُس نے ناتن سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم! کہ وہ شخص جس نے یہ کام کیا، واجب القتل ہے۔ سو اُس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑے گا، کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اسے ترس نہ آیا۔ تب ناتن نے داؤد سے کہا کہ وہ شخص تُو ہی ہے...... تو نے حِتّی اُوریّاہ کو تلوار سے مارا اور اس کی بیوی لے لی تا کہ وہ تیری بیوی بنے اور اس کو بنی عَمُّون کی تلوار سے قتل کروایا۔" (۲-سموئیل، باب ۱۲، فقرات ۱ تا ۹)

اس قصے اور اُس کی اِس شہرت کی موجودگی میں یہ ضرورت باقی نہ تھی کہ قرآنِ مجید میں اس کے متعلق کوئی تفصیلی بیان دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ ہے بھی نہیں کہ وہ اپنی کتابِ پاک میں ایسی باتوں کو کھول کر بیان کرے۔ اس لیے یہاں پردے پردے ہی میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اہلِ کتاب نے اسے بنا کیا دیا ہے۔ اصل واقعہ جو قرآنِ مجید کے مذکورۂ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اُوریّاہ (یا جو کچھ بھی اُس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرماں روا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیّت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی، اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر، قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی فرمایش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے ایک فرضی مُقدّمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤدؑ ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مُقدّمہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسے سُن کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلے کے الفاظ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل پوری طرح اُن کے اور اُس شخص کے معاملے پر چسپاں ہوتی ہے، اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اُس کا صُدور خود اُن سے اُس شخص کے معاملے میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رُجوع فرما لیا۔

بائبل میں اس واقعے کی وہ گھناؤنی شکل کیسے بنی؟ یہ بات بھی تھوڑے سے غور کے بعد سمجھ میں آ جاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کو اُس خاتون کی خوبیوں کا کسی ذریعے سے علم ہو گیا تھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسی لائق عورت ایک معمولی افسر کی بیوی ہونے کے بجائے مُلک کی مَلِکہ ہونی چاہیے۔ اسی خیال سے مغلوب ہو کر انھوں نے اس کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اس میں کوئی قباحت انھوں نے اس لیے محسوس نہ کی کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ اُن کے ہاں یہ ایک معمولی بات تھی کہ ایک شخص اگر کسی کی بیوی کو پسند کرتا تو بے تکلف

اس سے درخواست کر دیتا تھا کہ اسے میرے لیے چھوڑ دے۔ ایسی درخواست پر کوئی بُرا نہ مانتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات دوست ایک دوسرے کے پاسِ خاطر سے بیوی کو خود طلاق دے دیتے تھے تاکہ دوسرا اس سے شادی کر لے۔ لیکن یہ بات کرتے وقت حضرت داؤدؑ کو اس اِمر کا احساس نہ ہوا کہ ایک عام آدمی کی طرف سے اس طرح کی خواہش کا اظہار تو جبر و ظلم کے عُنصُر سے خالی ہو سکتا ہے، مگر ایک فرماں روا کی طرف سے جب ایسی خواہش ظاہر کی جائے تو وہ جبر سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ اس پہلو کی طرف جب اُس تمثیلی مُقدّمے کے ذریعے سے ان کو توجُّہ دلائی گئی تو وہ بلاتأمُّل اپنی اس خواہش سے دست بردار ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر بعد میں کسی وقت جب ان کی کسی خواہش اور کوشش کے بغیر اُس خاتون کا شوہر ایک جنگ میں شہید ہو گیا، اور انھوں نے اس سے نکاح کر لیا، تو یہودیوں کے خبیث ذہن نے افسانہ تراشی شروع کر دی، اور یہ خُبثِ نفس اُس وقت اور زیادہ تیزی سے کام کرنے لگا جب بنی اسرائیل کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا دشمن ہو گیا۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حاشیہ ۵۶) اِن مُحرّکات کے زیرِ اثر یہ قصہ تصنیف کر ڈالا گیا کہ حضرت داؤدؑ نے، معاذ اللہ! اُورِیّاہ کی بیوی کو اپنے محل کی چھت پر سے اس حالت میں دیکھ لیا تھا کہ وہ برَہنہ نہا رہی تھی۔ انھوں نے اس کو اپنے ہاں بلوایا اور اس سے زِنا کا ارتکاب کیا جس سے وہ حاملہ ہو گئی۔ پھر انھوں نے اُورِیّاہ کو بنی عَمُّون کے مقابلے پر جنگ میں بھیج دیا اور فوج کے کمانڈر یوآب کو حکم دیا کہ اسے لڑائی میں ایسی جگہ مقرر کر دے جہاں وہ لازماً مارا جائے۔ اور جب وہ مارا گیا تو انہوں نے اس کی بیوی سے شادی کر لی، اور اسی عورت کے پیٹ سے سلیمان (علیہ السلام) پیدا ہوئے۔ یہ تمام جھوٹے الزامات ظالموں نے اپنی ''کتابِ مقدس'' میں ثبت کر دیے ہیں، تاکہ نسلاً بعدَ نسلٍ اسے پڑھتے رہیں اور اپنی قوم کے اُن دو بزرگ ترین انسانوں کی تذلیل کرتے رہیں جو حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے سب سے بڑے مُحسن تھے۔

قرآنِ مجید کے مفسرین میں سے ایک گروہ نے تو اُن افسانوں کو قریب قریب جُوں کا تُوں قبول کر لیا ہے جو بنی اسرائیل کے ذریعے سے ان تک پہنچے ہیں۔ اسرائیلی روایات کا صرف اتنا حصّہ انھوں نے ساقط کیا ہے جس میں حضرت داؤدؑ پر زِنا کا الزام لگایا گیا تھا اور عورت کے حاملہ ہو جانے کا ذکر تھا۔ باقی سارا قصہ اُن کی نقل کردہ رِوایات میں اسی طرح پایا جاتا ہے جس طرح وہ بنی اسرائیل میں مشہور تھا۔ دوسرے گروہ نے سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کر دیا ہے کہ حضرت داؤدؑ سے کوئی ایسا فعل صادر ہوا تھا جو دنبیوں والے مُقدّمے سے کوئی مُماثَلت رکھتا ہو۔ اس کے بجائے وہ اپنی طرف سے اِس قصّے کی ایسی تاویلات کرتے ہیں جو بالکل بے بنیاد ہیں، جن کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اور خود قرآن کے سیاق وسباق سے بھی وہ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ لیکن مفسرین ہی میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک بات تک پہنچا ہے اور قرآن کے واضح اشارات سے قصّے کی اصل حقیقت پا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اقوال مُلاحظہ ہوں:

مَسرُوقؒ اور سعید بن جُبَیرؒ، دونوں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ''حضرت داؤدؑ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا کہ اُس عورت کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اپنی بیوی کو میرے لیے چھوڑ دے۔'' (ابنِ جَرِیر)

علامۂ زَمَخشَری اپنی تفسیر کَشّاف میں لکھتے ہیں کہ ''جس شکل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کا قصہ بیان فرمایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اُس شخص سے صرف یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اُن کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔''

علامۂ ابوبکر جَصّاصؒ اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ عورت اس شخص کی منکوحہ نہیں بلکہ صرف مخطوبہ یا منسوبہ تھی، حضرت داؤدؑ نے اسی عورت سے نکاح کا پیغام دے دیا، اس پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا کیونکہ انھوں نے اپنے مومن بھائی کے پیغام پر

پیغام دیا تھا حالانکہ ان کے گھر میں پہلے سے کئی بیویاں موجود تھیں۔(احکام القرآن) بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔لیکن یہ بات قرآن کے بیان سے پوری مطابقت نہیں رکھتی۔قرآنِ مجید میں مُقدّمہ پیش کرنے والے کے جو الفاظ نقل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ: لِيْ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا ''میرے پاس بس ایک ہی دُنبی ہے اور یہ کہتا ہے کہ اسے میرے حوالے کردے۔'' یہی بات حضرت داؤدؑ نے بھی اپنے فیصلے میں ارشاد فرمائی کہ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ ''اس نے تیری دُنبی مانگنے میں تجھ پر ظلم کیا۔'' یہ تمثیل حضرت داؤدؑ اور اُوریّاہ کے معاملے پر اسی صورت میں چسپاں ہوسکتی ہے، جب کہ وہ عورت اُس شخص کی بیوی ہو۔ پیغام پر پیغام دینے کا معاملہ ہوتا تو پھر تمثیل یوں ہوتی کہ ''میں ایک دُنبی لینا چاہتا تھا اور اس نے کہا کہ یہ بھی میرے لیے چھوڑ دے۔''

قاضی ابوبکر ابن العَرَبیؒ احکام القرآن میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اصل واقعہ بس یہی ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے آدمیوں میں سے ایک شخص سے کہا کہ میرے لیے اپنی بیوی چھوڑ دے، اور سنجیدگی کے ساتھ یہ مطالبہ کیا...... قرآن میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ شخص ان کے اس مطالبے پر اپنی بیوی سے دست بردار ہو گیا اور حضرت داؤدؑ نے اس عورت سے اس کے بعد شادی کر لی اور حضرت سلیمانؑ اسی کے بطن سے پیدا ہوئے...... جس بات پر عتاب ہوا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے ایک عورت کے شوہر سے یہ چاہا کہ وہ ان کی خاطر اسے چھوڑ دے...... یہ فعل خواہ فی الجملہ جائز ہی ہو مگر منصبِ نبوت سے بعید تھا، اسی لیے اُن پر عتاب بھی ہوا اور ان کو نصیحت بھی کی گئی۔''

یہی تفسیر اُس سیاق وسباق سے بھی مناسبت رکھتی ہے جس میں یہ قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ سلسلۂ کلام پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید میں اِس مَقام پر یہ قصّہ دو اغراض کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے آپؐ کو مخاطَب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ''جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کرو۔'' یعنی تمھیں تو ساحر اور کذّاب ہی کہا جا رہا ہے، لیکن ہمارے بندے داؤدؑ پر تو ظالموں نے زِنا اور سازشی قتل تک کے الزامات لگا دیے، لہٰذا اِن لوگوں سے جو کچھ بھی تم کو سننا پڑے اُسے برداشت کرتے رہو۔ دوسری غرض کفار کو یہ بتانا ہے کہ تم لوگ ہر محاسبے سے بے خوف ہو کر دنیا میں طرح طرح کی زیادتیاں کرتے چلے جاتے ہو، لیکن جس خدا کی خدائی میں تم یہ حرکتیں کر رہے ہو وہ کسی کو بھی محاسبہ کیے بغیر نہیں چھوڑتا، حتّٰی کہ جو بندے اس کے نہایت محبُوب ومقرّب ہوتے ہیں، وہ بھی اگر ایک ذرا سی لغزش کے مرتکب ہو جائیں تو خداوندِ عالَم اُن سے سخت مواخذہ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ان کے سامنے ہمارے بندے داؤدؑ کا قصّہ بیان کرو جو ایسی اور ایسی خوبیوں کا مالک تھا، مگر جب اس سے ایک بے جا بات سرزد ہو گئی تو دیکھو کہ ہم نے اسے کس طرح سرزنش کی۔

اس سلسلے میں ایک غلط فہمی اور باقی رہ جاتی ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ تمثیل میں مُقدّمہ پیش کرنے والے نے یہ جو کہا ہے کہ اس شخص کے پاس ۹۹ دُنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے جسے یہ مانگ رہا ہے، اس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید حضرت داؤدؑ کے پاس ۹۹ بیویاں تھیں اور وہ ایک عورت حاصل کر کے ۱۰۰ کا عدد پورا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دراصل تمثیل کے ہر ہر جُز کا حضرت داؤدؑ اور اُوریّاہ حتّی کے معاملے پر لفظ بلفظ چسپاں ہونا ضروری نہیں ہے۔ عام محاورے میں

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۭ﴿۲۷﴾ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ

ہم نے اس آسمان اور زمین کو، اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے[29]۔ یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنّم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متّقیوں کو ہم

دس، بیس، پچاس وغیرہ اعداد کا ذکر صرف کثرت کو بیان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ ٹھیک تعداد بیان کرنے کے لیے۔ ہم جب کسی سے کہتے ہیں کہ دس مرتبہ تم سے فُلاں بات کہہ دی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دس بار گن کر وہ بات کہی گئی ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ بارہا وہ بات کہی جا چکی ہے۔ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ تمثیلی مُقدّمے میں وہ شخص حضرت داؤدؑ کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ آپ کے پاس متعدّد بیویاں ہیں، اور پھر بھی آپ دوسرے شخص کی ایک بیوی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بات مفسر نیسابوریؒ نے حضرت حَسَنؒ بصری سے نقل کی ہے کہ لم یکن لداؤد تسع وتسعون امرأة وانما ھٰذا مثل۔ ”حضرت داؤدؑ کی ۹۹ بیویاں نہ تھیں بلکہ یہ صرف ایک تمثیل ہے۔“

(اس قصّے پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم میں کی ہے۔ جو اصحاب ہماری بیان کردہ تاویل کی ترجیح کے مفصّل دلائل معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کے صفحات ۲۹ تا ۴۴ مُلاحظہ فرمائیں۔)

۲۹ – یعنی محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا بُرے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ یہ ارشاد پچھلی تقریر کا ماحَصَل بھی ہے اور آگے کے مضمون کی تمہید بھی۔ پچھلی تقریر کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود یہ حقیقت سامعین کے ذہن نشین کرانا ہے کہ انسان یہاں شُترِ بے مَہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، نہ یہ دُنیا اندھیر نگری ہے کہ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پُرس نہ ہو۔ آگے کے مضمون کی تمہید کے طور پر اس فقرے سے کلام کا آغاز کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نیک و بد سب آخرِ کار مر کر مٹی ہو جائیں گے، کسی سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا، نہ کسی کو بھلائی یا بُرائی کا کوئی بدلہ ملے گا، وہ دراصل دنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھتا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے دنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعلِ عَبَث کا اِرتکاب کیا ہے۔ یہی بات قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر مختلف طریقوں سے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ (المومنون: ۱۱۵)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو فضول پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے جانے والے نہیں ہو؟

كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ ؕ اِذْ
عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ ۙ فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ

فاجروں جیسا کر دیں[۳۰]؟ ـــــ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب[۳۱] ہے جو (اے محمدؐ!) ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔

اور داؤدؑ کو ہم نے سلیمانؑ (جیسا بیٹا) عطا کیا[۳۲]، بہترین بندہ، کثرت سے اپنے رب کی طرف رُجوع کرنے والا۔ قابلِ ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اس کے سامنے خوب سدھے ہوئے تیز رَو گھوڑے پیش کیے گئے[۳۳] تو اس نے کہا: "میں نے اس مال[۳۴] کی محبّت اپنے رب کی

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○
(الدخان: ۳۸-۴۰)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور اس کائنات کو جو ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے ان کو برحق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ درحقیقت فیصلے کا دن اِن سب کے لیے حاضری کا وقتِ مقرر ہے۔

۳۰ – یعنی کیا تمھارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخرکار یکساں ہو جائیں؟ کیا یہ تصور تمھارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بدآدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مُحاسبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اس کے عدل دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ اس مفروضے پر تو دنیا میں بھلائی کے لیے کوئی مُحرّک اور بُرائی سے روکنے کے لیے کوئی مانع سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ خدا کی خدائی اگر، معاذ اللہ! ایسی ہی اندھیر نگری ہو تو پھر وہ شخص بے وقوف ہے جو اس زمین پر تکلیفیں اُٹھا کر خود صالح زندگی بسر کرتا ہے اور خَلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے، اور وہ شخص عقل مند ہے جو سازگار مواقع پا کر ہر طرح کی زیادتیوں سے فائدے سمیٹتا اور ہر قسم کے فِسق و فُجور سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

۳۱ – برکت کے لُغوی معنیٰ ہیں: "افزائشِ خیر و سعادت"۔ قرآن مجید کو برکت والی کتاب کہنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ انسان کے لیے نہایت مفید کتاب ہے، اُس کی زندگی کو دُرست کرنے کے لیے بہترین ہدایات دیتی ہے، اس کی پیروی میں آدمی کا نفع ہی نفع ہے، نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ

یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے۔" یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو (اس نے حکم دیا کہ) اُنھیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے۔[35] اور (دیکھو کہ) سلیمانؑ کو بھی ہم نے آزمائش

۳۲- حضرت سلیمانؑ کا ذکر اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۰۴۔ جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۰ تا ۷۵، النمل، حواشی ۱۸ تا ۵۶، سورۂ سبا، آیات ۱۲-۱۴۔

۳۳- اصل الفاظ ہیں: اَلصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ۔ اس سے مراد ایسے گھوڑے ہیں جو کھڑے ہوں تو نہایت سُکون کے ساتھ کھڑے رہیں، کوئی اُچھل کُود نہ کریں، اور جب دوڑیں تو نہایت تیز دوڑیں۔

۳۴- اصل میں لفظ خَیْر استعمال ہوا ہے جو عَرَبی زبان میں مالِ کثیر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گھوڑوں کے لیے بھی مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو چونکہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے رکھا تھا، اس لیے انھوں نے "خیر" کے لفظ سے ان کو تعبیر فرمایا۔

۳۵- ان آیات کے ترجمہ اور تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک گروہ ان کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے مُعایَنے اور ان کی دَوڑ کے مُلاحظہ میں اس قدر مشغول ہوئے کہ نمازِ عصر بُھول گئے، یا بقولِ بعض اپنا کوئی خاص وظیفہ پڑھنا بھول گئے جو وہ عصر و مغرب کے درمیان پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ سورج چُھپ گیا۔ تب انھوں نے حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو واپس لاؤ، اور جب وہ واپس آئے تو حضرت سلیمانؑ نے تلوار لے کر ان کو کاٹنا، یا بالفاظِ دیگر، اللہ کے لیے اُن کو قربان کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ ذکرِ الٰہی سے غفلت کے موجب بن گئے تھے۔ اس مطلب کے لحاظ سے ان آیات کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: "تو اس نے کہا: مَیں نے اس مال کی مَحبّت کو ایسا پسند کیا کہ اپنے رب کی یاد (نمازِ عصر، یا وظیفۂ خاص) سے غافل ہو گیا، یہاں تک کہ (سورج پردۂ مغرب میں) چھپ گیا۔ (پھر اس نے حکم دیا کہ) واپس لاؤ ان (گھوڑوں) کو (اور جب وہ واپس آئے) تو لگا اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار کے) ہاتھ چلانے۔" یہ تفسیر اگرچہ بعض اکابر مفسرین نے کی ہے، لیکن یہ اس وجہ سے قابلِ ترجیح نہیں ہے کہ اس میں مفسر کو تین باتیں اپنی طرف سے بڑھانی پڑتی ہیں جن کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اوّلاً، وہ فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی نمازِ عصر اس شغل میں چھوٹ گئی، یا ان کا کوئی خاص وظیفہ چھوٹ گیا جو وہ اس وقت پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ صرف یہ ہیں: اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ۔ اِن الفاظ کا ترجمہ یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ "میں نے اس مال کو اتنا پسند کیا کہ اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا"، لیکن ان میں نمازِ عصر یا کوئی خاص وظیفہ مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے۔ ثانیاً، وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ سورج چھپ گیا، حالانکہ وہاں سورج کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ کے الفاظ پڑھ کر آدمی کا ذہن بلا تأمُّل اَلصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ کی

طرف پھرتا ہے جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا ہے۔ ثالثاً، وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر خالی مسح نہیں کیا بلکہ تلوار سے مسح کیا، حالانکہ قرآن میں مَسْحًا بِالسَّيْفِ کے الفاظ نہیں ہیں، اور کوئی قرینہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر مسح بالسیف مراد لیا جا سکے۔ ہمیں اس طریقِ تفسیر سے اُصُولی اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ سے زائد کوئی مطلب لینا چار ہی صورتوں میں دُرست ہو سکتا ہے۔ یا تو قرآن ہی کی عبارت میں اس کے لیے کوئی قرینہ موجود ہو، یا قرآن میں کسی دوسرے مقام پر اس کی طرف کوئی اشارہ ہو، یا کسی صحیح حدیث میں اس اِجمال کی شرح ملتی ہو، یا اس کا اور کوئی قابلِ اعتبار ماخذ ہو، مثلاً تاریخ کا معاملہ ہے تو تاریخ میں اس اِجمال کی تفصیلات ملتی ہوں، آثارِ کائنات کا ذکر ہے تو مستند علمی تحقیقات سے اس کی تشریح ہو رہی ہو، اور احکامِ شرعیّہ کا معاملہ ہے تو فقہِ اسلامی کے مآخذ اس کی وضاحت کر رہے ہوں۔ جہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو وہاں محض بطورِ خود ایک قصہ تصنیف کر کے قرآن کی عبارت میں شامل کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

ایک گروہ نے مذکورۂ بالا ترجمہ و تفسیر سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ اور رُدُّوْهَا عَلَيَّ، دونوں کی ضمیر سورج ہی کی طرف پھرتی ہے۔ یعنی جب نمازِ عصر فوت ہو گئی اور سورج پردۂ مغرب میں چھپ گیا تو حضرت سلیمانؑ نے کارکنانِ قضا و قدر سے کہا کہ پھیر لاؤ سورج کو، تاکہ عصر کا وقت واپس آ جائے اور میں نماز ادا کرلوں، چنانچہ سورج پلٹ آیا اور انھوں نے نماز پڑھ لی۔ لیکن یہ تفسیر اُوپر والی تفسیر سے بھی زیادہ ناقابلِ قبول ہے۔ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ سورج کو واپس لانے پر قادر نہیں ہے، بلکہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں فرمایا ہے، حالانکہ حضرت سلیمانؑ کے لیے اتنا بڑا معجزہ صادر ہوا ہوتا تو وہ ضرور قابلِ ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اور اس لیے بھی کہ سورج کا غُروب ہو کر پلٹ آنا ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اگر وہ درحقیقت پیش آیا ہوتا تو دنیا کی تاریخ اس کے ذکر سے ہرگز خالی نہ رہتی۔ اس تفسیر کی تائید میں یہ حضرات بعض احادیث بھی پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سُورج کا غروب ہو کر دوبارہ پلٹ آنا ایک ہی دفعہ کا واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ کئی دفعہ پیش آیا ہے۔ قصۂ معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سورج کے واپس لائے جانے کا ذکر ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی حضورؐ کے لیے وہ واپس لایا گیا۔ اور حضرت علیؓ کے لیے بھی، جب کہ حضوؐر ان کی گود میں سر رکھے سو رہے تھے اور ان کی نمازِ عصر قضا ہو گئی تھی، حضورؐ نے سورج کی واپسی کی دعا فرمائی تھی اور وہ پلٹ آیا تھا۔ لیکن اِن روایات سے اِستدلال اُس تفسیر سے بھی زیادہ کمزور ہے جس کی تائید کے لیے انھیں پیش کیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کے متعلق جو رِوایت بیان کی جاتی ہے اس کے تمام طُرُق اور رِجال پر تفصیلی بحث کر کے ابنِ تَیمیہؒ نے اسے موضوع ثابت کیا ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اور ابنِ جَوزی کہتے ہیں کہ وہ بلاشک و شبہ موضوع ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر سورج کی واپسی والی رِوایَت بھی بعض محدثین کے نزدیک ضعیف اور بعض کے نزدیک موضوع ہے۔ رہی قصۂ معراج والی رِوایَت، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ سے شبِ معراج کے حالات بیان فرما رہے تھے تو کفار نے آپؐ سے ثبوت طلب کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ بیت المَقدِس کے راستے میں فُلاں مقام پر ایک قافلہ ملا تھا جس کے ساتھ فلاں واقعہ پیش آیا تھا۔ کفار نے پوچھا: وہ قافلہ کس روز مکہ پہنچے گا۔ آپؐ نے فرمایا: فلاں روز۔ جب وہ دن آیا تو قریش کے لوگ دن بھر قافلے کا انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ شام ہونے کو آ گئی۔ اس موقع پر حضورؐ نے دُعا کی کہ دن اس وقت تک غروب نہ ہو

وَ اَلۡقَیۡنَا عَلٰی کُرۡسِیِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَهَبۡ
لِیۡ مُلۡکًا لَّا یَنۡۢبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال دیا۔ پھر اس نے رُجوع کیا اور کہا کہ "اے میرے رب! مجھے معاف کردے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بیشک تُوہی اصل داتا ہے۔"[۳۶]

جب تک قافلہ نہ آجائے۔ چنانچہ فی الواقع سورج ڈوبنے سے پہلے وہ پہنچ گیا۔ اس واقعے کو بعض راویوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اُس روز دن میں ایک گھنٹے کا اضافہ کردیا گیا اور سورج اتنی دیر تک کھڑا رہا۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی رِوایات کیا اتنے بڑے غیر معمولی واقعے کے ثبوت میں کافی شہادت ہیں؟ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، سورج کا پلٹ آنا، یا گھنٹا بھر کا رُکا رہنا کوئی معمولی واقعہ تو نہیں ہے۔ ایسا واقعہ اگر فی الواقع پیش آگیا ہوتا تو دنیا بھر میں اس کی دُھوم مچ گئی ہوتی۔ بعض اخبارِ آحاد تک اس کا ذکر کیسے محدود رہ سکتا تھا؟

مفسرین کا تیسرا گروہ ان آیات کا وہی مفہوم لیتا ہے جو ایک خالی الذہن آدمی اس کے الفاظ پڑھ کر اس سے سمجھ سکتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق واقعہ بس اس قدر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جب اعلیٰ درجے کے اصیل گھوڑوں کا ایک دستہ پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: یہ مال مجھے کچھ اپنی بڑائی کی غرض سے یا اپنے نفس کی خاطر محبُوب نہیں ہے بلکہ اِن چیزوں سے دلچسپی کو میں اپنے رب کا کلمہ بلند کرنے کے لیے پسند کرتا ہوں۔ پھر انھوں نے ان گھوڑوں کی دوڑ کرائی یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے اُن کو واپس طلب فرمایا اور جب وہ آئے تو بقول ابنِ عباسؓ: جعل یمسح اعراف الخیل وعراقیبها حُبًّا لها، "حضرت اُن کی گردنوں پر اور ان کی پنڈلیوں پر محبّت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔" یہی تفسیر ہمارے نزدیک صحیح ہے، کیونکہ یہ قرآنِ مجید کے الفاظ سے پوری مطابقت رکھتی ہے اور مطلب کی تکمیل کے لیے اس میں ایسی کوئی بات بڑھانی نہیں پڑتی جو نہ قرآن میں ہو، نہ کسی صحیح حدیث میں اور نہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں۔

یہ بات بھی اس موقع پر نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس واقعے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے حق میں نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف کثرت سے رُجوع کرنے والا) کے تعریفی کلمات ارشاد فرمانے کے معاً بعد کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دراصل یہ بتانا ہے کہ دیکھو، وہ ہمارا ایسا اچھا بندہ تھا، بادشاہی کا سروسامان اُس کو دنیا کی خاطر نہیں بلکہ ہماری خاطر پسند تھا، اپنے شاندار رسالے کو دیکھ کر دنیا پرست فرماں رواؤں کی طرح اس نے ڈینگیں نہ ماریں بلکہ اُس وقت بھی ہم ہی اُسے یاد آئے۔

۳۶ — سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اِس جگہ اصل مقصد یہی واقعہ بیان کرنا ہے اور پچھلی آیات اسی کے لیے بطور تمہید ارشاد ہوئی ہیں۔ جس طرح پہلے حضرت داؤدؑ کی تعریف کی گئی، پھر اُس واقعے کا ذکر کیا گیا جس میں وہ مبتلائے فتنہ ہوگئے تھے، یہ بتایا گیا کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ نے اپنے ایسے محبُوب بندے کو بھی محاسبہ کیے بغیر نہ چھوڑا، پھر ان کی یہ شان دکھائی گئی کہ فتنے پر مُتنبّہ

ہوتے ہی وہ تائب ہوگئے اور اللہ کے آگے جھک کر انھوں نے اپنے اس فعل سے رُجوع کرلیا، اسی طرح یہاں بھی ترتیب کلام یہ ہے کہ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مرتبۂ بلند اور شانِ بندگی کا ذکر کیا گیا ہے، پھر بتایا گیا ہے کہ ان کو بھی آزمایش میں ڈالا گیا، پھر اُن کی یہ شانِ بندگی دکھائی گئی ہے کہ جب ان کی کرسی پر ایک جَسَد لاکر ڈال دیا گیا تو وہ فوراً ہی اپنی لغزش پر مُتَنَبِّہ ہوگئے اور اپنے رب سے معافی مانگ کر انھوں نے اپنی اُس بات سے رُجوع کرلیا جس کی وجہ سے وہ فتنے میں پڑے تھے۔ بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ ان دونوں قصّوں سے بیک وقت دو باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے: ایک، یہ کہ اس کے بے لاگ مُحاسبے سے انبیا تک نہیں بچ سکے ہیں، تابدیگراں چہ رَسَد۔ دوسرے یہ کہ بندے کے لیے صحیح رَوِیّہ قصور کر کے اکڑنا نہیں ہے بلکہ اُس کا کام یہ ہے کہ جس وقت بھی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوجائے اُسی وقت وہ عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جائے۔ اسی رَوِیّے کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی لغزشوں کو محض معاف ہی نہیں کیا بلکہ ان کو اور زیادہ الطاف وعِنایات سے نوازا۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پڑ گئے تھے؟ اور ان کی کرسی پر ایک جَسَد لاکر ڈال دینے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس جَسَد کا لاکر ڈالا جانا اُن کے لیے کس نوعیت کی تنبیہ تھی جس پر انھوں نے توبہ کی؟ اس کے جواب میں مفسرین نے چار مختلف مسلک اختیار کیے ہیں۔

ایک گروہ نے ایک لمبا چوڑا افسانہ بیان کیا ہے جس کی تفصیلات میں ان کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں۔ مگر سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے یا تو یہ قصور ہوا تھا کہ ان کے محل میں ایک بیگم چالیس دن تک بُت پرستی کرتی رہی اور وہ اس سے بےخبر رہے، یا یہ کہ وہ چند روز تک گھر میں بیٹھے رہے اور کسی مظلوم کی دادرسی نہ کی۔ اس پر ان کو یہ سزا ملی کہ ایک شیطان کسی نہ کسی طرح ان کی وہ انگوٹھی اُڑا لے گیا جس کی بدولت وہ جِنّ وانس اور ہواؤں پر حکومت کرتے تھے۔ انگوٹھی ہاتھ سے جاتے ہی حضرت سلیمانؑ کا سارا اقتدار چِھن گیا اور وہ چالیس دن تک دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اور اس دَوران میں وہ شیطان سلیمانؑ بنا ہوا حکمرانی کرتا رہا۔ سلیمانؑ کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال دینے سے مراد یہی شیطان ہے جو ان کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ بعض حضرات یہاں تک بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اس زمانے میں اُس شیطان سے حَرَمِ سلیمانی کی خواتین تک کی عِصمت محفوظ نہ رہی۔ آخرِ کار سلطنت کے اَعیان واکابر اور عُلَما کو اس کی کارروائیاں دیکھ کر شک ہوگیا کہ یہ سلیمان نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے سامنے تورات کھولی اور وہ ڈر کر بھاگ نکلا۔ راستے میں انگوٹھی اس کے ہاتھ سے سمندر میں گر گئی، یا خود اُسی نے پھینک دی، اور اسے ایک مچھلی نے نِگل لیا۔ پھر اتفاق سے وہ مچھلی حضرت سلیمانؑ کو مل گئی۔ اُسے پکانے کے لیے انھوں نے اس کا پیٹ جو چاک کیا تو انگوٹھی نکل آئی اور اس کا ہاتھ آنا تھا کہ جِنّ وانس سب سلام کرتے ہوئے اُن کے سامنے حاضر ہوگئے ـــــ یہ پورا افسانہ ازسرتاپا خُرافات پر مشتمل ہے جنھیں نَومسلم اہلِ کتاب نے تَلْمُود اور دوسری اسرائیلی رِوایات سے اخذ کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا تھا اور حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کو قرآن کے مُجْملات کی تفصیلات سمجھ کر اپنی زبان سے نقل کردیا۔ حالانکہ نہ اَنگشتریِ سلیمانی کی کوئی حقیقت ہے، نہ حضرت سلیمانؑ کے کمالات کسی انگشتری کے کرشمے تھے، نہ شیاطین کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیا کی شکل بنا کر آئیں اور خلقِ خدا کو گمراہ کریں، اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصوُّر کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی نبی کے قصور کی سزا ایسی فتنہ انگیز شکل میں دے جس سے شیطان نبی بن کر ایک پوری اُمت کا ستیاناس کردے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن خود اِس تفسیر کی تردید کر رہا ہے۔

آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب یہ آزمایش حضرت سلیمانؑ کو پیش آئی اور انھوں نے ہم سے معافی مانگ لی تب ہم نے ہوا اور شیاطین کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ لیکن یہ تفسیر اس کے برعکس یہ بتا رہی ہے کہ شیاطین پہلے ہی انگشتری کے طفیل حضرت سلیمانؑ کے تابعِ فرمان تھے۔ تعجُّب ہے کہ جن بزرگوں نے یہ تفسیر بیان کی ہے انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بعد کی آیات کیا کہہ رہی ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاں ۲۰ سال کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا۔ شیاطین کو خطرہ ہوا کہ اگر سلیمانؑ کے بعد یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم پھر اسی غلامی میں مبتلا رہیں گے، اس لیے انھوں نے اسے قتل کر دینے کی ٹھانی۔ حضرت سلیمانؑ کو اس کا علم ہو گیا اور انھوں نے اس لڑکے کو بادلوں میں چھُپا دیا، تاکہ وہیں اس کی پرورش ہوتی رہے۔ یہی وہ فتنہ تھا جس میں حضرت مبتلا ہوئے تھے کہ انھوں نے اللہ پر توکُّل کرنے کے بجائے بادلوں کی حفاظت پر اعتماد کیا۔ اس کی سزا ان کو یہ دی گئی کہ وہ بچہ مر کر ان کی کرسی پر آ گرا ــــــ یہ افسانہ بھی بالکل بے سروپا اور صریح قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں بھی یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہوائیں اور شیاطین پہلے سے حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخَّر تھے، حالانکہ قرآن صاف الفاظ میں ان کی تسخیر کو اس فتنے کے بعد کا واقعہ بتا رہا ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک روز قسم کھائی کہ آج رات مَیں اپنی ستّر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہو گا، مگر یہ بات کہتے ہوئے انھوں نے اِن شاء اللہ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک بیوی حاملہ ہوئیں اور ان سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا جسے دائی نے لا کر حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر ڈال دیا۔ یہ حدیث حضرت ابوہُریرہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایت کی ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدِّد طریقوں سے نقل کیا ہے۔ خود بخاری میں مختلف مقامات پر یہ رِوایت جن طریقوں سے نقل کی گئی ہے ان میں سے کسی میں بیویوں کی تعداد ۶۰ بیان کی گئی ہے، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰، کسی میں ۹۹، اور کسی میں ۱۰۰۔ جہاں تک اِسناد کا تعلق ہے، ان میں سے اکثر رِوایات کی سَند قوی ہے، اور باعتبارِ رِوایت اس کی صحّت میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہو گی جس طرح وہ نقل ہوئی ہے۔ بلکہ آپؐ نے غالباً یہود کی یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر اسے بطورِ مثال بیان فرمایا ہو گا، اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ اس بات کو حضورؐ خود بطورِ واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ ایسی رِوایات کو محض صحتِ سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اُتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ ہر شخص خود حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ جاڑے کی طویل ترین رات میں بھی عشا اور فجر کے درمیان دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اگر بیویوں کی کم سے کم تعداد ۶۰ ہی مان لی جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس رات بغیر دَم لیے فی گھنٹا ۶ بیوی کے حساب سے مسلسل دس گھنٹے یا ۱۱ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے۔ کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟ اور کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حضورؐ نے یہ بات واقعے کے طور پر بیان کی ہو گی؟ پھر حدیث میں یہ بات کہیں نہیں بیان کی گئی ہے کہ قرآنِ مجید میں حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر جس جَسَد کے ڈالے جانے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد یہی ادھورا بچہ ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ نے یہ واقعہ اس آیت کی تفسیر کے طور پر بیان فرمایا تھا۔ علاوہ بریں اس بچّے کی پیدایش پر حضرت سلیمانؑ کا اِستغفار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے اِستغفار کے ساتھ یہ دعا

فَسَخَّرۡنَا لَهُ الرِّيحَ تَجۡرِي بِأَمۡرِهِۦ رُخَآءً حَيۡثُ أَصَابَ ۝٣٦ وَ

تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخّر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا تھا،[۳۷] اور

کیوں مانگی کہ ”مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔“

ایک اور تفسیر جس کو امام رازیؒ ترجیح دیتے ہیں یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کسی سخت مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، یا کسی خطرے کی وجہ سے اس قدر متفکر تھے کہ گھلتے گھلتے وہ بس ہڈی اور چمڑا بن کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ تفسیر قرآن کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ ”ہم نے سلیمان کو آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا، پھر اس نے رُجوع کیا۔“ ان الفاظ کو پڑھ کر کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس جسد سے مراد خود حضرت سلیمانؑ ہیں۔ ان سے تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزمائش میں ڈالے جانے سے مراد کوئی قصور ہے جو آنجناب سے صادر ہوا تھا، اس قصور پر آپ کو تنبیہ اس شکل میں فرمائی گئی کہ آپ کی کرسی پر ایک جسد لا ڈالا گیا، اور اس پر جب آپ کو اپنے قصور کا احساس ہوا تو آپ نے رُجوع فرما لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام قرآنِ مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے اور حتمی طور پر اس کی کوئی تفسیر بیان کرنے کے لیے ہمیں کوئی یقینی بنیاد نہیں ملتی۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی دعا کے یہ الفاظ کہ ”اے میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھ کو وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو“، اگر تاریخ بنی اسرائیل کی روشنی میں پڑھے جائیں تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں غالباً یہ خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت و فرماں روائی آیندہ انھی کی نسل میں باقی رہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں ”فتنہ“ قرار دیا اور اس پر وہ اس وقت مُتنبّہ ہوئے جب اُن کا ولی عہد رَحُبْعام، ایک ایسا نالائق نوجوان بن کر اُٹھا جس کے لچھن صاف بتا رہے تھے کہ وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت چار دن بھی نہ سنبھال سکے گا۔ اُن کی کرسی پر ایک جَسَد لا کر ڈالے جانے کا مطلب غالباً یہی ہے کہ جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے وہ ایک کُندۂ ناتراش تھا۔ تب انھوں نے اپنی اس خواہش سے رُجوع کیا، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر درخواست کی کہ بس یہ بادشاہی مجھی پر ختم ہو جائے، میں اپنے بعد اپنی نسل میں بادشاہی جاری رہنے کی تمنا سے باز آیا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بعد کسی کے لیے بھی جانشینی کی نہ وصیت کی اور نہ کسی کی اطاعت کے لیے لوگوں کو پابند کیا۔ بعد میں ان کے اَعیانِ سلطنت نے رَحُبْعام کو تخت پر بٹھایا، مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ بنی اسرائیل کے دس قبیلے شمالی فلسطین کا علاقہ لے کر الگ ہو گئے اور صرف یہوداہ کا قبیلہ بیت المَقدِس کے تخت سے وابستہ رہ گیا۔

۳۷ – اس کی تشریح سورۂ انبیاء کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۱۷۶-۱۷۷) البتہ یہاں ایک بات وضاحت طلب ہے۔ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت سلیمانؑ کے لیے ہوا کو مسخر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں الرِّیۡحَ عَاصِفَةً (بادِتُند) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اسی ہوا کے متعلق فرمایا گیا ہے: تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖ رُخَآءً (وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی۔) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوا بجائے خود تو بادِتُند تھی، جیسی کہ بادبانی جہازوں کو چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے، مگر حضرت سلیمانؑ کے لیے وہ اس معنیٰ میں نرم بنا دی گئی تھی کہ جِدھر اُن کے تجارتی بیڑوں کو سفر کرنے کی ضرورت ہوتی تھی

الشَّيٰطِيۡنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍۙ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيۡنَ مُقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِ ﴿۳۸﴾
هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامۡنُنۡ اَوۡ اَمۡسِكۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا
لَزُلۡفٰى وَحُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ع وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَيُّوۡبَ ۘ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ

وقف لازم ع ۳ ۱۴ ۱۲

شیاطین کو مسخّر کر دیا، ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابندِ سلاسِل تھے۔[۳۸] (ہم نے اُس سے کہا:) ''یہ ہماری بخشش ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے، کوئی حساب نہیں۔''[۳۹] یقیناً اُس کے لیے ہمارے ہاں تقرُّب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔[۴۰] ع

اور ہمارے بندے ایُّوبؑ کا ذکر کرو،[۴۱] جب اس نے اپنے رب کو پُکارا کہ شیطان نے مجھے

اُسی طرف وہ چلتی تھی۔

۳۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۵-النمل، حواشی ۲۳ – ۲۸ – ۴۵ – ۴۶ – ۴۷ ـــــ شیاطین سے مراد جِنّ ہیں۔ اور ''پابندِ سلاسِل شیاطین'' سے مراد وہ خدمت گار شیاطین ہیں جنھیں شرارت کی پاداش میں مُقیّد کر دیا جاتا تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ بیڑیاں اور زنجیریں جن سے یہ شیاطین باندھے جاتے تھے، لوہے کی ہی بنی ہوئی ہوں اور قیدی انسانوں کی طرح وہ بھی لوگوں کو علانیہ بندھے ہوئے نظر آتے ہوں۔ بہرحال انھیں کسی ایسے طریقے سے مقیّد کیا جاتا تھا جس سے وہ بھاگنے اور شرارت کرنے پر قادر نہ رہتے تھے۔

۳۹ – اس آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ یہ ہماری بے حساب بخشش ہے، تمھیں اختیار ہے کہ جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو۔ دوسرے، یہ کہ یہ ہماری بخشش ہے، جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو، دینے یا نہ دینے پر تم سے کوئی مُحاسَبہ نہ ہوگا۔ ایک اور مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ شیاطین کُلّیّتاً تمھارے تصرُّف میں دے دیے گئے ہیں، اِن میں سے جسے چاہو رہا کر دو اور جسے چاہو روک رکھو، اس پر کوئی محاسَبہ تم سے نہ ہوگا۔

۴۰ – اس ذکر سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی اکڑ جتنی مبغوض ہے، اُس کی عاجزی کی ادا اتنی ہی محبُوب ہے۔ بندہ اگر قصور کرے اور تنبیہ کرنے پر الٹا اور زیادہ اکڑ جائے تو انجام وہ ہوتا ہے جو آگے آدم و ابلیس کے قصّے میں بیان ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس ذرا لغزش بھی اگر بندے سے ہو جائے اور وہ توبہ کر کے عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جائے تو اس پر وہ نوازشات فرمائی جاتی ہیں جو داؤد و سلیمان علیہما السلام پر فرمائی گئیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اِستغفار کے بعد جو دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے لفظ بلفظ پورا کیا اور ان کو فی الواقع ایسی بادشاہی دی جو نہ اُن سے پہلے کسی کو ملی تھی، نہ اُن کے بعد آج تک کسی کو عطا کی گئی۔ ہواؤں پر تصرُّف اور جِنّوں پر حکمرانی ایک ایسی غیر معمولی طاقت ہے جو انسانی تاریخ میں صرف حضرت سلیمانؑ ہی کو بخشی گئی ہے، کوئی دوسرا اس میں ان کا شریک نہیں ہے۔

مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّ عَذَابٍ ﴿۴۱﴾ اُرۡکُضۡ بِرِجۡلِکَ ۚ ھٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ
بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَ وَھَبۡنَا لَہٗۤ اَھۡلَہٗ وَ مِثۡلَھُمۡ مَّعَھُمۡ رَحۡمَۃً مِّنَّا وَ ذِکۡرٰی
لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۴۳﴾ وَ خُذۡ بِیَدِکَ ضِغۡثًا فَاضۡرِبۡ بِّہٖ وَ لَا تَحۡنَثۡ ؕ

سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔[۴۲] (ہم نے اُسے حکم دیا:) اپنا پاؤں زمین پر مار، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔[۴۳] ہم نے اُسے اس کے اہل و عیال واپس دیے اور ان کے ساتھ اُتنے ہی[۴۴] اور، اپنی طرف سے رحمت کے طور پر، اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر۔[۴۵] (اور ہم نے اُس سے کہا:) تنکوں کا ایک مُٹھّا لے اور اُس سے مار دے، اپنی قسم نہ توڑ۔[۴۶]

۴۱ – یہ چوتھا مقام ہے جہاں حضرت ایوبؑ کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نساء، آیت ۱۶۳، سورۂ انعام، آیت ۸۴ اور سورۂ انبیاء، آیات ۸۳ – ۸۴ میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم تفسیر سورۂ انبیاء میں ان کے حالات کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷۶ تا ۷۹)

۴۲ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیطان نے مجھے بیماری میں مبتلا کر دیا ہے اور میرے اُوپر مصائب نازل کر دیے ہیں، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ بیماری کی شدّت، مال و دولت کے ضیاع، اور اَعِزّہ و اقربا کے منہ موڑ لینے سے میں جس تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہوں، اُس سے بڑھ کر تکلیف اور عذاب میرے لیے یہ ہے کہ شیطان اپنے وسوسوں سے مجھے تنگ کر رہا ہے، وہ ان حالات میں مجھے اپنے رب سے مایوس کرنے کی کوشش کرتا ہے، مجھے اپنے رب کا ناشکرا بنانا چاہتا ہے، اور اس بات کے درپے ہے کہ میں دامنِ صبر ہاتھ سے چھوڑ بیٹھوں۔ حضرت ایّوبؑ کی فریاد کا یہ مطلب ہمارے نزدیک دو وجوہ سے قابلِ ترجیح ہے: ایک یہ کہ قرآنِ مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ نے شیطان کو صرف وسوسہ اندازی ہی کی طاقت عطا فرمائی ہے، یہ اختیارات اس کو نہیں دیے ہیں کہ اللہ کی بندگی کرنے والوں کو بیمار ڈال دے اور انھیں جسمانی اذیتیں دے کر بندگی کی راہ سے ہٹنے پر مجبُور کرے۔ دوسرے یہ کہ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت ایّوبؑ اپنی بیماری کی شکایت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتے ہیں، وہاں شیطان کا کوئی ذکر نہیں کرتے بلکہ صرف یہ عرض کرتے ہیں کہ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ”مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔“

۴۳ – یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر پاؤں مارتے ہی ایک چشمہ نکل آیا جس کا پانی پینا اور اُس میں غسل کرنا حضرت ایوبؑ کے مَرَض کا علاج تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی سخت جِلدی مرض میں مبتلا تھے۔ بائبل کا بیان بھی یہی ہے کہ سر سے پاؤں تک ان کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔

۴۴ – رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیماری میں حضرت ایوبؑ کی بیوی کے سوا اور سب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا

تھا، حتیٰ کہ اولاد تک ان سے منہ موڑ گئی تھی۔ اسی چیز کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرما رہا ہے کہ جب ہم نے ان کو شفا عطا فرمائی تو سارا خاندان ان کے پاس پلٹ آیا، اور پھر ہم نے ان کو مزید اولاد عطا کی۔

۴۵ - یعنی اس میں ایک صاحبِ عقل آدمی کے لیے یہ سبق ہے کہ انسان کو نہ اچھے حالات میں خدا کو بھول کر سرکش بننا چاہیے اور نہ بُرے حالات میں اس سے مایوس ہونا چاہیے۔ تقدیر کی بھلائی اور بُرائی سراسر اللہ وحدہٗ لاشریک کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہے تو آدمی کے بہترین حالات کو بدترین حالات میں تبدیل کر دے، اور چاہے تو بُرے سے بُرے حالات سے اس کو بخیریت گزار کر بہترین حالت پر پہنچا دے۔ اس لیے بندۂ عاقل کو ہر حالت میں اسی پر توکّل کرنا چاہیے اور اُسی سے آس لگانی چاہیے۔

۴۶ - اِن الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ایّوبؑ نے بیماری کی حالت میں ناراض ہو کر کسی کو مارنے کی قسم کھالی تھی، (رِوایات یہ ہیں کہ بیوی کو مارنے کی قسم کھائی تھی) اور اس قسم ہی میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تجھے اتنے کوڑے ماروں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرما دی اور حالتِ مرض کا وہ غصہ دور ہو گیا جس میں یہ قسم کھائی گئی تھی، تواُن کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ قسم پوری کرتا ہوں تو خواہ مخواہ ایک بے گناہ کو مارنا پڑے گا، اور قسم توڑتا ہوں تو یہ بھی ایک گناہ کا اِرتکاب ہے۔ اس مشکل سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس طرح نکالا کہ انھیں حکم دیا، ایک جھاڑو لو جس میں اُتنے ہی تنکے ہوں جتنے کوڑے تم نے مارنے کی قسم کھائی تھی، اور اس جھاڑو سے اُس شخص کو بس ایک ضرب لگا دو، تاکہ تمھاری قسم بھی پوری ہو جائے اور اسے ناروا تکلیف بھی نہ پہنچے۔

بعض فقہا اس رعایت کو حضرت ایوبؑ کے لیے خاص سمجھتے ہیں، اور بعض فقہا کے نزدیک دوسرے لوگ بھی اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ پہلی رائے ابنِ عَساکرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اور ابوبکر جَصّاصؒ نے مُجاہدؒ سے نقل کی ہے، اور امام مالکؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ دوسری رائے کو امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد، امام زُفَر اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص، مثلاً اپنے خادم کو دس کوڑے مارنے کی قسم کھا بیٹھا ہو اور بعد میں دسوں کوڑے ملا کر اسے صرف ایک ضرب اس طرح لگا دے کہ ہر کوڑے کا کچھ نہ کچھ حصّہ اس شخص کو ضرور لگ جائے، تو اس کی قسم پوری ہو جائے گی۔

متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زانی پر حد جاری کرنے کے معاملے میں بھی اس آیت کا بتایا ہوا طریقہ استعمال فرمایا ہے جو اتنا بیمار یا اتنا ضعیف ہو کہ سو دُرّوں کی مار برداشت نہ کر سکے۔ علّامہ ابوبکر جَصّاصؒ نے حضرت سعید بن سعدؓ بن عُبادہ سے رِوایت نقل کی ہے کہ قبیلۂ بنی ساعِدہ میں ایک شخص سے زِنا کا ارتکاب ہوا اور وہ ایسا مریض تھا کہ بس ہڈی اور چمڑا رہ گیا تھا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ خذوا عثکالًا فیہ مأۃ شمر اخ فاضربوہ بھا ضربۃ واحدۃ، ''کھجور کا ایک ٹہنا لو جس میں سو شاخیں ہوں اور اس سے بیک وقت اس شخص کو مار دو۔'' (احکام القرآن) مُسنَدِ احمد، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ، طَبَرانی، عبدالرزاق اور دوسری کُتُبِ حدیث میں بھی اس کی تائید کرنے والی کئی حدیثیں موجود ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض اور ضعیف پر حد جاری کرنے کے لیے یہی طریقہ مقرر فرمایا تھا۔ البتہ فقہاؒ نے اس کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ ہر شاخ یا ہر تنکا کچھ نہ کچھ مجرم کو لگ جانا چاہیے، اور ایک ہی ضرب سہی، مگر وہ کسی نہ کسی حد تک مجرم کو چوٹ لگانے والی بھی ہونی چاہیے۔ یعنی محض چھو دینا کافی نہیں ہے، بلکہ مارنا ضروری ہے۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

ہم نے اُسے صابر پایا، بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف بہت رُجوع کرنے والا۔[۴۷]

یہاں یہ بحث بھی پیدا ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک بات کی قسم کھا بیٹھا ہو اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ نامناسب بات ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک رِوایت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اس صورت میں آدمی کو وہی کام کرنا چاہیے جو بہتر ہو اور یہی اس کا کفّارہ ہے۔ دوسری رِوایت حضورؐ سے یہ ہے کہ اس نامناسب کام کے بجائے آدمی وہ کام کرے جو اچھا ہو اور اپنی قسم کا کفّارہ ادا کر دے۔ یہ آیت اسی دوسری روایت کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ ایک نامناسب کام نہ کرنا ہی اگر قسم کا کفارہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت ایوبؑ سے یہ نہ فرماتا کہ تم ایک جھاڑو مار کر اپنی قسم پوری کر لو، بلکہ یہ فرماتا کہ تم یہ نامناسب کام نہ کرو اور اسے نہ کرنا ہی تمھاری قسم کا کفّارہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النور، حاشیہ ۲۰)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی نے جس بات کی قَسم کھائی ہو اُسے فوراً پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ حضرت ایوبؑ نے قَسم بیماری کی حالت میں کھائی تھی اور اسے پورا تندرست ہونے کے بعد کیا، اور تندرست ہونے کے بعد بھی فوراً ہی نہیں کر دیا۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو حیلۂ شرعی کے لیے دلیل قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک حیلہ ہی تھا جو حضرت ایوبؑ کو بتایا گیا تھا، لیکن وہ کسی فرض سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ ایک بُرائی سے بچنے کے لیے بتایا گیا تھا۔ لہٰذا شریعت میں صرف وہی حیلے جائز ہیں جو آدمی کو اپنی ذات سے یا کسی دوسرے شخص سے ظلم اور گناہ اور بُرائی کو دفع کرنے کے لیے اختیار کیے جائیں۔ ورنہ حرام کو حلال کرنے یا فرائض کو ساقط کرنے یا نیکی سے بچنے کے لیے حیلہ سازی گناہ دَر گناہ ہے۔ بلکہ اس کے ڈانڈے کفر سے جا ملتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص اِن ناپاک اغراض کے لیے حیلہ کرتا ہے وہ گویا خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ مثلاً جو شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لیے سال ختم ہونے سے پہلے اپنا مال کسی اور کی طرف منتقل کر دیتا ہے وہ محض ایک فرض ہی سے فرار نہیں کرتا، وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس ظاہری فعل سے دھوکا کھا جائے گا اور اسے فرض سے سبکدوش سمجھ لے گا۔ جن فقہا نے اس طرح کے حیلے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احکامِ شریعت سے جان چھڑانے کے لیے یہ حیلہ بازیاں کرنی چاہییں۔ بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ کو قانونی شکل دے کر بچ نکلے تو قاضی یا حاکم اس پر گرفت نہیں کر سکتا، اُس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔

۴۷ — حضرت ایوبؑ کا ذکر اس سیاق و سباق میں یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کے نیک بندے جب مصائب و شدائد میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے رب سے شِکوہ سنج نہیں ہوتے بلکہ صبر کے ساتھ اس کی ڈالی ہوئی آزمایشوں کو برداشت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ اگر کچھ مدت تک خدا سے دعا مانگتے رہنے پر بلا نہ ٹلے تو پھر اس سے مایوس ہو کر دوسروں کے آستانوں پر ہاتھ پھیلانا شروع کر دیں۔ بلکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ملنا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملنا ہے، اس لیے مصیبتوں کا سلسلہ چاہے کتنا ہی دراز ہو، وہ اُسی کی رحمت کے امیدوار بنے رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ اُن الطاف و عنایات سے سرفراز ہوتے ہیں جن کی مثال حضرت ایوبؑ کی زندگی میں ملتی ہے۔ حتّٰی کہ اگر وہ کبھی مضطرب ہو کر کسی اَخلاقی مخمصے میں

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾
اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ
الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ

اور ہمارے بندوں، ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا ذکر کرو۔ بڑی قوتِ عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے[۴۸]۔ ہم نے اُن کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا، اور وہ دارِ آخرت کی یاد تھی[۴۹]۔ یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چُنے ہوئے نیک اشخاص میں ہے۔ اور اسماعیلؑ اور اَلْیَسَعؑ[۵۰] اور ذُوالکِفلؑ[۵۱] کا ذکر کرو، یہ سب

پھنس بھی جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں بُرائی سے بچانے کے لیے ایک راہ نکال دیتا ہے جس طرح اس نے حضرت ایوبؑ کے لیے نکال دی۔

۴۸ – اصل الفاظ ہیں: اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ (ہاتھوں والے اور نگاہوں والے۔) ہاتھ سے مراد، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، قوت وقدرت ہے۔ اور اِن انبیا کو صاحبِ قوت وقدرت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہایت باعمل لوگ تھے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور معصیتوں سے بچنے کی زبردست طاقت رکھتے تھے، اور دنیا میں اللہ کا کلِمہ بلند کرنے کے لیے انھوں نے بڑی کوششیں کی تھیں۔ نگاہ سے مراد آنکھوں کی بینائی نہیں بلکہ دل کی بصیرت ہے۔ وہ حق بیں اور حقیقت شناس لوگ تھے۔ دنیا میں اندھوں کی طرح نہیں چلتے تھے بلکہ آنکھیں کھول کر علم ومعرفت کی پوری روشنی میں ہدایت کا سیدھا راستہ دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔ ان الفاظ میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جو لوگ بدعمل اور گمراہ ہیں وہ درحقیقت ہاتھوں اور آنکھوں، دونوں سے محروم ہیں۔ ہاتھ والا حقیقت میں وہی ہے جو اللہ کی راہ میں کام کرے، اور آنکھوں والا دراصل وہی ہے جو حق کی روشنی اور باطل کی تاریکی میں امتیاز کرے۔

۴۹ – یعنی ان کی تمام سرفرازیوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن کے اندر دنیا طلَبی اور دنیا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا، ان کی ساری فکر وسَعی آخرت کے لیے تھی، وہ خود بھی اُس کو یاد رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اُس کی یاد دلاتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مرتبے دیے جو دنیا بنانے کی فکر میں منہمک رہنے والے لوگوں کو کبھی نصیب نہ ہوئے۔ اس سلسلے میں یہ لطیف نکتہ بھی نگاہ میں رہنا چاہیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے لیے صرف الدَّار (وہ گھر، یا اصل گھر) کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس سے یہ حقیقت ذہن نشین کرنی مطلوب ہے کہ یہ دنیا سرے سے انسان کا گھر ہے ہی نہیں، بلکہ یہ صرف ایک گزرگاہ ہے، ایک مسافرخانہ ہے جس سے آدمی کو بہرحال رخصت ہوجانا ہے۔ اصل گھر وہی آخرت کا گھر ہے۔ جو شخص اس کو سنوارنے کی فکر کرتا ہے وہی صاحبِ بصیرت ہے اور اللہ کے نزدیک لامحالہ اسی کو پسندیدہ انسان ہونا چاہیے۔ رہا وہ شخص جو اس مسافرخانے میں اپنی چندروزہ قیام گاہ کو سجانے کے لیے وہ حرکتیں کرتا ہے جن سے آخرت کا اصل گھر اُس کے لیے اُجڑ جائے، وہ عقل کا اندھا

مِّنَ الۡاَخۡيَارِؕ ۝۴۸ هٰذَا ذِكۡرٌ ؕ وَاِنَّ لِلۡمُتَّقِيۡنَ لَحُسۡنَ مَاٰبٍۙ ۝۴۹ جَنّٰتِ عَدۡنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الۡاَبۡوَابُۚ ۝۵۰ مُتَّكِـِٕيۡنَ فِيۡهَا يَدۡعُوۡنَ فِيۡهَا بِفَاكِهَةٍ

نیک لوگوں میں سے تھے۔

یہ ایک ذکر تھا۔(اب سُنو کہ) متّقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے، ہمیشہ رہنے والی جنّتیں جن کے دروازے اُن کے لیے کُھلے ہوں[۵۲] گے۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، خوب خوب فواکہ اور

ہے اور فطری بات ہے کہ ایسا آدمی اللہ کو پسند نہیں آ سکتا۔

۵۰ – قرآنِ مجید میں ان کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے: ایک سورۂ انعام، آیت ۸۶ میں۔ دوسرے اِس جگہ۔ اور دونوں مقامات پر کوئی تفصیل نہیں ہے بلکہ صرف انبیائے کرامؑ کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا ہے۔ وہ بنی اسرائیل کے اکابر انبیاؑ میں سے تھے۔ دریائے اُردُن کے کنارے ایک مقام ابیل محُولہ (Abel Meholah) کے رہنے والے تھے۔ یہودی اور عیسائی ان کو اِلیشعؑ (Elisha) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام جس زمانے میں جزیرہ نمائے سِینا میں پناہ گُزیں تھے، اُن کو چند اہم کاموں کے لیے شام و فلسطین کی طرف واپس جانے کا حکم دیا گیا، جن میں سے ایک کام یہ تھا کہ حضرت اَلیَسعؑ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کریں۔ اِس فرمان کے مطابق جب حضرت الیاسؑ اِن کی بستی پر پہنچے تو دیکھا کہ یہ بارہ جوڑی بیل آگے لیے زمین جوت رہے ہیں اور خود بارھویں جوڑی کے ساتھ ہیں۔ انھوں نے اِن کے پاس سے گزرتے ہوئے اِن پر اپنی چادر ڈال دی اور یہ کھیتی باڑی چھوڑ کر ساتھ ہو لیے۔ (۱-سلاطین، باب ۱۹، فقرات ۱۵ تا ۲۱) تقریباً دس بارہ سال یہ اُن کے زیرِ تربیت رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اُٹھا لیا تو یہ اُن کی جگہ مقرر ہوئے۔ (۲-سلاطین، باب ۲) بائبل کی کتاب ۲-سلاطین میں باب ۲ سے ۱۳ تک ان کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ درج ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی فلسطین کی اسرائیلی سلطنت جب شرک و بُت پرستی اور اَخلاقی نجاستوں میں غرق ہوتی ہی چلی گئی تو آخر کار انھوں نے یاہُو بن یہُوسفط بن نِمسی کو اُس خانوادۂ شاہی کے خلاف کھڑا کیا جس کے کرتوتوں سے اسرائیل میں یہ بُرائیاں پھیلی تھیں، اور اس نے نہ صرف بَعل پرستی کا خاتمہ کیا، بلکہ اس بدکردار خاندان کے بچّے بچّے کو قتل کر دیا۔ لیکن اس اصلاحی انقلاب سے بھی وہ برائیاں پوری طرح نہ مٹ سکیں جو اسرائیل کی رگ رگ میں اُتر چکی تھیں، اور حضرت اَلیَسعؑ کی وفات کے بعد تو انھوں نے طوفانی شکل اختیار کر لی، یہاں تک کہ سامریہ پر اَشُّوریوں کے پے در پے حملے شروع ہو گئے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن جلد ۲، بنی اسرائیل، حاشیہ ۷ اور تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۷۰، ۷۱)

۵۱ – حضرت ذوالکِفلؑ کا ذکر بھی قرآنِ مجید میں دو ہی جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ انبیاء۔ دوسرے یہ مقام۔ ان کے متعلق ہم اپنی تحقیق سورۂ انبیاء میں بیان کر چکے ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۱)

۵۲ – اصل الفاظ ہیں: مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الۡاَبۡوَابُ۔ اس کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ایک، یہ کہ ان جنتوں میں وہ بے روک ٹوک پھریں گے کہیں ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ دوسرے، یہ کہ جنت کے دروازے کھولنے کے لیے کسی کوشش کی حاجت

كَثِيرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿۵۱﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا
تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ هٰذَا ۭ وَ الثلثة
اِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ
فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوْجٌ
مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ۭ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۣ
لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ۭ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ

مشروبات طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی ہم سِن بیویاں[۵۳] ہوں گی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں حساب کے دن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ یہ تو ہے مُتّقیوں کا انجام۔ اور سرکشوں کے لیے بدترین ٹھکانا ہے، جہنّم جس میں وہ جُھلسے جائیں گے بہت ہی بُری قیام گاہ۔ یہ ہے اُن کے لیے، پس وہ مزا چکھیں کھَولتے ہوئے پانی اور پِیپ[۵۴] لہو اور اسی قسم کی دوسری تلخیوں کا۔ (وہ جہنّم کی طرف اپنے پیروؤں کو آتے دیکھ کر آپس میں کہیں گے:) "یہ ایک لشکر تمھارے پاس گُھسا چلا آ رہا ہے، کوئی خوش آمدید اِن کے لیے نہیں ہے، یہ آگ میں جُھلسنے والے ہیں"۔ وہ اُن کو جواب دیں گے: "نہیں بلکہ تم ہی جُھلسے جا رہے ہو کوئی خیر مقدم تمھارے لیے نہیں۔ تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو، کیسی بُری ہے یہ جائے قرار"۔ پھر وہ کہیں گے: "اے ہمارے رب! جس نے

نہ ہو گی بلکہ وہ مجرّد ان کی خواہش پر خود بخود کُھل جائیں گے۔ تیسرے، یہ کہ جنت کے انتظام پر جو فرشتے مقرر ہوں گے وہ اہلِ جنت کو دیکھتے ہی ان کے لیے دروازے کھول دیں گے۔ یہ تیسرا مضمون قرآنِ مجید میں ایک اور مقام پر زیادہ صاف الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۔ "یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو جنت کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ سلامٌ علیکم! خوش آمدید! ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جائیے۔" (الزُّمَر: ۷۳)

۵۳ – ہم سِن بیویوں کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ہم سِن ہوں گی اور یہ بھی کہ وہ اپنے شوہروں کی

قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾ وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرٰى
رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْأَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ أَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ
الْأَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ إِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾ قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنْذِرٌ
وَّمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ ﴿٦٧﴾ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ﴿٦٨﴾

ع ۴ ۱۳

ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا اُس کو دوزخ کا دُہرا عذاب دے۔" اور وہ آپس میں کہیں گے: "کیا بات ہے، ہم اُن لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جنھیں ہم دنیا میں بُرا سمجھتے تھے؟[55] ہم نے یونہی ان کا مذاق بنا لیا تھا، یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟" بے شک یہ بات سچّی ہے، اہلِ دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں۔ ع

(اے نبیؐ!) اِن[56] سے کہو: "میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔[57] کوئی حقیقی معبود نہیں مگر اللہ، جو یکتا ہے، سب پر غالب، آسمانوں اور زمین کا مالک اور اُن ساری چیزوں کا مالک جو اُن کے درمیان ہیں، زبردست اور درگزر کرنے والا۔" اِن سے کہو: "یہ ایک بڑی خبر ہے جس کو سُن کر تم منہ پھیرتے ہو۔[58]"

ہم سِن ہوں گی۔

۵۴ – اصل میں لفظ غَسَّاقٌ استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنٰی اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ ایک معنٰی جسم سے نکلنے والی رطوبت کے ہیں جو پیپ، لہو، کچ لہو وغیرہ کی شکل میں ہو، اور اس میں آنسو بھی شامل ہیں۔ دوسرے معنٰی انتہائی سرد چیز کے ہیں۔ اور تیسرے معنٰی انتہائی بدبودار مُتعفّن چیز کے۔ لیکن اس لفظ کا عام استعمال پہلے ہی معنٰی میں ہوتا ہے، اگرچہ باقی دونوں معنٰی بھی لغت کے اعتبار سے دُرست ہیں۔

۵۵ – مراد ہیں وہ اہلِ ایمان جن کو یہ کفار دنیا میں بُرا سمجھتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حیران ہو ہو کر ہر طرف دیکھیں گے کہ اس جہنّم میں ہم اور ہمارے پیشوا تو موجود ہیں مگر اُن لوگوں کا یہاں کہیں پتا نشان تک نہیں ہے جن کی ہم دنیا میں بُرائیاں کرتے تھے اور خدا، رسول، آخرت کی باتیں کرنے پر جن کا مذاق ہماری مجلسوں میں اُڑایا جاتا تھا۔

۵۶ – اب کلام کا رُخ پھر اُسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جس سے تقریر کا آغاز ہوا تھا۔ اِس حصّے کو پڑھتے ہوئے پہلے رُکوع سے مقابلہ کرتے جائیے، تاکہ بات پوری طرح سمجھ میں آ سکے۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۢ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ
اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٠﴾ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ
بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿٧١﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ

(ان سے کہو:) ''مجھے اُس وقت کی کوئی خبر نہ تھی جب مَلاءِ اعلیٰ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ مجھ کو تو وحی کے ذریعے سے یہ باتیں صرف اس لیے بتائی جاتی ہیں کہ میں کُھلا کُھلا خبردار کرنے والا ہوں۔'' جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا:[59] ''مَیں مٹّی سے ایک بشر بنانے والا ہوں[60]، پھر جب مَیں اسے پُوری طرح بنادوں اور اس میں اپنی رُوح پھُونک دوں[61]

۵۷ - آیت نمبر ۴ میں فرمایا گیا تھا کہ یہ لوگ اس بات پر بڑے اَچنبھے کا اظہار کر رہے ہیں کہ ایک خبردار کرنے والا خود ان کے درمیان سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان سے کہو میرا کام بس تمھیں خبردار کر دینا ہے۔ یعنی میں کوئی فوجدار نہیں ہوں کہ زبردستی تمھیں غلط راستے سے ہٹا کر سیدھے راستے کی طرف کھینچوں۔ میرے سمجھانے سے اگر تم نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ بے خبر ہی رہنا اگر تمھیں پسند ہے تو اپنی غفلت میں سرشار پڑے رہو، اپنا انجام خود دیکھ لو گے۔

۵۸ - یہ جواب ہے کفار کی اُس بات کا جو آیت نمبر ۵ میں گزری ہے کہ ''کیا اِس شخص نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔'' اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ تم چاہے کتنی ہی ناک بھوں چڑھاؤ، مگر یہ ہے ایک حقیقت جس کی خبر میں تمھیں دے رہا ہوں، اور تمھارے ناک بھوں چڑھانے سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔

اس جواب میں صرف بیانِ حقیقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے حقیقت ہونے کی دلیل بھی اسی میں موجود ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ معبُود بہت سے ہیں جن میں سے ایک اللہ بھی ہے، تم نے سارے معبُودوں کو ختم کر کے بس ایک معبُود کیسے بنا ڈالا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ معبُودِ حقیقی صرف ایک اللہ ہی ہے، کیونکہ وہ سب پر غالب ہے، زمین و آسمان کا مالک ہے، اور کائنات کی ہر چیز اس کی مِلک ہے۔ اُس کے ماسوا اس کائنات میں جن ہستیوں کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی ہستی بھی ایسی نہیں ہے جو اُس سے مغلوب اور اس کی مملوک نہ ہو۔ یہ مغلوب اور مملوک ہستیاں اُس غالب اور مالک کے ساتھ خدائی میں شریک کیسے ہو سکتی ہیں اور آخر کس حق کی بنا پر انھیں معبُود قرار دیا جا سکتا ہے۔

۵۹ - یہ اُس جھگڑے کی تفصیل ہے جس کی طرف اُوپر کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور جھگڑے سے مراد شیطان کا خدا سے جھگڑا ہے جیسا کہ آگے کے بیان سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ ''مَلاءِ اعلیٰ'' سے مراد فرشتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے شیطان کا مکالمہ دُوبدُو نہیں بلکہ کسی فرشتے ہی کے توسُّط سے ہوا ہے۔ اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بھی مَلاءِ اعلیٰ میں شامل تھا۔ جو قصہ یہاں بیان کیا جا رہا ہے وہ اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۳۵ تا ۵۳۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۱۰ تا ۱۵، الحِجر، حواشی ۱۷ تا ۱۹، بنی اسرائیل، حواشی ۷۱ تا ۸۲۔ جلد سوم، الکہف، حواشی ۴۶ تا ۴۸، طٰہٰ، حواشی ۹۲ تا ۱۰۶۔

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّآ
اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ
اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾
قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ

تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔[۶۲]" اس حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے، مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔[۶۳] رب نے فرمایا: "اے ابلیس! تجھے کیا چیز اُس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟[۶۴] تو بڑا بن رہا ہے یا تُو ہے ہی کچھ اُونچے درجے کی ہستیوں میں سے؟" اُس نے جواب دیا: "میں اُس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اِس کو مٹی سے۔" فرمایا:

۶۰ – بَشَر کے لغوی معنیٰ ہیں جسمِ کثیف جس کی ظاہری سطح کسی دوسری چیز سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ انسان کی تخلیق کے بعد تو یہ لفظ انسان ہی کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ لیکن تخلیق سے پہلے اس کا ذکر لفظِ بشر سے کرنے اور اس کو مٹی سے بنانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ "میں مٹی کا ایک پُتلا بنانے والا ہوں جو بال و پَر سے عاری ہو گا، یعنی جس کی جِلد دوسرے حیوانات کی طرح اُون یا صُوف یا بالوں اور پَروں سے ڈھکی ہوئی نہ ہو گی۔"

۶۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۱۷ تا ۱۹۔ جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۱۶۔

۶۲ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۴۵۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۰۔

۶۳ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۴۷، الکہف، حاشیہ ۴۸۔

۶۴ – یہ الفاظ تخلیقِ انسانی کے شَرَف پر دلالت کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ بادشاہ کا اپنے خدّام سے کوئی کام کرانا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ ایک معمولی کام تھا جو خدّام سے کرا لیا گیا۔ بخلاف اس کے بادشاہ کا کسی کام کو بنفسِ نفیس انجام دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک افضل و اشرف کام تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جسے میں نے خود بلا واسطہ بنایا ہے، اُس کے آگے جُھکنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟

"دونوں ہاتھوں" کے لفظ سے غالباً اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس نئی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی شانِ تخلیق کے دو اہم پہلو پائے جاتے ہیں: ایک، یہ کہ اسے جسمِ حیوانی عطا کیا گیا جس کی بنا پر وہ حیوانات کی جنس میں سے ایک نوع ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس کے اندر وہ رُوح ڈال دی گئی جس کی بنا پر وہ اپنی صفات میں تمام ارضی مخلوقات سے اشرف و افضل ہو گیا۔

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْۤ اِلٰى يَوْمِ
الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ
الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ ۖ وَالْحَقَّ
اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾

"اچھا تو یہاں سے نِکل جا[۶۵]، تو مرُدود ہے[۶۶] اور تیرے اُوپر یوم الجزا تک میری لعنت ہے۔[۶۷]" وہ بولا: "اے میرے رب! یہ بات ہے تو پھر مجھے اُس وقت تک کے لیے مُہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔" فرمایا: "اچھا، تجھے اُس روز تک کی مُہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا: "تیری عزّت کی قسم! میں اِن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے اُن بندوں کے جنھیں تونے خالص کرلیا ہے۔[۶۸]" فرمایا: "تو حق یہ ہے، اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں، کہ میں جہنّم کو تجھ سے[۶۹] اور اُن سب لوگوں سے بھر دُوں گا جو اِن انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔[۷۰]"

۶۵ – یعنی اس مَقام سے جہاں آدمؑ کی تخلیق ہوئی اور جہاں آدمؑ کے آگے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا اور جہاں ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا اِرتکاب کیا۔

۶۶ – اصل میں لفظ "رَجِیم" استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنیٰ ہیں: "پھینکا ہوا" یا "مارا ہوا"۔ اور محاورے میں یہ لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے مقامِ عزت سے گرا دیا گیا ہو اور ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ سورۂ اَعراف میں یہی مضمون اِن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے: فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ "پس تو نکل جا، تو ذلیل ہستیوں میں سے ہے۔"

۶۷ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یوم الجزا کے بعد اُس پر لعنت نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوم الجزا تک تو وہ اس نافرمانی کی پاداش میں مبتلائے لعنت رہے گا، اور یوم الجزا کے بعد وہ اپنے اُن کرتوتوں کی سزا بھگتے گا جو تخلیقِ آدمؑ کے وقت سے لے کر قیامت تک اس سے سرزد ہوں گے۔

۶۸ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "میں تیرے چیدہ بندوں کو بہکاؤں گا نہیں"، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "تیرے چیدہ بندوں پر میرا بس نہ چلے گا۔"

۶۹ – "تجھ سے" کا خطاب صرف شخص ابلیس ہی کی طرف نہیں ہے بلکہ پوری جنسِ شیاطین کی طرف ہے، یعنی

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِیْنَ ﴿۸۶﴾ اِنْ
هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۷﴾ وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ ﴿۸۸﴾ ع

(اے نبیؐ!) اِن سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا[71]، اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں[72]۔ یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے۔ اور تھوڑی مدّت ہی گزرے گی کہ تمھیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا[73]۔ ع

ابلیس اور اس کا وہ پورا گروہِ شیاطین جو اُس کے ساتھ مل کر نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے میں لگا رہے گا۔

۷۰ - یہ پورا قصہ سردارانِ قریش کے اس قول کے جواب میں سنایا گیا ہے کہ ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا، "کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر ذکر نازل کیا گیا؟" اس کا ایک جواب تو وہ تھا جو آیات نمبر ۹ اور ۱۰ میں دیا گیا تھا کہ کیا خدا کی رحمت کے خزانوں کے تم مالک ہو، اور کیا آسمان و زمین کی بادشاہی تمھاری ہے اور یہ فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے کہ خدا کا نبی کسے بنایا جائے اور کسے نہ بنایا جائے؟ دوسرا جواب یہ ہے، اور اس میں سردارانِ قریش کو بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں تمھارا حسد اور اپنی بڑائی کا گھمنڈ، آدم علیہ السلام کے مقابلے میں ابلیس کے حسد اور گھمنڈ سے ملتا جلتا ہے۔ ابلیس نے بھی اللہ تعالیٰ کے اس حق کو ماننے سے انکار کیا تھا کہ جسے وہ چاہے اپنا خلیفہ بنائے، اور تم بھی اُس کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہو کہ جسے وہ چاہے اپنا رسول بنائے۔ اُس نے آدمؑ کے آگے جھکنے کا حکم نہ مانا اور تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا حکم نہیں مان رہے ہو۔ اس کے ساتھ تمھاری یہ مُشابہت بس اس حد پر ختم نہ ہو جائے گی، بلکہ تمھارا انجام بھی پھر وہی ہو گا جو اُس کے لیے مقدر ہو چکا ہے، یعنی دنیا میں خدا کی لعنت، اور آخرت میں جہنم کی آگ۔

اس کے ساتھ اس قصّے کے ضمن میں دو باتیں اور بھی سمجھائی گئی ہیں۔ ایک، یہ کہ جو انسان بھی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے وہ دراصل اپنے اُس اَزلی دشمن، ابلیس کے پھندے میں پھنس رہا ہے جس نے آغازِ آفرینش سے نوعِ انسانی کو اِغوا کرنے کا تہیّہ کر رکھا ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ بندہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں انتہائی مبغوض ہے جو تکبر کی بنا پر اس کی نافرمانی کرے اور پھر اپنی اس نافرمانی کی رَوِش پر اِصرار کیے چلا جائے۔ ایسے بندے کے لیے اللہ کے ہاں کوئی معافی نہیں ہے۔

۷۱ - یعنی میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے یہ تبلیغ نہیں کر رہا ہوں۔

۷۲ - یعنی میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے جھوٹے دعوے لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ کچھ بن بیٹھتے ہیں جو فی الواقع وہ نہیں ہوتے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے محض کفارِ مکہ کی اِطّلاع کے لیے نہیں کہلوائی گئی ہے، بلکہ اس کے پیچھے حضورؐ کی وہ پوری زندگی شہادت کے طور پر موجود ہے جو نبوت سے پہلے انھی کفار کے درمیان چالیس برس تک گزر چکی تھی۔ مکّے کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بناوٹی آدمی نہیں ہیں۔ پوری قوم

میں کسی شخص نے بھی کبھی اُن کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سنی تھی جس سے یہ شبہ کرنے کی گنجایش ہوتی کہ وہ کچھ بننا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

۷۳ - یعنی جو تم میں سے زندہ رہیں گے وہ چند سال کے اندر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ پوری ہو کر رہی۔ اور جو مر جائیں گے ان کو موت کے دروازے سے گزرتے ہی پتا چل جائے گا کہ حقیقت وہی کچھ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔

تفہیم القرآن

الزمر

(۳۹)

الزمر

نام

اس سورہ کا نام آیات نمبر ۷۱ و ۷۳ (وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا اور وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا) سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں لفظِ زُمَر آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

آیت نمبر ۱۰ (وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ) سے اس امر کی طرف صاف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ سورت ہجرتِ حَبَشہ سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ بعض رِوایات میں یہ تصریح آئی ہے کہ اس آیت کا نُزول حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کے حق میں ہوا تھا جب کہ انھوں نے حَبَشہ کی طرف ہجرت کا عزم کیا۔ (رُوح المعانی، جلد ۲۳، صفحہ ۲۲۶)

موضوع اور مضمون

یہ پوری سورت ایک بہترین اور انتہائی مؤثر خطبہ ہے جو ہجرتِ حبشہ سے کچھ پہلے مکۂ معظّمہ کی ظلم و تشدُّد سے بھری ہوئی اور عِناد و مخالَفت سے لبریز فَضا میں دیا گیا تھا۔ یہ ایک وعظ ہے جس کے مخاطب زیادہ تر کفارِ قریش ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اہلِ ایمان سے بھی خطاب کیا گیا ہے۔ اس میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کا اصل مقصود بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان خالص اللہ کی بندگی اختیار کرے اور کسی دوسرے کی طاعت و عبادت سے اپنی خدا پرستی کو آلودہ نہ کرے۔ اِس اصل الاُصول کو بار بار مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے نہایت زور دار طریقے پر توحید کی حقانیت اور اسے ماننے کے عمدہ نتائج، اور شرک کی غَلَطی اور اس پر جمے رہنے کے بُرے نتائج کو واضح کیا گیا ہے، اور لوگوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنی غلط رَوِش سے باز آ کر اپنے رب کی رحمت کی طرف پلٹ آئیں۔ اِسی سلسلے میں اہلِ ایمان کو ہِدایَت فرمائی گئی ہے کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہوگئی ہے تو اُس کی زمین وسیع ہے، اپنا دین بچانے کے لیے کسی اور طرف نکل کھڑے ہو، اللہ تمھارے صبر کا اجر دے گا۔ دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ان کفار کو اس طرف سے بالکل مایوس کر دو کہ ان کا ظلم و ستم کبھی تم کو اِس راہ سے پھیر سکے گا اور اُن سے صاف صاف کہہ دو کہ تم میرا راستہ روکنے کے لیے جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو، کر ڈالو، میں اپنا یہ کام جاری رکھوں گا۔

آیاتہا ۷۵ — سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتہا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝١ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝٢ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ

اِس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔[۱]
(اے محمدؐ!) یہ کتاب ہم نے تمھاری طرف برحق نازل کی ہے،[۲] لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔[۳] خبردار! دین خالص اللہ کا حق ہے۔[۴] رہے وہ لوگ جنھوں نے

۱ – یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے جس میں بس یہ بتانے پر اِکتفا کیا گیا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام نہیں ہے، جیسا کہ منکرین کہتے ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے خود نازل فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر کر کے سامعین کو دو حقیقتوں پر مُتنبّہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اس کلام کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں بلکہ اس کی اہمیّت محسوس کریں۔ ایک، یہ کہ جس خدا نے اسے نازل کیا ہے وہ عزیز ہے، یعنی ایسا زبردست ہے کہ اس کے ارادوں اور فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی اور کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں ذرّہ برابر بھی مُزاحمت کر سکے۔ دوسرے، یہ کہ وہ حکیم ہے، یعنی جو ہدایت وہ اس کتاب میں دے رہا ہے وہ سراسر دانائی پر مبنی ہے اور صرف ایک جاہل و نادان آدمی ہی اس سے منہ موڑ سکتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ نمبر ۱)

۲ – یعنی اس میں جو کچھ ہے، حق اور سچّائی ہے، باطل کی کوئی آمیزش اس میں نہیں ہے۔

۳ – یہ ایک نہایت اہم آیت ہے جس میں دعوتِ اسلام کے اصل مقصود کو بیان کیا گیا ہے، اس لیے اس پر سے سرسری طور پر نہ گزر جانا چاہیے، بلکہ اس کے مفہوم و مدّعا کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بنیادی نِکات دو ہیں جنھیں سمجھے بغیر آیت کا مطلب نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک یہ کہ مطالبہ اللہ کی عبادت کرنے کا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی عبادت کا مطالبہ ہے جو دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے کی جائے۔

عبادت کا مادّہ عبد ہے۔ اور یہ لفظ ''آزاد'' کے مقابلے میں ''غلام'' اور ''مملوک'' کے لیے عَرَبی زبان میں مستعمل ہوتا ہے۔ اسی معنٰی کے لحاظ سے ''عبادت'' میں دو مفہوم پیدا ہوئے ہیں: ایک، پوجا اور پرستش، جیسا کہ عربی زبان کی مشہور و مستند لغت ''لِسان العرب'' میں ہے: عَبَدَ اللّٰہ، تَألَّہَ لَہٗ۔ وَالتَّعَبُّدُ، التَّنَسُّكُ۔ دوسرے، عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرماں برداری، جیسا کہ لِسان العرب میں ہے: العبادۃ، الطاعۃ ۔ ومعنی العبادۃ فی اللغۃ الطاعۃ مع الخضوع۔ و کل من دان

لملك فهو عابدٌ له (وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ)- والعابد، الخاضع لربه المستسلم المنقاد لامره- عبدالطاغوت، اطاعَه يعنى الشيطان فيما سَوَّل له واغواه - اِيَّاكَ نَعْبُدُ، اى نطيع الطاعة التى يخضع معها اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ، اطيعوا ربّكم۔ پس لغت کی ان مستند تشریحات کے مطابق مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کی پُوجا اور پرستش ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کے احکام کی بے چُون و چرا اطاعت، اور اس کے قانونِ شرعی کی برضا و رغبت پیروی، اور اُس کے اَمر و نہی کی دل و جان سے فرماں برداری کا بھی ہے۔

دین کا لفظ عربی زبان میں متعدّد مفہومات کا حامل ہے:

ایک مفہُوم ہے غلبہ و اقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرُّف، سیاست و فرماں روائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔ چنانچہ لسان العرب ہے: دَان النَّاسَ، اى قهرهم على الطاعة ـ دِنْتُهم ، اى قَهرتُهم ـ دِنْتُهٗ، سُسْتُهٗ وملكتُهٗ۔ وفى الحديث الكَيِّس من دان نفسهٗ، اى اذلّها واستعبدها ـ الدَّيّان ، القاضى ، الحَكَم، القهّار۔ ولا انت ديّانى، اى لستَ بقاهر لى فَتَسُوس امرى۔ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ، اى فى قضاء الملك۔

دوسرا مفہُوم ہے اطاعت، فرماں برداری اور غلامی۔ لِسان العرب میں ہے: الدين، الطاعة ـ دِنْتُهٗ ودِنْتُ لَهٗ، اى اطعتُهٗ ـ وَالدِّيْنُ لِلّٰهِ، انما هو طاعتهٗ والتعبّد لهٗ ـ فى الحديث اُرِيدُ من قريشٍ كلمة تَدِين لهمْ بهَا العرب، اى تطيعهم وتخضع لهم ـ ثم دانت بعد الرباب ، اى ذلّت له واطاعَتْهُ ـ يمرقون مِنَ الدِّيْنِ، اى انهم يخرجون من طاعة الامام المفترض الطاعة ـ المدين، العبد ـ فَلَوْ لَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ، اى غير مملوكين۔

تیسرا مفہُوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے۔ لسان العرب میں ہے: الدين، العادة والشأن ـ يقال ما زال ذٰلك دينى وديدَنى ، اى عادتى۔

ان تینوں مفہُومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنیٰ اِس آیت میں ''اُس طرزِ عمل اور اس رَوِیّے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔'' اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ''آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے۔''

۴ – یہ ایک امرِ واقعہ اور ایک حقیقت ہے جسے اُوپر کے مطالبے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے دین کو خالص کر کے اُس کی بندگی تم کو کرنی چاہیے کیونکہ خالص اور بے آمیز اطاعت و بندگی اللہ کا حق ہے۔ دوسرے الفاظ میں، بندگی کا مستحق کوئی دوسرا ہے ہی نہیں کہ اللہ کے ساتھ اُس کی بھی پرستش اور اُس کے احکام و قوانین کی بھی اطاعت کی جائے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اَور کی خالص اور بے آمیز بندگی کرتا ہے تو غلط کرتا ہے۔ اور اسی طرح اگر وہ اللہ کی بندگی کے ساتھ بندگیِ غیر کی آمیزش کرتا ہے تو یہ بھی حق کے سراسر خلاف ہے۔ اس آیت کی بہترین تشریح وہ حدیث ہے جو ابنِ مَردُوْیَہؒ نے یزید الرّقاشیؒ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ہم

وقف لازم

اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ
زُلۡفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ فِىۡ مَا هُمۡ فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهۡدِىۡ مَنۡ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾ لَوۡ اَرَادَ اللّٰهُ اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصۡطَفٰى
مِمَّا يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۴﴾ خَلَقَ

اُس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اِس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں[5]، اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُن تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں[6]۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو[7]۔

اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا برگزیدہ کر لیتا[8]، پاک ہے وہ اِس سے (کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو)، وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب[9]۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو

اپنا مال دیتے ہیں اس لیے کہ ہمارا نام بلند ہو، کیا اس پر ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے پوچھا: اگر اللہ کے اجر اور دنیا کی نامُوری دونوں کی نیت ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ان اللّٰہ تعالٰی لا یقبل الّا من اخلص لہٗ، ”اللہ تعالٰی کوئی عمل بھی قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اُسی کے لیے نہ ہو۔“ اس کے بعد حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

۵ — کفارِ مکہ کہتے تھے، اور بالعُموم دنیا بھر کے مشرکین یہی کہتے ہیں کہ ہم دوسری ہستیوں کی عبادت اُن کو خالق سمجھتے ہوئے نہیں کرتے۔ خالق تو ہم اللہ ہی کو مانتے ہیں اور اصل معبُود اسی کو سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی بارگاہ بہت اُونچی ہے جس تک ہماری رسائی بھلا کہاں ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہم ان بزرگ ہستیوں کو ذریعہ بناتے ہیں تاکہ یہ ہماری دعائیں اور التجائیں اللہ تک پہنچا دیں۔

٦ — یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اتفاق واتحاد صرف توحید ہی میں ممکن ہے۔ شرک میں کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے مشرکین کبھی اس پر متفق نہیں ہوئے ہیں کہ اللہ کے ہاں رسائی کا ذریعہ آخر کون سی ہستیاں ہیں۔ کسی کے نزدیک کچھ دیوتا اور دیویاں اس کا ذریعہ ہیں اور ان کے درمیان بھی سب دیوتاؤں اور دیویوں پر اتفاق نہیں ہے۔ کسی کے نزدیک چاند، سورج، مِرّیخ، مُشتری اس کا ذریعہ ہیں اور وہ بھی آپس میں اس پر متفق نہیں کہ ان میں سے کس کا کیا مرتبہ ہے اور کون اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ کسی کے نزدیک وفات یافتہ بزرگ ہستیاں اس کا ذریعہ ہیں اور ان کے درمیان بھی بے شمار اختلافات

ہیں۔ کوئی کسی بزرگ کو مان رہا ہے اور کوئی کسی اور کو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مختلف ہستیوں کے بارے میں یہ گمان نہ تو کسی علم پر مبنی ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی ایسی فہرست آئی ہے کہ فلاں فلاں اشخاص ہمارے مُقرَّبِ خاص ہیں، لہٰذا ہم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تم ان کو ذریعہ بناؤ۔ یہ تو ایک ایسا عقیدہ ہے جو محض وہم اور اندھی عقیدت اور اسلاف کی بے سوچے سمجھے تقلید سے لوگوں میں پھیل گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ اس میں اختلاف تو ہونا ہی ہے۔

۷ – یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے دو الفاظ استعمال فرمائے ہیں: ایک کاذب، دوسرے کفّار۔ کاذب ان کو اس لیے فرمایا گیا کہ انھوں نے اپنی طرف سے جھوٹ موٹ یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے اور پھر یہی جھوٹ وہ دوسروں میں پھیلاتے ہیں۔ رہا کُفّار، تو اس کے دو معنیٰ ہیں: ایک، سخت منکرِ حق، یعنی توحید کی تعلیم سامنے آ جانے کے بعد بھی یہ لوگ اس غلط عقیدے پر مُصِرّ ہیں۔ دوسرے، کافرِ نعمت، یعنی نعمتیں تو یہ لوگ اللہ سے پا رہے ہیں اور شکریے اُن ہستیوں کے ادا کر رہے ہیں جن کے متعلق انھوں نے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ نعمتیں ان کی مداخلت کے سبب سے مل رہی ہیں۔

۸ – یعنی اللہ کا بیٹا ہونا تو سرے سے ہی ناممکن ہے۔ ممکن اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی کو اللہ برگزیدہ کر لے۔ اور برگزیدہ بھی جس کو وہ کرے گا، لامحالہ وہ مخلوق ہی میں سے کوئی ہو گا، کیونکہ اللہ کے سوا دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ مخلوق ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مخلوق خواہ کتنی ہی برگزیدہ ہو جائے، اولاد کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی، کیونکہ خالق اور مخلوق میں عظیم الشان جوہری فرق ہے، اور ولدیت لازماً والد اور اولاد میں جوہری اتحاد کی مقتضی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ”اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو ایسا کرتا“ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ نے ایسا کرنا کبھی نہیں چاہا۔ اس طرزِ بیان سے یہ بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ کسی کو بیٹا بنا لینا تو درکنار، اللہ نے تو ایسا کرنے کا کبھی ارادہ بھی نہیں کیا ہے۔

۹ – یہ دلائل ہیں جن سے عقیدۂ ولدیت کی تردید کی گئی ہے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص اور عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اولاد کی ضرورت ناقص وکمزور کو ہوا کرتی ہے۔ جو شخص فانی ہوتا ہے وہی اس کا محتاج ہوتا ہے کہ اس کے ہاں اولاد ہو تاکہ اس کی نسل اور نوع باقی رہے۔ اور کسی کو مُتبَنّٰی بھی وہی شخص بناتا ہے جو یا تو لاوارث ہونے کی وجہ سے کسی کو وارث بنانے کی حاجت محسوس کرتا ہے، یا محبّت کے جذبے سے مغلوب ہو کر کسی کو بیٹا بنا لیتا ہے۔ یہ انسانی کمزوریاں اللہ کی طرف منسوب کرنا اور ان کی بنا پر مذہبی عقیدے بنا لینا جہالت اور کم نگاہی کے سوا اور کیا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ اکیلا اپنی ذات میں واحد ہے، کسی جنس کا فرد نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اولاد لازماً ہم جنس ہوا کرتی ہے۔ نیز اولاد کا کوئی تصوّر اِزْدِواج کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور اِزْدِواج بھی ہم جنس سے ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ شخص سخت جاہل و نادان ہے جو اس یکتا و یگانہ ہستی کے لیے اولاد تجویز کرتا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ وہ قہّار ہے۔ یعنی دنیا میں جو چیز بھی ہے اس سے مغلوب اور اس کی قاہرانہ گرفت میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کائنات میں کوئی کسی درجے میں بھی اس سے کوئی مُماثَلت نہیں رکھتا جس کی بنا پر اس کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہو

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ
اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۵﴾ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۗ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ
اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۗ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ

برحق پیدا کیا ہے[10]۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اُسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخّر کر رکھا ہے کہ ہر ایک، ایک وقتِ مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو، وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے[11]۔ اُسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر وہی ہے جس نے اُس جان سے اس کا جوڑا بنایا[12]۔ اور اسی نے تمھارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے[13]۔ وہ تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمھیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے[14]۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمھارا رب ہے[15]، بادشاہی

کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔

۱۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۲۶، النحل، حاشیہ ۶۔ جلد سوم، العنکبوت، حاشیہ ۷۵

۱۱ – یعنی زبردست ایسا ہے کہ اگر وہ تمھیں عذاب دینا چاہے تو کوئی طاقت اس کی مزاحمت نہیں کر سکتی۔ مگر یہ اس کا کرم ہے کہ تم یہ کچھ گستاخیاں کر رہے ہو، اور پھر بھی وہ تم کو فوراً پکڑ نہیں لیتا بلکہ مہلت پر مہلت دیے جاتا ہے۔ اِس مقام پر عقوبت میں تعجیل نہ کرنے اور مہلت دینے کو مغفرت (درگزر) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۲ – یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے حضرت آدمؑ سے انسانوں کو پیدا کر دیا اور پھر اُن کی بیوی حضرت حوّاؑ کو پیدا کیا۔ بلکہ یہاں کلام میں ترتیبِ زمان کے بجائے ترتیبِ بیان ہے جس کی مثالیں ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں تم نے آج جو کچھ کیا وہ مجھے معلوم ہے، پھر جو کچھ تم کل کر چکے ہو اُس سے بھی میں باخبر ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ کل کا واقعہ آج کے بعد ہوا ہے۔

۱۳ – مویشی سے مراد ہیں اُونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری۔ ان کے چار نر اور چار مادہ مل کر آٹھ نر و مادہ ہوتے ہیں۔

۱۴ – تین پردوں سے مراد ہے پیٹ، رحم اور مَشِیْمَہ (وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے)۔

۱۵ – یعنی مالک، حاکم اور پروردگار۔

الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶ اِنْ تَكْفُرُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۣ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ

اسی کی ہے[16]، کوئی معبُود اس کے سوا نہیں ہے[17]، پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟[18]
اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے[19] لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا[20]، اور اگر تم

۱۶ – یعنی تمام اختیارات کا مالک وہی ہے اور ساری کائنات میں اسی کا حکم چل رہا ہے۔

۱۷ – دوسرے الفاظ میں اِستِدلال یہ ہے کہ جب وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی ساری بادشاہی ہے تو پھر لازماً تمھارا اِلٰہ (معبُود) بھی وہی ہے۔ دوسرا کوئی الٰہ کیسے ہوسکتا ہے جب کہ نہ پروردگاری میں اس کا کوئی حصّہ، نہ بادشاہی میں اس کا کوئی دخل۔ آخر تمھاری عقل میں یہ بات کیسے سماتی ہے کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا تو ہو اللہ، سورج اور چاند کو مسخر کرنے والا اور رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات لانے والا بھی ہو اللہ، تمھارا اپنا اور تمام حیوانات کا خالق و رب بھی ہو اللہ، اور تمھارے معبُود بن جائیں اس کے سوا دوسرے۔

۱۸ – یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم کدھر پھرے جا رہے ہو۔ ارشاد یہ ہوا ہے کہ تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو۔ یعنی کوئی دوسرا ہے جو تم کو اُلٹی پٹّی پڑھا رہا ہے اور تم اس کے بہکائے میں آ کر ایسی سیدھی سی عقل کی بات بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔ دوسری بات جو اس اندازِ بیان سے خود مُترشّح ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ ”تم“ کا خطاب پھرانے والوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے ہے جو اُن کے اثر میں آ کر پھر رہے تھے۔ اس میں ایک لطیف مضمون ہے جو ذرا سے غور و فکر سے بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ پھرانے والے اُسی معاشرے میں سب کے سامنے موجود تھے اور ہر طرف اپنا کام عَلانیہ کر رہے تھے، اس لیے ان کا نام لینے کی حاجت نہ تھی۔ اُن کو خطاب کرنا بھی بیکار تھا، کیونکہ وہ اپنی اغراض کے لیے لوگوں کو خدائے واحد کی بندگی سے پھیرنے اور دوسروں کی بندگی میں پھانسنے اور پھانسے رکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایسے لوگ، ظاہر ہے کہ سمجھانے سے سمجھنے والے نہ تھے، کیونکہ نہ سمجھنے ہی سے ان کا مفاد وابستہ تھا، اور سمجھنے کے بعد بھی وہ اپنے مفاد کو قربان کرنے کے لیے مشکل ہی سے تیار ہوسکتے تھے۔ البتہ رحم کے قابل ان عوام کی حالت تھی جو اُن کے چکمے میں آ رہے تھے۔ اُن کی کوئی غرض اس کاروبار سے وابستہ نہ تھی، اس لیے وہ سمجھانے سے سمجھ سکتے تھے۔ اور ذرا سی آنکھیں کُھل جانے کے بعد وہ یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ جو لوگ انھیں خدا کے آستانے سے ہٹا کر دوسرے آستانوں کا راستہ دکھاتے ہیں وہ اپنے اِس کاروبار کا فائدہ کیا اُٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گمراہ کرنے والے چند آدمیوں سے رُخ پھیر کر گمراہ ہونے والے عوام کو مخاطَب کیا جا رہا ہے۔

۱۹ – یعنی تمھارے کفر سے اس کی خدائی میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں آ سکتی۔ تم مانو گے تب بھی وہ خدا ہے، اور نہ مانو گے تب بھی وہ خدا ہے اور رہے گا۔ اس کی فرماں روائی اپنے زور پر چل رہی ہے، تمھارے ماننے یا نہ ماننے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یاعبادی لو ان اولکم واٰخرکم وانسکم وجنکم

تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷

شکر کرو تو اسے وہ تمھارے لیے پسند کرتا ہے۔[21] کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔[22] آخرِ کار تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو، وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔

کانوا علٰی افجر قلب رجل منکم ما نقص من ملکی شیئًا۔ ’’اے میرے بندو! اگر تم سب کے سب اگلے اور پچھلے، انسان اور جنّ اپنے میں سے کسی فاجر سے فاجر شخص کے دل کی طرح ہو جاؤ تب بھی میری بادشاہی میں کچھ بھی کمی نہ ہوگی۔‘‘ (مسلم)

۲۰ – یعنی وہ اپنے کسی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ خود بندوں کے مفاد کی خاطر یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کفر کریں، کیونکہ کفر خود انھی کے لیے نقصان دِہ ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مَشِیّت اور چیز ہے اور رضا دوسری چیز۔ دنیا میں کوئی کام بھی اللہ کی مَشِیّت کے خلاف نہیں ہو سکتا، مگر اس کی رضا کے خلاف بہت سے کام ہو سکتے ہیں اور رات دن ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً دنیا میں جَبّاروں اور ظالموں کا حکمراں ہونا، چوروں اور ڈاکوؤں کا پایا جانا، قاتلوں اور زانیوں کا موجود ہونا اسی لیے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بنائے ہوئے نظامِ قدرت میں ان برائیوں کے ظہور اور اِن اَشرار کے وجود کی گنجایش رکھی ہے۔ پھر ان کو بدی کے ارتکاب کے مواقع بھی وہی دیتا ہے اور اُسی طرح دیتا ہے جس طرح نیکوں کو نیکی کے مواقع دیتا ہے۔ اگر وہ سرے سے اِن کاموں کی گنجایش ہی نہ رکھتا اور ان کے کرنے والوں کو مواقع ہی نہ دیتا تو دنیا میں کبھی کوئی بُرائی ظاہر نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ بر بنائے مَشِیّت ہے۔ لیکن مشیّت کے تحت کسی فعل کا صُدور یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اللہ کی رضا بھی اس کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر اس بات کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص اگر حرام خوری ہی کے ذریعے سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اسی ذریعے سے اس کو رزق دے دیتا ہے۔ یہ ہے اُس کی مشیّت۔ مگر مشیت کے تحت چور یا ڈاکو یا رشوت خوار کو رزق دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چوری، ڈاکے اور رشوت کو اللہ پسند بھی کرتا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ یہاں فرما رہا ہے کہ تم کفر کرنا چاہو تو کرو، ہم تمھیں زبردستی اس سے روک کر مومن نہیں بنائیں گے۔ مگر ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ تم بندے ہو کر اپنے خالق و پروردگار سے کفر کرو، کیونکہ یہ تمھارے ہی لیے نقصان دِہ ہے، ہماری خدائی کا اس سے کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

۲۱ – کفر کے مقابلے میں یہاں ایمان کے بجائے شکر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ کفر درحقیقت احسان فراموشی و نمک حرامی ہے، اور ایمان فی الحقیقت شکر گزاری کا لازمی تقاضا ہے۔ جس شخص میں اللہ جَلَّ شانُہٗ کے احسانات کا کچھ بھی احساس ہو وہ ایمان کے سوا کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے شکر اور ایمان ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ جہاں شکر ہوگا وہاں ایمان ضرور ہوگا۔ اور اس کے برعکس جہاں کفر ہوگا وہاں شکر کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ کفر کے ساتھ شکر کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔

وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيۡبًا اِلَيۡهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعۡمَةً
مِّنۡهُ نَسِىَ مَا كَانَ يَدۡعُوۡۤا اِلَيۡهِ مِنۡ قَبۡلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنۡدَادًا لِّيُضِلَّ
عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعۡ بِكُفۡرِكَ قَلِيۡلًا ۖ اِنَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ﴿۸﴾
اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ وَ

انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے[۲۳] تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اُسے پکارتا ہے[۲۴]، پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اُس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا[۲۵] اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیراتا ہے[۲۶]، تاکہ اُس کی راہ سے گمراہ کرے[۲۷]۔ (اے نبیؐ!) اُس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لُطف اُٹھا لے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔ (کیا اِس شخص کی رَوِش بہتر ہے یا اُس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور

۲۲ – مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمّہ دار ہے۔ کوئی شخص اگر دوسروں کو راضی رکھنے کے لیے، یا ان کی ناراضی سے بچنے کی خاطر کفر اختیار کرے گا تو وہ دوسرے لوگ اُس کے کفر کا وبال اپنے اُوپر نہیں اُٹھالیں گے، بلکہ اسے آپ ہی اپنا وبال بھگتنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا جس پر بھی کفر کا غلط اور ایمان کا صحیح ہونا واضح ہو جائے اس کو چاہیے کہ غلط رَوِیّہ چھوڑ کر صحیح رویہ اختیار کر لے اور اپنے خاندان یا برادری یا قوم کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق نہ بنائے۔

۲۳ – انسان سے مراد یہاں وہ کافر انسان ہے جس نے ناشکری کی رَوِش اختیار کر رکھی ہو۔

۲۴ – یعنی اُس وقت اُسے وہ دوسرے معبُود یاد نہیں آتے جنھیں وہ اپنے اچھے حال میں پکارا کرتا تھا، بلکہ ان سب سے مایوس ہو کر وہ صرف اللہ ربّ العالَمین کی طرف رُجوع کرتا ہے۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں دوسرے معبُودوں کے بے اختیار ہونے کا احساس رکھتا ہے اور اس حقیقت کا شُعور بھی اس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں دبا چھپا موجود ہے کہ اصل اختیارات کا مالک اللہ ہی ہے۔

۲۵ – یعنی وہ بُرا وقت پھر اُسے یاد نہیں رہتا جس میں وہ تمام دوسرے معبُودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے دعائیں مانگ رہا تھا۔

۲۶ – یعنی پھر دوسروں کی بندگی کرنے لگتا ہے۔ انھی کی اطاعت کرتا ہے، انھی سے دعائیں مانگتا ہے، اور انھی کے آگے نذر و نیاز پیش کرنا شروع کر دیتا ہے۔

يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا
يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۹ ع قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ
اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۱۰

اپنے رب کی رحمت سے اُمید لگاتا ہے؟ اِن سے پُوچھو: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟[۲۸] نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔ ع

(اَے نبیؐ!) کہو کہ اَے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔[۲۹] جن لوگوں نے اِس دنیا میں نیک رَوِیّہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے۔[۳۰] اور خدا کی زمین وسیع ہے،[۳۱] صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔[۳۲]

۲۷ – یعنی خود گمراہ ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی یہ کہہ کہہ کر گمراہ کرتا ہے کہ جو آفت مجھ پر آئی تھی وہ فُلاں حضرت یا فُلاں بزرگ یا فُلاں دیوی یا دیوتا کے صدقے میں ٹل گئی۔ اس سے دوسرے بہت سے لوگ بھی ان معبودانِ غیر اللہ کے معتقد بن جاتے ہیں اور ہر جاہل اپنے اسی طرح کے تجرِبات بیان کر کر کے عوام کی اس گمراہی کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

۲۸ – واضح رہے کہ یہاں مقابلہ دو قسم کے انسانوں کے درمیان کیا جا رہا ہے۔ ایک، وہ جو کوئی سخت وقت آ پڑنے پر تو اللہ کی طرف رُجوع کرتے ہیں اور عام حالات میں غیر اللہ کی بندگی کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے، وہ جنھوں نے اللہ کی اطاعت اور اس کی بندگی و پرستش کو اپنا مستقل طریقہ بنا لیا ہے اور راتوں کی تنہائی میں ان کا عبادت کرنا ان کے مخلص ہونے کی دلیل ہے۔ ان میں سے پہلے گروہ والوں کو اللہ تعالیٰ بے علم قرار دیتا ہے، خواہ انھوں نے بڑے بڑے کُتب خانے ہی کیوں نہ چاٹ رکھے ہوں۔ اور دوسرے گروہ والوں کو وہ عالم قرار دیتا ہے، خواہ وہ بالکل ہی اَن پڑھ کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اصل چیز حقیقت کا علم اور اس کے مطابق عمل ہے، اور اسی پر انسان کی فلاح کا اِنحِصار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ دونوں آخر یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں یہ مل کر ایک طریقے پر چلیں، اور آخرت میں دونوں ایک ہی طرح کے انجام سے دوچار ہوں؟

۲۹ – یعنی صرف مان کر نہ رہ جاؤ بلکہ اس کے ساتھ تقویٰ بھی اختیار کرو۔ جن چیزوں کا اللہ نے حکم دیا ہے اُن پر عمل کرو، جن سے روکا ہے ان سے بچو اور دنیا میں اللہ کے مواخَذے سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔

۳۰ – دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی۔ ان کی دنیا بھی سُدھرے گی اور آخرت بھی۔

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾ وَ اُمِرۡتُ لِاَنۡ
اَکُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲﴾ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ
یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳﴾ قُلِ اللّٰہَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّہٗ دِیۡنِیۡ ﴿ۙ۱۴﴾ فَاعۡبُدُوۡا مَا
شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ
اَہۡلِیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اَلَا ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۵﴾

(اَے نبیؐ!) اِن سے کہو: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کی بندگی کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مُسلم بنوں[۳۳]۔ کہو: اگر مَیں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ کہہ دو کہ مَیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُسی کی بندگی کروں گا، تم اُس کے سوا جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔ کہو: اصل دیوالیے تو وہی ہیں جنھوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو گھاٹے میں ڈال دیا۔ خوب سُن رکھو! یہی کُھلا دیوالہ[۳۴] ہے۔

۳۱- یعنی اگر ایک شہر یا علاقہ یا ملک اللہ کی بندگی کرنے والوں کے لیے تنگ ہو گیا ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ جہاں یہ مشکلات نہ ہوں۔

۳۲- یعنی اُن لوگوں کو جو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلنے میں ہر طرح کے مصائب و شدائد برداشت کرلیں مگر راہِ حق سے نہ ہٹیں۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دین و ایمان کی خاطر ہجرت کر کے جَلاوطنی کی مصیبتیں برداشت کریں، اور وہ بھی جو ظلم کی سرزمین میں جم کر ہر آفت کا سامنا کرتے چلے جائیں۔

۳۳- یعنی میرا کام صرف دوسروں سے کہنا ہی نہیں ہے، خود کر کے دکھانا بھی ہے۔ جس راہ پر لوگوں کو بلاتا ہوں، اِس پر سب سے پہلے میں خود چلتا ہوں۔

۳۴- دیوالہ عُرفِ عام میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ کاروبار میں آدمی کا لگایا ہوا سارا سرمایہ ڈوب جائے اور بازار میں اُس پر دوسروں کے مطالبے اتنے چڑھ جائیں کہ اپنا سب کچھ دے کر بھی وہ ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ یہی استعارہ کفار و مشرکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں استعمال کیا ہے۔ انسان کو زندگی، عمر، عقل، جسم، قوتیں اور قابلیتیں، ذرائع اور مواقع، جتنی چیزیں بھی دنیا میں حاصل ہیں، ان سب کا مجموعہ دراصل وہ سرمایہ ہے جسے وہ حیاتِ دنیا کے کاروبار میں لگاتا ہے۔ یہ سارا سرمایہ اگر کسی شخص نے اس مفروضے پر لگا دیا کہ کوئی خدا نہیں ہے، یا بہت سے خدا ہیں جن کا میں بندہ ہوں، اور کسی کو مجھے حساب نہیں دینا ہے، یا محاسبے

لَهُم مِّن فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِن تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۚ ذَٰلِكَ يُخَوِّفُ
اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ ۚ يَا عِبَادِ فَاتَّقُونِ ﴿١٦﴾ وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن
يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿١٧﴾ الَّذِينَ
يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ
وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٨﴾ أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۚ

اُن پر آگ کی چھتریاں اُوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، پس اے میرے بندو! میرے غضب سے بچو۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے طاغوت[۳۵] کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رُجوع کرلیا اُن کے لیے خوشخبری ہے۔ پس (اے نبیؐ!) بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں[۳۶]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی دانش مند ہیں۔ (اَے نبیؐ!) اُس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو؟[۳۷]

کے وقت کوئی دوسرا مجھے آ کر بچالے گا، تواِس کے معنٰی یہ ہیں کہ اس نے گھاٹے کا سودا کیا اور اپنا سب کچھ ڈبو دیا۔ یہ ہے پہلا خُسران۔ دوسرا خُسران یہ ہے کہ اس غلط مفروضے پر اس نے جتنے کام بھی کیے ان سب میں وہ اپنے نفس سے لے کر دنیا کے بہت سے انسانوں اور آیندہ نسلوں اور اللہ کی دوسری بہت سی مخلوق پر عمر بھر ظلم کرتا رہا۔ اِس لیے اُس پر بے شمار مطالبات چڑھ گئے، مگر اُس کے پلّے کچھ نہیں ہے جس سے وہ ان مطالبات کا بھگتان بھگت سکے۔ اس پر مزید خُسران یہ ہے کہ وہ خود ہی نہیں ڈوبا بلکہ اپنے بال بچوں اور عزیز و اقارب اور دوستوں اور ہم قوموں کو بھی اپنی غلط تعلیم و تربیت اور غلط مثال سے لے ڈوبا۔ یہی تین خسارے ہیں جن کے مجموعے کو اللہ تعالٰی خُسرانِ مبین قرار دے رہا ہے۔

۳۵ — طاغوت طغیان سے ہے جس کے معنٰی سرکشی کے ہیں۔ کسی کو طاغی (سرکش) کہنے کے بجائے اگر طاغوت (سرکشی) کہا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ انتہا درجے کا سرکش ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو حَسین کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ وہ حُسن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خوبصورتی میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ معبُودانِ غیر اللہ کو طاغوت اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی بندگی کرنا تو صرف سرکشی ہے مگر جو دوسروں سے اپنی بندگی کرائے وہ کمال درجے کا سرکش ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۸۶، النساء، حاشیہ ۹۱-۱۰۵۔ جلد دوم، النحل، حاشیہ ۳۲) طاغوت کا

اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِی النَّارِ ۚ﴿۱۹﴾ لٰكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ
غُرَفٌ مِّنۡ فَوۡقِهَا غُرَفٌ مَّبۡنِيَّةٌ ۙ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ
وَعۡدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخۡلِفُ اللّٰهُ الۡمِيۡعَادَ ﴿۲۰﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَـكَهٗ يَنَابِيۡعَ فِى الۡاَرۡضِ ثُمَّ يُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا
مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيۡجُ فَتَرٰٮهُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ يَجۡعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ
فِىۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰى لِاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۲۱﴾ ع اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰهُ صَدۡرَهٗ

ع ۲ ۱۲ ۱۶

کیا تم اُسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو؟ البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈر کر رہے اُن کے لیے بلند عمارتیں ہیں منزل پر منزل بنی ہوئی، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں[۳۸] کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعے سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں، پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں، پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں، پھر آخرِ کار اللہ اُن کو بُھس بنا دیتا ہے۔ درحقیقت اِس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے۔[۳۹] ع اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام

لفظ یہاں طواغیت، یعنی بہت سے طاغوتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اسی لیے اَنۡ یَّعۡبُدُوۡهَا فرمایا گیا۔ اگر واحد مراد ہوتا تو یَعۡبُدُوۡهُ ہوتا۔

۳۶ – اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ ہر آواز کے پیچھے نہیں لگ جاتے بلکہ ہر ایک کی بات سُن کر اُس پر غور کرتے ہیں اور جو حق بات ہوتی ہے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ وہ بات کو سُن کر غلط معنیٰ پہنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے اچھے اور بہتر پہلو کو اختیار کرتے ہیں۔

۳۷ – یعنی جس نے اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا لیا ہو اور اللہ نے فیصلہ کر لیا ہو کہ اسے اب سزا دینی ہے۔

۳۸ – اصل میں لفظ یَنَابِیۡعَ استعمال ہوا ہے جس کا اِطلاق ان تینوں چیزوں پر ہوتا ہے۔

۳۹ – یعنی اس سے ایک صاحبِ عقل آدمی یہ سبق لیتا ہے کہ یہ دنیا کی زندگی اور اس کی زینتیں سب عارضی ہیں۔ ہر بہار

لِلۡاِسۡلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيۡلٌ لِّلۡقٰسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ مِّنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۲﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ

کے لیے کھول دیا[40] اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے[41] (اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے اِن باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)۔ تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے[42]۔ وہ کھُلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اللہ نے بہترین کلام اُتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں[43] اور جس میں بار بار مضامین دُہرائے گئے ہیں۔ اُسے سُن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے

کا انجام خزاں ہے۔ ہر شباب کا انجام ضعیفی اور موت ہے۔ ہر عُروج آخرِ کار زوال دیکھنے والا ہے۔ لہٰذا یہ دنیا وہ چیز نہیں ہے جس کے حُسن پر فریفتہ ہو کر آدمی خدا اور آخرت کو بھول جائے اور یہاں کی چند روزہ بہار کے مزے لُوٹنے کی خاطر وہ حرکتیں کرے جو اُس کی عاقبت برباد کر دیں۔ پھر ایک صاحبِ عقل آدمی ان مناظر سے یہ سبق بھی لیتا ہے کہ اس دنیا کی بہار اور خزاں اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے پروان چڑھاتا ہے اور جسے چاہتا ہے خستہ و خراب کر دیتا ہے۔ نہ کسی کے بس میں یہ ہے کہ اللہ جسے پروان چڑھا رہا ہو اس کو وہ پھلنے پھُولنے سے روک دے، اور نہ کوئی یہ طاقت رکھتا ہے کہ جسے اللہ غارت کرنا چاہے اسے وہ خاک میں ملنے سے بچا لے۔

۴۰ — یعنی جسے اللہ نے یہ توفیق بخشی کہ ان حقائق سے سبق لے اور اسلام کے حق ہونے پر مطمئن ہو جائے۔ کسی بات پر آدمی کا شرحِ صدر ہو جانا یا سینہ کھُل جانا دراصل اِس کیفیت کا نام ہے کہ آدمی کے دل میں اُس بات کے متعلق کوئی خلجان یا تذبذب یا شک وشبہ باقی نہ رہے، اور اُسے کسی خطرے کا احساس اور کسی نقصان کا اندیشہ بھی اُس بات کو قبول اور اختیار کرنے میں مانع نہ ہو، بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ وہ یہ فیصلہ کر لے کہ یہ چیز حق ہے لہٰذا خواہ کچھ ہو جائے مجھے اسی پر چلنا ہے۔ اس طرح کا فیصلہ کر کے جب آدمی اسلام کی راہ کو اختیار کر لیتا ہے تو خدا اور رسول کی طرف سے جو حکم بھی اسے ملتا ہے وہ اسے بکراہت نہیں بلکہ برضا و رغبت مانتا ہے۔ کتاب و سنّت میں جو عقائد و افکار اور جو اُصول و قواعد بھی اس کے سامنے آتے ہیں وہ انھیں اِس طرح قبول کرتا ہے کہ گویا یہی اس کے دل کی آواز ہے۔ کسی ناجائز فائدے کو چھوڑنے پر اسے کوئی پچھتاوا لاحق نہیں ہوتا بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے وہ سرے سے کوئی فائدہ تھا ہی نہیں، اُلٹا ایک نقصان تھا جس سے بفضلِ خدا میں بچ گیا۔ اسی طرح کوئی نقصان بھی اگر راستی پر قائم رہنے کی صورت میں اسے پہنچے تو وہ اس پر افسوس نہیں کرتا بلکہ ٹھنڈے دل سے

رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى
اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾ اَفَمَنْ
يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا

والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہِ راست پر لے آتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے۔ اب اُس شخص کی بدحالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار اپنے منہ پر لے گا؟[۴۴] ایسے ظالموں سے تو کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزا اُس کمائی کا

اسے برداشت کرتا ہے اور اللہ کی راہ سے منہ موڑنے کی بہ نسبت وہ نقصان اسے ہلکا نظر آتا ہے۔ یہی حال اس کا خطرات پیش آنے پر بھی ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے کوئی دوسرا راستہ سرے سے ہے ہی نہیں کہ اس خطرے سے بچنے کے لیے اُدھر نکل جاؤں۔ اللہ کا سیدھا راستہ ایک ہی ہے جس پر مجھے بہرحال چلنا ہے۔ خطرہ آتا ہے تو آتا رہے۔

۴۱ – یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ اللہ کی صورت میں ایک نورِ علم اسے مل گیا ہے جس کے اُجالے میں وہ ہر ہر قدم پر صاف دیکھتا جاتا ہے کہ زندگی کی بے شمار پگ ڈنڈیوں کے درمیان حق کا سیدھا راستہ کون سا ہے۔

۴۲ – شرحِ صدر کے مقابلے میں انسانی قلب کی دو ہی کیفیتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ضیقِ صدر (سینہ تنگ ہو جانے اور دل بھنچ جانے) کی کیفیت جس میں کچھ نہ کچھ گنجایش اس بات کی رہ جاتی ہے کہ حق اُس میں نُفوذ کر جائے، اور دوسری قساوتِ قلب (دل کے پتھر ہو جانے) کی کیفیت جس میں حق کے لیے نُفوذ یا سَرایت کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اِس دوسری کیفیت کے متعلق فرماتا ہے کہ جو شخص اس حد تک پہنچ جائے اس کے لیے پھر کامل تباہی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص، خواہ دل کی تنگی ہی کے ساتھ سہی، ایک مرتبہ قبولِ حق کے لیے کسی طرح تیار ہو جائے تو اس کے لیے بچ نکلنے کا کچھ نہ کچھ امکان ہوتا ہے۔ یہ دوسرا مضمون آیت کے فحویٰ سے خود بخود نکلتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی صراحت نہیں فرمائی ہے، کیونکہ آیت کا اصل مقصود اُن لوگوں کو مُتنبِّہ کرنا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ضد اور ہٹ دھرمی پر تُلے ہوئے تھے اور فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ آپؐ کی کوئی بات مان کر نہیں دینی ہے۔ اس پر انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ تم تو اپنی اس ہیکڑی کو بڑی قابلِ فخر چیز سمجھ رہے ہو، مگر فی الحقیقت ایک انسان کی اس سے بڑھ کر کوئی نالائقی اور بدنصیبی نہیں ہو سکتی کہ اللہ کا ذکر اور اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت سُن کر وہ نرم پڑنے کے بجائے اور زیادہ سخت ہو جائے۔

۴۳ – یعنی ان میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ پوری کتاب اوّل سے لے کر آخر تک ایک ہی مدّعا، ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی نظامِ فکر و عمل پیش کرتی ہے۔ اس کا ہر جُز دوسرے جُز کی اور ہر مضمون دوسرے مضمون کی تصدیق و تائید اور

كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٢٤﴾ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ
حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٥﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا
لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ ۚ
قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢٨﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

وقف لازم

جو تم کرتے رہے [۴۵] تھے۔ اِن سے پہلے بھی بہت سے لوگ اسی طرح جھُٹلا چکے ہیں۔ آخر اُن پر عذاب ایسے رخ سے آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ جا سکتا تھا۔ پھر اللہ نے ان کو دنیا ہی کی زندگی میں رُسوائی کا مزا چکھایا، اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح کی مثالیں دی ہیں کہ یہ ہوش میں آئیں۔ ایسا قرآن جو عربی زبان میں [۴۶] ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں [۴۷] ہے، تاکہ یہ بُرے انجام سے بچیں۔ اللہ ایک مثال دیتا ہے۔

توضیح و تشریح کرتا ہے۔ اور معنٰی و بیان، دونوں کے لحاظ سے اس میں کامل یکسانی (consistency) پائی جاتی ہے۔

۴۴ – کسی ضَرب کو آدمی اپنے منہ پر اُس وقت لیتا ہے جب کہ وہ بالکل عاجز و بے بس ہو۔ ورنہ جب تک وہ مُدافعت پر کچھ بھی قادر ہوتا ہے وہ اپنے جسم کے ہر حصے پر چوٹ کھاتا رہتا ہے مگر منہ پر مار نہیں پڑنے دیتا۔ اس لیے یہاں اس شخص کی انتہائی بے بسی کی تصویر یہ کہہ کر کھینچ دی گئی ہے کہ وہ سخت مار اپنے منہ پر لے گا۔

۴۵ – اصل میں لفظ ''کسب'' استعمال ہوا ہے جس سے مراد قرآنِ مجید کی اِصطلاح میں جزا و سزا کا وہ استحقاق ہے جو آدمی اپنے عمل کے نتیجے میں کماتا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کی اصل کمائی یہ ہے کہ وہ اللہ کے اجر کا مستحق بنتا ہے۔ اور گمراہی و بدراہی اختیار کرنے والے کی کمائی وہ سزا ہے جو اسے آخرت میں ملنے والی ہے۔

۴۶ – یعنی یہ کسی غیر زبان میں نہیں آیا ہے کہ مکّہ اور عرب کے لوگ اسے سمجھنے کے لیے کسی مُترجِم یا شارح کے محتاج ہوں، بلکہ یہ اِن کی اپنی زبان میں ہے جسے یہ براہِ راست خود سمجھ سکتے ہیں۔

۴۷ – یعنی اس میں اینچ پینچ کی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ عام آدمی کے لیے اس کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے۔ بلکہ صاف صاف سیدھی بات کہی گئی ہے جس سے ہر آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کتاب کس چیز کو غلط کہتی ہے اور کیوں، کس چیز کو صحیح کہتی ہے اور کس بنا پر، کیا منوانا چاہتی ہے اور کس چیز کا انکار کرانا چاہتی ہے، کن کاموں کا حکم دیتی ہے اور کن کاموں سے

رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ

ایک شخص تو وہ ہے جس کی مِلکیّت میں بہت سے کج خُلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پُورا کا پُورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟[۴۸] — الحمدُ للّٰہ،[۴۹] مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔[۵۰] (اَے نبیؐ!) تمھیں بھی مرنا ہے اور اِن لوگوں کو

روکتی ہے۔

۴۸ - اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے شرک اور توحید کے فرق اور انسان کی زندگی پر دونوں کے اثرات کو اس طرح کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ اس سے زیادہ مختصر الفاظ میں اتنا بڑا مضمون اتنے مؤثر طریقے سے سمجھا دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات ہر آدمی تسلیم کرے گا کہ جس شخص کے بہت سے مالک یا آقا ہوں، اور ہر ایک اس کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہا ہو، اور وہ مالک بھی ایسے بدمزاج ہوں کہ ہر ایک اُس سے خدمت لیتے ہوئے دوسرے مالک کے حکم پر دوڑنے کی اسے مہلت نہ دیتا ہو اور ان کے متضاد اَحکام میں جس کے حکم کی بھی وہ تعمیل سے قاصر رہ جائے وہ اسے ڈانٹنے پھٹکارنے ہی پر اکتفا نہ کرتا ہو بلکہ سزا دینے پر تُل جاتا ہو، اس کی زندگی لامحالہ سخت ضیق میں ہوگی۔ اور اس کے برعکس وہ شخص بڑے چین اور آرام سے رہے گا جو بس ایک ہی آقا کا نوکر یا غلام ہو اور کسی دوسرے کی خدمت و رضا جوئی اسے نہ کرنی پڑے۔ یہ ایسی سیدھی سی بات ہے جسے سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و تأمُّل کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی شخص کے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ انسان کے لیے جو امن و اطمینان ایک خدا کی بندگی میں ہے وہ بہت سے خداؤں کی بندگی میں اسے کبھی میسر نہیں آ سکتا۔

اس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بہت سے کج خلق اور باہم مُتنازَع آقاؤں کی تمثیل پتھر کے بتوں پر راست نہیں آتی بلکہ اُن جیتے جاگتے آقاؤں پر ہی راست آتی ہے جو عَملاً آدمی کو متضاد احکام دیتے ہیں اور فی الواقع اس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ پتھر کے بُت کسے حکم دیا کرتے ہیں اور کب کسی کو کھینچ کر اپنی خدمت کے لیے بلاتے ہیں۔ یہ کام تو زندہ آقاؤں ہی کے کرنے کے ہیں۔ ایک آقا آدمی کے اپنے نفس میں بیٹھا ہوا ہے جو طرح طرح کی خواہشات اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ انھیں پورا کرے۔ دوسرے بے شمار آقا گھر میں، خاندان میں، بَرادری میں، قوم اور ملک کے معاشرے میں، مذہبی پیشواؤں میں، حکمرانوں اور قانون سازوں میں، کاروبار اور معیشت کے دائروں میں، اور دنیا کے تمدُّن پر غلبہ رکھنے والی طاقتوں میں ہر طرف موجود ہیں جن کے متضاد تقاضے اور مختلف مطالبے ہر وقت آدمی کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں اور ان میں سے جس کا تقاضا پورا کرنے میں بھی وہ کوتاہی کرتا ہے وہ اپنے دائرۂ کار میں اس کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ البتہ ہر ایک کی سزا کے ہتھیار الگ الگ ہیں۔ کوئی دل مسوستا ہے، کوئی رُوٹھ جاتا ہے، کوئی نکّو بناتا ہے، کوئی مقاطَعَہ کرتا ہے، کوئی دیوالہ نکالتا ہے، کوئی مذہب کا وار کرتا ہے اور کوئی قانون کی چوٹ لگاتا ہے۔ اِس ضیق سے نکلنے کی کوئی صورت انسان کے لیے اس کے سوا نہیں ہے

کہ وہ توحید کا مسلک اختیار کر کے صرف ایک خدا کا بندہ بن جائے اور ہر دوسرے کی بندگی کا قِلادَہ اپنی گردن سے اتار پھینکے۔

توحید کا مسلک اختیار کرنے کی بھی دو شکلیں ہیں جن کے نتائج الگ الگ ہیں۔

ایک شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدائے واحد کا بندہ بن کر رہنے کا فیصلہ کر لے اور گرد و پیش کا ماحول اس معاملے میں اس کا ساتھی نہ ہو۔ اس صورت میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ خارجی کش مکش اور ضیق اس کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے، لیکن اگر اس نے سچے دل سے یہ مسلک اختیار کیا ہو تو اسے داخلی امن و اطمینان لازماً میسر آ جائے گا۔ وہ نفس کی ہر اُس خواہش کو رد کر دے گا جو احکامِ الٰہی کے خلاف ہو یا جسے پورا کرنے کے ساتھ خدا پرستی کے تقاضے پورے نہ کیے جا سکتے ہوں۔ وہ خاندان، برادری، قوم، حکومت، مذہبی پیشوائی اور معاشی اقتدار کے بھی کسی ایسے مطالبے کو قبول نہ کرے گا جو خدا کے قانون سے ٹکراتا ہو۔ اس کے نتیجے میں اسے بے حد تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں، بلکہ لازماً پہنچیں گی۔ لیکن اس کا دل پوری طرح مطمئن ہو گا کہ جس خدا کا میں بندہ ہوں اس کی بندگی کا تقاضا پورا کر رہا ہوں، اور جن کا بندہ میں نہیں ہوں ان کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے جس کی بنا پر میں اپنے رب کے حکم کے خلاف ان کی بندگی بجا لاؤں۔ یہ دل کا اطمینان اور روح کا امن و سکون دنیا کی کوئی طاقت اُس سے نہیں چھین سکتی۔ حتّٰی کہ اگر اسے پھانسی پر بھی چڑھنا پڑ جائے تو وہ ٹھنڈے دل سے چڑھ جائے گا اور اس کو ذرا پچھتاوا نہ ہو گا کہ میں نے کیوں نہ جھوٹے خداؤں کے آگے سر جھکا کر اپنی جان بچا لی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ پورا معاشرہ اِسی توحید کی بنیاد پر قائم ہو جائے اور اس میں اَخلاق، تمدُّن، تہذیب، تعلیم، مذہب، قانون، رسم و رواج، سیاست، معیشت، غرض ہر شعبۂ زندگی کے لیے وہ اُصول اعتقاداً مان لیے جائیں اور عملاً رائج ہو جائیں جو خداوندِ عالم نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے دیے ہیں۔ خدا کا دین جس کو گناہ کہتا ہے، قانون اسی کو جرم قرار دے، حکومت کی انتظامی مشین اسی کو مٹانے کی کوشش کرے، تعلیم و تربیَت اسی سے بچنے کے لیے ذہن اور کردار تیار کرے، منبر و محراب سے اسی کے خلاف آواز بلند ہو، معاشرہ اسی کو معیوب ٹھیرائے اور معیشت کے ہر کاروبار میں وہ ممنوع ہو جائے۔ اسی طرح خدا کا دین جس چیز کو بھلائی اور نیکی قرار دے، قانون اس کی حمایت کرے، انتظام کی طاقتیں اسے پروان چڑھانے میں لگ جائیں، تعلیم و تربیت کا پورا نظام ذہنوں میں اس کو بٹھانے اور سیرتوں میں اسے رچا دینے کی کوشش کرے، منبر و محراب اسی کی تلقین کریں، معاشرہ اسی کی تعریف کرے اور اپنے عملی رسم و رواج اُس پر قائم کر دے، اور کاروبارِ معیشت بھی اسی کے مطابق چلے۔ یہ وہ صورت ہے جس میں انسان کو کامل داخلی و خارجی اطمینان میسر آ جاتا ہے اور مادّی و روحانی ترقی کے تمام دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، کیونکہ اس میں بندگیِ رب اور بندگیِ غیر کے تقاضوں کا تصادُم قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔

اسلام کی دعوت اگرچہ ہر ہر فرد کو یہی ہے کہ خواہ دوسری صورت پیدا ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ توحید ہی کو اپنا دین بنا لے اور تمام خطرات و مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کرے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا آخری مقصود یہی دوسری صورت پیدا کرنا ہے اور تمام انبیا علیہم السلام کی کوششوں کا مدّعا یہی رہا ہے کہ ایک امّتِ مسلمہ وجود میں آئے جو کفر اور کفار کے غلبے سے آزاد ہو کر من حیث الجماعت اللہ کے دین کی پیروی کرے۔ کوئی شخص جب تک قرآن و سنت سے ناواقف اور عقل سے بے بہرہ نہ ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ انبیا علیہم السلام کی سعی و جُہد کا مقصود صرف انفرادی ایمان و طاعت ہے، اور اجتماعی زندگی میں

مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾ ع ۳ / ۱۷

الجزء ۲۴

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ

وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ

رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ۚۖ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ

بھی مرنا ہے۔[۵۱] آخرِ کار قیامت کے روز تم سب اپنے رب کے حضُور اپنا اپنا مُقدّمہ پیش کرو گے۔ع پھر اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جس نے اللہ پر جھُوٹ باندھا اور جب سچّائی اس کے سامنے آئی تو اُسے جھُٹلا دیا۔ کیا ایسے کافروں کے لیے جہنّم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟ اور جو شخص سچّائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔[۵۲] انھیں اپنے رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں[۵۳] گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا۔ تاکہ جو بدترین اعمال انھوں نے کیے تھے انھیں اللہ ان کے حساب سے

دینِ حق کو نافذ و قائم کرنا سرے سے ان کا مقصد ہی نہیں رہا ہے۔

۴۹ – یہاں الحمدللہ کی معنویت سمجھنے کے لیے یہ نقشہ ذہن میں لائیے کہ اُوپر کا سوال لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے بعد مُقرِّر نے سُکوت کیا، تاکہ اگر مخالفینِ توحید کے ماس اس کا کوئی جواب ہو تو دیں۔ پھر جب ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور کسی طرف سے یہ آواز نہ آئی کہ دونوں برابر ہیں، تو مقرر نے کہا: الحمدللہ۔ یعنی خدا کا شکر ہے کہ تم خود بھی اپنے دلوں میں ان دونوں حالتوں کا فرق محسوس کرتے ہو اور تم میں سے کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ ایک آقا کی بندگی سے بہت سے آقاؤں کی بندگی بہتر ہے یا دونوں یکساں ہیں۔

۵۰ – یعنی ایک آقا کی غلامی اور بہت سے آقاؤں کی غلامی کا فرق تو خوب سمجھ لیتے ہیں مگر ایک خدا کی بندگی اور بہت سے خداؤں کی بندگی کا فرق جب سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو نادان بن جاتے ہیں۔

۵۱ – پچھلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے موقع ومحل اور سیاق وسباق پر غور کر کے ہر صاحبِ فہم آدمی خود بھر سکتا ہے۔ اس میں یہ مضمون پوشیدہ ہے کہ اِس اِس طرح تم ایک صاف سیدھی بات سیدھے طریقے سے اِن لوگوں کو سمجھا رہے ہو اور یہ لوگ نہ صرف یہ کہ ہٹ دھرمی سے تمھاری بات ردّ کر رہے ہیں، بلکہ اِس کھلی صداقت کو دبانے کے لیے تمھارے درپے آزار ہیں۔ اچھا ہمیشہ نہ تمھیں رہنا ہے نہ اِنھیں۔ دونوں کو ایک دن مرنا ہے۔ انجام سب کے سامنے آجائے گا۔

الَّذِیۡ عَمِلُوۡا وَ یَجۡزِیَہُمۡ اَجۡرَہُمۡ بِاَحۡسَنِ الَّذِیۡ کَانُوۡا
یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ ؕ وَ یُخَوِّفُوۡنَکَ بِالَّذِیۡنَ مِنۡ
دُوۡنِہٖ ؕ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿ۚ۳۶﴾ وَ مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ
مِنۡ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِعَزِیۡزٍ ذِی انۡتِقَامٍ ﴿۳۷﴾ وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ

ساقط کر دے اور جو بہترین اعمال وہ کرتے رہے اُن کے لحاظ سے اُن کو اجر عطا فرمائے۔[۵۴]

(اَے نبیؐ!) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اُس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔[۵۵] حالانکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اُسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں، اور جسے وہ ہدایت دے اُسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے؟[۵۶] اِن لوگوں سے اگر تم پوچھو

۵۲ – مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جو مُقدّمہ ہونا ہے اس میں سزا پانے والے کون ہوں گے، یہ بات تم آج ہی سُن لو۔ سزا لازماً انھی ظالموں کو ملنی ہے جنھوں نے یہ جھوٹے عقیدے گھڑے کہ اللہ کے ساتھ اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حُقوق میں کچھ دوسری ہستیاں بھی شریک ہیں، اور اس سے بھی زیادہ بڑھ کر ان کا ظلم یہ ہے کہ جب ان کے سامنے سچائی پیش کی گئی تو انھوں نے اسے مان کر نہ دیا بلکہ اُلٹا اُسی کو جھوٹا قرار دیا جس نے سچائی پیش کی۔ رہا وہ شخص جو سچائی لایا اور وہ لوگ جنھوں نے اس کی تصدیق کی، تو ظاہر ہے کہ اللہ کی عدالت سے ان کے سزا پانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵۳ – یہ بات ملحوظ رہے کہ یہاں فی الجنّۃ (جنت میں) نہیں بلکہ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ (ان کے رب کے ہاں) کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے رب کے ہاں تو بندہ مرنے کے بعد ہی پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے آیت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں پہنچ کر ہی نہیں، بلکہ مرنے کے وقت سے دُخولِ جنت تک کے زمانے میں بھی مومنِ صالح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی رہے گا۔ وہ عذابِ بَرزَخ سے، روزِ قیامت کی سختیوں سے، حساب کی سخت گیری سے، میدانِ حشر کی رسوائی سے، اپنی کوتاہیوں اور قصوروں پر مواخذے سے لازماً بچنا چاہے گا اور اللہ جَلَّ شانُہٗ اس کی یہ ساری خواہشات پوری فرمائے گا۔

۵۴ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ایمان لائے تھے زمانۂ جاہلیت میں ان سے اعتقادی اور اخلاقی دونوں ہی طرح کے بدترین گناہ سرزد ہو چکے تھے۔ اور ایمان لانے کے بعد انھوں نے صرف یہی ایک نیکی نہ کی تھی کہ اُس جھوٹ کو چھوڑ دیا جسے وہ پہلے مان رہے تھے اور وہ سچائی قبول کر لی جسے حضورؐ نے پیش فرمایا تھا، بلکہ مزید برآں انھوں نے اَخلاق، عبادات، اور معاملات میں بہترین اعمالِ صالحہ انجام دیے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے وہ بدترین اعمال جو جاہلیّت میں ان سے سرزد ہوئے تھے ان کے حساب سے محو کر دیے جائیں گے، اور ان کو انعام اُن اعمال کے لحاظ سے دیا جائے گا جو ان کے نامۂ اعمال میں سب سے بہتر ہوں گے۔

مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ
ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ
اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۞۳۸ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ
اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۞۳۹ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ

کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ اِن سے کہو: جب حقیقت یہ ہے تو تمھارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا تمھاری یہ دیویاں، جنھیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو، مجھے اُس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچالیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، بھروسا کرنے والے اُسی پر بھروسا کرتے ہیں[۵۷]۔ ان سے صاف کہو کہ ”اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ اپنا کام کیے جاؤ[۵۸] میں اپنا کام کرتا رہوں گا، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رُسوا کُن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے

۵۵ – کُفّارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے معبُودوں کی شان میں گستاخیاں کرتے ہو اور اِن کے خلاف زبان کھولتے ہو۔ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ یہ کیسی زبردست باکرامت ہستیاں ہیں۔ ان کی توہین تو جس نے بھی کی وہ برباد ہو گیا۔ تم بھی اگر اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو یہ تمھارا تختہ اُلٹ دیں گے۔

۵۶ – یعنی یہ بھی ہدایت سے ان کی محرومی ہی کا کرشمہ ہے کہ ان احمقوں کو اپنے اِن معبُودوں کی طاقت و عزت کا تو بڑا خیال ہے، مگر انھیں اس بات کا خیال کبھی نہیں آتا کہ اللہ بھی کوئی زبردست ہستی ہے اور شرک کر کے اُس کی جو توہین یہ کر رہے ہیں، اُس کی بھی کوئی سزا انھیں مل سکتی ہے۔

۵۷ – ابنِ ابی حاتمؒ نے ابنِ عباسؓ سے رِوایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من احب ان یکون اقوی الناس فلیتوکل علی اللّٰہ، ومن احب ان یکون اغنی الناس فلیکن بما فی ید اللّٰہ عزوجل اوثق منہ بما فی یدیہ، ومن احب ان یکون اکرم الناس فلیتق اللّٰہ عزوجلّ۔ ”جو شخص چاہتا ہو کہ سب انسانوں سے زیادہ طاقت ور ہو جائے اسے چاہیے کہ اللہ پر توکل کرے۔ اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر غنی ہو جائے، اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اُس پر زیادہ بھروسا رکھے، بہ نسبت اُس چیز کے جو اس کے اپنے ہاتھ میں ہے، اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے زیادہ عزت والا ہو جائے،

عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٤٠﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ
فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ
عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٤١﴾ ع اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ
تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ
الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾

جو کبھی ٹلنے والی نہیں۔'' (اے نبیؐ!) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتابِ برحق تم پر نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اُس کے بھٹکنے کا وبال اُسی پر ہوگا، تم اُن کے ذمّہ دار نہیں ہو۔[59] ع

وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت رُوحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اُس کی رُوح نیند میں قبض کر لیتا ہے،[60] پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اُسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی رُوحیں ایک وقتِ مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔ اِس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔[61]

اسے چاہیے کہ اللہ عزَّ وجلَّ سے ڈرے۔''

۵۸ – یعنی مجھے زک دینے کے لیے جو کچھ تم کر رہے ہو اور کر سکتے ہو وہ کیے جاؤ، اپنی کرنی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھو۔

۵۹ – یعنی تمھارے سپرد انھیں راہِ راست پر لے آنا نہیں ہے۔ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ ان کے سامنے راہِ راست پیش کر دو۔ اس کے بعد اگر یہ گمراہ رہیں تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۶۰ – نیند کی حالت میں روح قبض کرنے سے مراد احساس و شعور، فہم و اِدراک اور اختیار و ارادہ کی قوتوں کو معطّل کر دینا ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس پر اُردو زبان کی یہ کہاوت فی الواقع راست آتی ہے کہ سویا اور مُوا برابر۔

۶۱ – اس ارشاد سے اللہ تعالیٰ ہر انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ موت اور زیست کس طرح اُس کے دستِ قدرت میں ہے۔ کوئی شخص بھی یہ ضمانت نہیں رکھتا کہ رات کو جب وہ سوئے گا تو صبح لازماً زندہ ہی اُٹھے گا۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ ایک گھڑی بھر میں اُس پر کیا آفت آ سکتی ہے اور دوسرا لمحہ اُس پر زندگی کا لمحہ ہوتا ہے یا موت کا۔ ہر وقت سوتے میں یا جاگتے میں، گھر بیٹھے یا کہیں چلتے پھرتے آدمی کے جسم کی کوئی اندرونی خرابی، یا باہر سے کوئی نامعلوم آفت یکایک وہ شکل اختیار کر سکتی ہے جو اُس کے لیے پیامِ موت ثابت ہو۔ اِس طرح جو انسان خدا کے ہاتھ میں بے بس ہے وہ کیسا سخت نادان ہے اگر اُسی خدا سے غافل یا

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ
شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ
وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا
ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ

کیا اُس خدا کو چھوڑ کر اِن لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟[۶۲] ان سے کہو: کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ اُن کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو: شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔[۶۳] آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔ پھر اُسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کُڑھنے لگتے ہیں، اور جب اُس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کِھل اُٹھتے ہیں۔[۶۴] کہو: خدایا!

منحرف ہو۔

۶۲ – یعنی ایک تو ان لوگوں نے اپنے طور پر خود ہی یہ فرض کر لیا کہ کچھ ہستیاں اللہ کے ہاں بڑی زور آور ہیں جن کی سِفارش کسی طرح ٹل نہیں سکتی، حالانکہ ان کے سِفارشی ہونے پر نہ کوئی دلیل، نہ اللہ تعالیٰ نے کبھی یہ فرمایا کہ ان کو میرے ہاں یہ مرتبہ حاصل ہے، اور نہ خود اُن ہستیوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہم اپنے زور سے تمھارے سارے کام بنوا دیا کریں گے۔ اس پر مزید حماقت ان لوگوں کی یہ ہے کہ اصل مالک کو چھوڑ کر ان فرضی سِفارشیوں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور اِن کی ساری نیاز مندیاں اُنھی کے لیے وقف ہیں۔

۶۳ – یعنی کسی کا یہ زور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حُضور میں خود سفارشی بن کر اُٹھ ہی سکے، کجا کہ اپنی سِفارش منوا لینے کی طاقت بھی اُس میں ہو۔ یہ بات تو بالکل اللہ کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے سفارش کی اجازت دے اور جسے چاہے نہ دے۔ اور جس کے حق میں چاہے کسی کو سفارش کرنے دے اور جس کے حق میں چاہے نہ کرنے دے۔ (شَفاعت کے اسلامی عقیدے اور مشرکانہ عقیدے کا فرق سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۸۱، الانعام، حاشیہ ۳۲۔ جلد دوم، یونُس، حواشی ۵ – ۲۴، ہود، حواشی ۸۴ – ۱۰۶، الرعد، حاشیہ ۱۹، النحل، حواشی ۶۴ – ۶۵ – ۷۹۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۸۵ – ۸۶، الانبیاء، حاشیہ ۲۷، الحج، حاشیہ ۱۲۵۔ جلد چہارم، السباء، حاشیہ ۴۰۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ
بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ
الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا
يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا
بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا

آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، حاضر و غائب کے جاننے والے، تُو ہی اپنے بندوں کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اگر اِن ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو، اور اتنی ہی اور بھی، تو یہ روزِ قیامت کے بُرے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انھوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے بُرے نتائج ان پر کھل جائیں گے، اور وہی چیز ان پر مسلّط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اُڑاتے رہے ہیں۔

یہی انسان[65] جب ذرا سی مصیبت اِسے چھُو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، اور جب ہم اسے اپنی

۶۴ – یہ بات قریب قریب ساری دنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والے لوگوں میں مُشترَک ہے، حتّٰی کہ مسلمانوں میں بھی جن بدقسمتوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے وہ بھی اس عیب سے خالی نہیں ہیں۔ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اکیلے اللہ کا ذکر کیجیے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں: ضرور یہ شخص بزرگوں اور اولیا کو نہیں مانتا، جبھی تو بس اللہ ہی اللہ کی باتیں کیے جاتا ہے۔ اور اگر دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں کی کلی کھِل جاتی ہے اور بشاشت سے ان کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اصل میں دلچسپی اور محبّت کس سے ہے۔ علامۂ آلُوسیؒ نے تفسیر رُوح المعانی میں اس مقام پر خود اپنا ایک تجرِبہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کسی مصیبت میں ایک وفات یافتہ بزرگ کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ میں نے کہا: اللہ کے بندے! اللہ کو پکار، وہ خود فرماتا ہے کہ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میری یہ بات سُن کر اسے سخت غصہ آیا اور بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہتا تھا: یہ شخص اولیا کا منکر ہے۔ اور

خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ

طرف سے نعمت دے کر اُبھار دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے[۶۶]! نہیں، بلکہ یہ آزمائش ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۶۷]۔ یہی بات ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی کہہ چکے ہیں، مگر جو کچھ وہ کماتے تھے وہ ان کے کسی کام نہ آیا[۶۸]۔ پھر اپنی کمائی کے بُرے نتائج انھوں نے بُھگتے، اور ان لوگوں میں سے بھی جو ظالم ہیں وہ عنقریب اپنی کمائی کے بُرے نتائج بھگتیں گے۔ یہ ہمیں عاجز

بعض لوگوں نے اس کو یہ کہتے بھی سُنا کہ اللہ کی نسبت ولی جلدی سُن لیتے ہیں۔

۶۵ – یعنی جسے اللہ کے نام سے چِڑ ہے اور اکیلے اللہ کا ذکر سُن کر جس کا چہرہ بگڑنے لگتا ہے۔

۶۶ – اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس نعمت کا اہل ہوں، اسی لیے اس نے مجھے یہ کچھ دیا ہے، ورنہ اگر اس کے نزدیک مَیں ایک بُرا اور بدعقیدہ اور غلط کار آدمی ہوتا تو مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تو مجھے میری قابلیت کی بنا پر ملا ہے۔

۶۷ – لوگ اپنی جہالت و نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جسے کوئی نعمت مل رہی ہے وہ لازماً اس کی اہلیت و قابلیت کی بنا پر مل رہی ہے، اور اس نعمت کا ملنا اُس کے مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی علامت یا دلیل ہے۔ حالانکہ یہاں جس کو جو کچھ بھی دیا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے طور پر دیا جا رہا ہے۔ یہ امتحان کا سامان ہے نہ کہ قابلیت کا انعام، ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ بہت سے قابل آدمی خستہ حال ہیں اور بہت سے نا قابل آدمی نعمتوں میں کھیل رہے ہیں۔ اسی طرح یہ دنیوی نعمتیں مقبولِ بارگاہ ہونے کی علامت بھی نہیں ہیں۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ دنیا میں بکثرت ایسے نیک آدمی مصائب میں مبتلا ہیں جن کے نیک ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور بہت سے بُرے آدمی، جن کی قبیح حرکات سے ایک دنیا واقف ہے، عیش کر رہے ہیں۔ اب کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی ایک کی مصیبت اور دوسرے کے عیش کو اس بات کی دلیل بنا سکتا ہے کہ نیک انسان کو اللہ پسند نہیں کرتا اور بد انسان کو وہ پسند کرتا ہے؟

۶۸– مطلب یہ ہے کہ جب ان کی شامت آئی تو وہ قابلیت بھی دھری رہ گئی جس کا انھیں دعویٰ تھا، اور یہ بات بھی کُھل گئی کہ وہ اللہ کے مقبول بندے نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کی یہ کمائی مقبولیت اور صلاحیت کی بنا پر ہوتی تو شامت کیسے آجاتی۔

بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۵۱﴾ اَوَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَ
يَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾ ع قُلۡ يٰعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ
اَسۡرَفُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ
الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيۡبُوۡۤا اِلٰى

ع ۵ ۱۱/۲

کر دینے والے نہیں ہیں۔اور کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے؟[۶۹] اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ ع

(اے نبیؐ!) کہہ دو کہ اے میرے بندو![۷۰] جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایُوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفورٌ رحیم ہے،[۷۱] پلٹ آؤ اپنے رب

۶۹ – یعنی رزق کی تنگی و کشادگی اللہ کے ایک دوسرے ہی قانون پر مبنی ہے جس کے مصالح کچھ اور ہیں۔اس تقسیم رزق کا مدار آدمی کی اہلیت و قابلیت، یا اس کے محبُوب و مغضوب ہونے پر ہر گز نہیں ہے۔(اس مضمون کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۵۴-۵۵-۸۹، یونس، حاشیہ ۲۳، ہود، حاشیہ ۳-۳۳، الرعد، حاشیہ ۴۲۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۳۷، مریم، حاشیہ ۴۵، طٰہٰ، حواشی ۱۱۳-۱۱۴، الانبیاء، حاشیہ ۹۹، المومنون، دیباچہ، حاشیہ ۱-۴۹-۵۰، الشعراء، حاشیہ ۸۱-۸۴، القصص، حواشی ۹۷-۹۸-۱۰۱۔ جلد چہارم، سبا، حواشی ۵۴ تا ۶۰۔

۷۰ – بعض لوگوں نے ان الفاظ کی یہ عجیب تاویل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ''اے میرے بندو'' کہہ کر لوگوں سے خطاب کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا سب انسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک ایسی تاویل ہے جسے تاویل نہیں بلکہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف اور اللہ کے کلام کے ساتھ کھیل کہنا چاہیے۔جاہل عقیدت مندوں کا کوئی گروہ تو اس نکتے کو سُن کر جھوم اُٹھے گا، لیکن یہ تاویل اگر صحیح ہو تو پھر پورا قرآن غلط ہوا جاتا ہے، کیونکہ قرآن تو از اوّل تا آخر انسانوں کو صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیتا ہے، اور اس کی ساری دعوت ہی یہ ہے کہ تم ایک اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود بندے تھے۔ان کو اللہ نے رب نہیں بلکہ رسول بنا کر بھیجا تھا۔اور اس لیے بھیجا تھا کہ خود بھی اُسی کی بندگی کریں اور لوگوں کو بھی اسی کی بندگی سکھائیں۔آخر کسی صاحبِ عقل آدمی کے دماغ میں یہ بات کیسے سما سکتی ہے کہ مکۂ معظّمہ میں کفارِ قریش کے درمیان کھڑے ہو کر ایک روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یکایک یہ اعلان کر دیا ہوگا کہ تم عبد العُزّٰی اور عبدِ شمس کے بجائے دراصل عبدِ محمدؐ ہو، اعاذنا اللہ من ذالک۔

۷۱ – یہ خطاب تمام انسانوں سے ہے، صرف اہلِ ایمان کو مخاطَب قرار دینے کے لیے کوئی وزنی دلیل نہیں ہے۔اور جیسا کہ علامہ ابنِ کثیر نے لکھا ہے، عام انسانوں کو مخاطَب کر کے یہ بات ارشاد فرمانے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ و انابت کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، بلکہ بعد والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی وضاحت فرما دی ہے کہ گناہوں کی معافی کی صورت

رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا
تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ
اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ
يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ
السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾
اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ

کی طرف اور مطیع بن جاؤ اُس کے، قبل اِس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمھیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو[۶۷] کی، قبل اِس کے کہ تم پر اچانک عذاب آئے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کہے: ''افسوس میری اُس تقصیر پر جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا، بلکہ میں تو اُلٹا مذاق اُڑانے والوں میں شامل تھا۔'' یا کہے: ''کاش! اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں بھی متّقیوں میں سے ہوتا۔'' یا عذاب دیکھ کر کہے: ''کاش! مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں

بندگی و اطاعت کی طرف پلٹ آنا اور اللہ کے نازل کیے ہوئے پیغام کی پیروی اختیار کر لینا ہے۔ دراصل یہ آیت ان لوگوں کے لیے پیغامِ اُمید لے کر آئی تھی جو جاہلیّت میں قتل، زنا، چوری، ڈاکے اور ایسے ہی سخت گناہوں میں غرق رہ چکے تھے، اور اس بات سے مایوس تھے کہ یہ قصور کبھی معاف ہو سکیں گے۔ اُن سے فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، جو کچھ بھی تم کر چکے ہو اس کے بعد اب اگر اپنے رب کی اطاعت کی طرف پلٹ آؤ تو سب کچھ معاف ہو جائے گا۔ اس آیت کی یہی تاویل ابنِ عباسؓ، قَتادَہؒ، مجاہدؒ اور ابنِ زیدؒ نے بیان کی ہے۔ (ابنِ جَرِیر، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذِی) مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۸۴۔

۶۷ – کتاب اللہ کے بہترین پہلو کی پیروی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے آدمی ان کی تعمیل کرے، جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے ان سے بچے، اور اَمثال اور قصّوں میں جو کچھ اس نے ارشاد فرمایا ہے اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔ بخلاف اس کے جو شخص حکم سے منہ موڑتا ہے، مَنہیّات کا ارتکاب کرتا ہے اور اللہ کے وعظ و نصیحت سے کوئی اثر نہیں لیتا وہ کتاب اللہ کے بدترین پہلو کو اختیار کرتا ہے، یعنی وہ پہلو اختیار کرتا ہے جسے کتاب اللہ بدترین قرار دیتی ہے۔

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَ
كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى
اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾
وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ
اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ

شامل ہو جاؤں۔" (اور اُس وقت اسے یہ جواب ملے کہ) "کیوں نہیں، میری آیات تیرے پاس آ چکی تھیں، پھر تُو نے انھیں جھٹلایا اور تکبّر کیا، اور تو کافروں میں سے تھا۔" آج جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ باندھے ہیں، قیامت کے روز تم دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہوں گے۔ کیا جہنّم میں متکبّروں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے؟ اس کے برعکس جن لوگوں نے یہاں تقویٰ کیا ہے، ان کے اسبابِ کامیابی کی وجہ سے اللہ ان کو نجات دے گا، ان کو نہ کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے[۷۳]۔ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کی کُنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ع (اے نبیؐ!) اِن سے کہو: "پھر کیا اَے جاہلو! تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو؟" (یہ بات تمھیں ان سے صاف کہہ دینی چاہیے، کیونکہ) تمھاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاؑ کی طرف یہ وحی بھیجی

۷۳۔ یعنی اس نے دنیا کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ وہی ہر چیز کی خبر گیری اور نگہبانی کر رہا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں جس طرح اُس کے پیدا کرنے سے وجود میں آئی ہیں اُسی طرح وہ اُس کے باقی رکھنے سے باقی ہیں، اُس کے پرورش کرنے سے پھل

قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾
بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ
وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ
بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ

جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا[۷۴] اور تم خسارے میں رہو گے۔ لٰہذا (اَے نبیؐ!) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ۔

اِن لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے[۷۵]۔ (اس کی قدرتِ کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ) قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہو گی اور آسمان اس کے دستِ راست میں لپیٹے ہوئے ہوں[۷۶] گے۔ پاک اور بالاتر ہے وہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں[۷۷]۔ اور اُس روز صُور پھونکا جائے[۷۸] گا اور

پھول رہی ہیں، اور اس کی حفاظت و نگرانی میں کام کر رہی ہیں۔

۷۴ - یعنی شرک کے ساتھ کسی عمل کو عملِ صالح قرار نہیں دیا جائے گا، اور جو شخص بھی مشرک رہتے ہوئے اپنے نزدیک بہت سے کاموں کو نیک کام سمجھتے ہوئے کرے گا ان پر وہ کسی اجر کا مستحق نہ ہو گا اور اس کی پوری زندگی سراسر زیاں کاری بن کر رہ جائے گی۔

۷۵ - یعنی ان کو اللہ کی عظمت و کبریائی کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہے۔ انھوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ خداوندِ عالَم کا مقام کتنا بلند ہے اور وہ حقیر ہستیاں کیا شے ہیں جن کو یہ نادان لوگ خدائی میں شریک اور معبُودیت کا حق دار بنائے بیٹھے ہیں۔

۷۶ - زمین اور آسمان پر اللہ تعالیٰ کے کامل اقتدار و تصرُّف کی تصویر کھینچنے کے لیے مٹھی میں ہونے اور ہاتھ پر لپٹے ہونے کا استعارہ استعمال فرمایا گیا ہے۔ جس طرح ایک آدمی کسی چھوٹی سی گیند کو مٹھی میں دبا لیتا ہے اور اس کے لیے یہ ایک معمولی کام ہے، یا ایک شخص ایک رومال کو لپیٹ کر ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس کے لیے یہ کوئی زحمت طلب کام نہیں ہوتا، اُسی طرح قیامت کے روز تمام انسان (جو آج اللہ کی عظمت و کبریائی کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں) اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ زمین اور آسمان اللہ کے دستِ قدرت میں ایک حقیر گیند اور ایک ذرا سے رُومال کی طرح ہیں۔ مُسندِ احمد، بخاری، مسلم، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ جریر وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہُریرہؓ کی روایات منقول ہوئی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ دورانِ خطبہ میں یہ آیت آپؐ نے تلاوت فرمائی اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں (یعنی سیّاروں) کو اپنی مٹھی میں لے کر

فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ ؕ
ثُمَّ نُفِخَ فِیۡهِ اُخۡرٰی فَاِذَا هُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ وَ اَشۡرَقَتِ
الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الۡکِتٰبُ وَ جِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ
وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَ هُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۹﴾
ع
وَ وُفِّیَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ وَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۰﴾

وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سوائے اُن کے جنھیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صُور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اُٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔[۷۹] زمین اپنے رب کے نُور سے چمک اُٹھے گی، کتابِ اعمال لاکر رکھ دی جائے گی، انبیا اور تمام گواہ[۸۰] حاضر کر دیے جائیں گے، لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور اُن پر کوئی ظلم نہ ہوگا، اور ہر متنفّس کو جو کچھ بھی اُس نے عمل کیا تھا اُس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ ع

اِس طرح پھرائے گا جیسے ایک بچہ گیند پھِراتا ہے، اور فرمائے گا: میں ہوں خدائے واحد، میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جَبّار، میں ہوں کبریائی کا مالک، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں جَبّار؟ کہاں ہیں متکبّر؟ یہ کہتے کہتے حضوؐر پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ہمیں خطرہ ہونے لگا کہ کہیں آپؐ منبر سمیت گر نہ پڑیں۔

۷۷ – یعنی کہاں اُس کی یہ شانِ عظمت و کبریائی اور کہاں اس کے ساتھ خدائی میں کسی کا شریک ہونا۔

۷۸ – صور کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۴۷۔ جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۷۳، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸، الحج، حاشیہ ۱، المومنون، حاشیہ ۹۴، النمل، حاشیہ ۱۰۶۔

۷۹ – یہاں صرف دو مرتبہ صُور پھونکے جانے کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ سورۂ نمل میں ان دونوں سے پہلے ایک اور نفخِ صُور کا ذکر بھی آیا ہے، جسے سُن کر زمین و آسمان کی ساری مخلوق دہشت زدہ ہو جائے گی۔ (آیت ۸۷) اسی بنا پر احادیث میں تین مرتبہ نفخِ صُور واقع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک، نفخۃ الفَزَع، یعنی گھبرا دینے والا صُور۔ دوسرا، نفخۃ الصَعق، یعنی مار گرانے والا صُور۔ تیسرا، نفخۃ القیام لِربّ العالمین، یعنی وہ صور جسے پھونکتے ہی تمام انسان جی اُٹھیں گے اور اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنے مَرقدوں سے نکل آئیں گے۔

۸۰ – گواہوں سے مراد وہ گواہ بھی ہیں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا گیا تھا،

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا
فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا
بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا
اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَ
سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا
وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا

(اِس فیصلے کے بعد) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تھا، جہنّم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے،[81] اور اُس کے کارندے ان سے کہیں گے: ”کیا تمھارے پاس تمھارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے، جنھوں نے تم کو تمھارے رب کی آیات سُنائی ہوں اور تمھیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمھیں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا؟“ وہ جواب دیں گے: ”ہاں، آئے تھے، مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔“ کہا جائے گا: ”داخل ہوجاؤ جہنّم کے دروازوں میں، یہاں اب تمھیں ہمیشہ رہنا ہے، بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے یہ متکبّروں کے لیے۔“

اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے، انھیں گروہ در گروہ جنّت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے، اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے، تو اُس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ ”سلام ہو تم پر! بہت اچھے رہے، داخل ہوجاؤ اس میں

اور وہ گواہ بھی جو لوگوں کے اعمال کی شہادت پیش کریں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ گواہ صرف انسان ہی ہوں۔ فرشتے اور جنّ اور حیوانات، اور انسانوں کے اپنے اعضا اور در و دیوار اور شجر و حجر، سب ان گواہوں میں شامل ہوں گے۔

۸۱ – یعنی جہنّم کے دروازے پہلے سے کھلے نہ ہوں گے بلکہ ان کے پہنچنے پر کھولے جائیں گے، جس طرح مجرموں کے پہنچنے پر جیل کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور ان کے داخل ہوتے ہی بند کر دیا جاتا ہے۔

خٰلِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا
الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۷۴﴾
وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ
رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۵﴾ ع

ع ۸ ۵

ہمیشہ کے لیے۔" اور وہ کہیں گے: "شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا،[۸۲] اب ہم جنّت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔"[۸۳] پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔[۸۴]

اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد اور تسبیح کر رہے ہوں گے، اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ چُکا دیا جائے گا، اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ ربّ العالمین کے لیے۔[۸۵] ع

۸۲ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۳–۱۰۶، الانبیاء، حاشیہ ۹۹۔

۸۳ – یعنی ہم میں سے ہر ایک کو جو جنت بخشی گئی ہے وہ اب ہماری مِلک ہے اور ہمیں اس میں پورے اختیارات حاصل ہیں۔

۸۴ – ہوسکتا ہے کہ یہ اہلِ جنت کا قول ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہلِ جنت کی بات پر یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ اضافہ ارشاد فرمایا گیا ہو۔

۸۵ – یعنی پوری کائنات اللہ کی حمد پکار اُٹھے گی۔

تفہیم القرآن

المومن

(۴۰)

المومن

نام

آیت ۲۸ کے فقرے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ سورہ جس میں اُس خاص مومن کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول

ابنِ عباسؓ اور جابر بن زیدؒ کا بیان ہے کہ یہ سورت سورۂ زُمَر کے بعد مُتّصِلاً نازل ہوئی ہے اور اس کا جو مَقام قرآنِ مجید کی موجودہ ترتیب میں ہے وہی ترتیبِ نزول کے اعتبار سے بھی ہے۔

حالاتِ نُزُول

جن حالات میں یہ سورہ نازل ہوئی ہے اُن کی طرف صاف اشارات اس کے مضمون میں موجود ہیں۔ کفارِ مکہ نے اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دو طرح کی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ ایک، یہ کہ ہر طرف جھگڑے اور بحثیں چھیڑ کر، طرح طرح کے اُلٹے سیدھے سوالات اُٹھا کر، اور نت نئے الزامات لگا کر قرآن کی تعلیم اور اسلام کی دعوت اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنے شبہات اور وسوسے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیے جائیں کہ ان کو صاف کرتے کرتے آخرِ کار حضورؐ اور اہلِ ایمان زِچ ہو جائیں۔ دوسرے، یہ کہ آپؐ کو قتل کر دینے کے لیے زمین ہموار کی جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے وہ پیہم سازشیں کر رہے تھے، اور ایک مرتبہ تو عملاً انھوں نے اس کا اقدام کر بھی ڈالا تھا۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عَمرؓو بن عاص کی رِوایت ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یکایک عُقبہ بن ابی مُعَیط آگے بڑھا اور اُس نے آپؐ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اسے بَل دینا شروع کر دیا، تا کہ گلا گھونٹ کر آپؐ کو مار ڈالے۔ مگر عین وقت پر حضرت ابوبکرؓ پہنچ گئے اور انھوں نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا۔ حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ جس وقت ابوبکر صدیقؓ اُس ظالم سے کشمکش کر رہے تھے اس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ (کیا تم ایک شخص کو صرف اِس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے؟) تھوڑے اختلاف کے ساتھ یہ واقعہ سیرت ابنِ ہِشَام میں بھی منقول ہوا ہے اور نَسائی اور ابنِ ابی حاتم نے بھی اسے رِوایت کیا ہے۔

موضوع اور مَباحِث

صورتِ حال کے اِن دونوں پہلوؤں کو آغازِ تقریر ہی میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے اور پھر آگے کی پوری تقریر انھی دونوں پر ایک انتہائی مؤثّر اور سبق آموز تبصرہ ہے۔

قتل کی سازشوں کے جواب میں مومنِ آلِ فرعون کا قصہ سنایا گیا ہے (آیات ۲۳ تا ۵۴) اور اِس قصے کے پیرایے میں تین گروہوں کو تین مختلف سبق دیے گئے ہیں:

۱ - کفار کو بتایا گیا ہے کہ جو کچھ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرنا چاہتے ہو یہی کچھ اپنی طاقت کے بھروسے پر فرعون حضرتِ موسیٰؑ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، اب کیا یہ حرکتیں کر کے تم بھی اُسی انجام سے دوچار

ہونا چاہتے ہو جس سے وہ دوچار ہوا؟

۲- محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیروؤں کو سبق دیا گیا ہے کہ یہ ظالم بظاہر خواہ کتنے ہی بالا دست اور چیرہ دست ہوں، اور ان کے مقابلے میں تم خواہ کتنے ہی کمزور اور بے بس ہو، مگر تمھیں یقین رکھنا چاہیے کہ جس خدا کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے تم کام کر رہے ہو اس کی طاقت ہر دوسری طاقت پر بھاری ہے۔ لہٰذا جو بڑی سے بڑی خوفناک دھمکی بھی یہ تمھیں دے سکتے ہیں، اس کے جواب میں بس خدا کی پناہ مانگ لو اور اس کے بعد بالکل بے خوف ہو کر اپنے کام میں لگ جاؤ۔ خدا پرست کے پاس ظالم کی ہر دھمکی کا بس ایک ہی جواب ہے، اور وہ ہے: إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ۔ اس طرح خدا کے بھروسے پر خطرات سے بے پروا ہو کر کام کرو گے تو آخرِ کار اس کی نصرت آ کر رہے گی اور آج کے فرعون بھی وہی کچھ دیکھ لیں گے جو کل کے فرعون دیکھ چکے ہیں۔ وہ وقت آنے تک ظلم و ستم کے جو طوفان بھی اُمنڈ اُمنڈ کر آئیں انھیں صبر کے ساتھ تمھیں برداشت کرنا ہی ہوگا۔

۳- اِن دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی معاشرے میں موجود تھا، اور وہ اُن لوگوں کا گروہ تھا جو دلوں میں جان چکے تھے کہ حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ ہے اور کفارِ قریش سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔ مگر یہ جان لینے کے باوجود وہ خاموشی کے ساتھ حق و باطل کی اس کشمکش کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس موقع پر اُن کے ضمیر کو جھنجوڑا ہے اور انھیں بتایا ہے کہ جب حق کے دشمن عَلانِیَہ تمھاری آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظالمانہ اِقدام کرنے پر تُل گئے ہیں تو حَیف ہے تم پر اگر اب بھی تم بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہو۔ اس حالت میں جس شخص کا ضمیر بالکل مر نہ چکا ہو اُسے تو اُٹھ کر وہ فرض انجام دینا چاہیے جو فرعون کے بھرے دربار میں اُس کے اپنے درباریوں میں سے ایک راست باز آدمی نے اُس وقت انجام دیا تھا جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تھا۔ جو مَصلَحتیں تمھیں زبان کھولنے سے باز رکھ رہی ہیں، یہی مصلحتیں اُس شخص کے آگے بھی راستہ روک کر کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر اُس نے أُفَوِّضُ أَمْرِيَ إِلَى اللَّهِ کہہ کر ان ساری مصلحتوں کو ٹھکرا دیا، اور اس کے بعد دیکھ لو کہ فرعون اُس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

اب رہا کفار کا وہ مُجادلہ جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے مکۂ معظّمہ میں شب و روز جاری تھا، تو اس کے جواب میں ایک طرف دلائل سے توحید اور آخرت کے اُن عقائد کا برحق ہونا ثابت کیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان اصل بنائے نزاع تھے، اور یہ حقیقت صاف کھول کر رکھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ کسی علم اور کسی دلیل و حُجّت کے بغیر ان سچائیوں کے خلاف خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف اُن اصل محرکات کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کی بنا پر سردارانِ قریش اس قدر سرگرمی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ بظاہر انھوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ حضوؐر کی تعلیم اور آپؐ کے دعوائے نبوت پر انھیں حقیقی اعتراضات ہیں جن کی وجہ سے وہ ان باتوں کو نہیں مان رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اُن کے لیے محض

ایک جنگِ اقتدار تھی۔ آیت ۵۶ میں یہ بات کسی لاگ لپیٹ کے بغیر اُن سے صاف کہہ دی گئی ہے کہ تمھارے انکار کی اصل وجہ وہ کبر ہے جو تمھارے دلوں میں بھرا ہوا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اگر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تسلیم کر لیں گے تو تمھاری بڑائی قائم نہ رہ سکے گی۔ اسی وجہ سے تم اُن کو زَک دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو۔

اسی سلسلے میں کفار کو پے در پے تنبیہات کی گئی ہیں کہ اگر اللہ کی آیات کے مقابلے میں مُجادَلہ کرنے سے باز نہ آؤ گے تو اُسی انجام سے دوچار ہوگے جس سے پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں اور اس سے بدتر انجام تمھارے لیے آخرت میں مقدّر ہے۔ اُس وقت تم پچھتاؤ گے، مگر اس وقت کا پچھتانا تمھارے لیے کچھ بھی نافع نہ ہوگا۔

۸۵ آیاتھا
سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ
۹ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۲ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ
قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳ مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا

ح-م-اِس کتاب کا نُزُول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے، سب کچھ جاننے والا ہے، گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحبِ فضل ہے۔کوئی معبُود اس کے سوا نہیں، اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔[1]

اللہ کی آیات میں جھگڑے[2] نہیں کرتے مگر صرف وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے[3]۔اِس کے بعد

---

۱ – یہ تقریر کی تمہید ہے جس کے ذریعے سے سامعین کو پہلے ہی خبردار کر دیا گیا ہے کہ یہ کلام جو اُن کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے کسی معمولی ہستی کا کلام نہیں ہے، بلکہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ پھر پے در پے اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کی گئی ہیں جو آگے کے مضمون سے گہری مناسبت رکھتی ہیں:

اوّل، یہ کہ وہ ''زبردست'' ہے، یعنی سب پر غالب ہے۔اس کا جو فیصلہ بھی کسی کے حق میں ہو، نافذ ہو کر ہی رہتا ہے۔کوئی اس سے لڑ کر جیت نہیں سکتا، نہ اس کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔لہٰذا اس کے فرمان سے منہ موڑ کر اگر کوئی شخص کامیابی کی توقع رکھتا ہو، اور اس کے رسول سے جھگڑا کر کے یہ اُمید رکھتا ہو کہ وہ اسے نیچا دکھا دے گا، تو یہ اس کی اپنی حماقت ہے۔ایسی توقعات کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

دوسری صفت، یہ کہ وہ ''سب کچھ جاننے والا'' ہے۔یعنی وہ قیاس وگمان کی بنا پر کوئی بات نہیں کرتا بلکہ ہر چیز کا براہِ راست علم رکھتا ہے، اس لیے ماورائے حِسّ وادراک حقیقتوں کے متعلق جو معلومات وہ دے رہا ہے، صرف وہی صحیح ہو سکتی ہیں، اور ان کو نہ ماننے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی خواہ مخواہ جہالت کی پیروی کرے۔اسی طرح وہ جانتا ہے کہ انسان کی فلاح کس چیز میں ہے اور کون سے اُصول وقوانین اور احکام اس کی بہتری کے لیے ضروری ہیں۔اُس کی ہر تعلیم حکمت اور علمِ صحیح پر مبنی ہے جس میں غَلَطی کا امکان نہیں ہے۔لہٰذا اُس کی ہدایات کو قبول نہ کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی خود اپنی تباہی کے راستے پر جانا چاہتا ہے۔پھر انسانوں کی حرکات وسکنات میں سے کوئی چیز اُس سے چھپی نہیں رہ سکتی حتّٰی کہ وہ ان نیتوں اور ارادوں تک کو جانتا ہے

جو انسانی افعال کے اصل محرک ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کسی بہانے اُس کی سزا سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

تیسری صفت یہ کہ وہ ''گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' یہ اُمید اور ترغیب دلانے والی صفت ہے جو اِس غرض سے بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ اب تک سرکشی کرتے رہے ہیں وہ مایوس نہ ہوں، بلکہ یہ سمجھتے ہوئے اپنی رَوِش پر نظرِ ثانی کریں کہ اگر اب بھی وہ اس رَوِش سے باز آ جائیں تو اللہ کے دامنِ رحمت میں جگہ پا سکتے ہیں۔ اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ گناہ معاف کرنا اور توبہ قبول کرنا لازماً ایک ہی چیز کے دو عنوان نہیں ہیں، بلکہ بسا اوقات توبہ کے بغیر بھی اللہ کے ہاں گناہوں کی معافی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً ایک شخص خطائیں بھی کرتا رہتا ہے اور نیکیاں بھی، اور اس کی نیکیاں اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہیں، خواہ اُسے ان خطاؤں پر توبہ واِستِغفار کرنے کا موقع نہ ملا ہو، بلکہ وہ انھیں بھول بھی چکا ہو۔ اسی طرح ایک شخص پر دنیا میں جتنی بھی تکلیفیں اور مصیبتیں اور بیماریاں اور طرح طرح کی رنج و غم پہنچانے والی آفات آتی ہیں، وہ سب اس کی خطاؤں کا بدل بن جاتی ہیں۔ اسی بنا پر گناہوں کی معافی کا ذکر توبہ قبول کرنے سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ توبہ کے بغیر خطا بخشی کی یہ رِعایت صرف اہلِ ایمان کے لیے ہے اور اہلِ ایمان میں بھی صرف اُن کے لیے جو سرکشی و بغاوت کے ہر جذبے سے خالی ہوں اور جن سے گناہوں کا صُدور بشری کمزوری کی وجہ سے ہوا ہو، نہ کہ اِستِکبار اور مَعصِیَت پر اصرار کی بنا پر۔

چوتھی صفت، یہ کہ وہ ''سخت سزا دینے والا'' ہے۔ اس صفت کا ذکر کر کے لوگوں کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ بندگی کی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ جتنا رحیم ہے، بغاوت و سرکشی کا رَوِیّہ اختیار کرنے والوں کے لیے اتنا ہی سخت ہے۔ جب کوئی شخص یا گروہ اُن تمام حدوں سے گزر جاتا ہے جہاں تک وہ اُس کے درگزر اور اُس کی خطا بخشی کا مستحق ہو سکتا ہے، تو پھر وہ اس کی سزا کا مستحق بنتا ہے، اور اس کی سزا ایسی ہولناک ہے کہ صرف ایک احمق انسان ہی اس کو قابلِ برداشت سمجھ سکتا ہے۔

پانچویں صفت، یہ کہ وہ ''صاحبِ فضل'' ہے، یعنی کشادہ دست، غنی اور فیّاض ہے۔ تمام مخلوقات پر اس کی نعمتوں اور اس کے احسانات کی ہمہ گیر بارش ہر آن ہو رہی ہے۔ بندوں کو جو کچھ بھی مل رہا ہے اُسی کے فضل و کرم سے مل رہا ہے۔

ان پانچ صفات کے بعد دو حقیقتیں واشگاف طریقے سے بیان کر دی گئی ہیں: ایک، یہ کہ معبُودِ فی الحقیقت اُس کے سوا کوئی نہیں ہے، خواہ لوگوں نے کتنے ہی دوسرے جھوٹے معبود بنا رکھے ہوں۔ دوسری، یہ کہ جانا سب کو آخرِ کار اسی کی طرف ہے۔ کوئی دوسرا معبُود لوگوں کے اعمال کا حساب لینے والا اور ان کی جزا و سزا کا فیصلہ کرنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑ کر اگر کوئی دوسروں کو معبُود بنائے گا تو اپنی اس حماقت کا خمیازہ خود بھگتے گا۔

۲ – جھگڑا کرنے سے مراد ہے: کج بحثیاں کرنا۔ مین میخ نکالنا۔ اُلٹے سیدھے اعتراضات جڑنا۔ سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی ایک لفظ یا فقرہ لے اُڑنا اور اُس سے طرح طرح کے نکتے پیدا کر کے شبہات والزامات کی عمارتیں کھڑی کرنا۔ کلام کے اصل مدّعا کو نظر انداز کر کے اس کو غلط معنیٰ پہنانا تاکہ آدمی نہ خود بات کو سمجھے نہ دوسروں کو سمجھنے دے۔ یہ طرزِ اختلاف لازماً صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کا اختلاف بدنیّتی پر مبنی ہوتا ہے۔ نیک نیت مخالف اگر بحث کرتا بھی ہے تو تحقیق کی غَرَض سے کرتا ہے اور اصل مسائلِ زیرِ بحث پر گفتگو کر کے یہ اطمینان کرنا چاہتا ہے کہ ان مسائل میں اس کا اپنا نقطۂ نظر دُرست ہے یا فریقِ مخالف کا۔ اس قسم کی بحث حق معلوم کرنے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ کسی کو نیچا دکھانے کے لیے۔ بخلاف اس کے بدنیت مخالف کا اصل مقصد سمجھنا اور سمجھانا نہیں ہوتا بلکہ وہ فریقِ ثانی

يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ④ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ الْاَحْزَابُ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۖ وَ هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا
بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ⑤ وَ
كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۘ ⑥ وقف لازم وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا کے ملکوں میں اُن کی چلت پھرت تمھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے[۴]۔ اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم بھی جھُٹلا چکی ہے، اور اُس کے بعد بہت سے دوسرے جتھّوں نے بھی یہ کام کیا ہے۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اُسے گرفتار کرے۔ اُن سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ مگر آخرِ کار میں نے ان کو پکڑ لیا، پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ اِسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی اُن سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصلِ بجہنّم ہونے والے ہیں[۵]۔

کو زک دینا اور زِچ کرنا چاہتا ہے اور بحث کے میدان میں اس لیے اُترتا ہے کہ دوسرے کی بات کسی طرح چلنے نہیں دینی ہے۔ اسی وجہ سے وہ کبھی اصل مسائل کا سامنا نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اطراف ہی میں چھاپے مارتا رہتا ہے۔

۳ ـ ”کفر“ کا لفظ یہاں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے: ایک، کفرانِ نعمت۔ دوسرے، انکارِ حق۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیات کے مقابلے میں یہ طرزِ عمل صرف وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو اس کے احسانات کو بھول گئے ہیں اور جنھیں یہ احساس نہیں رہا ہے کہ اُسی کی نعمتیں ہیں جن کے بَل پر وہ پَل رہے ہیں۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جنھوں نے حق سے منہ موڑ لیا ہے اور اسے نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سیاق وسباق کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کفر کرنے والے سے مراد ہر وہ شخص نہیں ہے جو مسلمان نہ ہو۔ اس لیے کہ جو غیر مسلم اسلام کو سمجھنے کی غرض سے نیک نیتی کے ساتھ بحث کرے اور تحقیق کی غرض سے وہ باتیں سمجھنے کی کوشش کرے جن کے سمجھنے میں اسے زحمت پیش آ رہی ہو، اگرچہ اسلام قبول کرنے سے پہلے تک اِصطِلاحًا ہوتا وہ بھی کافر ہی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اُس پر وہ بات راست نہیں آتی جس کی اِس آیت میں مذمّت کی گئی ہے۔

۴ ـ پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک خلا ہے جسے ذہنِ سامع پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ فحوائے کلام سے یہ بات خود بخود مُترشّح ہوتی ہے کہ اللہ عزَّوجلَّ کی آیات کے مقابلے میں جو لوگ جھگڑالو پن کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، وہ سزا سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ لامحالہ ایک نہ ایک روز ان کی شامت آنی ہے۔ اب اگر تم دیکھ رہے ہو کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر کے بھی خدا کی زمین میں اطمینان سے دندناتے پھر رہے ہیں، اور اُن کے کاروبار خوب چمک رہے ہیں، اور ان کی حکومتیں بڑی شان سے

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ

عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے، اور وہ جو عرش کے گردوپیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دُعائے مغفرت کرتے ہیں[6]۔ وہ کہتے ہیں: "اے ہمارے رب! تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر

چل رہی ہیں، اور وہ خوب دادِ عیش دے رہے ہیں، تو اِس دھوکے میں نہ پڑ جاؤ کہ وہ خدا کی پکڑ سے بچ نکلے ہیں، یا خدا کی آیات سے جنگ کوئی کھیل ہے جسے تفریح کے طور پر کھیلا جا سکتا ہے اور اس کا کوئی بُرا نتیجہ اس کھیل کے کھلاڑیوں کو کبھی نہ دیکھنا پڑے گا۔ یہ تو دراصل ایک مُہلت ہے جو خدا کی طرف سے ان کو مل رہی ہے۔ اس مُہلت سے غلط فائدہ اُٹھا کر جو لوگ جس قدر زیادہ شرارتیں کرتے ہیں ان کی کشتی اسی قدر زیادہ بھر کر ڈوبتی ہے۔

۵ – یعنی دنیا میں جو عذاب اُن پر آیا وہ ان کی آخری سزا نہ تھی بلکہ اللہ نے یہ فیصلہ بھی ان کے حق میں کر دیا ہے کہ ان کو واصلِ بجہنّم ہونا ہے۔ ایک دوسرا مطلب اِس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح پچھلی قوموں کی شامت آچکی ہے اسی طرح اب جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان کے حق میں بھی اللہ کا یہ فیصلہ طے شدہ ہے کہ وہ واصلِ بجہنّم ہونے والے ہیں۔

۶ – یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی تسلی کے لیے ارشاد ہوئی ہے۔ وہ اُس وقت کفارِ مکہ کی زبان درازیاں اور چیرہ دستیاں، اور ان کے مقابلے میں اپنی بے بسی دیکھ دیکھ کر سخت دل شکستہ ہو رہے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ اِن گھٹیا اور رذیل لوگوں کی باتوں پر تم رنجیدہ کیوں ہوتے ہو، تمھارا مرتبہ تو وہ ہے کہ عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے اور عرش کے گردوپیش حاضر رہنے والے ملائکہ تک تمھارے حامی ہیں اور تمھارے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور سفارشیں کر رہے ہیں۔ عام فرشتوں کے بجائے عرشِ الٰہی کے حامل اور اس کے گردوپیش حاضر رہنے والے فرشتوں کا ذکر یہ تصور دلانے کے لیے کیا گیا ہے کہ سلطنتِ خداوندی کے عام اہل کار تو درکنار، وہ ملائکۂ مُقرّبین بھی جو اِس سلطنت کے ستون ہیں اور جنھیں فرماں روائے کائنات کے ہاں قرب کا مقام حاصل ہے، تمھارے ساتھ گہری دلچسپی و ہمدردی رکھتے ہیں۔ پھر یہ جو فرمایا گیا کہ یہ ملائکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا رشتہ ہی وہ اصل رشتہ ہے جس نے عرشیوں اور فرشیوں کو ملا کر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، اور اسی تعلق کی وجہ سے عرش کے قریب رہنے والے فرشتوں کو زمین پر بسنے والے اُن خاکی انسانوں سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے جو انھی کی طرح اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ فرشتوں کے اللہ پر ایمان رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کفر کر سکتے تھے، مگر انھوں نے اسے چھوڑ کر ایمان اختیار کیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کا اقتدار مانتے ہیں کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہے جو انھیں حکم دینے والی ہو اور وہ اُس کے آگے سرِ اطاعت جھکاتے ہوں۔ یہی مسلک جب ایمان لانے والے انسانوں نے بھی اختیار کر لیا تو اتنے بڑے اختلافِ جنس اور بُعدِ مقام کے باوجود اُن کے اور فرشتوں کے درمیان ہم مَشربی کا مضبوط تعلق قائم ہو گیا۔

رَّحۡمَةً وَّعِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاتَّبَعُوۡا سَبِيۡلَكَ وَقِهِمۡ عَذَابَ
الۡجَحِيۡمِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا وَاَدۡخِلۡهُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ ۣالَّتِيۡ وَعَدۡتَّهُمۡ وَمَنۡ صَلَحَ
مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۙ﴿۸﴾

چیز پر چھایا ہوا ہے[۷]، پس معاف کر دے اور عذابِ دوزخ سے بچا لے[۸] اُن لوگوں کو جنھوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے[۹]۔ اے ہمارے رب! اور داخل کر اُن کو ہمیشہ رہنے والی اُن جنّتوں میں جن کا تُو نے اُن سے وعدہ کیا ہے[۱۰]، اور اُن کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (اُن کو بھی وہاں اُن کے ساتھ ہی پہنچا دے)[۱۱]۔ تُو بلا شبہ قادرِ مطلق اور حکیم ہے۔

---

۷ – یعنی اپنے بندوں کی کمزوریاں اور لغزشیں اور خطائیں تجھ سے چھُپی ہوئی نہیں ہیں، بے شک تُو سب کچھ جانتا ہے، مگر تیرے علم کی طرح تیرا دامنِ رحمت بھی تو وسیع ہے، اس لیے ان کی خطاؤں کو جاننے کے باوجود اِن غریبوں کو بخش دے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بر بنائے رحمت اُن سب لوگوں کو بخش دے جن کو بر بنائے علم تو جانتا ہے کہ انھوں نے سچّے دل سے توبہ کی ہے اور فی الواقع تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

۸ – معاف کرنا اور عذابِ دوزخ سے بچا لینا اگرچہ صریحاً لازم و ملزوم ہیں اور ایک بات کا ذکر کر دینے کے بعد دوسری بات کہنے کی بظاہر کوئی حاجت نہیں رہتی، لیکن اس طرزِ بیان سے دراصل اہلِ ایمان کے ساتھ فرشتوں کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ کسی معاملے میں جس شخص کے دل کو لگی ہوئی ہوتی ہے وہ جب حاکم سے گزارش کرنے کا موقع پا لیتا ہے تو پھر وہ اِلحاح کے ساتھ ایک ہی درخواست کو بار بار طرح طرح سے پیش کرتا ہے اور ایک بات بس ایک دفعہ عرض کر کے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔

۹ – یعنی نافرمانی چھوڑ دی ہے، سرکشی سے باز آ گئے ہیں، اور فرماں برداری اختیار کر کے زندگی کے اُس راستے پر چلنے لگے ہیں جو تُو نے خود بتایا ہے۔

۱۰ – اس میں بھی وہی اِلحاح کی کیفیت پائی جاتی ہے جس کی طرف اُوپر حاشیہ نمبر ۸ میں ہم نے اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاف کرنا اور دوزخ سے بچا لینا آپ سے آپ جنت میں داخل کرنے کو مُستلزِم ہے، اور پھر جس جنت کا اللہ نے خود مومنین سے وعدہ کیا ہے، بظاہر اُسی کے لیے مومنین کے حق میں دعا کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، لیکن اہلِ ایمان کے لیے فرشتوں کے دل میں جذبۂ خیر خواہی کا اتنا جوش ہے کہ وہ اپنی طرف سے ان کے حق میں کلمۂ خیر کہتے ہی چلے جاتے ہیں حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ سب مہربانیاں اُن کے ساتھ کرنے والا ہے۔

۱۱ – یعنی اُن کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے اُن کے ماں باپ اور بیویوں اور اولاد کو بھی ان کے ساتھ جمع کر دے۔

وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَ
ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۹﴾ ع اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ
اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ
فَتَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ

ع ۱ ۹ ۲

اور بچادے اُن کو بُرائیوں سے[۱۲]۔ جس کو تُو نے قیامت کے دن بُرائیوں[۱۳] سے بچا دیا، اُس پر تُو نے بڑا رحم کیا، یہی بڑی کامیابی ہے۔'' ع

جن لوگوں نے کفر کیا ہے، قیامت کے روز اُن کو پکار کر کہا جائے گا: ''آج تمھیں جتنا شدید غصّہ اپنے اُوپر آ رہا ہے، اللہ تم پر اُس سے زیادہ غضب ناک اُس وقت ہوتا تھا جب تمھیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے[۱۴]۔'' وہ کہیں گے: ''اے ہمارے رب! تُو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی[۱۵]،

یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود بھی اُن نعمتوں کے سلسلے میں بیان فرمائی ہے جو جنت میں اہلِ ایمان کو دی جائیں گی۔ مُلاحظہ ہو: سورۂ رَعد، آیت ۲۳، اور سورۂ طور، آیت ۲۱۔ سورۂ طور والی آیت میں یہ تصریح بھی ہے کہ اگر ایک شخص جنت میں بلند درجے کا مستحق ہو اور اس کے والدین اور بال بچے اُس مرتبے کے مستحق نہ ہوں تو اس کو نیچے لا کر ان کے ساتھ ملانے کے بجائے اللہ تعالیٰ اُن کو اُٹھا کر اُس کے درجے میں لے جائے گا۔

۱۲ – ''سیّئات'' (برائیوں) کا لفظ تین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تینوں ہی یہاں مراد ہیں۔ ایک، غلط عقائد اور بگڑے ہوئے اَخلاق اور بُرے اعمال۔ دوسرے، گمراہی اور اعمالِ بد کا وبال۔ تیسرے، آفات اور مصائب اور اذیتیں خواہ وہ اِس دُنیا کی ہوں، یا عالَمِ برزخ کی، یا روزِ قیامت کی۔ فرشتوں کی دُعا کا مقصود یہ ہے کہ اِن کو ہر اُس چیز سے بچا جو اِن کے حق میں بُری ہو۔

۱۳ – روزِ قیامت کی بُرائیوں سے مراد میدانِ حشر کا ہَول، سایے اور ہر قسم کی آسایشوں سے محرومی، محاسبے کی سختی، تمام خلائق کے سامنے زندگی کے راز فاش ہونے کی رسوائی، اور دوسری وہ تمام ذلتیں اور سختیاں ہیں جن سے وہاں مجرمین کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔

۱۴ – یعنی کفار جب قیامت کے روز دیکھیں گے کہ انھوں نے دنیا میں شرک و دہریّت، انکارِ آخرت اور رسولوں کی مخالفت پر اپنے پورے کارنامۂ حیات کی بنیاد رکھ کر کتنی بڑی حماقت کی ہے، اور اس حماقت کی بدولت اب وہ کس انجام بد سے دوچار ہوئے ہیں، تو وہ اپنی انگلیاں چبائیں گے اور جھنجلا جھنجلا کر اپنے آپ کو خود کوسنے لگیں گے۔ اُس وقت فرشتے ان سے پکار کر

فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَهَلۡ اِلٰى خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِكُمۡ بِاَنَّهٗۤ
اِذَا دُعِىَ اللّٰهُ وَحۡدَهٗ كَفَرۡتُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ يُّشۡرَكۡ بِهٖ تُؤۡمِنُوۡا ؕ
فَالۡحُكۡمُ لِلّٰهِ الۡعَلِىِّ الۡكَبِيۡرِ ﴿۱۲﴾ هُوَ الَّذِىۡ يُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَـكُمۡ
مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا ؕ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنۡ يُّنِيۡبُ ﴿۱۳﴾ فَادۡعُوا

اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں[16]، کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل[17] ہے؟" (جواب ملے گا:) "یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو، اِس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے، اور جب اُس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے[18]۔"

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے[19] اور آسمان سے تمھارے لیے رزق نازل کرتا ہے[20] مگر (اِن نشانیوں کے مشاہدے سے) سبق صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہو[21]۔ (پس اے رجوع

کہیں گے کہ آج تو تمھیں اپنے اُوپر بڑا غصہ آ رہا ہے، مگر کل جب تمھیں اس انجام سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے انبیا اور دوسرے نیک لوگ راہِ راست کی طرف دعوت دیتے تھے اور تم اُن کی دعوت کو ٹھکراتے تھے اُس وقت اللہ تعالیٰ کا غضب اس سے زیادہ تم پر بھڑکتا تھا۔

۱۵ – دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی سے مراد وہی چیز ہے جس کا ذکر سورۂ بَقَرہ، آیت ۲۸ میں کیا گیا ہے کہ تم خدا کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو جب کہ تم بے جان تھے، اُس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر وہ تمھیں موت دے گا اور پھر دوبارہ زندہ کر دے گا۔ کفار ان میں سے پہلی تین حالتوں کا تو انکار نہیں کرتے، کیونکہ وہ مشاہدے میں آتی ہیں اور اس بنا پر نا قابلِ انکار ہیں۔ مگر آخری حالت پیش آنے کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے مشاہدے میں ابھی تک نہیں آئی ہے اور صرف انبیا علیہم السلام ہی نے اس کی خبر دی ہے۔ قیامت کے روز جب عملاً وہ چوتھی حالت بھی مشاہدے میں آ جائے گی تب یہ لوگ اقرار کریں گے کہ واقعی وہی کچھ پیش آ گیا جس کی ہمیں خبر دی گئی تھی۔

۱۶ – یعنی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس دوسری زندگی کا انکار کر کے ہم نے سخت غَلَطی کی اور اس غلط نظریے پر کام کر کے ہماری زندگی گناہوں سے لبریز ہو گئی۔

۱۷ – یعنی کیا اب اس کا کوئی امکان ہے کہ ہمارے اعترافِ گناہ کو قبول کر کے ہمیں عذاب کی اس حالت سے نکال دیا

اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾ رَفِیۡعُ
الدَّرَجٰتِ ذُو الۡعَرۡشِ ۚ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ

کرنے والو!) اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اُس کے لیے خالص کر کے[۲۲]، خواہ تمھارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

وہ بلند درجوں والا[۲۳]، مالکِ عرش ہے[۲۴]۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے رُوح

جائے جس میں ہم مبتلا ہو گئے ہیں۔

۱۸ – یعنی فیصلہ اب اُسی اکیلے خدا کے ہاتھ میں ہے جس کی خدائی پر تم راضی نہ تھے، اور اُن دُوسروں کا فیصلے میں کوئی دخل نہیں ہے جنھیں خدائی کے اختیارات میں حصّہ دار قرار دینے پر تمھیں بڑا اصرار تھا۔ (اس مقام کو سمجھنے کے لیے سورۂ زُمَر، آیت ۴۵ اور اس کا حاشیہ ۶۴ بھی نگاہ میں رہنا چاہیے۔) اس فقرے میں آپ سے آپ یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اب اِس عذاب کی حالت سے تمھارے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے، کیونکہ تم نے صرف آخرت ہی کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ اپنے خالق و پروردگار سے تم کو چڑ تھی اور اُس کے ساتھ دوسروں کو ملائے بغیر تمھیں چین نہ آتا تھا۔

۱۹ – نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ اس کائنات کا صانع اور مُدَبِّر و منتظم ایک خدا اور ایک ہی خدا ہے۔

۲۰ – رزق سے مراد یہاں بارش ہے۔ کیونکہ انسان کو جتنی اقسام کے رزق بھی دنیا میں ملتے ہیں اُن سب کا مدار آخرِ کار بارش پر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی بے شمار نشانیوں میں سے تنہا اِس ایک نشانی کو پیش کر کے لوگوں کو توجہ دلاتا ہے کہ صرف اِسی ایک چیز کے انتظام پر تم غور کرو تو تمھاری سمجھ میں آجائے کہ نظامِ کائنات کے متعلق جو تصور تم کو قرآن میں دیا جا رہا ہے وہی حقیقت ہے۔ یہ انتظام صرف اُسی صورت میں قائم ہوسکتا تھا جب کہ زمین اور اس کی مخلوقات اور پانی اور ہوا اور سورج اور حرارت و بُرودت سب کا خالق ایک ہی خدا ہو۔ اور یہ انتظام صرف اسی صورت میں لاکھوں کروڑوں برس تک پیہم ایک باقاعدگی سے چل سکتا ہے جب کہ وہی اَزَلی و اَبَدی خدا اس کو جاری رکھے۔ اور اس انتظام کو قائم کرنے والا لازماً ایک حکیم و رحیم پروردگار ہی ہوسکتا ہے جس نے زمین میں انسان اور حیوانات اور نباتات کو جب پیدا کیا تو ٹھیک ٹھیک ان کی ضروریات کے مطابق پانی بھی بنایا اور پھر اس پانی کو باقاعدگی کے ساتھ رُوئے زمین پر پہنچانے اور پھیلانے کے لیے یہ حیرت انگیز انتظامات کیے۔ اب اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جو یہ سب کچھ دیکھ کر بھی خدا کا انکار کرے، یا اُس کے ساتھ کچھ دوسری ہستیوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیرائے۔

۲۱ – یعنی خدا سے پھرا ہوا آدمی، جس کی عقل پر غفلت یا تعصُّب کا پردہ پڑا ہوا ہو، کسی چیز کو دیکھ کر بھی کوئی سبق نہیں لے سکتا۔ اس کی حیوانی آنکھیں یہ تو دیکھ لیں گی کہ ہوائیں چلیں، بادل آئے، کڑک چمک ہوئی، اور بارش ہوگئی۔ مگر اس کا انسانی دماغ کبھی یہ نہ سوچے گا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے اور مجھ پر اس کے کیا حقوق ہیں۔

مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿١٥﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا
يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ
الْقَهَّارِ ﴿١٦﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ؕ

نازل کر دیتا ہے[25]، تاکہ وہ ملاقات کے دن[26] سے خبردار کر دے۔ وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ (اُس روز پکار کر پوچھا جائے گا:) آج بادشاہی کس کی ہے[27]؟ (سارا عالَم پکار اُٹھے گا:) اللہ واحد قہّار کی۔ (کہا جائے گا:) آج ہر متنفّس کو اُس کمائی کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کی تھی۔

۲۲ – دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کی وضاحت سورۂ زُمَر حاشیہ نمبر ۳ میں کی جا چکی ہے۔

۲۳ – یعنی تمام موجودات سے اُس کا مقام بدرجہا بلند ہے۔ کوئی ہستی بھی جو اس کائنات میں موجود ہے، خواہ وہ کوئی فرشتہ ہو یا نبی یا ولی، یا اور کوئی مخلوق، اس کا مقام دوسری مخلوقات کے مقابلے میں چاہے کتنا ہی ارفع و اشرف ہو، مگر اللہ تعالیٰ کے بلند ترین مقام سے اس کے قریب ہونے تک کا تصور نہیں کیا جا سکتا، کجا کہ خدائی صفات و اختیارات میں اس کے شریک ہونے کا گمان کیا جا سکے۔

۲۴ – یعنی ساری کائنات کا بادشاہ و فرماں روا ہے۔ کائنات کے تختِ سلطنت کا مالک ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۴۱، یونُس، حاشیہ ۴، الرعد، حاشیہ ۳۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲)

۲۵ – روح سے مراد وحی اور نبوت ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد دوم، النحل، حاشیہ ۲، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۳) اور یہ ارشاد کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے یہ روح نازل کرتا ہے، اس معنٰی میں ہے کہ اللہ کے فضل پر کسی کا اِجارہ نہیں ہے۔ جس طرح کوئی شخص یہ اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ فُلاں شخص کو حُسن کیوں دیا گیا اور فلاں شخص کو حافظہ یا ذہانت کی غیر معمولی قوت کیوں عطا کی گئی، اسی طرح کسی کو یہ اعتراض کرنے کا بھی حق نہیں ہے کہ منصبِ نبوت کے لیے فلاں شخص ہی کو کیوں چُنا گیا اور جسے ہم چاہتے تھے اسے کیوں نہ نبی بنایا گیا۔

۲۶ – یعنی جس روز تمام انسان اور جنّ اور شیاطین بیک وقت اپنے رب کے سامنے جمع ہوں گے اور ان کے اعمال کے سارے گواہ بھی حاضر ہوں گے۔

۲۷ – یعنی دنیا میں تو بہت سے برخود غلط لوگ اپنی بادشاہی و جبّاری کے ڈنکے پیٹتے رہے، اور بہت سے احمق ان کی بادشاہیاں اور کبریائیاں مانتے رہے، اب بتاؤ کہ بادشاہی فی الواقع کس کی ہے؟ اختیارات کا اصل مالک کون ہے؟ اور حکم کس کا چلتا ہے؟ یہ ایسا مضمون ہے جسے اگر کوئی شخص گوشِ ہوش سے سنے تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا بادشاہ یا آمرِ مُطلَق بنا بیٹھا ہو، اُس کا زہرہ آب ہو جائے اور ساری جبّاریّت کی ہَوا اُس کے دماغ سے نکل جائے۔ اس موقع پر تاریخ کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ سامانی خاندان کا

لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑰ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ
الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؕ ⑱ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ

آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا[28]۔ اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے[29]۔ اَے نبیؐ! ڈرا دو اِن لوگوں کو اُس دن سے جو قریب آلگا ہے[30]۔ جب کلیجے منہ کو آرہے ہوں گے اور لوگ چُپ چاپ غم کے گھونٹ پیے کھڑے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا[31] اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے[32]۔ اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے،

فرماں روا نصر بن احمد (۳۰۱-۳۳۱ھ) جب نیشاپور میں داخل ہوا تو اس نے ایک دربار منعقد کیا اور تخت پر بیٹھنے کے بعد فرمایش کی کہ کارروائی کا افتتاح قرآنِ مجید کی تلاوت سے ہو۔ یہ سُن کر ایک بزرگ آگے بڑھے اور انھوں نے یہی رُکوع تلاوت کیا۔ جس وقت وہ اس آیت پر پہنچے تو نصر پر ہیبت طاری ہوگئی۔ لرزتا ہوا تخت سے اُترا، تاج سر سے اُتار کر سجدے میں گر گیا اور بولا: اے رب! بادشاہی تیری ہی ہے نہ کہ میری۔

۲۸ – یعنی کسی نوعیت کا ظلم بھی نہ ہوگا۔ واضح رہے کہ جزا کے معاملے میں ظلم کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک، یہ کہ آدمی اجر کا مستحق ہو اور وہ اس کو نہ دیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اُس سے کم دیا جائے۔ تیسرے، یہ کہ وہ سزا کا مستحق نہ ہو مگر اسے سزا دے ڈالی جائے۔ چوتھے، یہ کہ جو سزا کا مستحق ہو اسے سزا نہ دی جائے۔ پانچویں، یہ کہ جو کم سزا کا مستحق ہو اسے زیادہ سزا دے دی جائے۔ چھٹے، یہ کہ مظلوم منہ دیکھتا رہ جائے اور ظالم اس کی آنکھوں کے سامنے صاف بَری ہو کر نکل جائے۔ ساتویں، یہ کہ ایک کے گناہ میں دوسرا پکڑ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ان تمام نوعیّتوں میں سے کسی نوعیت کا ظلم بھی اس کی عدالت میں نہ ہونے پائے گا۔

۲۹ – مطلب یہ ہے کہ اللہ کو حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ وہ جس طرح کائنات کی ہر مخلوق کو بیک وقت رزق دے رہا ہے اور کسی کی رزق رسانی کے انتظام میں اُس کو ایسی مشغولیت نہیں ہوتی کہ دوسروں کو رزق دینے کی اسے فرصت نہ ملے، وہ جس طرح کائنات کی ہر چیز کو بیک وقت دیکھ رہا ہے، ساری آوازوں کو بیک وقت سُن رہا ہے، تمام چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملات کی بیک وقت تدبیر کر رہا ہے، اور کوئی چیز اس کی توجّہ کو اس طرح جذب نہیں کر لیتی کہ اُسی وقت وہ دوسری چیزوں کی طرف توجہ نہ کر سکے، اُسی طرح وہ ہر ہر فرد کا بیک وقت محاسبہ بھی کر لے گا اور ایک مُقدّمے کی سماعت کرنے میں اُسے ایسی مشغولیت لاحق نہ ہوگی کہ اُسی وقت دوسرے بے شمار مقدّمات کی سماعت نہ کر سکے۔ پھر اس کی عدالت میں اس بنا پر بھی کوئی تاخیر نہ ہوگی کہ واقعاتِ مقدّمہ کی تحقیق اور اس کے لیے شہادتیں فراہم ہونے میں وہاں کوئی مشکل پیش آئے۔ حاکمِ عدالت براہِ راست خود تمام حقائق سے واقف ہوگا۔ ہر فریقِ مقدّمہ اس کے سامنے بالکل بے نقاب ہوگا۔ اور واقعات

وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿١٩﴾ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿٢٠﴾ ع اَوَلَمْ
يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا
مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ

اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا۔ رہے وہ جن کو (یہ مشرکین) اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔[۳۳] ع

کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انھیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے زیادہ طاقت ور تھے، اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں۔

کی کُھلی کُھلی ناقابلِ انکار شہادتیں چھوٹی سے چھوٹی جزئی تفصیلات تک کے ساتھ بلا تاخیر پیش ہو جائیں گی۔ اس لیے ہر مقدّمے کا فیصلہ جھٹ پٹ ہو جائے گا۔

۳۰ – قرآنِ مجید میں لوگوں کو بار بار یہ احساس دلایا گیا ہے کہ قیامت اُن سے کچھ دُور نہیں ہے بلکہ قریب ہی لگی کھڑی ہے اور ہر لمحہ آ سکتی ہے۔ کہیں فرمایا: اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (النحل: ۱) کہیں ارشاد ہوا: اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ (الانبیاء: ۱) کہیں مُتنبّہ کیا گیا: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (القمر: ۱) کہیں فرمایا گیا: اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۚ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (النجم: ۵۷-۵۸) ان ساری باتوں سے مقصود لوگوں کو مُتنبّہ کرنا ہے کہ قیامت کو دور کی چیز سمجھ کر بے خوف نہ رہیں اور سنبھلنا ہے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سنبھل جائیں۔

۳۱ – اصل میں لفظ حَمِيْم استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد کسی شخص کا ایسا دوست ہے جو اُس کو پٹتے دیکھ کر جوش میں آئے اور اسے بچانے کے لیے دوڑے۔

۳۲ – یہ بات بر سبیلِ تنزُّل، کفار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے۔ حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے، اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فُسّاق و فُجّار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ انھیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال بھی کریں۔ لیکن چونکہ کفار و مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے اور آج بھی ہے کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے بلکہ اَڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور بخشوا کر ہی چھوڑیں گے اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ
اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى
بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ

مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور اُن کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس اُن کے رسول بَیِّنات[۳۴] لے کر آئے اور انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے اُن کو پکڑ لیا، یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔
ہم نے موسیٰؑ[۳۵] کو فرعون اور ہامان[۳۶] اور قارون کی طرف اپنی نشانیوں اور نمایاں سندِ ماموریت[۳۷] کے ساتھ

نہ ہو گا جس کی بات مانی جائے اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔

۳۳ – یعنی تمھارے معبودوں کی طرح وہ کوئی اندھا بہرا خدا نہیں ہے جسے کچھ پتا نہ ہو کہ جس آدمی کے معاملے کا وہ فیصلہ کر رہا ہے اس کے کیا کرتوت تھے۔

۳۴ – بَیِّنات سے مراد تین چیزیں ہیں: ایک، ایسی نمایاں علامات اور نشانیاں جو اُن کے مامور من اللہ ہونے پر شاہد تھیں۔ دوسرے، ایسی روشن دلیلیں جو ان کی پیش کردہ تعلیم کے حق ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ تیسرے، زندگی کے مسائل و معاملات کے متعلق ایسی واضح ہدایات جنھیں دیکھ کر ہر معقول آدمی یہ جان سکتا تھا کہ ایسی پاکیزہ تعلیم کوئی جھوٹا خود غَرَض آدمی نہیں دے سکتا۔

۳۵ – حضرت موسیٰؑ کے قصے کی دوسری تفصیلات کے لیے مُلاحَظہ ہو: جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۶۴ تا ۷۶، النساء، حاشیہ ۲۰۶، المائدہ، حاشیہ ۴۲۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۹۳ تا ۱۱۹، یونس، حواشی ۷۲ تا ۹۴، ہود، حواشی ۱۹-۱۰۴-۱۱۱، یوسف، دیباچہ، ابراہیم، حواشی ۸ تا ۱۳، بنی اسرائیل، حواشی ۱۱۳ تا ۱۱۷۔ جلد سوم، الکھف، حواشی ۵۷ تا ۵۹، مریم، حواشی ۲۹ تا ۳۱، طٰہٰ، دیباچہ، حواشی ۵ تا ۵۷، المومنون، حواشی ۳۹-۴۲، الشعراء، حواشی ۷ تا ۴۹، النمل، حواشی ۸ تا ۱۷، القصص، دیباچہ، حواشی ۱ تا ۵۷۔ جلد چہارم، احزاب، آیت ۶۹، الصّافّات، آیات ۱۱۴ تا ۱۲۲۔

۳۶ – ہامان کے متعلق مخالفین کے اعتراضات کا جواب اس سے پہلے سورۂ قصص کے حواشی میں دیا جا چکا ہے۔ (جلد سوم، صفحہ ۶۱۵)

۳۷ – یعنی ایسی صریح علامات کے ساتھ جن سے یہ اَمر مُشتَبِہ نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور اُن کی پشت پر اللہ ربّ العالمین کی طاقت ہے۔ قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان پر ایک غائر نگاہ ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کون سی علامات تھیں جن کو یہاں ان کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی سند قرار دیا

فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا
قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ

بھیجا مگر انھوں نے کہا "ساحر ہے کذّاب ہے۔" پھر جب وہ ہماری طرف سے حق ان کے سامنے[۳۸] لے آیا تو انھوں نے کہا "جو لوگ ایمان لاکر اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں ان سب کے لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو جیتا[۳۹] چھوڑ دو۔"

جا رہا ہے۔ اوّل تو یہی ایک عجیب بات تھی کہ جو شخص چند سال پہلے فرعون کی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر کے ملک سے فرار ہو گیا تھا اور جس کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے وہ اچانک ایک لاٹھی لیے ہوئے سیدھا فرعون کے بھرے دربار میں دَرّانہ چلا آتا ہے اور دھڑلّے کے ساتھ بادشاہ اور اس کے اعیانِ سلطنت کو مخاطب کر کے دعوت دیتا ہے کہ وہ اسے اللہ ربّ العالمین کا نمائندہ تسلیم کر کے اس کی ہدایات پر عمل کریں، اور کسی کو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ حالانکہ حضرت موسیٰؑ جس قوم سے تعلق رکھتے تھے وہ اس بُری طرح غلامی کے جُوئے تلے پس رہی تھی کہ اگر الزامِ قتل کی بنا پر اُن کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا تو اس بات کا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ ان کی قوم بغاوت تو درکنار، احتجاج ہی کے لیے زبان کھول سکے گی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا اور یدِ بیضا کے معجزے دیکھنے سے بھی پہلے فرعون اور اس کے اہلِ دربار محض حضرت موسیٰؑ کی آمد ہی سے مرعوب ہو چکے تھے اور پہلی نظر ہی میں انھیں محسوس ہو گیا تھا کہ یہ شخص کسی اور ہی طاقت کے بل بُوتے پر آیا ہے۔ پھر جو عظیم الشان معجزے پے در پے ان کے ہاتھ سے صادر ہوئے ان میں سے ہر ایک یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ یہ جادو کا نہیں، خدائی طاقت ہی کا کرشمہ ہے۔ آخر کس جادو کے زور سے ایک لاٹھی فی الواقع اژدہا بن سکتی ہے؟ یا ایک پورے ملک میں قحط پڑ سکتا ہے؟ یا لاکھوں مربع میل کے علاقے میں ایک نوٹس پر طرح طرح کے طوفان آ سکتے ہیں اور ایک نوٹس پر وہ ختم ہو سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کے بیان کے مطابق فرعون اور اس کی سلطنت کے تمام ذمّہ دار لوگ، زبان سے چاہے انکار کرتے رہے ہوں، مگر دل اُن کے پوری طرح جان چکے تھے کہ حضرت موسیٰؑ فی الواقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے ہیں۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۶ تا ۸۹، جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۲۹ تا ۵۳، الشعراء، حواشی ۲۲ تا ۴۱، النمل، حاشیہ ۱۶)

۳۸- یعنی جب پے در پے معجزات اور نشانیاں دکھا کر حضرت موسیٰؑ نے یہ بات اُن پر پوری طرح ثابت کر دی کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں اور مضبوط دلائل سے اپنا برسرِ حق ہونا پوری طرح واضح کر دیا۔

۳۹- سورۂ اعراف، آیت ۱۲۷ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا تھا کہ آخر موسیٰؑ کو یہ کھلی چھٹی کب تک دی جائے گی، اور اس نے کہا تھا کہ میں عنقریب بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دینے کا حکم دینے والا ہوں۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۹۳) اب یہ آیت بتاتی ہے کہ فرعون کے ہاں سے آخرِ کار یہ حکم جاری کر دیا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے حامیوں اور پیروؤں کو اتنا خوف زدہ کر دیا جائے کہ وہ ڈر کے مارے ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٢٥﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى
وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ

مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی۔[40]

ایک روز[41] فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا: "چھوڑو مجھے، مَیں اِس موسیٰؑ کو قتل کیے دیتا ہوں[42]، اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمھارا دین بدل ڈالے گا، یا ملک میں فساد

۴۰ – اصل الفاظ ہیں: وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ۔ اس فقرے کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کافروں کی جو چال بھی تھی، گمراہی اور ظلم و جَور اور مُخالفتِ حق ہی کی راہ میں تھی، یعنی حق واضح ہو جانے اور دلوں میں قائل ہو جانے کے باوجود وہ اپنی ضد میں بڑھتے ہی چلے گئے اور صداقت کو نیچا دکھانے کے لیے انھوں نے کوئی ذلیل سے ذلیل تدبیر اختیار کرنے میں بھی باک نہ کیا۔

۴۱ – یہاں سے جس واقعے کا بیان شروع ہو رہا ہے وہ تاریخِ بنی اسرائیل کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے جسے خود بنی اسرائیل بالکل فراموش کر گئے ہیں۔ بائبل اور تلمود، دونوں اس کے ذکر سے خالی ہیں، اور دوسری اسرائیلی روایات میں بھی اس کا کوئی نام ونشان نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآنِ مجید ہی کے ذریعے سے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے کہ فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کشمکش کے دَور میں ایک وقت یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ اس قصے کو جو شخص بھی پڑھے گا، بشرطیکہ وہ اسلام اور قرآن کے خلاف تعصّب میں اندھا نہ ہو چکا ہو، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے یہ قصہ بہت بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے، اور بجائے خود یہ بات بعید از عقل و قیاس بھی نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی شخصیّت، ان کی تبلیغ، اور ان کے ہاتھوں ظہور پذیر ہونے والے حیرت انگیز معجزات سے مُتاثّر ہو کر خود فرعون کے اَعیانِ سلطنت میں سے کوئی شخص دل ہی دل میں ایمان لے آیا ہو اور فرعون کو اُن کے قتل پر آمادہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا ہو۔ لیکن مغربی مُستشرِقین، علم و تحقیق کے لمبے چوڑے دعووں کے باوجود، تعصّب میں اندھے ہو کر جس طرح قرآن کی روشن صداقتوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اُس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مضمون "موسیٰ" کا مصنف اس قصے کے متعلق لکھتا ہے:

> "قرآن کی یہ کہانی کہ فرعون کے دربار میں ایک مومن موسیٰؑ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، پوری طرح واضح نہیں ہے۔ (سورہ ۴۰، آیت ۲۸) کیا ہمیں اس کا تقابُل اُس قصے سے کرنا چاہیے جو ہَگّادا میں بیان ہوا ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ یِتھرو نے فرعون کے دربار میں عَفو سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا؟"

گویا ان مُدّعیانِ تحقیق کے ہاں یہ بات تو طے شدہ ہے کہ قرآن کی ہر بات میں ضرور کیڑے ہی ڈالنے ہیں۔ اب اگر اُس کے کسی بیان پر حرف زنی کی کوئی بنیاد نہیں ملتی تو کم از کم یہی شوشہ چھوڑ دیا جائے کہ یہ قصہ پوری طرح واضح نہیں ہے، اور چلتے چلتے یہ شک بھی پڑھنے والوں کے دل میں ڈال دیا جائے کہ ہَگّادا میں یِتھرو کا جو قصہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے کا بیان ہوا ہے وہ کہیں سے

الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ
لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾ ع وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ ع ۳ ۸
فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّىَ اللّٰهُ وَقَدْ

برپا کرے گا۔[۴۳]"

موسیٰؑ نے کہا: "میں نے تو ہر اُس متکبّر کے مقابلے میں، جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ لے لی ہے۔[۴۴]" ع

اس موقع پر آلِ فرعون میں سے ایک مومن شخص، جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، بول اُٹھا: "کیا تم ایک شخص کو صرف اِس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سُن لیا ہوگا، اور اسے لا کر یہاں اس شکل میں بیان کر دیا ہوگا۔ یہ ہے "علمی تحقیق" کا وہ انداز جواِن لوگوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔

۴۲ – اس فقرے میں فرعون یہ تأثّر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ گویا کچھ لوگوں نے اسے روک رکھا ہے جن کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰؑ کو قتل نہیں کر رہا ہے، ورنہ اگر وہ مانع نہ ہوتے تو وہ کبھی کا انھیں ہلاک کر چکا ہوتا۔ حالانکہ دراصل باہر کی کوئی طاقت اسے روکنے والی نہ تھی، اس کے اپنے دل کا خوف ہی اس کو اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالنے سے روکے ہوئے تھا۔

۴۳ – یعنی، مجھے اس سے انقلاب کا خطرہ ہے، اور اگر یہ انقلاب برپا نہ بھی کر سکے تو کم از کم یہ خطرہ تو ہے ہی کہ اس کی کارروائیوں سے ملک میں فساد رونما ہوگا، لہٰذا بغیر اس کے کہ یہ کوئی مُسْتَلزِم سزائے موت جرم کرے، محض تحفظِ امنِ عام (maintenance of public order) کی خاطر اسے قتل کر دینا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ اس شخص کی ذات سے فی الواقع امنِ عام کو خطرہ ہے یا نہیں، تو اس کے لیے صرف ہِز میجسٹی کا اطمینان کافی ہے۔ سرکارِ عالی اگر مطمئن ہیں کہ یہ خطرناک آدمی ہے تو مان لیا جانا چاہیے کہ واقعی خطرناک اور گردن زدنی ہے۔

اِس مقام پر "دین بدل ڈالنے" کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے جس کے اندیشے سے فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ یہاں دین سے مراد نظامِ حکومت ہے اور فرعون کے قول کا مطلب یہ ہے کہ انی اخاف ان یغیر سلطانکم۔ (رُوح المعانی، ج ۲۴، ص ۵۶) بالفاظِ دیگر، فرعون اور اس کے خاندان کے اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد پر مذہب و سیاست اور تمدّن و معیشت کا جو نظام مصر میں چل رہا تھا وہ ملک کا دین تھا، اور فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے اِسی دین کے بدل جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن ہر زمانے کے مکّار حکمرانوں کی طرح اُس نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنے ہاتھ سے اقتدار نکل جانے کا خوف ہے، اس لیے میں موسیٰؑ کو قتل کرنا چاہتا ہوں،

جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ
وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ
ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ

وہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس بیّنات[۴۵] لے آیا۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا،[۴۶] لیکن اگر وہ سچّا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آجائیں گے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذّاب[۴۷] ہو۔ اَے میری قوم کے لوگو! آج تمھیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو، لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا؟“[۴۸]

بلکہ صورتِ معاملہ کو اُس نے اِس طرح پیش کیا کہ لوگو! خطرہ مجھے نہیں، تمھیں لاحق ہے، کیونکہ موسیٰؑ کی تحریک اگر کامیاب ہوگئی تو تمھارا دین بدل جائے گا۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میں تو تمھاری فکر میں گُھلا جارہا ہوں کہ میرے سایۂ اقتدار سے محروم ہو کر تمھارا کیا بنے گا۔ لہٰذا جس ظالم کے ہاتھوں یہ سایہ تمھارے سر سے اُٹھ جانے کا اندیشہ ہے اسے قتل کر دینا چاہیے کیونکہ وہ ملک اور قوم کا دشمن ہے۔

۴۴ – یہاں دو برابر کے احتمال ہیں، جن میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اس وقت دربار میں خود موجود ہوں، اور فرعون نے ان کی موجودگی میں انھیں قتل کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہو، اور حضرت نے اُس کو اور اُس کے درباریوں کو خطاب کر کے اُسی وقت برملا یہ جواب دے دیا ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں فرعون نے اپنی حکومت کے ذمّہ دار لوگوں کی کسی مجلس میں یہ خیال ظاہر کیا ہو، اور اس گفتگو کی اِطّلاع آنجناب کو اہلِ ایمان میں سے کچھ لوگوں نے پہنچائی ہو، اور اسے سن کر آپؑ نے اپنے پیروؤں کی مجلس میں یہ بات ارشاد فرمائی ہو۔ اِن دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، حضرت موسیٰؑ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی دھمکی اُن کے دل میں ذرّہ برابر بھی خوف کی کوئی کیفیت پیدا نہ کر سکی اور انھوں نے اللہ کے بھروسے پر اس کی دھمکی اسی کے منہ پر ماردی۔ اس واقعے کو جس موقع پر قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے، اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی یہی جواب اُن سب ظالموں کو ہے جو یوم الحساب سے بے خوف ہو کر آپؐ کو قتل کر دینے کی سازشیں کر رہے ہیں۔

۴۵ – یعنی اُس نے ایسی کُھلی کُھلی نشانیاں تمھیں دکھادی ہیں جن سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے

قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

فرعون نے کہا: ”میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے۔اور میں اُسی راستے کی طرف تمھاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے۔“[۴۹]

کہ وہ تمھارے رب کا بھیجا ہوا رسول ہے۔مومنِ آلِ فرعون کا اشارہ اُن نشانیوں کی طرف تھا جن کی تفصیلات اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔(تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۷،۸۹،۹۰،۹۱،۹۴ تا ۹۶، بنی اسرائیل، حواشی ۱۱۳ تا ۱۱۶۔جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۲۹ تا ۵۰، الشعراء، حواشی ۲۶ تا ۳۹، النمل، حاشیہ ۱۶)

۴۶ – یعنی اگر ایسی صریح نشانیوں کے باوجود تم اُسے جھوٹا سمجھتے ہو تب بھی تمھارے لیے مناسب یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، کیونکہ دوسرا احتمال، اور نہایت قوی احتمال یہ بھی ہے کہ وہ سچا ہو اور اس پر ہاتھ ڈال کر تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔اس لیے اگر تم اسے جھوٹا بھی سمجھتے ہو تو اس سے تعرُّض نہ کرو۔وہ اللہ کا نام لے کر جھوٹ بول رہا ہوگا تو اللہ خود اس سے نمٹ لے گا۔قریب قریب اسی طرح کی بات اس سے پہلے خود حضرت موسیٰؑ بھی فرعون سے کہہ چکے تھے: وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ (الدُّخان:۲۱) ”اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

یہاں یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ مومنِ آلِ فرعون نے گفتگو کے آغاز میں کھل کر یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آیا ہے، بلکہ ابتداءً وہ اسی طرح کلام کرتا رہا کہ وہ بھی فرعون ہی کے گروہ کا ایک آدمی ہے اور محض اپنی قوم کی بھلائی کے لیے بات کر رہا ہے۔مگر جب فرعون اور اس کے درباری کسی طرح راہِ راست پر آتے نظر نہ آئے تو آخر میں اُس نے اپنے ایمان کا راز فاش کر دیا، جیسا کہ پانچویں رُکوع میں اس کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے۔

۴۷ – اس فقرے کے دو مطلب ممکن ہیں، اور غالباً مومنِ آلِ فرعون نے قصداً یہ ذومعنیٰ بات اسی لیے کہی تھی کہ ابھی وہ کھل کر اپنے خیالات ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ایک ہی شخص کی ذات میں راست رَوی جیسی خوبی اور کِذب وافتِرا جیسی بدی جمع نہیں ہو سکتیں۔تم عَلانیَہ دیکھ رہے ہو کہ موسیٰؑ ایک نہایت پاکیزہ سیرت اور کمال درجے کا بلند کردار انسان ہے۔اب آخر یہ بات تمھارے دماغ میں کیسے سماتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اتنا بڑا جھوٹا ہو کہ اللہ کا نام لے کر نبوت کا بے بنیاد دعویٰ کر بیٹھے، اور دوسری طرف اللہ اسے اتنے اعلیٰ درجے کے اَخلاق عطا فرمائے۔دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ اگر حد سے تجاوز کر کے موسیٰ علیہ السلام کی جان لینے کے درپے ہو گے اور ان پر جھوٹے الزامات عائد کر کے اپنے ناپاک منصوبے عمل میں لاؤ گے، تو یاد رکھو کہ اللہ تمھیں ہرگز کامیابی کا راستہ نہ دکھائے گا۔

۴۸ – یعنی کیوں اللہ کی دی ہوئی اس نعمتِ غلبہ واقتدار کی ناشکری کر کے اس کے غضب کو اپنے اُوپر دعوت دیتے ہو؟

۴۹ – فرعون کے اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ یہ راز نہیں پا سکا تھا کہ اس کے دربار کا یہ امیر دل میں مومن ہو چکا ہے۔اسی لیے اُس نے اس شخص کی بات پر کسی ناراضی کا اظہار تو نہیں کیا، البتہ یہ واضح کر دیا کہ اس کے خیالات سننے کے بعد بھی وہ اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ
الۡاَحۡزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ
مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَ یٰقَوۡمِ
اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ یَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۚ مَا
لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿۳۳﴾ وَ
لَقَدۡ جَآءَکُمۡ یُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ
شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمۡ بِہٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا ہَلَکَ قُلۡتُمۡ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰہُ
مِنۡۢ بَعۡدِہٖ رَسُوۡلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ

وہ شخص جو ایمان لایا تھا اُس نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آ جائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آ چکا ہے، جیسا دن قومِ نوحؑ اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔[50] اے قوم! مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر فریاد و فُغاں کا دن نہ آ جائے جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے، مگر اُس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے، اُسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے یوسفؑ تمہارے پاس بیّنات لے کر آئے تھے، مگر تم اُن کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے۔ پھر جب اُن کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا: اب اُن کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا“[51] ـــــــ اِسی طرح اللہ اُن سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے[52] جو حد سے گزرنے والے

۵۰ – یعنی اللہ کو بندوں سے کوئی عداوت نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ انھیں ہلاک کر دے، بلکہ وہ ان پر عذاب اُسی وقت بھیجتا ہے جب کہ وہ حد سے گزر جاتے ہیں، اور اس وقت ان پر عذاب بھیجنا عین تقاضائے عدل و انصاف ہوتا ہے۔

۵۱ – یعنی تمھاری گمراہی اور پھر اس پر ہٹ دھرمی کا حال یہ ہے کہ موسٰی علیہ السلام سے پہلے تمھارے ملک میں

مُّرْتَابُ ۝۳۴ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ
اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ
يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝۳۵ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝۳۶ اَسْبَابَ

اور شکّی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔[53] یہ رویّہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اِسی طرح اللہ ہر متکبّر و جبّار کے دل پر ٹھپّا لگا دیتا ہے۔[54]

فرعون نے کہا: "اَے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں راستوں تک پہنچ سکوں، آسمانوں

یوسف علیہ السلام آئے جن کے متعلق تم خود مانتے ہو کہ وہ بلند ترین اَخلاق کے حامل تھے، اور اس بات کا بھی تمھیں اعتراف ہے کہ انھوں نے بادشاہِ وقت کے خواب کی صحیح تعبیر دے کر تمھیں سات برس کے اُس خوفناک قحط کی تباہ کاریوں سے بچا لیا جو اُن کے دَور میں تم پر آیا تھا، اور تمھاری ساری قوم اس بات کی بھی معترف ہے کہ ان کے دَورِ حکومت سے بڑھ کر عدل و انصاف اور خیر و برکت کا زمانہ کبھی مصر کی سرزمین نے نہیں دیکھا، مگر اُن کی ساری خوبیاں جانتے اور مانتے ہوئے بھی تم نے ان کے جیتے جی ان پر ایمان لا کر نہ دیا، اور جب ان کی وفات ہوگئی تو تم نے کہا کہ اب بھلا ایسا آدمی کہاں پیدا ہوسکتا ہے۔ گویا تم ان کی خوبیوں کے معترف ہوئے بھی تو اس طرح کہ بعد کے آنے والے ہر نبی کا انکار کرنے کے لیے اسے ایک مستقل بہانہ بنا لیا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہدایت بہرحال تمھیں قبول نہیں کرنی ہے۔

۵۲ - بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آگے کے یہ چند فقرے اللہ تعالیٰ نے مومنِ آلِ فرعون کے قول پر بطورِ اضافہ وتشریح ارشاد فرمائے ہیں۔

۵۳ - یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی میں اُنھی لوگوں کو پھینکا جاتا ہے جن میں یہ تین صفات موجود ہوتی ہیں۔ ایک، یہ کہ وہ اپنی بداعمالیوں میں حد سے گزر جاتے ہیں اور پھر انھیں فِسق و فُجور کی ایسی چاٹ لگ جاتی ہے کہ اصلاحِ اَخلاق کی کسی دعوت کو قبول کرنے کے لیے وہ آمادہ نہیں ہوتے۔ دوسرے، یہ کہ انبیا علیہم السلام کے معاملے میں ان کا مستقل رَوِیّہ شک کا رَوِیّہ ہوتا ہے۔ خدا کے نبی ان کے سامنے خواہ کیسے ہی بیّنات لے آئیں، مگر وہ ان کی نبوت میں بھی شک کرتے ہیں اور اُن حقائق کو بھی ہمیشہ شک ہی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو توحید اور آخرت کے متعلق انھوں نے پیش کیے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ وہ کتاب اللہ کی آیات پر معقولیت کے ساتھ غور کرنے کے بجائے کج بحثیوں سے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اُن کج بحثیوں کی بنیاد نہ کسی عقلی دلیل پر ہوتی

السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ
زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَ مَا كَیْدُ
فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ؑ ﴿۳۷﴾ وَ قَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ
اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ۚ﴿۳۸﴾ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا
مَتَاعٌ ؗ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً

ع ۴ ۹

کے راستوں تک، اور موسٰیؑ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ مجھے تو یہ موسٰیؑ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے[۵۵]"۔۔۔۔ اس طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی خوشنما بنا دی گئی اور وہ راہِ راست سے روک دیا گیا۔ فرعون کی ساری چال بازی (اس کی اپنی) تباہی کے راستے ہی میں صرف ہوئی۔ ع

وہ شخص جو ایمان لایا تھا، بولا: "اے میری قوم کے لوگو! میری بات مانو، میں تمھیں صحیح راستہ بتاتا ہوں، اے قوم! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے[۵۶]، ہمیشہ کے قیام کی جگہ آخرت ہی ہے۔ جو برائی کرے گا اُس کو

ہے، نہ کسی آسمانی کتاب کی سند پر، بلکہ از اوّل تا آخر صرف ضد اور ہٹ دھرمی ہی ان کی واحد بنیاد ہوتی ہے۔ یہ تین عُیوب جب کسی گروہ میں پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ اسے گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے، جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں نکال سکتی۔

۵۴ – یعنی کسی کے دل پر ٹھپّا بلا وجہ نہیں لگا دیا جاتا۔ یہ لعنت کی مُہر صرف اُسی کے دل پر لگائی جاتی ہے جس میں تکبُّر اور جبّاریت کی ہوا بھر چکی ہو۔ تکبر سے مراد ہے آدمی کا جھوٹا پِندار جس کی بنا پر وہ حق کے آگے سر جھکانے کو اپنی حیثیت سے گری ہوئی بات سمجھتا ہے۔ اور جبّاریّت سے مراد خلقِ خدا پر ظلم ہے جس کی کُھلی چھوٹ حاصل کرنے کے لیے آدمی شریعتِ الٰہیہ کی پابندیاں قبول کرنے سے بھاگتا ہے۔

۵۵ – مومنِ آلِ فرعون کی تقریر کے دَوران میں فرعون اپنے وزیر ہامان کو مخاطَب کر کے یہ بات کچھ اس انداز میں کہتا ہے کہ گویا وہ اس مومن کے کلام کو کسی التفات کے قابل نہیں سمجھتا، اس لیے متکبرانہ شان کے ساتھ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہامان سے کہتا ہے کہ ذرا میرے لیے ایک اُونچی عمارت تو بنوا، دیکھوں تو سہی کہ یہ موسٰیؑ جس خدا کی باتیں کر رہا ہے وہ کہاں رہتا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حواشی ۵۲ تا ۵۴)

۵۶ – یعنی اس دنیا کی عارضی دولت و خوشحالی پر پھول کر تم جو اللہ کو بھول رہے ہو، یہ تمھاری نادانی ہے۔

فَلَا یُجْزٰۤی اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ
مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَ
یٰقَوْمِ مَا لِیْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ ط النصف
تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ۫ وَّ اَنَا
اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ لَیْسَ
لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَا فِی الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَنَّ
الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَ

اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اُس نے بُرائی کی ہوگی۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، ایسے سب لوگ جنّت میں داخل ہوں گے، جہاں اُن کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔ اَے قوم! آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ میں تو تم لوگوں کو نجات کی طرف بُلاتا ہوں، اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو! تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں، اور اس کے ساتھ اُن ہستیوں کو شریک ٹھیراؤں جنھیں میں نہیں جانتا[۵۷]، حالانکہ میں تمھیں اُس زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلا رہا ہوں۔ نہیں، حق یہ ہے اور اِس کے خلاف نہیں ہوسکتا کہ جن کی طرف تم مجھے بُلا رہے ہو، اُن کے لیے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے نہ آخرت میں[۵۸]، اور ہم سب کو پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے، اور حد سے گزرنے والے[۵۹] آگ میں جانے والے ہیں۔ آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اُسے یاد کرو گے۔ اور اپنا

---

۵۷ – یعنی اُن کے شریکِ خدا ہونے کا میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں ہے، پھر آخر آنکھیں بند کر کے میں اتنی بڑی بات کیسے مان لوں کہ خدائی میں ان کی بھی شرکت ہے اور مجھے اللہ کے ساتھ اُن کی بھی بندگی کرنی ہے۔

۵۸ – اس فقرے کے کئی معنی ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ ان کو نہ دنیا میں یہ حق پہنچتا ہے اور نہ آخرت میں کہ اُن کی خدائی تسلیم کرنے کے لیے خلقِ خدا کو دعوت دی جائے۔ دوسرے، یہ کہ انھیں تو لوگوں نے زبردستی خدا بنایا ہے ورنہ وہ خود نہ اِس دنیا میں خدائی کے مُدّعی ہیں، نہ آخرت میں یہ دعویٰ لے کر اُٹھیں گے کہ ہم بھی تو خدا تھے، تم نے ہمیں کیوں نہ مانا۔ تیسرے، یہ کہ اُن کو پکارنے کا کوئی فائدہ نہ اِس دنیا میں ہے

اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۴۴﴾ فَوَقٰىہُ اللّٰہُ
سَیِّاٰتِ مَا مَکَرُوۡا وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ ﴿ۚ۴۵﴾ اَلنَّارُ
یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ ۟ قف اَدۡخِلُوۡۤا

معاملہ مَیں اللہ کے سُپرد کرتا ہوں، وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔[۶۰]''

آخرِ کار اُن لوگوں نے جو بُری سے بُری چالیں اُس مومن کے خلاف چلیں، اللہ نے اُن سب سے اُس کو بچالیا[۶۱]، اور فرعون کے ساتھی خود بدترین عذاب کے پھیر میں آگئے[۶۲]۔ دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح وشام وہ پیش کیے جاتے ہیں، اور جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم ہوگا کہ آلِ فرعون کو

نہ آخرت میں، کیونکہ وہ بالکل بے اختیار ہیں اور انھیں پکارنا قطعی لاحاصل ہے۔

۵۹ – ''حد سے گزر جانے'' کا مطلب حق سے تجاوُز کرنا ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے سوا دوسروں کی خدائی مانتا ہے، یا خود خدا بن بیٹھتا ہے، یا خدا سے باغی ہو کر دنیا میں خود مختاری کا رَوِیّہ اختیار کرتا ہے، اور پھر اپنی ذات پر، خلقِ خدا پر، اور دنیا کی ہر اُس چیز پر جس سے اس کو سابقہ پیش آئے، طرح طرح کی زیادتیاں کرتا ہے، وہ حقیقت میں عقل اور انصاف کی تمام حدوں کو پھاند جانے والا انسان ہے۔

۶۰ – اس فقرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں کہتے وقت اُس مومن شخص کو پورا یقین تھا کہ اس حق گوئی کی پاداش میں فرعون کی پوری سلطنت کا عتاب اس پر ٹوٹ پڑے گا اور اسے محض اپنے اعزازات اور مفادات ہی سے نہیں، اپنی جان تک سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے محض اللہ کے بھروسے پر اپنا وہ فرض انجام دے دیا جسے اس نازک موقع پر اس کے ضمیر نے اس کا فرض سمجھا تھا۔

۶۱ – اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص فرعون کی سلطنت میں اتنی اہم شخصیت کا مالک تھا کہ بھرے دربار میں فرعون کے رُو دَر رُو یہ حق گوئی کر جانے کے باوجود عَلانیہ اس کو سزا دینے کی جرأت نہ کی جا سکتی تھی، اس وجہ سے فرعون اور اس کے حامیوں کو اسے ہلاک کرنے کے لیے خفیہ تدبیریں کرنی پڑیں، مگر ان تدبیروں کو بھی اللہ نے نہ چلنے دیا۔

۶۲ – اِس طرزِ بیان سے یہ بات مُترشّح ہوتی ہے کہ مومنِ آلِ فرعون کی حق گوئی کا یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کش مکش کے بالکل آخری زمانے میں پیش آیا تھا۔ غالباً اس طویل کش مکش سے دل برداشتہ ہو کر آخرِ کار فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا ہوگا۔ مگر اپنی سلطنت کے اس بااثر شخص کی حق گوئی سے اس کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہوگا کہ موسیٰؑ کے اثرات حکومت کے بالائی طبقوں تک میں پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کے خلاف یہ انتہائی اقدام کرنے سے پہلے اُن عناصر کا پتا چلایا جائے جو سلطنت کے اُمَرا اور اعلیٰ عہدے داروں میں اِس تحریک سے مُتاثّر ہو چکے ہیں، اور

اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ ﴿۴۶﴾ وَ اِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ فَیَقُوۡلُ
الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ
مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُلٌّ

شدید تر عذاب میں داخل کرو[۶۳]۔ پھر ذرا خیال کرو اُس وقت کا جب یہ لوگ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دنیا میں جو لوگ کمزور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ "ہم تمھارے تابع تھے، اب کیا یہاں تم نارِ جہنّم کی تکلیف کے کچھ حصّے سے ہم کو بچالو گے؟[۶۴]" وہ بڑے بننے والے جواب دیں گے: "ہم سب

ان کی سرکوبی کر لینے کے بعد حضرت موسیٰؑ پر ہاتھ ڈالا جائے۔ لیکن ابھی وہ ان تدبیروں میں لگا ہی ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو ہجرت کا حکم دے دیا، اور ان کا پیچھا کرتے ہوئے فرعون اپنے لشکروں سمیت غرقاب ہو گیا۔

۶۳ – یہ آیت اُس عذابِ بَرزَخ کا صریح ثبوت ہے جس کا ذکر بکثرت احادیث میں عذابِ قبر کے عنوان سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہاں صاف الفاظ میں عذاب کے دو مرحلوں کا ذکر فرما رہا ہے: ایک کم تر درجے کا عذاب جو قیامت کے آنے سے پہلے فرعون اور آلِ فرعون کو اب دیا جا رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انھیں صبح و شام دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جسے دیکھ کر وہ ہر وقت ہول کھاتے رہتے ہیں کہ یہ ہے وہ دوزخ جس میں آخرِ کار ہمیں جانا ہے۔ اس کے بعد جب قیامت آجائے گی تو انھیں وہ اصلی اور بڑی سزا دی جائے گی جو ان کے لیے مقدر ہے، یعنی وہ اُسی دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے جس کا نظّارہ انھیں غرقاب ہو جانے کے وقت سے آج تک کرایا جا رہا ہے اور قیامت کی گھڑی تک کرایا جاتا رہے گا۔ اور یہ معاملہ صرف فرعون و آلِ فرعون کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ تمام مجرموں کو موت کی ساعت سے لے کر قیامت تک وہ انجامِ بد نظر آتا رہتا ہے جو اُن کا انتظار کر رہا ہے، اور تمام نیک لوگوں کو اُس انجامِ نیک کی حَسین تصویر دکھائی جاتی رہتی ہے جو اللہ نے اُن کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔ بخاری، مسلم اور مُسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "ان احدکم اذا مات عُرض علیہ مقعدہ بالغداۃ والعشی ، ان کان من اھل الجنۃ فمن اھل الجنۃ، وان کان من اھل النار فمن اھل النار، فیقال ھٰذا مقعدک حتّٰی یبعثک اللّٰہ عزوجل الیہ یوم القیٰمۃ۔ "تم میں سے جو شخص بھی مرتا ہے اسے صبح و شام اُس کی آخری قیام گاہ دکھائی جاتی رہتی ہے، خواہ وہ جنّتی ہو یا دوزخی۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں تو اُس وقت جائے گا جب اللہ تجھے قیامت کے روز دوبارہ اُٹھا کر اپنے حضور بلائے گا۔" (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، آیت ۹۷، الاَنعام، ۹۳-۹۴- جلد دوم، الانفال، ۵۰، النحل، ۲۸-۳۲- جلد سوم، المومنون، ۹۹-۱۰۰- جلد چہارم، یٰسٓین، ۲۶-۲۷ مع حاشیہ ۲۲-۲۳- جلد پنجم، محمد، ۲۷ مع حاشیہ ۳۷)

۶۴ – یہ بات وہ اس اُمید پر نہیں کہیں گے کہ ہمارے یہ سابق پیشوا یا حاکم یا رہنما فی الواقع ہمیں عذاب سے بچا سکیں گے یا اس میں کچھ کمی کرا دیں گے۔ اُس وقت تو اُن پر یہ حقیقت کھل چکی ہو گی کہ یہ لوگ یہاں ہمارے کسی کام آنے والے نہیں ہیں۔

فِيهَا ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ
لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾
قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا
فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ ع اِنَّا لَنَنْصُرُ
رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ
الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ ۙ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ

یہاں ایک حال میں ہیں، اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے۔[۶۵]" پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنّم کے اہل کاروں سے کہیں گے: "اپنے رب سے دُعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے۔" وہ پوچھیں گے: "کیا تمھارے پاس تمھارے رسول بیّنات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟" وہ کہیں گے: "ہاں"۔ جہنّم کے اہل کار بولیں گے: "پھر تو تم ہی دُعا کرو، اور کافروں کی دُعا اکارت ہی جانے والی ہے۔[۶۶]" ع

یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اِس دُنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں،[۶۷] اور اُس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے،[۶۸] جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی، اور اُن پر

مگر وہ انھیں ذلیل کرنے کے لیے ان سے کہیں گے کہ دنیا میں تو حضور بڑے طنطنے سے اپنی سرداری ہم پر چلاتے تھے، اب یہاں اِس آفت سے بھی تو ہمیں بچائیے جو آپ ہی کی بدولت ہم پر آئی ہے۔

۶۵ – یعنی ہم اور تم، دونوں ہی سزا یافتہ ہیں، اور اللہ کی عدالت سے جس کو جو سزا ملنی تھی مل چکی ہے۔ اُس کے فیصلے کو بدلنا، یا اس کی دی ہوئی سزا میں کمی بیشی کر دینا اب کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

۶۶ – یعنی جب واقعہ یہ ہے کہ رسول تمھارے پاس بیّنات لے کر آ چکے تھے اور تم اس بنا پر سزا پا کر یہاں آئے ہو کہ تم نے اُن کی بات ماننے سے انکار (کفر) کر دیا تھا، تو اب ہمارے لیے تمھارے حق میں اللہ تعالیٰ سے کوئی دُعا کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ ایسی دعا کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تو ہونا چاہیے، اور تم اپنی طرف سے ہر معذرت کی گنجایش پہلے ہی ختم کر چکے ہو۔ اِس حالت میں تم خود دعا کرنا چاہو تو کر دیکھو۔ مگر ہم یہ پہلے ہی تمھیں بتائے دیتے ہیں کہ تمھاری طرح کفر کر کے جو لوگ یہاں آئے ہوں ان کی دُعا بالکل لاحاصل ہے۔

اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡهُدٰى وَ
اَوۡرَثۡنَا بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ الۡكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّذِكۡرٰى لِاُولِى
الۡاَلۡبَابِ ﴿۵۴﴾ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَسَبِّحۡ

لعنت پڑے گی، اور بدترین ٹھکانا اُن کے حصّے میں آئے گا۔ آخر دیکھ لو کہ موسیٰؑ کی ہم نے رہنمائی کی[69] اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایت و نصیحت تھی[70]۔ پس اَے نبیؐ! صبر کرو[71]، اللہ کا وعدہ برحق ہے[72]، اپنے قصور کی معافی چاہو[73] اور صبح و شام

۶۷ – تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، الصّافّات، حاشیہ نمبر ۹۳۔

۶۸ – یعنی جب اللہ کی عدالت قائم ہوگی اور اس کے حضور گواہ پیش کیے جائیں گے۔

۶۹ – یعنی موسیٰؑ کو ہم نے فرعون کے مقابلے پر بھیج کر بس یونہی ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیا تھا، بلکہ قدم قدم پر ہم ان کی رہنمائی کرتے رہے یہاں تک کہ انھیں کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا۔ اِس ارشاد میں ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ اَے محمد (صلی اللہ علیک وسلم)! ایسا ہی معاملہ ہم تمھارے ساتھ بھی کریں گے۔ تم کو بھی مکّے کے شہر اور قریش کے قبیلے میں نبوت کے لیے اُٹھا دینے کے بعد ہم نے تمھارے حال پر نہیں چھوڑ دیا ہے کہ یہ ظالم تمھارے ساتھ جو سُلوک چاہیں کریں، بلکہ ہم خود تمھاری پشت پر موجود ہیں اور تمھاری رہنمائی کر رہے ہیں۔

۷۰ – یعنی جس طرح موسیٰؑ کا انکار کرنے والے اِس نعمت و برکت سے محروم رہ گئے اور اُن پر ایمان لانے والے بنی اسرائیل ہی کتاب کے وارث بنائے گئے، اسی طرح اب جو لوگ تمھارا انکار کریں گے وہ محروم ہو جائیں گے اور تم پر ایمان لانے والوں ہی کو یہ سعادت نصیب ہوگی کہ قرآن کے وارث ہوں اور دنیا میں ہدایت کے عَلَم بردار بن کر اُٹھیں۔

۷۱ – یعنی جو حالات تمھارے ساتھ پیش آ رہے ہیں ان کو ٹھنڈے دل سے برداشت کرتے چلے جاؤ۔

۷۲ – اشارہ ہے اُس وعدے کی طرف جو ابھی اُوپر کے اِس فقرے میں کیا گیا تھا کہ "ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اِس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں۔"

۷۳ – جس سِیاق وسَباق میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اُس پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس مَقام پر "قصور" سے مراد بے صبری کی وہ کیفیت ہے جو شدید مُخالَفت کے اُس ماحول میں خُصوصیّت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی مظلومی دیکھ دیکھ کر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔ آپؐ چاہتے تھے کہ جلدی سے کوئی معجزہ ایسا دکھا دیا جائے جس سے کفار قائل ہو جائیں، یا اللہ کی طرف سے اور کوئی ایسی بات جلدی ظہور میں آ جائے جس سے مخالَفت کا یہ طوفان ٹھنڈا ہو جائے۔ یہ خواہش بجائے خود کوئی گناہ نہ تھی جس پر کسی توبہ واِستِغفار کی حاجت ہوتی، لیکن جس مقامِ بلند پر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو سرفراز

بِحَمۡدِ رَبِّكَ بِالۡعَشِيِّ وَالۡاِبۡكَارِ ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يُجَادِلُوۡنَ
فِيۡۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰهُمۡ ۙ اِنۡ فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ اِلَّا
كِبۡرٌ مَّا هُمۡ بِبَالِغِيۡهِ ۚ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ﴿۵۶﴾

اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔[۷۴] حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سَند و حُجّت کے بغیر جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیات میں جھگڑے کر رہے ہیں، اُن کے دلوں میں کِبر بھرا ہُوا ہے،[۷۵] مگر وہ اُس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں[۷۶]۔ بس اللہ کی پناہ مانگ لو،[۷۷] وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔

فرمایا تھا، اور جس زبردست اولوا العزمی کا وہ مقام مقتضی تھا، اُس کے لحاظ سے یہ ذرا سی بے صبری بھی اللہ تعالیٰ کو آپؐ کے مرتبے سے فروتر نظر آئی، اس لیے ارشاد ہوا کہ اس کمزوری پر اپنے رب سے معافی مانگو اور چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ اپنے مَوْقِف پر قائم ہو جاؤ جیسا کہ تم جیسے عظیم المرتبت آدمی کو ہونا چاہیے۔

۷۴ — یعنی یہ حمد و تسبیح ہی وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ کے لیے کام کرنے والوں کو اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام حمد و تسبیح کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ دائماً اللہ کو یاد کرتے رہو۔ دوسرے، یہ کہ اِن مخصوص اوقات میں نماز ادا کرو۔ اور یہ دوسرے معنی لینے کی صورت میں اشارہ نماز کے ان پانچوں اوقات کی طرف ہے جو اس سورت کے نُزول کے کچھ مدّت بعد تمام اہلِ ایمان پر فرض کر دیے گئے۔ اس لیے کہ عَشِی کا لفظ عَرَبی زبان میں زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے ابتدائی حصّے تک کے لیے بولا جاتا ہے، جس میں ظہر سے عشا تک کی چاروں نمازیں آجاتی ہیں۔ اور اِبکار صبح کی پَو پھٹنے سے طُلوعِ آفتاب تک کے وقت کو کہتے ہیں جو نمازِ فجر کا وقت ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۵۹-۶۰-۲۶۳۔ جلد دوم، ہود، حاشیہ ۱۱۳، الحِجر، حاشیہ ۵۳، بنی اسرائیل، دیباچہ، حواشی ۱-۹۱ تا ۹۸۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۱، النور، حواشی ۸۴ تا ۸۹، العنکبوت، حواشی ۷۶ تا ۷۹، الروم، حواشی ۲۴-۵۰)

۷۵ — یعنی ان لوگوں کی بے دلیل مُخالفت اور اِن کی غیر معقول کَج بحثیوں کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کی آیات میں جو سچّائیاں اور خیر و صلاح کی باتیں ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں وہ اِن کی سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے یہ نیک نیتی کے ساتھ ان کو سمجھنے کی خاطر بحثیں کرتے ہیں، بلکہ اِن کے اِس رَوِیّے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا غُرورِ نفس یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ان کے ہوتے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم کر لی جائے اور بالآخر ایک روز اِنھیں خود بھی اُس شخص کی قیادت ماننی پڑے جس کے مقابلے میں یہ اپنے آپ کو سرداری کا زیادہ حق دار سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کسی طرح نہ چلنے پائے، اور اس مقصد کے لیے اِنھیں کوئی ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کرنے میں بھی کوئی تأمّل نہیں ہے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا
مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٥٨﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ

آسمانوں[۷۸] اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی بہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۷۹] اور یہ نہیں ہوسکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہوجائے اور ایمان دار و صالح اور بدکار برابر ٹھیریں مگر تم لوگ کم ہی کچھ سمجھتے ہو۔[۸۰] یقیناً قیامت کی گھڑی آنے والی ہے، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں، مگر

---

۷۶ – دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ نے بڑا بنایا ہے وہی بڑا بن کر رہے گا، اور یہ چھوٹے لوگ اپنی بڑائی قائم رکھنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ سب آخرِ کار ناکام ہوجائیں گی۔

۷۷ – یعنی جس طرح فرعون کی دھمکیوں کے مقابلے میں اللہ واحد قہّار کی پناہ مانگ کر موسیٰؑ بے فکر ہوگئے تھے، اسی طرح سردارانِ قریش کی دھمکیوں اور سازشوں کے مقابلے میں تم بھی اُس کی پناہ لے لو اور پھر بے فکر ہو کر اس کا کلمہ بلند کرنے میں لگ جاؤ۔

۷۸ – اُوپر کے ساڑھے تین رُکوعوں میں سردارانِ قریش کی سازشوں پر تبصرہ کرنے کے بعد اب یہاں سے خطاب کا رُخ عوام کی طرف پھر رہا ہے اور ان کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ جن حقائق کو ماننے کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دے رہے ہیں وہ سراسر معقول ہیں، ان کو مان لینے ہی میں تمھاری بھلائی ہے اور نہ ماننا تمھارے اپنے لیے تباہ کُن ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آخرت کے عقیدے کو لے کر اُس پر دلائل دیے گئے ہیں، کیونکہ کفار کو سب سے زیادہ اچنبھا اِسی عقیدے پر تھا اور اِسے وہ بعید از فہم خیال کرتے تھے۔

۷۹ – یہ امکانِ آخرت کی دلیل ہے۔ کفّار کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد انسان کا دوبارہ جی اُٹھنا غیر ممکن ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت نادان ہیں۔ اگر عقل سے کام لیں تو ان کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ ہو کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان کائنات بنائی ہے اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کر دینا کوئی دشوار کام نہیں ہوسکتا۔

۸۰ – یہ وجوبِ آخرت کی دلیل ہے۔ اُوپر کے فقرے میں بتایا گیا تھا کہ آخرت ہوسکتی ہے، اس کا ہونا غیر ممکن نہیں ہے۔ اور اس فقرے میں بتایا جا رہا ہے کہ آخرت ہونی چاہیے، عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہو، اور اس کا ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾ ع ۶

اکثر لوگ نہیں مانتے۔[81]

تمھارا[82] رب کہتا ہے: "مجھے پُکارو، میں تمھاری دُعائیں قبول کروں[83] گا۔ جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنّم میں داخل ہوں[84] گے۔"

خلافِ عقل و انصاف ہے۔ آخر کوئی معقول آدمی اس بات کو کیسے درست مان سکتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں اندھوں کی طرح جیتے ہیں اور اپنے بُرے اَخلاق و اعمال سے خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیتے ہیں وہ اپنی اِس غلط رَوِش کا کوئی بُرا انجام نہ دیکھیں، اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو دنیا میں آنکھیں کھول کر چلتے ہیں اور ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں اپنی اِس اچھی کارگزاری کا کوئی اچھا نتیجہ دیکھنے سے محروم رہ جائیں؟ یہ بات اگر صریحاً خلافِ عقل و انصاف ہے تو پھر یقیناً انکارِ آخرت کا عقیدہ بھی عقل و انصاف کے خلاف ہی ہونا چاہیے، کیونکہ آخرت نہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ نیک و بد دونوں آخرِ کار مر کر مٹی ہو جائیں اور ایک ہی انجام سے دوچار ہوں۔ اس صورت میں صرف عقل و انصاف ہی کا خون نہیں ہوتا بلکہ اَخلاق کی بھی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس لیے کہ اگر نیکی اور بدی کا انجام یکساں ہے تو پھر بد بڑا عقل مند ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے دل کے سارے ارمان نکال گیا اور نیک سخت بے وقوف ہے کہ خواہ مخواہ اپنے اُوپر طرح طرح کی اَخلاقی پابندیاں عائد کیے رہا۔

۸۱ – یہ وقوعِ آخرت کا قطعی حکم ہے جو اِستِدلال کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف علم ہی کی بنا پر لگایا جا سکتا ہے اور کلامِ وحی کے سوا کسی دوسرے کلام میں یہ بات اِس قطعیت کے ساتھ بیان نہیں ہو سکتی۔ وحی کے بغیر محض عقلی استدلال سے جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ بس اسی قدر ہے کہ آخرت ہو سکتی ہے، اور اُس کو ہونا چاہیے۔ اِس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا کہ آخرت یقیناً ہو گی اور ہو کر رہے گی، یہ صرف اُس ہستی کے کہنے کی بات ہے جسے معلوم ہے کہ آخرت ہو گی، اور وہ ہستی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیاس و اِستِدلال کے بجائے خالص علم پر دین کی بنیاد اگر قائم ہو سکتی ہے تو وہ صرف وحیِ الٰہی کے ذریعے ہی سے ہو سکتی ہے۔

۸۲ – آخرت کے بعد اب توحید پر کلام شروع ہو رہا ہے جو کفار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دوسری بنائے نزاع تھی۔

۸۳ – یعنی دعائیں قبول کرنے اور نہ کرنے کے جملہ اختیارات میرے پاس ہیں، لہٰذا تم دوسروں سے دُعائیں نہ مانگو بلکہ مجھ سے مانگو۔ اس آیت کی روح کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے تین باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں:

اوّل یہ کہ دُعا آدمی صرف اُس ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع و بصیر اور فوق الفطری اقتدار (supernatural powers) کا مالک سمجھتا ہے، اور دُعا مانگنے کا مُحرِّک دراصل آدمی کا یہ اندرونی احساس ہوتا ہے کہ عالَمِ اسباب کے تحت

فطری ذرائع و وسائل اس کی کسی تکلیف کو رفع کرنے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں یا کافی ثابت نہیں ہو رہے ہیں، اس لیے کسی فوق الفطری اقتدار کی مالک ہستی سے رُجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اس ہستی کو آدمی بے دیکھے پکارتا ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں پکارتا ہے۔ خَلوَت کی تنہائیوں میں پکارتا ہے۔ بآوازِ بلند ہی نہیں، چپکے چپکے بھی پکارتا ہے، بلکہ دل ہی دل میں اس سے مدد کی التجائیں کرتا ہے۔ یہ سب کچھ لازماً اِس عقیدے کی بنا پر ہوتا ہے کہ وہ ہستی اُس کو ہر جگہ ہر حال میں دیکھ رہی ہے۔ اس کے دل کی بات بھی سُن رہی ہے۔ اور اُس کو ایسی قدرتِ مُطلَقہ حاصل ہے کہ اسے پکارنے والا جہاں بھی ہو وہ اس کی مدد کو پہنچ سکتی ہے اور اس کی بگڑی بنا سکتی ہے۔ دُعا کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آدمی کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور ہستی کو مدد کے لیے پکارتا ہے وہ درحقیقت قطعی اور خالص اور صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ وہ اُس ہستی کے اندر اُن صفات کا اعتقاد رکھتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں۔ اگر وہ اس کو اُن خدائی صفات میں اللہ کا شریک نہ سمجھتا تو اس سے دُعا مانگنے کا تصور تک کبھی اس کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔

دوسری بات جو اس سلسلے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ کسی ہستی کے متعلق آدمی کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ اختیارات کی مالک ہے، اِس سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ وہ فی الواقع مالکِ اختیارات ہو جائے۔ مالکِ اختیارات ہونا تو ایک امرِ واقعی ہے جو کسی کے سمجھنے یا نہ سمجھنے پر موقوف نہیں ہے۔ جو درحقیقت اختیارات کا مالک ہے وہ بہرحال مالک ہی رہے گا، خواہ آپ اسے مالک سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ اور جو حقیقت میں مالک نہیں ہے، اس کو محض یہ بات کہ آپ نے اسے مالک سمجھ لیا ہے، اختیارات میں ذرّہ برابر بھی کوئی حصہ نہ دلوا سکے گی۔ اب یہ بات ایک امرِ واقعی ہے کہ قادرِ مُطلَق اور مدبّرِ کائنات اور سمیع و بصیر ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور وہی کُلّی طور پر اختیارات کا مالک ہے۔ دوسری کوئی ہستی بھی اس پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جو دعائیں سننے اور اُن پر قُبولیت یا عَدَمِ قبولیت کی صورت میں کوئی کارروائی کرنے کے اختیارات رکھتی ہو۔ اِس امرِ واقعی کے خلاف اگر لوگ اپنی جگہ کچھ انبیا اور اولیا اور فرشتوں اور جِنّوں اور سیّاروں اور فرضی دیوتاؤں کو اختیارات میں شریک سمجھ بیٹھیں تو اس سے حقیقت میں ذرّہ برابر بھی کوئی فرق رونما نہ ہوگا۔ مالک مالک ہی رہے گا اور بے اختیار بندے، بندے ہی رہیں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے دعا مانگنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر اَیوانِ حکومت کی طرف جائے مگر اصل حاکمِ ذی اختیار کو چھوڑ کر وہاں جو دوسرے سائلین اپنی حاجتیں لیے بیٹھے ہوں اُنھی میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے التجائیں کرتا چلا جائے کہ حضور ہی سب کچھ ہیں، آپ ہی کا یہاں حکم چلتا ہے، میری مراد آپ ہی بَر لائیں گے تو بَر آئے گی۔ یہ حرکت، اوّل تو بجائے خود سخت حماقت و جَہالت ہے، لیکن ایسی حالت میں یہ انتہائی گستاخی بھی بن جاتی ہے جب کہ اصل حاکمِ ذی اختیار سامنے موجود ہو اور عین اُس کی موجودگی میں اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے درخواستیں اور التجائیں پیش کی جارہی ہوں۔ پھر یہ جَہالت اپنے کمال پر اُس وقت پہنچ جاتی ہے، جب وہ شخص جس کے سامنے درخواست پیش کی جارہی ہو، خود بار بار اُس کو سمجھائے کہ میں تو خود تیری ہی طرح کا ایک سائل ہوں، میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، اصل حاکم سامنے موجود ہیں، تُو ان کی سرکار میں اپنی درخواست پیش کر، مگر اس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود یہ احمق کہتا ہی چلا جائے کہ میرے سرکار تو آپ ہیں، میرا کام آپ ہی بنائیں گے تو بنے گا۔

ان تین باتوں کو ذہن میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ مجھے پکارو، تمھاری دعاؤں کا جواب دینے والا میں ہوں، انھیں قبول کرنا میرا کام ہے۔

۸۴ – اس آیت میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں: ایک، یہ کہ دُعا اور عبادت کو یہاں مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے فقرے میں جس چیز کو دُعا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، اُسی کو دوسرے فقرے میں عبادت کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دعا عین عبادت اور جانِ عبادت ہے۔ دوسرے، یہ کہ اللہ سے دعا نہ مانگنے والوں کے لیے ''گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے دعا مانگنا عین تقاضائے بندگی ہے، اور اُس سے منہ موڑنے کے معنٰی یہ ہیں کہ آدمی تکبّر میں مبتلا ہے اس لیے اپنے خالق و مالک کے آگے اعترافِ عُبودیت کرنے سے کتراتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں آیت کے ان دونوں مضامین کو کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ حضرت نُعمان بن بَشیرؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ان الدعاء هو العبادة ثم قرأ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ...... یعنی دعا عین عبادت ہے، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (احمد، تِرْمِذی، ابوداؤد، نَسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ ابی حاتم، ابنِ جَرِیر) حضرت اَنَسؓ کی رِوایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: الدعاء مخ العبادة، ''دعا مغز عبادت ہے۔'' (تِرْمِذی) حضرت ابوہُریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: من لم يسأل الله يغضب عليه، ''جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔'' (تِرْمِذی)

اس مَقام پر پہنچ کر وہ عُقدہ بھی حل ہو جاتا ہے جو بہت سے ذہنوں میں اکثر الجھن ڈالتا رہتا ہے۔ لوگ دُعا کے معاملے پر اِس طرح سوچتے ہیں کہ جب تقدیر کی بُرائی اور بھلائی اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ اپنی غالب حکمت و مَصلَحت کے لحاظ سے جو فیصلہ کر چکا ہے وہی کچھ لازماً رونما ہو کر رہنا ہے، تو پھر ہمارے دعا مانگنے کا حاصل کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو آدمی کے دل سے دعا کی ساری اہمیت نکال دیتی ہے، اور اس باطل خیال میں مبتلا رہتے ہوئے اگر آدمی دُعا مانگے بھی تو اس کی دعا میں کوئی روح باقی نہیں رہتی۔ قرآنِ مجید کی مذکورہَ بالا آیت اس غلط فہمی کو دو طریقوں سے رفع کرتی ہے: اولاً، اللہ تعالیٰ بالفاظِ صریح فرما رہا ہے کہ ''مجھے پکارو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا۔'' اس سے صاف معلوم ہوا کہ قضا اور تقدیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس نے ہماری طرح، معاذ اللہ! خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھی باندھ دیے ہوں اور دُعا قبول کرنے کے اختیارات اس سے سلب ہو گئے ہوں۔ بندے تو بلاشبہ اللہ کے فیصلوں کو ٹالنے یا بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتے، مگر اللہ تعالیٰ خود یہ طاقت ضرور رکھتا ہے کہ کسی بندے کی دعائیں اور التجائیں سن کر اپنا فیصلہ بدل دے۔ دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دعا خواہ قبول ہو یا نہ ہو، بہرحال ایک فائدے اور بہت بڑے فائدے سے وہ کسی صورت میں بھی خالی نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کر کے اور اس سے دعا مانگ کر اس کی آقائی و بالا دستی کا اعتراف اور اپنی بندگی و عاجزی کا اقرار کرتا ہے۔ یہ اظہارِ عُبودیّت بجائے خود عبادت، بلکہ جانِ عبادت ہے، جس کے اجر سے بندہ کسی حال میں بھی محروم نہ رہے گا، قطعِ نظر اس سے کہ وہ خاص چیز اُس کو عطا کی جائے یا نہ کی جائے جس کے لیے اس نے دُعا کی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ان دونوں مضامین کی بھی پوری وضاحت ہمیں مل جاتی ہے۔ پہلے مضمون پر

حسبِ ذیل احادیث روشنی ڈالتی ہیں:

حضرت سلمانؓ فارسی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لا یرد القضاءَ الا الدعاء۔ (ترمذی) ''قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی مگر دُعا''، یعنی اللہ کے فیصلے کو بدل دینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے، مگر اللہ خود اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے، اور یہ اُس وقت ہوتا ہے جب بندہ اس سے دعا مانگتا ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من احدٍ یدعو بدعاءٍ الّا اٰتاہ اللّٰہ ما سأل او کف عنہ من السوء مثلہ ما لم یدع باثم اوقطیعۃ رحمٍ۔ (ترمذی) ''آدمی جب کبھی اللہ سے دعا مانگتا ہے، اللہ اسے یا تو وہی چیز دیتا ہے جس کی اس نے دعا کی تھی یا اُسی درجے کی کوئی بلا اس پر آنے سے روک دیتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دُعا نہ کرے۔'' اسی سے ملتا جلتا مضمون ایک دوسری حدیث میں ہے جو حضرت ابوسعید خُدریؓ نے حضورؐ سے روایت کی ہے۔ اُس میں آپؐ کا ارشاد یہ ہے کہ: ما من مسلم یدعو بدعوۃٍ لیس فیھا اثم ولا قطیعۃ رحمٍ الا اعطاہ اللّٰہ احدٰی ثلث، اما ان یعجل لہ دعوتہ، واما ان یدّخرھا لہٗ فی الاٰخرۃ واما ان یصرف عنہ من السوء مثلھا (مُسنَدِ احمد) ''ایک مسلمان جب بھی کوئی دُعا مانگتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے: یا تو اس کی وہ دُعا اسی دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے۔ یا اُسے آخرت میں اجر دینے کے لیے محفوظ رکھ لیا جاتا ہے۔ یا اُسی درجے کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔''

حضرت ابوہُریرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا دعا احدکم فلا یقل اللھم اغفرلی ان شئت، ارحمنی ان شئت، ارزقنی ان شئت، وَلْیَعْزِم مسئلتہ۔ (بخاری) ''جب تم میں سے کوئی شخص دُعا مانگے تو یوں نہ کہے کہ خدایا! مجھے بخش دے اگر تو چاہے، مجھ پر رحم کر اگر تو چاہے، مجھے رزق دے اگر تُو چاہے، بلکہ اسے قطعیّت کے ساتھ کہنا چاہیے کہ خدایا! میری فُلاں حاجت پوری کر۔'' دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ ہی سے ان الفاظ میں آئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ادعوا اللّٰہ وانتم موقنون بالاجابۃ (ترمذی) ''اللہ سے دعا مانگو، اس یقین کے ساتھ کہ وہ قبول فرمائے گا۔''

ایک اور روایت میں حضرت ابوہُریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: یستجاب للعبد ما لم یدعُ باثم اوقطیعۃ رحم ما لم یستعجل، قیل یا رسول اللّٰہ ما الاستعجال؟ قال یقول قد دعوت وقد دعوت فلم اَرَ یُستجاب لی فیستحسر عند ذٰلک ویدع الدعاء (مسلم) ''بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دُعا نہ کرے، اور جلد بازی سے کام نہ لے۔ عرض کیا گیا: جلد بازی کیا ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: جلد بازی یہ ہے کہ آدمی کہے: میں نے بہت دعا کی، بہت دعا کی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری دعا قبول ہی نہیں ہوتی، اور یہ کہہ کر آدمی تھک جائے اور دعا مانگنی چھوڑ دے۔''

دوسرے مضمون کو حسبِ ذیل احادیث واضح کرتی ہیں:

حضرت ابوہُریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لیس شیءٌ اکرم علی اللّٰہ من الدعاء۔ (ترمذی، ابنِ ماجہ) ''اللہ کی نگاہ میں دُعا سے بڑھ کر کوئی چیز باوقعت نہیں ہے۔''

اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ النَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫

وقف لازم

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی، تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو، اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔[85] وہی اللہ (جس نے تمھارے لیے یہ کچھ کیا ہے) تمھارا رب ہے۔ ہر چیز کا خالق۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔[86]

حضرت ابنِ مسعودؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: سلوا اللّٰہ من فضلہ فان اللّٰہ یحب ان یسأل (ترمذی) ''اللہ سے اس کا فضل مانگو، کیونکہ اللہ اِسے پسند فرماتا ہے کہ اُس سے مانگا جائے۔''

حضرت ابنِ عمرؓ اور حضرت مُعاذؓ بن جَبَل کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ان الدعاء ینفع ممّا نزل وممّا لم ینزل فعلیکم عباد اللّٰہ بالدعاء۔ (ترمذی، مُسندِ احمد) ''دعا بہرحال نافع ہے اُن بلاؤں کے معاملے میں بھی جو نازل ہو چکی ہیں اور اُن کے معاملے میں بھی جو نازل نہیں ہوئیں۔ پس اے بندگانِ خدا! تم ضرور دُعا مانگا کرو۔''

حضرت اَنسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: یسأل احدکم ربّہ حاجتہٗ کلّہ حتّٰی یسأل شسع نعلہٖ اذا انقطع (ترمذی) ''تم میں سے ہر شخص کو اپنی ہر حاجت خدا سے مانگنی چاہیے، حتّٰی کہ اگر اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے دُعا کرے۔'' یعنی جو معاملات بظاہر آدمی کو اپنے اختیار میں محسوس ہوتے ہیں اُن میں بھی تدبیر کرنے سے پہلے اُسے خدا سے مدد مانگنی چاہیے، اس لیے کہ کسی معاملے میں بھی ہماری کوئی تدبیر خدا کی توفیق و تائید کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی، اور تدبیر سے پہلے دُعا کے معنٰی یہ ہیں کہ بندہ ہر وقت، اپنی عاجزی اور خدا کی بالادستی کا اعتراف کر رہا ہے۔

۸۵ – یہ آیت دو اہم مضامین پر مشتمل ہے: اوّلاً، اس میں رات اور دن کو دلیلِ توحید کے طور پر پیش کیا گیا ہے، کیونکہ اُن کا باقاعدگی کے ساتھ آنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ زمین اور سورج پر ایک ہی خدا حکومت کر رہا ہے، اور ان کے اُلٹ پھیر کا انسان اور دوسری مخلوقاتِ ارضی کے لیے نافع ہونا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ وہی ایک خدا اِن سب اشیا کا خالق بھی ہے اور اُس نے یہ نظام کمال درجہ حکمت کے ساتھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ مخلوقات کے لیے نافع ہو۔ ثانیاً، اِس میں خدا کے منکر اور خدا کے ساتھ شرک کرنے والے انسانوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ خدا نے رات اور دن کی شکل میں یہ کتنی بڑی نعمت اُن کو عطا کی ہے، اور وہ کتنے سخت ناشکرے ہیں کہ اُس کی اِس نعمت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شب و روز اُس سے غداری و بے وفائی کیے چلے جاتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۶۵۔ جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۷۷، النمل، حاشیہ ۱۰۴، القصص، حاشیہ ۹۱، الروم، حاشیہ ۳۶۔ جلد چہارم، لقمان، آیت ۲۹، حاشیہ ۵۰۔ یٰسین، آیت ۳۷، حاشیہ ۳۲)

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
يَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ
بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ

پھر تم کدھر سے بہکائے جارہے ہو؟[۸۷] اِسی طرح وہ سب لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔[۸۸]

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا[۸۹] اور اوپر آسمان کا گنبد بنا دیا۔[۹۰] جس نے تمھاری صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی۔ جس نے تمھیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔[۹۱]

۸۶ – یعنی رات اور دن کے اُلٹ پھیر نے ثابت کیا کہ وہی تمھارا اور ہر چیز کا خالق ہے۔ اور یہ اُلٹ پھیر تمھاری زندگی کے لیے جو عظیم فوائد ومنافع اپنے اندر رکھتا ہے، اُس سے ثابت ہوا کہ وہ تمھارا نہایت مہربان پروردگار ہے۔ اس کے بعد لامحالہ یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ تمھارا حقیقی معبُود بھی وہی ہے۔ یہ بات سراسر عقل اور انصاف کے خلاف ہے کہ خالق اور پروردگار تو ہو اللہ، اور تمھارے معبُود بن جائیں دوسرے۔

۸۷ – یعنی کون تم کو یہ اُلٹی پٹّی پڑھا رہا ہے کہ جو نہ خالق ہیں نہ پروردگار، وہ تمھاری عبادت کے مستحق ہیں۔

۸۸ – یعنی ہر زمانے میں عوام الناس صرف اس وجہ سے اِن بہکانے والوں کے فریب میں آتے رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے حقیقت سمجھانے کے لیے جو آیات نازل کیں، لوگوں نے ان کو نہ مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُن خود غرض فریبیوں کے جال میں پھنس گئے جو اپنی دکان چمکانے کے لیے جعلی خداؤں کے آستانے بنائے بیٹھے تھے۔

۸۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد سوم، النمل، حواشی ۷۴-۷۵۔

۹۰ – یعنی تمھیں کھلی فضا میں نہیں چھوڑ دیا گیا کہ عالَم بالا کی آفات بارش کی طرح برس کر تم کو تہس نہس کر دیں، بلکہ زمین کے اُوپر ایک نہایت مستحکم سماوی نظام (جو دیکھنے والی آنکھ کو گنبد کی طرح نظر آتا ہے) تعمیر کر دیا، جس سے گزر کر کوئی تباہ کُن چیز تم تک نہیں پہنچ سکتی، حتّٰی کہ آفاق کی مہلک شعاعیں تک نہیں پہنچ سکتیں، اور اسی وجہ سے تم امن وچین کے ساتھ زمین پر جی رہے ہو۔

۹۱ – یعنی تمھارے پیدا کرنے سے پہلے تمھارے لیے اس قدر محفوظ اور پُر امن جائے قرار مہیّا کی۔ پھر تمھیں پیدا کیا تو اس طرح کہ ایک بہترین جسم، نہایت موزوں اعضا اور نہایت اعلیٰ درجے کی جسمانی وذہنی قوتوں کے ساتھ تم کو عطا کیا۔ یہ سیدھا قامت، یہ ہاتھ اور یہ پاؤں، یہ آنکھ ناک اور یہ کان، یہ بولتی ہوئی زبان اور بہترین صلاحیتوں کا مخزن دماغ تم خود بنا کر نہیں لے آئے تھے، نہ تمھاری ماں اور تمھارے باپ نے انھیں بنایا تھا، نہ کسی نبی یا ولی یا دیوتا میں یہ قدرت تھی کہ انھیں بناتا۔ ان کا

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٥﴾
قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا
جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۫ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٦﴾

وہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمھارا رب ہے۔ بے حساب برکتوں والا ہے وہ کائنات کا رب۔ وہی زندہ ہے[92]۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص[93] کر کے۔ ساری تعریف اللہ ربّ العالمین ہی کے لیے ہے[94]۔

اے نبیؐ! اِن لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے تو اُن ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنھیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو[95]۔ (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بیّنات آ چکی ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ربّ العالمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں۔

بنانے والا وہ حکیم و رحیم قادرِ مُطلَق تھا جس نے انسان کو وجود میں لانے کا جب فیصلہ کیا تو اسے دُنیا میں کام کرنے کے لیے ایسا بے نظیر جسم دے کر پیدا کیا۔ پھر پیدا ہوتے ہی اس کی مہربانی سے تم نے اپنے لیے پاکیزہ رزق کا ایک وسیع خوانِ یَغما بچھا ہوا پایا۔ کھانے اور پینے کا ایسا پاکیزہ سامان جو زہریلا نہیں بلکہ صحّت بخش ہے، کڑوا کسیلا اور بدمزا نہیں بلکہ خوش ذائقہ ہے، سڑا بُسا اور بدبودار نہیں بلکہ خوش رائحہ ہے، بے جان پھوک نہیں بلکہ اُن حیاتینوں اور مفید غذائی مادّوں سے مالا مال ہے جو تمھارے جسم کی پرورش اور نَشْو ونُما کے لیے موزوں ترین ہیں۔ یہ پانی، یہ غلّے، یہ ترکاریاں، یہ پھل، یہ دودھ، یہ شہد، یہ گوشت، یہ نمک مرچ اور مسالے، جو تمھارے تَغذیے کے لیے اس قدر موزوں اور تمھیں زندگی کی طاقت ہی نہیں، زندگی کا لُطف دینے کے لیے بھی اس قدر مناسب ہیں، آخر کس نے اس زمین پر اتنی اِفراط کے ساتھ مہیا کیے ہیں، اور کس نے یہ انتظام کیا ہے کہ غذا کے یہ بے حساب خزانے زمین سے پے در پے نکلتے چلے آئیں اور ان کی رسد کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ پائے؟ یہ رزق کا انتظام نہ ہوتا اور بس تم پیدا کر دیے جاتے تو سوچو کہ تمھاری زندگی کا کیا رنگ ہوتا۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ تمھارا پیدا کرنے والا محض خالق ہی نہیں بلکہ خالقِ حکیم اور ربِّ رحیم ہے؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: جلد دوم، ہود، حواشی ۶-۷۔ جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳ تا ۸۳)

۹۲ — یعنی اصلی اور حقیقی زندگی اُسی کی ہے۔ اپنے بل پر آپ زندہ وہی ہے۔ اَزَلی واَبَدی حیات اس کے سوا کسی کی بھی

هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ
عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ثُمَّ
لِتَكُوۡنُوۡا شُيُوۡخًا‌ ۚ وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّتَوَفّٰى مِنۡ قَبۡلُ وَلِتَبۡلُغُوۡۤا
اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِىۡ يُحۡىٖ وَ

وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نُطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچّے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بُلا لیا جاتا ہے[۹۶]۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقرر وقت تک پہنچ جاؤ[۹۷]، اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو[۹۸]۔ وہی ہے زندگی دینے

نہیں ہے۔ باقی سب کی حیات عطائی ہے، عارضی ہے، موت آشنا اور فنا در آغوش ہے۔

۹۳ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّمَر، حاشیہ ۳-۴۔

۹۴ — یعنی کوئی دوسرا نہیں ہے جس کی حمد وثنا کے گیت گائے جائیں اور جس کے شکرانے بجا لائے جائیں۔

۹۵ — یہاں پھر عبادت اور دعا کو ہم معنیٰ استعمال کیا گیا ہے۔

۹۶ — یعنی کوئی پیدا ہونے سے پہلے اور کوئی جوانی کو پہنچنے سے پہلے اور کوئی بڑھاپے کو پہنچنے سے پہلے مر جاتا ہے۔

۹۷ — وقتِ مقرر سے مراد یا تو موت کا وقت ہے، یا وہ وقت جب تمام انسانوں کو دوبارہ اُٹھ کر اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو زندگی کے مختلف مرحلوں سے گزارتا ہوا اُس ساعتِ خاص تک لے جاتا ہے جو اُس نے ہر ایک کی واپسی کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اُس وقت سے پہلے ساری دنیا مل کر بھی کسی کو مارنا چاہے تو نہیں مار سکتی، اور وہ وقت آ جانے کے بعد دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی کسی کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں تو کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے معنیٰ لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ ہنگامۂ ہستی اس لیے برپا نہیں کیا گیا ہے کہ تم مر کر مٹی میں مل جاؤ اور فنا ہو جاؤ، بلکہ زندگی کے اِن مختلف مرحلوں سے اللہ تم کو اس لیے گزارتا ہے کہ تم سب اُس وقت پر جو اس نے مقرر کر رکھا ہے، اُس کے سامنے حاضر ہو۔

۹۸ — یعنی زندگی کے ان مختلف مراحل سے تم کو اس لیے نہیں گزارا جاتا کہ تم جانوروں کی طرح جیو اور انھی کی طرح مر جاؤ، بلکہ اس لیے گزارا جاتا ہے کہ تم اس عقل سے کام لو جو اللہ نے تمھیں عطا کی ہے اور اُس نظام کو سمجھو جس میں خود تمھارے اپنے وجود

ع ۸/۱۴

يُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٦٨﴾ ع

معانقة ۱۳ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿٦٩﴾ ۖ ج

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ قف فَسَوْفَ

والا، اور وہی موت دینے والا ہے۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے، بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے، اور وہ ہو جاتی ہے۔ ع

تم نے دیکھا[99] اُن لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں؟ یہ لوگ جو اِس کتاب کو اور اُن ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں؟[100] عنقریب

پر یہ احوال گزرتے ہیں۔ زمین کے بے جان مادّوں میں زندگی جیسی عجیب و غریب چیز کا پیدا ہونا، پھر نُطفے کے ایک خُرد بینی کیڑے سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق کا وجود میں آنا، پھر ماں کے پیٹ میں استقرارِ حمل کے وقت سے وضعِ حمل تک اندر ہی اندر اُس کا اس طرح پرورش پانا کہ اُس کی جنس، اس کی شکل و صورت، اس کے جسم کی ساخت، اس کے ذہن کی خصوصیات، اور اس کی قوتیں اور صلاحیتیں سب کچھ وہیں متعیَّن ہو جائیں اور ان کی تشکیل پر دنیا کی کوئی طاقت اثر انداز نہ ہو سکے، پھر یہ بات کہ جسے اِسقاطِ حمل کا شکار ہونا ہے اس کا اِسقاط ہی ہو کر رہتا ہے، جسے بچپن میں مرنا ہے وہ بچپن ہی میں مرتا ہے خواہ وہ کسی بادشاہ ہی کا بچہ کیوں نہ ہو، اور جسے جوانی یا بڑھاپے کی کسی عمر تک پہنچنا ہے وہ خطرناک سے خطرناک حالات سے گزر کر بھی، جن میں بظاہر موت یقینی ہونی چاہیے، اُس عمر کو پہنچ کر رہتا ہے، اور جسے عمر کے جس خاص مرحلے میں مرنا ہے اُس میں وہ دنیا کے کسی بہترین ہسپتال کے اندر بہترین ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہتے ہوئے بھی مر کر رہتا ہے، یہ ساری باتیں کیا اس حقیقت کی نشان دہی نہیں کر رہی ہیں کہ ہماری اپنی حیات و مَمات کا سرِ رشتہ کسی قادرِ مُطلَق کے ہاتھ میں ہے؟ اور جب امرِ واقعہ یہی ہے کہ ایک قادرِ مُطلق ہماری موت و زیست پر حکمراں ہے تو پھر کوئی نبی یا ولی یا فرشتہ یا ستارہ اور سَیّارہ آخر کیسے ہماری بندگی و عبادت کا مستحق ہو گیا؟ کسی بندے کو یہ مَقام کب سے حاصل ہوا کہ ہم اس سے دعائیں مانگیں اور اپنی قسمت کے بننے اور بگڑنے کا مختار اُس کو مان لیں؟ اور کسی انسانی طاقت کا یہ منصب کیسے ہو گیا کہ ہم اس کے قانون اور اس کے امر و نہی اور اُس کے خود ساختہ حلال و حرام کی بے چُون و چَرا اطاعت کریں؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹)

۹۹ — مطلب یہ ہے کہ اُوپر والی تقریر کے بعد بھی کیا تمھاری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اِن لوگوں کی غلط بینی اور غلط روی کا اصل سرچشمہ کہاں ہے اور کہاں سے ٹھوکر کھا کر یہ اس گمراہی کے گڑھے میں گرے ہیں؟ (واضح رہے کہ یہاں ''تم'' کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص مخاطب ہے جو ان آیات کو پڑھے یا سنے۔)

۱۰۰ — یہ ہے اُن کے ٹھوکر کھانے کی اصل وجہ۔ اُن کا قرآن کو اور اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات کو نہ ماننا

يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ﴿۷۱﴾ فِي
الْحَمِيْمِ ۙ۬ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ
تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ
نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ
تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾ اُدْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ

انھیں معلوم ہو جائے گا جب طوق اُن کی گردنوں میں ہوں گے، اور زنجیریں، جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔[101] پھر اُن سے پوچھا جائے گا کہ اب کہاں ہیں اللہ کے سوا وہ دوسرے خدا جن کو تم شریک کرتے تھے؟[102] وہ جواب دیں گے: ''کھوئے گئے وہ ہم سے، بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے۔''[103] اِس طرح اللہ کافروں کا گمراہ ہونا مُتحقّق کر دے گا۔ اُن سے کہا جائے گا: ''یہ تمھارا انجام اِس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیرِ حق پر مگن تھے اور پھر اُس پر اِتراتے تھے۔[104] اب جاؤ، جہنّم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے،

اور اللہ کی آیات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جھگڑالو پن سے اُن کا مقابلہ کرنا، یہی وہ بنیادی سبب ہے جس نے اُن کو بھٹکا دیا ہے اور اُن کے لیے سیدھی راہ پر آنے کے سارے امکانات ختم کر دیے ہیں۔

۱۰۱ – یعنی جب وہ پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر پانی مانگیں گے تو دوزخ کے کارکن اُن کو زنجیروں سے کھینچتے ہوئے ایسے چشموں کی طرف لے جائیں گے جن سے کھولتا ہوا پانی نکل رہا ہو گا۔ اور پھر جب وہ اسے پی کر فارغ ہوں گے تو پھر وہ انھیں کھینچتے ہوئے واپس لے جائیں گے اور دوزخ کی آگ میں جھونک دیں گے۔

۱۰۲ – یعنی اگر وہ واقعی خدا یا خدائی میں شریک تھے، اور تم اِس اُمید پر ان کی عبادت کرتے تھے کہ وہ بُرے وقت پر تمھارے کام آئیں گے تو اب کیوں وہ آ کر تمھیں نہیں چھُڑاتے؟

۱۰۳ – یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم دنیا میں شرک نہیں کرتے تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اب ہم پر یہ بات کھُل گئی ہے کہ ہم جنھیں دنیا میں پکارتے تھے، وہ کچھ بھی نہ تھے، ہیچ تھے، لاشے تھے۔

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٦﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ
فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا
يُرْجَعُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ
مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ وَمَا
كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا

بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے متکبّرین کا۔" پس اَے نبیؐ! صبر کرو، اللہ[105] کا وعدہ برحق ہے۔ اب خواہ ہم تمھارے سامنے ہی اِن کو اُن بُرے نتائج کا کوئی حصّہ دکھا دیں جن سے ہم اِنھیں ڈرا رہے ہیں، یا (اُس سے پہلے) تمھیں دنیا سے اٹھالیں، پلٹ کر آنا تو اِنھیں ہماری ہی طرف ہے۔[106]

اے نبیؐ![107] تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں، جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔ کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اِذن کے بغیر خود کوئی نشانی[108] لے آتا۔ پھر جب

۱۰۴ – یعنی تم نے صرف اتنے ہی پر اکتفانہ کیا کہ جو چیز حق نہ تھی اُس کی تم نے پیروی کی، بلکہ تم اُس غیرِ حق پر ایسے مگن رہے کہ جب حق تمھارے سامنے پیش کیا گیا تو تم نے اُس کی طرف التفات نہ کیا اور اُلٹے اپنی باطل پرستی پر اِتراتے رہے۔

۱۰۵ – یعنی جو لوگ جھگڑالو پَن سے تمھارا مقابلہ کر رہے ہیں اور ذلیل ہتھکنڈوں سے تمھیں نیچا دکھانا چاہتے ہیں، ان کی باتوں اور ان کی حرکتوں پر صبر کرو۔

۱۰۶ – یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر اُس شخص کو، جس نے تمھیں زک دینے کی کوشش کی ہے، اِسی دنیا میں اور تمھاری زندگی ہی میں سزا دے دیں۔ یہاں کوئی سزا پائے یا نہ پائے، بہر حال وہ ہماری گرفت سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ مر کر تو اسے ہمارے پاس ہی آنا ہے۔ اُس وقت وہ اپنے کرتوتوں کی بھرپور سزا پالے گا۔

۱۰۷ – یہاں سے ایک اور موضوع شروع ہو رہا ہے۔ کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہم آپ کو اُس وقت تک خدا کا رسول نہیں مان سکتے جب تک آپ ہمارا منہ مانگا معجزہ ہمیں نہ دکھا دیں۔ آگے کی آیات میں ان کی اِسی بات کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جارہا ہے۔ (جس قسم کے معجزات کا وہ لوگ مطالبہ کرتے تھے ان کے چند نمونوں کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ہود، حاشیہ ۱۳، الحِجر، حواشی ۴ – ۵، بنی اسرائیل، حواشی ۱۰۵ – ۱۰۶ – جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۳۳)

۱۰۸ – یعنی کسی نبی نے بھی کبھی اپنی مرضی سے کوئی معجزہ نہیں دکھایا ہے، اور نہ کوئی نبی خود معجزہ دکھانے پر قادر

ع ۸ ۱۰ ۱۳

جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾ ع اَللّٰهُ الَّذِيْ
جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ لَكُمْ فِيْهَا
مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ
تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا، اور اُس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے[109] ع
اللہ ہی نے تمھارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں، تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمھارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمھارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو، وہاں تم اُن پر پہنچ سکو۔ اُن پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمھیں دکھا رہا ہے، آخر تم اُس کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے۔[110]

تھا۔ معجزہ تو جب بھی کسی نبی کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے اُس وقت ظاہر ہوا ہے جب اللہ نے یہ چاہا کہ اس کے ہاتھ سے کوئی معجزہ کسی منکر قوم کو دکھایا جائے۔ یہ کفار کے مطالبے کا پہلا جواب ہے۔

۱۰۹ – یعنی معجزہ کبھی کھیل کے طور پر نہیں دکھایا گیا ہے۔ وہ تو ایک فیصلہ کُن چیز ہے۔ اُس کے ظاہر ہو جانے کے بعد جب کوئی قوم نہیں مانتی تو پھر اس کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ تم محض تماش بینی کے شوق میں معجزے کا مطالبہ کر رہے ہو، مگر تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ اس طرح دراصل تم خود تقاضے کر کر کے اپنی شامت بُلا رہے ہو۔ یہ کفار کے اس مطالبے کا دوسرا جواب ہے، اور اس کی تفصیلات اس سے پہلے قرآن میں متعدّد مقامات پر گزر چکی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: جلد دوم، الحِجر، حواشی ۵–۳۰، بنی اسرائیل، حواشی ۶۸–۶۹۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۷–۸، الفرقان، حاشیہ ۳۳، الشعراء حاشیہ ۴۹)

۱۱۰ – مطلب یہ ہے کہ اگر تم محض تماشا دیکھنے اور دل بہلانے کے لیے معجزے کا مطالبہ نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمھیں صرف یہ اطمینان کرنے کی ضرورت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن باتوں کو ماننے کی دعوت تمھیں دے رہے ہیں (یعنی توحید اور آخرت) وہ حق ہیں یا نہیں، تو اس کے لیے خدا کی یہ نشانیاں بہت کافی ہیں جو ہر وقت تمھارے مُشاہَدے اور تجربے میں آ رہی ہیں۔ حقیقت کو سمجھنے کے لیے اِن نشانیوں کے ہوتے کسی اور نشانی کی کیا حاجت رہ جاتی ہے۔ یہ معجزات کے مطالبے کا تیسرا جواب ہے۔ یہ جواب بھی اس سے پہلے متعدّد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے اور ہم اس کی تشریح اچھی طرح کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: جلد اوّل، الانعام، حواشی ۲۶–۲۷۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۰۵، الرعد، حواشی ۱۵ تا ۲۰۔ جلد سوم، الشعراء، حواشی ۳–۴–۵)

زمین پر جو جانور انسان کی خدمت کر رہے ہیں، خُصوصاً گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، اُونٹ اور گھوڑے، اِن کو

اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ ؕ كَانُوۡۤا اَكۡثَرَ مِنۡهُمۡ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا

پھر کیا[111] یہ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِن کو اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے تعداد میں زیادہ تھے، اِن سے بڑھ کر طاقتور تھے، اور زمین میں اِن سے زیادہ شاندار آثار

بنانے والے نے ایسے نقشے پر بنایا ہے کہ یہ بآسانی انسان کے پالتو خادم بن جاتے ہیں، اور اِن سے اُس کی بے شمار ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اِن پر سواری کرتا ہے۔ اِن سے بار برداری کا کام لیتا ہے۔ اِنھیں کھیتی باڑی کے کام میں استعمال کرتا ہے۔ اِن کا دودھ نکال کر اسے پیتا بھی ہے اور اس سے دہی، لسّی، مکھن، گھی، کھویا، پنیر، اور طرح طرح کی مٹھائیاں بناتا ہے۔ اِن کا گوشت کھاتا ہے۔ اِن کی چربی استعمال کرتا ہے۔ اِن کے اُون اور بال اور کھال اور آنتیں اور ہڈی اور خون اور گوبر، ہر چیز اُس کے کام آتی ہے۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے کہ انسان کے خالق نے زمین پر اس کو پیدا کرنے سے بھی پہلے اُس کی اِن بے شمار ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ جانور اِس خاص نقشے پر پیدا کر دیے تھے تاکہ وہ اُن سے فائدہ اٹھائے؟

پھر زمین کا تین چوتھائی حصّہ پانی سے لبریز ہے اور صرف ایک چوتھائی خشکی پر مشتمل ہے۔ خشک حصوں کے بھی بہت سے چھوٹے اور بڑے رقبے ایسے ہیں جن کے درمیان پانی حائل ہے۔ کُرۂ زمین کے اِن خشک علاقوں پر انسانی آبادیوں کا پھیلنا اور پھر اُن کے درمیان سفر و تجارت کے تعلقات کا قائم ہونا اِس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ پانی اور سمندروں اور ہواؤں کو ایسے قوانین کا پابند بنایا جاتا جن کی بدولت جہاز رانی کی جاسکتی، اور زمین پر وہ سروسامان پیدا کیا جاتا جسے استعمال کر کے انسان جہاز سازی پر قادر ہوتا۔ کیا یہ اِس بات کی صریح علامت نہیں ہے کہ ایک ہی قادرِ مُطلَق ربِّ رحیم و حکیم ہے جس نے انسان اور زمین اور پانی اور سمندروں اور ہواؤں اور اُن تمام چیزوں کو جو زمین پر ہیں، اپنے خاص منصوبے کے مطابق بنایا ہے۔ بلکہ اگر انسان صرف جہاز رانی ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھے تو اس میں تاروں کے مواقع اور سیّاروں کی باقاعدہ گردش سے جو مدد ملتی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ زمین ہی نہیں، آسمانوں کا خالق بھی وہی ایک ربِّ کریم ہے۔

اِس کے بعد اِس بات پر بھی غور کیجیے کہ جس خدائے حکیم نے اپنی اتنی بے شمار چیزیں انسان کے تصرُّف میں دی ہیں اور اس کے مفاد کے لیے یہ کچھ سروسامان فراہم کیا ہے، کیا بسلامتیِ ہوش و حواس آپ اس کے متعلق یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ معاذ اللہ ایسا آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پُورا ہو گا کہ وہ انسان کو یہ سب کچھ دے کر کبھی اس سے حساب نہ لے گا۔

۱۱۱ – یہ خاتمۂ کلام ہے۔ اِس حصّے کو پڑھتے وقت آیات ۴-۵ اور آیت ۲۱ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیں۔

فِي الْأَرْضِ فَمَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ
وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ
اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ
فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ ع

ع ۹ ۱۴

چھوڑ گئے ہیں۔ جو کچھ کمائی اُنھوں نے کی تھی، آخر وہ اُن کے کس کام آئی؟ جب ان کے رسول اُن کے پاس بیّنات لے کر آئے تو وہ اُسی علم میں مگن رہے جو ان کے اپنے پاس [112] تھا، اور پھر اُسی چیز کے پھیر میں آ گئے جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو پکار اُٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہٗ لاشریک کو، اور ہم انکار کرتے ہیں اُن سب معبُودوں کا جنھیں ہم شریک ٹھیراتے تھے۔ مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان اُن کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہوسکتا تھا، کیونکہ یہی اللہ کا مقرّر ضابطہ ہے، جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا [113] ہے، اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے۔ ع

۱۱۲ – یعنی اپنے فلسفے اور سائنس، اپنے قانون، اپنے دُنیوی عُلوم، اور اپنے پیشواؤں کے گھڑے ہوئے مذہبی افسانوں (Mythology) اور دینیات (Theology) ہی کو انھوں نے اصل علم سمجھا، اور انبیا علیہم السلام کے لائے ہوئے علم کو ہیچ سمجھ کر اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔

۱۱۳ – یہ کہ توبہ اور ایمان بس اسی وقت تک نافع ہیں جب تک آدمی اللہ کے عذاب یا موت کی گرفت میں نہ آ جائے۔ عذاب آ جانے یا موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد ایمان لانا یا توبہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

تفہیم القرآن

حٰمٓ السجدہ

(۴۱)

حٰمٓ السجدہ

نام

اس سورت کا نام دو لفظوں سے مرکّب ہے۔ ایک حٰمٓ، دوسرے اَلسّجدہ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس کا آغاز حٰمٓ سے ہوتا ہے اور جس میں ایک مقام پر آیتِ سجدہ آئی ہے۔

زمانۂ نزُول

معتبر رِوایات کی رُو سے اس کا زمانۂ نزول حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے پہلے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاقؒ نے مشہور تابعی محمد بن کَعب القُرَظیؒ کے حوالے سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجدِ حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیّت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس موقع پر عُتبہ بن رَبِیعَہ (ابوسفیان کے خُسر) نے سردارانِ قریش سے کہا کہ صاحبو! اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں، شاید کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں، اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور عُتبہ اُٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ آپؐ اُس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُس نے کہا: ’’بھتیجے! تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمھیں معلوم ہے۔ مگر تم اپنی قوم پر ایک بڑی مصیبت لے آئے ہو۔ تم نے جماعت میں تفرِقہ ڈال دیا، ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا، قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی اور ایسی باتیں کرنے لگے جن کے معنٰی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔ اب ذرا میری بات سنو! میں کچھ تجویزیں تمھارے سامنے رکھتا ہوں، ان پر غور کرو، شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔‘‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’ابوالولید! آپ کہیں، میں سنوں گا۔‘‘ اس نے کہا: ’’بھتیجے! یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے اگر تمھارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملے کا فیصلہ تمھارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جنّ آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اَطِبّا بلواتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمھارا علاج کراتے ہیں۔‘‘ عُتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ’’ابوالولید! آپ کو جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے؟‘‘ اس نے کہا: ’’ہاں‘‘۔ آپؐ نے فرمایا: ’’اچھا، اب میری سنو۔‘‘ اس کے بعد آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اسی سورت کی

تلاوت شروع کی اور عُتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (آیت نمبر ۳۸) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، پھر سر اُٹھا کر فرمایا: ''اے ابوالولید! میرا جواب آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' عُتبہ اُٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دُور سے اس کو دیکھتے ہی کہا: خدا کی قسم! عُتبہ کا چہرہ بدلا ہُوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آ کر بیٹھا تو لوگوں نے کہا: ''کیا سن آئے؟'' اس نے کہا: ''بخدا! میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم! نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے، نہ کہانت۔ اے سردارانِ قریش! میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو، اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اُٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمھاری بادشاہی، اور اس کی عزت تمھاری عزت ہی ہوگی۔'' سردارانِ قریش اُس کی یہ بات سنتے ہی بول اُٹھے: ''ولید کے ابّا! آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔'' عتبہ نے کہا: ''میری جو رائے تھی وہ میں نے تمھیں بتا دی، اب تمھارا جو جی چاہے کرتے رہو۔'' (ابنِ ہشام، جلد ۱، ص ۳۱۳- ۳۱۴)

اس قصے کو متعدّد دوسرے محدثین نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے بھی مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے، جن میں تھوڑا بہت لفظی اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض رِوایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضورؐ تلاوت کرتے ہوئے آیت فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ (اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اِن سے کہہ دو کہ میں تمھیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں) پر پہنچے تو عُتبہ نے بے اختیار آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا: ''خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔'' بعد میں اس نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنے اس فعل کی وجہ یہ بیان کی کہ ''آپ لوگ جانتے ہیں، محمدؐ کی زبان سے جو بات نکلتی ہے پوری ہو کر رہتی ہے، اس لیے میں ڈر گیا کہ کہیں ہم پر عذاب نازل نہ ہو جائے۔'' (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر ابنِ کثیر، ج ۴، ص ۹۰ -۹۱۔ البدایہ والنِّہایہ، ج ۳، ص ۶۲)

موضوع اور مضمون عُتبہ کی اِس گفتگو کے جواب میں جو تقریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، اس میں اُن بے ہودہ باتوں کی طرف سرے سے کوئی التفات نہ کیا گیا جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھیں۔ اس لیے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ دراصل حضورؐ کی نیت اور آپؐ کی عقل پر حملہ تھا۔ اُس کی ساری باتوں کے پیچھے یہ مفروضہ کام کر رہا تھا کہ حضورؐ کے نبی، اور قرآن کے وحی ہونے کا تو بہرحال کوئی امکان نہیں ہے، اب لامحالہ آپؐ کی اِس دعوت کا محرک یا تو مال و دولت اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ہے، یا پھر، معاذ اللہ! آپؐ کی عقل میں فتور آ گیا ہے۔ پہلی صورت میں وہ آپؐ سے سودے بازی کرنا چاہتا تھا،

اور دوسری صورت میں یہ کہہ کر آپؐ کی توہین کر رہا تھا کہ ہم اپنے خرچ پر آپؐ کی دیوانگی کا علاج کرائے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی بے ہودگیوں پر جب مخالفین اتر آئیں تو ایک شریف آدمی کا کام ان کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ اُن کو قطعی نظر انداز کر کے اپنی جو بات کہنی ہو کہے۔

عُتْبَہ کی باتوں سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے اِس سورہ میں اُس مُخالَفت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جو قرآنِ مجید کی دعوت کو زَک دینے کے لیے کفارِ مکہ کی طرف سے اُس وقت انتہائی ہٹ دھرمی اور بداَخلاقی کے ساتھ کی جارہی تھی۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے: ''آپ خواہ کچھ کریں، ہم آپ کی کوئی بات سن کر نہ دیں گے۔ ہم نے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں۔ اپنے کان بند کر لیے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک دیوار حائل ہوگئی ہے جو ہمیں اور آپ کو کبھی نہ ملنے دے گی۔''

انھوں نے آپؐ کو صاف صاف نوٹس دے دیا تھا کہ آپ اپنی اِس دعوت کا کام جاری رکھیے، ہم آپ کی مخالَفت میں جو کچھ ہم سے ہو سکے گا، کریں گے۔

انھوں نے آپؐ کو زَک دینے کے لیے کام کا یہ نقشہ بنایا تھا کہ جب بھی آپؐ یا آپؐ کے پیروؤں میں سے کوئی عام لوگوں کو قرآن سنانے کی کوشش کرے، فوراً ہنگامہ برپا کر دیا جائے اور اتنا شور مچایا جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔

وہ پوری سرگرمی کے ساتھ اِس کام میں لگے ہوئے تھے کہ قرآنِ مجید کی آیات کو الٹے معنٰی پہنا کر عوام میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائیں۔ بات کچھ کہی جاتی تھی اور وہ اسے بناتے کچھ تھے۔ سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالتے تھے۔ سِیاق وسَباق سے الگ کر کے کوئی لفظ کہیں سے اور کوئی فقرہ کہیں سے لے اُڑتے اور اِس کے ساتھ اپنی طرف سے چار باتیں ملا کر نئے نئے مضامین پیدا کرتے تھے، تاکہ قرآن اور اس کے پیش کرنے والے رسول کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کی جائے۔

عجیب عجیب قسم کے اعتراضات جَڑتے تھے، جن کا ایک نمونہ اِس سورہ میں پیش کیا گیا ہے۔ کہتے تھے کہ ایک عرب اگر عَرَبی زبان میں کوئی کلام سناتا ہے تو اس میں معجزے کی کیا بات ہوئی؟ عربی تو اس کی مادری زبان ہے۔ اپنی مادری زبان میں جس کا جی چاہے ایک کلام تصنیف کر لے اور دعوٰی کر دے کہ وہ اس پر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ معجزہ تو جب ہوتا کہ یہ شخص کسی دوسری زبان میں، جسے یہ نہیں جانتا، یکایک اُٹھ کر ایک فصیح و بلیغ تقریر کر ڈالتا۔ تب یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ اس کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ اُوپر کہیں سے اس پر نازل ہو رہا ہے۔

اس اندھی اور بہری مخالَفت کے جواب میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، اُس کا ماحَصَل یہ ہے:

(۱) یہ خدا ہی کا نازل کردہ کلام ہے اور عربی زبان ہی میں ہے۔ جو حقیقتیں اس میں صاف صاف کھول کر بیان کی گئی ہیں، جاہل لوگ اُن کے اندر علم کی کوئی روشنی نہیں پاتے، مگر سمجھ بُوجھ رکھنے والے اس روشنی کو دیکھ

بھی رہے ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے یہ کلام نازل کیا۔ کوئی اسے زحمت سمجھتا ہے تو یہ اس کی اپنی بدنصیبی ہے۔ خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے فائدہ اٹھائیں، اور ڈرنا چاہیے اُن لوگوں کو جو اس سے منہ موڑ لیں۔

(۲) تم نے اگر اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہیں تو نبی کے سُپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ جو نہیں سننا چاہتا اُسے سنائے، اور جو نہیں سمجھنا چاہتا اس کے دل میں زبردستی اپنی بات اُتارے۔ وہ تو تمھارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ سننے والوں ہی کو سنا سکتا ہے اور سمجھنے والوں ہی کو سمجھا سکتا ہے۔

(۳) تم چاہے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لو اور اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو، مگر حقیقت یہی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی ہے اور تم کسی دوسرے کے بندے نہیں ہو۔ تمھاری ضد سے یہ حقیقت بہر حال نہیں بدل سکتی۔ مان لو گے اور اس کے مطابق اپنا عمل دُرست کر لو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود ہی تباہی سے دوچار ہو گے۔

(۴) تمھیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ شرک اور کفر تم کس کے ساتھ کر رہے ہو؟ اُس خدا کے ساتھ جس نے یہ اَتھاہ کائنات بنائی ہے، جو زمین و آسمان کا خالق ہے، جس کی پیدا کی ہوئی برکتوں سے اس زمین میں تم فائدہ اُٹھا رہے ہو، اور جس کے مہیا کیے ہوئے رزق پر تم پَل رہے ہو۔ اُس کا شریک تم اُس کی حقیر مخلوقات کو بناتے ہو، اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ضد میں آ کر منہ موڑتے ہو۔

(۵) اچھا، نہیں مانتے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم پر اُسی طرح کا عذاب اچانک ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہے جیسا عاد اور ثمود پر آیا تھا۔ اور یہ عذاب بھی تمھارے جرم کی آخری سزا نہ ہو گا، بلکہ آگے میدانِ حشر کی باز پُرس اور جہنّم کی آگ ہے۔

(۶) بڑا ہی بدقسمت ہے وہ انسان جس کے ساتھ ایسے شیاطینِ جنّ واِنس لگ جائیں جو اُسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھاتے رہیں، اس کی حماقتوں کو اُس کے سامنے خوش نُما بنا کر پیش کریں، اور اسے کبھی نہ خود صحیح بات سوچنے دیں، نہ کسی دوسرے سے سننے دیں۔ اس طرح کے نادان لوگ آج تو یہاں ایک دوسرے کو بڑھاوے چڑھاوے دے رہے ہیں، اور ہر ایک دوسرے کی شہ پا کر نہلے پر دہلا مار رہا ہے، مگر قیامت کے روز جب شامت آئے گی تو ان میں سے ہر ایک کہے گا کہ جن لوگوں نے مجھے بہکایا تھا، وہ میرے ہاتھ لگ جائیں تو انھیں پاؤں تلے روند ڈالوں۔

(۷) یہ قرآن ایک اٹل کتاب ہے۔ اسے تم اپنی گھٹیا چالوں اور اپنے جھوٹ کے ہتھیاروں سے شکست نہیں دے سکتے۔ باطل خواہ سامنے سے آئے یا در پردہ اور بالواسطہ حملہ آور ہو، اِسے زَک دینے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔

(۸) آج تمھاری اپنی زبان میں یہ قرآن پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو، تو تم کہتے ہو کہ یہ کسی عجمی زبان میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر ہم تمھاری ہدایت کے لیے عجمی زبان میں اسے بھیجتے تو تم ہی لوگ کہتے کہ یہ بھی عجیب مذاق ہے، عرب کی قوم کی ہدایت کے لیے عجمی زبان میں کلام فرمایا جا رہا ہے، جسے یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمھیں دراصل ہِدایت مطلوب ہی نہیں ہے۔ نہ ماننے کے لیے نت نئے بہانے تراش رہے ہو۔

(۹) کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر فی الواقع حقیقت یہی نکلی کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے تو اس کا انکار کر کے اور اس کی مُخالَفت میں اتنی دُور تک جا کر تم کس انجام سے دوچار ہو گے۔

(۱۰) آج تم نہیں مان رہے ہو، مگر عنقریب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اِس قرآن کی دعوت تمام آفاق پر چھا گئی ہے اور تم خود اس سے مغلوب ہو چکے ہو۔ اُس وقت تمھیں پتا چل جائے گا کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا تھا، وہ حق تھا۔

مخالفین کو یہ جوابات دینے کے ساتھ اُن مسائل کی طرف بھی توجّہ فرمائی گئی ہے جو اس شدید مُزاحمَت کے ماحول میں اہلِ ایمان کو اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھے۔ ایمان لانے والوں کے لیے اُس وقت تبلیغ کرنا تو درکنار، ایمان کے راستے پر قائم رہنا بھی سخت دشوار ہو رہا تھا، اور ہر اُس شخص کی جان عذاب میں آ جاتی تھی جس کے متعلق یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ دشمنوں کی خوفناک جتھا بندی اور ہر طرف چھائی ہوئی طاقت کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ اِس حالت میں اوّل تو یہ کہہ کر اُن کی ہمت بندھائی گئی کہ تم حقیقت میں بے یار و مددگار نہیں ہو، بلکہ جو شخص بھی ایک دفعہ خدا کو اپنا رب مان کر اِس عقیدے اور مسلک پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتا ہے، خدا کے فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں اور دنیا سے لے کر آخرت تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ پھر یہ فرما کر ان کا حوصلہ بڑھایا گیا کہ بہترین ہے وہ انسان جو خود نیک عمل کرے، دوسروں کو خدا کی طرف بلائے، اور ڈٹ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو سوال سخت پریشان کُن بنا ہوا تھا، وہ یہ تھا کہ جب اِس دعوت کی راہ میں ایسے سنگِ گراں حائل ہیں تو اِن چٹانوں سے تبلیغ کا راستہ آخر کیسے نکالا جائے؟ اس سوال کا حل آپؐ کو یہ بتایا گیا کہ یہ نمایشی چٹانیں بظاہر بڑی سخت نظر آتی ہیں، مگر اَخلاقِ حَسَنہ کا ہتھیار وہ ہتھیار ہے جو انھیں توڑ کر اور پگھلا کر رکھ دے گا۔ صبر کے ساتھ اس سے کام لو، اور جب کبھی شیطان اِشتِعال دلا کر کسی دوسرے ہتھیار سے کام لینے پر اُکسائے تو خدا سے پناہ مانگو۔

آیاتہا ۵۴ سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝١ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ
اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝٣ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا

حٰ مٓ، یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔[۱]

۱ — یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے۔ آگے کی تقریر پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس تمہید میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں وہ بعد کے مضمون سے کیا مناسبت رکھتی ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ یعنی تم جب تک چاہو یہ رٹ لگاتے رہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر رہے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کلام کا نُزول خداوندِ عالَم کی طرف سے ہے۔ مزید برآں یہ ارشاد فرما کر مخاطبین کو اس بات پر بھی مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ تم اگر اس کلام کو سُن کر چیں بہ جَبیں ہوتے ہو تو تمھارا یہ غصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہے، اگر اسے ردّ کرتے ہو تو ایک انسان کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات ردّ کرتے ہو، اور اگر اس سے بے رُخی برتتے ہو تو ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے منہ موڑتے ہو۔

دوسری بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ اس کا نازل کرنے والا وہ خدا ہے جو اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان (رحمٰن اور رحیم) ہے۔ نازل کرنے والے خدا کی دوسری صفات کے بجائے صفتِ رحمت کا ذکر اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس نے اپنی رحیمی کے اِقتِضا سے یہ کلام نازل کیا ہے۔ اِس سے مخاطبین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اِس کلام سے اگر کوئی بے رُخی برتتا ہے، یا اسے ردّ کرتا ہے، یا اس پر چیں بہ جَبیں ہوتا ہے تو درحقیقت اپنے آپ سے دشمنی کرتا ہے۔ یہ تو ایک نعمتِ عُظمیٰ ہے جو خدا نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی اور فلاح و سعادت کے لیے نازل کی ہے۔ خدا اگر انسانوں سے بے رُخی برتتا تو انھیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور کچھ پروا نہ کرتا کہ یہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں، لیکن یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ اُن کی زندگی سنوارنے کے لیے علم کی روشنی دکھانا بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر یہ کلام اپنے ایک بندے پر نازل کر رہا ہے۔ اب اُس شخص سے بڑھ کر ناشکرا اور آپ اپنا دشمن کون ہوگا جو اس رحمت سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے اُلٹا اس سے لڑنے کے لیے دوڑے۔

فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ
اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَ فِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ

مگر اِن لوگوں میں سے اکثر نے اس سے رُوگردانی کی اور وہ سُن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں: "جس چیز کی طرف تُو ہمیں بُلا رہا ہے، اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں[۲]، ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں، اور ہمارے

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اِس کتاب کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ یعنی اس میں کوئی بات گُنجلک اور پیچیدہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس بنا پر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر دے کہ اس کی سمجھ میں اس کتاب کے مضامین آتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، صحیح عقائد کون سے ہیں اور غلط عقائد کون سے، اچھے اَخلاق کیا ہیں اور بُرے اَخلاق کیا، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، کس طریقے کی پیروی میں انسان کی بھلائی ہے اور کس طریقے کو اختیار کرنے میں اُس کا اپنا خسارہ ہے۔ ایسی صاف اور کھلی ہوئی ہدایت کو اگر کوئی شخص ردّ کرتا ہے یا اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا۔ اُس کے اس رَوِیّے کے صاف معنٰی یہ ہیں کہ وہ خود برسرِ غلط رہنا چاہتا ہے۔

چوتھی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ عَرَبی زبان کا قرآن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی غیر زبان میں آتا تو اہلِ عرب یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ہم اُس زبان ہی سے نابلَد ہیں جس میں خدا نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔ لیکن یہ تو ان کی اپنی زبان میں ہے۔ اسے نہ سمجھ سکنے کا بہانہ وہ نہیں بنا سکتے۔ (اس مقام پر آیت ۴۴ بھی پیشِ نظر رہے جس میں یہی مضمون ایک دوسرے طریقے سے بیان ہوا ہے۔ اور یہ شبہ کہ پھر غیر اہلِ عرب کے لیے تو قرآن کی دعوت کو قبول نہ کرنے کے لیے ایک معقول عذر موجود ہے، اس سے پہلے ہم رفع کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یُوسُف، حاشیہ ۵۔ رسائل و مسائل، حصّہ اوّل، ص ۱۹ تا ۲۳)

پانچویں بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں۔ یعنی اس سے فائدہ صرف دانا لوگ ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ نادان لوگوں کے لیے یہ اسی طرح بے فائدہ ہے جس طرح ایک قیمتی ہیرا اُس شخص کے لیے بے فائدہ ہے جو ہیرے اور پتھر کا فرق نہ جانتا ہو۔

چھٹی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب بشارت دینے والی اور ڈرا دینے والی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ محض ایک تخیُّل، ایک فلسفہ، اور ایک نمونۂ اِنشا پیش کرتی ہو، جسے ماننے یا نہ ماننے کا کچھ حاصل نہ ہو۔ بلکہ یہ ہانکے پکارے تمام دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اسے ماننے کے نتائج نہایت شان دار اور نہ ماننے کے نتائج انتہائی ہولناک ہیں۔ ایسی کتاب کو صرف ایک بے وقوف ہی سرسری طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔

۲ - یعنی اُس کے لیے ہمارے دلوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ کُھلا ہوا نہیں ہے۔

بَيۡنِكَ حِجَابٌ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ ۝۵ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ
يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسۡتَقِيۡمُوۡۤا اِلَيۡهِ وَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ ؕ
وَوَيۡلٌ لِّلۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝۶ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ
بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ۝۷ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے[3]۔ تُو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے[4]۔''

اے نبیؐ! اِن سے کہو: مَیں تو ایک بشر ہوں تم جیسا[5]۔ مجھے وحی کے ذریعے سے بتایا جاتا ہے کہ تمھارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے[6]، لہٰذا تم سیدھے اُسی کا رُخ اختیار کرو[7] اور اس سے معافی چاہو[8]۔ تباہی ہے اُن مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے[9] اور آخرت کے منکر ہیں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے،

۳ – یعنی اس دعوت نے ہمارے اور تمھارے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ اس نے ہمیں اور تمھیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا ہے۔ یہ ایک ایسی رکاوٹ بن گئی ہے جو ہم کو اور تم کو جمع نہیں ہونے دیتی۔

۴ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ ہم کو تم سے اور تم کو ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرے، یہ کہ تم اپنی دعوت سے باز نہیں آتے تو اپنا کام کیے جاؤ، ہم بھی تمھاری مخالفت سے باز نہ آئیں گے، اور جو کچھ تمھیں نیچا دکھانے کے لیے ہم سے ہو سکے گا، کریں گے۔

۵ – یعنی میرے بس میں یہ نہیں ہے کہ تمھارے دلوں پر چڑھے ہوئے غلاف اُتار دوں، تمھارے بہرے کان کھول دوں، اور اُس حجاب کو پھاڑ دوں جو تم نے خود ہی میرے اور اپنے درمیان ڈال لیا ہے۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ اُسی کو سمجھا سکتا ہوں جو سمجھنے کے لیے تیار ہو، اُسی کو سنا سکتا ہوں جو سننے کے لیے تیار ہو، اور اُسی سے مل سکتا ہوں جو ملنے کے لیے تیار ہو۔

۶ – یعنی تم چاہے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو اور اپنے کان بہرے کر لو، مگر حقیقت یہ ہے کہ تمھارے بہت سے خدا نہیں ہیں، بلکہ صرف ایک ہی خدا ہے جس کے تم بندے ہو۔ اور یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے جو مَیں نے اپنے غور و فکر سے بنایا ہو، جس کے صحیح اور غلط ہونے کا یکساں احتمال ہو، بلکہ یہ حقیقت مجھ پر وحی کے ذریعے سے منکشف کی گئی ہے جس میں غلطی کے احتمال کا شائبہ تک نہیں ہے۔

۷ – یعنی کسی اَور کو خدا نہ بناؤ، کسی اور کی بندگی و پرستش نہ کرو، کسی اور کو مدد کے لیے نہ پکارو، کسی اور کے آگے سرِ تسلیم و اطاعت خم نہ کرو، کسی اَور کے رسم و رواج اور قانون و ضابطہ کو شریعتِ واجب الاطاعت نہ مانو۔

۸ – معافی اُس بے وفائی کی جو اَب تک تم اپنے خدا سے کرتے رہے، اُس شرک اور کفر اور نافرمانی کی جس کا ارتکاب

ع ۱ ۸ ۱۵

لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸ ع قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ
الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝۹ ج وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا
وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۱۰

اُن کے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔[۱۰] ع

اَے نبیؐ! اِن سے کہو: کیا تم اُس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اُس کا ہمسر ٹھیراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔ اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اُوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے، اور اس میں برکتیں رکھ دیں،[۱۱] اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیّا کر دیا۔[۱۲] یہ سب کام چار دن میں[۱۳] ہو گئے۔

تم سے اب تک ہوتا رہا، اور ان گناہوں کی جو خدا فراموشی کے باعث تم سے سرزد ہوئے۔

۹ – یہاں زکوٰۃ کے معنیٰ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ابنِ عباسؓ اور ان کے جلیل القدر شاگرد عِکرِمہؒ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اس مَقام پر زکوٰۃ سے مراد وہ پاکیزگیِ نفس ہے جو توحید کے عقیدے اور اللہ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تباہی ہے ان مشرکین کے لیے جو پاکیزگی اختیار نہیں کرتے۔ دوسرا گروہ، جس میں قَتادہؒ، سُدِّیؒ، حَسن بصریؒ، ضَحّاکؒ، مُقاتِلؒ اور ابن السّائبؒ جیسے مفسرین شامل ہیں، اس لفظ کو یہاں بھی زکوٰۃِ مال ہی کے معنیٰ میں لیتا ہے۔ اِس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو شرک کر کے خدا کا اور زکوٰۃ نہ دے کر بندوں کا حق مارتے ہیں۔

۱۰ – اصل میں اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے دو معنیٰ اور بھی ہیں: ایک، یہ کہ وہ ایسا اجر ہوگا جس میں کبھی کمی نہ آئے گی۔ دوسرے یہ کہ وہ اجر احسان جتا جتا کر نہیں دیا جائے گا، جیسے کسی بخیل کا عطیّہ ہوتا ہے کہ اگر وہ جی کڑا کر کے کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو بار بار اس کو جتاتا ہے۔

۱۱ – زمین کی برکتوں سے مراد وہ بے حد و حساب سر و سامان ہے جو کروڑہا کروڑ سال سے مسلسل اُس کے پیٹ سے نکلتا چلا آ رہا ہے اور خُردبینی کیڑوں سے لے کر انسان کے بلند ترین تمدن تک کی روز افزوں ضروریات پوری کیے چلا جا رہا ہے۔ ان برکتوں میں سب سے بڑی برکتیں ہوا اور پانی ہیں، جن کی بدولت ہی زمین پر نباتی، حیوانی اور پھر انسانی زندگی ممکن ہوئی۔

۱۲ – اصل الفاظ ہیں: قَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ اس فقرے کی تفسیر میں مفسرین کے متعدِّد اقوال ہیں:

بعض مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”زمین میں اس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے ٹھیک حساب سے رکھ دیے پورے چار دنوں میں۔“ یعنی کم یا زیادہ نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں۔

ابنِ عباسؓ، قتادہؒ اور سُدّیؒ اِس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”زمین میں اس کے ارزاق چار دنوں میں رکھ دیے۔ پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا۔“ یعنی جو کوئی یہ پوچھے کہ یہ کام کتنے دنوں میں ہوا، اُس کا مکمل جواب یہ ہے کہ چار دنوں میں ہو گیا۔

ابنِ زیدؒ اس کے معنٰی یہ بیان کرتے ہیں کہ ”زمین میں اُس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے چار دنوں کے اندر رکھ دیے، ٹھیک اندازے سے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق۔“

جہاں تک قواعدِ زبان کا تعلق ہے، آیت کے الفاظ میں یہ تینوں معنٰی لینے کی گنجایش ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلے دو معنوں میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیا اہمیّت رکھتی ہے کہ یہ کام ایک گھنٹا کم چار دن، یا ایک گھنٹا زیادہ چار دن میں نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت اور کمالِ رُبوبیّت اور کمالِ حکمت کے بیان میں کون سی کسر رہ جاتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے اس تصریح کی حاجت ہو؟ اسی طرح یہ تفسیر بھی بڑی کمزور تفسیر ہے کہ ”پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا۔“ آیت سے پہلے اور بعد کے مضمون میں کسی جگہ بھی کوئی قرینہ یہ نہیں بتاتا کہ اُس وقت کسی سائل نے یہ دریافت کیا تھا کہ یہ سارے کام کتنے دنوں میں ہوئے، اور یہ آیت اس کے جواب میں نازل ہوئی۔ انھی وجوہ سے ہم نے ترجمے میں تیسرے معنٰی کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زمین میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک جس جس قسم کی جتنی مخلوق بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا تھا، ہر ایک کی مانگ اور حاجت کے ٹھیک مطابق غذا کا پورا سامان حساب لگا کر اس نے زمین کے اندر رکھ دیا۔ نباتات کی بے شمار اقسام خشکی اور تری میں پائی جاتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی غذائی ضروریات دوسری اقسام سے مختلف ہیں۔ جاندار مخلوقات کی بے شمار انواع ہوا اور خشکی اور تری میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور ہر نوع ایک الگ قسم کی غذا مانگتی ہے۔ پھر ان سب سے جدا، ایک اور مخلوق انسان ہے جس کو محض جسم کی پرورش ہی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے بھی طرح طرح کی خوراکیں درکار ہیں۔ اللہ کے سوا کون جان سکتا تھا کہ اس کُرۂ خاکی پر زندگی کا آغاز ہونے سے لے کر اُس کے اختتام تک کس کس قسم کی مخلوقات کے کتنے افراد کہاں کہاں اور کب کب وجود میں آئیں گے، اور ان کو پالنے کے لیے کیسی اور کتنی غذا درکار ہوگی۔ اپنی تخلیقی اسکیم میں جس طرح اُس نے غذا طلب کرنے والی اِن مخلوقات کو پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اُسی طرح اُس نے اُن کی طلب کو پورا کرنے کے لیے خوراک کا بھی مکمل انتظام کر دیا۔

موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے مارکسی تصوّرِ اِشتراکیت کا اسلامی ایڈیشن ”قرآنی نظامِ رُبوبیّت“ کے نام سے نکالا ہے، وہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيۡنَ کا ترجمہ ”سب مانگنے والوں کے لیے برابر“ کرتے ہیں، اور اس پر اِستِدلال کی عمارت یوں اٹھاتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لیے برابر خوراک رکھی ہے، لہٰذا آیت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے، کیونکہ انفرادی مِلکیّت کے نظام میں وہ مُساوات قائم نہیں ہو سکتی جس کا یہ ”قرآنی قانون“ تقاضا کر رہا ہے۔ لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریّات کی خدمت لینے کے جوش میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائلین، جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، صرف انسان ہی نہیں ہیں، بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنھیں زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا واقعی

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ

پھر وہ آسمان کی طرف متوجّہ ہوا جو اُس وقت محض دُھواں[14] تھا۔ اُس نے آسمان اور زمین سے کہا: ”وجود

ان سب کے درمیان، یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے تمام افراد کے درمیان خدا نے سامانِ پرورش میں مُساوات رکھی ہے؟ کیا فطرت کے اس پورے نظام میں کہیں آپ کو غذا کے مُساوی راشن کی تقسیم کا انتظام نظر آتا ہے؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ نباتات اور حیوانات کی دنیا میں، جہاں انسانی ریاست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ریاست براہِ راست تقسیمِ رزق کا انتظام کر رہی ہے، اللہ میاں خود اپنے اِس ”قرآنی قانون“ کی خلاف ورزی ـــــ بلکہ معاذ اللہ! بے انصافی ـــــ فرما رہے ہیں! پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ ”سائلین“ میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں جنھیں انسان پالتا ہے، اور جن کی خوراک کا انتظام انسان ہی کے ذمّے ہے۔ مثلاً بھیڑ بکری، گائے بھینس، گھوڑے، گدھے، خچّر اور اونٹ وغیرہ۔ اگر قرآنی قانون یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے، اور اسی قانون کو نافذ کرنے کے لیے نظامِ رُبوبیّت چلانے والی ایک ریاست مطلوب ہے، تو کیا وہ ریاست انسان اور ان حیوانات کے درمیان بھی مَعاشی مُساوات قائم کرے گی؟

۱۳ - اس مقام کی تفسیر میں مفسرین کو بالعُموم یہ زحمت پیش آئی ہے کہ اگر زمین کی تخلیق کے دو دن، اور اس میں پہاڑ جمانے اور برکتیں رکھنے اور سامانِ خوراک پیدا کرنے کے چار دن تسلیم کیے جائیں، تو آگے آسمانوں کی پیدایش دو دنوں میں ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مزید دو دن ملا کر آٹھ دن بن جاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے متعدّد مقامات پر قرآنِ مجید میں تصریح فرمائی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق جملہ چھ دنوں میں ہوئی ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۶-۲۶۱-۳۲۴-۲۶۱۔ جلد سوم، ص ۴۶۰) اسی بنا پر قریب قریب تمام مفسّرین یہ کہتے ہیں کہ یہ چار دن زمین کی تخلیق کے دو دن سمیت ہیں، یعنی دو دن تخلیقِ زمین کے اور دو دن زمین کے اندر ان باقی چیزوں کی پیدایش کے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس طرح جملہ چار دنوں میں زمین اپنے سرو سامان سمیت مکمل ہوگئی۔ لیکن یہ بات قرآنِ مجید کے ظاہر الفاظ کے بھی خلاف ہے، اور درحقیقت وہ زحمت بھی محض خیالی زحمت ہے جس سے بچنے کے لیے اس تاویل کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ زمین کی تخلیق کے دو دن دراصل اُن دو دنوں سے الگ نہیں ہیں جن میں بحیثیتِ مجموعی پوری کائنات بنی ہے۔ آگے کی آیات پر غور کیجیے۔ ان میں زمین اور آسمان دونوں کی تخلیق کا یکجا ذکر کیا گیا ہے، اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دو دنوں میں سات آسمان بنا دیے۔ ان سات آسمانوں سے پوری کائنات مراد ہے، جس کا ایک جُز ہماری یہ زمین بھی ہے۔ پھر جب کائنات کے دوسرے بے شمار تاروں اور سیّاروں کی طرح یہ زمین بھی اُن دو دنوں کے اندر مُجرّد ایک کُرے کی شکل اختیار کر چکی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ذی حیات مخلوقات کے لیے تیار کرنا شروع کیا، اور چار دنوں کے اندر اس میں وہ سب کچھ سرو سامان پیدا کر دیا جس کا اوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے تاروں اور سیّاروں میں اِن چار دنوں کے اندر کیا کچھ ترقیاتی کام کیے گئے، اُن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے، کیونکہ نزولِ قرآن کے دَور کا انسان تو درکنار، اِس زمانے کا آدمی بھی ان معلومات کو ہضم کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

۱۴ - اِس مقام پر تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ⑪ فَقَضٰىهُنَّ

میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔" دونوں نے کہا: "ہم آ گئے فرماں برداروں کی طرح۔"[15] تب اُس نے

اوّل، یہ کہ آسمان سے مراد یہاں پوری کائنات ہے، جیسا کہ بعد کے فقروں سے ظاہر ہے۔ دوسرے الفاظ میں آسمان کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیقِ کائنات کی طرف متوجہ ہوا۔

دوم، یہ کہ دھویں سے مراد مادّے کی وہ ابتدائی حالت ہے جس میں وہ کائنات کی صورت گری سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزا غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانے کے سائنس داں اسی چیز کو سحابیے (nebula) سے تعبیر کرتے ہیں اور آغازِ کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادّہ جس سے کائنات بنی ہے، اسی دُخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا۔

سوم، یہ کہ "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا" سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ پہلے اُس نے زمین بنائی، پھر اس میں پہاڑ جمانے، برکتیں رکھنے اور سامانِ خوراک فراہم کرنے کا کام انجام دیا، پھر اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ کائنات کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا۔ اِس غلط فہمی کو بعد کا یہ فقرہ رفع کر دیتا ہے کہ "اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آجاؤ، اور انھوں نے کہا: ہم آ گئے فرماں برداروں کی طرح۔" اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت اور بعد کی آیات میں ذکر اُس وقت کا ہو رہا ہے جب نہ زمین تھی نہ آسمان تھا، بلکہ تخلیقِ کائنات کی ابتدا کی جا رہی تھی۔ محض لفظ ثُمَّ (پھر) کو اس بات کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ زمین کی پیدایش آسمان سے پہلے ہو چکی تھی۔ قرآنِ مجید میں اس امر کی متعدّد مثالیں موجود ہیں کہ ثُمَّ کا لفظ لازماً ترتیبِ زمانی ہی کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ ترتیبِ بیان کے طور پر بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ زُمَر، حاشیہ نمبر ۱۲)

قدیم زمانے کے مفسرین میں یہ بحث مدت ہائے دراز تک چلتی رہی ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ ایک گروہ اِس آیت اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۹ سے یہ اِستدلال کرتا ہے کہ زمین پہلے بنی ہے۔ دوسرا گروہ سورۂ نازعات کی آیات ۲۷ تا ۳۳ سے دلیل لاتا ہے کہ آسمان پہلے بنا ہے، کیونکہ وہاں اس امر کی تصریح ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں کسی جگہ بھی تخلیقِ کائنات کا ذکر طبیعیات یا ہیئت کے علوم سکھانے کے لیے نہیں کیا گیا ہے، بلکہ توحید و آخرت کے عقائد پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے بے شمار دوسرے آثار کی طرح زمین و آسمان کی پیدایش کو بھی غور و فکر کے لیے پیش فرمایا گیا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ بات سرے سے غیر ضروری تھی کہ تخلیقِ آسمان و زمین کی زمانی ترتیب بیان کی جاتی اور بتایا جاتا کہ زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ دونوں میں سے خواہ یہ پہلے بنی ہو یا وہ، بہر حال دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے اِلٰہِ واحد ہونے پر گواہ ہیں، اور اس امر پر شاہد ہیں کہ ان کے پیدا کرنے والے نے یہ سارا کارخانہ کسی کھلنڈرے کے کھلونے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اسی لیے قرآن کسی جگہ زمین کی پیدایش کا ذکر پہلے کرتا ہے اور کسی جگہ آسمان کی پیدایش کا۔ جہاں انسان کو خدا کی نعمتوں کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعُموم وہ زمین کا ذکر پہلے کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان سے قریب تر ہے۔ اور جہاں خدا کی عظمت اور اس کے کمالِ قدرت کا تصور دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعُموم وہ آسمانوں کا ذکر پہلے کرتا ہے،

سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَاَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا ؕ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ۖ٭ وَحِفۡظًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۱۲﴾

دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے، اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔[۱۶] یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔

کیونکہ چرخِ گرداں کا منظر ہمیشہ سے انسان کے دل پر ہیبت طاری کرتا رہا ہے۔

۱۵ – ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے طریقِ تخلیق کی کیفیت ایسے انداز سے بیان فرمائی ہے جس سے خدائی تخلیق اور انسانی صنّاعی کا فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ انسان جب کوئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کا نقشہ اپنے ذہن میں جماتا ہے، پھر اُس کے لیے مطلوبہ مواد جمع کرتا ہے، پھر اس مواد کو اپنے نقشے کے مطابق صورت دینے کے لیے پیہم محنت اور کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دوران میں وہ مواد، جسے وہ اپنے ذہنی نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے، مسلسل اس کی مُزاحمت کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کبھی مواد کی مزاحمت کامیاب ہو جاتی ہے اور چیز مطلوبہ نقشے کے مطابق ٹھیک نہیں بنتی، اور کبھی آدمی کی کوشش غالب آجاتی ہے اور وہ اسے اپنی مطلوبہ شکل دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک درزی قمیص بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے پہلے وہ قمیص کی صورت کا تصور اپنے ذہن میں حاضر کرتا ہے، پھر کپڑا فراہم کر کے اُسے اپنے تصورِ قمیص کے مطابق تراشنے اور سینے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دَوران میں اُسے کپڑے کی اس مزاحمت کا مسلسل مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ درزی کے تصور پر ڈھلنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، حتّٰی کہ کبھی کپڑے کی مزاحمت غالب آجاتی ہے اور قمیص ٹھیک نہیں بنتا، اور کبھی درزی کی کوشش غالب آجاتی ہے اور وہ کپڑے کو ٹھیک اپنے تصور کے مطابق شکل دے دیتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا طرزِ تخلیق دیکھیے۔ کائنات کا مادّہ دھوئیں کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اللہ نے چاہا کہ اسے وہ شکل دے جو اَب کائنات کی ہے۔ اِس غرض کے لیے اُسے کسی انسان کاریگر کی طرح بیٹھ کر زمین اور چاند اور سورج اور دوسرے تارے اور سیّارے گھڑنے نہیں پڑے، بلکہ اُس نے کائنات کے اُس نقشے کو جو اس کے ذہن میں تھا بس یہ حکم دے دیا کہ وہ وجود میں آجائے، یعنی دھوئیں کی طرح پھیلا ہوا مواد اُن کہکشانوں اور تاروں اور سیّاروں کی شکل میں ڈھل جائے جنھیں وہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس مواد میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اللہ کے حکم کی مزاحمت کرتا۔ اللہ کو اسے کائنات کی صورت میں ڈھالنے کے لیے کوئی محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑی۔ اُدھر حکم ہوا اور اِدھر وہ مواد سکڑ اور سمٹ کر فرماں برداروں کی طرح اپنے مالک کے نقشے پر ڈھلتا چلا گیا، یہاں تک کہ دو دنوں میں زمین سمیت ساری کائنات بن کر تیار ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کے طریقِ تخلیق کی اِسی کیفیت کو قرآنِ مجید میں دوسرے متعدّد مقامات پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو بس اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۱۵، آلِ عمران، حواشی ۴۴ – ۵۳۔ جلد دوم، النحل، حواشی ۳۵ – ۳۶۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۲۲۔ جلد چہارم، یٰسین، آیت ۸۲، المومن، آیت ۶۸)

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ
عَادٍ وَّثَمُوۡدَ ؕ ﴿۱۳﴾ اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ
وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ
رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں[17] تو اِن سے کہہ دو کہ مَیں تم کو اُسی طرح کے ایک اچانک ٹُوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہُوا تھا۔ جب خدا کے رسول اُن کے پاس آگے اور پیچھے، ہر طرف سے آئے[18] اور انھیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، تو انھوں نے کہا: ”ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا ہم اُس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔“[19]

---

۱۶ – اِن آیات کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن کے حسبِ ذیل مقامات کا مطالعہ مفید ہوگا: جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۴۔ جلد دوم، الرّعد، حاشیہ ۲، الحِجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۳۴-۳۵، المومنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۳۷، الصّافّات، حواشی ۵-۶)

۱۷ – یعنی اِس بات کو نہیں مانتے کہ خدا اور معبُود بس وہی ایک ہے جس نے یہ زمین اور ساری کائنات بنائی ہے، اور اپنی اِس جہالت پر اصرار ہی کیے چلے جاتے ہیں کہ اُس خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی، جو حقیقت میں اس کے مخلوق و مملوک ہیں، معبود بنائیں گے اور اس کی ذات وصفات اور حُقوق واختیارات میں انھیں اُس کا شریک ٹھیرائیں گے۔

۱۸ – اس فقرے کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ ان کے پاس رسول کے بعد رسول آتے رہے۔ دوسرے، یہ کہ رسولوں نے ہر پہلو سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، اور ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنے میں کسر نہ اُٹھا رکھی۔ تیسرے، یہ کہ ان کے پاس اُن کے اپنے ملک میں بھی رسول آئے اور گردوپیش کے ملکوں میں بھی آتے رہے۔

۱۹ – یعنی اگر اللہ کو ہمارا یہ مذہب پسند نہ ہوتا اور وہ اس سے باز رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ تم چونکہ فرشتے نہیں ہو بلکہ ہم جیسے انسان ہی ہو، اس لیے ہم یہ نہیں مانتے کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے اور اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنا مذہب چھوڑ کر وہ دین اختیار کرلیں جسے تم پیش کر رہے ہو۔ کفار کا یہ کہنا کہ جس چیز کے لیے تم ”بھیجے گئے ہو“ اُسے ہم نہیں مانتے محض طنز کے طور پر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا مانتے تھے اور پھر ان کی بات ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بلکہ یہ اُسی طرح کا طنزیہ اندازِ بیان ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے متعلق اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ اِنَّ رَسُوۡلَكُمُ الَّذِىۡۤ اُرۡسِلَ اِلَيۡكُمۡ لَمَجۡنُوۡنٌ (الشُّعَراء، آیت ۲۷)، ”یہ رسول صاحب جو تمھارے

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا
مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ
اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۱۵ فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ
الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى

عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے: ''کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔'' اُن کو یہ نہ سُوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے، وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے، آخرکار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی[20] تاکہ انھیں دنیا ہی کی زندگی میں ذِلّت ورُسوائی کے عذاب کا مزا چکھا دیں[21]، اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رُسوا کن

پاس بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔'' (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ یٰسین، حاشیہ نمبر ۱۱)

۲۰ – ''منحوس دنوں'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دن بجائے خود منحوس تھے، اور عذاب اس لیے آیا کہ یہ منحوس دن قومِ عاد پر آ گئے تھے۔ یہ مطلب اگر ہوتا اور بجائے خود اُن دنوں ہی میں کوئی نحوست ہوتی تو عذاب دُور و نزدیک کی ساری ہی قوموں پر آ جاتا۔ اس لیے صحیح مطلب یہ ہے کہ اُن ایّام میں چونکہ اس قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوا، اس بنا پر وہ دن قومِ عاد کے لیے منحوس تھے۔ اس آیت سے دنوں کے سَعد و نَحس پر اِستِدلال کرنا دُرست نہیں ہے۔

طوفانی ہوا کے لیے ''رِیْحِ صَرصَر'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے معنٰی میں اہلِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت لُو ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت ٹھنڈی ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسی ہوا ہے جس کے چلنے سے سخت شور برپا ہوتا ہو۔ بہرحال اس معنٰی پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ بہت تیز طوفانی ہوا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل آئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ ہوا مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک چلتی رہی۔ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے اور مر مر کر گر پڑے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں۔ (الحاقّہ، آیت ۷) جس چیز پر سے بھی یہ ہوا گزر گئی، اس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ (الذاریات، ۴۲) جس وقت یہ ہوا آ رہی تھی، اس وقت عاد کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے کہ خوب گھٹا گھِر کر آئی ہے، بارش ہوگی اور سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے گا۔ مگر وہ آئی تو

وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١٦﴾ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى
الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٧﴾ وَ
ع ۲ / ۱۲
نَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿١٨﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ
اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ

ہے، وہاں کوئی اُن کی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔

رہے ثمود، تو ان کے سامنے ہم نے راہِ راست پیش کی، مگر انھوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا پسند کیا۔ آخر اُن کے کرتوتوں کی بدولت ذلّت کا عذاب اُن پر ٹوٹ پڑا، اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بدعملی سے پرہیز کرتے تھے۔[۲۲] ع

اور ذرا اُس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے[۲۳] جائیں گے۔ اُن کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے[۲۴] گا، پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور

اس طرح آئی کہ اس نے ان کے پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ (الاحقاف: ۲۴-۲۵)

۲۱ — یہ ذلت و رُسوائی کا عذاب اُن کے اُس کبر و غرور کا جواب تھا جس کی بنا پر وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے تھے اور خم ٹھونک ٹھونک کر کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ زور آور کون ہے۔ اللہ نے ان کو اس طرح ذلیل کیا کہ اُن کی آبادی کے بڑے حصّے کو ہلاک کر دیا، اُن کے تمدّن کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا، اور ان کا قلیل حصّہ جو باقی رہ گیا وہ دنیا کی اُنھی قوموں کے آگے ذلیل و خوار ہوا جن پر کبھی یہ لوگ اپنا زور جتاتے تھے۔ (عاد کے قصّے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۱ تا ۵۳، ہود، حواشی ۵۴ تا ۶۶۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۳۴ تا ۳۷، الشعراء، حواشی ۸۸ تا ۹۴، العنکبوت، حاشیہ ۶۵)

۲۲ — ثمود کے قصے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۷ تا ۵۹، ہود، حواشی ۶۹ تا ۷۴، الحجر، حواشی ۴۲ تا ۴۶، بنی اسرائیل، حاشیہ ۶۸۔ جلد سوم، الشعراء، حواشی ۹۵ تا ۱۰۶، النمل، حواشی ۵۸ تا ۶۶)

۲۳ — اصل مُدّعا یہ کہنا ہے کہ جب وہ اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ لیکن اس مضمون کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ کیونکہ ان کا انجام آخرِ کار دوزخ ہی میں جانا ہے۔

اَبۡصَارُهُمۡ وَ جُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۰﴾ وَ قَالُوۡا
لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ
الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيۡهِ

ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں[۲۵]۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے: "تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گی: "ہمیں اُسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے[۲۶]۔ اُسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اُسی کی طرف تم

۲۴ – یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ ایک ایک نسل اور ایک ایک پشت کا حساب کر کے اس کا فیصلہ کیے بعد دیگرے کیا جاتا رہے، بلکہ تمام اگلی پچھلی نسلیں بیک وقت جمع کی جائیں گی اور ان سب کا اکٹھا حساب کیا جائے گا۔ اس لیے کہ ایک شخص اپنی زندگی میں جو کچھ بھی اچھے اور بُرے اعمال کرتا ہے، اس کے اثرات اس کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی مدّت ہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں اور وہ ان اثرات کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک نسل اپنے دَور میں جو کچھ بھی کرتی ہے، اس کے اثرات بعد کی نسلوں میں صدیوں جاری رہتے ہیں، اور اپنے اِس ورثے کے لیے وہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ محاسبے اور انصاف کے لیے اِن سارے ہی آثار و نتائج کا جائزہ لینا اور ان کی شہادتیں فراہم کرنا ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے قیامت کے روز نسل پر نسل آتی جائے گی اور ٹھیرائی جاتی رہے گی۔ عدالت کا کام اُس وقت شروع ہوگا جب اگلے پچھلے سب جمع ہو جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰)

۲۵ – احادیث میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ جب کوئی ہیکڑ مجرم اپنے جرائم کا انکار ہی کرتا چلا جائے گا اور تمام شہادتوں کو بھی جھٹلانے پر تُل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے جسم کے اعضا ایک ایک کر کے شہادت دیں گے کہ اُس نے ان سے کیا کیا کام لیے تھے۔ یہ مضمون حضرت اَنسؓ، حضرت ابو موسیٰ اَشْعَرِیؓ، حضرت ابوسعید خُدریؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایت کیا ہے، اور مسلم، نَسائی، ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، بَزّار وغیرہ محدثین نے ان رِوایات کو نقل کیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۵۵)

یہ آیت منجملہ اُن بہت سی آیات کے ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالَمِ آخرت محض ایک رُوحانی عالَم نہیں ہوگا، بلکہ انسان وہاں دوبارہ اُسی طرح جسم و روح کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ اب اِس دنیا میں ہیں۔ یہی نہیں، اُن کو جسم بھی وہی دیا جائے گا جس میں اب وہ رہتے ہیں۔ وہی تمام اجزا اور جواہر (atoms) جن سے اُن کے بدن اس دنیا میں مرکّب تھے، قیامت کے روز جمع کر دیے جائیں گے اور وہ اپنے انھی سابق جسموں کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے جن کے اندر رہ کر وہ دنیا میں کام کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اعضا وہاں اُسی صورت میں تو گواہی دے سکتے ہیں جب کہ وہ وہی اعضا ہوں جن سے اُس نے اپنی پہلی

تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ
لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ
كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ
اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ

واپس لائے جا رہے ہو۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمھیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمھارے اپنے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمھارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمھارا یہی گمان، جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمھیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے[۲۷]۔'' اس حالت میں وہ صبر کریں (یا نہ کریں)، آگ ہی

زندگی میں کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اِس مضمون پر قرآنِ مجید کی حسبِ ذیل آیات بھی دلیلِ قاطع ہیں: بنی اسرائیل، آیات ۴۹ تا ۵۱ – ۹۸۔ المومنون: ۳۵ تا ۳۸ – ۸۲ – ۸۳۔ النور: ۲۴۔ السجدہ، ۱۰۔ یٰسٓ: ۶۵ – ۷۸ – ۷۹۔ الصّٰفّٰت: ۱۶ تا ۱۸۔ الواقعہ: ۴۷ تا ۵۰۔ النازعات: ۱۰ تا ۱۴۔

۲۶ – اس سے معلوم ہوا کہ صرف انسان کے اپنے اعضائے جسم ہی قیامت کے روز گواہی نہیں دیں گے، بلکہ ہر وہ چیز بول اُٹھے گی جس کے سامنے انسان نے کسی فعل کا ارتکاب کیا تھا۔ یہی بات سورۂ زلزال میں فرمائی گئی ہے کہ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ زمین وہ سارے بوجھ نکال پھینکے گی جو اس کے اندر بھرے پڑے ہیں، اور انسان کہے گا کہ یہ اسے کیا ہو گیا ہے، اُس روز زمین اپنی ساری سرگزشت سنا دے گی، (یعنی جو جو کچھ انسان نے اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اس کی ساری داستان بیان کر دے گی)۔ کیونکہ تیرا رب اسے بیان کرنے کا حکم دے چکا ہو گا۔

۲۷ – حضرت حَسَن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تشریح میں خوب فرمایا ہے کہ ہر آدمی کا رَوِیّہ اُس گمان کے لحاظ سے مُتعیّن ہوتا ہے جو وہ اپنے رب کے متعلق قائم کرتا ہے۔ مومنِ صالح کا رَوِیّہ اس لیے درست ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے بارے میں صحیح گمان رکھتا ہے، اور کافر و منافق اور فاسق و ظالم کا رَوِیّہ اس لیے غلط ہوتا ہے کہ اپنے رب کے بارے میں اس کا گمان غلط ہوتا ہے۔ یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی جامع اور مختصر حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ تمھارا رب کہتا ہے: انا عند ظن عبدی بی، ''میں اُس گمان کے ساتھ ہوں جو میرا بندہ مجھ سے رکھتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿٢٤﴾
وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ ع

ع ۱۷

ان کا ٹھکانا ہوگی، اور اگر رُجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع انھیں نہ دیا جائے گا۔[۲۸] ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلّط کر دیے تھے جو انھیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوش نما بنا کر دکھاتے تھے،[۲۹] آخرِ کار اُن پر بھی وہی فیصلۂ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنّوں اور انسانوں کے گروہوں پر چسپاں ہو چکا تھا، یقیناً وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے۔ ع

۲۸ - اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کی طرف پلٹنا چاہیں گے تو نہ پلٹ سکیں گے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو نہ نکل سکیں گے، اور یہ بھی کہ توبہ اور معذرت کرنا چاہیں گے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔

۲۹ - یہ اللہ تعالیٰ کی مستقل اور دائمی سنّت ہے کہ وہ بُری نیت اور بُری خواہشات رکھنے والے انسانوں کو کبھی اچھے ساتھی نہیں دلواتا، بلکہ انھیں اُن کے اپنے رُجحانات کے مطابق بُرے ساتھی ہی دلواتا ہے۔ پھر جتنے جتنے وہ بدی کی پستیوں میں گہرے اترتے جاتے ہیں، اتنے ہی بدتر سے بدتر آدمی اور شیاطین ان کے ہم نشین اور مشیر اور رفیقِ کار بنتے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ فلاں صاحب بذاتِ خود تو بہت اچھے ہیں، مگر انھیں ساتھی بُرے مل گئے ہیں، حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر شخص کو ویسے ہی دوست ملتے ہیں جیسا وہ خود ہوتا ہے۔ ایک نیک آدمی کے ساتھ اگر بُرے لوگ لگ بھی جائیں تو وہ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک لگے نہیں رہ سکتے۔ اور اسی طرح ایک بدنیت اور بدکردار آدمی کے ساتھ نیک اور شریف انسانوں کی رفاقت اتفاقاً واقع ہو بھی جائے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں نبھ سکتی۔ بد آدمی فطرتاً بدوں ہی کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور بد ہی اس کی طرف کھنچتے ہیں، جس طرح غلاظت مکھیوں کو کھینچتی ہے اور مکھیاں غلاظت کی طرف کھنچتی ہیں۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ وہ آگے اور پیچھے ہر چیز اُن کو خوش نُما بنا کر دکھاتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن کو یقین دلاتے تھے کہ آپ کا ماضی بھی بڑا شان دار تھا اور مستقبل بھی نہایت درخشاں ہے۔ وہ ایسی عینک اُن کی آنکھوں پر چڑھاتے تھے کہ ہر طرف ان کو ہرا ہی ہرا نظر آتا تھا۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ آپ پر تنقید کرنے والے احمق ہیں، آپ کوئی نرالا کام تھوڑی کر رہے ہیں، دنیا میں ترقی کرنے والے وہی کچھ کرتے رہے ہیں جو آپ کر رہے ہیں، اور آگے اوّل تو کوئی آخرت ہے ہی نہیں جس میں آپ کو اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی پڑے، لیکن اگر وہ پیش آ ہی گئی، جیسا کہ چند نادان دعویٰ کرتے ہیں، تو جو خدا آپ کو یہاں

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ
تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ
اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲۷ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ
لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۲۸ وَ
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝۲۹

یہ منکرینِ حق کہتے ہیں: ”اِس قرآن کو ہرگز نہ سنو، اور جب یہ سُنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو، شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ۔“[30] اِن کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزا چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ اِنھیں دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اُسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہوگا۔ یہ ہے سزا اِس جُرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔ وہاں یہ کافر کہیں گے کہ ”اے ہمارے رب! ذرا ہمیں دکھا دے اُن جنّوں اور انسانوں کو جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، ہم انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے، تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں۔“[31]

نعمتوں سے نواز رہا ہے وہ وہاں بھی آپ پر انعام واکرام کی بارش کرے گا، دوزخ آپ کے لیے نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بنی ہے جنھیں یہاں خدا نے اپنی نعمتوں سے محروم کر رکھا ہے۔

۳۰ – یہ کفارِ مکہ کے اُن منصوبوں میں سے ایک تھا جس سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کو ناکام کرنا چاہتے تھے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اور اس کو سنانے والا کس پائے کا انسان ہے، اور اس شخصیت کے ساتھ اس کا طرزِ ادا کس درجہ موثّر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اِس دل کش انداز میں اس بے نظیر کلام کو جو سنے گا وہ آخرِ کار گھائل ہو کر رہے گا۔ اس لیے انھوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اس کلام کو نہ خود سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اسے سنانا شروع کریں، شور مچاؤ، تالی پیٹ دو، آوازے کسو، اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو، اور اتنی آواز بلند کرو کہ ان کی آواز اس کے مقابلے میں دب جائے۔ اس تدبیر سے وہ اُمید رکھتے تھے کہ اللہ کے نبی کو شکست

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ

جن لوگوں نے[۳۲] کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے[۳۳]، یقیناً اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں[۳۴] اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو، نہ غم کرو[۳۵]، اور خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے

دے دیں گے۔

۳۱ – یعنی دنیا میں تو یہ لوگ اپنے لیڈروں اور پیشواؤں اور فریب دینے والے شیاطین کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، مگر جب قیامت کے روز انھیں پتا چلے گا کہ یہ رہنما انھیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی لوگ انھیں کوسنے لگیں گے اور یہ چاہیں گے کہ وہ کسی طرح ان کے ہاتھ آ جائیں تو پکڑ کر انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں۔

۳۲ – یہاں تک کفار کو ان کی ہٹ دھرمی اور مخالفت حق کے نتائج پر مُتنبِّہ کرنے کے بعد اب اہلِ ایمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روئے سُخن مڑتا ہے۔

۳۳ – یعنی محض اتفاقاً کبھی اللہ کو اپنا رب کہہ کر نہیں رہ گئے، اور نہ اس غَلَطی میں مبتلا ہوئے کہ اللہ کو اپنا رب کہتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنا رب بناتے بھی جائیں، بلکہ ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اس پر قائم رہے، اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کیا، نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی، اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے۔

توحید پر استقامت کا مفہوم کیا ہے، اس کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ نے اس طرح کی ہے:

حضرت اَنسؓ کی رِوایت ہے کہ حضوؐر نے فرمایا: قد قالها الناس ثم کفر اکثرھم، فمن مات علیها فھو ممن استقام۔ "بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا، مگر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے۔ ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اسی عقیدے پر جما رہا۔" (ابنِ جَریر، نَسائی، ابنِ ابی حاتم)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: لم یشرکوا باللّٰہ شیئًا، لَم یَلتفتوا الی الٰهٍ غیرہ۔ "پھر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا، اس کے سوا کسی دوسرے معبُود کی طرف توجہ نہ کی۔" (ابنِ جَریر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا: "خدا کی قسم! استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے، لومڑیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے نہ پھرے۔" (ابنِ جَریر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کر لیا۔" (کَشّاف)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اللہ کے عائد کردہ فرائض فرماں برداری کے ساتھ ادا کرتے رہے۔" (کَشّاف)

تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ج

وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اِس دُنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی،

۳۴- فرشتوں کا یہ نُزول ضروری نہیں ہے کہ کسی محسوس صورت میں ہو اور اہلِ ایمان اُنھیں آنکھوں سے دیکھیں یا ان کی آواز کانوں سے سنیں۔ اگرچہ اللہ جَلَّ شانُہٗ جس کے لیے چاہے فرشتوں کو عَلانیَہ بھی بھیج دیتا ہے، لیکن بالعُموم اہلِ ایمان پر، خُصوصاً سخت وقتوں میں جب کہ دشمنانِ حق کے ہاتھوں وہ بہت تنگ ہو رہے ہوں، اُن کا نُزول غیر محسوس طریقے سے ہوتا ہے، اور اُن کی باتیں کان کے پردوں سے ٹکرانے کے بجائے دل کی گہرائیوں میں سکینت واطمینانِ قلب بن کر اُترتی ہیں۔ بعض مفسرین نے فرشتوں کے اِس نُزول کو موت کے وقت، یا قبر، یا میدانِ حشر کے لیے مخصوص سمجھا ہے۔ لیکن اگر اُن حالات پر غور کیا جائے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، تو اِس میں کچھ شک نہیں رہتا کہ یہاں اس معاملے کو بیان کرنے کا اصل مقصد اِس زندگی میں دینِ حق کی سربلندی کے لیے جانیں لڑانے والوں پر فرشتوں کے نزول کا ذکر کرنا ہے، تاکہ انھیں تسکین حاصل ہو، اور ان کی ہمت بندھے، اور ان کے دل اس احساس سے مطمئن ہو جائیں کہ وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے فرشتے ان کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ فرشتے موت کے وقت بھی اہلِ ایمان کا استقبال کرنے آتے ہیں، اور قبر (عالَمِ بَرزَخ) میں بھی وہ ان کی پذیرائی کرتے ہیں، اور جس روز قیامت قائم ہوگی اُس روز بھی ابتدائے حشر سے جنت میں پہنچنے تک وہ برابر اُن کے ساتھ لگے رہیں گے، لیکن اُن کی یہ معیّت اُسی عالَم کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اِس دنیا میں بھی وہ جاری ہے۔ سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں جس طرح باطل پرستوں کے ساتھی شیاطین و اَشرار ہوتے ہیں، اُسی طرح اہلِ ایمان کے ساتھی فرشتے ہوا کرتے ہیں۔ ایک طرف باطل پرستوں کو اُن کے ساتھی اُن کے کرتوت خوش نُما بنا کر دکھاتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ حق کو نیچا دکھانے کے لیے جو ظلم و ستم اور بے ایمانیاں تم کر رہے ہو، یہی تمھاری کامیابی کے ذرائع ہیں اور انھی سے دنیا میں تمھاری سرداری محفوظ رہے گی۔ دوسری طرف حق پرستوں کے پاس اللہ کے فرشتے آ کر وہ پیغام دیتے ہیں جو آگے کے فقروں میں ارشاد ہو رہا ہے۔

۳۵- یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جو دنیا سے لے کر آخرت تک ہر مرحلے میں اہلِ ایمان کے لیے تسکین کا ایک نیا مضمون اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اِس دنیا میں فرشتوں کی اس تلقین کا مطلب یہ ہے کہ باطل کی طاقتیں خواہ کتنی ہی بالادست اور چیرہ دست ہوں، اُن سے ہرگز خوف زدہ نہ ہو، اور حق پرستی کی وجہ سے جو تکلیفیں اور محرومیاں بھی تمھیں سہنی پڑیں، ان پر کوئی رنج نہ کرو، کیونکہ آگے تمھارے لیے وہ کچھ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے۔ یہی کلمات جب موت کے وقت فرشتے کہتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو وہاں تمھارے لیے کسی خوف کا مقام نہیں ہے، کیونکہ وہاں جنت تمھاری منتظر ہے، اور دنیا میں جن کو تم چھوڑ کر جا رہے ہو اُن کے لیے تمھیں رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہاں ہم تمھارے ولی و رفیق ہیں۔ عالَمِ برزخ اور میدانِ حشر میں جب فرشتے یہی کلمات کہیں گے تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ یہاں تمھارے لیے چین ہی چین ہے، دنیا کی زندگی میں جو حالات تم پر گزرے ان کا غم نہ کرو، اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾
نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَآ
إِلَى ٱللَّهِ وَعَمِلَ صَٰلِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ ﴿٣٣﴾ وَلَا
تَسْتَوِي ٱلْحَسَنَةُ وَلَا ٱلسَّيِّئَةُ ۚ ٱدْفَعْ بِٱلَّتِي هِيَ أَحْسَنُ
فَإِذَا ٱلَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُۥ عَدَٰوَةٌ كَأَنَّهُۥ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾

ع ۴/۱۸

وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمھیں ملے گا، اور ہر چیز جس کی تم تمنّا کرو گے وہ تمھاری ہوگی، یہ ہے سامانِ ضیافت اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔" ع

اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔[۳۶]

اور اَے نبیؐ! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔[۳۷] یہ صفت

والا ہے اس کا خوف نہ کھاؤ، اس لیے کہ ہم تمھیں اُس جنت کی بشارت دے رہے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

۳۶- اہلِ ایمان کو تسکین دینے اور ان کی ہمت بندھانے کے بعد اب اُن کو اُن کے اصل کام کی طرف رغبت دلائی جارہی ہے۔ گزشتہ آیت میں اُن کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اِس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اُس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنّت کا مستحق بناتی ہے۔ اب ان کو بتایا جارہا ہے کہ آگے کا درجہ، جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان واظہار کرنا اپنے اُوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ مَیں مسلمان ہوں۔ اِس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا، اُسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے، جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی، اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ اِن حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اُس سے نہ ہٹنا بلا شبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن

کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خَلقِ خدا کو دعوت دے، اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے عَلَم برداروں پر حرف رکھنے کی گنجایش نہ ملے۔

۳۷۔ اس ارشاد کی پوری معنویت سمجھنے کے لیے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہییں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپؐ کے واسطے سے آپؐ کے پیروؤں کو، یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ دعوتِ حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا، جس میں اَخلاق، انسانیت اور شرافت کی ساری حدیں توڑ ڈالی گئی تھیں۔ ہر جھوٹ حضوؐر اور آپؐ کے ساتھیوں کے خلاف بولا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپؐ کو بدنام کرنے اور آپؐ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپؐ پر چسپاں کیے جا رہے تھے، اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپؐ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، جن سے تنگ آ کر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبُور ہو گئی تھی۔ پھر آپؐ کی تبلیغ کو روک دینے کے لیے پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ ہُلّڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپؐ کی تاک میں لگا رہے، اور جب آپؐ دعوتِ حق کے لیے زبان کھولیں، اتنا شور برپا کر دیا جائے کہ کوئی آپؐ کی بات نہ سن سکے۔ یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ اُس وقت مخالفتوں کے توڑنے کا یہ نسخہ حضوؐر کو بتایا گیا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ یعنی بظاہر تمھارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اُٹھا لائے ہوں، جس کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر کمزوری رکھتی ہے جو آخرِ کار اس کا بھٹا بٹھا دیتی ہے۔ کیونکہ انسان جب تک انسان ہے، اُس کی فطرت بدی سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بدی کے ساتھی ہی نہیں، خود اُس کے عَلَم بردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لیے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے دلوں میں اُن کا وَقار پیدا کرنا تو درکنار، انھیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور اُن کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے، جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے۔ اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے، مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخرِ کار وہ غالب آ کر رہتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو نیکی میں بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مُسخَّر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اپنے دل میں اس کی قدر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروفِ پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، ایسی حالت میں تو ایک مدّت کی کش مکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اُس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمھارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو تو یہ محض نیکی ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بُرا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوۡحَظٍّ
عَظِيۡمٍ ﴿۳۵﴾ وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ

نصیب نہیں ہوتی مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں[۳۸]، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں[۳۹]۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو،[۴۰]

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخرِ کار جگری دوست بن جائے گا۔ اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں تو بے شک یہ ایک نیکی ہوگی، مگر گالی دینے والے کی زبان بند نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا، اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لیے کھل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا ہو اور آپ اس کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جائیں، تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے۔ لیکن اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو اور آپ اسے بچالیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا، کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ تاہم اس قاعدۂ کُلِیّہ کو اس معنیٰ میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دنیا میں ایسے خبیث النفس لوگ بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور ان کی بُرائی کا جواب احسان اور بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے نیشِ عَقرَب کا زہریلا پن ذرّہ برابر بھی کم نہیں ہوتا۔ لیکن اس طرح کے شرِّ مجسّم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسّم انسان کم یاب ہیں۔

۳۸- یعنی یہ نسخہ ہے تو بڑا کارگر، مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔ اس کے لیے بڑا عزم، بڑا حوصلہ، بڑی قوتِ برداشت، اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جہاں کسی شخص کو سال ہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاند جانے میں تأمّل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں، وہاں بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا، اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا، کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح سے اپنے نفس کو عقل و شُعور کے تابع کر لیا ہو، اور جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اُسے اُس کے مَقامِ بلند سے نیچے اُتار لانے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔

۳۹- یہ قانونِ فطرت ہے۔ بڑے ہی بلند مرتبے کا انسان اِن صفات سے مُتَّصِف ہوا کرتا ہے، اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو، اُسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ گھٹیا درجے کے

لوگ اپنی کمینہ چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں اور رکیک حرکتوں سے اُس کو شکست دے دیں۔

۴۰ – شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ، اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی، حق کے لیے لڑنے والوں، اور خُصوصاً اُن کے سربرآوردہ لوگوں، اور سب سے بڑھ کر اُن کے رہنما سے کوئی ایسی غَلَطی کرا دے جس کی بنا پر عامۃُ النّاس سے یہ کہا جا سکے کہ دیکھیے صاحب! بُرائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی کچھ بہت اُونچے درجے کے انسان نہیں ہیں، فُلاں رکیک حرکت تو آخر انھوں نے بھی کی ہے۔ عامۃ النّاس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیوں اور دوسری طرف کی جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں۔ وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالفین ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی و راست بازی کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اُس وقت تک وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں ان کی طرف سے کوئی بے جا حرکت، یا ان کے مرتبے سے گری ہوئی حرکت سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بڑی زیادتی کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، تو اُن کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب ہزار گالیوں سے دینے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنّے رہو۔ وہ بڑا دردمند و خیرخواہ بن کر تمھیں اشتعال دلائے گا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیے، اور فلاں بات کا تو منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے، اور اِس حملے کے جواب میں تو لڑ جانا چاہیے، ورنہ تمھیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ایسے ہر موقع پر جب تمھیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو خبردار ہو جاؤ کہ یہ شیطان کی اُکساہٹ ہے جو غصہ دلا کر تم سے کوئی غَلَطی کرانا چاہتا ہے۔ اور خبردار ہو جانے کے بعد اس زُعم میں نہ مبتلا ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غَلَطی نہیں کرا سکتا۔ یہ اپنی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا زُعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ خطرناک فریب ہوگا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مَقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمدؒ نے اپنی مُسنَد میں حضرت ابوہُرَیرہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ خاموشی کے ساتھ اس کی گالیاں سنتے رہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھ کر مسکراتے رہے۔ آخرکار جنابِ صِدّیقؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے بھی جواب میں اسے ایک سخت بات کہہ دی۔ اُن کی زبان سے وہ بات نکلتے ہی حضوؐر پر شدید اِنقباض طاری ہوا جو چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگا اور آپؐ فوراً اُٹھ کر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی اُٹھ کر آپؐ کے پیچھے ہو لیے اور راستے میں عرض کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، وہ مجھے گالیاں دیتا رہا اور آپؐ خاموش مسکراتے رہے، مگر جب میں نے اسے جواب دیا تو آپؐ ناراض ہو گئے؟ فرمایا: ”جب تک تم خاموش تھے، ایک فرشتہ تمھارے ساتھ رہا اور تمھاری طرف سے اس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آ گیا۔ میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔“

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۶﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَ النَّهَارُ
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ
وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾

وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔[۴۱]

اللہ[۴۲] کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔[۴۳] سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، بلکہ اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے، اگر فی الواقع تم اُسی کی عبادت کرنے والے ہو۔[۴۴]

---

۴۱ — مخالفتوں کے طوفان میں اللہ کی پناہ مانگ لینے کے بعد جو چیز مومن کے دل میں صبر و سُکون اور اطمینان کی ٹھنڈک پیدا کرتی ہے، وہ یہی یقین ہے کہ اللہ بے خبر نہیں ہے۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسے بھی وہ جانتا ہے، اور جو کچھ ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ ہماری اور ہمارے مخالفین کی ساری باتیں وہ سُن رہا ہے، اور دونوں کا طرزِ عمل جیسا کچھ بھی ہے اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ اسی اعتماد پر بندۂ مومن اپنا اور دشمنانِ حق کا معاملہ اللہ کے سُپرد کر کے پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

یہ پانچواں موقع ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطے سے اہلِ ایمان کو دعوتِ دین اور اصلاحِ خلق کی یہ حکمت سکھائی گئی ہے۔ اس سے پہلے کے چار مقامات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاَعراف، حواشی ۱۴۹ تا ۱۵۳، النحل، ۱۲۲ – ۱۲۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۸۹ – ۹۰، العنکبوت، حواشی ۸۱ – ۸۲۔

۴۲ — اب رُوئے سُخن عوام الناس کی طرف مڑ رہا ہے اور چند فقرے ان کو حقیقت سمجھانے کے لیے ارشاد ہو رہے ہیں۔

۴۳ — یعنی یہ اللہ کے مظاہر نہیں ہیں کہ تم یہ سمجھتے ہوئے ان کی عبادت کرنے لگو کہ اللہ ان کی شکل میں خود اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے، بلکہ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں، جن پر غور کرنے سے تم کائنات کی اور اس کے نظام کی حقیقت سمجھ سکتے ہو اور یہ جان سکتے ہو کہ انبیا علیہم السلام جس توحیدِ خداوندی کی تعلیم دے رہے ہیں وہی امرِ واقعی ہے۔ سورج اور چاند سے پہلے رات اور دن کا ذکر اِس اَمر پر مُتنَبِّہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ رات کو سورج کا چھُپنا اور چاند کا نکل آنا، اور دن کو چاند کا چھُپنا اور سورج کا نمودار ہو جانا صاف طور پر یہ دلالت کر رہا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی خدا یا خدا کا مظہر نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی مجبور و لاچار بندے ہیں جو خدا کے قانون میں بندھے ہوئے گردش کر رہے ہیں۔

۴۴ — یہ جواب ہے اُس فلسفے کا جو شرک کو معقول ثابت کرنے کے لیے کچھ زیادہ ذہین قسم کے مشرکین عُموماً بگھارا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اِن چیزوں کو سجدہ نہیں کرتے، بلکہ ان کے واسطے سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس کا جواب

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ ۩ ۳۸ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ
خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ
الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۳۹

السجدۃ ۱۱

لیکن اگر یہ لوگ غُرور میں آ کر اپنی ہی بات پر اَڑے رہیں[۴۵] تو پروا نہیں ، جو فرشتے تیرے رب کے مقرّب ہیں، وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے۔[۴۶] س

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سُونی پڑی ہوئی ہے، پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکایک وہ پھبک اُٹھتی ہے اور پُھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جِلا اُٹھاتا ہے، وہ مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔[۴۷] یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ دیا گیا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ ہی کے عبادت گزار ہو تو ان واسطوں کی کیا ضرورت ہے، براہِ راست خود اُسی کو سجدہ کیوں نہیں کرتے۔

۴۵ – ’’غُرور میں آ کر‘‘ سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ تمھاری بات مان لینے میں اپنی ذلّت سمجھ کر اُسی جہالت پر اصرار کیے چلے جائیں جس میں یہ مبتلا ہیں۔

۴۶ – مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام، جو اِن فرشتوں کے ذریعے سے چل رہا ہے، اللہ کی توحید اور اسی کی بندگی میں رَواں دواں ہے، اور اس نظام کے منتظم فرشتے ہر آن یہ شہادت دے رہے ہیں کہ اُن کا رب اِس سے پاک اور مُنزَّہ ہے کہ کوئی خداوندی اور معبُودیّت میں اس کا شریک ہو۔ اب اگر چند احمق سمجھانے پر نہیں مانتے اور ساری کائنات جس راستے پر چل رہی ہے اُس سے منہ موڑ کر شرک ہی کی راہ چلنے پر اصرار کیے جاتے ہیں، تو پڑا رہنے دو ان کو اپنی اس حماقت میں۔

اس مقام کے متعلق یہ اَمر تو مُتَّفَق عَلَیہ ہے کہ یہاں سجدہ لازم آتا ہے، مگر اس اَمر میں فُقہا کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے کہ اوپر کی دونوں آیتوں میں سے کس پر سجدہ کرنا چاہیے۔ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ پر سجدہ کرتے تھے۔ اسی قول کو امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے، اور ایک قول امام شافعیؒ سے بھی اسی کی تائید میں منقول ہے۔ لیکن حضرات ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ، سعید بن المُسَیّبؒ، مَسْرُوقؒ، قَتادہؒ، حَسَن بصریؒ، ابوعبدالرحمن السُّلَمیؒ، ابنِ سِیرِینؒ، ابراہیم نَخَعیؒ اور متعدّد دوسرے اکابر وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ پر سجدے کے قائل ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی ہے اور شافعیوں کے ہاں بھی مُرَجّح قول یہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ؕ
اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِى النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾ ۙ

جو لوگ[۴۸] ہماری آیات کو اُلٹے معنی پہناتے ہیں،[۴۹] وہ ہم سے کچھ چُھپے ہوئے نہیں ہیں[۵۰]۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے، یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو، تمھاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلامِ نصیحت آیا تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے،[۵۱]

۴۷ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۵۳۔ جلد سوم، الحج، حواشی ۸-۹، الروم، حاشیہ ۲۸۔ جلد چہارم، فاطر، حاشیہ ۱۹۔

۴۸ – عوام الناس کو چند فقروں میں یہ سمجھانے کے بعد کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس توحید اور آخرت کے عقیدے کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہی معقول ہے اور آثارِ کائنات اسی کے حق ہونے کی شہادت دے رہے ہیں، اب رُوئے سُخن پھر اُن مخالفین کی طرف مڑتا ہے جو پوری ہٹ دھرمی کے ساتھ مخالفت پر تُلے ہوئے تھے۔

۴۹ – اصل الفاظ ہیں: يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا (ہماری آیات میں اِلحاد کرتے ہیں۔) اِلحاد کے معنی ہیں: اِنحراف، سیدھی راہ سے ٹیڑھی راہ کی طرف مڑ جانا، کج روی اختیار کرنا۔ اللہ کی آیات میں اِلحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرے۔ آیاتِ الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے، باقی ہر طرح کے غلط معنی اُن کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہے۔ کفارِ مکہ قرآنِ مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے جو چالیں چل رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کی آیات کو سُن کر جاتے اور پھر کسی آیت کو سیاق وسباق سے کاٹ کر، کسی آیت میں لفظی تحریف کر کے، کسی فقرے یا لفظ کو غلط معنی پہنا کر طرح طرح کے اعتراضات جڑتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے کہ لو سنو! آج ان نبی صاحب نے کیا کہہ دیا ہے۔

۵۰ – ان الفاظ میں ایک سخت دھمکی مضمر ہے۔ حاکمِ ذی اقتدار کا یہ کہنا کہ فلاں شخص جو حرکتیں کر رہا ہے وہ مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں، آپ سے آپ یہ معنی اپنے اندر رکھتا ہے کہ وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔

۵۱ – یعنی اَٹل ہے۔ اِس کو اُن چالوں سے شکست نہیں دی جا سکتی جو باطل پرست لوگ اِس کے خلاف چل رہے

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ
حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ
قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَ لَوْ
جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْ لَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ

باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے[۵۲]، یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے۔

اَے نبیؐ! تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں سے نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمھارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے[۵۳]، اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔

اگر ہم اِس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے: ”کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟

ہیں۔ اس میں صداقت کا زور ہے، علمِ حق کا زور ہے، دلیل و حُجّت کا زور ہے، زبان اور بیان کا زور ہے، بھیجنے والے خدا کی خدائی کا زور ہے، اور پیش کرنے والے رسول کی شخصیّت کا زور ہے۔ جھوٹ اور کھوکھلے پروپیگنڈے کے ہتھیاروں سے کوئی اِسے زَک دینا چاہے تو کیسے دے سکتا ہے۔

۵۲ — سامنے سے نہ آ سکنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کر کے اگر کوئی شخص اُس کی کسی بات کو غلط اور کسی تعلیم کو باطل و فاسد ثابت کرنا چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیچھے سے نہ آ سکنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کوئی حقیقت و صداقت ایسی منکشف نہیں ہو سکتی جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے خلاف ہو، کوئی علم ایسا نہیں آ سکتا جو فی الواقع ”علم“ ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجرِبہ اور مُشاہَدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کر دے کہ قرآن نے عقائد، اَخلاق، قانون، تہذیب و تمدُّن، معیشت و معاشرت اور سیاستِ مُدُن کے باب میں انسان کو جو رہنمائی دی ہے وہ غلط ہے۔ اس کتاب نے جس چیز کو حق کہہ دیا ہے وہ کبھی باطل ثابت نہیں ہو سکتی، اور جسے باطل کہہ دیا ہے وہ کبھی حق ثابت نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ باطل خواہ سامنے سے آ کر حملہ آور ہو یا ہیر پھیر کے راستوں سے چھاپے مارے، بہر حال کسی طرح بھی وہ اُس دعوت کو شکست نہیں دے سکتا جسے لے کر قرآن آیا ہے۔ تمام مخالفتوں اور مخالفین کی ساری خُفیہ اور عَلانِیَہ چالوں کے عَلَی الرَّغم یہ دعوت پھیل کر رہے گی اور کوئی اسے زَک نہیں دے سکے گا۔

۵۳ — یعنی یہ اُس کا حِلم اور عَفو و درگزر ہی ہے کہ اس کے رسولوں کو جھٹلایا گیا، گالیاں دی گئیں، اذیتیں پہنچائی گئیں، اور پھر بھی وہ سال ہا سال تک مخالفین کو مہلت دیتا چلا گیا۔

قرء حفص بتسهيل الهمزة الثانية ١٢

ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ
يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿٤٤﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ
فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ

کیا عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی۔[۵۴] ‘‘ اِن سے کہو: یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹّی ہے۔ اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے اُن کو دُور سے پکارا جا رہا[۵۵] ہو۔ع اِس سے پہلے ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف[۵۶] ہوا تھا۔ اگر تیرے رب نے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر دی ہوتی تو اِن اختلاف کرنے والوں کے

۵۴ – یہ اُس ہٹ دھرمی کا ایک اور نمونہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب ہیں، عَرَبی ان کی مادری زبان ہے، وہ اگر عَرَبی میں قرآن پیش کرتے ہیں تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کلام انھوں نے خود نہیں گھڑ لیا ہے بلکہ ان پر خدا نے نازل کیا ہے۔ ان کے اِس کلام کو خدا کا نازل کیا ہوا کلام تو اس وقت مانا جا سکتا تھا جب یہ کسی ایسی زبان میں یکایک دھواں دھار تقریر کرنا شروع کر دیتے جسے یہ نہیں جانتے، مثلاً فارسی یا رومی یا یونانی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب ان کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا گیا ہے، جسے یہ سمجھ سکیں تو ان کو یہ اعتراض ہے کہ عرب کے ذریعے سے عربوں کے لیے عربی زبان میں یہ کلام کیوں نازل کیا گیا۔ لیکن اگر کسی دوسری زبان میں یہ بھیجا جاتا تو اُس وقت یہی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ معاملہ بھی خوب ہے۔ عرب قوم میں ایک عرب کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مگر کلام اُس پر ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے نہ رسول سمجھتا ہے نہ قوم۔

۵۵ – دُور سے جب کسی کو پکارا جاتا ہے تو اس کے کان میں ایک آواز تو پڑتی ہے مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ایسی بے نظیر تشبیہ ہے جس سے ہٹ دھرم مخالفین کے نفسیات کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ فطری بات ہے کہ جو شخص کسی تعصّب میں مبتلا نہیں ہوتا اُس سے اگر آپ گفتگو کریں تو وہ اسے سنتا ہے، سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اور معقول بات ہوتی ہے تو کھُلے دل سے اس کو قبول کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آپ کے خلاف نہ صرف تعصب بلکہ عناد اور بغض رکھتا ہو، اس کو آپ اپنی بات سمجھانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ سرے سے اُس کی طرف توجہ ہی نہ کرے گا۔ آپ کی ساری بات سُن کر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے گا کہ آپ اتنی دیر تک کیا کہتے رہے ہیں۔ اور آپ کو بھی یوں محسوس ہو گا کہ جیسے آپ کی آواز اس کے کان کے پردوں سے اُچٹ کر باہر ہی باہر گزر رہی ہے، دل اور دماغ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں پا سکی۔

۵۶ – یعنی کچھ لوگوں نے اسے مانا تھا اور کچھ مخالفت پر تُل گئے تھے۔

بَيۡنَهُمۡ ؕ وَاِنَّهُمۡ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ ﴿۴۵﴾ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا
فَلِنَفۡسِهٖ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۴۶﴾

درمیان فیصلہ چُکا دیا جاتا۔[57] اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس کی طرف سے سخت اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔[58]

جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا، جو بدی کرے گا اس کا وبال اُسی پر ہوگا، اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔[59]

۵۷ – اس ارشاد کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ طے نہ کر دیا ہوتا کہ لوگوں کو سوچنے سمجھنے کے لیے کافی مُہلت دی جائے گی تو اس طرح کی مخالفت کرنے والوں کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ دوسرا مفہُوم یہ ہے کہ اگر اللہ نے پہلے ہی یہ طے نہ کر لیا ہوتا کہ اختلافات کا آخری فیصلہ قیامت کے روز کیا جائے گا تو دنیا ہی میں حقیقت کو بے نقاب کر دیا جاتا اور یہ بات کھول دی جاتی کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔

۵۸ – اس مختصر سے فقرے میں کفارِ مکہ کے مَرض کی پوری تشخیص کر دی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، اور اس شک نے ان کو سخت خَلجان و اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو وہ بڑے زور شور سے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا انکار کرتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کا یہ انکار کسی یقین کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ ان کے دلوں میں شدید تذبذب برپا ہے۔ ایک طرف ان کے ذاتی مفاد، ان کے نفس کی خواہشات، اور ان کے جاہلانہ تعصُّبات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلائیں اور پوری طاقت کے ساتھ ان کی مخالفت کریں۔ دوسری طرف ان کے دل اندر سے پکارتے ہیں کہ یہ قرآن فی الواقع ایک بے مثل کلام ہے، جس کے مانند کوئی کلام کسی ادیب یا شاعر سے کبھی نہیں سنا گیا ہے، نہ کوئی مجنون دیوانگی کے عالَم میں ایسی باتیں کر سکتا ہے، نہ کبھی شیاطین اس غرض کے لیے آ سکتے ہیں کہ لوگوں کو خدا پرستی اور نیکی و پاکیزگی کی تعلیم دیں۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وہ جھوٹا کہتے ہیں تو ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ خدا کے بندو! کچھ شرم کرو، کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟ جب وہ ان کو مجنون کہتے ہیں تو ان کا دل اندر سے پکارتا ہے کہ ظالمو! کیا واقعی تم اس شخص کو دیوانہ سمجھتے ہو؟ جب وہ ان پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ حق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی بڑائی کے لیے کر رہے ہیں، تو ان کا دل اندر سے ملامت کرتا ہے کہ لعنت ہے تم پر، اِس نیک نفس انسان کو بندۂ غرض کہتے ہو جسے کبھی تم نے دولت اور اقتدار اور نام و نمود کے لیے دوڑ دھوپ کرتے نہیں دیکھا ہے، جس کی ساری زندگی مفاد پرستی کے ہر شائبے سے پاک رہی ہے، جس نے ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے لیے کام کیا ہے، مگر کبھی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے کوئی بے جا کام نہیں کیا۔

الجزء ۲۵

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۭ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ
اَكْمَامِهَا وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ
وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ

اُس ساعت[۶۰] کا علم اللہ ہی کی طرف راجع ہوتا ہے[۶۱]، وہی اُن سارے پھلوں کو جانتا ہے جو اپنے شگوفوں میں سے نکلتے ہیں، اسی کو معلوم ہے کہ کون سی مادہ حاملہ ہوئی ہے اور کس نے بچہ جنا ہے[۶۲]۔ پھر جس روز وہ اِن لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے: ''ہم عرض کر چکے ہیں، آج ہم میں سے کوئی اِس کی گواہی

۵۹ – یعنی تیرا رب کبھی یہ ظلم نہیں کر سکتا کہ نیک انسان کی نیکی ضائع کر دے اور بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کا بدلہ نہ دے۔

۶۰ – اُس ساعت سے مراد قیامت ہے، یعنی وہ گھڑی جب بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کا بدلہ دیا جائے گا اور اُن نیک انسانوں کی دادرسی کی جائے گی جن کے ساتھ بدی کی گئی ہے۔

۶۱ – یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ گھڑی کب آئے گی۔ یہ جواب ہے کفار کے اِس سوال کا کہ ہم پر بدی کا وبال پڑنے کی جو دھمکی دی جا رہی ہے وہ آخر کب پوری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سوال کو نقل کیے بغیر اُس کا جواب دیا ہے۔

۶۲ – اس ارشاد سے سامعین کو دو باتوں کا احساس دلایا گیا ہے: ایک، یہ کہ صرف ایک قیامت ہی نہیں بلکہ تمام اُمورِ غیب کا علم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے، کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جو خدا جزئیات کا اتنا تفصیلی علم رکھتا ہے اُس کی نگاہ سے کسی شخص کے اعمال و افعال کا چُوک جانا ممکن نہیں ہے، لہٰذا کسی کو بھی اُس کی خدائی میں بے خوف ہو کر من مانی نہیں کرنی چاہیے۔ اِسی دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے اس فقرے کا تعلق بعد کے فقروں سے جُڑتا ہے۔ اِس ارشاد کے معاً بعد جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس پر غور کیجیے تو ترتیبِ کلام سے خود بخود یہ مضمون مُترشّح ہوتا نظر آئے گا کہ قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنے کی فکر میں کہاں پڑے ہو، فکر اِس بات کی کرو کہ جب وہ آئے گی تو اپنی اِن گمراہیوں کا تمھیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہی بات ہے جو ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی تاریخ پوچھنے والے ایک شخص سے فرمائی تھی۔ صحاح اور سُنَن اور مَسانید میں حدِّ تواتر کو پہنچی ہوئی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضوؐر سفر میں کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک شخص نے دُور سے پکارا: ''یا محمدؐ!'' آپؐ نے فرمایا: ''بولو کیا کہنا ہے؟'' اس نے کہا: ''قیامت کب آئے گی؟'' آپؐ نے جواب دیا: ویحك انها كائنة لامحالة فما اعددت لها؟ ''بندۂ خدا! وہ تو بہر حال آنی ہی ہے۔ تُو نے اس کے لیے کیا تیاری کی؟''

شَهِيۡدٍ ۚ﴿۴۷﴾ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَظَنُّوۡا مَا لَهُمۡ مِّنۡ
مَّحِيۡصٍ ﴿۴۸﴾ لَا يَسۡـَٔمُ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ دُعَآءِ الۡخَيۡرِ ۖ وَاِنۡ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوۡسٌ
قَنُوۡطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنَّا مِنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَيَقُوۡلَنَّ
هٰذَا لِىۡ ۙ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ رُّجِعۡتُ اِلٰى رَبِّىۡۤ اِنَّ لِىۡ
عِنۡدَهٗ لَلۡحُسۡنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِمَا عَمِلُوۡا ۖ وَلَنُذِيۡقَنَّهُمۡ

دینے والا نہیں ہے۔[۶۳] "اُس وقت وہ سارے معبود اِن سے گم ہو جائیں گے جنھیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے،[۶۴] اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ اِن کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا،[۶۵] اور جب کوئی آفت اِس پر آجاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے، مگر جوں ہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اِسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں، یہ کہتا ہے کہ "میں اِسی کا مستحق ہوں،[۶۶] اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی، لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا۔" حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں، اور انھیں ہم

۶۳ – یعنی اب ہم پر حقیقت کھل چکی ہے اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ جو کچھ ہم سمجھے بیٹھے تھے وہ سراسر غلط تھا۔ اب ہمارے درمیان کوئی ایک شخص بھی اِس بات کا قائل نہیں ہے کہ خدائی میں کوئی دوسرا بھی آپ کا شریک ہے۔ "ہم عرض کر چکے ہیں" کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت کے روز بار بار ہر مرحلے میں کفار سے کہا جائے گا کہ دنیا میں تم خدا کے رسولوں کا کہا ماننے سے انکار کرتے رہے، اب بولو حق پر وہ تھے یا تم؟ اور ہر موقع پر کفار اس بات کا اعتراف کرتے چلے جائیں گے کہ واقعی حق وہی تھا جو انھوں نے بتایا تھا، اور غلطی ہماری تھی کہ اُس علم کو چھوڑ کر اپنی جہالتوں پر اصرار کرتے رہے۔

۶۴ – یعنی مایوسی کے عالَم میں یہ لوگ ہر طرف نظر دوڑائیں گے کہ عمر بھر جن کی سیوا کرتے رہے، شاید اُن میں سے کوئی مدد کو آئے اور ہمیں خدا کے عذاب سے چھڑا لے، یا کم از کم ہماری سزا ہی کم کرا دے، مگر کسی طرف کوئی مددگار بھی ان کو نظر نہ آئے گا۔

۶۵ – بھلائی سے مراد ہے خوشحالی، کشادہ رزق، تندرستی، بال بچوں کی خیر وغیرہ۔ اور انسان سے مراد یہاں نوعِ انسانی کا ہر فرد نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو انبیا اور صلحا بھی آجاتے ہیں، جو اس صفت سے مُبرّا ہیں جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ بلکہ اس مقام پر

مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ﴿۵۰﴾ وَاِذَاۤ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ
وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ‌ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ ﴿۵۱﴾ قُلۡ
اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرۡتُمۡ بِهٖ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ
هُوَ فِىۡ شِقَاقٍ بَعِيۡدٍ ﴿۵۲﴾ سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى

بڑے گندے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے[۶۷]۔ اور جب اسے کوئی آفت چھُو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے[۶۸]۔

اے نبیؐ! اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور تم اِس کا انکار کرتے رہے، تو اُس شخص سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہوگا جو اس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو[۶۹]؟

عنقریب ہم اِن کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک

وہ چھچھورا اور کم ظرف انسان مراد ہے جو بُرا وقت آنے پر گڑگڑانے لگتا ہے، اور دنیا کا عیش پاتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ چونکہ نوعِ انسانی کی اکثریت اِسی کمزوری میں مبتلا ہے، اس لیے اسے انسان کی کمزوری قرار دیا گیا ہے۔

۶۶ – یعنی یہ سب کچھ مجھے اپنی اہلیّت کی بنا پر ملا ہے اور میرا حق یہی ہے کہ میں یہ کچھ پاؤں۔

۶۷ – یعنی ہماری اطاعت و بندگی سے منہ موڑتا ہے اور ہمارے آگے جھکنے کو اپنی توہین سمجھنے لگتا ہے۔

۶۸ – اس مضمون کی متعدّد آیات اس سے پہلے قرآنِ مجید میں گزر چکی ہیں۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۵، ہود، حاشیہ ۱۰، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔ جلد سوم، الروم، حواشی ۵۲ تا ۵۶۔ جلد چہارم، الزُّمَر، آیات ۸-۹-۴۹۔

۶۹ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض اس خطرے کی بنا پر ایمان لے آؤ کہ اگر کہیں یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا تو انکار کر کے ہماری شامت نہ آ جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سرسری طور پر بے سوچے سمجھے تم انکار کر رہے ہو، اور بات کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہو، اور خواہ مخواہ کی ضد میں آ کر مخالفت پر تُل گئے ہو، یہ کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہے۔ تم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ تمھیں اس قرآن کے خدا کی طرف سے نہ ہونے کا علم ہو گیا ہے اور تم یقین کے ساتھ

يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

کہ اِن پر یہ بات کُھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا

یہ جان چکے ہو کہ خدا نے اِسے نہیں بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے کلامِ الٰہی ماننے سے تمھارا انکار علم کی بنا پر نہیں بلکہ گمان کی بنا پر ہے، جس کا صحیح ہونا اگر بادیُ النظر میں ممکن ہے تو غلط ہونا بھی ممکن ہے۔ اب ذرا ان دونوں قسم کے امکانات کا جائزہ لے کر دیکھ لو۔ تمھارا گمان فرض کرو کہ صحیح نکلا تو تمھارے اپنے خیال کے مطابق زیادہ سے زیادہ بس یہی ہوگا کہ ماننے والے اور نہ ماننے والے، دونوں یکساں رہیں گے، کیونکہ دونوں ہی کو مر کر مٹی میں مل جانا ہے، اور آگے کوئی زندگی نہیں ہے جس میں کفر و ایمان کے کچھ نتائج نکلنے والے ہوں۔ لیکن اگر فی الواقع یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور وہ سب کچھ پیش آ گیا جس کی یہ خبر دے رہا ہے، پھر بتاؤ کہ اس کا انکار کر کے اور اس کی مُخالفت میں اتنی دُور جا کر تم کس انجام سے دوچار ہوگے؟ اس لیے تمھارا اپنا مفاد یہ تقاضا کرتا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ اس قرآن پر غور کرو۔ اور غور کرنے کے بعد بھی تم ایمان نہ لانے ہی کا فیصلہ کرتے ہو تو نہ لاؤ، مگر مخالفت پر کمر بستہ ہو کر اس حد تک آگے تو نہ بڑھ جاؤ کہ جھوٹ اور مکر و تَلبیس اور ظلم و ستم کے ہتھیار اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے استعمال کرنے لگو، اور خود ایمان نہ لانے پر اکتفا نہ کر کے دوسروں کو بھی ایمان لانے سے روکتے پھرو۔

۷۰ — اس آیت کے دو مفہُوم ہیں اور دونوں ہی اکابر مفسرین نے بیان کیے ہیں:

ایک مفہُوم یہ ہے کہ عنقریب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے مَمالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اُس کے آگے سرنگوں ہیں۔ اُس وقت اِنھیں پتا چل جائے گا کہ جو کچھ آج اِن سے کہا جا رہا ہے اور یہ مان کر نہیں دے رہے ہیں، وہ سراسر حق تھا۔ بعض لوگوں نے اس مفہُوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آ جانا اور بڑے بڑے علاقے فتح کر لینا تو اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیرو بھی ملک پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو پورے معاملے پر غور کیے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے دَور میں جو حیرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں، وہ محض اس معنیٰ میں اللہ کی نشانیاں نہ تھیں کہ اہلِ ایمان ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے، بلکہ اس معنیٰ میں تھیں کہ یہ فتحِ مَمالک دنیا کی دوسری فتوحات کی طرح نہیں تھی جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کا مالک بنا دیتی ہیں اور خدا کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے جِلَو میں ایک عظیم الشان مذہبی، اَخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدّنی و مَعاشی انقلاب لے کر آئی تھی، جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے، انسان کے بہترین جوہر کھلتے چلے گئے اور بدترین اوصاف دبتے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدنیا درویشوں اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے اندر ہی دیکھنے کی امید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کاروبارِ دنیا چلانے والوں میں بھی وہ پائے جا سکتے ہیں، اس انقلاب نے وہ فضائلِ اخلاق فرماں رواؤں کی سیاست میں، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی عدالت میں، فوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فتوحات میں، ٹیکس وصول کرنے والوں کی تحصیل داری میں، اور بڑے بڑے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ معاشرے میں عام انسانوں کو اَخلاق اور کردار اور طہارت و نظافت کے اعتبار سے اتنا اونچا اُٹھایا کہ دوسرے

معاشروں کے چیدہ لوگ بھی ان کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اُس نے اَوہام و خُرافات کے چکّر سے نکال کر انسان کو علمی تحقیق اور معقول طرزِ فکر و عمل کی صاف شاہراہ پر ڈال دیا۔ اُس نے اجتماعی زندگی کے اُن امراض کا علاج کیا جن کے علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے، یا اگر انھوں نے اس کی فکر کی بھی تو ان امراض کے علاج میں کامیاب نہ ہو سکے، مثلاً رنگ و نسل اور وطن و زبان کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق، ایک ہی معاشرے میں طبقات کی تقسیم اور ان کے درمیان اُونچ نیچ کا امتیاز اور چھُوت چھات، قانونی حُقوق اور عملی معاشرت میں مُساوات کا فُقدان، عورتوں کی پستی اور بنیادی حقوق تک سے محرومی، جرائم کی کثرت، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج، حُکومت کا تنقید و محاسبے سے بالاتر رہنا، عوام کا بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہونا، بین الاقوامی تعلقات میں معاہدات کی بے احترامی، جنگ میں وحشیانہ حرکات، اور ایسے ہی دوسرے امراض۔ سب سے بڑھ کر خود عرب کی سرزمین میں اس انقلاب نے دیکھتے دیکھتے طوائف المُلُوکی کی جگہ نظم، خوں ریزی و بدامنی کی جگہ امن، فِسق و فُجور کی جگہ تقویٰ و طہارت، ظلم و بے انصافی کی جگہ عدل، گندگی و ناشائستگی کی جگہ پاکیزگی اور تہذیب، جَہالت کی جگہ علم، اور نسل در نسل چلنے والی عداوتوں کی جگہ اخوّت و مَحبّت پیدا کر دی، اور جس قوم کے لوگ اپنے قبیلے کی سرداری سے بڑھ کر کسی چیز کا خواب تک نہ دیکھ سکتے تھے، انھیں دنیا کا امام بنا دیا۔ یہ تھیں وہ نشانیاں جو اُسی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جسے مخاطب کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ یہ آیت سنائی تھی۔ اور اُس کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ ان نشانیوں کو برابر دکھائے جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زوال کے دَور میں بھی اَخلاق کی جس بلندی کا مُظاہَرہ کیا ہے، اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے عَلَم بردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقا، امریکا، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اُس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پا کر اُتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دَور میں ظالم پائے گئے ہیں اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمراں رہے اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا، اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانۂ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا، اور اب ہندو غالب آ جانے کے بعد ان کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رَوِیَّہ کیا رہا، اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔

دوسرا مفہُوم اس آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آفاقِ ارض و سما میں بھی اور انسانوں کے اپنے وجود میں بھی لوگوں کو وہ نشانیاں دکھائے گا جن سے اُن پر یہ بات کُھل جائے گی کہ یہ قرآن جو تعلیم دے رہا ہے، وہی برحق ہے۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آفاقِ ارض و سما اور خود اپنے وجود کو تو لوگ اُس وقت بھی دیکھ رہے تھے، پھر زمانۂ مستقبل میں ان چیزوں کے اندر نشانیاں دکھانے کے کیا معنیٰ؟ لیکن یہ اعتراض بھی ویسا ہی سطحی ہے جیسا اُوپر کے مفہُوم پر اعتراض سطحی تھا۔ آفاقِ ارض و سما تو بے شک وہی ہیں جنھیں انسان ہمیشہ سے دیکھتا رہا ہے، اور انسان کا اپنا وجود بھی اُسی طرح کا ہے جیسا ہر زمانے میں دیکھا جاتا رہا ہے، مگر ان چیزوں کے اندر خدا کی نشانیاں اس قدر بے شمار ہیں کہ انسان کبھی ان کا احاطہ نہیں کر سکا ہے، نہ کبھی کر سکے گا۔ ہر دَور میں انسان کے سامنے نئی نئی نشانیاں آتی چلی گئی ہیں اور قیامت تک آتی چلی جائیں گی۔

شَهِيدٌ ﴿٥٣﴾ أَلَآ إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَآ
إِنَّهُۥ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ﴿٥٤﴾ ع

ع ۶

شاہد ہے؟[۷۱] آگاہ رہو، یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔[۷۲] سُن رکھو، وہ ہر چیز پر محیط ہے۔[۷۳]

۷۱ – یعنی کیا لوگوں کو انجام بد سے ڈرانے کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اِس دعوتِ حق کو جھٹلانے اور زک پہنچانے کے لیے جو جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ ان کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا ہے۔

۷۲ – یعنی اِن کے اِس رَوِیّے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ کبھی اِن کو اپنے رب کے سامنے جانا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہے۔

۷۳ – یعنی اُس کی گرفت سے بچ کر یہ کہیں جا نہیں سکتے، اور اُس کے ریکارڈ سے ان کی کوئی حرکت چھوٹ نہیں سکتی۔

تفہیم القرآن

الشوریٰ

(۴۲)

الشُّوریٰ

نام آیت ۳۸ کے فقرے وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لفظِ شُوریٰ آیا ہے۔

زمانۂ نزُول کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہو سکا ہے، لیکن اس کے مضمون پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ حٰم السجدہ کے متصلاً بعد نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ یہ ایک طرح سے بالکل اُس کا تتمّہ نظر آتی ہے۔ اِس کیفیت کو ہر وہ شخص خود محسوس کرے گا جو پہلے سورۂ حٰم السجدہ کو بغور پڑھے اور پھر اس سورہ کی تلاوت کرے۔ وہ دیکھے گا کہ اُس سورت میں سردارانِ قریش کی اندھی بہری مخالفت پر بڑی کاری ضربیں لگائی گئی تھیں، تاکہ مکۂ معظّمہ اور اس کے گرد وپیش کے علاقے میں جس کسی کے اندر بھی اَخلاق، شرافت اور معقولیت کی کوئی حِس باقی ہو، وہ جان لے کہ قوم کے بڑے لوگ کس قدر بے جا طریقے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالَفت کر رہے ہیں، اور ان کے مقابلے میں آپؐ کی بات کتنی سنجیدہ، آپؐ کا مَوْقِف کتنا معقول اور آپؐ کا رَوِیَّہ کیسا شریفانہ ہے۔ اُس تنبیہ کے معاً بعد یہ سورت نازل کی گئی جس نے تفہیم کا حق ادا کر دیا اور ایسے دل نشین انداز میں دعوتِ محمدیؐ کی حقیقت سمجھائی جس کا اثر قبول نہ کرنا کسی ایسے شخص کے بس میں نہ تھا جو حق پسندی کا کچھ بھی مادّہ اپنے اندر رکھتا ہو اور جاہلیت کی گمراہیوں کے عشق میں بالکل اندھا نہ ہو چکا ہو۔

موضوع اور مضمون بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ تم لوگ ہمارے نبی کی پیش کردہ باتوں پر یہ کیا چہ میگوئیاں کرتے پھر رہے ہو۔ یہ باتیں کوئی نئی اور نرالی نہیں ہیں، نہ یہی کوئی نادر واقعہ ہے جو تاریخ میں پہلی ہی مرتبہ پیش آیا ہو کہ ایک شخص پر خدا کی طرف سے وَحی آئے اور اسے بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے ہدایات دی جائیں۔ ایسی ہی وحی، اِسی طرح کی ہدایات کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے انبیا علیہم السلام پر پے در پَے بھیجتا رہا ہے۔ اور نرالی، اچنبھے کے قابل بات یہ نہیں ہے کہ آسمان و زمین کے مالک کو معبُود اور حاکم مانا جائے، بلکہ یہ ہے کہ اس کے بندے ہو کر، اس کی خدائی میں رہتے ہوئے کسی دوسرے کی خداوندی تسلیم کی جائے۔ تم توحید پیش کرنے والے پر بگڑ رہے ہو، حالانکہ مالکِ کائنات کے ساتھ جو شرک تم کر رہے ہو، وہ ایسا جرمِ عظیم ہے کہ آسمان اُس پر پھٹ پڑیں تو کچھ بعید نہیں۔ تمھاری اس جسارت پر فرشتے حیران ہیں اور ہر وقت ڈر رہے ہیں کہ نہ معلوم کب تم پر خدا کا غضب ٹوٹ پڑے۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ نبوت پر کسی شخص کا مقرر کیا جانا، اور اس شخص کا اپنے آپ کو نبی کی

حیثیت سے پیش کرنا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ خَلقِ خدا کی قسمتوں کا مالک بنا دیا گیا ہے اور اسی دعوے کے ساتھ وہ میدان میں آیا ہے۔ قسمتیں تو اللہ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہیں۔ نبی صرف غافلوں کو چونکانے اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتانے آیا ہے۔ اُس کی بات نہ ماننے والوں کا محاسبہ کرنا اور اُنھیں عذاب دینا یا نہ دینا اللہ کا اپنا کام ہے۔ یہ کام نبی کے سُپرد نہیں کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس غلط فہمی کو اپنے دماغ سے نکال دو کہ نبی اُس طرح کے کسی دعوے کے ساتھ آیا ہے جیسے دعوے تمھارے ہاں کے نام نہاد مذہبی پیشوا اور پیر فقیر کیا کرتے ہیں کہ جو ان کی بات نہ مانے گا، یا اُن کی شان میں گستاخی کرے گا، وہ اسے جلا کر بھسم کر دیں گے۔ اسی سلسلے میں لوگوں کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نبی تمھاری بدخواہی کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ تو ایک خیر خواہ ہے جو تمھیں خبردار کر رہا ہے کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو اس میں تمھاری اپنی تباہی ہے۔

پھر اس مسئلے کی حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ اللہ نے سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر راست رَو کیوں نہ بنا دیا، اور یہ مجالِ اختلاف کیوں رکھی جس کی وجہ سے لوگ فکر وعمل کے ہر اُلٹے سیدھے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ بتایا گیا کہ اسی چیز کی بدولت تو یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ انسان اللہ کی اُس رحمتِ خاص کو پا سکے جو دوسری بے اختیار مخلوقات کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف اُس ذی اختیار مخلوق کے لیے ہے جو جِبلّی طور پر نہیں، شُعوری طور پر اپنے اختیار سے اللہ کو اپنا ولی (patron,guardian) بنائے۔ یہ رَوِش جو انسان اختیار کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ سہارا دے کر، اس کی رہنمائی کر کے، اسے حسنِ عمل کی توفیق دے کر، اپنی رحمتِ خاص میں داخل کر لیتا ہے۔ اور جو انسان اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اُن کو ولی بناتا ہے جو درحقیقت ولی نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے، وہ اس رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان کا اور ساری مخلوقات کا ولی حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ دوسرے نہ حقیقت میں ولی ہیں، نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ ولایَت کا حق ادا کر سکیں۔ انسان کی کامیابی کا مدار اسی پر ہے کہ وہ اپنے لیے اپنے اختیار سے ولی کا انتخاب کرنے میں غَلَطی نہ کرے، اور اُسی کو اپنا ولی بنائے جو درحقیقت ولی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جس دین کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، وہ حقیقت میں ہے کیا:

اُس کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ کائنات اور انسان کا خالق، مالک اور ولیِ حقیقی ہے، اس لیے وہی انسان کا حاکم بھی ہے، اور اسی کا یہ حق ہے کہ انسان کو دین اور شریعت (اعتقاد وعمل کا نظام) دے اور انسانی اختلافات کا فیصلہ کر کے بتائے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ دوسری کسی ہستی کو انسان کے لیے شارع (lawgiver) بننے کا سرے سے حق ہی نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر، فطری حاکمیت کی طرح تشریعی حاکمیت بھی اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ انسان یا کوئی غیر اللہ اس حاکمیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص اللہ کی اِس حاکمیت کو نہیں مانتا تو اس کا اللہ کی محض نظری حاکمیت کو ماننا لاحاصل ہے۔

اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے انسان کے لیے ایک دین مقرر کیا ہے۔

وہ ایک ہی دین تھا جو ہر زمانے میں تمام انبیاؑ کو دیا جاتا رہا۔ کوئی نبی بھی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی نہیں تھا۔ وہی ایک دین اوّل روز سے نسلِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا رہا ہے، اور سارے انبیاؑ اُسی کے پیرو اور داعی رہے ہیں۔

وہ دین کبھی محض مان کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں بھیجا گیا، بلکہ ہمیشہ اس غرض کے لیے بھیجا گیا ہے کہ زمین پر وہی قائم اور رائج اور نافذ ہو، اور اللہ کے ملک میں اللہ کے دین کے سوا کسی اور کے ساختہ و پرداختہ دین کا سکّہ نہ چلے۔ انبیا علیہم السلام اس دین کی محض تبلیغ پر نہیں بلکہ اُسے قائم کرنے کی خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔

نوعِ انسانی کا اصل دین یہی تھا، مگر انبیاؑ کے بعد ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ خود غرض لوگ اس کے اندر اپنی خود پسندی، خود رائی اور خود نُمائی کے باعث اپنے مفاد کی خاطر تَفَرِقے برپا کر کر کے نئے نئے مذہب نکالتے رہے۔ دنیا میں یہ جتنے بھی مختلف مذہب پائے جاتے ہیں، سب اُسی ایک دین کو بگاڑ کر پیدا کیے گئے ہیں۔

اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ ان متفرق طریقوں اور مصنوعی مذہبوں اور انسانی ساخت کے دینوں کی جگہ وہی اصل دین لوگوں کے سامنے پیش کریں اور اسی کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔

اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے اگر تم اُلٹے بگڑتے ہو اور لڑنے کو دَوڑتے ہو تو یہ تمھاری نادانی ہے۔ تمھاری اس حماقت کی وجہ سے نبی اپنا کام نہیں چھوڑ دے گا۔ وہ اس بات پر مامور ہے کہ پوری استقامت کے ساتھ اپنے مَوْقِف پر جم جائے اور اُس کام کو پورا کرے جس پر وہ مامور ہوا ہے۔ اُس سے یہ اُمید نہ رکھو کہ وہ تمھیں راضی کرنے کے لیے دین میں اُنھی اَوہام و خُرافات اور جاہلیت کی رسموں اور طور طریقوں کے لیے کوئی گنجایش نکالے گا جن سے خدا کا دین پہلے خراب کیا جاتا رہا ہے۔

تم لوگوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کو اختیار کرنا اللہ کے مقابلے میں کتنی بڑی جسارت ہے۔ تم اپنے نزدیک اسے دنیا کا معمول سمجھ رہے ہو، اور تمھیں اس میں کوئی قَباحت نظر نہیں آتی۔ مگر اللہ کے نزدیک یہ بدترین شرک اور شدید ترین جرم ہے، جس کی سخت سزا اُن سب لوگوں کو بھگتنی پڑے گی جنھوں نے اللہ کی زمین پر اپنا دین جاری کیا اور جنھوں نے اُن کے دین کی پیروی اور اطاعت کی۔

اِس طرح دین کا ایک صاف اور واضح تصور پیش کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم لوگوں کو سمجھا کر راہِ راست پر لانے کے لیے جو بہتر سے بہتر طریقہ ممکن تھا، وہ استعمال کیا جا چکا۔ ایک طرف اللہ نے اپنی کتاب نازل فرمائی جو نہایت دل نشین طریقے سے تمھاری اپنی زبان میں تمھیں حقیقت بتا رہی ہے، اور دوسری طرف

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کی زندگیاں تمھاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جنھیں دیکھ کر تم جان سکتے ہو کہ اس کتاب کی رہنمائی میں کیسے انسان تیار ہوتے ہیں۔ اس پر بھی اگر تم ہدایت نہ پاؤ تو پھر دنیا میں کوئی چیز تمھیں راہِ راست پر نہیں لاسکتی۔ اس کا نتیجہ تو پھر یہی ہے کہ تمھیں اُسی گمراہی میں پڑا رہنے دیا جائے جس میں تم صدیوں سے مبتلا ہو، اور اُسی انجام سے تم کو دوچار کر دیا جائے جو ایسے گمراہوں کے لیے اللہ کے ہاں مقدّر ہے۔

اِن حقائق کو بیان کرتے ہوئے بیچ بیچ میں اختصار کے ساتھ توحید اور آخرت کے دلائل دیے گئے ہیں، دنیا پرستی کے نتائج پر مُتنَبِّہ کیا گیا ہے، آخرت کی سزا سے ڈرایا گیا ہے، اور کفار کی اُن اَخلاقی کمزوریوں پر گرفت کی گئی ہے جو ہِدایت سے اُن کے منہ موڑنے کا اصل سبب تھیں۔ پھر کلام کو ختم کرتے ہوئے دو اہم باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

ایک یا یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی زندگی کے ابتدائی چالیس سال میں ''کتاب'' کے تصوُّر سے بالکل خالی الذہن اور ایمان کے مسائل و مباحث سے قطعی ناواقف رہنا، اور پھر یکایک اِن دونوں چیزوں کو لے کر دنیا کے سامنے آجانا، آپؐ کے نبی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

دوسرے، یہ کہ آپؐ کا اپنی پیش کردہ تعلیم کو خدا کی تعلیم قرار دینا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ آپؐ خدا سے رُودَررُو کلام کرنے کے مُدّعی ہیں، بلکہ خدا نے یہ تعلیم تمام انبیاؑ کی طرح آپؐ کو بھی تین طریقوں سے دی ہے: ایک وحی، دوسرے پردے کے پیچھے سے آواز، اور تیسرے فرشتے کے ذریعے سے پیغام۔ یہ وضاحت اس لیے کی گئی کہ مخالفین یہ الزام تراشی نہ کرسکیں کہ حضورؐ خدا سے رُودَررُو کلام کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور حق پسند لوگ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انسان نبوت کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہو، اُسے کن طریقوں سے ہِدایات دی جاتی ہیں۔

آیاتہا ۵۳ — رکوعاتہا ۵

سُوْرَةُ الشُّوْرٰى مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝١ عٓسٓقٓ ۝٢ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٣ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝٤ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ
فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ

ح م، ع س ق۔ اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمھاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے (رسولوں) کی طرف وحی کرتا رہا ہے[1]۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اُسی کا ہے، وہ برتر اور عظیم ہے[2]۔ قریب ہے کہ آسمان اُوپر سے پھٹ پڑیں[3]۔ فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں

۱ – افتتاحِ کلام کا یہ انداز خود بتا رہا ہے کہ پَس منظر میں وہ چہ می گوئیاں ہیں جو مکّۂ معظّمہ کی ہر محفل، ہر چوپال، ہر کوچہ و بازار اور ہر مکان اور دُکان میں اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور قرآن کے مضامین پر ہو رہی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ نہ معلوم یہ شخص کہاں سے یہ نرالی باتیں نکال نکال کر لا رہا ہے۔ ہم نے تو ایسی باتیں نہ کبھی سُنیں، نہ ہوتے دیکھیں۔ وہ کہتے تھے: یہ عجیب ماجرا ہے کہ باپ دادا سے جو دین چلا آ رہا ہے، ساری قوم جس دین کی پیروی کر رہی ہے، سارے ملک میں جو طریقے صدیوں سے رائج ہیں، یہ شخص اِن سب کو غلط قرار دیتا ہے اور کہتا ہے جو دین مَیں پیش کر رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ وہ کہتے تھے: اِس دین کو بھی اگر یہ اِس حیثیت سے پیش کرتا کہ دینِ آبائی اور رائج الوقت طریقوں میں اِسے کچھ قباحت نظر آتی ہے اور اُن کی جگہ اِس نے خود کچھ نئی باتیں سوچ کر نکالی ہیں، تو اس پر کچھ گفتگو بھی کی جا سکتی تھی، مگر وہ تو کہتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو میں تمھیں سنا رہا ہوں۔ یہ بات آخر کیسے مان لی جائے؟ کیا خدا اِس کے پاس آتا ہے؟ یا یہ خدا کے پاس جاتا ہے؟ یا اِس کی اور خدا کی بات چیت ہوتی ہے؟ اِنھی چرچوں اور چہ می گوئیوں پر بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے، مگر دراصل کفار کو سناتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ہاں، یہی باتیں اللہ عزیز و حکیم وحی فرما رہا ہے اور یہی مضامین لیے ہوئے اس کی وحی پچھلے تمام انبیاؑ پر نازل ہوتی رہی ہے۔

وحی کے لُغوی معنٰی ہیں: ''اشارۂ سَریع'' اور ''اشارۂ خفی''، یعنی ایسا اشارہ جو سُرعت کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ بس اشارہ کرنے والا جانے یا وہ شخص جسے اشارہ کیا گیا ہے، باقی کسی اور شخص کو اُس کا پتا نہ چلنے پائے۔ اِس لفظ کو اِصطلاحاً اُس ہدایت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو بجلی کی کَوند کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے کسی بندے کے دل میں ڈالی جائے۔

لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۝۵ وَ الَّذِیۡنَ

درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں[۴]۔ آگاہ رہو، حقیقت میں اللہ غفور ورحیم ہی ہے[۵]۔ جن لوگوں نے

ارشادِ الٰہی کا مدّعا یہ ہے کہ اللہ کے کسی کے پاس آنے یا اس کے پاس کسی کے جانے اور رُوبرو گفتگو کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ غالب اور حکیم ہے۔ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جب بھی وہ کسی بندے سے رابطہ قائم کرنا چاہے، کوئی دشواری اس کے ارادے کی راہ میں مزاحم نہیں ہوسکتی، اور وہ اپنی حکمت سے اس کام کے لیے وحی کا طریقہ اختیار فرما لیتا ہے۔ اسی مضمون کا اعادہ سورت کی آخری آیات میں کیا گیا ہے، اور وہاں اسے زیادہ کھول کر بیان فرمایا گیا ہے۔

پھر یہ جو اُن لوگوں کا خیال تھا کہ یہ نرالی باتیں ہیں، اس پر ارشاد ہوا ہے کہ یہ نرالی باتیں نہیں ہیں، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاؑ آئے ہیں، اُن سب کو بھی خدا کی طرف سے یہی کچھ ہدایات دی جاتی رہی ہیں۔

۲ – یہ تمہیدی فقرے محض اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ارشاد نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ ان کا ہر لفظ اُس پَس منظر سے گہرا ربط رکھتا ہے جس میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف جو لوگ چہ می گوئیاں کر رہے تھے، ان کے اعتراضات کی اوّلین بنیاد یہ تھی کہ حضوؐر ان کو توحید کی دعوت دے رہے تھے، اور وہ اس پر کان کھڑے کر کر کے کہتے تھے کہ اگر اکیلا ایک اللہ ہی معبود، حاجت روا اور شارع ہے تو پھر ہمارے بزرگ کیا ہوئے؟ اس پر فرمایا گیا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی مِلک ہے۔ مالک کے ساتھ اس کی مِلکیّت میں کسی اور کی خداوندی آخر کس طرح چل سکتی ہے؟ خُصوصاً جب کہ وہ دوسرے، جن کی خداوندی مانی جاتی ہے، یا جو اپنی خداوندی چلانا چاہتے ہیں، خود بھی اُس کے مملوک ہی ہیں۔ پھر فرمایا گیا کہ وہ برتر اور عظیم ہے، یعنی اِس سے بالاتر اور بزرگ تر ہے کہ کوئی اُس کا ہم سر ہو، اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں سے کسی چیز میں بھی حصّہ دار بن سکے۔

۳ – یعنی یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے کہ کسی مخلوق کا نسب خدا سے جا ملایا گیا اور اسے خدا کا بیٹا یا بیٹی قرار دے دیا گیا۔ کسی کو حاجت روا اور فریاد رس ٹھیرا لیا گیا اور اس سے دعائیں مانگی جانے لگیں۔ کسی بزرگ کو دنیا بھر کا کارساز سمجھ لیا گیا اور عَلانِیَہ کہا جانے لگا کہ ہمارے حضرت ہر وقت ہر جگہ ہر شخص کی سنتے ہیں اور وہی ہر ایک کی مدد کو پہنچ کر اس کے کام بنایا کرتے ہیں۔ کسی کو اَمر و نَہی اور حلال و حرام کا مختار مان لیا گیا اور خدا کو چھوڑ کر لوگ اس کے احکام کی اطاعت اِس طرح کرنے لگے کہ گویا وہی اِن کا خدا ہے۔ خدا کے مقابلے میں یہ وہ جسارتیں ہیں جن پر اگر آسمان پھٹ پڑیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ (یہی مضمون سورۂ مریم، آیات ۸۸-۹۱ میں بھی ارشاد ہوا ہے۔)

۴ – مطلب یہ ہے کہ فرشتے انسانوں کی یہ باتیں سُن سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ کیا بکواس ہے جو ہمارے رب کی شان میں کی جا رہی ہے، اور یہ کیسی بغاوت ہے جو زمین کی اس مخلوق نے برپا کر رکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں: سبحان اللہ! کس کی یہ حیثیت ہو سکتی ہے کہ ربّ العالَمین کے ساتھ اُلوہیّت اور حکم میں شریک ہو سکے، اور کون اُس کے سوا ہمارا اور سب بندوں کا محسن ہے کہ اُس کی حمد کے ترانے گائے جائیں اور اس کا شکر ادا کیا جائے۔ پھر وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایسا جُرمِ عظیم دنیا میں کیا جا رہا ہے

اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيۡظٌ عَلَيۡهِمۡ ۖ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ ۝۶ وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنۡذِرَ

اُس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں[۶]، اللہ ہی اُن پر نگراں ہے، تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو[۷]۔

ہاں، اِسی طرح اَے نبیؐ! یہ قرآنِ عربی ہم نے تمھاری طرف وحی کیا ہے[۸]، تاکہ تم بستیوں کے مرکز

جس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہر وقت بھڑک سکتا ہے، اس لیے وہ زمین پر بسنے والے اِن خود فراموش وخدا فراموش بندوں کے حق میں بار بار رحم کی درخواست کرتے ہیں کہ ابھی ان پر عذاب نازل نہ کیا جائے اور انھیں سنبھلنے کا کچھ اور موقع دیا جائے۔

۵ – یعنی یہ اُس کی حلیمی و رحیمی اور چشم پوشی و درگزر ہی تو ہے جس کی بدولت کفر اور شرک اور دَہریّت اور فِسق و فُجور اور ظلم و ستم کی انتہا کر دینے والے لوگ بھی سال ہا سال تک، بلکہ اس طرح کے پورے پورے معاشرے صدیوں تک مہلت پر مہلت پاتے چلے جاتے ہیں، اور ان کو صرف رزق ہی نہیں ملے جاتا بلکہ دنیا میں ان کی بڑائی کے ڈنکے بجتے ہیں اور زینتِ حیاتِ دُنیا کے وہ سروسامان انھیں ملتے ہیں جنھیں دیکھ دیکھ کر نادان لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے۔

۶ – اصل میں لفظ ''اَوۡلِيَآءَ'' استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔ معبُودانِ باطل کے متعلق گمراہ انسانوں کے مختلف عقائد اور بہت سے مختلف طرزِ عمل ہیں، جن کو قرآنِ مجید میں ''اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانے'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآنِ پاک کا تتبُّع کرنے سے لفظِ ''ولی'' کے حسبِ ذیل مفہُومات معلوم ہوتے ہیں:

۱ – جس کے کہنے پر آدمی چلے، جس کی ہدایات پر عمل کرے، اور جس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں، رسموں اور قوانین وضوابط کی پیروی کرے۔ (النساء، آیات ۱۱۸ تا ۱۲۰۔ الاعراف: ۳-۲۷ تا ۳۰)

۲ – جس کی رہنمائی (guidance) پر آدمی اعتماد کرے اور یہ سمجھے کہ وہ اسے صحیح راستہ بتانے والا اور غَلَطی سے بچانے والا ہے۔ (البقرہ: ۲۵۷۔ بنی اسرائیل: ۹۷۔ الکہف: ۱۷-۵۰۔ الجاثیہ: ۱۹)

۳ – جس کے متعلق آدمی یہ کہے کہ میں دنیا میں خواہ کچھ کرتا رہوں، وہ مجھے اُس کے بُرے نتائج سے، اور اگر خدا ہے اور آخرت بھی ہونے والی ہے، تو اُس کے عذاب سے بچالے گا۔ (النساء: ۱۲۳-۱۷۳۔ الاَنعام: ۵۱۔ الرعد: ۳۷۔ العنکبوت: ۲۲۔ الاحزاب: ۶۵۔ الزمر: ۳)

۴ – جس کے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ وہ دنیا میں فوق الفطری طریقے سے اس کی مدد کرتا ہے، آفات و مصائب سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے روزگار دلواتا ہے، اولاد دیتا ہے، مرادیں بر لاتا ہے، اور دوسری ہر طرح کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔ (ہود: ۲۰۔ الرعد: ۱۶۔ العنکبوت: ۴۱)

بعض مقامات پر قرآن میں ولی کا لفظ ان میں سے کسی ایک معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے، اور بعض مقامات پر جامعیت کے ساتھ

أُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا وَ تُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ
فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴿۷﴾ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ

(شہرِ مکّہ) اور اُس کے گردو پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو[9]، اور جمع ہونے کے دن سے ڈرا دو[10]، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں۔

اگر اللہ چاہتا تو اِن سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے،

اس کے سارے ہی مفہومات مراد ہیں۔ آیتِ زیرِ تشریح بھی انھی میں سے ایک ہے۔ یہاں اللہ کے سوا دوسروں کو ولی بنانے سے مراد مذکورۂ بالا چاروں معنوں میں ان کو اپنا سرپرست بنانا اور حامی و مددگار سمجھنا ہے۔

۷ – ''اللہ ہی ان پر نگراں ہے''، یعنی وہ ان کے سارے افعال دیکھ رہا ہے اور اُن کے نامۂ اعمال تیار کر رہا ہے۔ ان کا مُحاسبہ اور مُؤاخذہ کرنا اُسی کا کام ہے۔ ''تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو''، یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی قسمت تمھارے حوالے نہیں کر دی گئی ہے کہ جو تمھاری بات نہ مانے گا، اُسے تم جلا کر خاک کر دو گے، یا اُس کا تختہ اُلٹ دو گے، یا اُسے تہس نہس کر کے رکھ دو گے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو ایسا سمجھتے تھے، اور آپؐ کی غلط فہمی یا بر خود غلطی کو رفع کرنے کے لیے یہ بات ارشاد ہوئی ہے۔ بلکہ اس سے مقصود کفار کو سنانا ہے۔ اگرچہ بظاہر مخاطَب حضوؐر ہی ہیں، لیکن اصل مُدّعا کفار کو یہ بتانا ہے کہ اللہ کا نبی اُس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتا جیسے بلند بانگ دعوے خدا رسیدگی اور رُوحانیت کے ڈھونگ رچانے والے عُموماً تمھارے ہاں کیا کرتے ہیں۔ جاہلیت کے معاشروں میں بالعُموم یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ''حضرت'' قِسم کے لوگ ہر اُس شخص کی قسمت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں جو ان کی شان میں کوئی گستاخی کرے۔ بلکہ مر جانے کے بعد اُن کی قبر کی بھی اگر کوئی توہین کر گزرے، یا اور کچھ نہیں تو ان کے متعلق کوئی بُرا خیال ہی دل میں لے آئے تو وہ اس کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ یہ خیال زیادہ تر ''حضرتوں'' کا اپنا پھیلایا ہوا ہوتا ہے، اور نیک لوگ جو خود ایسی باتیں نہیں کرتے، اُن کے نام اور ان کی ہڈیوں کو اپنے کاروبار کا سرمایہ بنانے کے لیے کچھ دوسرے ہوشیار لوگ اُن کے متعلق اس خیال کو پھیلاتے ہیں۔ بہرحال عوام میں اِسے روحانیت و خدا رسیدگی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی کو قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ اسی فریب کا طِلِسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ کفار کو سناتے ہوئے اپنے رسولِ پاک سے فرما رہا ہے کہ بلاشبہ تم ہمارے پیغمبر ہو اور ہم نے اپنی وحی سے تمھیں سرفراز کیا ہے، مگر تمھارا کام صرف لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانا ہے۔ اُن کی قسمتیں تمھارے حوالے نہیں کر دی گئی ہیں۔ وہ ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہیں۔ بندوں کے اعمال کو دیکھنا اور اُن کو عذاب دینا یا نہ دینا ہمارا اپنا کام ہے۔

۸ – وہی بات پھر دُہرا کر زیادہ زور دیتے ہوئے کہی گئی ہے جو آغازِ کلام میں کہی گئی تھی۔ اور ''قرآنِ عربی'' کہہ کر سامعین

وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۸﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ
اَوْلِیَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِیُّ وَ هُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی ۫ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۹﴾ ع

اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔[11] کیا (یہ ایسے نادان ہیں کہ) انھوں نے اُسے چھوڑ کر دوسرے ولی بنا رکھے ہیں؟ ولی تو اللہ ہی ہے، وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔[12] ع

کو مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے کہ یہ کسی غیر زبان میں نہیں ہے، تمھاری اپنی زبان میں ہے۔ تم براہِ راست اسے خود سمجھ سکتے ہو۔ اس کے مضامین پر غور کر کے دیکھو کہ یہ پاک صاف اور بے غرض رہنمائی کیا خداوندِ عالَم کے سوا کسی اَور کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے۔

۹ – یعنی انھیں غفلت سے چونکا دو اور مُتَنَبِّہ کر دو کہ افکار و عقائد کی جن گمراہیوں اور اَخلاق و کردار کی جن خرابیوں میں تم لوگ مبتلا ہو، اور تمھاری انفرادی اور قومی زندگی جن فاسد اُصولوں پر چل رہی ہے، ان کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۱۰ – یعنی انھیں یہ بھی بتا دو کہ یہ تباہی و بربادی صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ آگے وہ دن بھی آنا ہے جب اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جمع کر کے اُن کا حساب لے گا۔ دنیا میں اگر کوئی شخص اپنی گمراہی و بدعملی کے بُرے نتائج سے بچ بھی نکلا تو اُس دن بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اور بڑا ہی بدقسمت ہے وہ جو یہاں بھی خراب ہو اور وہاں بھی اُس کی شامت آئے۔

۱۱ – یہ مضمون اس سلسلۂ کلام میں تین مقاصد کے لیے آیا ہے:

اوّلاً، اس سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم اور تسلّی دینا ہے۔ اس میں حضورؐ کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ آپؐ کُفّارِ مکہ کی جَہالت و ضلالت اور اُوپر سے اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھ دیکھ کر اس قدر زیادہ نہ کُڑھیں، اللہ کی مرضی یہی ہے کہ انسانوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی عطا کی جائے، پھر جو ہدایت چاہے اسے ہدایت ملے، اور جو گمراہ ہی ہونا پسند کرے اسے جانے دیا جائے جدھر وہ جانا چاہتا ہے۔ اگر یہ اللہ کی مَصلَحت نہ ہوتی تو انبیاؑ اور کتابیں بھیجنے کی حاجت ہی کیا تھی، اس کے لیے تو اللہ جَلّ شانُہٗ کا ایک تخلیقی اشارہ کافی تھا، سارے انسان اُسی طرح مُطیعِ فرمان ہوتے جس طرح دریا، پہاڑ، درخت، مٹی، پتھر اور سب حیوانات ہیں۔ (اِس مقصد کے لیے یہ مضمون دوسرے مقامات پر بھی قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے۔ مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حواشی ۲۳ تا ۲۵-۷۱)

ثانیاً، اس کے مخاطَب وہ تمام لوگ ہیں جو اِس ذہنی اُلجھن میں گرفتار تھے اور اب بھی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ فی الواقع انسانوں کی رہنمائی کرنا چاہتا تھا، اور اگر عقیدہ و عمل کے یہ اختلافات، جو لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اُسے پسند نہ تھے، اور اگر اُسے پسند یہی تھا کہ لوگ ایمان و اسلام کی راہ اختیار کریں، تو اس کے لیے آخر وحی اور کتاب اور نبوّت کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو وہ بآسانی اس طرح کر سکتا تھا کہ سب کو مومن و مسلم پیدا کر دیتا۔ اِسی اُلجھن کا ایک شاخسانہ یہ استدلال بھی تھا کہ جب اللہ نے ایسا نہیں کیا ہے تو ضرور وہ مختلف طریقے جن پر ہم چل رہے ہیں، اس کو پسند ہیں، اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں اُسی کی مرضی سے کر رہے ہیں، لہٰذا اُس پر اعتراض کا کسی کو حق نہیں ہے۔ (اِس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے بھی یہ مضمون قرآن میں متعدّد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مُلاحَظہ ہو:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ إِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ

تمھارے[13] درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے[14]۔ وہی اللہ میرا[15]

تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۸۰-۱۱۰-۱۲۴-۱۲۵۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۰۱، ہود، حاشیہ ۱۱۶، النحل، حواشی ۱۰-۳۱-۳۲)

ثالثاً، اس کا مقصد اہلِ ایمان کو اُن مشکلات کی حقیقت سمجھانا ہے جو تبلیغِ دین اور اصلاحِ خَلق کی راہ میں اکثر پیش آتی ہیں۔ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی آزادیِ انتخاب وارادہ، اور اس کی بنا پر طبائع اور طریقوں کے اختلاف کی حقیقت کو نہیں سمجھتے، وہ کبھی تو کارِ اصلاح کی سُست رفتاری دیکھ کر مایوس ہونے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ کرامتیں اور معجزات رونما ہوں، تاکہ انھیں دیکھتے ہی لوگوں کے دل بدل جائیں، اور کبھی وہ ضرورت سے زیادہ جوش سے کام لے کر اصلاح کے بے جا طریقے اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ (اِس مقصد کے لیے بھی یہ مضمون بعض مَقامات پر قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے۔ مُلاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الرعد، حواشی ۴۷ تا ۴۹، النحل ۸۹ تا ۹۷)

اِن مقاصد کے لیے ایک بڑا اہم مضمون اِن مختصر سے فقروں میں بیان فرمایا گیا ہے۔ دنیا میں اللہ کی حقیقی خلافت اور آخرت میں اس کی جنت کوئی معمولی رحمت نہیں ہے جو مٹی اور پتھر اور گدھوں اور گھوڑوں کے مرتبے کی مخلوق پر ایک رحمتِ عام کی طرح بانٹ دی جائے۔ یہ تو ایک خاص رحمت اور بہت اُونچے درجے کی رحمت ہے، جس کے لیے فرشتوں تک کو موزوں نہ سمجھا گیا۔ اسی لیے انسان کو ایک ذی اختیار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کر کے اللہ نے اپنی زمین کے یہ وسیع ذرائع اُس کے تصرُّف میں دیے، اور یہ ہنگامہ خیز طاقتیں اس کو بخشیں، تاکہ یہ اُس امتحان سے گزر سکے جس میں کامیاب ہو کر ہی کوئی بندہ اُس کی یہ رحمتِ خاص پانے کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ رحمت اللہ کی اپنی چیز ہے۔ اس پر کسی کا اِجارہ نہیں ہے، نہ کوئی اسے اپنے ذاتی اِستحقاق کی بنا پر دعوے سے لے سکتا ہے، نہ کسی میں یہ طاقت ہے کہ اسے بزور حاصل کر سکے۔ اِسے وہی لے سکتا ہے جو اللہ کے حُضور بندگی پیش کرے، اس کو اپنا ولی بنائے اور اس کا دامن تھامے۔ تب اللہ اس کی مدد اور رہنمائی کرتا ہے، اور اُسے اِس امتحان سے بخیریت گزرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے، تاکہ وہ اس کی رحمت میں داخل ہو سکے۔ لیکن جو ظالم اللہ ہی سے منہ موڑ لے اور اس کے بجائے دوسروں کو اپنا ولی بنا بیٹھے، اللہ کو کچھ ضرورت نہیں پڑی ہے کہ خواہ مخواہ زبردستی اس کا ولی بنے، اور دوسرے جن کو وہ ولی بناتا ہے، سرے سے کوئی علم، کوئی طاقت اور کسی قسم کے اختیارات ہی نہیں رکھتے کہ اس کی وِلایت کا حق ادا کر کے اسے کامیاب کرا دیں۔

۱۲ — یعنی وِلایت کوئی من سمجھوتے کی چیز نہیں ہے کہ آپ جسے چاہیں اپنا ولی بنا بیٹھیں، اور وہ حقیقت میں بھی آپ کا سچا اور اصلی ولی بن جائے اور وِلایت کا حق ادا کر دے۔ یہ تو ایک اَمرِ واقعی ہے جو لوگوں کی خواہشات کے ساتھ بنتا اور بدلتا نہیں چلا جاتا، بلکہ جو حقیقت میں ولی ہے وہی ولی ہے، خواہ آپ اسے ولی نہ سمجھیں اور نہ مانیں، اور جو حقیقت میں ولی نہیں ہے وہ ولی نہیں ہے، خواہ آپ مرتے دم تک اسے ولی سمجھتے اور مانتے چلے جائیں۔ اب رہا یہ سوال کہ صرف اللہ ہی کے ولیِ حقیقی ہونے اور دوسرے کسی کے نہ ہونے کی دلیل کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کا حقیقی ولی وہی ہو سکتا ہے جو موت کو حیات میں تبدیل کرتا ہے،

جس نے بے جان مادّوں میں جان ڈال کر جیتا جاگتا انسان پیدا کیا ہے، اور جو حقِ ولایت ادا کرنے کی قدرت اور اختیارات بھی رکھتا ہے۔ وہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور ہوتو اسے ولی بناؤ، اور اگر وہ صرف اللہ ہی ہے، تو پھر اس کے سوا کسی اور کو اپنا ولی بنالینا جہالت وحماقت اور خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۱۳ – اس پورے پیراگراف کی عبارت اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے، لیکن اس میں متکلّم اللہ تعالیٰ نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا اللہ جَلَّ شانُہٗ اپنے نبی کو ہدایت دے رہا ہے کہ تم یہ اعلان کرو۔ اس طرح کے مضامین قرآنِ مجید میں کہیں تو قُلْ (اے نبی! کہو) سے شروع ہوتے ہیں، اور کہیں اس کے بغیر ہی شروع ہوجاتے ہیں، صرف اندازِ کلام بتادیتا ہے کہ یہاں متکلّم اللہ نہیں بلکہ اللہ کا رسول ہے۔ بلکہ بعض مَقامات پر تو کلام اللہ کا ہوتا ہے اور متکلّم اہلِ ایمان ہوتے ہیں، جیسے مثلاً سورۂ فاتحہ میں ہے، یا متکلم فرشتے ہوتے ہیں، جیسے مثلاً سورۂ مریم، آیت ۶۴-۶۵ میں ہے۔

۱۴ – یہ اللہ تعالیٰ کے مالکِ کائنات اور ولیِ حقیقی ہونے کا فطری اور منطقی تقاضا ہے۔ جب بادشاہی اور وِلایَت اُسی کی ہے تو لامحالہ پھر حاکم بھی وہی ہے اور انسانوں کے باہمی تنازُعات واختلافات کا فیصلہ کرنا بھی اُسی کا کام ہے۔ اس کو جو لوگ صرف آخرت کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، وہ غلطی کرتے ہیں۔ کوئی دلیل اس امر کی نہیں ہے کہ اللہ کی یہ حاکمانہ حیثیت اِس دنیا کے لیے نہیں بلکہ صرف موت کے بعد کی زندگی کے لیے ہے۔ اِسی طرح جو لوگ اِس دنیا میں صرف عقائد اور چند ''مذہبی'' مسائل تک اسے محدود قرار دیتے ہیں، وہ بھی غلطی پر ہیں۔ قرآنِ مجید کے الفاظ عام ہیں، اور وہ صاف صاف عَلَی الاطلاق تمام نزاعات واختلافات میں اللہ کو فیصلہ کرنے کا اصل حق دار قرار دے رہے ہیں۔ ان کی رُو سے اللہ جس طرح آخرت کا مالک یوم الدین ہے، اسی طرح اِس دنیا کا بھی احکم الحاکمین ہے۔ اور جس طرح وہ اعتقادی اختلافات میں یہ طے کرنے والا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، ٹھیک اُسی طرح قانونی حیثیت سے بھی وہی یہ طے کرنے والا ہے کہ انسان کے لیے پاک کیا ہے اور ناپاک کیا، جائز اور حلال کیا ہے اور حرام ومکروہ کیا، اَخلاق میں بدی وزِشتی کیا ہے اور نیکی وخوبی کیا، معاملات میں کس کا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے، معاشرت اور تمدّن اور سیاست اور معیشت میں کون سے طریقے دُرست ہیں اور کون سے غلط۔ آخر اسی بنیاد پر تو قرآن میں یہ بات اُصولِ قانون کے طور پر ثبت کی گئی ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹) اور وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب: ۳۶) اور اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف: ۳)

پھر جس سِیاق وسَباق میں یہ آیت آئی ہے، اُس کے اندر یہ ایک اور معنیٰ بھی دے رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اختلافات کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا محض قانونی حق ہی نہیں ہے، جس کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کافر ومومن ہونے کا مدار ہے، بلکہ اللہ فی الواقع عملاً بھی حق اور باطل کا فیصلہ کررہا ہے، جس کی بدولت باطل اور اس کے پرستار آخرکار تباہ ہوتے ہیں اور حق اور اس کے پرستار سرفراز کیے جاتے ہیں، خواہ اِس فیصلے کے نفاذ میں دنیا والوں کو کتنی ہی تاخیر ہوتی نظر آتی ہو۔ یہ مضمون آگے آیت ۲۴ میں بھی آرہا ہے، اور اس سے پہلے قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر گزر چکا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرَّعد، حواشی ۴-۳۴-۶۰، ابراہیم، حواشی ۲۶-۳۴ تا ۴۰، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۰۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۵ تا ۱۸۔ ۴۴ تا ۴۶)

عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ ۖ وَ اِلَيۡهِ اُنِيۡبُ ۝١٠ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ
جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ مِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ
يَذۡرَؤُكُمۡ فِيۡهِ ؕ لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ۝١١ لَهٗ
مَقَالِيۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ

رب ہے، اُسی پر میں نے بھروسا کیا، اور اسی کی طرف میں رُجوع کرتا ہوں[16]۔ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، جس نے تمھاری اپنی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے، اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انھی کے ہم جنس) جوڑے بنائے، اور اِس طریقے سے وہ تمھاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں[17]، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے[18]۔ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں، جسے چاہتا ہے کُھلا رزق

---

۱۵ – یعنی جو اختلافات کا فیصلہ کرنے والا اصل حاکم ہے۔

۱۶ – یہ دو فعل ہیں، جن میں سے ایک بصیغۂ ماضی بیان کیا گیا ہے اور دوسرا بصیغۂ مضارع جس میں اِستمرار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ صیغۂ ماضی میں فرمایا: ''میں نے اُسی پر بھروسا کیا''، یعنی ایک دفعہ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر لیا کہ جیتے جی مجھے اُسی کی مدد، اُسی کی رہنمائی، اُسی کی حمایت و حفاظت، اور اُسی کے فیصلے پر اعتماد کرنا ہے۔ پھر صیغۂ مضارع میں فرمایا: ''میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''، یعنی جو معاملہ بھی مجھے اپنی زندگی میں پیش آتا ہے، میں اُس میں اللہ ہی کی طرف رُجوع کیا کرتا ہوں۔ کوئی مصیبت، تکلیف، یا مشکل پیش آتی ہے تو کسی کی طرف نہیں دیکھتا، اُس سے مدد مانگتا ہوں۔ کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو اُس کی پناہ ڈھونڈتا ہوں اور اُس کی حفاظت پر بھروسا کرتا ہوں۔ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو اُس سے رہنمائی طلب کرتا ہوں اور اُسی کی تعلیم و ہدایت میں اُس کا حل یا حکم تلاش کرتا ہوں۔ اور کسی سے نزاع ہوتی ہے تو اُسی کی طرف دیکھتا ہوں کہ اُس کا آخری فیصلہ وہی کرے گا، اور یقین رکھتا ہوں کہ جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہی حق ہوگا۔

۱۷ – اصل الفاظ ہیں: لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ ''کوئی چیز اُس کے مانند جیسی نہیں ہے۔'' مفسرین اور اہلِ لغت میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس میں لفظِ مثل پر کاف (حرفِ تشبیہ) کا اضافہ محاورے کے طور پر کیا گیا ہے، جس سے مقصود محض بات میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے، اور عرب میں یہ طرزِ بیان رائج ہے۔ مثلاً شاعر کہتا ہے: وقتلٰی کمثل جذوع النخل۔ اور ایک دوسرا شاعر کہتا ہے: ما ان کمثلھم فی الناس من احد۔ بعض دوسرے حضرات کا قول یہ ہے کہ ''اس جیسا کوئی نہیں'' کہنے کے بجائے ''اُس کے مثل جیسا کوئی نہیں'' کہنے میں مبالغہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر بفرضِ محال اللہ کا کوئی مثل ہوتا تو اُس جیسا بھی کوئی نہ ہوتا، کجا کہ خود اللہ جیسا کوئی ہو۔

وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ⑫ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى
بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ
مُوْسٰى وَ عِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ

دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے، اُسے ہر چیز کا علم ہے۔[19]

اُس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوحؑ کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ!) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اِس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اِس دین کو اور اُس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔[20] یہی بات

۱۸ – یعنی بیک وقت ساری کائنات میں ہر ایک کی سُن رہا ہے اور ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

۱۹ – یہ دلائل ہیں اِس امر کے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کیوں ولی برحق ہے، اور کیوں اسی پر توکُّل کرنا صحیح ہے، اور کیوں اسی کی طرف رُجوع کیا جانا چاہیے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳ تا ۸۳، الروم، حواشی ۲۵ تا ۳۱)

۲۰ – یہاں اُسی بات کو پھر زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو پہلی آیت میں ارشاد ہوئی تھی۔ اِس میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں ہیں، نہ انبیاؑ میں سے کوئی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی گزرا ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے ایک ہی دین ہے جسے شروع سے تمام انبیاؑ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، اور اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا نام لیا گیا ہے جو طوفان کے بعد موجودہ نسلِ انسانی کے اوّلین پیغمبر تھے، اُس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے جو آخری نبی ہیں، پھر حضرت ابراہیمؑ کا نام لیا گیا ہے جنھیں اہلِ عرب اپنا پیشوا مانتے تھے، اور آخر میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا گیا ہے جن کی طرف یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کو منسوب کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اِنھی پانچ انبیاؑ کو اُس دین کی ہدایت کی گئی تھی۔ بلکہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاؑ بھی آئے ہیں، سب ایک ہی دین لے کر آئے ہیں، اور نمونے کے طور پر اُن پانچ جلیل القدر انبیاؑ کا نام لے دیا گیا ہے جن سے دنیا کو معروف ترین آسمانی شریعتیں ملی ہیں۔

یہ آیت چونکہ دین اور اس کے مقصود پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس پر پوری طرح غور کر کے اسے سمجھا جائے:

فرمایا کہ شَرَعَ لَكُمْ ''مقرر کیا تمھارے لیے''۔ شرع کے لغوی معنیٰ راستہ بنانے کے ہیں، اور اِصطِلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ عَرَبی زبان میں اسی اِصطلاحی معنیٰ کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی

(legislation) کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون (law) کا، اور شارع کا لفظ واضعِ قانون (lawgiver) کا ہم معنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ یہ تشریعِ خداوندی دراصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے اُن اُصولی حقائق کا جو اُوپر آیت نمبر ۱، ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں کہ اللہ ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے، اور وہی انسان کا حقیقی ولی ہے، اور انسانوں کے درمیان جس امر میں بھی اختلاف ہو اُس کا فیصلہ کرنا اُسی کا کام ہے۔ اب چونکہ اُصولاً اللہ ہی مالک اور ولی اور حاکم ہے، اس لیے لامحالہ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ انسان کے لیے قانون و ضابطہ بنائے، اور اسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون و ضابطہ دے۔ چنانچہ اپنی اس ذمہ داری کو اس نے یوں ادا کر دیا ہے۔

پھر فرمایا: مِّنَ الدِّيْنِ، ''از قسم دین''۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ''از آئین'' کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تشریع فرمائی ہے، اس کی نوعیت آئین کی ہے۔ لفظِ ''دین'' کی جو تشریح ہم اس سے پہلے سورۂ زُمَر، حاشیہ نمبر ۳ میں کر چکے ہیں، وہ اگر نگاہ میں رہے تو یہ سمجھنے میں کوئی اُلجھن پیش نہیں آ سکتی کہ دین کے معنیٰ ہی کسی کی سیادت و حاکمیت تسلیم کر کے اس کے احکام کی اطاعت کرنے کے ہیں۔ اور جب یہ لفظ طریقے کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ طریقہ ہوتا ہے جسے آدمی واجب الاتباع اور جس کے مقرر کرنے والے کو مطاع مانے۔ اِس بنا پر اللہ کے مقرر کیے ہوئے اِس طریقے کو دین کی نوعیت رکھنے والی تشریع کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی حیثیت محض سِفارش (recommendation) اور وعظ و نصیحت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بندوں کے لیے اُن کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے جس کی پیروی نہ کرنے کے معنیٰ بغاوت کے ہیں، اور جو شخص اس کی پیروی نہیں کرتا وہ دراصل اللہ کی سیادت و حاکمیت اور اپنی بندگی کا انکار کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع وہی ہے جس کی ہدایت نوح اور ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھی، اور اُسی کی ہدایت اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ اس ارشاد سے کئی باتیں نکلتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اِس تشریع کو براہِ راست ہر انسان کے پاس نہیں بھیجا ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً جب اس نے مناسب سمجھا ہے ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کر کے یہ تشریع اس کے حوالے کی ہے۔ دوسرے، یہ کہ یہ تشریع ابتدا سے یکساں رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی زمانے میں کسی قوم کے لیے کوئی دین مقرر کیا گیا ہو، اور کسی دوسرے زمانے میں کسی اور قوم کے لیے اُس سے مختلف اور متضاد دین بھیج دیا گیا ہو۔ خدا کی طرف سے بہت سے دین نہیں آئے ہیں، بلکہ جب بھی آیا ہے یہی ایک دین آیا ہے۔ تیسرے، یہ کہ اللہ کی سیادت و حاکمیت ماننے کے ساتھ اُن لوگوں کی رسالت کو ماننا، جن کے ذریعے سے یہ تشریع بھیجی گئی ہے، اور اُس وحی کو تسلیم کرنا جس میں یہ تشریع بیان کی گئی ہے، اِس دین کا لازمی جُز ہے، اور عقل و مَنطِق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو لازمی جز ہونا چاہیے، کیونکہ آدمی اس تشریع کی اطاعت کر ہی نہیں سکتا جب تک وہ اُس کے خدا کی طرف سے مستند (authentic) ہونے پر مطمئن نہ ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان سب انبیاؑ کو دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع اِس ہدایت اور تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ۔ اِس فقرے کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ''قائم کنید دین را'' کیا ہے، اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ''قائم رکھو دین کو''۔ یہ دونوں ترجمے دُرست ہیں۔ اِقامت کے معنیٰ قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی، اور انبیا علیہم السلام اِن دونوں ہی کاموں پر مامور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم

کریں اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو، وہاں اسے قائم رکھیں۔ ظاہر بات ہے کہ قائم رکھنے کی نوبت آتی ہی اُس وقت ہے جب ایک چیز قائم ہو چکی ہو۔ ورنہ پہلے اسے قائم کرنا ہوگا، پھر یہ کوشش مسلسل جاری رکھنی پڑے گی کہ وہ قائم رہے۔

اب ہمارے سامنے دو سوالات آتے ہیں: ایک، یہ کہ دین کو قائم کرنے سے مراد کیا ہے؟ دوسرے، یہ کہ خود دین سے کیا مراد ہے، جسے قائم کرنے اور پھر قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے؟ اِن دونوں باتوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

قائم کرنے کا لفظ جب کسی مادّی یا جسمانی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد بیٹھے کو اُٹھانا ہوتا ہے، مثلاً کسی انسان یا جانور کو اُٹھانا۔ یا پڑی ہوئی چیز کو کھڑا کرنا ہوتا ہے، جیسے بانس یا ستون کو قائم کرنا۔ یا کسی چیز کے بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کر کے بلند کرنا ہوتا ہے، جیسے کسی خالی زمین میں عمارت قائم کرنا۔ لیکن جو چیزیں مادّی نہیں بلکہ معنوی ہوتی ہیں، اُن کے لیے جب قائم کرنے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اُس سے مراد اُس چیز کی محض تبلیغ کرنا نہیں، بلکہ اس پر کماحقّہٗ عمل در آمد کرنا، اسے رواج دینا اور اسے عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فُلاں شخص نے اپنی حکومت قائم کی، تو اس کے معنیٰ یہ نہیں ہوتے کہ اس نے اپنی حکومت کی طرف دعوت دی، بلکہ یہ ہوتے ہیں کہ اس نے ملک کے لوگوں کو اپنا مطیع کر لیا، اور حکومت کے تمام شعبوں کی ایسی تنظیم کر دی کہ ملک کا سارا انتظام اس کے احکام کے مطابق چلنے لگا۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ ملک میں عدالتیں قائم ہیں، تو اس کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ انصاف کرنے کے لیے منصف مقرر ہیں اور وہ مُقدّمات کی سَماعت کر رہے ہیں اور فیصلے دے رہے ہیں، نہ یہ کہ عدل و انصاف کی خوبیاں خوب خوب بیان کی جا رہی ہیں اور لوگ ان کے قائل ہو رہے ہیں۔ اسی طرح جب قرآنِ مجید میں حکم دیا جاتا ہے کہ نماز قائم کرو، تو اس سے مراد نماز کی دعوت و تبلیغ نہیں ہوتی بلکہ یہ ہوتی ہے کہ نماز کو اُس کی تمام شرائط کے ساتھ نہ صرف خود ادا کرو بلکہ ایسا انتظام کرو کہ وہ اہلِ ایمان میں باقاعدگی کے ساتھ رائج ہو جائے۔ مسجدیں ہوں، جمعہ و جماعت کا اہتمام ہو، وقت کی پابندی کے ساتھ اذانیں دی جائیں، امام اور خطیب مقرر ہوں، اور لوگوں کو وقت پر مسجدوں میں آنے اور نماز ادا کرنے کی عادت پڑ جائے۔ اس تشریح کے بعد یہ بات سمجھنے میں کوئی دِقّت پیش نہیں آ سکتی کہ انبیا علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں، اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کر لیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کر لیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین اُن میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے، تاکہ اس کے مطابق عمل در آمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اِس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آ سکتا۔ لیکن ہر صاحبِ عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اِس حکم میں دعوت و تبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے، بلکہ دین قائم کرنے اور قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے، مگر بجائے خود مقصد نہیں ہے، کجا کہ کوئی شخص اسے انبیاؑ کے مشن کا مقصدِ وحید قرار دے بیٹھے۔

اب دوسرے سوال کو لیجیے۔ بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیا علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے، اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا، اس لیے انھوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں، بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجا لانا ہے، یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اَخلاقی اُصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں

مشترک رہے ہیں۔لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کر لی گئی ہے، اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کر دی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اُس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دینِ بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیّدنا مسیح علیہ السلام کی اُمّت کو خراب کر دیا۔اس لیے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے، اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اِقامت کو غیر مقصود بالذات سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اَخلاقی اُصولوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔اِس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہُوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے، آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اَخلاقی اصول ہی ہیں، یا شرعی احکام بھی۔قرآنِ مجید کا جب ہم تتبّع کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے، ان میں حسبِ ذیل چیزیں بھی ہمیں ملتی ہیں:

(۱) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔(البیّنہ: آیت ۵) ''اور ان کو حکم نہیں دیا گیا مگر اس بات کا کہ یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی راست رَو ملّت کا دین ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اس دین میں شامل ہیں، حالانکہ اِن دونوں کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام پچھلی شریعتوں میں نماز کی یہی شکل و ہیئت، یہی اس کے اجزا، یہی اس کی رکعتیں، یہی اس کا قبلہ، یہی اُس کے اوقات، اور یہی اس کے دوسرے احکام رہے ہیں۔اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمام شریعتوں میں یہی اس کا نصاب، یہی اس کی شرحیں، اور یہی اس کی تحصیل اور تقسیم کے احکام رہے ہیں۔لیکن اختلافِ شرائع کے باوجود اللہ تعالیٰ اِن دونوں چیزوں کو دین میں شمار کر رہا ہے۔

(۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ...... اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ......(المائدہ: ۳) ''تمھارے لیے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سُوَر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور وہ جو گلا گُھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکّر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اُس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا، اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔نیز یہ بھی تمھارے لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب کام فسق ہیں۔آج کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا......'' اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکامِ شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ (التوبہ: ۲۹) ''جنگ کرو اُن لوگوں سے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔'' معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال و حرام

کے اُن احکام کو ماننا اور اُن کی پابندی کرنا بھی دین ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے دیے ہیں۔

(۴) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (النور: ۲) ''زانیہ عورت اور مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔'' مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یوسف: ۷۶) ''یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین میں پکڑ لینے کا مجاز نہ تھا۔'' اِس سے معلوم ہوا کہ فوج داری قانون بھی دین ہے۔ اگر آدمی خدا کے فوج داری قانون پر چلے تو وہ خدا کے دین کا پیرو ہے، اور اگر بادشاہ کے قانون پر چلے تو وہ بادشاہ کے دین کا پیرو۔

یہ چار تو وہ نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظِ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے جہنّم کی دھمکی دی ہے (مثلاً زِنا، سود خواری، قتلِ مومن، یتیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا، وغیرہ)، اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا ہے (مثلاً عملِ قومِ لُوط، اور لین دین میں قومِ شعیبؑ کا رَوِیّہ) اُن کا سدِّ باب لازماً دین ہی میں شمار ہونا چاہیے، اس لیے کہ دین اگر جہنم اور عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے نہیں آیا ہے تو اور کس چیز کے لیے آیا ہے؟ اسی طرح وہ احکامِ شریعت بھی دین ہی کا حصّہ ہونے چاہییں جن کی خلاف ورزی کو خلود فی النار کا موجب قرار دیا گیا ہے، مثلاً میراث کے احکام، جن کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ: وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۖ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (النساء: ۱۴) ''جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی اور اللہ کے حُدود سے تجاوز کرے گا، اللہ اس کو دوزخ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لیے رُسوا کُن عذاب ہے۔'' اسی طرح جن چیزوں کی حُرمت اللہ تعالیٰ نے پوری شدّت اور قطعیّت کے ساتھ بیان کی ہے، مثلاً ماں بہن اور بیٹی کی حرمت، شراب کی حُرمت، چوری کی حُرمت، جُوئے کی حُرمت، جھوٹی شہادت کی حُرمت، ان کی تحریم کو اگر اقامتِ دین میں شامل نہ کیا جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر ضروری احکام بھی دے دیے ہیں جن کا اِجرا مقصود نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً روزہ اور حج، اُن کی اِقامت کو بھی محض اس بہانے اِقامتِ دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا کہ رمضان کے ۳۰ روزے تو پچھلی شریعتوں میں نہ تھے، اور کعبے کا حج تو صرف اُس شریعت میں تھا جو اولادِ ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی۔

دراصل ساری غَلَط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (ہم نے تم میں سے ہر اُمّت کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کر دی) کا اُلٹا مطلب لے کر اسے یہ معنیٰ پہنا دیے گئے ہیں کہ شریعت چونکہ ہر اُمت کے لیے الگ تھی، اور حکم صرف اُس دین کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیا کے درمیان مشترک تھا، اس لیے اِقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سورۂ مائدہ میں جس مَقام پر یہ آیت آئی ہے، اُس کے پورے سِیاق وسَباق کو آیت ۴۱ سے آیت ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی اُمت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اُس اُمّت کے لیے دین تھی اور اُس کے دَورِ نبوت میں اُسی کی اِقامت مطلوب تھی۔

اور اب چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دَورِ نبوت ہے، اس لیے اُمّتِ محمدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اِس دَور کے لیے دین ہے اور اس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ رہا ان شریعتوں کا اختلاف، تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے، مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا، اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزا میں بھی فرق تھا۔ اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا، مگر رمضان کے ۳۰ روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اِقامتِ دین میں شامل ہے، مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزہ رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی اُمت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے، اُنھی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا، اور اب اقامت دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لیے شریعتِ محمدیہ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے، اس کے مطابق انھیں ادا کیا جائے۔ انھی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکام شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

قرآنِ مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا، اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیّت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ عَلانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اَخلاقی، تہذیبی اور قانونی وسیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصّے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کیے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ (النساء:۱۰۵) ''اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے، تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اُس روشنی میں جو اللہ نے تمھیں دکھائی ہے۔'' اِس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کے جو احکام دیے گئے ہیں، وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصور رکھتے ہیں جو ایک مقرر قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمّہ لے۔ (التوبہ:۶۰-۱۰۳) اِس کتاب میں سود کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سود خواری جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔ (البقرہ: ۲۷۵-۲۷۹) وہ اُسی صورت میں رُوبہ عمل آسکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور مَعاشی نظام پوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اِس کتاب میں قاتل سے قِصاص لینے کا حکم (البقرہ، ۱۷۸)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ: ۳۸)، زِنا اور قَذف پر حد جاری کرنے کا حکم (النور: ۲-۴) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ اِن احکام کے ماننے والے لوگوں کو کفار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہنا ہوگا۔ اس کتاب میں کفار سے قِتال کا حکم (البقرہ: ۱۹۰-۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کر کے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ اِس کتاب میں اہلِ کتاب سے جِزیہ لینے کا حکم (التوبہ: ۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے اُن سے جزیہ وصول کریں گے اور اُن کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔ اور یہ معاملہ صرف مَدَنی سورتوں ہی تک محدود نہیں ہے، مکّی سورتوں میں بھی دِیدۂ بینا کو عَلانیہ یہ نظر آسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیشِ نظر تھا وہ دین کے غلبہ و اقتدار کا تھا، نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہلِ دین کے

ذِمّی بن کر رہنے کا۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۸۹-۹۹-۱۰۱۔ جلد سوم، القصص، ۱۰۴-۱۰۵، الروم، ۱ تا ۳۔ جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۱۷۱ تا ۱۷۹ (حواشی ۹۳-۹۴)، صٓ، دیباچہ اور آیت ۱۱ مع حاشیہ ۱۲۔

سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے، وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عظیم الشان کام ہے جو حضورؐ نے ۲۳ سال کے زمانۂ رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپؐ نے تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو مُسخّر کیا، اور اُس میں ایک مکمل حکومت کا نظام ایک مفصل شریعت کے ساتھ قائم کر دیا جو اعتقادات اور عبادات سے لے کر شخصی کردار، اجتماعی اَخلاق، تہذیب وتمدُّن، معیشت و معاشرت، سیاست وعدالت اور صلح وجنگ تک زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی۔ اگر حضورؐ کے اس پورے کام کو ''اقامتِ دین'' کے اُس حکم کی تفسیر نہ مانا جائے جو اس آیت کے مطابق تمام انبیاؑ سمیت آپؐ کو دیا گیا تھا، تو پھر اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں: یا تو معاذ اللہ! حضورؐ پر یہ الزام عائد کیا جائے کہ آپؐ مامور تو صرف ایمانیات اور اَخلاق کے موٹے موٹے اُصولوں کی محض تبلیغ ودعوت پر ہوئے تھے، مگر آپؐ نے اس سے تجاوز کر کے بطورِ خود ایک حکومت قائم کر دی اور ایک مفصل قانون بنا ڈالا، جو شرائعِ انبیاؑ کی قدرِ مشترک سے مختلف بھی تھا اور زائد بھی۔ یا پھر اللہ تعالیٰ پر یہ الزام رکھا جائے کہ وہ سورۂ شُوریٰ میں مذکورۂ بالا اعلان کر چکنے کے بعد خود اپنی بات سے منحرف ہو گیا، اور اس نے اپنے آخری نبی سے نہ صرف وہ کام لیا جو اس سورت کی اعلان کردہ ''اقامتِ دین'' سے بہت کچھ زائد اور مختلف تھا، بلکہ اس کام کی تکمیل پر اپنے پہلے اعلان کے خلاف یہ دوسرا اعلان بھی کر دیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا)، اعاذنا اللہ من ذالک۔ ان دو صورتوں کے سوا اگر کوئی تیسری صورت ایسی نکلتی ہو جس سے ''اِقامتِ دین'' کی یہ تعبیر بھی قائم رہے اور اللہ یا اُس کے رسولؐ پر کوئی الزام بھی عائد نہ ہوتا ہو تو ہم ضرور اُسے معلوم کرنا چاہیں گے۔

اِقامتِ دین کا حکم دینے کے بعد، آخری بات جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ''دین میں تَفرِقہ نہ برپا کرو''، یا ''اس کے اندر متفرق نہ ہو جاؤ''۔ دین میں تَفرِقہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی دین کے اندر اپنی طرف سے کوئی نرالی بات ایسی نکالے جس کی کوئی معقول گنجایش اُس میں نہ ہو، اور اصرار کرے کہ اس کی نکالی ہوئی بات کے ماننے ہی پر کفر وایمان کا مدار ہے، پھر جو ماننے والے ہوں انھیں لے کر نہ ماننے والوں سے جدا ہو جائے۔ یہ نرالی بات کئی طرح کی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں جو چیز نہ تھی وہ اس میں لا کر شامل کر دی جائے۔ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں جو بات شامل تھی اسے نکال باہر کیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کی نُصوص میں تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی تاویلات کر کے نرالے عقائد اور انوکھے اعمال ایجاد کیے جائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کی باتوں میں ردّ وبدل کر کے اس کا حلیہ بگاڑا جائے، مثلاً جو چیز اہم تھی اسے غیر اہم بنا دیا جائے، اور جو چیز حد سے حدِ مباح کے درجے میں تھی اسے فرض وواجب، بلکہ اس سے بھی بڑھا کر اسلام کا رکنِ رَکین بنا ڈالا جائے۔ اسی طرح کی حرکتوں سے انبیا علیہم السلام کی اُمتوں میں پہلے تَفرِقہ برپا ہوا، پھر رفتہ رفتہ ان فرقوں کے مذاہب بالکل الگ مستقل ادیان بن گئے جن کے ماننے والوں میں اب یہ تصور تک باقی نہیں رہا ہے کہ کبھی ان سب کی اصل ایک تھی۔ اِس تَفرِقے کا اُس جائز اور معقول اختلافِ رائے سے کوئی تعلق نہیں ہے جو دین کے احکام کو سمجھنے اور نصوص پر غور کر کے اُن سے مسائل مُستنبَط کرنے میں فطری طور پر اہلِ علم کے درمیان واقع ہوتا ہے، اور جس کے لیے خود کتاب اللہ کے الفاظ میں لغت اور محاورے اور قواعدِ زبان کے لحاظ سے گنجایش

عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ
وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ وَ مَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ

اِن مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ!) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کرلیتا ہے، اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رُجوع کرے۔[۲۱]
لوگوں میں جو تَفَرِقہ رُونما ہوا، وہ اِس کے بعد ہوا کہ اُن کے پاس علم آچکا تھا،[۲۲] اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔[۲۳] اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک

ہوتی ہے۔ (اس موضوع پر مزید تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۲۲۰، آلِ عمران، حواشی ۱۶-۱۷، النساء، ۲۱۱ تا ۲۱۶، المائدہ، ۱۰۱، الانعام، ۱۴۱۔ جلد دوم، النحل، حواشی ۱۱۷ تا ۱۲۱۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۸۹ تا ۹۱، الحج، حواشی ۱۱۴ تا ۱۱۷، المومنون، ۴۵ تا ۴۸، القصص، ۲۷ تا ۴۷، الروم، ۵۰-۵۱)

۲۱ – یہاں پھر وہی بات دُہرائی گئی ہے جو اس سے پہلے آیت ۸-۹ میں ارشاد ہو چکی ہے اور جس کی تشریح ہم حاشیہ نمبر ۱۱ میں کر چکے ہیں۔ اس جگہ یہ بات ارشاد فرمانے کا مُدّعا یہ ہے کہ تم اِن لوگوں کے سامنے دین کی صاف شاہراہ پیش کر رہے ہو، اور یہ نادان اس نعمت کی قدر کرنے کے بجائے اُلٹے اس پر بگڑ رہے ہیں۔ مگر انھی کے درمیان انھی کی قوم میں وہ لوگ موجود ہیں جو اللہ کی طرف رُجوع کر رہے ہیں، اور اللہ بھی انھیں کھینچ کھینچ کر اپنی طرف لا رہا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی قسمت ہے کہ کوئی اِس نعمت کو پائے اور کوئی اس پر خار کھائے۔ مگر اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ اُسی کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو اس کی طرف بڑھے۔ دُور بھاگنے والوں کے پیچھے دَوڑنا اللہ کا کام نہیں ہے۔

۲۲ – یعنی تَفَرُّقے کا سبب یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ نہیں بھیجے تھے اور کتابیں نازل نہیں کی تھیں، اِس وجہ سے لوگ راہِ راست نہ جاننے کے باعث اپنے اپنے الگ مذہب اور مدارسِ فکر اور نظامِ زندگی خود ایجاد کر بیٹھے، بلکہ یہ تَفَرِقہ اُن میں اللہ کی طرف سے علم آجانے کے بعد رُونما ہوا۔ اس لیے اللہ اس کا ذمّہ دار نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ خود اُس کے ذمہ دار ہیں جنھوں نے دین کے صاف صاف اُصول اور شریعت کے واضح احکام سے ہٹ کر نئے نئے مذاہب و مسالک بنائے۔

۲۳ – یعنی اِس تَفَرِقَہ پردازی کا محرک کوئی نیک جذبہ نہیں تھا، بلکہ یہ اپنی نرالی اُپَج دکھانے کی خواہش، اپنا الگ جھنڈا بلند کرنے کی فکر، آپس کی ضِدَّم ضِدّا، ایک دوسرے کو زَک دینے کی کوشش، اور مال و جاہ کی طلب کا نتیجہ تھی۔ ہوشیار اور حوصلہ مند لوگوں نے دیکھا کہ بندگانِ خدا اگر سیدھے سیدھے خدا کے دین پر چلتے رہیں تو بس ایک خدا ہوگا جس کے آگے لوگ جھکیں گے، ایک رسول ہوگا جس کو لوگ پیشوا اور رہنما مانیں گے، ایک کتاب ہوگی جس کی طرف لوگ رُجوع کریں گے، اور

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ

وقتِ مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قَضِیّہ چُکا دیا گیا ہوتا۔[۲۴] اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ اُس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔[۲۵]

چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے، اس لیے اے محمدؐ! اب تم اُسی دین کی طرف دعوت دو، اور

ایک صاف عقیدہ اور بے لاگ ضابطہ ہوگا جس کی پیروی وہ کرتے رہیں گے۔ اس نظام میں اُن کی اپنی ذات کے لیے کوئی مقامِ امتیاز نہیں ہوسکتا جس کی وجہ سے ان کی مَشِیْخَت چلے، اور لوگ اُن کے گرد جمع ہوں، اور ان کے آگے سر بھی جھکائیں اور جیبیں بھی خالی کریں۔ یہی وہ اصل سبب تھا جو نئے نئے عقائد اور فلسفے، نئے نئے طرزِ عبادت اور مذہبی مراسم، اور نئے نئے نظامِ حیات ایجاد کرنے کا محرّک بنا، اور اسی نے خلقِ خدا کے ایک بڑے حصّے کو دین کی صاف شاہراہ سے ہٹا کر مختلف راہوں میں پراگندہ کر دیا۔ پھر یہ پراگندگی اِن گروہوں کی باہمی بحث وجدال اور مذہبی ومَعاشی اور سیاسی کشمکش کی بدولت شدید تلخیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ نوبت اُن خوں ریزیوں تک پہنچی جن کے چھینٹوں سے تاریخِ انسانی سُرخ ہو رہی ہے۔

۲۴ – یعنی دنیا ہی میں عذاب دے کر ان سب لوگوں کا خاتمہ کر دیا جاتا جو گمراہیاں نکالنے اور جان بوجھ کر ان کی پیروی کرنے کے مجرم تھے، اور صرف راہِ راست پر چلنے والے باقی رکھے جاتے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ خدا کے نزدیک حق پر کون ہیں اور باطل پر کون۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دوٹوک فیصلہ قیامت تک کے لیے ملتوی کر رکھا ہے، کیونکہ دنیا میں یہ فیصلہ کر دینے کے بعد بنی نوعِ انسان کی آزمائش بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔

۲۵ – مطلب یہ ہے کہ ہر نبی اور اُس کے قریبی تابعین کا دور گزر جانے کے بعد جب پچھلی نسلوں تک کتاب اللہ پہنچی تو انھوں نے اسے یقین واعتماد کے ساتھ نہیں لیا، بلکہ وہ اس کے متعلق سخت شکوک اور ذہنی اُلجھنوں میں مبتلا ہوگئیں۔ اس حالت میں اُن کے مبتلا ہو جانے کے بہت سے وُجوہ تھے، جنھیں ہم اُس صورتِ حال کا مُطالَعہ کر کے بآسانی سمجھ سکتے ہیں جو توراۃ وانجیل کے معاملے میں پیش آئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو اگلی نسلوں نے اُن کی اصل حالت پر اُن کی اصل عبارت اور زبان میں محفوظ رکھ کر پچھلی نسلوں تک نہیں پہنچایا۔ اُن میں خدا کے کلام کے ساتھ تفسیر وتاریخ اور سَماعی رِوایات اور فُقَہا کے نکالے ہوئے جزئیات کی صورت میں انسانی کلام گڈمڈ کر دیا۔ ان کے ترجموں کو اتنا رواج دیا کہ اصل غائب ہوگئی اور صرف ترجمے باقی رہ گئے۔ ان کی تاریخی سند بھی اس طرح ضائع کر دی کہ اب کوئی شخص بھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جو کتاب اس کے ہاتھ میں ہے، وہ وہی ہے جو حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کے ذریعے سے دنیا والوں کو ملی تھی۔ پھر ان کے اکابر نے وقتاً فوقتاً مذہب، الٰہیات، فلسفہ، قانون،

اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ

جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور اِن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو،[۲۶] اور ان سے کہہ دو کہ: "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا۔[۲۷] مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔[۲۸] اللہ ہی[۲۹] ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔[۳۰]

طبعیات، نفسیات اور اجتماعیات کی ایسی بحثیں چھیڑیں اور ایسے نظامِ فکر بنا ڈالے جن کی بُھول بُھلیّوں میں پھنس کر لوگوں کے لیے یہ طے کرنا محال ہو گیا کہ ان پیچیدہ راستوں کے درمیان حق کی سیدھی شاہراہ کون سی ہے۔ اور چونکہ کتاب اللہ اپنی اصل حالت اور قابلِ اعتماد صورت میں موجود نہ تھی، اس لیے لوگ کسی ایسی سند کی طرف رُجوع بھی نہ کر سکتے تھے جو حق کو باطل سے مُمیّز کرنے میں ان کی مدد کرتی۔

۲۶ - یعنی ان کو راضی کرنے کے لیے اِس دین کے اندر کوئی ردّو بدل اور کمی بیشی نہ کرو۔ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اُصول پر اِن گمراہ لوگوں سے کوئی مُصالحَت نہ کرو۔ اِن کے اَوہام اور تعصُّبات اور جاہلانہ طور طریقوں کے لیے دین میں کوئی گنجایش محض اِس لالچ میں آ کر نہ نکالو کہ کسی نہ کسی طرح یہ دائرۂ اسلام میں آ جائیں۔ جس کو ماننا ہے، خدا کے اصلی اور خالص دین کو، جیسا کہ اس نے بھیجا ہے، سیدھی طرح مان لے، ورنہ جس جہنم میں جا کر گرنا چاہے گر جائے۔ خدا کا دین لوگوں کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔ لوگ اگر اپنی فلاح چاہتے ہیں تو خود اپنے آپ کو بدل کر اس کے مطابق بنائیں۔

۲۷ - بالفاظِ دیگر، مَیں اُن تَفرِقَہ پرداز لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو خدا کی بھیجی ہوئی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ میں ہر اُس کتاب کو مانتا ہوں جسے خدا نے بھیجا ہے۔

۲۸ - اِس جامع فقرے کے کئی مطلب ہیں:

ایک مطلب یہ ہے کہ میں ان ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصُّب برتُوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے، اور وہ ہے سراسر عدل و انصاف کا تعلق۔ جس کی جو بات حق ہے، میں اس کا ساتھی ہوں، خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے، میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں جس حق کو تمھارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں، اس میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ؕ﴿۱۵﴾ وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ
مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ عَلَيْهِمْ

اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے۔"

اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے دین کے معاملے میں جھگڑے کرتے ہیں [۳۱]، اُن کی حُجّت بازی اُن کے رب کے نزدیک باطل ہے، اور اُن پر

ہے، بلکہ وہ سب کے لیے یکساں ہے۔ اس میں اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر، شریف اور کمین کے لیے الگ الگ حُقوق نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ سب کے لیے حق ہے، جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے، اور جو جُرم ہے وہ سب کے لیے جرم ہے۔ اِس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لیے بھی کوئی اِستثنا نہیں۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ میں دنیا میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ میرے سُپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے درمیان انصاف کروں، اور اُن بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا خاتمہ کر دوں جو تمھاری زندگیوں میں اور تمھارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔

ان تین مطالب کے علاوہ اس فقرے کا ایک چوتھا مطلب بھی ہے جو مکّۂ معظّمہ میں نہ کُھلا تھا، مگر ہجرت کے بعد کُھل گیا، اور وہ یہ ہے کہ میں خدا کا مقرر کیا ہوا قاضی اور جج ہوں، تمھارے درمیان انصاف کرنا میری ذمہ داری ہے۔

۲۹ – یعنی ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے عمل کا خود ذمہ دار و جواب دِہ ہے۔ تم اگر نیکی کرو گے تو اس کا پھل ہمیں نہیں پہنچ جائے گا، بلکہ تم ہی اس سے مُتمتّع ہو گے۔ اور ہم اگر بُرائی کریں گے تو اس کی پاداش میں تم نہیں پکڑے جاؤ گے، بلکہ ہمیں خود ہی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہی بات سورۂ بَقَرہ، آیت ۱۳۹، سورۂ یُونُس، آیت ۴۱، سورۂ ہود، آیت ۳۵، اور سورۂ قصص، آیت ۵۵ میں اس سے پہلے ارشاد ہو چکی ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۲۹۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۴۹، ہود، حاشیہ ۳۹، القصص، حاشیہ ۷۷)

۳۰ – یعنی معقول دلائل سے بات سمجھانے کا جو حق تھا، وہ ہم نے ادا کر دیا۔ اب خواہ مخواہ تُو تُو مَیں مَیں کرنے سے کیا حاصل؟ تم اگر جھگڑا کرو بھی تو ہم تم سے جھگڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۳۱ – یہ اشارہ ہے اُس صورتِ حال کی طرف جو مکّے میں اُس وقت آئے دن پیش آ رہی تھی۔ جہاں کسی کے متعلق لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے، مدّتوں اس کی جان ضِیق میں کیے رکھتے، نہ گھر میں اسے چین لینے دیا جاتا نہ محلّے اور برادری میں، جہاں بھی وہ جاتا ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ جاتی، جس کا مدّعا یہ ہوتا کہ کسی طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر اسی جاہلیت میں پلٹ آئے جس سے وہ نکلا ہے۔

غَضَبٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝١٦ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
وَالْمِيْزَانَ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝١٧ يَسْتَعْجِلُ بِهَا
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَ
يَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ
ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ۝١٨ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ

اس کا غضب ہے اور اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔

وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے[۳۲]۔ اور تمھیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ لگی ہو[۳۳]۔ جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں، مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔ خوب سُن لو، جو لوگ اُس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں، وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔

اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے[۳۴]۔ جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے[۳۵]، اور وہ بڑی قوت والا

۳۲ — میزان سے مراد اللہ کی شریعت ہے، جو ترازو کی طرح تول کر صحیح اور غلط، حق اور باطل، ظلم اور عدل، راستی اور ناراستی کا فرق واضح کر دیتی ہے۔ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا گیا تھا کہ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان انصاف کروں۔) یہاں بتا دیا گیا کہ اِس کتابِ پاک کے ساتھ وہ میزان آ گئی ہے جس کے ذریعے سے یہ انصاف قائم کیا جائے گا۔

۳۳ — یعنی جس کو سیدھا ہونا ہے بلا تاخیر سیدھا ہو جائے۔ فیصلے کی گھڑی کو دُور سمجھ کر ٹالنا نہیں چاہیے۔ ایک سانس کے متعلق بھی آدمی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کے بعد دوسرے سانس کی اُسے مُہلت ضرور ہی مل جائے گی۔ ہر سانس آخری سانس ہو سکتا ہے۔

۳۴ — اصل میں لفظ لَطِيْفٌ استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہوم ''مہربان'' سے ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ میں دو مفہوم شامل ہیں: ایک، یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر بڑی شفقت و عنایت رکھتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ بڑی باریک بینی کے ساتھ

ع ۲

الْعَزِيْزُ ﴿۱۹﴾ع مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ
كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ
مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ

اور زبردست ہے۔[۳۶] ع جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔[۳۷]

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنھوں نے اِن کے لیے دین کی نوعیّت رکھنے والا ایک ایسا

اُن کی دَقیق ترین ضروریات پر بھی نگاہ رکھتا ہے جن تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی، اور انھیں اس طرح پورا کرتا ہے کہ وہ خود بھی محسوس نہیں کرتے کہ ہماری کون سی ضرورت کب کس نے پوری کر دی۔ پھر یہاں بندوں سے مراد محض اہلِ ایمان نہیں، بلکہ تمام بندے ہیں، یعنی اللہ کا یہ لطف اس کے سب بندوں پر عام ہے۔

۳۵ — مطلب یہ ہے کہ اِس لطفِ عام کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سب بندوں کو سب کچھ یکساں دے دیا جائے۔ اگرچہ وہ اپنے خزانوں سے دے سب ہی کو رہا ہے، مگر اس عطا اور دین میں یکسانی نہیں ہے۔ کسی کو کوئی چیز دی ہے، تو کسی دوسرے کو کوئی اور چیز۔ کسی کو ایک چیز زیادہ دی ہے، تو کسی اور کو کوئی دوسری چیز فراوانی کے ساتھ عطا فرما دی ہے۔

۳۶ — یعنی اس کی عطا و بخشش کا یہ نظام اس کے اپنے زور پر قائم ہے۔ کسی کا یہ بَل بُوتا نہیں ہے کہ اسے بدل سکے، یا زبردستی اس سے کچھ لے سکے، یا کسی کو دینے سے اس کو روک سکے۔

۳۷ — گزشتہ آیت میں دو حقیقتیں بیان کی گئی تھیں جن کا مُشاہدہ ہم ہر وقت ہر طرف کر رہے ہیں۔ ایک، یہ کہ تمام بندوں پر اللہ کا لُطف عام ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس کی عطا و بخشش اور رزق رسانی سب کے لیے یکساں نہیں ہے، بلکہ اُس میں فرق و تفاوُت پایا جاتا ہے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اس لُطف اور رزق رسانی میں جزوی تفاوُت تو بے شمار ہیں، مگر ایک بہت بڑا اُصولی تفاوُت بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آخرت کے طالب کے لیے ایک طرح کا رزق ہے، اور دنیا کے طالب کے لیے دوسری طرح کا رزق۔

یہ ایک بڑی اہم حقیقت ہے جسے اِن مختصر الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے پوری تفصیل کے ساتھ سمجھ لیا جائے، کیونکہ یہ ہر انسان کو اپنا رَویّہ متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔

آخرت اور دنیا دونوں کے لیے سعی وعمل کرنے والوں کو اس آیت میں کسان سے تشبیہ دی گئی ہے جو زمین تیار کرنے سے لے کر فصل کے تیار ہونے تک مسلسل عرق ریزی اور جاں فشانی کرتا ہے، اور یہ ساری محنتیں اس غرض کے لیے کرتا ہے کہ اپنی کھیتی میں جو بیج وہ بو رہا ہے اس کی فصل کاٹے اور اس کے پھل سے متمتّع ہو۔ لیکن نیت اور مقصد کے فرق، اور بہت بڑی حد تک طرزِ عمل کے فرق سے

يَأْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ

طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اِذن نہیں دیا؟[۳۸] اگر فیصلے کی بات پہلے طے نہ ہو گئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا

بھی، آخرت کی کھیتی بونے والے کسان اور دنیا کی کھیتی بونے والے کسان کے درمیان فرقِ عظیم واقع ہو جاتا ہے، اس لیے دونوں کی محنتوں کے نتائج وثمرات بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف رکھے ہیں' حالانکہ دونوں کے کام کرنے کی جگہ یہی زمین ہے۔

آخرت کی کھیتی بونے والے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ دنیا اسے نہیں ملے گی۔ دنیا تو کم یا زیادہ بہر حال اس کو ملنی ہی ہے، کیونکہ یہاں اللہ جَلَّ شانُہٗ کے لُطفِ عام میں اس کا بھی حصّہ ہے، اور رزق نیک و بد سبھی کو یہاں مل رہا ہے۔ لیکن اللہ نے اُسے خوشخبری دنیا ملنے کی نہیں بلکہ اس بات کی سنائی ہے کہ اس کی آخرت کی کھیتی بڑھائی جائے گی، کیونکہ اُسی کا وہ طالب ہے اور اُسی کے انجام کی اُسے فکر لاحق ہے۔ اس کھیتی کے بڑھائے جانے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ مثلاً جس قدر زیادہ نیک نیّتی کے ساتھ وہ آخرت کے لیے عملِ صالح کرتا جائے گا، اُسے اور زیادہ نیک عمل کی توفیق عطا کی جائے گی اور اس کا سینہ نیکیوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔ پاک مقصد کے لیے پاک ذرائع اختیار کرنے کا جب وہ تہیہ کرلے گا تو اس کے لیے پاک ہی ذرائع میں برکت دی جائے گی، اور اللہ اس کی نوبت نہ آنے دے گا کہ اس کے لیے خیر کے سارے دروازے بند ہو کر صرف شر ہی کے دروازے کھلے رہ جائیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ دنیا میں اس کی تھوڑی نیکی بھی آخرت میں کم از کم دس گُنی تو بڑھائی ہی جائے گی، اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، ہزاروں لاکھوں گُنی بھی اللہ جس کے لیے چاہے گا بڑھا دے گا۔

رہا دنیا کی کھیتی بونے والا، یعنی وہ شخص جو آخرت نہیں چاہتا اور سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے اس کی محنت کے دو نتائج صاف صاف سنا دیے ہیں: ایک، یہ کہ خواہ وہ کتنا ہی سر مارے، جس قدر دنیا وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ پوری کی پوری اسے نہیں مل جائے گی، بلکہ اس کا ایک حصّہ ہی ملے گا، جتنا اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ دوسرے، یہ کہ اسے جو کچھ ملنا ہے بس دنیا ہی میں مل جائے گا، آخرت کی بھلائیوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

۳۸ — اس آیت میں شُرَکَآءُ سے مراد، ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پُوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ بلکہ لامحالہ اُن سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریّات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اَخلاقی اُصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدّن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں، اور اپنی سیاست اور حکومت میں اِس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے۔ یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ ربّ العالَمین کی تشریع کے خلاف اور اس کے اِذن (sanction) کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا۔ اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۷۰ - ۲۸۶،

وَ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ
مِمَّا کَسَبُوۡا وَ ہُوَ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ ۚ لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ
الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِکَ الَّذِیۡ یُبَشِّرُ اللّٰہُ عِبَادَہُ الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا
الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ وَ مَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا ؕ

ہوتا[۳۹]۔ یقیناً اِن ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اُس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ اِن پر آکر رہے گا۔ بخلاف اِس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ جنّت کے گلستانوں میں ہوں گے، جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے، یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے اُن بندوں کو دیتا ہے جنھوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔ اَے نبیؐ! اِن لوگوں سے کہہ دو کہ میں اِس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں[۴۰]، البتہ قرابت کی محبّت ضرور چاہتا ہوں[۴۱]۔ جو کوئی بھلائی کمائے گا، ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔

آلِ عمران، حاشیہ ۵۷، النساء، حاشیہ ۹۰، المائدہ، حواشی ۱ تا ۵- ۱۰۴- ۱۰۵، الانعام، حواشی ۸۶- ۸۷- ۱۰۶- ۱۰۷- جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱، یونُس، حواشی ۶۰- ۶۱، ابراہیم، حواشی ۳۰ تا ۳۲، النحل، حواشی ۱۱۴ تا ۱۱۶۔ جلد سوم، الکہف، حواشی ۴۹- ۵۰، مریم، حاشیہ ۲۷، القصص، حاشیہ ۸۶۔ جلد چہارم، سَبا، آیت ۴۱، حاشیہ ۶۳، یٰسین، آیت ۶۰، حاشیہ ۵۳)

۳۹ — یعنی اللہ کے مقابلے میں یہ ایسی سخت جسارت ہے کہ اگر فیصلہ قیامت پر نہ اُٹھا رکھا گیا ہوتا تو دنیا ہی میں ہر اُس شخص پر عذاب نازل کر دیا جاتا جس نے اللہ کا بندہ ہوتے ہوئے، اللہ کی زمین پر خود اپنا دین جاری کیا، اور وہ سب لوگ بھی تباہ کر دیے جاتے جنھوں نے اللہ کے دین کو چھوڑ کر دوسروں کے بنائے ہوئے دین کو قبول کیا۔

۴۰ — ’’اس کام‘‘ سے مراد وہ کوشش ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خدا کے عذاب سے بچانے اور جنت کی بشارت کا مستحق بنانے کے لیے کر رہے تھے۔

۴۱ - اصل الفاظ ہیں: اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى۔ یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر ''قُربیٰ'' کی مَحبّت ضرور چاہتا ہوں۔ اس لفظ ''قُربیٰ'' کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے۔

ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنیٰ میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ''میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہلِ قریش) کم از کم اُس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تُل گئے ہو۔'' یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالے سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمِذی، ابنِ جَرِیر، طَبَرانی، بَیْہَقی اور ابنِ سَعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مُجاہد، عِکْرِمَہ، قَتادہ، سُدِّی، ابو مالک، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ضَحّاک، عطا بن دینار اور دوسرے اکابر مفسرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ ''قُربیٰ'' کو قُرب اور تقرُّب کے معنیٰ میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ ''میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر اِس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمھارے اندر اللہ کے قُرب کی چاہت پیدا ہو جائے۔'' یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حَسَن بصریؒ سے منقول ہے، اور ایک قول قَتادہؒ سے بھی اِس کی تائید میں نقل ہوا ہے، بلکہ طَبَرانی کی ایک رِوایَت میں ابنِ عباسؓ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں ایک دوسرے مَقام پر یہی مضمون اِن الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الفرقان: ۵۷) ''اِن سے کہہ دو کہ میں اِس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔''

تیسرا گروہ ''قُربیٰ'' کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنیٰ میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ ''میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے مَحبّت کرو۔'' پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمُطَّلِب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جُبَیرؒ اور عَمْرو بن شُعَیبؒ سے منقول ہے، اور بعض رِوایات میں یہی تفسیر ابنِ عباسؓ اور حضرت علیؓ بن حسینؒ (زین العابدینؒ) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن متعدِّد وُجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو جس وقت مکۂ معظّمہ میں سورۂ شُوریٰ نازل ہوئی ہے، اُس وقت حضرت علیؓ و فاطمہؓ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمُطَّلِب میں سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ اُن میں سے بعض کُھلّم کُھلّا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمُطَّلِب ہی نہ تھے۔ آپؐ کی والدۂ ماجدہ، آپؐ کے والد ماجد اور آپؐ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپؐ کی رشتہ داریاں تھیں۔ اور ان سب گھرانوں میں آپؐ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی۔ آخر حضورؐ کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اَقرِبا میں سے آپؐ صرف بنی عبدالمُطَّلِب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبۂ مَحبّت کو انھی کے لیے مخصوص رکھتے۔ تیسری بات، جو ان سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مَقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اُس مَقام سے اِس کارِ عظیم پر

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿٢٣﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ
اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ

بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے۔[۴۲]

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اللہ پر جھُوٹا بُہتان گھڑ لیا ہے؟[۴۳] اگر اللہ چاہے تو تمھارے دل پر مُہر کر دے۔[۴۴] وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے۔[۴۵] وہ

یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے مَحبّت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔ قرآنِ مجید میں انبیا علیہم السلام کے جو قصے آئے ہیں، اُن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اُٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ ربّ العالمین کے ذمّے ہے۔ (یونُس، ۷۲۔ ہود، ۲۹-۵۱۔ الشعراء، ۱۰۹-۱۲۷-۱۴۵-۱۶۴-۱۸۰) سورۂ یٰسین میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے۔ (آیت ۲۱) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآنِ پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ (الاَنعام: ۹۰۔ یوسف: ۱۰۴۔ المومنون: ۷۲۔ الفرقان: ۵۷۔ سبا: ۴۷۔ ص: ۸۶۔ الطّور: ۴۰۔ القلم: ۴۶) اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ میں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں، اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے مَحبّت کرو۔ پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اُوپر سے ساری تقریر اُنھی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آ رہی ہے، اور آگے بھی رُوئے سُخن انھی کی طرف ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو اُن لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے اُن کے لیے انجام دیا ہو۔ کفار حضورؐ کے اس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپؐ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمھاری انجام دی ہے، اس پر تم میرے رشتہ داروں سے مَحبّت کرنا۔ وہ تو اُلٹا اِسے جرم سمجھ رہے تھے اور اُس کی بنا پر آپؐ کی جان کے درپے تھے۔

۴۲ — یعنی جان بُوجھ کر نافرمانی کرنے والے مجرمین کے برعکس، نیکی کی کوشش کرنے والے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ (۱) جتنی کچھ اپنی طرف سے وہ نیک بننے کی سعی کرتے ہیں، اللہ ان کو اس سے زیادہ نیک بنا دیتا ہے۔ (۲) ان کے کام میں جو کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، یا نیک بننے کی کوشش کے باوجود جو گناہ ان سے سرزد ہو جاتے ہیں، اللہ ان سے چشم پوشی کرتا ہے، اور (۳) جو تھوڑی سی نیک عمل کی پونجی وہ لے کر آتے ہیں، اللہ اس پر ان کی قدر افزائی کرتا ہے اور انھیں زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔

۴۳ — اِس سوالیہ فقرے میں سخت ملامت کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اَے نبیؐ! کیا یہ لوگ اس قدر جری اور بے باک ہیں کہ تم جیسے شخص پر افترا، اور وہ بھی اِفتِرا علَی اللہ جیسے گھناؤنے فعل کا الزام رکھتے ہوئے انھیں ذرا شرم نہیں آتی؟ یہ تم پر تہمت لگاتے ہیں کہ تم اس قرآن کو خود تصنیف کر کے جھوٹ مُوٹ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہو؟

عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ
وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ

سینوں کے چُھپے ہوئے راز جانتا ہے[۴۶]۔ وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور بُرائیوں سے درگزر کرتا ہے، حالانکہ تم لوگوں کے سب افعال کا اُسے علم ہے[۴۷]۔ وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دُعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اَور زیادہ دیتا ہے۔ رہے انکار کرنے والے،

۴۴ – یعنی اتنے بڑے جھوٹ صرف وہی لوگ بولا کرتے ہیں جن کے دلوں پر مُہر لگی ہوئی ہے۔ اگر اللہ چاہے تو تمھیں بھی اُن میں شامل کر دے۔ مگر اُس کا یہ فضل ہے کہ اُس نے تمھیں اِس گروہ سے الگ رکھا ہے۔ اس جواب میں اُن لوگوں پر شدید طنز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام رکھ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اَے نبیؐ! ان لوگوں نے تمھیں بھی اپنی قُماش کا آدمی سمجھ لیا ہے۔ جس طرح یہ خود اپنی اغراض کے لیے ہر بڑے سے بڑا جھوٹ بول جاتے ہیں، اِنھوں نے خیال کیا کہ تم بھی اُسی طرح اپنی دکان چمکانے کے لیے ایک جھوٹ گھڑ لائے ہو۔ لیکن یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اس نے تمھارے دل پر وہ مُہر نہیں لگائی ہے جو اِن کے دلوں پر لگا رکھی ہے۔

۴۵ – یعنی یہ اللہ کی عادت ہے کہ وہ باطل کو کبھی پائداری نہیں بخشتا، اور آخرِ کار حق کو حق ہی کر کے دکھا دیتا ہے، اس لیے اَے نبیؐ! تم اِن جھوٹے الزامات کی ذرّہ برابر پروا نہ کرو، اور اپنا کام کیے جاؤ۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ سارا جھوٹ غبار کی طرح اُڑ جائے گا، اور جس چیز کو تم پیش کر رہے ہو، اس کا حق ہونا عیاں ہو جائے گا۔

۴۶ – یعنی اُس کو معلوم ہے کہ یہ الزامات تم پر کیوں لگائے جا رہے ہیں، اور یہ ساری تگ ودَو جو تمھیں زُک دینے کے لیے کی جا رہی ہے، اس کے پیچھے درحقیقت کیا اغراض اور کیا نیتیں کام کر رہی ہیں۔

۴۷ – پچھلی آیت کے معاً بعد توبہ کی ترغیب دینے سے خود بخود یہ مضمون نکلتا ہے کہ ظالمو! سچّے نبی پر یہ جھوٹے الزامات رکھ کر کیوں اپنے آپ کو اَور زیادہ خدا کے عذاب کا مستحق بناتے ہو، اب بھی اپنی ان حرکتوں سے باز آجاؤ اور توبہ کر لو تو اللہ معاف فرما دے گا۔ توبہ کے معنٰی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کیے پر نادم ہو، جس بُرائی کا وہ مرتکب ہوا ہے یا ہوتا رہا ہے اس سے باز آ جائے، اور آیندہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ نیز یہ بھی سچّی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو بُرائی کسی شخص نے پہلے کی ہے، اُس کی تلافی کرنے کی وہ اپنی حد تک پوری کوشش کرے، اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، وہاں اللہ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اُس دھبّے کو دھوتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگا لیا ہے۔ لیکن کوئی توبہ اُس وقت تک حقیقی توبہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ ہو۔ کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی بُرے فعل کو چھوڑ دینا سرے سے توبہ کی تعریف ہی میں نہیں آتا۔

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي
الْأَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌ
بَصِيْرٌ ﴿٢٧﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ
رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٨﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾ ع

تو ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور اُن پر نگاہ رکھتا ہے[۴۸]۔ وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے، اور وہی قابلِ تعریف ولی ہے[۴۹]۔ اُس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جان دار مخلوقات جو اُس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں[۵۰]۔ وہ جب چاہے انھیں اکٹھا کر سکتا ہے[۵۱]۔ ع

۴۸ — جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اُسے نظر میں رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں دراصل اللہ تعالیٰ اُس بنیادی سبب کی طرف اشارہ فرما رہا ہے جو کفارِ مکّہ کی سرکشی میں کام کر رہا تھا۔ اگرچہ روم و ایران کے مقابلے میں ان کی کوئی ہستی نہ تھی اور گردوپیش کی قوموں میں وہ ایک پس ماندہ قوم کے ایک تجارت پیشہ قبیلے، یا بالفاظِ دیگر، بنجاروں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، مگر اپنی اس ذرا سی دنیا میں ان کو دوسرے عربوں کی بہ نسبت جو خوش حالی اور بڑائی نصیب تھی، اُس نے اُن کو اتنا مغرور و متکبر بنا دیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی کی بات پر کان دھرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے، اور ان کے سردارانِ قبائل اِس کو اپنی کسرِشان سمجھتے تھے کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پیشوا ہوں اور وہ ان کی پیروی کریں۔ اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کہیں ہم اِن چھوٹے ظرف کے لوگوں پر واقعی رزق کے دروازے کھول دیتے تو یہ بالکل ہی پھٹ پڑتے، مگر ہم نے انھیں دیکھ کر ہی رکھا ہے، اور ناپ تول کر ہم انھیں بس اُتنا ہی دے رہے ہیں جو اِن کو آپے سے باہر نہ ہونے دے۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے یہ آیت دوسرے الفاظ میں وہی مضمون ادا کر رہی ہے جو سورۂ توبہ، آیات ۶۸-۷۰، الکہف، آیات ۳۲-۴۲۔ القصص، آیات ۷۵-۸۲۔ الروم، آیت ۹۔ سبا، آیات ۳۴-۳۶۔ اور المومن، آیات ۸۲-۸۵ میں بیان ہوا ہے۔

۴۹ — یہاں ولی سے مراد وہ ہستی ہے جو اپنی پیدا کردہ ساری مخلوق کے معاملات کی متولّی ہے، جس نے بندوں کی

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ
كَثِيْرٍ ۝٣٠ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝٣١ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝٣٢ ط
اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصُوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے۔[52] تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو، اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے۔ اُس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اللہ جب چاہے ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں ـــــ اِس میں

حاجات وضروریات پوری کرنے کا ذمّہ لے رکھا ہے۔

۵۰ – یعنی زمین میں بھی اور آسمانوں میں بھی۔ یہ کھُلا اشارہ ہے اِس طرف کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے سیّاروں میں بھی جان دار مخلوقات موجود ہیں۔

۵۱ – یعنی جس طرح وہ انھیں پھیلا دینے پر قادر ہے، اُسی طرح وہ انھیں جمع کر لینے پر بھی قادر ہے، لہٰذا یہ خیال کرنا غلط ہے کہ قیامت نہیں آ سکتی اور تمام اوّلین و آخرین کو بیک وقت اُٹھا کر اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔

۵۲ – واضح رہے کہ یہاں تمام انسانی مصائب کی وجہ بیان نہیں کی جا رہی ہے، بلکہ رُوئے سُخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اس وقت مکّۂ معظّمہ میں کفر و نافرمانی کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تمھارے سارے قصوروں پر گرفت کرتا تو تمھیں جیتا ہی نہ چھوڑتا، لیکن یہ مصائب جو تم پر نازل ہوئے ہیں (غالباً اشارہ ہے مکّہ کے قحط کی طرف) یہ محض بطورِ تنبیہ ہیں، تاکہ تم ہوش میں آؤ، اور اپنے اعمال کا جائزہ لے کر دیکھو کہ اپنے رب کے مقابلے میں تم نے کیا رَوِش اختیار کر رکھی ہے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ جس خدا سے تم بغاوت کر رہے ہو، اس کے مقابلے میں تم کتنے بے بس ہو، اور یہ جانو کہ جنھیں تم اپنا ولی و کارساز بنائے بیٹھے ہو، یا جن طاقتوں پر تم نے بھروسا کر رکھا ہے، وہ اللہ کی پکڑ سے بچانے میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتیں۔

مزید توضیح کے لیے یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ جہاں تک مومنِ مُخلِص کا تعلق ہے، اُس کے لیے اللہ کا قانون اس سے مختلف ہے۔ اُس پر جو تکلیفیں بھی آتی ہیں وہ سب اُس کے گناہوں اور خطاؤں اور کوتاہیوں کا کفارہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ حدیثِ صحیح میں ہے کہ مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ ولا وَصَبٍ ولا همٍّ ولاحزن ولا اذًى ولاغمٍّ حتى الشوكة يُشاكُها اِلا كفّر الله بها من خطاياه۔ (بخاری و مسلم) ”مسلمان کو جو رنج اور دکھ اور فکر اور غم اور تکلیف اور پریشانی بھی پیش آتی ہے،

لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ یُوْبِقْھُنَّ بِمَا کَسَبُوْا وَ یَعْفُ عَنْ
کَثِیْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّ یَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَھُمْ مِّنْ
مَّحِیْصٍ ﴿۳۵﴾ فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ مَا

بڑی نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو کمال درجہ صبر و شکر کرنے والا ہو[۵۳] ــــــ یا (اُن پر سوار ہونے والوں کے) بہت سے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کے چند ہی کرتوتوں کی پاداش میں انھیں ڈبو دے، اور اُس وقت ہماری آیات میں جھگڑے کرنے والوں کو پتا چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے[۵۴]۔

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے[۵۵]، اور جو کچھ

حتّٰی کہ ایک کانٹا بھی اگر اس کو چُبھتا ہے تو اللہ اس کو اس کی کسی نہ کسی خطا کا کفّارہ بنا دیتا ہے۔" رہے وہ مصائب جو اللہ کی راہ میں اُس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کوئی مومن برداشت کرتا ہے، تو وہ محض کوتاہیوں کا کفّارہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے ہاں ترقیِ دَرَجات کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ وہ گناہوں کی سزا کے طور پر نازل ہوتے ہیں۔

۵۳ – "صبر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور بُرے تمام حالات میں بندگی کے رَوِیّے پر ثابت قدم رہے۔ جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بُھول کر خدا سے باغی اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے، اور بُرا وقت آ جائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اُتر آئے۔ "شکر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیرِ الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اُٹھا لے جائے، وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان ہی سمجھتا رہے، اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے، اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے اُن نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں، اور خوش حالی و بدحالی، دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔

۵۴ – قریش کے لوگوں کو اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں حَبَش اور افریقا کے ساحلی علاقوں کی طرف بھی جانا ہوتا تھا، اور ان سفروں میں وہ بادبانی جہازوں اور کشتیوں پر بحرِ اَحمر سے گزرتے تھے، جو ایک بڑا خطرناک سمندر ہے۔ اس میں اکثر طوفان اُٹھتے رہتے ہیں، اور زیرِ آب چٹانیں کثرت سے ہیں جن سے طوفان کی حالت میں ٹکرا جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے جس کیفیت کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے یہاں کھینچا ہے، اسے قریش کے لوگ اپنے ذاتی تجرِبات کی روشنی میں پوری طرح محسوس کر سکتے تھے۔

۵۵ – یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی پُھول جائے۔ بڑی سے بڑی دولت بھی جو دنیا میں کسی شخص کو ملی ہے، ایک تھوڑی سی مدّت ہی کے لیے ملی ہے۔ چند سال وہ اُس کو برت لیتا ہے اور پھر سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتا

عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ وَّ اَبۡقٰى لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۚ‏ ﴿۳۶﴾
وَالَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ
يَغۡفِرُوۡنَ ۚ‏ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۖ وَاَمۡرُهُمۡ

اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔[۵۶] وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں،[۵۷] جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں[۵۸] اور اگر غصّہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں،[۵۹] جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں،[۶۰] نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے

ہے۔ پھر وہ دولت بھی چاہے بہی کھاتوں میں کتنی ہی بڑی ہو، عملاً اس کا ایک قلیل سا حصّہ ہی آدمی کے اپنے استعمال میں آتا ہے۔ اس مال پر اِترانا کسی ایسے انسان کا کام نہیں ہے جو اپنی اور اس مال و دولت کی، اور خود اِس دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہو۔

۵۶ – یعنی وہ دولت اپنی نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے، اور پھر وقتی و عارضی بھی نہیں ہے، بلکہ اَبَدی اور لازوال ہے۔

۵۷ – اللہ پر توکّل کو یہاں ایمان لانے کا لازمی تقاضا، اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ضروری وصف قرار دیا گیا ہے۔ توکّل کے معنٰی یہ ہیں کہ: اوّلاً، آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اَخلاق کے جو اُصول، حلال و حرام کے جو حُدُود، اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط اللہ نے دیے ہیں، وہی برحق ہیں اور انھی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے۔ ثانیاً، آدمی کا بھروسا اپنی طاقت، قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر، اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو، بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اُس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے، اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ اسی صورت میں مستحق ہو سکتا ہے، جب کہ وہ اُس کی رضا کو مقصود بنا کر، اُس کے مقرر کیے ہوئے حُدود کی پابندی کرتے ہوئے کام کرے۔ ثالثاً، آدمی کو اُن وعدوں پر پورا بھروسا ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عملِ صالح کا رَوِیّہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لیے کام کرنے والے بندوں سے کیے ہیں، اور انھی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اُن تمام فوائد اور منافع اور لذائذ کو لات مار دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں، اور اُن سارے نقصانات اور تکلیفوں اور محرومیوں کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اُس کے نصیب میں آئیں۔ توکّل کے معنٰی کی اِس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کتنا گہرا تعلق ہے، اور اُس کے بغیر جو ایمان محض خالی خُولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو، اُس سے وہ شاندار نتائج کیوں نہیں حاصل ہو سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکّل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔

۵۸ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۵۳ – ۵۴، الانعام، حواشی ۱۳۰ – ۱۳۱۔ جلد دوم، النحل، حاشیہ ۸۹، نیز سورۂ نجم، آیت ۳۲۔

شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ

سے چلاتے ہیں[۶۱]، ہم نے جو کچھ بھی رزق انھیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶۲]، اور جب ان پر زیادتی

۵۹ – یعنی وہ غُصَیل اور جھلّے نہیں ہوتے، بلکہ نرم خُو اور دھیمے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، ان کی سَرِشت انتقامی نہیں ہوتی، بلکہ وہ بندگانِ خدا سے درگزر اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے ہیں، اور کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا ہے تو اُسے پی جاتے ہیں۔ یہ وصف انسان کی بہترین صفات میں سے ہے، جسے قرآنِ مجید میں نہایت قابلِ تعریف قرار دیا گیا ہے۔ (آلِ عمران، آیت ۱۳۴) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے بڑے اسباب میں شمار کیا گیا ہے۔ (آلِ عمران: ۱۵۹) حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ما انتقم رَسُول الله صلی الله علیه وسلم لنفسه فی شئ قطّ الا ان تنتهك حرمَة اللهِ۔ (بخاری و مسلم) ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا۔ البتہ جب اللہ کی حُرمتوں میں سے کسی حرمت کی ہتک کی جاتی، تب آپؐ سزا دیتے تھے۔‘‘

۶۰ – لفظی ترجمہ ہوگا: ’’اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں‘‘، یعنی جس کام کے لیے بھی اللہ بلاتا ہے اس کے لیے دَوڑ پڑتے ہیں، اور جس چیز کی بھی اللہ دعوت دیتا ہے اسے قبول کرتے ہیں۔

۶۱ – اِس چیز کو یہاں اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے، اور سورۂ آلِ عمران (آیت ۱۵۹) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس بنا پر مشاورت اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اہم ستون ہے، اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیّت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اِس کے وُجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں:

ایک، یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو، اُس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو، اُس میں ان سب کی رائے لی جائے، اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو اُن کے مُعتَمَدعَلَیہ نمایندوں کو شریکِ مشورہ کیا جائے۔

دوسرے، یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے، یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اَخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں، اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حُقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہے، اور نہ وہ متکبّر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقلِ کُل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے، یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو، اُن میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اُسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی، کبھی

اِس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس طرح کی جرأتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی باز پُرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو، اُن سب کو، یا اُن کے بھروسے کے نمایندوں کو اُس کا فیصلہ کرنے میں شریکِ مشورہ کرے، تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جا سکے، اور اگر نادانستہ کوئی غَلَطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمے داری نہ آ پڑے۔

یہ تین وُجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ سکتی ہے کہ اسلام جس اَخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اُس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بداَخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرزِ زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اُصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں، اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انھیں بھی شریکِ مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو اُن میں کُنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا بَرادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریکِ مشورہ ہونا ممکن نہ ہو، تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی مُتَّفَق عَلَیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے مُعتَمَدٌ عَلَیہ نمایندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو اُن کے چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے، اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحبِ رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابلِ اعتماد سمجھتی ہو، اور وہ اُسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کرسکتا، نہ یہ فریب کاری کرسکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلّط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمایندے نہیں بلکہ وہ نمایندے منتخب کریں جو اُس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اُس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے مُلَوَّث ہو، اور اس خواہش کے ساتھ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوششیں صرف وہی شخص کرسکتا ہے جسے خدا اور خَلق دونوں کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو، حالانکہ نہ خدا دھوکا کھا سکتا ہے، اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں عَلانِیَۃ ڈاکا مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکا نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اوّل، یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں انھیں اظہارِ رائے کی پوری آزادی حاصل ہو، اور وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں، اور انھیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غَلَطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کرسکیں، اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے، جسے کوئی شخص بھی اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم، یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے، اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی، یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی، یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم، یہ کہ سربراہِ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو، اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر، یا مال سے خرید کر، یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر، یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمایندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم، یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیں، اور اس طرح کے اظہارِ رائے کی انھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر، یا کسی جتھا بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غدّاری ہوگی، نہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ کی پیروی۔

پنجم، یہ کہ جو مشورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاقِ رائے) سے دیا جائے، یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولا سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے"، بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں"۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اِجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اُصولِ شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مُطْلَقُ الْعِنان اور مختارِ کل نہیں ہے بلکہ لازماً اُس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے، اور اِس اصل الاُصول کی پابند ہے کہ "تمھارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے"، اور "تمھارے درمیان جو نزاع بھی ہو، اس میں اللہ اور رسولؐ کی طرف رُجوع کرو"۔ اس قاعدہ کُلِّیّہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اِس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور اُس پر عمل درآمد کس طریقے سے کیا جائے، تاکہ اُس کا منشا ٹھیک طور سے پورا ہو، لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کر دیا ہو، اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

۶۲- اس کے تین مطلب ہیں:

ایک، یہ کہ جو رزقِ حلال ہم نے انھیں دیا ہے اُسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مالِ حرام پر ہاتھ نہیں مارتے۔

دوسرے، یہ کہ ہمارے دیے ہوئے رزق کو سینت کر نہیں رکھتے، بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں۔

الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ

کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں[۶۳] ــــ بُرائی[۶۴] کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے[۶۵]، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے، اُس کا اجر اللہ کے ذمّے ہے[۶۶]، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا[۶۷]۔ اور جو لوگ

تیسرے، یہ کہ جو رزق انھیں دیا گیا ہے اُس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ہی ذات کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔

پہلے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رزقِ حلال وطیّب ہی کو "اپنے دیے ہوئے رزق" سے تعبیر فرماتا ہے، ناپاک اور حرام طریقوں سے کمائے ہوئے رزق کو وہ اپنا رزق نہیں کہتا۔ دوسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رزق انسان کو دیتا ہے وہ خرچ کرنے کے لیے دیتا ہے، سَیَنت سَیَنت کر رکھنے اور اس پر مارِ زربن کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں دیتا۔ اور تیسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ خرچ کرنے سے مراد قرآنِ مجید میں محض اپنی ذات پر اور اپنی ضروریات پر ہی خرچ کر دینا نہیں ہے، بلکہ اس کے مفہوم میں اِنفاق فی سبیل اللہ بھی شامل ہے۔ انھی تین وُجوہ سے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کو یہاں اہلِ ایمان کی اُن بہترین صفات میں شمار فرما رہا ہے جن کی بنا پر آخرت کی بھلائیاں انھی کے لیے مختص کی گئی ہیں۔

۶۳ – یہ بھی اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور جبّاروں کے لیے نرم چارا نہیں ہوتے۔ اُن کی نرم خوئی اور عفو و درگزر کی عادت کمزوری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ انھیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں، اور جب کسی زیر دست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن جب کوئی طاقت ور اپنی طاقت کے زعم میں اُن پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کے دانت کھٹے کر دیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبّر کے آگے نہیں جُھکتا۔ اِس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے، جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔

۶۴ – یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت آیتِ ماسَبَق کی تشریح کے طور پر ہے۔

۶۵ – یہ پہلا اُصولی قاعدہ ہے جسے بدلہ لینے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو، اتنی ہی بُرائی وہ اس کے ساتھ کر لے، اُس سے زیادہ بُرائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

۶۶ – یہ دوسرا قاعدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لے لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہو، وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمے ہے، کیونکہ تم نے بگڑے ہوئے

انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ
عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ
عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾ ع وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ

ع ۴ / ۵

ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں، اُن کو ملامت نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دُوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اُولوا العزمی کے کاموں میں سے ہے[۶۸]۔ ع

جس کو اللہ ہی گمراہی میں پھینک دے، اُس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں ہے[۶۹]۔

لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

۶۷ - اس تنبیہ میں بدلہ لینے کے متعلق ایک تیسرے قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک بُرائی کے بدلے میں اُس سے بڑھ کر بُرائی کر گزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک ہی تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات گھونسوں کی اُس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا دُرست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اگر کسی کمینے انسان نے خراب کیا ہے تو اس کے لیے یہ حلال نہیں ہو جائے گا کہ وہ اس کی بیٹی یا بہن سے زِنا کرے۔

۶۸ - واضح رہے کہ ان آیات میں اہلِ ایمان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ اُس وقت عملاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں میں موجود تھیں، اور کفارِ مکہ اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل کفار کو یہ بتایا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی بسر کرنے کا جو سروسامان پا کر تم آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو، اصل دولت وہ نہیں ہے، بلکہ اصل دولت یہ اَخلاق اور اوصاف ہیں جو قرآن کی رہنمائی قبول کر کے تمھارے ہی معاشرے کے ان مومنوں نے اپنے اندر پیدا کیے ہیں۔

۶۹ - مطلب یہ ہے کہ اللہ نے قرآن جیسی بہترین کتاب اِن لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجی جو نہایت معقول اور نہایت مؤثّر و دل نشین طریقے سے ان کو حقیقت کا علم دے رہی ہے اور زندگی کا صحیح راستہ بتا رہی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نبی ان کی رہنمائی کے لیے بھیجا، جس سے بہتر سیرت و کردار کا آدمی کبھی ان کی نگاہوں نے نہ دیکھا تھا۔ اور اِس کتاب اور

وَ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ
مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَ تَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ
يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۗ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اَلَاۤ اِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ
يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾

تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے: اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟[70] اورتم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلّت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے، اور اُس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔[71] اُس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے، کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنھوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلّقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ خبردار رہو، ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں۔ جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے، اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں۔

اس رسول کی تعلیم و تربیت کے نتائج بھی اللہ نے ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں انھیں آنکھوں سے دکھا دیے۔ اب اگر کوئی شخص یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ہدایت سے منہ موڑتا ہے تو اللہ پھر اُسی گمراہی میں اسے پھینک دیتا ہے جس سے نکلنے کا وہ خواہش مند نہیں ہے۔ اور جب اللہ ہی نے اسے اپنے دروازے سے دھتکار دیا تو اب کون یہ ذمّہ لے سکتا ہے کہ اسے راہِ راست پر لے آئے گا۔

۷۰ – یعنی آج جب کہ پلٹ آنے کا موقع ہے، یہ پلٹنے سے انکار کر رہے ہیں۔ کل جب فیصلہ ہو چکے گا اور سزا کا حکم نافذ ہو جائے گا، اس وقت اپنی شامت دیکھ کر یہ چاہیں گے کہ اب انھیں پلٹنے کا موقع ملے۔

۷۱ – انسان کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی ہولناک منظر اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ جان رہا ہوتا ہے کہ عنقریب وہ اُس بلا کے چنگل میں آنے والا ہے جو سامنے نظر آ رہی ہے، تو پہلے تو ڈر کے مارے وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ پھر اس سے رہا نہیں جاتا۔ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بلا کیسی ہے اور ابھی اُس سے کتنی دُور ہے۔ لیکن اِس کی بھی ہمت نہیں پڑتی کہ سر اُٹھا کر نگاہ بھر کر اسے دیکھے۔ اس لیے وہ بار بار ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے اور پھر ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ
مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ
اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا
الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾

مان لو اپنے رب کی بات، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے[۷۲]۔ اُس دن تمھارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمھارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا[۷۳]۔ اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ! ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے[۷۴]۔ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اُس پر پھُول جاتا ہے، اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر اُلٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے[۷۵]۔

جہنّم کی طرف جانے والوں کی اسی کیفیت کا نقشہ اِس آیت میں کھینچا گیا ہے۔

۷۲ – یعنی نہ اللہ خود اُسے ٹالے گا اور نہ کسی دوسرے میں یہ طاقت ہے کہ اسے ٹال سکے۔

۷۳ – اصل الفاظ ہیں: مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ۔ اس فقرے کے کئی مفہوم اور بھی ہیں: ایک، یہ کہ تم اپنے کرتوتوں میں سے کسی کا انکار نہ کر سکو گے۔ دوسرے، یہ کہ تم بھیس بدل کر کہیں چھُپ نہ سکو گے۔ تیسرے، یہ کہ تمھارے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے گا اُس پر تم کوئی احتجاج اور اظہارِ ناراضی نہ کر سکو گے۔ چوتھے، یہ کہ تمھارے بس میں نہ ہوگا کہ جس حالت میں تم مبتلا کیے گئے ہو اسے بدل سکو۔

۷۴ – یعنی تمھارے اُوپر یہ ذمہ داری تو نہیں ڈالی گئی ہے کہ تم اِنھیں ضرور راہِ راست ہی پر لا کے رہو، اور نہ اس بات کی تم سے کوئی باز پُرس ہونی ہے کہ یہ لوگ کیوں راہِ راست پر نہ آئے۔

۷۵ – انسان سے مراد یہاں وہ چھچھورے اور کم ظرف لوگ ہیں جن کا اُوپر سے ذکر چلا آ رہا ہے۔ جنھیں دنیا کا کچھ رزق مل گیا ہے تو اُس پر پھُولے نہیں سماتے، اور سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو سُن کر نہیں دیتے۔ لیکن اگر کسی وقت اپنے ہی کرتوتوں کی بدولت اُن کی شامت آجاتی ہے تو قسمت کو رونا شروع کر دیتے ہیں اور اُن ساری نعمتوں کو بھول

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ
يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ
ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے[۷۶]، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں مِلا جُلا کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے[۷۷]۔

جاتے ہیں جو اللہ نے اُنھیں دی ہیں اور کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ جس حالت میں وہ مبتلا ہوئے ہیں اُس میں اُن کا اپنا کیا قصور ہے۔ اِس طرح نہ خوشحالی اُن کی اصلاح میں مددگار ہوتی ہے، نہ بدحالی ہی انھیں سبق دے کر راہِ راست پر لاسکتی ہے۔ سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ اُن لوگوں کے رویّے پر طنز ہے جو اُوپر کی تقریر کے مخاطب تھے۔ مگر اُن کو خطاب کر کے یہ نہیں کہا گیا کہ تمھارا حال یہ ہے، بلکہ بات یوں کہی گئی کہ انسان میں عام طور پر یہ کمزوری پائی جاتی ہے اور یہی اُس کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ اِس سے حکمتِ تبلیغ کا یہ نکتہ ہاتھ آتا ہے کہ مخاطب کی کمزوریوں پر براہِ راست چوٹ نہیں کرنی چاہیے، بلکہ عُمومی انداز میں اُن کا ذکر کرنا چاہیے، تاکہ وہ چِڑ نہ جائے، اور اُس کے ضمیر میں اگر کچھ بھی زندگی باقی ہے تو ٹھنڈے دل سے اپنے عیب کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

۷۶ – یعنی کفر و شرک کی حماقت میں جو لوگ مبتلا ہیں، وہ اگر سمجھانے سے نہیں مانتے تو نہ مانیں، حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے۔ زمین و آسمان کی بادشاہی دنیا کے نام نہاد بادشاہوں اور جبّاروں اور سرداروں کے حوالے نہیں کر دی گئی ہے، نہ کسی نبی یا ولی یا دیوی اور دیوتا کا اس میں کوئی حصّہ ہے، بلکہ اس کا مالک اکیلا اللہ تعالیٰ ہے۔ اُس سے بغاوت کرنے والا نہ اپنے بَل بُوتے پر جیت سکتا ہے، نہ اُن ہستیوں میں سے کوئی آ کر اسے بچا سکتی ہے جنھیں لوگوں نے اپنی حماقت سے خدائی اختیارات کا مالک سمجھ رکھا ہے۔

۷۷ – یہ اللہ کی بادشاہی کے مُطلّق (absolute) ہونے کا ایک کُھلا ہُوا ثبوت ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ بڑے سے بڑے دنیوی اقتدار کا مالک بنا پھرتا ہو، یا روحانی اقتدار کا مالک سمجھا جاتا ہو، کبھی اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ دوسروں کو دلوانا تو درکنار، خود اپنے ہاں اپنی خواہش کے مطابق اولاد پیدا کر سکے۔ جسے خدا نے بانجھ کر دیا وہ کسی دوا اور کسی علاج اور کسی تعویذ گنڈے سے اولاد والا نہ بن سکا، جسے خدا نے لڑکیاں ہی لڑکیاں دیں وہ ایک بیٹا بھی کسی تدبیر سے حاصل نہ کر سکا، اور جسے خدا نے لڑکے ہی لڑکے دیے وہ ایک بیٹی بھی کسی طرح نہ پا سکا۔ اِس معاملے میں ہر ایک قطعی بے بس رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی خدا کی خدائی میں مختارِ کل ہونے کا زعم کرے، یا کسی دوسری ہستی کو

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ
حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ
حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ

کسی[۷۸] بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اُس سے رُوبرُو بات کرے۔ اُس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے[۷۹]، یا پردے کے پیچھے سے[۸۰]، یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے، اور وہ اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے[۸۱]، وہ برتر اور حکیم ہے[۸۲]۔ اور اِسی طرح (اے محمدؐ!) ہم نے اپنے حکم سے ایک رُوح تمھاری طرف

اختیارات میں دخیل سمجھے تو یہ اس کی اپنی ہی بے بصیرتی ہے، جس کا خمیازہ وہ خود بُھگتے گا۔ کسی کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت میں ذرہ برابر بھی تغیّر واقع نہیں ہوتا۔

۷۸ – تقریر ختم کرتے ہوئے اُسی مضمون کو پھر لیا گیا ہے جو آغازِ کلام میں ارشاد ہوا تھا۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس سورہ کی پہلی آیت اور اس کے حاشیے پر دوبارہ ایک نگاہ ڈال لیجیے۔

۷۹ – یہاں وحی سے مراد ہے اِلقا، الہام، دل میں کوئی بات ڈال دینا، یا خواب میں کچھ دکھا دینا، جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کو دکھایا گیا۔ (یوسف، آیات ۴-۱۰۰۔ الصّافّات، ۱۰۲)

۸۰ – مراد یہ ہے کہ بندہ ایک آواز سنے، مگر بولنے والا اُسے نظر نہ آئے، جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا کہ طور کے دامن میں ایک درخت سے یکایک انھیں آواز آنی شروع ہوئی، مگر بولنے والا ان کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ (طٰہٰ، آیات ۱۱ تا ۴۸۔ النمل، آیات ۸ تا ۱۲۔ القصص، آیات ۳۰ تا ۳۵)

۸۱ – یہ وحی کے آنے کی وہ صورت ہے جس کے ذریعے سے تمام کُتُبِ آسمانی انبیا علیہم السلام تک پہنچی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس فقرے کی غلط تاویل کر کے اس کو یہ معنی پہنائے ہیں کہ "اللہ کوئی رسول بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے عام لوگوں تک اُس کا پیغام پہنچاتا ہے۔" لیکن قرآن کے الفاظ فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (پھر وہ وحی کرتا ہے اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے) اُن کی اس تاویل کا غلط ہونا بالکل عیاں کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے سامنے انبیاؑ کی تبلیغ کو "وحی کرنے" سے نہ قرآن میں کہیں تعبیر کیا گیا ہے اور نہ عَرَبی زبان میں انسان کی انسان سے عَلانیہ گفتگو کو "وحی" کے لفظ سے تعبیر کرنے کی کوئی گنجایش ہے۔ لغت میں وحی کے معنی ہی خفیہ اور سَرِیع اشارے کے ہیں۔ انبیاؑ کی تبلیغ پر اِس لفظ کا اِطلاق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہو۔

۸۲ – یعنی وہ اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کسی بشر سے رُودررُو کلام کرے، اور اس کی حکمت اِس سے عاجز نہیں ہے کہ اپنے کسی بندے تک اپنی ہدایات پہنچانے کے لیے رُوبرو بات چیت کرنے کے سوا کوئی اور تدبیر نکال لے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا
نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ۙ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا
فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ ع

ع ۵ ۱۰

وحی کی ہے۔[۸۳] تمھیں کچھ پتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے،[۸۴] مگر اُس رُوح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا، جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو، اُس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو! سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔[۸۵] ع

۸۳ - ''اِسی طرح'' سے مراد محض آخری طریقہ نہیں ہے، بلکہ وہ تینوں طریقے ہیں جو اُوپر کی آیات میں مذکور ہوئے ہیں، اور ''رُوح'' سے مراد وحی، یا وہ تعلیم ہے جو وحی کے ذریعے سے حضوؐر کو دی گئی۔ یہ بات قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن تینوں طریقوں سے ہدایات دی گئی ہیں:

(۱) حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتدا ہی سچّے خوابوں سے ہوئی تھی۔ (بخاری و مسلم) یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا ہے۔ چنانچہ احادیث میں آپؐ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپؐ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مُطّلع کیا گیا ہے، اور قرآنِ مجید میں بھی آپؐ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ (الفتح، آیت ۲۷) اس کے علاوہ متعدّد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضوؐر نے فرمایا: فُلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے، یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ ایسی تمام چیزیں وحی کی پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، اور احادیثِ قُدسیہ بھی زیادہ تر اسی قَبیل سے ہیں۔

(۲) معراج کے موقع پر حضوؐر کو وحی کی دوسری قسم سے بھی مُشرّف فرمایا گیا۔ متعدّد صحیح احادیث میں حضوؐر کو پنج وقتہ نماز کا حکم دیے جانے، اور حضوؐر کے اُس پر بار بار عرض معروض کرنے کا ذکر جس طرح آیا ہے، اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اللہ اور اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ویسا ہی مکالمہ ہوا تھا جیسا دامنِ طور میں حضرت موسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوا۔

(۳) رہی تیسری قسم، تو اُس کے متعلق قرآن خود ہی شہادت دیتا ہے کہ اُسے جبریلِ امین کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا گیا ہے۔ (البقرہ: ۹۷۔ الشعراء: ۱۹۲ تا ۱۹۵)

۸۴ - یعنی نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضورؐ کے ذہن میں یہ تصوّر تک نہ آیا تھا کہ آپؐ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے، یا ملنی چاہیے، بلکہ آپؐ سرے سے کُتبِ آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اِسی طرح آپؐ کو اللہ پر ایمان تو ضرور حاصل تھا، مگر آپؐ نہ شُعوری طور پر اس تفصیل سے واقف تھے کہ انسان کو اللہ کے متعلق کیا کیا باتیں ماننی چاہییں، اور نہ آپؐ کو یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کُتبِ الٰہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفّارِ مکہ سے بھی چھُپی ہوئی نہ تھیں۔ مکۂ معظّمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضورؐ کی زبان سے کتابِ الٰہی کا کوئی ذکر سنا ہو، یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو فُلاں فُلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہو تو اس کی یہ حالت تو کبھی نہیں ہو سکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب و روز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا لفظ تک نہ سنیں، اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انھی موضوعات پر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۳، حاشیہ ۱۰۹ سورۃ القصص)

۸۵ - یہ آخری تنبیہ ہے جو کفار کو دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی نے کہا اور تم نے سُن کر ردّ کر دیا، اِس پر بات ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کے حُضور پیش ہونا ہے، اور آخرِ کار اُسی کے دربار سے یہ فیصلہ ہونا ہے کہ کس کا کیا انجام ہونا چاہیے۔

تفہیم القرآن

الزخرف

(۴۳)

الزُّخرُف

نام

آیت ۳۵ کے لفظ وَزُخْرُفًا سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں لفظ زُخْرُف آیا ہے۔

زمانۂ نزُول

کسی معتبر رِوایت سے معلوم نہیں ہو سکا ہے، لیکن اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ بھی اُسی زمانے میں نازل ہوئی ہے جس میں المومن، حٰمٓ السجدہ اور الشُّوریٰ نازل ہوئیں۔ یہ ایک ہی سلسلے کی سورتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نُزول اُس وقت سے شروع ہوا جب کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہو گئے تھے۔ شب و روز اپنی محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر مشورے کر رہے تھے کہ آپؐ کو کس طرح ختم کیا جائے، اور ایک حملہ آپؐ کی جان پر ہو بھی چکا تھا۔ اِس صورتِ حال کی طرف آیات ۷۹-۸۰ میں صاف اشارہ موجود ہے۔

موضوع اور مَباحِث

اس سورہ میں پورے زور کے ساتھ قریش اور اہلِ عرب کے اُن جاہلانہ عقائد و اوہام پر تنقید کی گئی ہے جن پر وہ اصرار کیے چلے جا رہے تھے، اور نہایت محکم و دل نشین طریقے سے ان کی نامعقولیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے، تاکہ معاشرے کا ہر فرد، جس کے اندر کچھ بھی معقولیت موجود ہو، یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ آخر یہ کیسی جہالتیں ہیں جن سے ہماری قوم بُری طرح چمٹی ہوئی ہے، اور جو شخص ہمیں اِن کے چکّر سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔

کلام کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی شرارتوں کے بَل پر یہ چاہتے ہو کہ اس کتاب کا نُزول روک دیا جائے، مگر اللہ نے کبھی اَشرار کی وجہ سے انبیاؑ کی بِعثت اور کتابوں کی تنزیل نہیں روکی ہے، بلکہ اُن ظالموں کو ہلاک کر دیا ہے جو اُس کی ہدایت کا راستہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ یہی کچھ وہ اب بھی کرے گا۔ آگے چل کر آیات ۴۱-۴۳ اور ۷۹-۸۰ میں یہ مضمون پھر دُہرایا گیا ہے۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے، اُن کو سناتے ہوئے حضورؐ سے فرمایا گیا ہے کہ تم خواہ زندہ رہو یا نہ رہو، ان ظالموں کو ہم سزا دے کر رہیں گے۔ اور خود اُن لوگوں کو صاف صاف مُتنَبِّہ کر دیا گیا ہے کہ اگر تم نے ہمارے نبی کے خلاف ایک اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کُن قدم اٹھائیں گے۔

اِس کے بعد بتایا گیا ہے کہ وہ مذہب کیا ہے جسے یہ لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اور وہ دلائل کیا ہیں جن کے بَل بُوتے پر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

خود مانتے ہیں کہ زمین و آسمان کا، اور اِن کا اپنا اور اِن کے معبُودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ جن نعمتوں سے یہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں، وہ سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ پھر بھی دوسروں کو اللہ کے ساتھ خدائی میں شریک کرنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔

بندوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے ہیں، اور اولاد بھی بیٹیاں، جنھیں خود اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے ہیں۔

فرشتوں کو انھوں نے دیویاں قرار دے رکھا ہے۔ اُن کے بت عورتوں کی شکل کے بنا رکھے ہیں۔ اُنھیں زنانہ کپڑے اور زیور پہناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اُن کی عبادت کرتے ہیں اور انھی سے منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔ آخر اِنھیں کیسے معلوم ہوا کہ فرشتے عورتیں ہیں؟

اِن جہالتوں پر ٹوکا جاتا ہے تو تقدیر کا بہانہ پیش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ ہمارے اس کام کو پسند نہ کرتا تو ہم کیسے اِن بتوں کی پرستش کر سکتے تھے۔ حالانکہ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذریعہ اُس کی کتابیں ہیں، نہ کہ وہ کام جو دنیا میں اس کی مَشِیَّت کے تحت ہو رہے ہیں۔ مَشِیَّت کے تحت تو ایک بت پرستی ہی نہیں، چوری، زِنا، ڈاکا، قتل، سب ہی کچھ ہو رہا ہے۔ کیا اِس دلیل سے ہر اُس بُرائی کو جائز و برحق قرار دیا جائے گا جو دنیا میں ہو رہی ہے؟

پوچھا جاتا ہے کہ اپنے اِس شرک کے لیے تمھارے پاس اِس غلط دلیل کے سوا کوئی اور سند بھی ہے، تو جواب دیتے ہیں کہ باپ دادا سے یہ کام یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ گویا اِن کے نزدیک کسی مذہب کے حق ہونے کے لیے یہ کافی دلیل ہے۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام، جن کی اولاد ہونے پر ہی اِن کے سارے فخر و امتیاز کا مدار ہے، باپ دادا کے مذہب کو لات مار کر گھر سے نکل گئے تھے اور اُنھوں نے اسلاف کی ایسی اندھی تقلید کو ردّ کر دیا تھا جس کا ساتھ کوئی دلیلِ معقول نہ دیتی ہو، پھر اگر ان لوگوں کو اَسلاف کی تقلید ہی کرنی تھی تو اس کے لیے بھی اپنے بزرگ ترین اسلاف، ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو چھوڑ کر انھوں نے اپنے جاہل ترین اسلاف کا انتخاب کیا!

اِن سے کہا جاتا ہے کہ کیا کبھی کسی نبی نے اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے ساتھ دوسرے بھی عبادت کے مستحق ہیں، تو یہ عیسائیوں کے اِس فعل کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ اُنھوں نے عیسیٰ ابنِ مریمؑ کو ابنُ اللہ مانا اور اُن کی پرستش کی۔ حالانکہ سوال یہ نہ تھا کہ کسی نبی کی اُمت نے شرک کیا ہے یا نہیں، بلکہ یہ تھا کہ خود کسی نبی نے شرک کی تعلیم دی ہے؟ عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے کب کہا تھا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو۔ اُن کی اپنی تعلیم تو وہی تھی جو دنیا کے ہر نبی نے دی ہے، کہ میرا رب بھی اللہ ہے اور تمھارا رب بھی، اسی کی تم عبادت کرو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرنے میں انھیں تأمُّل ہے تو اِس بنا پر کہ ان کے پاس مال و دولت اور ریاست و وجاہت تو ہے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہمارے ہاں کسی کو نبی بنانا چاہتا تو ہمارے

دونوں شہروں (مکہ و طائف) کے بڑے آدمیوں میں سے کسی کو بناتا۔ اِسی بنا پر فرعون نے بھی حضرت موسیٰؑ کو حقیر جانا تھا، اور کہا تھا کہ آسمان کا بادشاہ اگر مجھ زمین کے بادشاہ کے پاس کوئی ایلچی بھیجتا تو اسے سونے کے کنگن پہنا کر، فرشتوں کی ایک فوج اس کی اَرْدَلی میں دے کر بھیجتا، یہ فقیر کہاں سے آ کھڑا ہوا؟ فضیلت مجھے حاصل ہے کہ مصر کی بادشاہی میری ہے اور دریائے نیل کی نہریں میری ماتحتی میں چل رہی ہیں۔ یہ شخص میرے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے کہ نہ مال رکھتا ہے نہ اقتدار۔

اِس طرح کفار کی ایک ایک جاہلانہ بات پر تنقید کرنے اور اس کے نہایت معقول و مُدَلَّل جوابات دینے کے بعد آخر میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ نہ خدا کی کوئی اولاد ہے، نہ آسمان و زمین کے خدا الگ الگ ہیں، نہ اللہ کے ہاں کوئی ایسا شفیع ہے جو جان بُوجھ کر گمراہی اختیار کرنے والوں کو اُس کی سزا سے بچا سکے۔ اللہ کی ذات اس سے مُنَزَّہ ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو۔ وہی اکیلا ساری کائنات کا خدا ہے، باقی سب اس کے بندے ہیں نہ کہ اس کے ساتھ خدائی صفات و اختیارات میں شریک۔ اور شَفاعت اس کے ہاں صرف وہی کر سکتے ہیں جو خود حق پرست ہوں، اور اُنھی کے لیے کر سکتے ہیں جنھوں نے دنیا میں حق پرستی اختیار کی ہو۔

آیاتھا ۸۹ سُوۡرَۃُ الزُّخۡرُفِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتھا ۷

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حٰمٓ ۞ وَ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۞ اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا
لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۞ وَ اِنَّهٗ فِىۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ لَدَيۡنَا لَعَلِىٌّ حَكِيۡمٌ ۞

ح م۔ قسم ہے اِس واضح کتاب کی کہ ہم نے اِسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے، تاکہ تم لوگ اِسے سمجھو[1]۔ اور درحقیقت یہ اُمّ الکتاب میں ثبت ہے[2]، ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب[3]۔

۱ – قرآنِ مجید کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنّف ''ہم'' ہیں، نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور قسم کھانے کے لیے قرآن کی جس صفت کا انتخاب کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ''کتابِ مبین'' ہے۔ اس صفت کے ساتھ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر خود قرآن کی قسم کھانا آپ سے آپ یہ معنٰی دے رہا ہے کہ لوگو! یہ کھلی کتاب تمھارے سامنے موجود ہے، اِسے آنکھیں کھول کر دیکھو، اِس کے صاف صاف غیر مُبْہَم مضامین، اِس کی زبان، اِس کا ادب، اِس کی حق و باطل کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دینے والی تعلیم، یہ ساری چیزیں اِس حقیقت کی صریح شہادت دے رہی ہیں کہ اِس کا مصنف خداوندِ عالَم کے سوا کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔

پھر یہ جو فرمایا کہ ''ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم اِسے سمجھو''، اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ یہ کسی غیر زبان میں نہیں ہے، بلکہ تمھاری اپنی زبان میں ہے، اس لیے اسے جانچنے پرکھنے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں تمھیں کوئی دِقّت پیش نہیں آ سکتی۔ یہ کسی عجمی زبان میں ہوتا تو تم یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم اس کے کلامِ الٰہی ہونے یا نہ ہونے کی جانچ کیسے کریں، جب کہ ہماری سمجھ ہی میں یہ نہیں آ رہا ہے۔ لیکن اِس عربی قرآن کے متعلق تم یہ عذر کیسے کر سکتے ہو۔ اس کا ایک ایک لفظ تمھارے لیے واضح ہے۔ اس کی ہر عبارت اپنی زبان اور اپنے مضمون، دونوں کے لحاظ سے تم پر روشن ہے۔ خود دیکھ لو کہ کیا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یا کسی دوسرے عرب کا کلام ہو سکتا ہے۔ دوسرا مطلب اس ارشاد کا یہ ہے کہ اس کتاب کی زبان ہم نے عربی اس لیے رکھی ہے کہ ہم عرب قوم کو مخاطَب کر رہے ہیں، اور وہ عربی زبان کے قرآن ہی کو سمجھ سکتی ہے۔ عربی میں قرآن نازل کرنے کی اِس صریح معقول وجہ کو نظر انداز کر کے جو شخص صرف اس بنا پر اِسے کلامِ الٰہی کے بجائے کلامِ محمدؐ قرار دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان بھی عَرَبی ہے تو وہ بڑی زیادتی کرتا ہے۔ (اِس دوسرے مطلب کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ حٰمٓ السجدہ، آیت ۴۴ مع حاشیہ نمبر ۵۴ مُلاحظہ فرمائیں۔)

۲ – ''اُمّ الکتاب'' سے مراد ہے: ''اصل الکتاب''، یعنی وہ کتاب جس سے تمام انبیاؑ پر نازل ہونے والی کتابیں

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ ۝٥
وَكَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِيٍّ فِي الۡاَوَّلِيۡنَ ۝٦ وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ

اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درسِ نصیحت تمھارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں، صرف اِس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ[۴] ہو؟ پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بار ہا ہم نے نبی بھیجے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی

ماخوذ ہیں۔ اِسی کو سورۂ واقعہ میں کِتٰبٌ مَّكۡنُوۡنٌ (پوشیدہ اور محفوظ کتاب) کہا گیا ہے اور سورۂ بُروج میں اس کے لیے لوحِ محفوظ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی ایسی لوح جس کا لکھا مٹ نہیں سکتا اور جو ہر قسم کی دَر اندازی سے محفوظ ہے۔ قرآن کے متعلق یہ فرما کر کہ یہ ''اُمّ الکتاب'' میں ہے، ایک اہم حقیقت پر مُتنبّہ فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زمانوں میں مختلف ملکوں اور قوموں کی ہدایت کے لیے مختلف انبیاءؑ پر مختلف زبانوں میں کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں، مگر اُن سب میں دعوت ایک ہی عقیدے کی طرف دی گئی ہے، حق ایک ہی سچائی کو قرار دیا گیا ہے، خیر و شر کا ایک ہی معیار پیش کیا گیا ہے، اخلاق و تہذیب کے یکساں اُصول بیان کیے گئے ہیں، اور فی الجملہ ایک ہی دین ہے جسے یہ سب کتابیں لے کر آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سب کی اصل ایک ہے اور صرف عبارتیں مختلف ہیں۔ ایک ہی معنیٰ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بنیادی کتاب میں ثبت ہیں، اور جب کبھی ضرورت پیش آئی ہے، اس نے کسی نبی کو مبعوث کر کے وہ معنیٰ حال اور موقع کی مناسبت سے ایک خاص عبارت اور خاص زبان میں نازل فرما دیے ہیں۔ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کا فیصلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے بجائے کسی اور قوم میں پیدا کرنے کا ہوتا تو یہی قرآن وہ حضورؐ پر اُسی قوم کی زبان میں نازل کرتا۔ اُس میں بات اُسی قوم اور ملک کے حالات کے لحاظ سے کی جاتی، عبارتیں کچھ اور ہوتیں، زبان بھی دوسری ہوتی، لیکن بنیادی طور پر تعلیم و ہدایت یہی ہوتی، اور وہ یہی قرآن ہوتا، اگرچہ قرآنِ عربی نہ ہوتا۔ اسی مضمون کو سورۂ شُعَراء میں یوں ادا کیا گیا ہے: وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ...... بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيۡنٍ ۝ وَاِنَّهٗ لَفِيۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ (۱۹۲-۱۹۶) ''یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے...... صاف صاف عَرَبی زبان میں اور یہ اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔'' (تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حواشی ۱۱۹-۱۲۱)

۳ — اس فقرے کا تعلق کتابِ مُبین سے بھی ہے اور اُمّ الکتاب سے بھی۔ یعنی یہ تعریف قرآن کی بھی ہے اور اُس اصل کتاب کی بھی جس سے قرآن منقول یا ماخوذ ہے۔ اِس تعریف سے یہ بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ کوئی شخص اپنی نادانی سے اِس کتاب کی قدر و منزلت نہ پہچانے اور اس کی حکیمانہ تعلیم سے فائدہ نہ اُٹھائے تو یہ اُس کی اپنی بدقسمتی ہے۔ کوئی اگر اس کی حیثیت کو گرانے کی کوشش کرے اور اس کی باتوں میں کیڑے ڈالے تو یہ اس کی اپنی رذالت ہے۔ کسی کی ناقدری سے یہ بے قدر نہیں ہو سکتی اور کسی کے خاک ڈالنے سے اِس کی حکمت چھُپ نہیں سکتی۔ یہ تو بجائے خود ایک بلند مرتبہ کتاب ہے جسے اُس کی بے نظیر تعلیم اُس کی معجزانہ بلاغت اُس کی بے عیب حکمت اور اُس کے عالی شان مصنف کی شخصیت نے بلند کیا ہے۔ یہ کسی کے گرائے کیسے گر جائے گی۔ آگے چل کر آیت ۴۴ میں قُریش کو خاص طور پر اور اہلِ عرب کو بالعموم یہ بتایا گیا ہے کہ جس کتاب کی تم اِس طرح

نَبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٧﴾ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ
بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٨﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ ﴿٩﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا

نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انھوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔[5] پھر جو لوگ ان سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے، انھیں ہم نے ہلاک کر دیا، پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔[6]

اگر تم اِن لوگوں سے پُوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ انھیں اُسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔ وہی نا جس نے تمھارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا[7] اور اس میں تمھاری خاطر راستے

ناقدری کر رہے ہو، اُس کے نُزول نے تم کو ایک بہت بڑے شَرَف کا موقع عطا کیا ہے، جسے اگر تم نے کھو دیا تو خدا کے سامنے تمھیں سخت جواب دِہی کرنی ہوگی۔ (مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۳۹)

۴ – اِس ایک فقرے میں وہ پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے وقت سے لے کر اِن آیات کے نُزول تک پچھلے چند برس میں ہو گزری تھی۔ یہ فقرہ ہمارے سامنے یہ تصویر کھینچتا ہے کہ ایک قوم صدیوں سے سخت جَہالت، پستی اور بدحالی میں مبتلا ہے۔ یکایک اللہ تعالیٰ کی نظرِعنایت اُس پر ہوتی ہے۔ وہ اس کے اندر ایک بہترین رہنما اٹھاتا ہے اور اُسے جَہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے خود اپنا کلام نازل کرتا ہے، تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہو، جاہلانہ اَوہام کے چکر سے نکلے، اور حقیقت سے آگاہ ہو کر زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرلے۔ مگر اُس قوم کے نادان لوگ اور اس کے خودغرض قبائلی سردار اُس رہنما کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں اور اُسے ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ جوں جوں سال پر سال گزرتے جاتے ہیں، ان کی عداوت اور شرارت بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اُسے قتل کر دینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اِس حالت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ کیا تمھاری اس نالائقی کی وجہ سے ہم تمھاری اصلاح کی کوشش چھوڑ دیں؟ اِس درسِ نصیحت کا سلسلہ روک دیں؟ اور تمھیں اُسی پستی میں پڑا رہنے دیں جس میں تم صدیوں سے گرے ہوئے ہو؟ کیا تمھارے نزدیک واقعی ہماری رحمت کا تقاضا یہی ہونا چاہیے؟ تم نے کچھ سوچا بھی کہ خدا کے فضل کو ٹھکرانا اور حق سامنے آجانے کے بعد باطل پر اصرار کرنا تمھیں کس انجام سے دوچار کرے گا؟

۵ – یعنی یہ بے ہودگی اگر نبی اور کتاب کے بھیجنے میں مانع ہوتی تو کسی قوم میں بھی کوئی نبی نہ آتا، نہ کوئی کتاب بھیجی جاتی۔

لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝١٠ۚ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍۚ

بنا دیے،[8] تاکہ تم اپنی منزلِ مقصود کی راہ پا سکو۔[9] جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اُتارا[10]

۶ – یعنی خاص لوگوں کی بے ہودگی کا نتیجہ یہ کبھی نہیں ہوا کہ پوری نوعِ انسانی کو نبوت اور کتاب کی رہنمائی سے محروم کر دیا جاتا، بلکہ اِس کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جو لوگ باطل پرستی کے نشے اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں بدمست ہو کر انبیاؑ کا مذاق اُڑانے سے باز نہ آئے انھیں آخرِ کار تباہ کر دیا گیا۔ پھر جب اللہ کا قہر ٹوٹ پڑا تو جس قوت کے بَل پر یہ قریش کے چھوٹے چھوٹے سردار اکڑ رہے ہیں، اُس سے ہزاروں گُنی زیادہ طاقت رکھنے والے بھی مچھّر اور پِسّو کی طرح مسل کر رکھ دیے گئے۔

۷ – دوسرے مَقامات پر تو زمین کو فرش سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے لیے گہوارے کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ایک بچّہ اپنے پنگھوڑے میں آرام سے لیٹا ہوتا ہے، ایسے آرام کی جگہ تمھارے لیے اِس عظیم الشان کُرے کو بنا دیا جو فضا میں معلّق ہے، جو ایک ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے اپنے مِحوَر پر گھوم رہا ہے۔ جو ۶۶۶۰۰ میل فی گھنٹا کی رفتار سے رواں دواں ہے۔ جس کے پیٹ میں وہ آگ بھری ہے کہ پتھروں کو پگھلا دیتی ہے اور آتش فشانوں کی شکل میں لاوا اُگل کر کبھی کبھی تمھیں بھی اپنی شان دکھا دیتی ہے۔ مگر اِس کے باوجود تمھارے خالق نے اسے اتنا پُرسکون بنا دیا ہے کہ تم آرام سے اس پر سوتے ہو اور تمھیں ذرا جھٹکا تک نہیں لگتا۔ تم اس پر رہتے ہو اور تمھیں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ کُرہ مُعلّق ہے اور تم اس پر سر کے بل لٹکے ہوئے ہو۔ تم اطمینان سے اُس پر چلتے پھرتے ہو اور تمھیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ تم بندوق کی گولی سے بھی زیادہ تیز رفتار گاڑی پر سوار ہو۔ بے تکلف اُسے کھودتے ہو، اُس کا سینہ چیرتے ہو، طرح طرح سے اُس کو پیٹ کر اپنا رزق اُس سے وصول کرتے ہو، حالانکہ اس کی ایک معمولی سی جھرجھری کبھی زلزلے کی شکل میں آ کر تمھیں خبر دے دیتی ہے کہ یہ کس بلا کا خوفناک دیو ہے جسے اللہ نے تمھارے لیے مُسخّر کر رکھا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۴-۷۵)

۸ – پہاڑوں کے بیچ بیچ میں دَرّے، اور پھر کوہستانی اور میدانی علاقوں میں دریا وہ قُدرَتی راستے ہیں جو اللہ نے زمین کی پشت پر بنا دیے ہیں۔ انسان انھی کی مدد سے کُرۂ زمین پر پھیلا ہے۔ اگر پہاڑی سلسلوں کو کسی شگاف کے بغیر بالکل ٹھوس دیوار کی شکل میں کھڑا کر دیا جاتا اور زمین میں کہیں دریا، ندیاں، نالے نہ ہوتے تو آدمی جہاں پیدا ہوا تھا، اسی علاقے میں مُقیّد ہو کر رہ جاتا۔ پھر اللہ نے مزید فضل یہ فرمایا کہ تمام رُوئے زمین کو یکساں بنا کر نہیں رکھ دیا، بلکہ اس میں قسم قسم کے ایسے امتیازی نشانات (land marks) قائم کر دیے جن کی مدد سے انسان مختلف علاقوں کو پہچانتا ہے اور ایک علاقے اور دوسرے علاقے کا فرق محسوس کرتا ہے۔ یہ دوسرا اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت انسان کے لیے زمین میں نقل و حرکت آسان ہوئی۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اسے کسی لَق و دَق صحرا میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، جہاں سیکڑوں میل تک زمین ہر قسم کے امتیازی نشانات سے خالی ہوتی ہے اور آدمی کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچا ہے اور آگے کدھر جائے۔

۹ – یہ فقرہ بیک وقت دو معنٰی دے رہا ہے: ایک معنٰی یہ کہ تم اِن قدرتی راستوں اور ان نشاناتِ راہ کی مدد سے اپنا راستہ معلوم کر سکو اور اس جگہ تک پہنچ سکو جہاں جانا چاہتے ہو۔ دوسرے معنٰی یہ کہ اللہ جَلّ شانُہٗ کی اس کاریگری کو دیکھ کر تم ہدایت حاصل کر سکو،

فَاَنۡشَرۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخۡرَجُوۡنَ ⑪ وَالَّذِىۡ
خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡفُلۡكِ وَالۡاَنۡعَامِ مَا

اور اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو جِلا اُٹھایا، اِسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے۔[11] وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے،[12] اور جس نے تمھارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا، تاکہ تم

حقیقتِ نفس الامری کو پا سکو، اور یہ سمجھ سکو کہ زمین میں یہ انتظام اَلل ٹَپ نہیں ہو گیا ہے، نہ بہت سے خداؤں نے مل کر یہ تدبیر کی ہے، بلکہ ایک ربِّ حکیم ہے جس نے اپنی مخلوق کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر پہاڑوں اور میدانوں میں یہ راستے بنائے ہیں، اور زمین کے ایک ایک خِطّے کو بے شمار طریقوں سے ایک الگ شکل دی ہے جس کی بدولت انسان ہر خطّے کو دوسرے سے مُمیّز کر سکتا ہے۔

۱۰ – یعنی ہر علاقے کے لیے بارش کی ایک اوسط مقدار مقرر کی جو مدت ہائے دراز تک سال بہ سال ایک ہی ہموار طریقے سے چلتی رہتی ہے۔ اس میں ایسی بے قاعدگی نہیں رکھی کہ کبھی سال میں دو انچ بارش ہو اور کبھی دو سو انچ ہو جائے۔ پھر وہ اُس کو مختلف زمانوں میں اور مختلف اوقات میں جگہ جگہ پھیلا کر اس طرح برساتا ہے کہ بالعُموم وہ وسیع پیمانے پر زمین کی بار آوری کے لیے نافع ہوتی ہے۔ اور یہ بھی اس کی حکمت ہی ہے کہ زمین کے بعض حصوں کو اُس نے بارش سے قریب قریب بالکل محروم کر کے بے آب و گیاہ صحرا بنا دیے ہیں، اور بعض دوسرے حصوں میں وہ کبھی قحط ڈال دیتا ہے اور کبھی طوفانی بارش کر دیتا ہے، تاکہ آدمی یہ جان سکے کہ زمین کے آباد علاقوں میں بارش اور اس کی عام باقاعدگی کتنی بڑی نعمت ہے، اور یہ بھی اُس کو یاد رہے کہ اِس نظام پر کوئی دوسری طاقت حکمراں ہے جس کے فیصلوں کے آگے کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ایک ملک میں بارش کے عام اوسط کو بدل سکے، یا زمین کے وسیع علاقوں پر اس کی تقسیم میں فرق ڈال سکے، یا کسی آتے ہوئے طوفان کو روک سکے، یا رُوٹھے ہوئے بادلوں کو منا کر اپنے ملک کی طرف کھینچ لائے اور انھیں برسنے پر مجبور کر دے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحات ۵۰۲ – ۵۰۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۱۷–۱۸)

۱۱ – یہاں پانی کے ذریعے سے زمین کے اندر روئیدگی کی پیدایش کو بیک وقت دو چیزوں کی دلیل قرار دیا گیا ہے: ایک، یہ کہ یہ کام خدائے واحد کی قدرت و حکمت سے ہو رہے ہیں، کوئی دوسرا اس کارِ خدائی میں اس کا شریک نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہو سکتی ہے اور ہو گی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۵۳ الف۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹، النمل، حاشیہ ۷۳، الروم، حواشی ۲۵ – ۳۴ – ۳۵۔ جلد چہارم، سورۂ فاطر، حاشیہ ۱۹، سورۂ یٰسٓ، حاشیہ ۲۹)

۱۲ – جوڑوں سے مراد صرف نوعِ انسانی کے زن و مرد، اور حیوانات و نباتات کے نر و مادہ ہی نہیں ہیں، بلکہ دوسری بے شمار چیزیں بھی ہیں جن کو خالق نے ایک دوسرے کا جوڑ بنایا ہے، اور جن کے اِختلاط یا امتزاج سے دنیا میں نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ مثلاً عناصر میں بعض کا بعض سے جوڑ لگتا ہے اور بعض کا بعض سے نہیں لگتا۔ جن کا جوڑ ایک دوسرے سے لگتا ہے،

تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ
اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا
هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

اُن کی پُشت پر چڑھو اور جب اُن پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے اِن چیزوں کو مسخّر کر دیا، ورنہ ہم انھیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے،[۱۳] اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔"[۱۴]

انھی کے ملنے سے طرح طرح کی ترکیبیں واقع ہو رہی ہیں۔ یا مثلاً بجلی میں منفی اور مثبت بجلیاں ایک دوسرے کا جوڑ ہیں، اور ان کی باہمی کشش ہی دنیا میں عجیب عجیب کرشموں کی موجب بن رہی ہے۔ یہ اور دوسرے اَن گنت جوڑے، جو قسم قسم کی مخلوقات کے اندر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں، ان کی ساخت، اور اِن کی باہمی مناسبتوں، اور ان کے تعامُل کی گونا گوں شکلوں، اور ان کے ملنے سے پیدا ہونے والے نتائج پر اگر انسان غور کرے تو اس کا دل یہ گواہی دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سارا کارخانۂ عالم کسی ایک ہی زبردست صانع حکیم کا بنایا ہوا ہے، اور اسی کی تدبیر سے یہ چل رہا ہے۔ صرف ایک عقل کا اندھا ہی یہ فرض کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کے بغیر ہوا اور ہو رہا ہے، یا اس میں ایک سے زیادہ خداؤں کی دخیل کاری کا کوئی امکان ہے۔

۱۳ — یعنی زمین کی تمام مخلوقات میں سے تنہا انسان کو کشتیاں اور جہاز چلانے اور سواری کے لیے جانور استعمال کرنے کی یہ مَقدِرت اللہ تعالیٰ نے اس لیے تو نہیں دی تھی کہ وہ غلّے کی بوریوں کی طرح ان پر لد جائے اور کبھی نہ سوچے کہ آخر وہ کون ہے جس نے ہمارے لیے بحرِ زخّار میں کشتیاں دوڑانے کے امکانات پیدا کیے، اور جس نے جانوروں کی بے شمار اقسام میں سے بعض کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ ہم سے بدرجہا زیادہ طاقتور ہونے کے باوجود ہمارے تابعِ فرمان بن جاتے ہیں، اور ہم ان پر سوار ہو کر جدھر چاہتے ہیں انھیں لیے پھرتے ہیں۔ اِن نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا اور نعمت دینے والے کو فراموش کر دینا، دل کے مُردہ اور عقل و ضمیر کے بے حس ہونے کی علامت ہے۔ ایک زندہ اور حسّاس قلب و ضمیر رکھنے والا انسان تو اِن سواریوں پر جب بیٹھے گا تو اس کا دل احساسِ نعمت اور شکرِ نعمت کے جذبے سے لبریز ہو جائے گا۔ وہ پکار اُٹھے گا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے میرے لیے ان چیزوں کو مسخّر کیا۔ پاک ہے اِس سے کہ اُس کی ذات وصفات اور اختیارات میں کوئی اس کا شریک ہو۔ پاک ہے اس کمزوری سے کہ اپنی خدائی کا کام خود چلانے سے وہ عاجز ہو اور دوسرے مددگار خداؤں کی اسے حاجت پیش آئے۔ پاک ہے اِس سے کہ مَیں اِن نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کروں۔

اس آیت کے منشا کی بہترین عملی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اذکار ہیں جو سواریوں پر بیٹھتے وقت آپؐ کی زبان مبارک پر جاری ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ جب سفر پر جانے کے لیے سواری پر بیٹھتے تو تین مرتبہ

اللہ اکبر کہتے، پھر یہ آیت پڑھتے، اور اس کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللھم انی اسألك فی سفری ھٰذا البِرَّ والتقویٰ، ومن العمل ما ترضٰی، اللھم ھَوِّن لنا السفر، واطْوِلَنا البعیدَ، اللھم انت الصاحب فی السفر، والخلیفۃُ فی الاھل، اللھم اَصْحِبْنا فی سفرنا واخْلُفْنَا فی اھلنا۔ (مُسْنَدِ احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، دارِمی، ترمذِی)

''خدایا! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے اس سفر میں مجھے نیکی اور تقویٰ اور ایسے عمل کی توفیق دے جو تجھے پسند ہو۔ خدایا! ہمارے لیے سفر کو آسان کر دے اور لمبی مَسافت کو لپیٹ دے۔ خدایا! تو ہی سفر کا ساتھی اور ہمارے پیچھے ہمارے اہل وعیال کا نگہبان ہے۔ خدایا! ہمارے سفر میں ہمارے ساتھ اور پیچھے ہمارے گھر والوں کی خبر گیری فرما۔''

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر رِکاب میں پاؤں رکھا، پھر سوار ہونے کے بعد فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا......، پھر تین مرتبہ الحمد للہ اور تین دفعہ اللہ اکبر کہا، پھر فرمایا: سُبْحٰنَكَ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ، قد ظلمتُ نفسی فاغفرلی۔ اس کے بعد آپؐ ہنس دیے۔ میں نے پوچھا: یا رسولؐ اللہ! آپ ہنسے کس بات پر؟ فرمایا: بندہ جب ربِّ اغْفِرْلِیْ کہتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس کی یہ بات بڑی پسند آتی ہے، وہ فرماتا ہے کہ میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا مغفرت کرنے والا کوئی اور نہیں ہے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذِی، نَسائی وغیرہ)

ایک صاحب ابومِجْلَز بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں جانور پر سوار ہوا اور میں نے آیت سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا پڑھی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا اس طرح کرنے کا تمھیں حکم دیا گیا ہے؟ میں نے عرض کیا: پھر کیا کہوں؟ فرمایا: یوں کہو کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمیں اسلام کی ہدایت دی، شکر ہے اُس کا کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ہم پر احسان فرمایا، شکر ہے اس کا کہ اس نے ہمیں اُس بہترین اُمت میں داخل کیا جو خَلْقِ خدا کے لیے نکالی گئی ہے، اس کے بعد یہ آیت پڑھو۔ (ابنِ جَرِیر، احکام القرآن للجَصّاص)

۱۴ – مطلب یہ ہے کہ ہر سفر پر جاتے ہوئے یاد کرلو کہ آگے ایک بڑا اور آخری سفر بھی درپیش ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ہر سواری کو استعمال کرنے میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ شاید کوئی حادثہ اسی سفر کو آدمی کا آخری سفر بنا دے، اس لیے بہتر ہے کہ ہر مرتبہ وہ اپنے رب کی طرف واپسی کو یاد کر کے چلے، تاکہ اگر مرنا ہی ہے تو بے خبر نہ مرے۔

یہاں تھوڑی دیر ٹھیر کر ذرا اس تعلیم کے اَخلاقی نتائج کا بھی اندازہ کر لیجیے۔ کیا آپ یہ تصوُّر کر سکتے ہیں کہ جو شخص کسی سواری پر بیٹھتے وقت سمجھ بُوجھ کر پورے شُعور کے ساتھ اس طرح اللہ کو اور اس کے حضور اپنی واپسی اور جواب دِہی کو یاد کر کے چلا ہو، وہ آگے جا کر کسی فِسق وفُجور یا کسی ظلم وستم کا مرتکب ہوگا؟ کیا کسی فاحشہ سے ملاقات کے لیے، یا کسی کلَب میں شراب خوری اور قمار بازی کے لیے جاتے وقت بھی کوئی شخص یہ کلمات زبان سے نکال سکتا ہے یا ان کا خیال کر سکتا ہے؟ کیا کوئی حاکم، یا سرکاری افسر، یا تاجر، جو یہ کچھ سوچ کر اور اپنے منہ سے کہہ کر گھر سے چلا ہو، اپنی جائے عمل پر پہنچ کر لوگوں کے حق مار سکتا ہے؟ کیا کوئی سپاہی بے گناہوں کا خون بہانے اور کمزوروں کی آزادی پر ڈاکا مارنے کے لیے جاتے وقت بھی اپنے ہوائی جہاز یا ٹینک پر قدم رکھتے ہوئے یہ الفاظ زبان پر لا سکتا ہے؟ اگر نہیں، تو یہی ایک چیز ہر اُس نقل وحرکت پر بند باندھ دینے کے لیے کافی ہے جو معصیت

ع ۱۵

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۟ؕ ﴿۱۵﴾
اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاِذَا بُشِّرَ
اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ
كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ

(یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی) اِن لوگوں نے اُس کے بندوں میں سے بعض کواس کا جُز بنا ڈالا،[15] حقیقت یہ ہے کہ انسان کُھلا احسان فراموش ہے۔ ع

کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمھیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اُس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُس کی ولادت کا مُژدہ جب خود اِن میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اُس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔[16] کیا اللہ کے حصّے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث وحجت میں اپنا مدّعا پوری طرح

کے لیے ہو۔

۱۵ - جُز بنا دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے کسی بندے کو اُس کی اولاد قرار دیا جائے، کیونکہ اولاد لا محالہ باپ کی ہم جنس اور اس کے وجود کا ایک جُز ہوتی ہے، اور کسی شخص کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنے کے معنٰی ہی یہ ہیں کہ اُسے اللہ کی ذات میں شریک کیا جا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ کسی مخلوق کو اللہ کا جُز بنانے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اُسے اُن صفات اور اختیارات کا حامل قرار دیا جائے جو اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اِسی تصور کے تحت اُس سے دُعائیں مانگی جائیں، یا اُس کے آگے عُبودیّت کے مراسم ادا کیے جائیں، یا اُس کی تحریم وتحلیل کو شریعتِ واجب الاتباع ٹھیرا لیا جائے۔ کیونکہ اس صورت میں آدمی اُلوہیّت ورُبوبیّت کو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان بانٹتا ہے اور اس کا ایک جُز بندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

۱۶ - یہاں مشرکینِ عرب کی نامعقولیت کو پوری طرح بے نقاب کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اُن کے بت انھوں نے عورتوں کی شکل کے بنا رکھے تھے، اور یہی ان کی وہ دیویاں تھیں جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اوّل تو تم نے یہ جاننے اور ماننے کے باوجود، کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے، اور اِس زمین کو اُسی نے تمھارے لیے گہوارہ بنایا ہے، اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، اور اُسی نے یہ جانور تمھاری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں، اُس کے ساتھ دوسروں کو معبود بنایا۔ حالانکہ جنھیں تم معبود بنا رہے ہو، وہ خدا نہیں بلکہ بندے ہیں۔ پھر مزید غضب یہ کیا کہ بعض بندوں کو صفات ہی میں نہیں بلکہ اللہ کی ذات میں بھی اُس کا شریک بنا ڈالا، اور یہ عقیدہ ایجاد کیا کہ وہ اللہ کی اولاد ہیں۔ اس پر بھی تم نے بس نہ کیا اور اللہ

مُّبِیۡنٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الۡمَلٰٓئِکَۃَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عِبٰدُ الرَّحۡمٰنِ اِنَاثًا ؕ

واضح بھی نہیں کر سکتی؟[۱۷]

انھوں نے فرشتوں کو، جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں،[۱۸] عورتیں قرار دے لیا۔

کے لیے وہ اولاد تجویز کی جسے تم خود اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے ہو۔ بیٹی گھر میں پیدا ہو جائے تو تمھارا منہ کالا ہو جاتا ہے، خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتے ہو، بلکہ بعض اوقات زندہ بچی کو دفن کر دیتے ہو۔ یہ اولاد تو آئی اللہ کے حصّے میں۔ اور بیٹے، جو تمھارے نزدیک فخر کے قابل اولاد ہیں، مخصوص ہو گئے تمھارے لیے؟ اس پر تمھارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ کے ماننے والے ہیں۔

۱۷ — بالفاظِ دیگر، جو نرم و نازک اور ضعیف و کمزور اولاد ہے وہ تم نے اللہ کے حصّے میں ڈالی، اور خم ٹھونک کر میدان میں اُترنے والی اولاد خود لے اُڑے۔

اِس آیت سے عورتوں کے لیے زیور کے جواز کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے زیور کو ایک فطری چیز قرار دیا ہے۔ یہی بات احادیث سے بھی ثابت ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور نَسائی حضرت علیؓ سے رِوایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ میں ریشم اور دوسرے ہاتھ میں سونا لے کر فرمایا: یہ دونوں چیزیں لباس میں استعمال کرنا میری اُمت کے مردوں پر حرام ہے۔ تِرمِذی اور نَسائی نے حضرت ابوموسیٰؓ اَشعَری کی رِوایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ریشم اور سونا میری اُمت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں پر حرام کیا گیا۔ علامہ ابوبکر جَصّاصؒ نے احکام القرآن میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے حسبِ ذیل رِوایات نقل کی ہیں:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کے صاحبزادے اُسامہ بن زیدؓ کو چوٹ لگ گئی اور خون بہنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اپنی اولاد جیسی مَحبّت تھی۔ آپؐ ان کا خون چوس چوس کر تھوکتے جاتے اور ان کو یہ کہہ کہہ کر بہلاتے جاتے کہ اُسامہ اگر بیٹی ہوتا تو ہم اسے زیور پہناتے، اُسامہ اگر بیٹی ہوتا تو ہم اسے اچھے اچھے کپڑے پہناتے۔

حضرت ابوموسیٰؓ اَشعَری کی رِوایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لبس الحریر والذھب حرام علی ذکور امتی وحلال لاناثھا۔ ”ریشمی کپڑے اور سونے کے زیور پہننا میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔“

حضرت عَمرُوؓ بن عاص کی رِوایت ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتیں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم پسند کرتی ہو کہ اللہ تمھیں ان کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے؟ انھوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تو ان کا حق ادا کرو، یعنی ان کی زکوٰۃ نکالو۔

حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ زیور پہننے میں مُضایقہ نہیں، بشرطیکہ اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰؓ اَشعَری کو لکھا کہ تمھاری عمل داری میں جو مسلمان عورتیں رہتی ہیں، اُن کو حکم دو کہ اپنے زیوروں کی زکوٰۃ نکالیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے عَمرو بن دینار کے حوالے سے یہ رِوایات نقل کی ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے اپنی بہنوں کو اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ

اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا
لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ
اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ؕ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ
فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى

کیا اُن کے جسم کی ساخت اِنھوں نے دیکھی ہے؟[19] اِن کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انھیں اس کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔

یہ کہتے ہیں: ''اگر خدائے رحمٰن چاہتا (کہ ہم ان کی عبادت نہ کریں) تو ہم کبھی اُن کو نہ پُوجتے۔''[20] یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے، محض تیر تُکّے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اِس سے پہلے کوئی کتاب اِن کو دی تھی جس کی سند (اپنی اِس ملائکہ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہیں؟[21] نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک

نے اپنی بیٹیوں کو سونے کے زیور پہنائے تھے۔

اِن تمام رِوایات کو نقل کرنے کے بعد علّامہ جَصّاصؒ لکھتے ہیں کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے جو رِوایات عورتوں کے لیے سونے اور ریشم کے حلال ہونے کے متعلق وارد ہوئی ہیں، وہ عدَمِ جواز کی رِوایات سے زیادہ مشہور اور نمایاں ہیں۔ اور آیتِ مذکورہ بالا بھی اس کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ پھر اُمّت کا عمل بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانے سے ہمارے زمانے (یعنی چوتھی صدی کے آخری دَور) تک یہی رہا ہے، بغیر اس کے کہ کسی نے اس پر اعتراض کیا ہو۔ اس طرح کے مسائل میں اخبارِ آحاد کی بنا پر کوئی اعتراض تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔''

۱۸ – یعنی مذکر یا مؤنث ہونے سے مُبرّا ہیں۔ یہ مفہوم فَحوائے کلام سے خود بخود مُترشّح ہو رہا ہے۔

۱۹ – دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''کیا اُن کی پیدایش کے وقت یہ موجود تھے؟''

۲۰ – یہ اپنی گمراہی پر تقدیر سے اُن کا اِستدلال تھا جو ہمیشہ سے غلط کار لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارا فرشتوں کی عبادت کرنا اسی لیے تو ممکن ہوا کہ اللہ نے ہمیں یہ کام کرنے دیا۔ اگر وہ نہ چاہتا کہ ہم یہ فعل کریں تو ہم کیسے کر سکتے تھے۔ پھر مدّت ہائے دراز سے ہمارے ہاں یہ کام ہو رہا ہے اور اللہ کی طرف سے اس پر کوئی عذاب نازل نہ ہوا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ کو ہمارا یہ کام ناپسند نہیں ہے۔

۲۱ – مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت سے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے، وہ چونکہ اللہ کی مَشیّت کے تحت ہو رہا ہے، اس لیے ضرور اس کو اللہ کی رضا بھی حاصل ہے۔ حالانکہ اگر یہ اِستدلال صحیح ہو تو دنیا میں صرف ایک شرک ہی تو نہیں

أُمَّةٍ وَّإِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا
عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿٢٣﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ

طریقے پر پایا ہے، اور ہم انھی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں[۲۲]۔ اِسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے، اور ہم انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں[۲۳]۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا: کیا تم اُسی ڈگر پر چلے جاؤ گے،

ہو رہا ہے۔ چوری، ڈاکا، قتل، زِنا، رشوت، بدعہدی، اور ایسے ہی دوسرے بے شمار جرائم بھی ہو رہے ہیں جنھیں کوئی شخص بھی نیکی اور بھلائی نہیں سمجھتا۔ پھر کیا اِسی طرزِ اِستدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جائے گا کہ یہ تمام افعال حلال وطیّب ہیں، کیونکہ اللہ اپنی دنیا میں انھیں ہونے دے رہا ہے، اور جب وہ اِنھیں ہونے دے رہا ہے، تو ضرور وہ ان کو پسند بھی کرتا ہے؟ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذریعہ وہ واقعات نہیں ہیں جو دنیا میں ہو رہے ہیں، بلکہ اللہ کی کتاب ہے جو اس کے رسول کے ذریعے سے آتی ہے اور جس میں اللہ خود بتاتا ہے کہ اسے کون سے عقائد، کون سے اعمال، اور کون سے اَخلاق پسند ہیں اور کون سے ناپسند۔ پس اگر قرآن سے پہلے آئی ہوئی کوئی کتاب اِن لوگوں کے پاس ایسی موجود ہو جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ فرشتے بھی میرے ساتھ تمھارے معبود ہیں اور تم کو ان کی عبادت بھی کرنی چاہیے، تو یہ لوگ اس کا حوالہ دیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۷۱-۷۹-۸۰-۱۱۰-۱۲۴-۱۲۵۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۶، یونس، حاشیہ ۱۰۱، ہود، حاشیہ ۱۱۶، الرعد، حاشیہ ۴۹، النحل، حواشی ۱۰-۳۱-۹۴۔ جلد چہارم، الزُّمَر، حاشیہ ۲۰، الشُّوریٰ، حاشیہ ۱۱)

۲۲ – یعنی ان کے پاس کسی کتابِ الٰہی کی کوئی سند نہیں ہے، بلکہ سند صرف یہ ہے کہ باپ دادا سے یوں ہی ہوتا چلا آ رہا ہے، لہٰذا ہم بھی انھی کی تقلید میں فرشتوں کو دیویاں بنائے بیٹھے ہیں۔

۲۳ – یہ بات قابلِ غور ہے کہ انبیاؑ کے مقابلے میں اٹھ کر باپ دادا کی تقلید کا جھنڈا بلند کرنے والے ہر زمانے میں اپنی قوم کے کھاتے پیتے لوگ ہی کیوں رہے ہیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ وہی حق کی مخالفت میں پیش پیش اور قائم شدہ جاہلیّت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں سرگرم رہے، اور وہی عوام کو بہکا اور بھڑکا کر انبیا علیہم السلام کے خلاف فتنے اُٹھاتے رہے؟ اس کے بنیادی وجوہ دو تھے: ایک، یہ کہ کھاتے پیتے اور خوشحال طبقے اپنی دنیا بنانے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ حق اور باطل کی، بزعمِ خویش، دُوراَز کار بحث میں سر کھپانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اُن کی تن آسانی اور ذہنی کاہلی دین کے معاملے میں انتہائی بے فکر، اور اِس کے ساتھ عملاً قدامت پسند (conservative) بنا دیتی ہے، تاکہ جو حالت پہلے سے قائم چلی آ رہی ہے وہی، قطعِ نظر اس سے کہ وہ حق ہے یا باطل، جُوں کی تُوں قائم رہے اور کسی نئے نظام کے متعلق

بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۗ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ
بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ النصف
بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾
وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

خواہ مَیں اُس راستے سے زیادہ صحیح راستہ تمھیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انھوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو، ہم اُس کے کافر ہیں۔ آخرِ کار ہم نے اُن کی خبر لے ڈالی، اور دیکھ لو کہ جُھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ ع

یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا[۲۴] کہ "تم جن کی بندگی کرتے ہو، میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق صرف اُس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری رہنمائی کرے گا[۲۵]۔" اور ابراہیمؑ یہی کلمہ[۲۶] اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا، تاکہ وہ اِس کی طرف رُجوع کریں[۲۷]۔

سوچنے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔ دوسرے، یہ کہ قائم شدہ نظام سے اُن کے مفاد پوری طرح وابستہ ہو چکے ہوتے ہیں، اور انبیا علیہم السلام کے پیش کردہ نظام کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں وہ بھانپ جاتے ہیں کہ یہ آئے گا تو ان کی چودھراہٹ کی بِساط بھی لپیٹ کر رکھ دی جائے گی، اور ان کے لیے اَکلِ حرام اور فعلِ حرام کی بھی کوئی آزادی باقی نہ رہے گی۔ (مزید تفصیل لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۹۱۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۴۶ - ۵۳ - ۵۸ - ۴۷ - ۸۸ - ۹۲، ہود، حواشی ۳۱ - ۳۲ - ۴۱، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۸۔ جلد سوم، المؤمنون، حواشی ۲۶ - ۲۷ - ۳۵ - ۵۹۔ جلد چہارم، سَبا، آیت ۳۴، حاشیہ ۵۴)

۲۴ – تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی، ۱۲۴ تا ۱۳۳، الاَنعام، حواشی ۵۰ تا ۵۵۔ جلد دوم، ابراہیم، حواشی ۴۶ تا ۵۳۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۲۶ - ۲۷، الانبیاء، حواشی ۵۴ تا ۶۶، الشعراء، حواشی ۵۰ تا ۶۲، العنکبوت، حواشی ۲۶ تا ۴۶۔ جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۸۳ تا ۱۰۰، حواشی ۴۴ تا ۵۵۔

۲۵ – اِن الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ نے محض اپنا عقیدہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ اس کی دلیل بھی دے دی۔ دوسرے معبُودوں سے تعلّق نہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ نہ انھوں نے پیدا کیا ہے، نہ وہ کسی معاملے میں صحیح رہنمائی کرتے ہیں، نہ کر سکتے ہیں۔ اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے تعلّق جوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ وہی پیدا کرنے والا ہے اور وہی انسان کی صحیح رہنمائی

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾
وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

(اس کے باوجود جب یہ لوگ دوسروں کی بندگی کرنے لگے تو میں نے ان کو مٹا نہیں دیا) بلکہ میں اِنھیں اور اِن کے باپ دادا کو متاعِ حیات دیتا رہا، یہاں تک کہ اِن کے پاس حق، اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آ گیا۔[۲۸] مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو اِنھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادُو ہے[۲۹] اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔
کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟[۳۰]

کرتا ہے اور کرسکتا ہے۔

۲۶ – یعنی یہ بات کہ خالق کے سوا کوئی معبود ہونے کا مستحق نہیں ہے۔

۲۷ – یعنی جب بھی راہِ راست سے ذرا قدم ہٹے تو یہ کلمہ ان کی رہنمائی کے لیے موجود رہے اور وہ اسی کی طرف پلٹ آئیں۔ اس واقعے کو جس غرض کے لیے یہاں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کفارِ قریش کی نامعقولیت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا جائے اور انھیں اس بات پر شرم دلائی جائے کہ تم نے اسلاف کی تقلید اختیار کی بھی تو اس کے لیے اپنے بہترین اسلاف کو چھوڑ کر اپنے بدترین اسلاف کا انتخاب کیا۔ عرب میں قریش کی مَشیخت جس بنا پر چل رہی تھی وہ تو یہ تھی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اولاد تھے اور ان کے بنائے ہوئے کعبے کی مجاوری کر رہے تھے۔ اس لیے انھیں پیروی اُن کی کرنی چاہیے تھی، نہ کہ اپنے اُن جاہل اسلاف کی جنھوں نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے طریقے کو چھوڑ کر گرد و پیش کی بت پرست قوموں سے شرک سیکھ لیا۔ پھر اس واقعے کو بیان کر کے ایک اور پہلو سے بھی ان گمراہ لوگوں کی غَلَطی واضح کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حق و باطل کی تمیز کیے بغیر اگر آنکھیں بند کر کے باپ دادا کی تقلید کرنا درست ہوتا تو سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ یہ کام کرتے۔ مگر انھوں نے صاف صاف اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہہ دیا کہ مَیں تمھارے اِس جاہلانہ مذہب کی پیروی نہیں کر سکتا جس میں تم نے اپنے خالق کو چھوڑ کر ان ہستیوں کو معبود بنا رکھا ہے جو خالق نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ تقلیدِ آبائی کے قائل نہ تھے، بلکہ ان کا مسلک یہ تھا کہ باپ دادا کی پیروی کرنے سے پہلے آدمی کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیے کہ وہ صحیح راستے پر ہیں بھی یا نہیں، اور اگر دلیلِ معقول سے یہ ظاہر ہو کہ وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو ان کی پیروی چھوڑ کر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو دلیل کی رُو سے حق ہو۔

۲۸ – اصل میں رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا رسول

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾

کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں اِن کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے، تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں[۳۱]۔ اور تیرے رب کی رحمت اُس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (اِن کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں[۳۲]۔

آ گیا جس کا رسول ہونا بالکل ظاہر و باہر تھا۔ جس کی نبوت سے پہلے کی زندگی اور بعد کی زندگی صاف شہادت دے رہی تھی کہ وہ یقیناً خدا کا رسول ہے۔

۲۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ صٓ، حاشیہ ۵۔

۳۰ – دونوں شہروں سے مراد مکّہ اور طائف ہیں۔ کفار کا یہ کہنا تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اُس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے اِن مرکزی شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لیے منتخب کرتا۔ رسول بنانے کے لیے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا، جس کے حصّے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چَرا کر جوانی گزار دی، جو اَب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، اور جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خانوادے کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکے میں ولید بن مُغیرہ اور عُتبہ بن رَبیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عُروہ بن مسعود، حبیب بن عَمرو، کِنانہ بن عبدِعَمرو اور ابنِ عبدِ یالِیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا اُن لوگوں کا اِستدلال۔ پہلے تو وہ یہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی بَشَر بھی رسول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآنِ مجید میں پے در پے دلائل دے کر ان کے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا، اور اُن سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے رہے ہیں، اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشر ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں آئے ہیں وہ یکایک آسمان سے نہیں اتر آئے تھے، بلکہ انھی انسانی بستیوں میں پیدا ہوئے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے، اور کھانے پینے سے مُبرّا نہ تھے (مُلاحظہ ہو: النحل: آیت ۴۳۔ بنی اسرائیل: ۹۴-۹۵۔ یوسف: ۱۰۹۔ الفرقان: ۷-۲۰۔ الانبیاء: ۷-۸۔ الرعد: ۳۸)، تو انھوں نے یہ دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا، بشر ہی رسول سہی، مگر وہ کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے۔ مال دار ہو، بااثر ہو، بڑے جتّھے والا ہو، لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اِس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟

۳۱ – یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے جس کے اندر چند مختصر الفاظ میں بہت سی اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں: پہلی بات یہ کہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا ان کے سُپرد کب سے ہو گیا؟ کیا یہ طے کرنا اِن کا کام ہے کہ اللہ اپنی رحمت

وَ لَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ

اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے

سے کس کو نوازے اور کس کو نہ نوازے؟ (یہاں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمتِ عام ہے جس میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے۔)

دوسری بات یہ کہ نبوت تو خیر بہت بڑی چیز ہے، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں، ان کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت، کسی کو خوش آواز اور کسی کو بد آواز، کسی کو قوی ہیکل اور کسی کو کمزور، کسی کو ذہین اور کسی کو کُند ذہن، کسی کو قوی الحافظہ اور کسی کو نسیان میں مبتلا، کسی کو سلیم الاعضا اور کسی کو اپاہج یا اندھا یا گونگا بہرا، کسی کو امیر زادہ اور کسی کو فقیر زادہ، کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں۔ اس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرّہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ جس کو جو کچھ ہم نے بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور ان مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی کی تقدیر پر پڑتا ہے، اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق، طاقت، عزت، شہرت، دولت، حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہوتا ہے اسے کوئی گرا نہیں سکتا، اور جس پر ہماری طرف سے اِدبار آ جاتا ہے اسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس عالمگیر خدائی انتظام میں یہ لوگ کہاں فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کائنات کا مالک کسے اپنا نبی بنائے اور کسے نہ بنائے۔

تیسری بات یہ کہ اس خدائی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو، یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، ہر طرف تمھیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوُت ہی تفاوُت نظر آئے گا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اس کو محروم کر دیا ہے، اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے۔ یہ اس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسروں سے بے نیاز نہ ہو، بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملے میں دوسرے کا محتاج رہے۔ اب یہ کیسا احمقانہ خیال تمھارے دماغ میں سمایا ہے کہ جسے ہم نے ریاست اور وجاہت دی ہے، اُسی کو نبوت بھی دے دی جائے؟ کیا اسی طرح تم یہ بھی کہو گے کہ عقل، علم، دولت، حُسن، طاقت، اقتدار، اور دوسرے تمام کمالات ایک ہی میں جمع کر دیے جائیں، اور جس کو ایک چیز نہیں ملی ہے اُسے دوسری بھی کوئی چیز نہ دی جائے؟

۳۲ – یہاں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمتِ خاص، یعنی نبوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن رئیسوں کو اُن کی دولت و وجاہت اور مَشِیخَت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو، وہ اِس دولت کے قابل نہیں ہیں جو محمد ابنِ عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی گئی ہے۔ یہ دولت اُس دولت سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ درجے کی ہے، اور اس کے لیے موزونیت کا معیار کچھ اور ہے۔ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمھارا ہر چودھری اور سیٹھ نبی بننے کا اہل ہے، تو یہ تمھارے اپنے ہی ذہن کی پستی ہے۔ اللہ سے اِس نادانی کی توقع کیوں رکھتے ہو؟

بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِــُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ
كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ
لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ ع وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا
فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ
وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ
بَيْنِىْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾

گھروں کی چھتیں، اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالا خانوں پر چڑھتے ہیں، اور اُن کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے کے بنوا دیتے۔[۳۳] یہ تو محض حیاتِ دنیا کی متاع ہے، اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متّقین کے لیے ہے۔ ع

جو شخص رحمٰن کے ذکر[۳۴] سے تغافل برتتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں اور وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں، اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا: "کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بُعد ہوتا، تُو تو بدترین ساتھی نکلا۔"

۳۳ – یعنی یہ سیم وزر، جس کا کسی کو مل جانا تمھاری نگاہ میں نعمت کی انتہا اور قدر و قیمت کی معراج ہے، اللہ کی نگاہ میں اتنی حقیر چیز ہے کہ اگر تمام انسانوں کے کفر کی طرف ڈھلک پڑنے کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ ہر کافر کا گھر سونے چاندی کا بنا دیتا۔ اِس جنسِ فرومایہ کی فراوانی آخر کب سے انسان کی شرافت اور پاکیزگیِ نفس اور طہارتِ رُوح کی دلیل بن گئی؟ یہ مال تو ان خبیث ترین انسانوں کے پاس بھی پایا جاتا ہے جن کے گھناؤنے کردار کی سڑاند سے سارا معاشرہ مُتعفّن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اِسے تم نے آدمی کی بڑائی کا معیار بنا رکھا ہے۔

۳۴ – وسیع المعنیٰ لفظ ہے۔ رحمٰن کے ذکر سے مراد اس کی یاد بھی ہے، اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت بھی، اور یہ قرآن بھی۔

وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾
اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ مَنْ كَانَ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ
نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ
بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾

اُس وقت اِن لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمھارے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہے کہ تم اور تمھارے شیاطین عذاب میں مشترک ہیں۔[۳۵]

اب کیا اے نبیؐ! تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے؟[۳۶] اب تو ہمیں اِن کو سزا دینی ہے، خواہ تمھیں دنیا سے اُٹھالیں، یا تم کو آنکھوں سے اِن کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے اِن سے وعدہ کیا ہے، ہمیں اِن پر پوری قدرت حاصل ہے۔[۳۷] تم بہرحال اُس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعے سے تمھارے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً تم سیدھے راستے[۳۸] پر ہو۔

۳۵ – یعنی اس امر میں تمھارے لیے تسلّی کا کوئی پہلو نہیں ہے کہ تمھیں غلط راہ پر ڈالنے والے کو سزا مل رہی ہے، کیونکہ وہی سزا گمراہی قبول کرنے کی پاداش میں تم بھی پا رہے ہو۔

۳۶ – مطلب یہ ہے کہ جو سننے کے لیے تیار ہوں اور جنھوں نے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں ان کی طرف توجہ کرو، اور اندھوں کو دکھانے اور بہروں کو سنانے کی کوشش میں اپنی جان نہ کھپاؤ، نہ اس غم میں اپنے آپ کو گُھلاتے رہو کہ تمھارے یہ بھائی بند کیوں راہِ راست پر نہیں آتے اور کیوں اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں۔

۳۷ – اِس ارشاد کا مطلب اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنے سے ہی اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی ہے۔ کفارِ مکّہ یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی اُن کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے یہ کانٹا درمیان سے نکل جائے تو پھر سب اچھا ہو جائے گا۔ اسی گمانِ فاسد کی بنا پر وہ شب و روز بیٹھ بیٹھ کر مشورے کرتے تھے کہ آپؐ کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ اُن کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنے نبیؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمھارے رہنے یا نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم زندہ رہو گے تو تمھاری آنکھوں کے سامنے اِن کی شامت آئے گی، اُٹھا لیے جاؤ گے تو تمھارے پیچھے اِن کی خبر لی جائے گی۔ شامتِ اعمال اب ان کی دامن گیر ہو چکی ہے جس سے یہ بچ نہیں سکتے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً
يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

ع ۱۰

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمھارے لیے اور تمھاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے، اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جوابدِہی کرنی ہوگی۔[۳۹] تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے، اُن سب سے پوچھ دیکھو، کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ اُن کی بندگی کی جائے؟[۴۰]

ہم نے[۴۱] موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے[۴۲] ساتھ فرعون اور اُس کے اَعیانِ سلطنت کے پاس بھیجا،

۳۸ – یعنی تم اس فکر میں نہ پڑو کہ ظلم اور بے ایمانی کے ساتھ حق کی مخالفت کرنے والے اپنے کیے کی کیا اور کب سزا پاتے ہیں، نہ اِس بات کی فکر کرو کہ اسلام کو تمھاری زندگی میں فروغ حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ تمھارے لیے بس یہ اطمینان کافی ہے کہ تم حق پر ہو۔ لہٰذا نتائج کی فکر کیے بغیر اپنا فرض انجام دیتے چلے جاؤ، اور یہ اللہ پر چھوڑ دو کہ وہ باطل کا سر تمھارے سامنے نیچا کرتا ہے یا تمھارے پیچھے۔

۳۹ – یعنی اِس سے بڑھ کر کسی شخص کی کوئی خوش قسمتی نہیں ہو سکتی کہ تمام انسانوں میں سے اُس کو اللہ اپنی کتاب نازل کرنے کے لیے منتخب کرے، اور کسی قوم کے حق میں بھی اس سے بڑی کسی خوش قسمتی کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی دوسری سب قوموں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اُس کے ہاں اپنا نبی پیدا کرے اور اُس کی زبان میں اپنی کتاب نازل کرے اور اُسے دنیا میں پیغامِ خداوندی کی حامل بن کر اُٹھنے کا موقع دے۔ اس شَرفِ عظیم کا احساس اگر قریش اور اہلِ عرب کو نہیں ہے اور وہ اس کی ناقدری کرنا چاہتے ہیں، تو ایک وقت آئے گا جب انھیں اس کی جوابدِہی کرنی ہوگی۔

۴۰ – رسولوں سے پوچھنے کا مطلب اُن کی لائی ہوئی کتابوں سے معلوم کرنا ہے۔ جس طرح فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی معاملے میں اگر تمھارے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت کی طرف رُجوع کرو، اسی طرح رسولوں سے پوچھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جو رسول دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں ان سب کے پاس جا کر دریافت کرو، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسول دنیا میں جو تعلیمات چھوڑ گئے ہیں ان سب میں تلاش کر کے دیکھ لو، آخر کس نے یہ بات سکھائی تھی کہ اللہ جَلَّ شانُہٗ کے سوا بھی کوئی عبادت کا مستحق ہے؟

۴۱ – یہ قصہ یہاں تین مقاصد کے لیے بیان کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ اللہ تعالیٰ جب کسی ملک اور کسی قوم میں اپنا نبی بھیج کر اسے وہ موقع عطا فرماتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثت سے اب اہلِ عرب کو اُس نے عطا فرمایا ہے، اور وہ اُس کی قدر

فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا ہُمۡ
مِّنۡہَا یَضۡحَکُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَ مَا نُرِیۡہِمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ اِلَّا ہِیَ اَکۡبَرُ مِنۡ اُخۡتِہَا ۫
وَ اَخَذۡنٰہُمۡ بِالۡعَذَابِ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَ قَالُوۡا یٰۤاَیُّہَ السّٰحِرُ

اور اُس نے جا کر کہا کہ میں ربّ العالمین کا رسول ہوں۔ پھر جب اُس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے۔ ہم ایک پر ایک ایسی نشانی اُن کو دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی، اور ہم نے اُن کو عذاب میں دھر لیا، تاکہ وہ اپنی رَوِش سے باز آئیں۔[۴۳] ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے: اَے ساحر!

کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے اُس حماقت کا ارتکاب کرتی ہے جس کا ارتکاب فرعون اور اس کی قوم نے کیا تھا، تو پھر اس کا وہ انجام ہوتا ہے جو تاریخ میں نمونۂ عبرت بن چکا ہے۔ دوسرے، یہ کہ فرعون نے بھی اپنی بادشاہی اور اپنی شوکت وحشمت اور دولت و ثروت پر فخر کر کے موسیٰؑ کو اسی طرح حقیر سمجھا تھا جس طرح اب کفارِ قریش اپنے سرداروں کے مقابلے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیر سمجھ رہے ہیں۔ مگر خدا کا فیصلہ کچھ اور تھا، جس نے آخر بتا دیا کہ اصل میں حقیر و ذلیل کون تھا۔ تیسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ مذاق اور اس کی تنبیہات کے مقابلے میں ہیکڑی دکھانا کوئی سستا سودا نہیں ہے، بلکہ یہ سودا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس کا خمیازہ جو بھگت چکے ہیں ان کی مثال سے سبق نہ لو گے تو خود بھی ایک روز وہی خمیازہ بھگت کر رہو گے۔

۴۲ – ان سے مراد وہ ابتدائی نشانیاں ہیں جنھیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں گئے تھے، یعنی عصا اور یدِ بَیضا۔ (تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاَعراف، حواشی ۸۷ تا ۸۹۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۱۲- ۱۳- ۲۹- ۳۰، الشعراء، حواشی ۲۶ تا ۲۹، النمل، حاشیہ ۱۶، القصص، حواشی ۴۴- ۴۵)

۴۳ – اِن نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعے سے ان کو دکھائیں، اور وہ یہ تھیں:

(۱) جادوگروں سے اللہ کے نبی کا برسرِ عام مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر ایمان لے آئے۔ تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۸ تا ۹۲۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۳۰ تا ۵۰، الشعراء، حواشی ۲۹ تا ۴۰۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے پیشگی اعلان کے مطابق مصر کی سرزمین میں شدید قحط برپا ہوگیا اور وہ ان کی دعا پر ہی دُور ہوا۔

(۳) اُن کے پیشگی اعلان کے بعد سارے ملک میں ہولناک بارشوں اور ژالہ باری اور گرج اور کڑک کے طوفان آئے جنھوں نے بستیوں اور کھیتیوں کو تباہ کر ڈالا، اور یہ بلا بھی اُن کی دعا سے ہی دفع ہوئی۔

(۴) پورے ملک پر ان کے اعلان کے مطابق ٹِڈی دَلوں کا خوفناک حملہ ہوا، اور یہ آفت بھی اس وقت تک نہ ٹلی جب تک انھوں نے اسے ٹالنے کے لیے اللہ سے دعا نہ کی۔

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ ﴿٤٩﴾ فَلَمَّا
كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿٥٠﴾ وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ

اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے اُس کی بنا پر ہمارے لیے اُس سے دعا کر، ہم ضرور راہِ راست پر آجائیں گے۔ مگر جوں ہی کہ ہم اُن پر سے عذاب ہٹا دیتے، وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے۔[۴۴] ایک روز فرعون نے

(۵) ملک بھر میں ان کے اعلان کے مطابق جُوئیں اور سُرسُریاں پھیل گئیں، جن سے ایک طرف آدمی اور جانور سخت مبتلائے عذاب ہوئے اور دوسری طرف غلّوں کے گودام تباہ ہو گئے۔ یہ عذاب بھی اُس وقت ٹلا جب حضرت موسیٰؑ سے درخواست کر کے دعا کرائی گئی۔

(۶) ملک کے گوشے گوشے میں اُن کی قبل از وقت تنبیہ کے مطابق مینڈکوں کا سیلاب اُمنڈ آیا، جس نے پوری آبادی کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ اللہ کی یہ فوج بھی حضرت موسیٰؑ کی دُعا کے بغیر واپس نہ گئی۔

(۷) ٹھیک اُن کے اعلان کے مطابق خون کا عذاب رونما ہوا جس سے تمام نہروں، کنوؤں، چشموں، تالابوں اور حوضوں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا، مچھلیاں مر گئیں، ہر جگہ پانی کے ذخیروں میں عُفونت پیدا ہو گئی، اور پورے ایک ہفتے تک مصر کے لوگ صاف پانی کو ترس گئے۔ یہ آفت بھی اُس وقت ٹلی جب اس سے نجات پانے کے لیے حضرت موسیٰؑ سے دُعا کرائی گئی۔ تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۹۴ تا ۹۶۔ جلد سوم، النمل، حواشی ۱۶-۱۷۔ جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۳۷۔

بائبل کی کتابِ خُروج، باب ۷-۸-۹-۱۰ اور ۱۲ میں بھی ان عذابوں کی مفصّل رُوداد درج ہے، مگر وہ گپ اور حقیقت کا مجموعہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب خون کا عذاب آیا تو جادوگروں نے بھی ویسا ہی لا کر دکھا دیا۔ مگر جب جُوؤں کا عذاب آیا تو جادوگر جواب میں جُوئیں پیدا نہ کر سکے اور انھوں نے کہا کہ یہ خدا کا کام ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مینڈکوں کا سیلاب اُٹھا تو جادوگر بھی جواب میں مینڈک چڑھا لائے، لیکن اس کے باوجود فرعون نے حضرت موسیٰؑ ہی سے یہ درخواست کی کہ اللہ سے دُعا کر کے اس عذاب کو دفع کرائیے۔ سوال یہ ہے کہ جب جادوگر مینڈک چڑھا لانے پر قادر تھے تو فرعون نے انھی کے ذریعے سے یہ عذاب کیوں نہ دُور کرا لیا؟ اور آخر یہ معلوم کیسے ہوا کہ مینڈکوں کی اس فوج میں اللہ کے مینڈک کون سے ہیں اور جادُوگروں کے مینڈک کون سے؟ یہی سوال خون کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی تنبیہ کے مطابق ہر طرف پانی کے ذخیرے خون میں تبدیل ہو چکے تھے تو جادُوگروں نے کس پانی کو خون بنایا، اور کیسے معلوم ہوا کہ فُلاں جگہ کا پانی جادُوگروں کے کرتب سے خون بنا ہے؟ ایسی ہی باتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بائبل خالص کلامِ الٰہی پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کو جن لوگوں نے تصنیف کیا ہے انھوں نے اس کے اندر اپنی طرف سے بھی بہت کچھ ملا دیا ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ یہ مصنّفین کچھ تھے بھی واجبی سی عقل کے لوگ جنھیں بات گھڑنے کا سلیقہ بھی نصیب نہ تھا۔

۴۴ - فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی ہٹ دھرمی کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ خدا کے عذاب سے تنگ آ کر حضرت موسیٰؑ سے اُس کے ٹلنے کی دعا کرانا چاہتے تھے، اُس وقت بھی وہ آپ کو پیغمبر کہنے کے بجائے جادوگر ہی کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ جادو کی حقیقت سے ناواقف نہ تھے، اور ان سے یہ بات چھُپی ہوئی نہ تھی کہ یہ کرشمے کسی جادُو سے رونما نہیں ہو سکتے۔ ایک جادُوگر زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک محدود رقبے میں جو لوگ اُس کے سامنے موجود ہوں اُن کے ذہن پر ایسا اثر ڈالے جس سے وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ پانی خون بن گیا ہے، یا مینڈک اُبلے پڑ رہے ہیں، یا ٹِڈّی دَل چڑھے چلے آ رہے ہیں۔ اور اس محدود رقبے کے اندر بھی کوئی پانی حقیقت میں خون نہ بن جائے گا، بلکہ اس دائرے سے نکلتے ہی پانی کا پانی رہ جائے گا۔ کوئی مینڈک فی الواقع پیدا نہ ہوگا، بلکہ اسے پکڑ کر آپ اس دائرے سے باہر لے جائیں گے تو آپ کے ہاتھ میں مینڈک کے بجائے صرف ہوا ہوگی۔ ٹِڈّی دَل بھی محض خیالی دَل ہوگا، کسی کھیت کو وہ نہ چاٹ سکے گا۔ رہی یہ بات کہ ایک پورے ملک میں قحط برپا ہو جائے، یا تمام ملک کی نہریں اور چشمے اور کنویں خون سے بھر جائیں، یا ہزار ہا میل کے رقبے پر ٹِڈّی دَل ٹوٹ پڑیں اور وہ لاکھوں ایکڑ کے کھیت صاف کر جائیں، یہ کام نہ آج تک کبھی کوئی جادُوگر کر سکا ہے، نہ جادُو کے زور سے کبھی یہ ہو سکتا ہے۔ ایسے جادُوگر کسی بادشاہ کے پاس ہوتے تو اسے فوج رکھنے اور جنگ کی مصیبتیں جھیلنے کی کیا ضرورت تھی؟ جادو کے زور سے وہ ساری دنیا کو مُسخّر کر سکتا تھا۔ بلکہ جادُوگروں کے پاس یہ طاقت ہوتی تو وہ بادشاہوں کی ملازمت ہی کیوں کرتے؟ خود بادشاہ نہ بن بیٹھتے؟

مفسرین کو بالعُموم یہ پریشانی پیش آئی ہے کہ جب عذاب سے نجات پانے کے لیے فرعون اور اس کے درباری حضرت موسیٰؑ سے دُعا کی درخواست کرتے تھے، اس وقت وہ ان کو "اے ساحر" کہہ کر کیسے خطاب کرتے تھے۔ مصیبت کے وقت مدد کی التجا کرنے والا تو خوشامد کرتا ہے نہ کہ مَذمّت۔ اسی وجہ سے انھوں نے یہ تاویل کی ہے کہ جادو اس زمانے کے اہلِ مصر کے نزدیک بڑا باوُقعت علم تھا، اور "اے ساحر" کہہ کر دراصل وہ حضرت موسیٰؑ کی مَذمّت نہ کرتے تھے، بلکہ اپنے نزدیک عزّت کے ساتھ وہ گویا ان کو "اے عالم" کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن یہ تاویل اس بنا پر بالکل غلط ہے کہ قرآن میں دوسرے مَقامات پر جہاں جہاں بھی فرعون کے وہ اقوال نقل کیے گئے ہیں جن میں اس نے حضرت موسیٰؑ کو جادوگر اور ان کے پیش کردہ معجزات کو جادو کہا ہے، وہاں مَذمّت اور تحقیر کا انداز صاف ظاہر ہوتا ہے، اور صریحاً یہ نظر آتا ہے کہ اس کے نزدیک جادو ایک جھوٹی چیز تھی جس کا الزام حضرت موسیٰؑ پر رکھ کر وہ آپ کو جھوٹا مدّعیِ نبوت قرار دیتا تھا۔ اس لیے یہ ماننے کے قابل بات نہیں ہے کہ یکایک اس مقام پر اس کی نگاہ میں "ساحر" ایک باعزت عالم کا لقب بن گیا ہو۔ رہا یہ سوال کہ جب دُعا کی درخواست کرتے وقت بھی وہ عَلانیہ حضرت موسیٰؑ کی توہین کرتا تھا تو آپ اُس کی درخواست قبول ہی کیوں کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آں جناب کے پیشِ نظر اللہ کے حکم سے اُن لوگوں پر حُجّت تمام کرنا تھا۔ عذاب ٹالنے کے لیے اُن کا آپ سے دعا کی درخواست کرنا خود یہ ثابت کر رہا تھا کہ اپنے دلوں میں وہ جان چکے ہیں کہ یہ عذاب کیوں آ رہے ہیں، کہاں سے آ رہے ہیں، اور کون انھیں ٹال سکتا ہے۔ اس کے باوجود جب وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ آپ کو ساحر کہتے تھے، اور عذاب ٹل جانے کے بعد راہِ راست قبول کرنے کے وعدے سے پھر جاتے تھے، تو درحقیقت وہ اللہ کے نبی کا کچھ نہ بگاڑتے تھے، بلکہ اپنے خلاف اُس مُقدّمے کو اور زیادہ مضبوط کرتے چلے جاتے تھے جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے اُن

فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ
وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ

اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا:[۴۵] "لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟[۴۶] میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے[۴۷] اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟[۴۸] کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اُتارے گئے؟ یا فرشتوں کا

کے کُلّی اِستیصال کی شکل میں آخر کر دیا۔ ان کا آپ کو ساحر کہنا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ درحقیقت اپنے دل میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ عذاب ان پر جادُو کے زور سے آرہے ہیں۔ بلکہ اپنے دلوں میں وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ اللہ ربّ العالمین کی نشانیاں ہیں، اور پھر جان بُوجھ کر اُن کا انکار کرتے تھے۔ یہی بات ہے جو سورۂ نمل میں فرمائی گئی ہے کہ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (آیت ۱۴) "ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے، مگر انھوں نے ظلم اور تکبّر کی بنا پر ان نشانیوں کا انکار کیا۔"

۴۵ – غالباً پوری قوم میں پکارنے کی عملی صورت یہ رہی ہوگی کہ فرعون نے جو بات اپنے دربار میں سلطنت کے اَعیان و اکابر اور قوم کے بڑے بڑے سرداروں کو مخاطب کر کے کہی تھی، اُسی کو مُنادیوں کے ذریعے سے پورے ملک کے شہروں اور قریوں میں نشر کرایا گیا ہوگا۔ بے چارے کے پاس اُس زمانے میں یہ ذرائع نہ تھے کہ خوشامدی پریس، خانہ ساز خبر رساں ایجنسیوں اور سرکاری ریڈیو سے مُنادی کراتا۔

۴۶ – مُنادی کا یہ مضمون ہی صاف بتا رہا ہے کہ ہِز میجسٹی کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے پے در پے معجزات نے ملک کے عوام کا عقیدہ اپنے دیوتاؤں پر سے مُتزلزل کر دیا تھا اور فراعِنہ کا باندھا ہوا وہ سارا طِلسم ٹوٹ گیا تھا جس کے ذریعے سے خداؤں کا اَوتار بن کر یہ خاندان مصر میں اپنی خداوندی چلا رہا تھا۔ اسی صورتِ حال کو دیکھ کر فرعون چیخ اُٹھا کہ کم بختو! تمھیں آنکھوں سے نظر نہیں آتا کہ اِس ملک میں بادشاہی کس کی ہے، اور دریائے نیل سے نکلی ہوئی یہ نہریں، جن پر تمھاری ساری معیشت کا انحصار ہے، کس کے حکم سے جاری ہیں؟ یہ ترقیات (developments) کے کام تو میرے اور میرے خاندان کے کیے ہوئے ہیں، اور تم گرویدہ ہو رہے ہو اِس فقیر کے۔

۴۷ – یعنی جس کے پاس نہ مال و دولت ہے، نہ اختیار و اقتدار۔ وہی اعتراض جو کفارِ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا تھا۔

۴۸ – بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ فرعون کا اعتراض اُس لکنت پر تھا جو حضرت موسیٰؑ کی زبان میں بچپن سے

مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ

ایک دستہ اس کی اَردَلی میں نہ آیا؟"[۴۹]

اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ[۵۰]۔ آخرِ کار جب انھوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے اُن سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا

تھی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جب نبوت کے منصب پر سرفراز کیا جا رہا تھا، اُس وقت انھوں نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ میری زبان کی گرہ کھول دیجیے، تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھ لیں، اور اُسی وقت ان کی دوسری درخواستوں کے ساتھ یہ درخواست بھی قبول کر لی گئی تھی۔ (آیات ۲۷ تا ۳۶) پھر قرآنِ مجید میں مختلف مَقامات پر حضرت موسیٰؑ کی جو تقریریں نقل کی گئی ہیں، وہ کمال درجے کی طلاقتِ لِسانی پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا فرعون کے اعتراض کی بِنا کوئی لکنت نہ تھی جو آنحضرت کی زبان میں ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص نہ معلوم کیا اُلجھی اُلجھی باتیں کرتا ہے، ما بدولت کی سمجھ میں تو کبھی اس کا مدّعا آیا نہیں۔

۴۹ - قدیم زمانے میں جب کسی شخص کو کسی علاقے کی گورنری، یا کسی غیر ملک کی سفارت کے منصب پر مقرر کیا جاتا تو بادشاہ کی طرف سے اس کو خِلعت عطا ہوتا تھا جس میں سونے کے کڑے یا کنگن بھی شامل ہوتے تھے، اور اس کے ساتھ سپاہیوں، چوب داروں اور خدّام کا ایک دستہ بھی ہوتا تھا، تاکہ اس کا رعب اور دبدبہ قائم ہو اور اُس بادشاہ کی شان وشوکت کا اظہار ہو جس کی طرف سے وہ مامور ہو کر آ رہا ہے۔ فرعون کا مطلب یہ تھا کہ اگر واقعی موسیٰ علیہ السلام کو آسمان کے بادشاہ نے اِیں جناب کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا تو اِسے خِلعتِ شاہی ملا ہوتا اور فرشتوں کے پَرے کے پَرے اس کے ساتھ آئے ہوتے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ایک ملنگ ہاتھ میں لاٹھی لیے آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ میں ربّ العالمین کا رسول ہوں۔

۵۰ - اس مختصر سے فقرے میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ جب کوئی شخص کسی ملک میں اپنی مُطلَقُ العِنانی چلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے کُھلّم کُھلّا ہر طرح کی چالیں چلتا ہے، ہر فریب اور مکر و دغا سے کام لیتا ہے، کھلے بازار میں ضمیروں کی خرید و فروخت کا کاروبار چلاتا ہے، اور جو بِکتے نہیں انھیں بے دریغ کچلتا اور روندتا ہے، تو خواہ زبان سے وہ یہ بات نہ کہے، مگر اپنے عمل سے صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اس ملک کے باشندوں کو عقل اور اَخلاق اور مردانگی کے لحاظ سے ہلکا سمجھتا ہے، اور اُس نے ان کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ میں اِن بے وقوف، بے ضمیر اور بُزدل لوگوں کو جدھر چاہوں ہانک کر لے جا سکتا ہوں۔ پھر جب اس کی یہ تدبیریں کامیاب ہو جاتی ہیں اور ملک کے باشندے اس کے دست بستہ غلام بن جاتے ہیں، تو وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ اُس خبیث نے جو کچھ انھیں سمجھا تھا، واقعی وہ وہی کچھ ہیں۔ اور اُن کے اِس ذلیل حالت میں مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر "فاسق" ہوتے ہیں۔ اُن کو اِس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ حق

ع

اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلۡنٰہُمۡ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾ ع وَ لَمَّا ضُرِبَ ابۡنُ
مَرۡیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوۡمُکَ مِنۡہُ یَصِدُّوۡنَ ﴿۵۷﴾ وَ قَالُوۡۤا ءَاٰلِہَتُنَا خَیۡرٌ اَمۡ
ہُوَ ؕ مَا ضَرَبُوۡہُ لَکَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ خَصِمُوۡنَ ﴿۵۸﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا
عَبۡدٌ اَنۡعَمۡنَا عَلَیۡہِ وَ جَعَلۡنٰہُ مَثَلًا لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿ؕ۵۹﴾ وَ لَوۡ نَشَآءُ

غرق کر دیا، اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونۂ عبرت بنا کر رکھ دیا۔[۵۱] ع

اور جوں ہی کہ ابنِ مریمؑ کی مثال دی گئی، تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غُل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبُود اچھے ہیں یا وہ؟[۵۲] یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ ابنِ مریمؑ اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا۔[۵۳] ہم چاہیں تو

کیا ہے اور باطل کیا، انصاف کیا ہے اور ظلم کیا۔ سچّائی اور دیانت اور شرافت قدر کے لائق ہے یا جھوٹ اور بے ایمانی اور رذالت۔ ان مسائل کے بجائے اُن کے لیے اصل اہمیّت صرف اپنے ذاتی مفاد کی ہوتی ہے، جس کے لیے وہ ہر ظالم کا ساتھ دینے، ہر جبّار کے آگے دبنے، ہر باطل کو قُبول کرنے، اور ہر صدائے حق کو دبانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

۵۱ – یعنی جو اُن کے انجام سے سبق نہ لیں اور اُنھی کی رَوِش پر چلیں اُن کے لیے وہ پیش رَو ہیں، اور جو سبق لینے والے ہیں اُن کے لیے نمونۂ عبرت۔

۵۲ – اس سے پہلے آیت ۴۵ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ”تم سے پہلے جو رسول ہو گزرے ہیں ان سب سے پوچھ دیکھو، کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ اُن کی بندگی کی جائے؟“ یہ تقریر جب اہلِ مکہ کے سامنے ہو رہی تھی تو ایک شخص نے، جس کا نام رِوایات میں عبداللہ ابنُ الزِّبَعْرٰی آیا ہے، اعتراض جَڑ دیا کہ کیوں صاحب! عیسائی مریمؑ کے بیٹے کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اس کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں؟ پھر ہمارے معبُود کیا بُرے ہیں؟ اس پر کفار کے مجمع سے ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا اور نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ وہ مارا، پکڑے گئے، اب بولو اس کا کیا جواب ہے۔ لیکن ان کی اس بے ہودگی پر سلسلۂ کلام توڑا نہیں گیا، بلکہ جو مضمون چلا آ رہا تھا، پہلے اُسے مکمل کیا گیا، اور پھر اُس سوال کی طرف توجہ کی گئی جو معترض نے اُٹھایا تھا۔ (واضح رہے کہ اس واقعے کو تفسیر کی کتابوں میں مختلف طریقوں سے رِوایت کیا گیا ہے جن میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ لیکن آیت کے سِیاق وسَباق اور اُن رِوایات پر غور کرنے کے بعد ہمارے نزدیک واقعے کی صحیح صورت وہی ہے جو ابھی ہم نے بیان کی ہے۔)

۵۳ – قدرت کا نمونہ بنانے سے مراد حضرت عیسٰیؑ کو بے باپ کے پیدا کرنا، اور پھر اُن کو وہ معجزے عطا کرنا ہے جو

لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

تم سے فرشتے پیدا کر دیں[54] جو زمین میں تمھارے جانشین ہوں۔ اور وہ دراصل قیامت کی ایک نشانی ہے،[55] پس تم اُس میں شک نہ کرو اور میری بات مان لو، یہی سیدھا راستہ ہے،

نہ ان سے پہلے کسی کو دیے گئے تھے نہ اُن کے بعد۔ وہ مٹی کا پرندہ بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا۔ وہ مادر زاد اندھے کو بینا کر دیتے۔ وہ کوڑھ کے مریض کو تندرست کر دیتے۔ حتیٰ کہ وہ مُردے کو جِلا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ محض اِس غیر معمولی پیدایش اور اِن عظیم معجزات کی وجہ سے اُن کو بندگی سے بالاتر سمجھنا اور خدا کا بیٹا قرار دے کر ان کی عبادت کرنا غلط ہے۔ اُن کی حیثیت ایک بندے سے زیادہ کچھ نہ تھی جسے ہم نے اپنے انعامات سے نواز کر اپنی قدرت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حواشی ۴۲ تا ۴۴، النساء، ۱۹۰، المائدہ، حواشی ۴۰ - ۴۶ - ۱۲۷۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۱۵ تا ۲۲، الانبیاء، حواشی ۸۸ تا ۹۰، المومنون، حاشیہ ۴۳)

۵۴ — دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم میں سے بعض کو فرشتہ بنا دیں۔

۵۵ — اس فقرے کا یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ قیامت کے علم کا ایک ذریعہ ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "وہ" سے کیا چیز مراد ہے؟ حضرت حَسَن بصریؒ اور سعید بن جُبَیرؒ کے نزدیک اس سے مراد قرآن ہے، یعنی قرآن سے آدمی یہ علم حاصل کرسکتا ہے کہ قیامت آئے گی۔ لیکن یہ تفسیر سیاق وسَباق سے بالکل غیر متعلق ہے۔ سلسلۂ کلام میں کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ دوسرے مفسرین قریب قریب بالاتفاق یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰ ابنِ مریمؑ ہیں، اور یہی سِیاق وسَباق کے لحاظ سے دُرست ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آں جناب کو قیامت کی نشانی یا قیامت کے علم کا ذریعہ کس معنیٰ میں فرمایا گیا ہے؟ ابنِ عباسؓ، مُجاہدؒ، عِکرِمہؒ، قَتادَہؒ، سُدّیؒ، ضَحّاکؒ، ابو العالیہؒ اور ابو مالکؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ کا نُزولِ ثانی ہے جس کی خبر بکثرت احادیث میں وارد ہوئی ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو معلوم ہوجائے گا کہ قیامت اب قریب ہے۔ لیکن اِن بزرگوں کی جلالتِ قدر کے باوجود یہ ماننا مشکل ہے کہ اِس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی کو قیامت کی نشانی یا اس کے علم کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ بعد کی عبارت یہ معنیٰ لینے میں مانع ہے۔ اُن کا دوبارہ آنا تو قیامت کے علم کا ذریعہ صرف اُن لوگوں کے لیے بن سکتا ہے جو اُس زمانہ میں موجود ہوں یا اُس کے بعد پیدا ہوں۔ کفارِ مکہ کے لیے آخر وہ کیسے ذریعۂ علم قرار پاسکتا تھا کہ اُن کو خطاب کر کے یہ کہنا صحیح ہوتا کہ "پس تم اس میں شک نہ کرو"۔ لہٰذا ہمارے نزدیک صحیح تفسیر وہی ہے جو بعض دوسرے مفسرین نے کی ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰؑ کے بے باپ پیدا ہونے اور اُن کے مٹی سے پرندہ بنانے اور مُردے جِلانے کو قیامت کے اِمکان کی ایک دلیل قرار دیا گیا ہے، اور ارشادِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ جو خدا باپ کے بغیر بچہ

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى
بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ
تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ
وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ
مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾

ایسا نہ ہو شیطان تم کو اُس سے روک دے[۵۶] کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اور جب عیسیٰؑ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ ”میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض اُن باتوں کی حقیقت کھول دُوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ اُسی کی تم عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے[۵۷]۔“ مگر (اُس کی اِس صاف تعلیم کے باوجود) گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا،[۵۸] پس تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے۔

پیدا کر سکتا ہے، اور جس خدا کا ایک بندہ مٹی کے پُتلے میں جان ڈال سکتا اور مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے، اُس کے لیے آخر تم اس بات کو کیوں ناممکن سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں اور تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دے۔

۵۶ – یعنی قیامت پر ایمان لانے سے روک دے۔

۵۷ – یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں خدا ہوں یا خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو، بلکہ ان کی دعوت وہی تھی جو دوسرے تمام انبیاؑ کی دعوت تھی اور اب جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو بلا رہے ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حواشی ۴۵ تا ۴۸، النساء، حواشی، ۲۱۳–۲۱۷–۲۱۸، المائدہ، حواشی ۱۰۰–۱۳۰۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۲۱ تا ۲۳)

۵۸ – یعنی ایک گروہ نے اُن کا انکار کیا تو مُخالفت میں اس حد تک پہنچ گیا کہ اُن پر ناجائز ولادت کی تہمت لگائی اور ان کو اپنے نزدیک سُولی پر چڑھوا کر چھوڑا۔ دوسرے گروہ نے اُن کا اقرار کیا تو عقیدت میں بے تحاشا غُلُوّ کر کے ان کو خدا بنا بیٹھا، اور پھر ایک انسان کے خدا ہونے کا مسئلہ اس کے لیے ایسی گُتھی بنا جسے سلجھاتے سُلجھاتے اُس میں بے شمار فرقے بن گئے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۲۱۱ تا ۲۱۶، المائدہ، حواشی ۳۹–۴۰–۱۰۱–۱۳۰)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾
ع اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾ يٰعِبَادِ
لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ
تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا
مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ
تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ

کیا یہ لوگ اب بس اِسی چیز کے منتظر ہیں کہ اچانک اِن پر قیامت آ جائے اور انھیں خبر بھی نہ ہو؟ وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے ۵۹ع اُس روز اُن لوگوں سے، جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیعِ فرمان بن کر رہے تھے، کہا جائے گا کہ "اے میرے بندو! آج تمھارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمھیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمھاری بیویاں،۶۰ تمھیں خوش کر دیا جائے گا۔" اُن کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے، اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہوگی۔ ان سے کہا جائے گا: "تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے۔ تم اِس جنت کے وارث اپنے اُن اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو جو تم دنیا میں کرتے رہے۔ تمھارے لیے

---

۵۹ - دوسرے الفاظ میں صرف وہ دوستیاں باقی رہ جائیں گی جو دنیا میں نیکی اور خدا ترسی پر قائم ہیں، دوسری تمام دوستیاں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی، اور آج گمراہی، ظلم و ستم اور معصیت میں جو لوگ ایک دوسرے کے یار و مددگار بنے ہوئے ہیں، کل قیامت کے روز وہی ایک دوسرے پر الزام ڈالنے اور اپنی جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں بار بار جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے، تاکہ ہر شخص اِسی دنیا میں اچھی طرح سوچ لے کہ کن لوگوں کا ساتھ دینا اِس کے لیے مفید ہے اور کن کا ساتھ تباہ کُن۔

۶۰ - اصل میں ازواج کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بیویوں کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور ایسے لوگوں کے لیے

فِيۡهَا فَاكِهَةٌ كَثِيۡرَةٌ مِّنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ الۡمُجۡرِمِيۡنَ فِىۡ عَذَابِ
جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ۖ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ وَهُمۡ فِيۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ ۚ﴿۷۵﴾ وَمَا
ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡا هُمُ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوۡا يٰمٰلِكُ لِيَقۡضِ
عَلَيۡنَا رَبُّكَ ‌ؕ قَالَ اِنَّكُمۡ مّٰكِثُوۡنَ ﴿۷۷﴾ لَقَدۡ جِئۡنٰكُمۡ بِالۡحَـقِّ
وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَكُمۡ لِلۡحَـقِّ كٰرِهُوۡنَ ﴿۷۸﴾ اَمۡ اَبۡرَمُوۡۤا اَمۡرًا فَاِنَّا
مُبۡرِمُوۡنَ ۚ﴿۷۹﴾ اَمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰٮهُمۡ‌ ؕ بَلٰى

یہاں بکثرت فواکِہ موجود ہیں جنھیں تم کھاؤ گے۔" رہے مجرمین، تو وہ ہمیشہ جہنّم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے، کبھی اُن کے عذاب میں کمی نہ ہوگی، اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے۔ ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اُوپر ظلم کرتے رہے۔ وہ پکاریں گے: "اے مالک[61]! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے تو اچھا ہے۔" وہ جواب دے گا: "تم یوں ہی پڑے رہو گے، ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے تھے، مگر تم میں سے اکثر کو حق ہی ناگوار تھا۔[62]"

کیا اِن لوگوں نے کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے[63]؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں۔ کیا اِنھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اِن کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سُن رہے ہیں

بھی جو کسی شخص کے ہم مشرَب، ہم جولی اور ہم جماعت ہوں۔ یہ وسیع المعنیٰ لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس کے مفہوم میں دونوں داخل ہو جائیں۔ اہلِ ایمان کی مومن بیویاں بھی اُن کے ساتھ ہوں گی اور ان کے مومن دوست بھی جنت میں اِن کے رفیق ہوں گے۔

۶۱ – مالک سے مراد ہے جہنّم کا داروغہ، جیسا کہ فَحْوائے کلام سے خود ظاہر ہو رہا ہے۔

۶۲ – یعنی ہم نے حقیقت تمھارے سامنے کھول کر رکھ دی، مگر تم حقیقت کے بجائے افسانوں کے دلدادہ تھے اور سچّائی تمھیں سخت ناگوار تھی۔ اب اپنے اِس احمقانہ انتخاب کا انجام دیکھ کر بلبلاتے کیوں ہو؟ ہوسکتا ہے کہ یہ داروغۂ جہنّم ہی کے جواب کا ایک حصّہ ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس کا جواب "تم یوں ہی پڑے رہو گے" پر ختم ہو گیا ہو اور یہ دوسرا فقرہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہو۔ پہلی صورت میں داروغۂ جہنّم کا یہ قول کہ "ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے تھے" ایسا ہی ہے جیسے حکومت کا کوئی افسر حکومت کی طرف سے بولتے ہوئے "ہم" کا لفظ استعمال کرتا ہے اور اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہماری حکومت نے یہ کام کیا

وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ۝٨٠ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا
اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝٨١ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ
الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝٨٢ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا
يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝٨٣ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ
اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝٨٤ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝٨٥

اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔

اِن سے کہو: ”اگر واقعی رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوتا۔“[۶۴] پاک ہے آسمانوں اور زمین کا فرماں روا، عرش کا مالک، اُن ساری باتوں سے جو یہ لوگ اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اچھا، اِنھیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو، یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس کا اِنھیں خوف دلایا جارہا ہے۔

وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا، اور وہی حکیم و علیم ہے۔[۶۵] بہت بالا و برتر ہے وہ جس کے قبضے میں زمین اور آسمانوں اور ہر اُس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے۔[۶۶] اور وہی قیامت کی گھڑی کا علم رکھتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔[۶۷]

یا یہ حکم دیا۔

۶۳ – اشارہ ہے اُن باتوں کی طرف جو سردارانِ قریش اپنی خفیہ مجلسوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی فیصلہ کُن قدم اُٹھانے کے لیے کر رہے تھے۔

۶۴ – مطلب یہ ہے کہ میرا کسی کو خدا کی اولاد نہ ماننا، اور جنھیں تم اس کی اولاد قرار دے رہے ہو ان کی عبادت سے انکار کرنا کسی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر نہیں ہے۔ میں جس بنا پر اس سے انکار کرتا ہوں، وہ صرف یہ ہے کہ کوئی خدا کا بیٹا یا بیٹی نہیں ہے اور تمھارے یہ عقائد حقیقت کے خلاف ہیں۔ ورنہ میں تو خدا کا ایسا وفادار بندہ ہوں کہ اگر بالفرض حقیقت یہی ہوتی تو تم سے پہلے میں بندگی میں سر جھکا دیتا۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ
بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ

اُس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنھیں پکارتے ہیں، وہ کسی شَفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ کوئی علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔[۶۸]

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ خود کہیں گے کہ

۶۵ – یعنی آسمان اور زمین کے خدا الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ساری کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ اُسی کی حکمت اِس پورے نظامِ کائنات میں کارفرما ہے، اور وہی تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔

۶۶ – یعنی اُس کی ہستی اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے کہ کوئی خدائی میں اُس کا شریک ہو اور اس عظیم کائنات کی فرماں روائی میں کچھ بھی دخل رکھتا ہو۔ زمین و آسمان میں جو بھی ہیں، خواہ وہ انبیاؑ ہوں یا اولیا، فرشتے ہوں یا جنّ یا ارواح، ستارے ہوں یا سیّارے، سب اُس کے بندے اور غلام اور تابعِ فرمان ہیں۔ اُن کا کسی خدائی صِفت سے مُتَّصِف یا خدائی اختیار کا حامل ہونا قطعی ناممکن ہے۔

۶۷ – یعنی دنیا میں تم خواہ کسی کو اپنا حامی و سرپرست بناتے پھرو، مگر مرنے کے بعد تمھارا سابقہ اُسی ایک خدا سے پڑنا ہے اور اُسی کی عدالت میں تم کو اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہے۔

۶۸ – اس فقرے کے کئی مفہوم ہیں:

ایک، یہ کہ لوگوں نے جن جن کو دنیا میں معبود بنا رکھا ہے وہ سب اللہ کے حضور شَفاعت کرنے والے نہیں ہیں۔ ان میں سے جو گمراہ و بدراہ تھے، وہ تو خود وہاں مجرم کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ البتہ وہ لوگ ضرور دوسروں کی شَفاعت کرنے کے قابل ہوں گے جنھوں نے علم کے ساتھ (نہ کہ بے جانے بُوجھے) حق کی شہادت دی تھی۔

دوسرے، یہ کہ جنھیں شفاعت کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، وہ بھی صرف اُن لوگوں کی شفاعت کر سکیں گے جنھوں نے دنیا میں جان بُوجھ کر (نہ کہ غفلت و بے خبری کے ساتھ) حق کی شہادت دی ہو۔ کسی ایسے شخص کی شفاعت نہ وہ خود کریں گے، نہ کرنے کے مجاز ہوں گے جو دنیا میں حق سے برگشتہ رہا تھا، یا بے سمجھے بُوجھے اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ بھی کہتا رہا اور دوسرے الٰہوں کی بندگی بھی کرتا رہا۔

تیسرے، یہ کہ کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ اُس نے جن کو معبُود بنا رکھا ہے وہ لازماً شفاعت کے اختیارات رکھتے ہیں، اور انھیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا زور حاصل ہے کہ جسے چاہیں بخشوالیں، قطعِ نظر اس سے کہ اس کے اعمال و عقائد کیسے ہی ہوں، تو وہ غلط کہتا ہے۔ یہ حیثیت اللہ کے ہاں کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ جو شخص کسی کے لیے ایسی شفاعت کے اختیارات کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اگر علم کی بنا پر اس بات کی مبنی برحقیقت شہادت دے سکتا ہو تو ہمت کر کے آگے آئے، لیکن اگر وہ ایسی شہادت دینے کی پوزیشن

اللّٰہُ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۸۷﴾ وَ قِیۡلِہٖ یٰرَبِّ اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ لَّا
یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ فَاصۡفَحۡ عَنۡہُمۡ وَ قُلۡ سَلٰمٌ ؕ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾ ع

وقف لازم ع ۲۲/۱۳

اللہ نے۔[۶۹] پھر کہاں سے یہ دھوکا کھا رہے ہیں؟ قسم ہے رسولؐ کے اِس قول کی کہ اے رب! یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں[۷۰] دیتے۔

اچھا، اَے نبیؐ! اِن سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمھیں[۷۱]، عنقریب اِنھیں معلوم ہو جائے گا۔

میں نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے، تو خواہ مخواہ سنی سنائی باتوں پر، یا محض قیاس و وہم وگمان کی بنیاد پر ایسا ایک عقیدہ گھڑ لینا سراسر لغو، اور اس خیالی بھروسے پر اپنی عاقبت کو خطرے میں ڈال لینا قطعی حماقت ہے۔

اس آیت سے ضمناً دو بڑے اہم اُصول بھی مُستَنبَط ہوتے ہیں: اوّلاً، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے بغیر حق کی شہادت دینا چاہے دنیا میں معتبر ہو، مگر اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ دنیا میں تو جو شخص کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرے گا، ہم اس کو مسلمان مان لیں گے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرتے رہیں گے، جب تک وہ کُھلّم کُھلّا کفرِ صریح کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن اللہ کے ہاں صرف وہی شخص اہلِ ایمان میں شمار ہوگا جس نے اپنی بساطِ علم وعقل کی حد تک یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو کہ وہ کس چیز کا انکار اور کس چیز کا اقرار کر رہا ہے۔

ثانیاً، اس سے قانونِ شہادت کا یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ گواہی کے لیے علم شرط ہے۔ گواہ جس واقعے کی گواہی دے رہا ہو، اس کا اگر اُسے علم نہیں ہے تو اس کی گواہی بے معنیٰ ہے۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فیصلے سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ آپؐ نے ایک گواہ سے فرمایا کہ: اِذا رأیت مثل الشمس فاشھد والافدع (احکام القرآن للجصّاص) ''اگر تو نے واقعہ کو خود اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھا ہے جیسے تو سورج کو دیکھ رہا ہے تو گواہی دے ورنہ رہنے دے۔''

۶۹ — اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ اگر تم اِن سے پوچھو کہ خود اِن کو کس نے پیدا کیا ہے، تو کہیں گے کہ اللہ نے۔ دوسرے، یہ کہ اگر تم اِن سے پوچھو کہ اِن کے معبُودوں کا خالق کون ہے، تو یہ کہیں گے کہ اللہ۔

۷۰ — یہ قرآن مجید کی نہایت مشکل آیات میں سے ہے جس میں نَحْو کا یہ نہایت پیچیدہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وَ قِیۡلِہٖ میں واؤ کیسا ہے اور اس لفظ کا تعلق اُوپر کے سلسلۂ کلام میں کس چیز کے ساتھ ہے۔ مفسرین نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے، مگر کوئی تشفّی بخش بات مجھے اُن کے ہاں نہیں ملی۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح بات وہی ہے جو شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمے سے مُترشّح ہوتی ہے، یعنی اس میں واو عطف کا نہیں بلکہ قسمیہ ہے، اور اس کا تعلق فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ سے ہے، اور قِیۡلِہٖ کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے، جس پر یٰرَبِّ اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ کا فقرہ صریح

دلالت کر رہا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ:

قسم ہے رسول کے اس قول کی کہ ”اے رب! یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے“، کیسی عجیب ہے اِن لوگوں کی فریب خوردگی کہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور پھر بھی خالق کو چھوڑ کر مخلوق ہی کی عبادت پر اصرار کیے جاتے ہیں۔

رسول کے اِس قول کی قَسَم کھانے کا مدّعا یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ رَوِش صاف ثابت کیے دے رہی ہے کہ فی الواقع یہ ہٹ دھرم ہیں، کیونکہ ان کے رَوِیّے کا غیر معقول ہونا ان کے اپنے اعتراف سے ظاہر ہے، اور ایسا غیر معقول رَوِیّہ صرف وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جو نہ ماننے کا فیصلہ کیے بیٹھا ہو۔ بالفاظِ دیگر یہ قسم اس معنیٰ میں ہے کہ بالکل ٹھیک کہا رسول نے، فی الواقع یہ مان کر دینے والے لوگ نہیں ہیں۔

۷۱ – یعنی ان کی سخت باتوں اور تضحیک و اِستہزا پر نہ ان کے لیے بددُعا کرو اور نہ ان کے جواب میں کوئی سخت بات کہو، بس سلام کر کے ان سے الگ ہو جاؤ۔

تفہیم القرآن

الدخان

(۴۴)

الدخان

نام

آیت نمبر ۱۰: يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ کے لفظ دُخان کو اس سورت کا عنوان بنایا گیا ہے، یعنی یہ وہ سورت ہے جس میں لفظِ دُخان وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نزول

اِس کا زمانۂ نزول بھی کسی معتبر رِوایت سے معلوم نہیں ہوتا، مگر مضامین کی اندرونی شہادت بتاتی ہے کہ یہ بھی اُسی دَور میں نازل ہوئی ہے جس میں سورۂ زُخرُف اور اس سے پہلے کی چند سورتیں نازل ہوئی تھیں، البتہ یہ اُن سے کچھ مُتأخِّر ہے۔ تاریخی پَسِ منظر یہ ہے کہ جب کفارِ مکہ کی مخالفانہ رَوِش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ خدایا! یوسفؑ کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ حضورؐ کا خیال یہ تھا کہ جب اِن لوگوں پر مصیبت پڑے گی تو انھیں خدا یاد آئے گا اور ان کے دل نصیحت قبول کرنے کے لیے نرم پڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دُعا قبول فرمائی اور سارے علاقے میں ایسے زور کا قحط پڑا کہ لوگ بلبلا اُٹھے۔ آخر کار بعض سردارانِ قریش، جن میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے خاص طور پر ابوسُفیان کا نام لیا ہے، حضورؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ اپنی قوم کو اس بلا سے نجات دلانے کے لیے اللہ سے دُعا کریں۔ یہی موقع ہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

موضوع اور مَباحِث

اس موقع پر کفارِ مکہ کی فہمایش اور تنبیہ کے لیے جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا گیا، اس کی تمہید چند اہم مباحث پر مشتمل ہے:

اوّل، یہ کہ تم لوگ اس قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھنے میں غَلَطی کر رہے ہو۔ یہ کتاب تو اپنی ذات میں خود اِس امر کی بَیِّن شہادت ہے کہ یہ کسی انسان کی نہیں بلکہ خداوندِ عالَم کی کتاب ہے۔

دوسرے، یہ کہ تم اس کتاب کی قدر و قیمت سمجھنے میں بھی غلطی کر رہے ہو۔ تمھارے نزدیک یہ ایک بلا ہے جو تم پر نازل ہوگئی ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ گھڑی انتہائی مبارک گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر تمھارے ہاں اپنا رسول بھیجنے اور اپنی کتاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

تیسرے، یہ کہ تم اپنی نادانی سے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ اس رسول اور اِس کتاب سے لڑ کر تم جیت جاؤ گے۔ حالانکہ اِس رسول کی بِعثَت اور اس کتاب کی تنزیل اُس ساعتِ خاص میں ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ قسمتوں کے فیصلے فرمایا کرتا ہے۔ اور اللہ کے فیصلے بودے نہیں ہوتے کہ جس کا جی چاہے انھیں بدل ڈالے، نہ وہ کسی جَہالت و نادانی پر مبنی ہوتے ہیں کہ ان میں غلطی اور خامی کا کوئی احتمال ہو۔ وہ تو اُس فرماں روائے کائنات کے پختہ اور اَٹل فیصلے ہوتے ہیں جو سمیع و علیم اور حکیم ہے۔ اُن سے لڑنا

کوئی کھیل نہیں ہے۔

چوتھے، یہ کہ اللہ کو تم خود بھی زمین و آسمان اور کائنات کی ہر چیز کا مالک و پروردگار مانتے ہو، اور یہ بھی مانتے ہو کہ زندگی و موت اسی کے اختیار میں ہے۔ مگر اس کے باوجود تمھیں دوسروں کو معبُود بنانے پر اصرار ہے اور اس کے لیے حجت تمھارے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یہی کام ہوتا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص شعور کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ ہی مالک و پروردگار اور زندگی و موت کا مختار ہے تو اسے کبھی یہ شبہ تک لاحق نہیں ہو سکتا کہ معبُود ہونے کے مستحق اُس کے سوا یا اس کے ساتھ دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ تمھارے باپ دادا نے اگر یہ حماقت کی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ تم بھی آنکھیں بند کر کے اسی کا ارتکاب کرتے چلے جاؤ۔ حقیقت میں تو اُن کا رب بھی اکیلا وہی خدا تھا جو تمھارا رب ہے، اور اُنھیں بھی اسی ایک کی بندگی کرنی چاہیے تھی جس کی بندگی تمھیں کرنی چاہیے۔

پانچویں، یہ کہ اللہ کی رُبوبیت و رحمت کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ تمھارا پیٹ پالے، بلکہ یہ بھی ہے کہ تمھاری رہنمائی کا انتظام کرے۔ اِسی رہنمائی کے لیے اُس نے رسول بھیجا ہے اور کتاب نازل کی ہے۔

اس تمہید کے بعد اُس قحط کے معاملے کو لیا گیا ہے جو اُس وقت درپیش تھا۔ جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں، یہ قحط نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِستِدعا پر آیا تھا، اور حضورؐ نے اس کے لیے دُعا اس خیال سے کی تھی کہ مصیبت پڑے گی تو کفار کی اکڑی ہوئی گردنیں ڈھیلی پڑ جائیں گی، شاید کہ پھر حرفِ نصیحت ان پر کارگر ہو۔ یہ توقع اس وقت کسی حد تک پوری ہوتی نظر آ رہی تھی، کیونکہ بڑے بڑے ہیکڑ دشمنانِ حق کال کے مارے پکار اُٹھے تھے کہ پروردگار! یہ عذاب ہم پر سے ٹال دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اِس پر ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ایسی مصیبتوں سے یہ لوگ کہاں سبق لینے والے ہیں۔ اِنھوں نے جب اُس رسول کی طرف سے منہ موڑ لیا جس کی زندگی سے، جس کے کردار سے اور جس کے کام اور کلام سے عَلانِیَہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ یقیناً خدا کا رسول ہے، تو اب محض ایک قحط اِن کی غفلت کیسے دُور کر دے گا۔ دوسری طرف کفار کو مخاطَب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ تم بالکل جھوٹ کہتے ہو کہ یہ عذاب تم پر سے ٹال دیا جائے تو تم ایمان لے آوَ گے۔ ہم اِس عذاب کو ہٹائے دیتے ہیں، ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ تم اپنے اس وعدے میں کتنے سچّے ہو۔ تمھارے سر پر تو شامت کھُیل رہی ہے۔ تم ایک بڑی ضرب مانگ رہے ہو، ہلکی چوٹوں سے تمھارا دماغ دُرست نہیں ہو گا۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر فرعون اور اس کی قوم کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اُن لوگوں کو بھی ٹھیک یہی آزمائش پیش آئی تھی جس سے اب کفارِ قریش کے سرداروں کو سابقہ پڑا ہے۔ اُن کے پاس بھی ایسا ہی ایک معزّز رسول آیا تھا۔ انھوں نے بھی وہ صریح علامات اور نشانیاں دیکھ لی تھیں جن سے اُس کا مامور من اللہ ہونا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ بھی نشانی پر نشانی دیکھتے چلے گئے مگر اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ آخرِ کار رسول

کی جان لینے کے درپے ہو گئے، اور نتیجہ وہ کچھ دیکھا جو ہمیشہ کے لیے سامانِ عبرت بن گیا۔

اس کے بعد دوسرا موضوع آخرت کا لیا گیا ہے جس سے کفارِ مکہ کو شدت کے ساتھ انکار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھ کر آتے نہیں دیکھا ہے، تم اگر دوسری زندگی کے دعوے میں سچّے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔ اس کے جواب میں عقیدۂ آخرت کی دو دلیلیں مختصر طور پر دی گئی ہیں۔ ایک، یہ کہ اس عقیدے کا انکار ہمیشہ اَخلاق کے لیے تباہ کُن ثابت ہوتا رہا ہے۔ دوسرے، یہ کہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں ہے، بلکہ ایک حکیمانہ نظام ہے، اور حکیم کا کوئی کام عَبَث نہیں ہوتا۔ پھر کفار کے اس مطالبے کا کہ اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو، یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ کام روز روز ہر ایک کے مطالبے پر نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے اللہ نے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے جب وہ تمام نوعِ انسانی کو بیک وقت جمع کرے گا اور اپنی عدالت میں ان کا مُحاسَبہ فرمائے گا۔ اُس وقت کی اگر کسی کو فکر کرنی ہو تو کر لے، کیونکہ وہاں کوئی نہ اپنے زور پر بچ سکے گا نہ کسی کے بچائے بچے گا۔

اللہ کی اس عدالت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ وہاں مجرم قرار پائیں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جو وہاں سے کامیاب ہو کر نکلیں گے وہ کیا انعام پائیں گے۔ پھر یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ تم لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ قرآن صاف سیدھی زبان میں اور تمھاری اپنی زبان میں نازل کر دیا گیا ہے، اب اگر تم سمجھانے سے نہیں سمجھتے اور انجامِ بد ہی دیکھنے پر مُصِرّ ہو تو انتظار کرو، ہمارا نبی بھی منتظر ہے، جو کچھ ہونا ہے وہ اپنے وقت پر سامنے آجائے گا۔

---

۵۹ آیاتہا
سُوْرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ
۳ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝۱ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا مع ۱۲
كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝۳ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴ اَمْرًا مِّنْ
عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝۵ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ

ح ـ م ـ قسم ہے اِس کتابِ مُبین کی کہ ہم نے اِسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبّہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے[1]۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ[2] ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے[3]۔ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے، تیرے رب کی رحمت کے طور پر[4]۔ یقیناً

۱ – کتابِ مُبین کی قسم کھانے کا مطلب سورۂ زُخرف حاشیہ نمبر۱ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں بلکہ ''ہم'' ہیں، اور اس کا ثبوت کہیں اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، خود یہ کتاب ہی اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد مزید بات یہ فرمائی گئی کہ وہ بڑی خیر و برکت والی رات تھی جس میں اسے نازل کیا گیا۔ یعنی نادان لوگ، جنھیں اپنی بھلائی برائی کا شعور نہیں ہے، اس کتاب کی آمد کو اپنے لیے بَلائے ناگہانی سمجھ رہے ہیں اور اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ لیکن درحقیقت ان کے لیے اور تمام نوعِ انسانی کے لیے وہ ساعت بڑی ہی سعید تھی جب ''ہم'' نے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے یہ کتاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس رات میں قرآن نازل کرنے کا مطلب بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ نُزولِ قرآن کا سلسلہ اُس رات شروع ہوا۔ اور بعض مفسرین اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس میں پورا قرآن اُمّ الکتاب سے منتقل کر کے حاملِ وحی فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا، اور پھر وہ حالات و وقائع کے مطابق حسبِ ضرورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سال تک نازل کیا جاتا رہا۔ صحیح صورتِ معاملہ کیا ہے، اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اُس رات سے مراد وہی رات ہے جسے سورۂ قدر میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ پھر یہ بات بھی قرآنِ مجید ہی میں بتا دی گئی ہے کہ وہ ماہِ رَمضان کی ایک رات تھی: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ (البقرہ: ۱۸۵)

۲ – اصل میں لفظ ''اَمْرٍ حَكِيْمٍ'' استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنیٰ ہیں: ایک، یہ کہ وہ حکم سراسر حکمت پر مبنی

هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۙ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا

وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے[5]، آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اُس چیز کا رب جو آسمان و زمین

ہوتا ہے، کسی غَلَطی یا خامی کا اُس میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے، یہ کہ وہ ایک پختہ اور محکم فیصلہ ہوتا ہے، اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں۔

۳ – سورۂ قدر میں یہی مضمون اِس طرح بیان کیا گیا ہے: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ، ''اُس رات ملائکہ اور جبریل اپنے رب کے اِذن سے ہر طرح کا حکم لے کر اُترتے ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے شاہی نظم و نسق میں یہ ایک ایسی رات ہے جس میں وہ افراد اور قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے کر کے اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے، اور پھر وہ انھی فیصلوں کے مطابق عمل در آمد کرتے رہتے ہیں۔ بعض مفسرین کو، جن میں حضرت عِکْرِمَہؒ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، یہ شبہ لاحق ہوا ہے کہ یہ نصفِ شَعبان کی رات ہے، کیونکہ بعض احادیث میں اِسی رات کے متعلق یہ بات منقول ہوئی ہے کہ اس میں قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ لیکن ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ، مُجاہدؒ، قَتادَہؒ، حَسَن بصریؒ، سعید بن جُبَیرؒ، ابنِ زیدؒ، ابو مالکؒ، ضَحّاکؒ اور دوسرے بہت سے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ رمضان کی وہی رات ہے جسے لیلۃ القدر کہا گیا ہے، اس لیے کہ قرآنِ مجید خود اس کی تصریح کر رہا ہے، اور جہاں قرآن کی صراحت موجود ہو، وہاں اخبارِ آحاد کی بنا پر کوئی دوسری رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ ''عثمان بن محمد کی جو رِوایَت امام زُہریؒ نے شعبان سے شعبان تک قسمتوں کے فیصلے ہونے کے متعلق نقل کی ہے وہ ایک مُرسَل رِوایَت ہے، اور ایسی رِوایات نُصوص کے مقابلے میں نہیں لائی جا سکتیں۔'' قاضی ابو بکر ابن العَرَبیؒ کہتے ہیں کہ ''نصف شعبان کی رات کے متعلق کوئی حدیث قابلِ اعتماد نہیں ہے، نہ اس کی فضیلت کے بارے میں اور نہ اس امر میں کہ اُس رات قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے۔'' (احکام القرآن)

۴ – یعنی یہ کتاب دے کر ایک رسول کو بھیجنا نہ صرف حکمت کا تقاضا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا بھی تھا، کیونکہ وہ رب ہے اور رُبوبیّت صرف اسی بات کی متقاضی نہیں ہے کہ بندوں کے جسم کی پرورش کا سامان کیا جائے، بلکہ اس بات کی بھی متقاضی ہے کہ علمِ صحیح سے ان کی رہنمائی کی جائے، حق و باطل کے فرق سے اُن کو آگاہ کیا جائے، اور انھیں تاریکی میں بھٹکتا نہ چھوڑ دیا جائے۔

۵ – اِس سِیاق و سَباق میں اللہ تعالیٰ کی اِن دو صفات کو بیان کرنے سے مقصود لوگوں کو اِس حقیقت پر مُتنَبِّہ کرنا ہے کہ صحیح علم صرف وہی دے سکتا ہے، کیونکہ تمام حقائق کو وہی جانتا ہے۔ ایک انسان تو کیا، سارے انسان مل کر بھی اگر اپنے لیے کوئی راہِ حیات متعیّن کریں تو اس کے حق ہونے کی کوئی ضمانت نہیں، کیونکہ پوری نوعِ انسانی یکجا ہو کر بھی ایک سمیع و علیم نہیں بنتی۔ اُس کے بس میں یہ ہے ہی نہیں کہ اُن تمام حقائق کا احاطہ کرے جن کا جاننا ایک صحیح راہ حیات متعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہی سمیع و علیم ہے، اس لیے وہی یہ بتا سکتا ہے کہ انسان کے لیے ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا، حق کیا ہے اور باطل کیا، خیر کیا ہے اور شر کیا۔

بَيْنَهُمَا ۘ إِنْ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ ۝٧ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ
رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ۝٨ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ ۝٩

وقف لازم

کے درمیان ہے، اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو۔[6] کوئی معبود اُس کے سوا نہیں ہے۔[7] وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔[8] تمہارا رب اور تمہارے اُن اسلاف کا رب جو پہلے گزر چکے ہیں۔[9] (مگر فی الواقع اِن لوگوں کو یقین نہیں ہے) بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں۔[10]

۶ — اہلِ عرب خود اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات اور اس کی ہر چیز کا رب (مالک و پروردگار) ہے۔ اس لیے ان سے فرمایا گیا کہ اگر تم بے سوچے سمجھے محض زبان ہی سے یہ اقرار نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمھیں واقعی اُس کی پروردگاری کا شعور اور اس کے مالک ہونے کا یقین ہے، تو تمھیں تسلیم کرنا چاہیے کہ (۱) انسان کی رہنمائی کے لیے کتاب اور رسول کا بھیجنا اس کی شانِ رحمت و پروردگاری کا عین تقاضا ہے، اور (۲) مالک ہونے کی حیثیت سے یہ اس کا حق اور مملوک ہونے کی حیثیت سے یہ تمھارا فرض ہے کہ اس کی طرف سے جو ہدایت آئے اسے مانو، اور جو حکم آئے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دو۔

۷ — معبُود سے مراد ہے حقیقی معبُود، جس کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت (بندگی و پرستش) کی جائے۔

۸ — یہ دلیل ہے اس امر کی کہ اس کے سوا کوئی معبُود نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ جس نے بے جان مادّوں میں جان ڈال کر تم کو جیتا جاگتا انسان بنایا، اور جو اس امر کے کُلّی اختیارات رکھتا ہے کہ جب تک چاہے تمھاری اِس زندگی کو باقی رکھے اور جب چاہے اسے ختم کر دے، اس کی تم بندگی نہ کرو، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرو، یا اس کے ساتھ دوسروں کی بندگی بھی کرنے لگو۔

۹ — اِس میں ایک لطیف اشارہ ہے اِس امر کی طرف کہ تمھارے جن اسلاف نے اس کو چھوڑ کر دوسرے معبُود بنائے، ان کا رب بھی حقیقت میں وہی تھا۔ انھوں نے اپنے اصلی رب کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے کوئی صحیح کام نہ کیا تھا کہ اُن کی تقلید کرنے میں تم حق بجانب ہو اور ان کے فعل کو اپنے مذہب کے دُرست ہونے کی دلیل ٹھیرا سکو۔ اُن کو لازم تھا کہ وہ صرف اُسی کی بندگی کرتے، کیونکہ وہی ان کا رب تھا۔ لیکن اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو تمھیں لازم ہے کہ سب کی بندگی چھوڑ کر اسی ایک کی بندگی اختیار کرو، کیونکہ وہی تمھارا رب ہے۔

۱۰ — اِس مختصر سے فقرے میں ایک بڑی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دَہریّے ہوں یا مشرکین، ان سب پر وقتاً فوقتاً ایسی ساعتیں آتی رہتی ہیں جب ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھے بیٹھے ہو، اس میں کہیں نہ کہیں جھول موجود ہے۔ دَہریّہ اپنے انکارِ خدا میں بظاہر خواہ کتنا ہی سخت ہو، کسی نہ کسی وقت اس کا دل یہ شہادت دے گزرتا ہے کہ خاک کے ایک ذرّے سے لے کر کہکشانوں تک اور گھاس کی ایک پتّی سے لے کر انسان کی تخلیق تک یہ حیرت انگیز، حکمت سے لبریز نظام کسی صانع حکیم کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ اسی طرح ایک مشرک اپنے شرک میں خواہ کتنا ہی گہرا ڈوبا ہوا ہو، کبھی

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ ﴿۱۰﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ
هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾
اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۙ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا
عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا

وقفِ لازم

اچھا، انتظار کرو اُس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے درد ناک سزا۔ (اب کہتے ہیں کہ) ”پروردگار! ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔“ اِن کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ اِن کے پاس رسولِ مُبین آگیا[11]، پھر بھی یہ اُس کی طرف مُلتفت نہ ہوئے اور کہا کہ ”یہ تو سکھایا پڑھایا باولا ہے[12]۔“ ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں،

نہ کبھی اس کا دل بھی یہ پکار اُٹھتا ہے کہ جنھیں میں معبُود بنائے بیٹھا ہوں یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ لیکن اِس قلبی شہادت کا نتیجہ نہ تو یہ ہوتا ہے کہ انھیں خدا کے وجود اور اس کی توحید کا یقین حاصل ہو جائے، نہ یہی ہوتا ہے کہ انھیں اپنے شرک اور اپنی دَہریّت میں کامل یقین و اطمینان حاصل رہے۔ اِس کے بجائے اُن کا دین درحقیقت شک پر قائم ہوتا ہے، خواہ اُس میں یقین کی کتنی ہی شدت وہ دکھا رہے ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ شک ان کے اندر بے چینی کیوں نہیں پیدا کرتا، اور وہ سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کیوں نہیں کرتے کہ یقین کی اطمینان بخش بنیاد انھیں مل سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں سنجیدگی ہی سے تو وہ محروم ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اصل اہمیّت صرف دنیا کی کمائی اور اس کے عیش کی ہوتی ہے، جس کی فکر میں وہ اپنے دل اور دماغ اور جسم کی ساری طاقتیں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ رہے دین کے مسائل، تو وہ حقیقت میں ان کے لیے ایک کھیل، ایک تفریح، ایک ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتے، جن پر سنجیدگی کے ساتھ چند لمحے بھی وہ غور و فکر میں صَرف نہیں کر سکتے۔ مذہبی مراسم ہیں تو تفریح کے طور پر ادا کیے جا رہے ہیں۔ انکار و دَہریّت کی بحثیں ہیں تو تفریح کے طور پر کی جا رہی ہیں۔ دنیا کے مشاغل سے اتنی فرصت کسے ہے کہ بیٹھ کر یہ سوچے کہ کہیں ہم حق سے منحرف تو نہیں ہیں، اور اگر حق سے منحرف ہیں تو اس کا انجام کیا ہے۔

۱۱ – رسولِ مُبین کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ اس کا رسول ہونا اُس کی سیرت، اُس کے اَخلاق و کردار اور اُس کے کارناموں سے بالکل عیاں ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس نے حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔

۱۲ – اُن کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے چارا تو سیدھا سادھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اِسے بھَرّوں پر چڑھا لیا، وہ درپردہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آ کر عام لوگوں کے سامنے انھیں پیش کر دیتا ہے، وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا ہے۔ اِس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ اُن ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور سنجیدہ تعلیمات کو اُڑا دیتے

إِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿١٥﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ إِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿١٦﴾ وقف لازم

تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔ جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔[۱۳]

تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برسوں سے ان کے سامنے پیش کر کر کے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نہ ان معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآنِ مجید میں بیان کی جا رہی تھیں، نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پایے کا آدمی ہے، اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص در پردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہؓ اور ابوبکرؓ اور علیؓ اور زیدؓ بن حارثہ اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ جاتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب اور ہر وقت کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضوؐر کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے، حالانکہ درپردہ کسی دوسرے شخص کے سکھانے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپؐ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۰۷۔ جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۲)

۱۳ – اِن آیات کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے، اور یہ اختلاف صحابۂ کرامؓ کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے مشہور شاگرد مَسرُوقؒ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم کوفے کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔ اس نے آیت يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ پڑھی، پھر کہنے لگا: جانتے ہو یہ کیسا دھواں ہے؟ یہ دھواں قیامت کے روز آئے گا اور کفار و منافقین کو اندھا بہرا کر دے گا، مگر اہلِ ایمان پر اس کا اثر بس اس قدر ہوگا کہ جیسے زکام لاحق ہوگیا ہو۔ اُس کی یہ بات سُن کر ہم حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے پاس گئے اور ان سے واعظ کی یہ تفسیر بیان کی۔ حضرت عبداللہؓ لیٹے ہوئے تھے۔ یہ تفسیر سُن کر گھبرا کے اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ آدمی کو علم نہ ہو تو اسے جاننے والوں سے پوچھ لینا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہی چلے گئے تو حضوؐر نے دعا کی کہ خدایا! یوسف علیہ السلام کے قحط جیسے قحط سے میری مدد فرما۔ چنانچہ ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مُردار تک کھا گئے۔ اُس زمانے میں حالت یہ تھی کہ جو شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا اُسے بھوک کی شدت میں بس دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ آخر کار ابوسفیان نے آ کر حضوؐر سے کہا کہ آپؐ تو صلۂ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپؐ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس مصیبت کو دور کر دے۔ یہی زمانہ تھا جب قریش کے لوگ کہنے لگے تھے کہ خدایا! ہم پر سے یہ عذاب دُور کر دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اسی واقعے کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ اور بڑی ضرب سے مراد وہ ضرب ہے جو آخر کار جنگِ بدر کے روز قریش کو لگائی گئی۔ یہ رِوایت امام احمد، بخاری، ترمِذی، نَسائی، ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم نے متعدّد سندوں کے ساتھ مَسرُوقؒ سے نقل کی ہے۔ اور مَسرُوقؒ کے علاوہ ابراہیم نَخَعیؒ، قَتادَہؒ، عاصمؒ اور عامرؒ کا بھی یہی بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے اِس آیت کی یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ اس لیے اس امر میں کوئی شک

نہیں رہتا کہ حضرتِ موصوف کی رائے فی الواقع یہی تھی۔ تابعین میں سے مجاہد، قَتادہ، ابوالعالیہ، مُقاتِل، ابراہیم النَّخَعی، ضَحّاک اور عَطِیّہ العوفی وغیرہ حضرات نے بھی اس تفسیر میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے اتفاق کیا ہے۔

دوسری طرف حضرت علیؓ، ابنِ عمرؓ، ابنِ عباسؓ، ابوسعید خُدریؓ، زید بن علیؒ اور حَسَن بصریؒ جیسے اکابر کہتے ہیں کہ ان آیات میں سارا ذکر قیامت کے قریب زمانے کا کیا گیا ہے اور وہ دھواں جس کی خبر دی گئی ہے، اُسی زمانے میں زمین پر چھائے گا۔ مزید تقویت اِس تفسیر کو اُن رِوایات سے ملتی ہے جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ حُذَیفہؓ بن اَسِید الغِفاری کہتے ہیں کہ ایک روز ہم قیامت کے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں حضورؐ برآمد ہوئے اور فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک دس علامات یکے بعد دیگرے ظاہر نہ ہولیں گی: سورج کا مغرب سے طُلُوع ہونا، دھواں، دابّہ، یاجوج وماجوج کا خُروج، عیسٰی ابنِ مریمؑ کا نُزول، زمین کا دھنسنا مشرق میں، مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، اور عدن سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانکتی ہوئی لے جائے گی۔ (مسلم) اسی کی تائید ابو مالک اَشْعَریؓ کی وہ رِوایَت کرتی ہے جسے ابنِ جَریر اور طَبَرانی نے نقل کیا ہے، اور ابوسعید خُدریؓ کی رِوایَت جسے ابنِ ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ ان دونوں رِوایَتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دھویں کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا ہے، اور یہ بھی حضورؐ نے فرمایا ہے کہ وہ دھواں جب چھائے گا تو مومن پر اس کا اثر صرف زکام جیسا ہوگا، اور کافر کی نس نس میں وہ بھر جائے گا اور اس کے ہر مَنْفَذْ سے نکلے گا۔

اِن دونوں تفسیروں کا تعارُض اُوپر کی آیات پر غور کرنے سے بآسانی رفع ہوسکتا ہے۔ جہاں تک حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی تفسیر کا تعلق ہے، یہ اَمرِ واقعہ ہے کہ مکّۂ معظّمہ میں حضورؐ کی دعا سے سخت قحط رُونما ہوا تھا جس سے کفار کے خَتنے بہت کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے، اور انھوں نے اسے رفع کرانے کے لیے حضورؐ سے دعا کی درخواست کی تھی۔ اِس واقعے کی طرف قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۲۹۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۷۷، یونُس، حواشی ۱۴-۱۵-۲۹۔ جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۷۲) ان آیات میں بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ اشارہ اُسی صورتِ حال کی طرف ہے۔ کفار کا یہ کہنا کہ ”پروردگار! ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔“ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ”اِن کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے جب کہ ان کے پاس رسولِ مُبین آ گیا، پھر بھی یہ اس کی طرف مُلتفِت نہ ہوئے اور کہا کہ یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے۔“ پھر یہ فرمانا کہ ”ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔“ یہ ساری باتیں اُسی صورت میں راست آسکتی ہیں جب کہ واقعہ حضورؐ ہی کے زمانے کا ہو۔ قیامت کے قریب ہونے والے واقعات پر ان کا اِطلاق بعید اَز فہم ہے۔ اس لیے اس حد تک تو ابنِ مسعودؓ کی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُس کا یہ حصّہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ ”دھواں“ بھی اُسی زمانے میں ظاہر ہوا تھا، اور اس شکل میں ظاہر ہوا تھا کہ بھوک کی شدت میں جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ یہ بات قرآنِ مجید کے ظاہر الفاظ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی، اور احادیث کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ آسمان دھواں لیے ہوئے آ گیا اور لوگوں پر چھا گیا۔ وہاں تو کہا گیا ہے کہ ”اچھا تو اُس دن کا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔“ بعد کی آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم نہ رسول کے سمجھانے سے مانتے ہو، نہ قحط کی شکل میں جو تنبیہ تمھیں کی گئی ہے اُس سے ہی ہوش میں آتے ہو، تو پھر قیامت

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْٓا
اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ
اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾

ہم اِن سے پہلے فرعون کی قوم کو اِسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں۔ اُن کے پاس ایک نہایت شریف رسُول[۱۴] آیا اور اس نے کہا[۱۵]: "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو[۱۶]، میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[۱۷]۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمھارے سامنے (اپنی ماموریّت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں[۱۸]۔ اور میں اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اِس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔

کا انتظار کرو، اُس وقت جب پوری طرح شامت آئے گی تب تمھیں پتا چل جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا تھا۔ پس جہاں تک دھویں کا تعلق ہے، اس کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ قحط کے زمانے کی چیز نہیں ہے بلکہ علاماتِ قیامت میں سے ہے، اور یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ تعجّب ہے کہ مفسرینِ کبار میں سے جنھوں نے حضرت ابنِ مسعودؓ کی تائید کی انھوں نے پوری بات کی تائید کر دی، اور جنھوں نے ان کی تردید کی انھوں نے پوری بات کی تردید کر دی، حالانکہ آیات اور احادیث پر غور کرنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا کون سا حصّہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔

۱۴ – اصل میں "رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کریم کا لفظ جب انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بہترین شریفانہ خصائل اور نہایت قابلِ تعریف صفات سے متصف ہے۔ معمولی خوبیوں کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

۱۵ – یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ کے جو اقوال نقل کیے جا رہے ہیں وہ ایک وقت میں ایک ہی مسلسل تقریر کے اجزا نہیں ہیں، بلکہ سال ہا سال کے دَوران میں مختلف مواقع پر جو باتیں انھوں نے فرعون اور اس کے اہلِ دربار سے کہی تھیں، ان کا خلاصہ چند فقروں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۳ تا ۹۷، یونُس، حواشی ۷۲ تا ۹۳۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۱۸ الف تا ۵۲، الشعراء، حواشی ۷ تا ۴۹، النمل، حواشی ۸ تا ۱۷، القصص، حواشی ۴۶ تا ۵۶۔ جلد چہارم، المومن، آیات ۲۳ تا ۴۶، الزُّخرُف، ۴۶ تا ۵۶ مع حواشی)

۱۶ – اصل میں اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو اُوپر ہم نے کیا ہے، اور اس کے لحاظ سے یہ اُس مطالبے کا ہم معنیٰ ہے جو سورۂ اَعراف (آیت ۱۰۵)، سورۂ طٰہٰ (۴۷) اور الشّعراء (۱۷) میں گزر چکا ہے کہ "بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دو۔" دوسرا ترجمہ، جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے، یہ ہے کہ "اللہ کے بندو! میرا حق ادا کرو، یعنی میری بات مانو، مجھ پر ایمان لاؤ، اور میری ہدایت کی پیروی کرو، یہ خدا کی طرف سے تمھارے اُوپر میرا حق ہے۔"

وَ اِنۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا لِیۡ فَاعۡتَزِلُوۡنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّہٗۤ اَنَّ ہٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ
مُّجۡرِمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَیۡلًا اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۲۳﴾ وَ اتۡرُکِ الۡبَحۡرَ

اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو۔[19]" آخرِ کار اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔[20] (جواب دیا گیا:) "اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو[21] لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔[22] سمندر کو اس کے حال پر

بعد کا یہ فقرہ کہ "میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں" اِس دوسرے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۱۷ – یعنی بھروسے کے قابل رسول ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی بات ملا کر کہنے والا نہیں ہوں۔ نہ اپنی کسی ذاتی خواہش یا غرض کے لیے خود ایک حکم یا قانون گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کرنے والا ہوں۔ مجھ پر تم یہ اعتماد کر سکتے ہو کہ جو کچھ میرے بھیجنے والے نے کہا ہے، وہی بے کم و کاست تم تک پہنچاؤں گا۔ (واضح رہے کہ یہ دو فقرے اُس وقت کے ہیں جب حضرت موسیٰؑ نے سب سے پہلے اپنی دعوت پیش فرمائی تھی۔)

۱۸ – دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مقابلے میں جو سرکشی تم کر رہے ہو، یہ دراصل اللہ کے مقابلے میں سرکشی ہے، کیونکہ میری جن باتوں پر تم بگڑ رہے ہو، وہ میری نہیں بلکہ اللہ کی باتیں ہیں اور مَیں اُسی کے رسول کی حیثیت سے انھیں بیان کر رہا ہوں۔ اگر تمھیں اس میں شک ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں یا نہیں، تو میں تمھارے سامنے اپنے مامور من اللہ ہونے کی صریح سند پیش کرتا ہوں۔ اِس سند سے مراد کوئی ایک معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزات کا وہ طویل سلسلہ ہے جو فرعون کے دربار میں پہلی مرتبہ پہنچنے کے بعد سے آخر زمانۂ قیامِ مصر تک حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کو سال ہا سال تک دکھاتے رہے۔ جس سند کو بھی اُن لوگوں نے جھٹلایا، اُس سے بڑھ کر صریح سند آپ پیش کرتے چلے گئے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّخرُف، حواشی نمبر ۴۲–۴۳)

۱۹ – یہ اُس زمانے کی بات ہے جب حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ ساری نشانیوں کے مقابلے میں فرعون اپنی ہٹ پر اَڑا ہوا تھا، مگر یہ دیکھ کر کہ اِن نشانیوں سے مصر کے عوام اور خواص روز بروز مُتأثّر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس کے ہوش اُڑے جا رہے تھے۔ اُس زمانے میں پہلے تو اس نے بھرے دربار میں وہ تقریر کی جو سورۂ زُخرُف، آیات ۵۱–۵۳ میں گزر چکی ہے (مُلاحظہ ہو: حواشی سورۂ زُخرف ۴۵ تا ۴۹)، پھر زمین پاؤں تلے سے نکلتی دیکھ کر آخرِ کار وہ اللہ کے رسول کو قتل کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس وقت آں جناب نے وہ بات کہی جو سورۂ مومن، آیت ۲۷ میں گزر چکی ہے کہ اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ "میں نے پناہ لی اپنے رب اور تمھارے رب کی ہر اُس متکبر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔" یہاں حضرت موسیٰؑ اپنی اُسی بات کا حوالہ دے کر فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت سے فرما رہے ہیں کہ دیکھو، میں تمھارے سارے حملوں کے مقابلے میں اللہ ربّ العالمین کی پناہ مانگ چکا ہوں۔ اب تم میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن اگر تم خود اپنی خیر چاہتے ہو تو مجھ پر حملہ آور ہونے سے باز رہو۔ میری بات نہیں مانتے تو نہ مانو۔ مجھ پر ہاتھ ہرگز نہ ڈالنا، ورنہ اِس کا بہت بُرا انجام دیکھو گے۔

رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّ
زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَ
اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ

کُھلا چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے۔[۲۳]" کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔کتنے ہی عیش کے سروسامان، جن میں وہ مزے کر رہے تھے، اُن کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا اُن کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو اِن چیزوں کا وارث بنا دیا۔[۲۴] پھر نہ آسمان اُن پر رویا نہ زمین،[۲۵] اور

۲۰- یہ حضرت موسیٰؑ کی آخری رپورٹ ہے جو اُنھوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی۔ "یہ لوگ مجرم ہیں"، یعنی اِن کا مجرم ہونا اب قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے۔کوئی گنجایش اِن کے ساتھ رعایت برتنے اور ان کو اصلاحِ حال کا مزید موقع دینے کی باقی نہیں رہی ہے۔اب وقت آ گیا ہے کہ حضور آخری فیصلہ صادر فرمائیں۔

۲۱- یعنی اُن سب لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ ان میں بنی اسرائیل بھی تھے، اور مصر کے وہ قبطی باشندے بھی جو حضرت یوسفؑ کے زمانے سے حضرت موسیٰؑ کی آمد تک مسلمانوں میں شامل ہو چکے تھے، اور وہ لوگ بھی جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کی نشانیاں دیکھ کر اور آپ کی دعوت و تبلیغ سے مُتأثّر ہو کر اہلِ مصر میں سے اسلام قبول کیا تھا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یوسف، حاشیہ ۶۸)

۲۲- یہ ابتدائی حکم ہے جو حضرت موسیٰؑ کو ہجرت کے لیے دیا گیا تھا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۵۳، الشعراء، حواشی ۳۹ تا ۴۷)

۲۳- یہ حکم اُس وقت دیا گیا جب حضرت موسیٰؑ اپنے قافلے کو لے کر سمندر پار اُتر چکے تھے، اور چاہتے تھے کہ سمندر پر عصا مار کر اُسے پھر ویسا ہی کر دیں جیسا وہ پھٹنے سے پہلے تھا، تاکہ فرعون اور اس کا لشکر اُس راستے سے گزر کر نہ آ جائے جو معجزے سے بنا تھا۔اُس وقت فرمایا گیا کہ ایسا نہ کرو۔ اس کو اِسی طرح پھٹا کا پھٹا رہنے دو، تاکہ فرعون اپنے لشکر سمیت اِس راستے میں اُتر آئے، پھر سمندر کو چھوڑ دیا جائے گا اور یہ پوری فوج غرق کر دی جائے گی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۵۳-۵۴، الشعراء، حاشیہ ۴۷)

۲۴- حضرت حَسَن بصریؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے قومِ فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں جو آلِ فرعون کے بعد مصر کے وارث ہوئے، کیونکہ تاریخوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کبھی وہاں واپس گئے ہوں اور اس سرزمین کے وارث ہوئے ہوں۔ یہی اختلاف بعد کے مفسرین میں بھی پایا جاتا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۴۵)

ع ۱ ۲۹ ۱۴

مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿٢٩﴾ ع وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ
الْمُهِيْنِ ﴿٣٠﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ
اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٢﴾ ج وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ

ذرا سی مُہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔ ع اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلّت کے عذاب، فرعون[۲۶] سے نجات دی، جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اُونچے درجے کا آدمی تھا[۲۷]، اور ان کی حالت جانتے ہوئے اُن کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی[۲۸]، اور انھیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح

۲۵ – یعنی جب وہ حکمراں تھے تو اُن کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے، اُن کی حمد وثنا کے ترانوں سے دنیا گونج رہی تھی۔ خوشامدیوں کے جمگھٹے ان کے آگے اور پیچھے لگے رہتے تھے، ان کی وہ ہوا باندھی جاتی تھی کہ گویا ایک عالَم اُن کے کمالات کا گرویدہ اور ان کے احسانات کا زیرِ بار ہے اور ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مقبول نہیں، مگر جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان کے لیے رونے والی نہ تھی، بلکہ دنیا نے ایسا اطمینان کا سانس لیا کہ گویا ایک کانٹا تھا جو اس کے پہلو سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے نہ خلقِ خدا کے ساتھ کوئی بھلائی کی تھی کہ زمین والے ان کے لیے روتے، نہ خدا کی خوشنودی کا کوئی کام کیا تھا کہ آسمان والوں کو ان کی ہلاکت پر افسوس ہوتا۔ جب تک مَشِیّتِ الٰہی سے ان کی رسّی دراز ہوتی رہی، وہ زمین کے سینے پر مونگ دَلتے رہے۔ جب ان کے جرائم حد سے گزر گئے تو اس طرح اُٹھا کر پھینک دیے گئے جیسے کُوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

۲۶ – یعنی فرعون بجائے خود اُن کے لیے ذلّت کا عذاب تھا اور دوسرے تمام عذاب اسی ایک عذابِ مجسّم کے شاخسانے تھے۔

۲۷ – اس میں ایک لطیف طنز ہے کفارِ قریش کے سرداروں پر۔ مطلب یہ ہے کہ حدِّ بندگی سے تجاوُز کر جانے والوں میں تمھارا مرتبہ اور مَقام ہی کیا ہے۔ بڑے اُونچے درجے کا سرکش تو وہ تھا جو اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تخت پر خدائی کا رُوپ دھارے بیٹھا تھا۔ اُسے جب خس وخاشاک کی طرح بہا دیا گیا تو تمھاری کیا ہستی ہے کہ قہرِ الٰہی کے آگے ٹھیر سکو۔

۲۸ – یعنی بنی اسرائیل کی خوبیاں اور کمزوریاں، دونوں اللہ پر عیاں تھیں۔ اُس نے بے دیکھے بھالے اُن کا انتخاب اندھا دُھند نہیں کر لیا تھا۔ اُس وقت دنیا میں جتنی قومیں موجود تھیں اُن میں سے اِس قوم کو جب اُس نے اپنے پیغام کا حامل اور اپنی توحید کی دعوت کا عَلَم بردار بنانے کے لیے چُنا تو اس بنا پر چُنا کہ اُس کے علم میں وقت کی موجود قوموں میں سے یہی اس کے لیے موزوں تر تھی۔

بَلٰٓـؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى
وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمْ
خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا
مُجْرِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا

آزمایش تھی۔[29]

یہ لوگ کہتے ہیں: "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اُس کے بعد ہم دوبارہ اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔[30] اگر تم سچّے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔"[31] یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم[32] اور اُس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اِسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔[33] یہ آسمان و زمین اور اِن کے درمیان کی چیزیں

۲۹ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۶۴ تا ۸۵، النساء، حواشی ۱۸۲ تا ۱۹۹، المائدہ، حواشی ۴۲ تا ۷۴۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۹۷ تا ۱۳۲۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۵۶ تا ۷۴۔

۳۰ – یعنی پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ "پہلی موت" کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فُلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا، تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد لازماً دوسرا بچہ پیدا ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچہ نہ ہوا ہو۔

۳۱ – اِن کا اِستِدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اُٹھتے نہیں دیکھا ہے، اس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی۔ تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ دوسری زندگی ہوگی تو ہمارے اجداد کو قبروں سے اُٹھا لاؤ، تاکہ ہمیں زندگی بعدِ موت کا یقین آ جائے۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمھارا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی۔ حالانکہ سراسر مُہمَل تھی۔ آخر ان سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دنیا میں واپس آئیں گے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی مسلمان نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں؟

۳۲ – تُبَّع قبیلۂ حِمیَر کے بادشاہوں کا لقب تھا، جیسے کِسریٰ، قیصر، فرعون وغیرہ القاب مختلف مَمالک کے بادشاہوں کے لیے مخصوص رہے ہیں۔ یہ لوگ قومِ سَبا کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۵ قبلِ مسیح میں اِن کو سَبا کے ملک پر غلبہ حاصل ہوا اور ۳۰۰ء تک یہ حکمراں رہے۔ عرب میں صدیوں تک اِن کی عظمت کے افسانے زبان زدِ خلائق

لَعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى

ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ اِن کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۳۴]۔
اِن سب کے اُٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے[۳۵]، وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے

رہے ہیں۔ (تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سَبا، حاشیہ نمبر ۳۷)

۳۳– یہ کفار کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اَخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے، اور تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اس نظریے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا ہے وہ آخرِ کار تباہ ہو کر رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ’’یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟‘‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفارِ مکہ تو اس خوشحالی اور شوکت وحشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبَّع کی قوم، اور اس سے پہلے سَبا اور قومِ فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادّی خوشحالی اور دُنیوی شان و شوکت اَخلاقی زوال کے نتائج سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پونجی اور اپنے ذرائع و وسائل کے بل بُوتے پر ان سے بچ جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سَبا، حواشی ۲۵-۳۶)

۳۴– یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا وسزا کا منکر ہے، وہ دراصل اِس کارخانۂ عالَم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے، اِسی بنا پر اس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یوں ہی مٹی میں رَل مِل جائے گا، اور اُس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالق حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ فعلِ عَبَث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ اِستدلال قرآنِ مجید میں متعدّد مَقامات پر کیا گیا ہے، اور ہم اس کی مفصل تشریح کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یُونُس، حواشی ۱۰-۱۱۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۶-۱۷، المومنون، حواشی ۱۰۱-۱۰۲، الروم، حواشی ۴ تا ۱۰)

۳۵– یہ اُن کے اِس مطالبے کا جواب ہے کہ ’’اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچّے ہو۔‘‘ مطلب یہ ہے کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اُٹھا کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اس کے لیے تو ربّ العالمین نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جب تمام اوّلین وآخرین کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مُقدّمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہرحال اپنے وقتِ مقرر پر ہی ہوگا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کر سکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اِس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے، بس اِسی دنیا کی زندگی تک ہے،

عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ
هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾ ع اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ
الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ ۛ كَالْمُهْلِ ۛۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۶﴾ معانقة ۱۴
خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۴۷﴾ ۖ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ
مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۸﴾ ؕ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾

کسی عزیز قریب[۳۶] کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انھیں کوئی مدد پہنچے گی، سوائے اِس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے، وہ زبردست اور رحیم ہے[۳۷] ع

زَقّوم[۳۸] کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا، تیل کی تلچھٹ[۳۹] جیسا، پیٹ میں اِس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔ "پکڑو اِسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اِس کو جہنّم کے بیچوں بیچ، اور اُنڈیل دو اِس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تُو۔

مرنے کے بعد پھر کوئی عدالت نہیں ہونی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلنا ہو۔

۳۶- اصل میں لفظ "مولیٰ" استعمال کیا گیا ہے جو عَرَبی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی تعلق کی بنا پر دوسرے شخص کی حمایت کرے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ رشتہ داری کا تعلق ہو، یا دوستی کا، یا کسی اور قسم کا۔

۳۷- ان فقروں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی اُس کا کیا رنگ ہوگا۔ کسی کی مدد یا حمایت وہاں کسی مجرم کو نہ چھڑا سکے گی، نہ اس کی سزا کم ہی کرا سکے گی۔ کُلّی اختیارات اس حاکمِ حقیقی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بُوتا کسی میں نہیں ہے۔ یہ بالکل اس کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور حقیقت میں اُس کی شان یہی ہے کہ انصاف کرنے میں بے رحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے۔ لیکن جس کے مُقدّمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا، وہ بہر حال بے کم و کاست نافذ ہوگا۔ عدالتِ الٰہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقروں میں بتایا گیا ہے کہ اُس عدالت میں جو لوگ مجرم ثابت ہوں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ دنیا میں خدا سے ڈر کر نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہے تھے، ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔

۳۸- زَقّوم کی تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ صافّات، حاشیہ ۳۴۔

إِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝٥٠ إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝٥١
فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝٥٢ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ
مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝٥٣ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝٥٤ يَدْعُوْنَ
فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ۝٥٥ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ

یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔"

خدا ترس لوگ امن کی جگہ[۴۰] میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں، حریر و دیبا[۴۱] کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہوگی ان کی شان۔ اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں[۴۲] ان سے بیاہ دیں گے۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں[۴۳] گے۔ وہاں موت کا مزا وہ کبھی نہ چکھیں گے،

۳۹ — اصل میں لفظ "اَلْمُهْل" استعمال ہوا ہے، جس کے کئی معنیٰ ہیں: پگھلی ہوئی دھات، پیپ، لہو، پگھلا ہوا تارکول، لاوا، تیل کی تلچھٹ۔ یہ مختلف معنیٰ اہلِ لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ لیکن اگر زَقُّوم سے مراد وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں تھوہر کہتے ہیں، تو اس کو چبانے سے جو رَس نکلے گا، اغلب یہی ہے کہ وہ تیل کی تلچھٹ سے مشابہ ہوگا۔

۴۰ — امن کی جگہ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں کسی قسم کا کھٹکا نہ ہو۔ کوئی غم، کوئی پریشانی، کوئی خطرہ اور اندیشہ، کوئی مَشَقَّت اور تکلیف لاحق نہ ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ یہاں تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے، ہمیشہ خوشحال رہو گے کبھی خستہ حال نہ ہو گے، ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔" (مسلم بروایتِ ابوہُریرہؓ و ابوسعید خُدریؓ)

۴۱ — اصل میں سُنْدُس اور اِسْتَبْرَق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ سُندُس عربی زبان میں باریک ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں۔ اور اِستَبرَق فارسی لفظ ستبر کا مُعَرَّب ہے، اور یہ دبیز ریشمی کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۴۲ — اصل الفاظ ہیں: حُوْرٌ عِيْنٌ۔ حُور جمع ہے حَورا کی، اور حَورا عربی زبان میں گوری عورت کو کہتے ہیں۔ اور عِین جمع ہے عَینا کی، اور یہ لفظ بڑی بڑی آنکھوں والی عورت کے لیے بولا جاتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّافّات، حاشیہ ۲۶ و ۲۹)

۴۳ — "اطمینان سے" طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز جتنی چاہیں گے، بے فکری کے ساتھ جنت کے خادموں کو اس کے لانے کا حکم دیں گے اور وہ حاضر کر دی جائے گی۔ دنیا میں کوئی شخص ہوٹل تو درکنار، خود اپنے گھر میں اپنی چیز بھی اس اطمینان سے طلب نہیں کر سکتا جس طرح وہ جنت میں طلب کرے گا۔ کیونکہ یہاں کسی چیز کے بھی اتھاہ ذخیرے کسی کے

اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰىۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِۙ ۝۵۶ فَضْلًا
مِّنْ رَّبِّكَؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۵۷ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۵۸ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝۵۹ ع

ع ۳ ۱۷ ۱۲

بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنّم کے عذاب سے بچا دے گا[۴۴]، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اَے نبیؐ! ہم نے اِس کتاب کو تمھاری زبان میں سہل بنا دیا ہے، تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اب تم بھی انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں۔[۴۵] ع

پاس نہیں ہوتے، اور جو چیز بھی آدمی استعمال کرتا ہے اُس کی قیمت بہر حال اُس کی اپنی جیب ہی سے جاتی ہے۔ جنت میں مال اللہ کا ہوگا اور بندے کو اس کے استعمال کی کھلی اجازت ہوگی۔ نہ کسی چیز کے ذخیرے ختم ہو جانے کا خطرہ ہو گا، نہ بعد میں بل پیش ہونے کا کوئی سوال۔

۴۴ – اس آیت میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں:

ایک یہ کہ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد جہنّم سے بچائے جانے کا ذکر خاص طور پر الگ فرمایا گیا ہے، حالاں کہ کسی شخص کا جنت میں پہنچ جانا آپ سے آپ اس امر کو مُستلزِم ہے کہ وہ جہنّم میں جانے سے بچ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرماں برداری کے انعام کی قدر انسان کو پوری طرح اسی وقت محسوس ہو سکتی ہے جب کہ اس کے سامنے یہ بات بھی ہو کہ نافرمانی کرنے والے کہاں پہنچے ہیں، اور وہ کس بُرے انجام سے بچ گیا ہے۔

دوسری قابلِ توجہ بات اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جہنم سے بچنے اور جنت میں پہنچنے کو اپنے فضل کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔ اس سے انسان کو اس حقیقت پر مُتنبّہ کرنا مقصود ہے کہ یہ کامیابی کسی شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ اگرچہ آدمی کو انعام اس کے اپنے حُسنِ عمل ہی پر ملے گا، لیکن اوّل تو حُسنِ عمل ہی کی توفیق آدمی کو اللہ کے فضل کے بغیر کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ پھر جو بہتر سے بہتر عمل بھی آدمی سے بن آ سکتا ہے، وہ کبھی کامل و اکمل نہیں ہو سکتا جس کے متعلق دعوے سے یہ کہا جا سکے کہ اس میں نقص کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ وہ بندے کی کمزوریوں اور اس کے عمل کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اُس کی خدمات کو قبول فرما لے اور اسے انعام سے سرفراز فرمائے۔ ورنہ باریک بینی کے ساتھ حساب کرنے پر وہ اُتر آئے تو کس کی یہ ہمت ہے کہ اپنی قوتِ بازو سے جنت جیت لینے کا دعویٰ کر سکے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اعملوا وسدّدوا وقاربوا واعلموا انّ احدًا لن يُّدخلهٗ عمله الجنّة۔ "عمل کرو اور اپنی حدِ استطاعت تک زیادہ سے زیادہ ٹھیک کام کرنے کی کوشش کرو، مگر یہ جان لو کہ کسی شخص کو

محض اس کا عمل ہی جنت میں نہ داخل کر دے گا۔" لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! کیا آپؐ کا عمل بھی؟" فرمایا: وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یتغمّدنی اللّٰہ بِرَحْمَتِہٖ، "ہاں، میں بھی محض اپنے عمل کے زور سے جنت میں نہ پہنچ جاؤں گا، اِلّا یہ کہ مجھے میرا رب اپنی رحمت سے ڈھانک لے۔"

۴۵- یعنی اب اگر یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کرتے تو دیکھتے رہو کہ ان کی کس طرح شامت آتی ہے، اور یہ بھی منتظر ہیں کہ دیکھیں تمھاری اس دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے۔

تفہیم القرآن

الجاثیہ

(۴۵)

الجاثیہ

نام آیت ۲۸ کے فقرے وَتَرٰی کُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لفظِ جاثیہ آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول اس سورت کا زمانۂ نُزول بھی کسی معتبر رِوایت میں بیان نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کے مضامین سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۂ دُخان کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین میں ایسی مشابہت ہے جس سے یہ دونوں تؤام نظر آتی ہیں۔

موضوع اور مَباحِث اس کا موضوع توحید و آخرت کے متعلق کفارِ مکہ کے شبہات و اعتراضات کا جواب دینا اور اُس رَوِیّے پر اُن کو مُتَنَبِّہ کرنا ہے جو انھوں نے قرآن کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔

کلام کا آغاز توحید کے دلائل سے کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انسان کے اپنے وجود سے لے کر زمین و آسمان تک ہر طرف پھیلی ہوئی بے شمار نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا ہے کہ تم جدھر بھی نگاہ اُٹھا کر دیکھو، ہر چیز اُسی توحید کی شہادت دے رہی ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔ یہ طرح طرح کے حیوانات، یہ شب و روز، یہ بارشیں اور ان سے اُگنے والی نباتات، یہ ہوائیں، اور یہ انسان کی اپنی پیدایش، اِن ساری چیزوں کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر دیکھے اور کسی تعصب کے بغیر اپنی عقل کو سیدھے طریقے سے اِستعمال کر کے اِن پر غور کرے تو یہ نشانیاں اسے اس امر کا یقین دلانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے، نہ بہت سے خداؤں کی خدائی میں چل رہی ہے، بلکہ ایک ہی خدا نے اِسے بنایا ہے، اور وہی اکیلا اس کا مدبّر اور فرماں روا ہے۔ البتہ اُس شخص کی بات دُوسری ہے جو نہ ماننے کی قسم کھا کر بیٹھ گیا ہو، یا شکوک و شبہات ہی میں پڑے رہنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ اُسے دنیا میں کہیں سے بھی یقین و ایمان کی دولت حاصل نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر دوسرے رُکوع کی ابتدا میں پھر فرمایا گیا ہے کہ انسان اس دنیا میں جتنی چیزوں سے کام لے رہا ہے، اور جو بے حدّ و حساب اشیا اور قوتیں اِس کائنات میں اُس کے مفاد کی خدمت کر رہی ہیں، وہ آپ سے آپ کہیں سے نہیں آ گئی ہیں، نہ دیویوں اور دیوتاؤں نے انھیں فراہم کیا ہے، بلکہ وہ ایک ہی خدا ہے جس نے یہ سب کچھ اپنے پاس سے اس کو بخشا اور اس کے لیے مسخّر کر دیا ہے۔ کوئی شخص صحیح غور و فکر سے کام لے تو اس کی اپنی عقل ہی پکار اُٹھے گی کہ وہی خدا انسان کا محسن ہے،

اور اسی کا یہ حق ہے کہ انسان اُس کا شکر گزار ہو۔

اس کے بعد کفارِ مکہ کو اُس ہٹ دھرمی، اِستکبار، اِستہزا اور اصرار علی الکفر پر سخت ملامت کی گئی ہے جس سے وہ قرآن کی دعوت کا مقابلہ کر رہے تھے، اور انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ یہ قرآن وہی نعمت لے کر آیا ہے جو پہلے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی، جس کی بدولت وہ تمام اقوامِ عالَم پر فضیلت کے مستحق ہوئے تھے۔ اُنھوں نے جب اِس نعمت کی ناقدری کی اور دین میں اختلاف کر کے اسے کھو دیا، تو اب یہ دولت تمھارے ہاں بھیجی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جو دین کی صاف شاہراہ انسان کو دکھاتا ہے۔ جو لوگ اپنی جہالت وحماقت سے اس کو ردّ کریں گے وہ اپنی ہی تباہی کا سامان کریں گے۔ اور خدا کی تائید و رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو اِس کی پیروی قبول کر کے تقویٰ کی رَوِش پر قائم ہو جائیں۔

اِسی سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ خدا سے بے خوف لوگ تمھارے ساتھ جو بے ہودگیاں کر رہے ہیں، اُن پر درگزر اور تحمل سے کام لو۔ تم صبر کرو گے تو خدا خود اِن سے نمٹے گا اور تمھیں اِس صبر کا اجر عطا فرمائے گا۔

پھر عقیدۂ آخرت کے متعلق کفار کے جاہلانہ خیالات پر کلام کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، اِس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ ہم گردشِ ایام سے بس اُسی طرح مرتے ہیں جس طرح ایک گھڑی چلتے چلتے رُک جائے۔ موت کے بعد کوئی رُوح باقی نہیں رہتی جسے قبض کیا جاتا ہو اور پھر کسی وقت دوبارہ لا کر انسانی جسم میں پھونک دیا جائے۔ اِس چیز کا اگر تمھیں دعویٰ ہے تو ہمارے مرے ہوئے آبا واجداد کو زندہ کر کے دکھاؤ۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پَے در پَے چند دلائل ارشاد فرمائے ہیں:

ایک، یہ کہ تم یہ بات کسی علم کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہو، بلکہ محض گمان کی بنیاد پر اتنا بڑا حکم لگا بیٹھے ہو۔ کیا فی الواقع تمھیں یہ علم ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے اور روحیں قبض نہیں کی جاتیں بلکہ فنا ہو جاتی ہیں؟

دوسرے، یہ کہ تمھارے اس دعوے کی بنیاد زیادہ سے زیادہ بس یہ ہے کہ تم نے کسی مرنے والے کو اُٹھ کر دنیا میں آتے نہیں دیکھا ہے۔ کیا یہ بات اتنا بڑا دعویٰ کر دینے کے لیے کافی ہے کہ مرنے والے پھر کبھی نہیں اٹھیں گے؟ کیا تمھارے تجربے اور مُشاہدے میں کسی چیز کا نہ آنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ تمھیں اُس چیز کے نہ ہونے کا علم حاصل ہے؟

تیسرے، یہ کہ یہ بات سراسر عقل اور انصاف کے خلاف ہے کہ نیک اور بد، فرماں بردار اور نافرمان، ظالم اور مظلوم، آخرِ کار سب یکساں کر دیے جائیں، کسی بھلائی کا کوئی اچھا نتیجہ اور کسی بُرائی کا کوئی بُرا نتیجہ نہ نکلے،

نہ کسی مظلوم کی داد رسی ہو اور نہ کوئی ظالم اپنے کیے کی سزا پائے، بلکہ سب ایک ہی انجام سے دوچار ہوں۔ خدا کی اس کائنات کے متعلق جس نے یہ تصور قائم کیا ہے، اُس نے بڑا ہی غلط تصور قائم کیا ہے۔ اِس تصور کو ظالم اور بدکار لوگ تو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے افعال کا بُرا نتیجہ نہیں دیکھنا چاہتے، لیکن خدا کی یہ خدائی اندھیر نگری نہیں ہے، بلکہ یہ ایک برحق نظام ہے، جس میں نیک و بد کو بالآخر یکساں کر دینے کا ظلم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

چوتھے، یہ کہ انکارِ آخرت کا عقیدہ اخلاق کے لیے سخت تباہ کُن ہے۔ اس کو اختیار وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے نفس کے بندے بنے ہوئے ہیں، اور اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں بندگیِ نفس کی کھلی چھوٹ مل جائے۔ پھر جب وہ اِس عقیدے کو اختیار کر لیتے ہیں تو یہ انھیں گمراہ سے گمراہ تر کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُن کی اَخلاقی حِس بالکل مُردہ ہو جاتی ہے اور ہدایت کے تمام دروازے اُن کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔

یہ دلائل دینے کے بعد اللہ تعالیٰ پورے زور کے ساتھ فرماتا ہے کہ جس طرح تم آپ سے آپ زندہ نہیں ہو گئے ہو، بلکہ ہمارے زندہ کرنے سے زندہ ہوئے ہو، اسی طرح تم آپ سے آپ نہیں مر جاتے، بلکہ ہمارے موت دینے سے مرتے ہو، اور ایک وقت یقیناً ایسا آنا ہے جب تم سب بیک وقت جمع کیے جاؤ گے۔ اس بات کو اگر آج تم اپنی جَہالت و نادانی سے نہیں مانتے تو نہ مانو، جب وہ وقت آ جائے گا تو تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اپنے خدا کے حُضور پیش ہو اور تمھارا پورا نامۂ اعمال بے کم و کاست تیار ہے جو تمھارے ایک ایک کرتوت کی شہادت دے رہا ہے۔ اُس وقت تم کو معلوم ہو جائے گا کہ عقیدۂ آخرت کا یہ انکار اور اُس کا یہ مذاق جو تم اُڑا رہے ہو، تمھیں کس قدر مہنگا پڑا ہے۔

۳۷ اٰیاتھا

سُوْرَۃُ الْجَاثِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ

۴ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝۲ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۳ وَ فِیْ خَلْقِکُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ

ح م۔ اِس کتاب کا نُزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے۔[2]

اور تمھاری اپنی پیدایش میں، اور اُن حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے، بڑی نشانیاں ہیں

۱ ـ یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے جس میں سامعین کو دو باتوں سے خبردار کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر نازل ہو رہی ہے۔ دوسرے، یہ کہ اسے وہ خدا نازل کر رہا ہے جو زبردست بھی ہے اور حکیم بھی۔ اس کا زبردست ہونا اِس بات کا متقاضی ہے کہ انسان اس کے فرمان سے سرتابی کی جرأت نہ کرے، کیونکہ نافرمانی کر کے وہ اُس کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ اور اُس کا حکیم ہونا اِس کا متقاضی ہے کہ انسان پورے اطمینان کے ساتھ برضا و رغبت اُس کی ہدایات اور اس کے احکام کی پیروی کرے، کیونکہ اُس کی کسی تعلیم کے غلط یا نامناسب یا نقصان دہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

۲ ـ تمہید کے بعد اصل تقریر کا آغاز اِس طرح کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پَس منظر میں اہلِ مکہ کے وہ اعتراضات ہیں جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تعلیم پر کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آخر محض ایک شخص کے کہنے سے ہم اتنی بڑی بات کیسے مان لیں کہ جن بزرگ ہستیوں کے آستانوں سے آج تک ہماری عقیدتیں وابستہ رہی ہیں وہ سب ہیچ ہیں اور خدائی بس ایک خدا کی ہے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس حقیقت کو ماننے کی دعوت تمھیں دی جا رہی ہے، اس کی سچائی کے نشانات سے تو سارا عالم بھرا پڑا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، تمھارے اندر اور تمھارے باہر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، جو شہادت دے رہی ہیں کہ یہ ساری کائنات ایک خدا اور ایک ہی خدا کی تخلیق ہے، اور وہی اکیلا اس کا مالک، حاکم اور مدبّر ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ آسمان و زمین میں نشانیاں کس چیز کی ہیں۔ اس لیے کہ سارا جھگڑا ہی اُس وقت اِس بات پر چل رہا تھا کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے خداؤں اور معبُودوں کو بھی ماننے پر اصرار کر رہے تھے، اور قرآن کی دعوت یہ تھی کہ ایک خدا کے سوا نہ کوئی خدا ہے نہ معبُود۔ لہٰذا بے کہے یہ بات آپ ہی آپ موقع و محل سے ظاہر ہو رہی تھی کہ نشانیوں سے مراد توحید کی صداقت اور شرک کے بُطلان کی نشانیاں ہیں۔

اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ

اُن لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں[۳]۔ اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں[۴]، اور اُس رزق میں[۵] جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو جِلا اُٹھاتا ہے[۶]، اور ہواؤں کی گردش میں[۷]

پھر یہ جو فرمایا کہ ”یہ نشانیاں ایمان لانے والوں کے لیے ہیں“، اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بجائے خود تو یہ نشانیاں سارے ہی انسانوں کے لیے ہیں، لیکن انھیں دیکھ کر صحیح نتیجے پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو ایمان لانے کے لیے تیار ہوں۔ غفلت میں پڑے ہوئے لوگ، جو جانوروں کی طرح جیتے ہیں، اور ہٹ دھرم لوگ، جو نہ ماننے کا تہیّہ کیے بیٹھے ہیں، ان کے لیے اِن نشانیوں کا ہونا اور نہ ہونا یکساں ہے۔ چمن کی رونق اور اس کا حُسن و جمال تو آنکھوں والے کے لیے ہے۔ اندھا کسی رونق اور کسی حُسن و جمال کا اِدراک نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے چمن کا وجود ہی بے معنیٰ ہے۔

۳ – یعنی جو لوگ انکار کا فیصلہ کر چکے ہیں، یا جنھوں نے شک ہی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنا اپنے لیے پسند کر لیا ہے اُن کا معاملہ تو دوسرا ہے، مگر جن لوگوں کے دل کے دروازے یقین کے لیے بند نہیں ہوئے ہیں، وہ جب اپنی پیدایش پر، اور اپنے وجود کی ساخت پر، اور زمین میں پھیلے ہوئے انواع و اقسام کے حیوانات پر غور کی نگاہ ڈالیں گے تو انھیں بے شمار علامات ایسی نظر آئیں گی جنھیں دیکھ کر یہ شبہ کرنے کی ادنیٰ سی گنجایش بھی نہ رہے گی کہ شاید یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر بن گیا ہو، یا شاید اس کے بنانے میں ایک سے زیادہ خداؤں کا دخل ہو۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد اوّل، الانعام، حواشی ۲۵ تا ۲۷۔ جلد دوم، النحل، حواشی ۷ تا ۹۔ جلد سوم، الحج، حواشی ۵ تا ۹، المومنون، حواشی ۱۲ – ۱۳، الفرقان، حاشیہ ۶۹، الشعراء، حواشی ۵۷ – ۵۸، النمل، حاشیہ ۸۰، الروم، حواشی ۲۵ تا ۳۲، ۷۹۔ جلد چہارم، السجدہ، حواشی ۱۴ تا ۱۸، یٰسین آیات ۷۱ تا ۷۳، الزمر، آیت ۶، المومن، حواشی ۹۷ – ۹۸ – ۱۱۰)

۴ – رات اور دن کا یہ فرق و اختلاف اس اعتبار سے بھی نشانی ہے کہ دونوں پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں، اور اس اعتبار سے بھی کہ ایک روشن ہے اور دوسرا تاریک، اور اِس اعتبار سے بھی کہ ایک مدّت تک بڑی تدریج کے ساتھ دن چھوٹا اور رات بڑی ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ پھر ایک وقت جا کر دونوں برابر ہو جاتے ہیں، پھر بتدریج دن بڑا اور رات چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے، پھر ایک وقت جا کر دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ یہ مختلف قسم کے فرق و اختلاف جو رات اور دن میں پائے جاتے ہیں اور ان سے جو عظیم حکمتیں وابستہ ہیں، وہ اس بات کی صریح علامت ہیں کہ سورج اور زمین اور موجوداتِ زمین کا خالق ایک ہی ہے، اور اِن دونوں کُروں کو ایک ہی زبردست اقتدار نے قابو میں کر رکھا ہے، اور وہ کوئی اندھا بہرا بے حکمت اقتدار نہیں ہے، بلکہ ایسا حکیمانہ اقتدار ہے جس نے یہ اٹل حساب قائم کر کے اپنی زمین کو زندگی کی اُن بے شمار انواع کے لیے موزوں جگہ بنا دیا ہے جو نباتات، حیوانات اور انسان کی شکل میں اُس نے یہاں پیدا کی ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۶۵۔ جلد سوم، النمل، حاشیہ ۱۰۴، القصص، حاشیہ ۹۲۔ جلد چہارم، لقمان، آیت ۲۹، حاشیہ ۵۰ – ۵۱، یٰسین، آیت ۳۷، حاشیہ ۳۲)

اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۵﴾ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ
فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ وَیْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ
اَثِیْمٍ ﴿۷﴾ لا یَّسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَیْهِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ

بہت نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جنھیں ہم تمھارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ اب آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟[۶]

تباہی ہے ہر اُس جھوٹے بداعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں، اور وہ اُن کو سنتا ہے، پھر پُورے اِستکبار کے ساتھ اپنے کفر پر اِس طرح اَڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے

۵ – رزق سے مراد یہاں بارش ہے، جیسا کہ بعد کے فقرے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔

۶ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۷، الفرقان، حواشی ۶۲ تا ۶۵، الشعراء، حاشیہ ۵، النمل، حواشی ۷۳ – ۷۴، الروم، حواشی ۳۵ – ۴۷۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حواشی ۲۶ تا ۳۱۔

۷ – ہواؤں کی گردش سے مراد مختلف اوقات میں زمین کے مختلف حصوں پر اور مختلف بلندیوں پر مختلف ہوائیں چلنا ہے، جن سے موسموں کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ زمین کے اُوپر ایک وسیع کُرۂ ہوائی پایا جاتا ہے جس کے اندر وہ تمام عناصر موجود ہیں جو زندہ مخلوقات کو سانس لینے کے لیے درکار ہیں، اور ہوا کے اسی لحاف نے زمین کی آبادی کو بہت سی آفاتِ سماوی سے بچا رکھا ہے۔ اِس کے ساتھ دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ یہ ہوا محض بالائی فضا میں بھر کر نہیں رہ گئی ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے چلتی رہتی ہے۔ کبھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور کبھی گرم۔ کبھی بند ہو جاتی ہے اور کبھی چلنے لگتی ہے۔ کبھی ہلکی چلتی ہے تو کبھی تیز، اور کبھی آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی خشک ہوا چلتی ہے اور کبھی مرطوب۔ کبھی بارش لانے والی ہوا چلتی ہے اور کبھی اس کو اُڑا لے جانے والی چل پڑتی ہے۔ یہ طرح طرح کی ہوائیں کچھ یوں ہی اندھا دُھند نہیں چلتیں، بلکہ اِن کا ایک قانون اور ایک نظام ہے جو شہادت دیتا ہے کہ یہ انتظام کمال درجہ حکمت پر مبنی ہے اور اس سے بڑے بڑے اہم مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ پھر اس کا بڑا گہرا تعلق اُس سردی اور گرمی سے ہے جو زمین اور سورج کے درمیان بدلتی ہوئی مناسبتوں کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے، اور مزید برآں اس کا نہایت گہرا تعلق موسمی تغیُّرات اور بارشوں کی تقسیم سے بھی ہے۔ یہ ساری چیزیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کسی اندھی فطرت نے اتفاقاً یہ انتظامات نہیں کر دیے ہیں، نہ سورج اور زمین اور ہوا اور پانی اور نباتات اور حیوانات کے الگ الگ مدبّر ہیں، بلکہ لازماً ایک ہی خدا ان سب کا خالق ہے اور اسی کی حکمت نے ایک مقصدِ عظیم

لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۸﴾ وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا
اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹﴾ مِنْ وَّرَآئِهِمْ

اُن کو سُنا ہی نہیں۔[9] ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مُژدہ سُنا دو۔ ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ اُن کا مذاق بنالیتا ہے۔[10] ایسے سب لوگوں کے لیے ذلّت کا عذاب ہے۔ ان کے آگے

کے لیے یہ انتظام قائم کیا ہے، اور اسی کی قدرت سے یہ پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک مقرر قانون پر چل رہا ہے۔

۸ – یعنی جب اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت پر خود اللہ ہی کے بیان کیے ہوئے یہ دلائل سامنے آ جانے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اب کیا چیز ایسی آ سکتی ہے جس سے انھیں دولتِ ایمان نصیب ہو جائے۔ اللہ کا کلام تو وہ آخری چیز ہے جس کے ذریعے سے کوئی شخص یہ نعمت پا سکتا ہے۔ اور ایک اَن دیکھی حقیقت کا یقین دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو معقول دلائل ممکن ہیں، وہ اس کلام پاک میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی انکار ہی کرنے پر تُلا ہوا ہو تو انکار کرتا رہے۔ اس کے انکار سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔

۹ – بالفاظِ دیگر، فرق اور بہت بڑا فرق ہے اُس شخص میں جو نیک نیتی کے ساتھ اللہ کی آیات کو کھلے دل سے سنتا اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرتا ہے، اور اس شخص میں جو انکار کا پیشگی فیصلہ کر کے سنتا ہے اور کسی غور و فکر کے بغیر اپنے اسی فیصلے پر قائم رہتا ہے جو اِن آیات کو سننے سے پہلے وہ کر چکا تھا۔ پہلی قسم کا آدمی اگر آج اِن آیات کو سُن کر ایمان نہیں لا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کافر رہنا چاہتا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مزید اطمینان کا طالب ہے۔ اس لیے اگر اس کے ایمان لانے میں دیر بھی لگ رہی ہے تو یہ بات عین متوقع ہے کہ کل کوئی دوسری آیت اس کے دل میں اُتر جائے اور وہ مطمئن ہو کر مان لے۔ لیکن دوسری قسم کا آدمی کبھی کوئی آیت سُن کر بھی ایمان نہیں لا سکتا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی آیاتِ الٰہی کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکا ہے۔ اِس حالت میں بالعُموم وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جن کے اندر تین صفات موجود ہوتی ہیں: ایک، یہ کہ وہ جھوٹے ہوتے ہیں، اس لیے صداقت ان کو اپیل نہیں کرتی۔ دوسرے، یہ کہ وہ بدعمل ہوتے ہیں، اس لیے کسی ایسی تعلیم و ہدایت کو مان لینا انھیں سخت ناگوار ہوتا ہے جو ان پر اَخلاقی پابندیاں عائد کرتی ہو۔ تیسرے، یہ کہ وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں، ہمیں کوئی کیا سکھائے گا، اس لیے اللہ کی جو آیات انھیں سنائی جاتی ہیں، ان کو وہ سرے سے کسی غور و فکر کا مستحق ہی نہیں سمجھتے اور ان کے سننے کا حاصل بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو نہ سننے کا تھا۔

۱۰ – یعنی اُسی ایک آیت کا مذاق اُڑانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ تمام آیات کا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ مثلاً جب وہ سنتا ہے کہ قرآن میں فُلاں بات بیان ہوئی ہے تو اسے سیدھے معنیٰ میں لینے کے بجائے پہلے تو اسی میں کوئی ٹیڑھ تلاش کر کے نکال لاتا ہے تاکہ اسے مذاق کا موضوع بنائے، پھر اس کا مذاق اُڑانے کے بعد کہتا ہے: اجی ان کے کیا کہنے ہیں، وہ تو روز ایک سے ایک نرالی بات سنا رہے ہیں، دیکھو فُلاں آیت میں انھوں نے یہ دلچسپ بات کہی ہے، اور فُلاں آیت کے لطائف کا تو جواب

جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝١٠ هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ
ع ۱۱/۱۷ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝١١ ع اَللّٰهُ الَّذِيْ
سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝١٢ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

جہنّم ہے۔[11] جو کچھ بھی انھوں نے دنیا میں کمایا ہے، اس میں سے کوئی چیز اُن کے کسی کام نہ آئے گی، نہ اُن کے وہ سرپرست ہی اُن کے لیے کچھ کرسکیں گے جنھیں اللہ کو چھوڑ کر انھوں نے اپنا ولی بنا رکھا ہے۔[12] اُن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

یہ قرآن سراسر ہدایت ہے، اور اُن لوگوں کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا۔ ع

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخّر کیا، تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اُس میں چلیں[13] اور تم اس کا فضل تلاش کرو[14] اور شکرگزار ہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمھارے لیے

ہی نہیں ہے۔

۱۱ — اصل الفاظ ہیں: مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ۔ وراء کا لفظ عربی زبان میں ہر اس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو آدمی کی نظر سے اوجھل ہو، خواہ وہ آگے ہو یا پیچھے۔ اس لیے دوسرا ترجمہ ان الفاظ کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''ان کے پیچھے جہنّم ہے۔'' اگر پہلے معنٰی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بے خبر منہ اٹھائے اِس راہ پر دَوڑے جا رہے ہیں اور انھیں احساس نہیں ہے کہ آگے جہنم ہے جس میں وہ جا کر گرنے والے ہیں۔ دوسرے معنٰی لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ آخرت سے بے فکر ہو کر اپنی اِس شرارت میں مشغول ہیں، اور انھیں پتا نہیں ہے کہ جہنّم ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

۱۲ — یہاں ولی کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے: ایک، وہ دیویاں اور دیوتا اور زندہ یا مُردہ پیشوا جن کے متعلق مشرکین نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو شخص اُن کا مُتوسّل ہو، وہ خواہ دنیا میں کچھ ہی کرتا رہے، خدا کے ہاں اس کی پکڑ نہ ہوسکے گی، کیونکہ اُن کی مداخلت اُسے خدا کے غضب سے بچالے گی۔ دوسرے، وہ سردار اور لیڈر اور امرا و حُکّام جنھیں خدا سے بے نیاز ہو کر لوگ اپنا رہنما اور مُطاع بناتے ہیں، اور آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کرتے ہیں، اور انھیں خوش کرنے کے لیے خدا کو ناخوش کرنے میں تامّل نہیں کرتے۔

جَمِیۡعًا مِّنۡهُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۱۳﴾ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا یَغۡفِرُوۡا لِلَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجۡزِیَ قَوۡمًۢا بِمَا
كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَ مَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡهَا ۫

مسخّر کر دیا[15]، سب کچھ اپنے پاس سے[16]——اِس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔[17]

اَے نبیؐ! ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے بُرے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے[18]، اُن کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں، تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔[19] جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا، اور جو بُرائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔

یہ آیت ایسے سب لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ جب اس رَوِش کے نتیجے میں جہنم سے ان کو سابقہ پیش آئے گا تو ان دونوں قسم کے سرپرستوں میں سے کوئی بھی انھیں بچانے کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ الشُّوریٰ، حاشیہ ٦)

۱۳ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۸۳۔ جلد سوم، الروم، حاشیہ ۶۹۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۵۵، المومن، حاشیہ ۱۱۰، الشُّوریٰ، حاشیہ ۵۴۔

۱۴ — یعنی سمندر میں تجارت، ماہی گیری، غَوّاصی، جہاز رانی اور دوسرے ذرائع سے رزقِ حلال حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

۱۵ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۴۴۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۳۵۔

۱۶ — اس فقرے کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ اللہ کا یہ عَطِیّہ دنیا کے بادشاہوں کا سا عَطِیّہ نہیں ہے جو رعیّت سے حاصل کیا ہوا مال رعیّت ہی میں سے کچھ لوگوں کو بخش دیتے ہیں، بلکہ کائنات کی یہ ساری نعمتیں اللہ کی اپنی پیدا کردہ ہیں اور اس نے اپنی طرف سے یہ انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ دوسرے، یہ کہ نہ ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں کوئی اللہ کا شریک، نہ انھیں انسان کے لیے مسخّر کرنے میں کسی اور ہستی کا کوئی دخل، تنہا اللہ ہی اُن کا خالق بھی ہے اور اسی نے اپنی طرف سے وہ انسان کو عطا کی ہیں۔

۱۷ — یعنی اِس تسخیر میں اور ان چیزوں کو انسان کے لیے نافع بنانے میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ نشانیاں اِس حقیقت کی طرف کھلا کھلا اشارہ کر رہی ہیں کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک کائنات کی تمام اشیا اور قوتوں کا خالق و مالک اور مدبّر و منتظم ایک ہی خدا ہے جس نے اُن کو ایک قانون کا تابع بنا رکھا ہے۔ اور وہی خدا انسان کا رب ہے جس نے اپنی قدرت اور حکمت اور رحمت سے اِن تمام اشیا اور قوتوں کو انسان کی زندگی، اس کی معیشت، اس کی آسایش، اس کی

ترقی اور اس کی تہذیب و تمدن کے لیے ساز گار و مددگار بنایا ہے۔ اور تنہا وہی خدا انسان کی عُبودیّت اور شکر گزاری اور نیاز مندی کا مستحق ہے، نہ کہ کچھ دوسری ہستیاں جن کا نہ ان اشیا اور قوتوں کے پیدا کرنے میں کوئی حصہ، نہ انھیں انسان کے لیے مسخّر کرنے اور نافع بنانے میں کوئی دخل۔

۱۸ – اصل الفاظ ہیں: الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "جو لوگ اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے۔" لیکن عربی محاورے میں ایسے مواقع پر ایّام سے مراد محض دن نہیں بلکہ وہ یادگار دن ہوتے ہیں جن میں اہم تاریخی واقعات پیش آئے ہوں۔ مثلاً ایّام العرب کا لفظ تاریخ عرب کے اہم واقعات اور قبائلِ عرب کی اُن بڑی بڑی لڑائیوں کے لیے بولا جاتا ہے جنھیں بعد کی نسلیں صدیوں تک یاد کرتی رہی ہیں۔ یہاں ایام اللہ سے مراد کسی قوم کے وہ بُرے دن ہیں جب اللہ کا غضب اس پر ٹوٹ پڑے اور اپنے کرتوتوں کی پاداش میں وہ تباہ کر کے رکھ دی جائے۔ اِسی معنیٰ کے لحاظ سے ہم نے اس فقرے کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "جو لوگ اللہ کی طرف سے بُرے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے"، یعنی جن کو یہ خیال نہیں ہے کہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہمارے اِن افعال پر ہماری شامت آئے گی، اور اسی غفلت نے اُن کو ظلم و ستم پر دلیر کر دیا ہے۔

۱۹ – مفسرین نے اس آیت کے دو مطلب بیان کیے ہیں، اور آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجایش ہے۔

ایک یہ کہ اہلِ ایمان اِس ظالم گروہ کی زیادتیوں پر درگزر سے کام لیں، تاکہ اللہ اُن کو اپنی طرف سے اُن کے صبر و حلم اور ان کی شرافت کی جزا دے اور راہِ خدا میں جو اذیّتیں انھوں نے برداشت کی ہیں ان کا اجر عطا فرمائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اس گروہ سے درگزر کریں، تاکہ اللہ خود اس کی زیادتیوں کا بدلہ اُسے دے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اُس وقت تک تھا جب تک مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ پھر جب اس کی اجازت آگئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسخ کا یہ دعویٰ دُرست نہیں ہے۔ "درگزر" کا لفظ اس معنیٰ میں کبھی نہیں بولا جاتا کہ جب آدمی کسی کی زیادتیوں کا بدلہ لینے پر قادر نہ ہو تو اس سے درگزر کرے، بلکہ اس موقع پر صبر، تحمّل اور برداشت کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو چھوڑ کر جب یہاں درگزر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اہلِ ایمان انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود ان لوگوں کی زیادتیوں کا جواب دینے سے پرہیز کریں جنھیں خدا سے بے خوفی نے اَخلاق و آدمیت کی حدیں توڑ ڈالنے پر جری کر دیا ہے۔ اِس حکم کا کوئی تعارُض اُن آیات سے نہیں ہے جن میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ جنگ کی اجازت کا تعلق اُس حالت سے ہے جب مسلمانوں کی حکومت کسی کافر قوم کے خلاف باقاعدہ کارروائی کرنے کی کوئی معقول وجہ پائے۔ اور عَفو و درگزر کا حکم اُن عام حالات کے لیے ہے جن میں اہلِ ایمان کو خدا سے بے خوف لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے سابقہ پیش آئے اور وہ انھیں اپنی زبان و قلم اور اپنے برتاؤ سے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ اس حکم کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اپنے مَقامِ بلند سے نیچے اُتر کر اُن پست اَخلاق لوگوں سے اُلجھنے اور جھگڑنے اور ان کی ہر بے ہودگی کا جواب دینے پر نہ اُتر آئیں۔ جب تک شرافت اور معقولیت کے ساتھ کسی الزام یا اعتراض کا جواب دینا یا کسی زیادتی کی مُدافعت کرنا ممکن ہو، اس سے پرہیز نہ کیا جائے۔ مگر جہاں بات اِن حُدود سے گزرتی نظر آئے، وہاں چپ سادھ لی جائے اور معاملہ اللہ کے سُپرد کر دیا جائے۔ مسلمان ان سے خود اُلجھیں گے تو اللہ اُن سے

ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۵﴾ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ وَ
الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ وَ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلَی
الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۚ۱۶﴾ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ
بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ
یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی
شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡہَا وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَ الَّذِیۡنَ

پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے۔

اِس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب اور حکم[۲۰] اور نبوت عطا کی تھی۔ اُن کو ہم نے عمدہ سامانِ زیست سے نوازا، دنیا بھر کے لوگوں پر انھیں فضیلت عطا[۲۱] کی، اور دین کے معاملے میں انھیں واضح ہدایات دے دیں۔ پھر جو اختلاف اُن کے درمیان رونما ہوا، وہ (ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ) علم آ جانے کے بعد ہوا، اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے[۲۲]۔ اللہ قیامت کے روز اُن معاملات کا فیصلہ فرما دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد اب اے نبیؐ! ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے[۲۳]۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور اُن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو

نمٹنے کے لیے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے گا۔ درگزر سے کام لیں گے تو اللہ خود ظالموں سے نمٹے گا اور مظلوموں کو ان کے تحمّل کا اجر عطا فرمائے گا۔

۲۰ – حکم سے مراد تین چیزیں ہیں: ایک، کتاب کا علم و فہم اور دین کی سمجھ۔ دوسرے، کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت۔ تیسرے، معاملات میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت۔

۲۱ – یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کر دی، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اُس زمانے میں دنیا کی تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لیے چُن لیا تھا کہ وہ کتاب اللہ کے حامل ہوں اور خدا پرستی کے علَم بردار بن کر اٹھیں۔

۲۲ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۳۰، آلِ عمران، حواشی ۱۷-۱۸۔ جلد چہارم، الشُّوریٰ، حواشی ۲۲-۲۳۔

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ
وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا
السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً
ع ۲ ۱۸ مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمھارے کچھ بھی کام نہیں آ سکتے[۲۴]۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لیے، اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں[۲۵]۔

کیا[۲۶] وہ لوگ جنھوں نے بُرائیوں کا ارتکاب کیا ہے، یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انھیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں[۲۷]۔ اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے[۲۸]، اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفّس کو اُس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا[۲۹]۔

---

۲۳ – مطلب یہ ہے کہ جو کام پہلے بنی اسرائیل کے سُپرد کیا گیا تھا وہ اب تمھارے سپرد کیا گیا ہے۔ انھوں نے علم پانے کے باوجود اپنی نفسانفسی سے دین میں ایسے اختلافات برپا کیے، اور آپس میں ایسی گروہ بندیاں کر ڈالیں جن سے وہ اس قابل نہ رہے کہ دنیا کو خدا کے راستے پر بلا سکیں۔ اب اُسی دین کی صاف شاہراہ پر تمھیں کھڑا کیا گیا ہے تا کہ تم وہ خدمت انجام دو جسے بنی اسرائیل چھوڑ بھی چکے ہیں اور ادا کرنے کے اہل بھی نہیں رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد چہارم، الشُّوریٰ، آیات ۱۳ تا ۱۵، مع حواشی ۲۰ تا ۲۶)

۲۴ – یعنی اگر تم انھیں راضی کرنے کے لیے اللہ کے دین میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرو گے تو اللہ کے مواخذے سے وہ تمھیں نہ بچا سکیں گے۔

۲۵ – مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اور یہ شریعت دنیا کے تمام انسانوں کے لیے وہ روشنی پیش کرتی ہے

اور باطل کا فرق نمایاں کرنے والی ہے۔ مگر اس سے ہدایت وہی لوگ پاتے ہیں جو اس کی صداقت پر یقین لائیں، اور انھی کے حق میں یہ رحمت ہے۔

۲۶ – توحید کی دعوت کے بعد اب یہاں سے آخرت پر کلام شروع ہو رہا ہے۔

۲۷ – یہ آخرت کے برحق ہونے پر اَخلاقی اِستِدلال ہے۔ اَخلاق میں خیر و شر اور اعمال میں نیکی و بدی کے فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو، بلکہ اچھوں کو ان کی اچھّائی کا اچھا بدلہ ملے، اور بُرے اپنی برائی کا بُرا بدلہ پائیں۔ یہ بات اگر نہ ہو، اور نیکی و بدی کا نتیجہ ایک ہی جیسا ہو، تو سرے سے اخلاق میں خوبی و زِشتی کی تمیز ہی بے معنٰی ہو جاتی ہے اور خدا پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں بدی کی راہ چلتے ہیں، وہ تو ضرور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی جزا و سزا نہ ہو، کیونکہ یہ تصور ہی ان کے عیش کو مُنَغَّص کر دینے والا ہے۔ لیکن خداوندِ عالَم کی حکمت اور اس کے عدل سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ نیک و بد سے ایک جیسا معاملہ کرے اور کچھ نہ دیکھے کہ مومنِ صالح نے دنیا میں کس طرح زندگی بسر کی ہے اور کافر و فاسق یہاں کیا گُل کھلاتا رہا ہے۔ ایک شخص عمر بھر اپنے اُوپر اَخلاق کی پابندیاں لگائے رہا، حق والوں کے حق ادا کرتا رہا، ناجائز فائدوں اور لذّتوں سے اپنے آپ کو محروم کیے رہا، اور حق و صداقت کی خاطر طرح طرح کے نقصانات برداشت کرتا رہا۔ دوسرے شخص نے اپنی خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کیں، نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ بندوں کے حقوق پر دست درازی کرنے سے باز آیا، جس طرح سے بھی اپنے لیے فائدے اور لذتیں سمیٹ سکتا تھا، سمیٹتا چلا گیا۔ کیا خدا سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ان دونوں قسم کے آدمیوں کی زندگی کے اس فرق کو وہ نظر انداز کر دے گا؟ مرتے دم تک جن کا جینا یکساں نہیں رہا ہے، موت کے بعد اگر ان کا انجام یکساں ہو تو خدا کی خدائی میں اس سے بڑھ کر اور کیا بے انصافی ہو سکتی ہے؟ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونُس، حواشی ۹ – ۱۰، ہود، حاشیہ ۱۰۶، النحل، حاشیہ ۳۵۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹، النمل، حاشیہ ۸۶، الروم، حواشی ۶ تا ۸۔ جلد چہارم، سورۂ صٓ، آیت ۲۸، حاشیہ ۳۰)

۲۸ – یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کی تخلیق کھیل کے طور پر نہیں کی ہے، بلکہ یہ ایک بامقصد حکیمانہ نظام ہے۔ اس نظام میں یہ بات بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات اور ذرائع و وسائل کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے جن لوگوں نے اچھا کارنامہ انجام دیا ہو، اور انھیں غلط طریقے سے استعمال کر کے جن دوسرے لوگوں نے ظلم و فساد برپا کیا ہو، یہ دونوں قسم کے انسان آخرِ کار مر کر مٹی ہو جائیں اور اس موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں انصاف کے مطابق ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ نکلے۔ اگر ایسا ہو تو یہ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھلونا ہوگی، نہ کہ ایک حکیم کا بنایا ہوا بامقصد نظام۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الأنعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۱۱، ابراہیم، حاشیہ ۲۶، النحل، حاشیہ ۶۔ جلد سوم، العنکبوت، حاشیہ ۷۵، الروم، حاشیہ ۶)

۲۹ – اس سِیاق و سَباق میں اِس فقرے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر نیک انسانوں کو ان کی نیکی کا اجر نہ ملے، اور ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا نہ دی جائے، اور مظلوموں کی کبھی دادرسی نہ ہو تو یہ ظلم ہوگا۔ خدا کی خدائی میں ایسا ظلم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح خدا کے ہاں ظلم کی یہ دوسری صورت بھی کبھی رُونما نہیں ہو سکتی کہ کسی نیک انسان کو اس کے استحقاق سے کم اجر دیا جائے،

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ

پھر کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا[۳۰]، اور اللہ نے علم کے باوجود[۳۱] اُسے گمراہی میں پھینک دیا اور اُس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا[۳۲]؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اُسے ہدایت دے؟

یا کسی بدانسان کو اس کے استحقاق سے زیادہ سزا دے دی جائے۔

۳۰۔ خواہشِ نفس کو خدا بنا لینے سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہش کا بندہ بن کر رہ جائے۔ جس کام کو اس کا دل چاہے اسے کر گزرے، خواہ خدا نے اسے حرام کیا ہو، اور جس کام کو اس کا دل نہ چاہے اسے نہ کرے، خواہ خدا نے اسے فرض کر دیا ہو۔ جب آدمی اِس طرح کسی کی اطاعت کرنے لگے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اس کا معبُود خدا نہیں ہے بلکہ وہ ہے جس کی وہ اس طرح اطاعت کر رہا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ زبان سے اس کو اپنا الٰہ اور معبُود کہتا ہو یا نہ کہتا ہو، اور اس کا بُت بنا کر اس کی پوجا کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ اس لیے کہ ایسی بے چُون وچَرا اطاعت ہی اُس کے معبُود بن جانے کے لیے کافی ہے، اور اس عملی شرک کے بعد ایک آدمی صرف اِس بنا پر شرک کے جرم سے بَری نہیں ہوسکتا کہ اس نے اپنے اس مُطاع کو زبان سے معبُود نہیں کہا ہے اور سجدہ اس کو نہیں کیا ہے۔ اِس آیت کی یہی تشریح دوسرے اکابر مفسرین نے بھی کی ہے۔ ابنِ جَریرؒ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”اس نے اپنی خواہشِ نفس کو معبُود بنا لیا۔ جس چیز کی نفس نے خواہش کی، اس کا ارتکاب کر گزرا۔ نہ اللہ کے حرام کیے ہوئے کو حرام کیا، نہ اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال کیا۔“ ابوبکر جَصّاصؒ اس کے معنٰی یہ بیان کرتے ہیں کہ ”وہ خواہشِ نفس کی اس طرح اطاعت کرتا ہے جیسے کوئی خدا کی اطاعت کرے۔“ زَمَخشَریؒ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ ”وہ خواہشِ نفس کا نہایت فرماں بردار ہے۔ جدھر اس کا نفس اسے بلاتا ہے اسی طرف وہ چلا جاتا ہے، گویا کہ وہ اس کی بندگی اس طرح کرتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے خدا کی بندگی کرے۔“ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۵۶۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ سَبا، حاشیہ ۶۳، یٰسٓ، حاشیہ ۵۳، الشوریٰ، حاشیہ ۳۸)

۳۱۔ اصل الفاظ ہیں: اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ ایک مطلب ان الفاظ کا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ شخص عالم ہونے کے باوجود اللہ کی طرف سے گمراہی میں پھینکا گیا، کیونکہ وہ خواہشِ نفس کا بندہ بن گیا تھا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ نے اپنے اِس علم کی بنا پر کہ وہ اپنے نفس کی خواہش کو اپنا خدا بنا بیٹھا ہے، اسے گمراہی میں پھینک دیا۔

۳۲۔ اللہ کے کسی کو گمراہی میں پھینک دینے اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دینے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دینے کی تشریح اس سے پہلے ہم متعدّد مقامات پر اس کتاب میں کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۰-۱۶، الانعام، حواشی ۱۷-۲۷۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸۰، التوبہ، حواشی ۸۹-۹۳، یونُس، حاشیہ ۱۷، الرعد، حاشیہ ۴۴، ابراہیم، حواشی ۶-۷-۴۰،

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا
وَ مَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا
یَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ

کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے ۳۳؟

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ''زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے، اور گردشِ ایّام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔'' درحقیقت اِس معاملے میں اِن کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں ۳۴۔ اور جب ہماری واضح آیات انھیں سنائی جاتی ہیں ۳۵ تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا

النحل، حاشیہ ۱۱۰، بنی اسرائیل، حاشیہ ۵۱۔ جلد سوم، الروم، حاشیہ ۸۴۔ جلد چہارم، فاطر، آیت ۸، حواشی ۱۶-۱۷، المومن، حاشیہ ۵۴۔

۳۳ — جس سیاق وسباق میں یہ آیت آئی ہے اُس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ آخرت کا انکار دراصل وہی لوگ کرتے ہیں جو خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں اور عقیدۂ آخرت کو اپنی اِس آزادی میں مانع سمجھتے ہیں۔ پھر جب وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں تو ان کی بندگیِ نفس اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے اور وہ اپنی گمراہی میں روز بروز زیادہ ہی بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی برائی ایسی نہیں ہوتی جس کے ارتکاب سے وہ باز رہ جائیں۔ کسی کا حق مارنے میں انھیں تأمّل نہیں ہوتا۔ کسی ظلم اور زیادتی کا موقع پا جانے کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے صرف اس لیے رُک جائیں گے کہ حق وانصاف کا کوئی احترام ان کے دلوں میں ہے۔ جن واقعات کو دیکھ کر کوئی انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے، وہی واقعات اُن کی آنکھوں کے سامنے بھی آتے ہیں، مگر وہ اُن سے اُلٹا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں اور ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی کلمۂ نصیحت ان پر کارگر نہیں ہوتا۔ جو دلیل بھی کسی انسان کو برائی سے روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے، وہ ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی، بلکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساری دلیلیں اپنی اِسی بے قید آزادی کے حق میں نکالتے چلے جاتے ہیں، اور ان کے دل و دماغ کسی اچھی فکر کے بجائے شب و روز اپنی اغراض وخواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کرنے کی اُدھیڑ بُن ہی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ عقیدۂ آخرت کا انکار انسانی اَخلاق کے لیے تباہ کن ہے۔ آدمی کو آدمیت کے دائرے میں اگر کوئی چیز رکھ سکتی ہے تو وہ صرف یہ احساس ہے کہ ہم غیر ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عالم بھی ہو تو وہ جانوروں سے بدتر رَوِیّہ اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔

۳۴ — یعنی کوئی ذریعۂ علم ایسا نہیں ہے جس سے ان کو تحقیق یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس زندگی کے بعد انسان کے لیے کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، اور یہ بات بھی انھیں معلوم ہو گئی ہو کہ انسان کی روح کسی خدا کے حکم سے قبض نہیں کی جاتی ہے بلکہ آدمی محض گردشِ ایام سے مر کر فنا ہو جاتا ہے۔ منکرینِ آخرت یہ باتیں کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ محض گمان کی بنا پر کرتے ہیں۔ علمی حیثیت سے

إِلَّآ أَنْ قَالُوا ائْتُوا بِاٰبَآئِنَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ
ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ

نہیں ہوتی کہ اُٹھالاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچّے ہو[۳۶]۔ اَے نبیؐ! اِن سے کہو: اللہ ہی تمھیں زندگی بخشتا ہے، پھر وہی تمھیں موت دیتا ہے[۳۷]، پھر وہی تم کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں

اگر وہ بات کریں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں"، لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم جانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔" اسی طرح علمی طریقے پر وہ یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آدمی کی روح خدا کے حکم سے نکالی نہیں جاتی ہے، بلکہ وہ محض اُس طرح مر کر ختم ہو جاتا ہے جیسے ایک گھڑی چلتے چلتے رک جائے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان دونوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ فی الواقع کیا صورت پیش آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انسانی ذرائعِ علم کی حد تک زندگی بعدِ موت کے ہونے یا نہ ہونے، اور قبضِ رُوح واقع ہونے یا گردشِ ایّام سے آپ ہی آپ مر جانے کا یکساں احتمال ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ امکانِ آخرت کے احتمال کو چھوڑ کر حتمی طور پر انکارِ آخرت کے حق میں فیصلہ کر ڈالتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور ہے کہ دراصل اس مسئلے کا آخری فیصلہ وہ دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی خواہش کی بنا پر کرتے ہیں؟ چونکہ ان کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہو اور موت کی حقیقت نیستی اور عَدَم نہیں بلکہ خدا کی طرف سے قبضِ روح ہو، اس لیے وہ اپنے دل کی مانگ کو اپنا عقیدہ بنا لیتے ہیں اور دوسری بات کا انکار کر دیتے ہیں۔

۳۵ – یعنی وہ آیات جن میں آخرت کے امکان پر مضبوط عقلی دلائل دیے گئے ہیں، اور جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُس کا ہونا عین حکمت و انصاف کا تقاضا ہے اور اس کے نہ ہونے سے یہ سارا نظامِ عالَم بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔

۳۶ – دوسرے الفاظ میں اُن کی اس حجت کا مطلب یہ تھا کہ جب کوئی اُن سے یہ کہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہو گی تو اسے لازماً قبر سے ایک مُردہ اُٹھا کر ان کے سامنے لے آنا چاہیے۔ اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو وہ یہ نہیں مان سکتے کہ مرے ہوئے انسان کسی وقت از سرِ نَو زندہ کر کے اُٹھائے جانے والے ہیں۔ حالانکہ یہ بات سرے سے کسی نے بھی ان سے نہیں کہی تھی کہ اِس دنیا میں متفرق طور پر وقتاً فوقتاً مُردوں کو دوبارہ زندہ کیا جاتا رہے گا۔ بلکہ جو کچھ کہا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ قیامت کے بعد اللہ تعالیٰ بیک وقت تمام انسانوں کو از سرِ نَو زندہ کرے گا اور ان سب کے اعمال کا محاسبہ کر کے جزا اور سزا کا فیصلہ فرمائے گا۔

۳۷ – یہ جواب ہے اُن کی اس بات کا کہ موت گردشِ ایّام سے آپ ہی آپ آجاتی ہے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ نہ تمھیں زندگی اتفاقاً ملتی ہے، نہ تمھاری موت خود بخود واقع ہو جاتی ہے۔ ایک خدا ہے جو تمھیں زندگی دیتا ہے اور وہی اسے سلب کرتا ہے۔

ع ۳ ۵ ۱۹

فِیْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ
وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ
جَاثِیَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُدْخِلُهُمْ

کوئی شک نہیں[۳۸]، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۳۹] ع زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے[۴۰]، اور جس روز قیامت کی گھڑی آ کھڑی ہوگی، اُس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔

اُس وقت تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے[۴۱]۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامۂ اعمال دیکھے۔ اُن سے کہا جائے گا: "آج تم لوگوں کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے تھے۔ یہ ہمارا تیار کرایا ہوا اعمال نامہ ہے جو تمھارے اُوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے، جو کچھ بھی تم کرتے تھے اُسے ہم لکھواتے جا رہے تھے[۴۲]۔" پھر جو لوگ ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے، انھیں ان کا

---

۳۸ - یہ جواب ہے ان کی اس بات کا کہ اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ اب نہیں ہوگا، اور متفرق طور پر نہیں ہوگا، بلکہ ایک دن سب انسانوں کے جمع کرنے کے لیے مقرر ہے۔

۳۹ - یعنی جہالت اور قصورِ فکر و نظر ہی لوگوں کے انکارِ آخرت کا اصل سبب ہے، ورنہ حقیقت میں تو آخرت کا ہونا نہیں بلکہ اس کا نہ ہونا بعید از عقل ہے۔ کائنات کے نظام اور خود اپنے وجود پر کوئی شخص صحیح طریقے سے غور کرے تو اسے خود محسوس ہو جائے گا کہ آخرت کے آنے میں کسی شک کی گنجایش نہیں۔

۴۰ - سیاق و سباق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس فقرے سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جو خدا اس عظیم الشان کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے، اس کی قدرت سے یہ بات ہرگز بعید نہیں ہے کہ جن انسانوں کو وہ پہلے پیدا کر چکا ہے انھیں دوبارہ وجود میں لے آئے۔

۴۱ - یعنی وہاں میدانِ حشر کا ایسا ہَول اور عدالتِ الٰہی کا ایسا رعب طاری ہوگا کہ بڑے بڑے ہیکڑ لوگوں کی اکڑ بھی ختم ہو جائے گی اور عاجزی کے ساتھ سب گھٹنوں کے بَل گرے ہوں گے۔

۴۲ - لکھوانے کی صرف یہی ایک ممکن صورت نہیں ہے کہ کاغذ پر قلم سے لکھوایا جائے۔ انسانی اقوال و افعال کو

رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۱ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ
فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ
بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝۳۲ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ

رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا، اور یہی صریح کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اُن سے کہا جائے گا: ”کیا میری آیات تم کو نہیں سُنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبّر کیا[۴۳] اور مجرم بن کر رہے۔ اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں[۴۴] ہے۔“ اُس وقت اُن پر ان کے اعمال کی بُرائیاں کھل[۴۵] جائیں گی اور وہ اُسی چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ

ثبت کرنے اور دوبارہ اُن کو بعینہٖ اسی شکل میں پیش کر دینے کی متعدّد دوسری صورتیں اِسی دنیا میں خود انسان دریافت کر چکا ہے، اور ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آگے اس کے اور کیا امکانات پوشیدہ ہیں جو کبھی انسان ہی کی گرفت میں آجائیں گے۔ اب یہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی ایک ایک بات، اور اس کی حرکات و سکنات میں سے ایک ایک چیز، اور اس کی نیتوں اور ارادوں اور خواہشات اور خیالات میں سے ہر مخفی سے مخفی شے کو ثبت کرا رہا ہے، اور کس طرح وہ ہر آدمی، ہر گروہ اور ہر قوم کا پورا کارنامۂ حیات بے کم و کاست اس کے سامنے لا رکھے گا۔

۴۳ - یعنی اپنے گھمنڈ میں تم نے یہ سمجھا کہ اللہ کی آیات کو مان کر مطیع فرمان بن جانا تمھاری شان سے فروتر ہے، اور تمھارا مقام بندگی کے مقام سے بہت اونچا ہے۔

۴۴ - اس سے پہلے آیت ۲۴ میں جن لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے وہ آخرت کا قطعی اور کُھلا انکار کرنے والے تھے۔ اور یہاں اُن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اس کا یقین نہیں رکھتے، اگرچہ گمان کی حد تک اس کے امکان سے منکر نہیں ہیں۔ بظاہر ان دونوں گروہوں میں اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ ایک بالکل منکر ہے اور دوسرا اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے۔ لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار اور اس پر یقین نہ ہونے کے اَخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کے

يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ
هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ
اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا
يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ
السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ
فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٧﴾ ع

مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ ”آج ہم بھی اُسی طرح تمھیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔ تمھارا ٹھکانا اب دوزخ ہے اور کوئی تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تمھارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنا لیا تھا اور تمھیں دُنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو۔“[۴۶]

پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک اور سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ زمین اور آسمانوں میں بڑائی اُسی کے لیے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے۔ ع

احساس سے خالی ہوگا، اور یہ عدمِ احساس اس کو لازماً فکر و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا کر کے رہے گا۔ صرف آخرت کا یقین ہی دنیا میں آدمی کے رَوِیّے کو دُرست رکھ سکتا ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو شک اور انکار، دونوں اُسے ایک ہی طرح کی غیر ذمہ دارانہ رَوِش پر ڈال دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہی غیر ذمّہ دارانہ رَوِش آخرت کی بدانجامی کا اصل سبب ہے، اس لیے دوزخ میں جانے سے نہ انکار کرنے والا بچ سکتا ہے، نہ یقین نہ رکھنے والا۔

۴۵ – یعنی وہاں ان کو پتا چل جائے گا کہ اپنے جن طور طریقوں اور عادات و خصائل اور اعمال و مشاغل کو وہ دنیا میں بہت خوب سمجھتے تھے، وہ سب ناخوب تھے۔ اپنے آپ کو غیر جواب دِہ فرض کر کے انھوں نے ایسی بنیادی غَلَطی کر ڈالی جس کی وجہ سے ان کا پورا کارنامۂ حیات ہی غلط ہو کر رہ گیا۔

۴۶ – یہ آخری فقرہ اس انداز میں ہے جیسے کوئی آقا اپنے کچھ خادموں کو ڈانٹنے کے بعد دوسروں سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اچھا، اب اِن نالائقوں کی یہ سزا ہے۔

تفہیم القرآن

الاحقاف

(۴۶)

الاحقاف

نام آیت ۲۱ کے فقرے اِذۡ اَنۡذَرَ قَوۡمَهٗ بِالۡاَحۡقَافِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نُزُول ایک تاریخی واقعے سے متعین ہو جاتا ہے جس کا ذکر آیات ۲۹-۳۲ میں آیا ہے۔ ان آیات میں جِنّوں کے آنے اور قرآن سُن کر واپس جانے کا جو واقعہ بیان ہوا ہے، وہ حدیث و سیرت کی مُتَّفَق عَلَیہ رِوایات کی رو سے اُس وقت پیش آیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکۂ معظّمہ کی طرف پلٹتے ہوئے نَخلہ کے مَقام پر ٹھیرے تھے، اور تمام معتبر تاریخی رِوایات کے مطابق آپؐ کے طائف تشریف لے جانے کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے کا ہے، لٰہذا یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہ سورت ۱۰ نبوی کے آخر، یا ۱۱ نبوی کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی۔

تاریخی پَس منظر ۱۰ نبوی حضوؐر کی حیاتِ طیّبہ میں انتہائی سختی کا سال تھا۔ تین برس سے قریش کے تمام قبیلوں نے مل کر بنی ہاشم اور مسلمانوں کا مکمل مُقاطَعہ کر رکھا تھا، اور حضوؐر اپنے خاندان اور اپنے اصحاب کے ساتھ شِعْبِ ابی طالب[1] میں محصور تھے۔ قریش کے لوگوں نے ہر طرف سے اِس محلے کی ناکابندی کر رکھی تھی جس سے گزر کر کسی قسم کی رسد اندر نہ پہنچ سکتی تھی۔ صرف حج کے زمانے میں یہ محصورین نکل کر کچھ خریداری کر سکتے تھے، مگر ابولہب جب بھی ان میں سے کسی کو بازار کی طرف، یا کسی تجارتی قافلے کی طرف جاتے دیکھتا، پکار کر تاجروں سے کہہ دیتا کہ جو چیز یہ خریدنا چاہیں اس کی قیمت اتنی زیادہ بتاؤ کہ یہ نہ خرید سکیں، پھر وہ چیز میں تم سے خریدلوں گا اور تمھارا نقصان نہ ہونے دوں گا۔ متواتر تین سال کے اس مُقاطَعے نے مسلمانوں اور بنی ہاشم کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی، اور ان پر ایسے ایسے سخت وقت گزر گئے تھے جن میں بسا اوقات گھاس اور پتّے کھانے کی نوبت آجاتی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ محاصرہ اِس سال ٹوٹا ہی تھا کہ حضوؐر کے چچا ابو طالب، جو دس سال سے آپؐ کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے، وفات پا گئے، اور اس سانحے پر بمشکل ایک مہینا گزرا تھا کہ آپؐ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ بھی انتقال فرما گئیں، جن کی ذات آغازِ نبوت سے لے کر اس وقت تک آپؐ کے لیے وجہِ سُکون وتسلّی بنی رہی تھی۔ ان پے در پے صدموں اور تکلیفوں کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِس سال کو عام الحُزن

---

[1] شِعْبِ ابی طالب مکۂ معظّمہ کے ایک محلے کا نام تھا جس میں بنی ہاشم رہا کرتے تھے۔ شِعْب عَرَبی زبان میں گھاٹی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ محلّہ کوہِ ابوقُبَیس کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں واقع تھا، اور ابو طالب بنی ہاشم کے سردار تھے، اس لیے اسے شِعْبِ ابی طالب کہا جاتا تھا۔ مکۂ معظّمہ میں جو مکان آج مَقامی رِوایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مَقامِ پیدایش کی حیثیت سے معروف ہے، اسی کے قریب یہ گھاٹی واقع تھی۔ اب اسے شِعْبِ علی یا شِعْبِ بنی ہاشم کہتے ہیں۔

(رنج وغم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے بعد کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اور زیادہ دلیر ہو گئے۔ پہلے سے زیادہ آپؐ کو تنگ کرنے لگے۔ حتّٰی کہ آپؐ کا گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو گیا۔ اسی زمانے کا یہ واقعہ ابنِ ہِشَام نے بیان کیا ہے کہ ایک روز قریش کے اوباشوں میں سے ایک شخص نے سرِ بازار آپؐ کے سر پر مٹی پھینک دی۔

آخرِ کار آپؐ اس ارادے سے طائف تشریف لے گئے کہ بنی ثَقِیف کو اسلام کی طرف دعوت دیں، اور اگر وہ اسلام نہ قبول کریں تو انھیں کم از کم اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ آپؐ کو اپنے ہاں چین سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع دے دیں۔ آپؐ کو اُس وقت کوئی سواری تک میسر نہ تھی۔ مکہ سے طائف تک کا سارا سفر آپؐ نے پیدل طے کیا۔ بعض رِوایات کی رُو سے آپؐ تنہا تشریف لے گئے تھے، اور بعض رِوایات کے مطابق آپؐ کے ساتھ صرف حضرت زیدؓ بن حارِثہ تھے۔ وہاں پہنچ کر چند روز آپؐ نے قیام کیا اور ثَقِیف کے سرداروں اور معزّزین میں سے ایک ایک کے پاس جا کر بات کی۔ مگر اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کی کوئی بات نہ مانی، بلکہ آپؐ کو صاف صاف نوٹس دے دیا کہ ان کے شہر سے نکل جائیں، کیونکہ ان کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں آپؐ کی تبلیغ ان کے نوجوانوں کو "بگاڑ" نہ دے۔ مجبُوراً آپؐ کو طائف چھوڑ دینا پڑا۔ جب آپؐ وہاں سے نکلنے لگے تو ثَقِیف کے سرداروں نے اپنے ہاں کے لفنگوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ راستے کے دونوں طرف دُور تک آپؐ پر آوازے کستے، گالیاں دیتے اور پتھر مارتے چلے گئے، یہاں تک کہ آپؐ زخموں سے چُور ہو گئے اور آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ اس حالت میں آپؐ طائف کے باہر ایک باغ کی دیوار کے سایے میں بیٹھ گئے اور اپنے رب سے عرض کیا:

"خداوندا! میں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے دُرشتی کے ساتھ پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے حوالے جو مجھ پر قابو پا لے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں، مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اُس نور کی جو اندھیرے میں اُجالا اور دنیا اور آخرت کے معاملات کو دُرست کرتا ہے، مجھے اِس سے بچا لے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو جاؤں۔ تیری مرضی پر راضی ہوں، یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔" (ابنِ ہِشَام، ج ۲، ص ۶۲)

دل شکستہ و غمگین پلٹ کر جب آپؐ قَرنُ المنازِل کے قریب پہنچے تو محسوس ہوا کہ آسمان پر ایک بادل سا چھایا ہوا ہے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو جبریل علیہ السلام سامنے تھے۔ انھوں نے پکار کر کہا: "آپؐ کی

قوم نے جو کچھ آپؐ کو جواب دیا ہے اللہ نے اسے سُن لیا، اب یہ پہاڑوں کا منتظم فرشتہ اللہ نے بھیجا ہے، آپؐ جو حکم دینا چاہیں اِسے دے سکتے ہیں۔'' پھر پہاڑوں کے فرشتے نے آپؐ کو سلام کر کے عرض کیا: ''آپؐ فرمائیں تو دونوں طرف کے پہاڑ اِن لوگوں پر اُلٹ دوں۔'' آپؐ نے جواب دیا: ''نہیں، بلکہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ اِن کی نسل سے وہ لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کریں گے۔'' (بخاری، بدء الخلق، ذکر الملائکہ۔ مسلم، کتاب المغازی۔ نسائی، البعوث)

اس کے بعد آپؐ چند روز نَخلہ کے مقام پر جا کر ٹھیر گئے۔ پریشان تھے کہ اب کیسے مکّہ واپس جاؤں۔ طائف میں جو کچھ گزری ہے اس کی خبریں وہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ اس کے بعد تو کفار پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ اِنھی ایام میں ایک روز رات کو آپؐ نماز میں قرآنِ مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جِنّوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا، انھوں نے قرآن سنا، ایمان لائے، واپس جا کر اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ خوشخبری سنائی کہ انسان چاہے آپؐ کی دعوت سے بھاگ رہے ہوں، مگر بہت سے جِنّ اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور وہ اسے اپنی جنس میں پھیلا رہے ہیں۔

موضوع اور مَباحِث

یہ حالات تھے جن میں یہ سورت نازل ہوئی۔ جو شخص بھی ایک طرف اِن حالاتِ نُزول کو دیکھے گا اور دوسری طرف اس سورت کو بغور پڑھے گا، اسے اِس امر میں کوئی شبہ نہ رہے گا کہ فی الواقع یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے بلکہ ''اِس کا نُزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔'' اس لیے کہ اوّل سے آخر تک پوری سورت میں کہیں اُن انسانی جذبات و تأثُّرات کا ایک ادنٰی شائبہ تک نہیں پایا جاتا جو اِن حالات سے گزرنے والے انسان کے اندر فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہوتا، جنھیں پَے در پَے صدمات اور مصائب کے بے پناہ ہُجوم اور طائف کے تازہ ترین چرکے نے خستہ حالی کی انتہا کو پہنچا دیا تھا، تو اِس سورہ میں کہیں تو اُن کیفیات کا عکس نظر آتا جو اُس وقت آپؐ کے دل پر گزر رہی تھیں۔ اُوپر ہم نے حضوؐر کی جو دُعا نقل کی ہے، اسے دیکھیے۔ وہ آپؐ کا اپنا کلام ہے۔ اس کا لفظ لفظ ان کیفیات سے لبریز ہے۔ مگر یہ سورت جو اُسی زمانے اور اُنھی حالات میں آپؐ ہی کی زبان مبارک سے ادا ہوئی ہے، اُن کے ہر اثر سے قطعی خالی ہے۔

سورت کا موضوع کفار کو اُن گمراہیوں کے نتائج سے خبردار کرنا ہے جن میں وہ نہ صرف مبتلا تھے، بلکہ بڑے اصرار اور غرور و اِستکبار کے ساتھ ان پر جمے ہوئے تھے، اور اُلٹا اُس شخص کو ہدفِ ملامت بنا رہے تھے جو انھیں اِن گمراہیوں سے نکالنے کے لیے کوشاں تھا۔ ان کے نزدیک دنیا کی حیثیت محض ایک بے مقصد کھلونے کی تھی، اور اس کے اندر اپنے آپ کو وہ غیر جواب دِہ مخلوق سمجھ رہے تھے۔ توحید کی دعوت ان کے خیال میں باطل تھی، اور انھیں اصرار تھا کہ اُن کے معبُود واقعی خدا کے شریک ہیں۔ وہ قرآن کے متعلق یہ ماننے کو تیار

نہ تھے کہ یہ خداوندِ عالَم کا کلام ہے۔ رسالت کا ایک عجیب جاہلانہ تصوُّر ان کے ذہن میں تھا، اور اس کی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت کو جانچنے کے لیے وہ طرح طرح کے نرالے معیار تجویز کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام کے برحق نہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ تھا کہ ان کے شُیوخ اور بڑے بڑے قبائلی سردار اور ان کی قوم کے بُوجھ بُجھکّڑ اسے نہیں مان رہے ہیں، اور صرف چند نوجوان، چند غریب لوگ اور چند غلام ہی اس پر ایمان لائے ہیں۔ وہ قیامت، اور زندگی بعدِ موت، اور جزا و سزا کی باتوں کو ایک من گھڑت افسانہ سمجھتے تھے، اور ان کا خیال یہ تھا کہ اِن چیزوں کا وقوع خارج از اِمکان ہے۔

اِس سورت میں بالاختصار انھی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی مُدلّل تردید کی گئی ہے اور کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم اگر عقل و دلیل سے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے تعصُّب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو رَدّ کر دو گے تو آپ اپنا ہی انجام خراب کرو گے۔

---

۳۵ ایاتھا

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ مَكِّيَّةٌ

۴ رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الجزء ۲۶

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ

وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝

ح۔م۔اِس کتاب کا نُزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔[1]

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق، اور ایک مدّتِ خاص کے تعیّن کے ساتھ پیدا کیا ہے۔[2] مگر یہ کافر لوگ اُس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے ان کو خبردار کیا گیا ہے۔[3]

۱ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۃ الزُّمَر، حاشیہ ۱، اور سورۃ الجاثیہ، حاشیہ ۱۔ اس کے ساتھ سورۃ السجدہ، حاشیہ نمبر ۱ بھی نگاہ میں رہے تو اس تمہید کی روح سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

۲ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۱۱، ابراہیم، حاشیہ ۲۳، الحِجر، حاشیہ ۴۷، النَّحل، حاشیہ ۶۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۵ تا ۱۷، المومنون، حاشیہ ۱۰۲، العنکبوت، حواشی ۷۵-۷۶۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۵۱، الدخان، حاشیہ ۳۴، الجاثیہ، حاشیہ ۲۸۔

۳ - یعنی واقعی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نظامِ کائنات ایک بے مقصد کھلونا نہیں بلکہ ایک با مقصد حکیمانہ نظام ہے جس میں لازماً نیک و بد اور ظالم و مظلوم کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہونا ہے، اور کائنات کا موجودہ نظام دائمی و ابدی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک خاص عمر مقرر ہے جس کے خاتمے پر اسے لازماً دَرہم برہم ہو جانا ہے، اور خدا کی عدالت کے لیے بھی ایک وقت طے شدہ ہے جس کے آنے پر وہ ضرور قائم ہونی ہے، لیکن جن لوگوں نے خدا کے رسول اور اس کی کتاب کو ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ان حقائق سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ انھیں اس بات کی کچھ فکر نہیں ہے کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب اُنھیں اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہوگی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان حقیقتوں سے خبردار کر کے خدا کے رسول نے اُن کے ساتھ کوئی برائی کی ہے، حالانکہ یہ ان کے ساتھ بہت بڑی بھلائی ہے کہ اس نے محاسبے اور باز پُرس کا وقت آنے سے پہلے اُن کو نہ صرف یہ بتا دیا کہ وہ وقت آنے والا ہے، بلکہ یہ بھی ساتھ ساتھ بتا دیا کہ اُس وقت ان سے کن اُمور کی باز پُرس ہو

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا
مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ
قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴ وَمَنْ

اَے نبیؐ! اِن سے کہو: ”کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا بھی کہ وہ ہستیاں ہیں کیا جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انھوں نے کیا پیدا کیا ہے، یا آسمانوں کی تخلیق وتدبیر میں ان کا کیا حصّہ ہے۔ اِس سے پہلے آئی ہوئی کوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیّہ (اِن عقائد کے ثبوت میں) تمھارے پاس ہو تو وہی لے آؤ، اگر تم سچّے ہو۔[۴]“ آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا

گی تا کہ وہ اس کے لیے تیاری کرسکیں۔

آگے کی تقریر سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ انسان کی سب سے بڑی بنیادی غَلَطی وہ ہے جو وہ خدا کے متعلق اپنے عقیدے کے تعیُّن میں کرتا ہے۔ اس معاملے میں سہل انگاری سے کام لے کر کسی گہرے اور سنجیدہ فکر و تحقیق کے بغیر ایک سَرسَری یا سُنا سُنایا عقیدہ بنا لینا ایسی عظیم حماقت ہے جو دنیا کی زندگی میں انسان کے پورے رَوِیّے کو، اور اَبَدالآباد تک کے لیے اس کے انجام کو خراب کر کے رکھ دیتی ہے۔ لیکن جس وجہ سے آدمی اس خطرناک سَہل اَنگاری میں مبتلا ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر ذمّہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ لیتا ہے، اور اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ خدا کے بارے میں جو عقیدہ بھی میں اختیار کرلوں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، کیونکہ یا تو مرنے کے بعد سرے سے کوئی زندگی نہیں ہے جس میں مجھے کسی بازپُرس سے سابقہ پیش آئے، یا اگر ایسی کوئی زندگی ہو اور وہاں بازپُرس بھی ہو تو جن ہستیوں کا دامن میں نے تھام رکھا ہے وہ مجھے انجامِ بد سے بچالیں گی۔ یہی احساسِ ذمّہ داری کا فُقدان آدمی کو مذہبی عقیدے کے انتخاب میں غیر سنجیدہ بنا دیتا ہے، اور اسی بنا پر وہ بڑی بے فکری کے ساتھ دہریّت سے لے کر شرک کی انتہائی نامعقول صورتوں تک طرح طرح کے لغو عقیدے خود گھڑتا ہے، یا دوسروں کے گھڑے ہوئے عقیدے قبول کر لیتا ہے۔

۴ – چونکہ مخاطَب ایک مشرک قوم کے لوگ ہیں، اس لیے ان کو بتایا جا رہا ہے کہ احساسِ ذمّہ داری کے فُقدان کی وجہ سے وہ کس طرح بے سوچے سمجھے ایک نہایت غیر معقول عقیدے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو خالقِ کائنات ماننے کے ساتھ بہت سی دوسری ہستیوں کو معبُود بنائے ہوئے تھے، ان سے دعائیں مانگتے تھے، ان کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے تھے، اُن کے آگے ماتھے رگڑتے اور نذر و نیاز پیش کرتے تھے، اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات انھیں حاصل ہیں۔ انھی ہستیوں کے متعلق ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ انھیں آخر کس بنیاد پر تم نے اپنا معبود مان رکھا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو معبُودیت میں حصّہ دار قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں: یا تو آدمی کو خود کسی ذریعۂ علم سے

اَضَلُّ مِمَّنۡ یَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَنۡ لَّا یَسۡتَجِیۡبُ لَہٗۤ اِلٰی
یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ وَ ہُمۡ عَنۡ دُعَآئِہِمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝۵ وَ اِذَا حُشِرَ

انسان اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے[5] سکتے، بلکہ اِس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے اُن کو پکار رہے ہیں[6]، اور جب تمام انسان جمع کیے

یہ معلوم ہو کہ زمین و آسمان کے بنانے میں واقعی اس کا بھی کوئی حصّہ ہے۔ یا اللہ تعالیٰ نے آپ یہ فرمایا ہو کہ فلاں صاحب بھی خدائی کے کام میں میرے شریک ہیں۔ اب اگر کوئی مشرک نہ یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ اُسے اپنے معبُودوں کے شریکِ خدا ہونے کا براہِ راست علم حاصل ہے، اور نہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب میں یہ دکھا سکے کہ خدا نے خود کسی کو اپنا شریک قرار دیا ہے، تو لامحالہ اس کا عقیدہ قطعی بے بنیاد ہی ہوگا۔

اس آیت میں ''پہلے آئی ہوئی کتاب'' سے مراد کوئی ایسی کتاب ہے جو قرآن سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی ہو، اور علم کے ''بقیہ'' سے مراد قدیم زمانے کے انبیاؑ اور صُلَحا کی تعلیمات کا کوئی ایسا حصہ ہے جو بعد کی نسلوں کو کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے پہنچا ہو۔ ان دونوں ذرائع سے جو کچھ بھی انسان کو ملا ہے، اُس میں کہیں شرک کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ تمام کُتُبِ آسمانی بالاتفاق وہی توحید پیش کرتی ہیں جس کی طرف قرآن دعوت دے رہا ہے۔ اور عُلُومِ اوّلین کے جتنے نُقوش بھی بچے کھچے موجود ہیں، ان میں بھی کہیں اس امر کی شہادت نہیں ملتی کہ کسی نبی یا ولی یا مردِ صالح نے کبھی لوگوں کو خدا کے سوا کسی اور کی بندگی و عبادت کرنے کی تعلیم دی ہو۔ بلکہ اگر کتاب سے مراد کتابِ الٰہی، اور بقیۂ علم سے مراد انبیاؑ و صُلَحا کا چھوڑا ہوا علم نہ بھی لیا جائے، تو دنیا کی کسی علمی کتاب اور دینی یا دنیوی علوم کے کسی ماہر کی تحقیقات میں بھی آج تک اس امر کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے کہ زمین یا آسمان کی فُلاں چیز کو خدا کے سوا فلاں بزرگ یا دیوتا نے پیدا کیا ہے، یا انسان جن نعمتوں سے اس کائنات میں مُتمتّع ہو رہا ہے ان میں سے فلاں نعمت خدا کے بجائے فلاں معبُود کی آفریدہ ہے۔

۵ – جواب دینے سے مراد جوابی کارروائی کرنا ہے، نہ کہ الفاظ میں باآواز جواب دینا یا تحریری شکل میں لکھ کر بھیج دینا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اگر ان معبُودوں سے فریاد یا اِستغاثہ کرے، یا ان سے کوئی دعا مانگے، تو چونکہ ان کے ہاتھ میں کوئی طاقت اور کوئی اختیار نہیں ہے، اس لیے وہ اس کی درخواست پر کوئی کارروائی نفی یا اثبات کی شکل میں نہیں کر سکتے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد چہارم، الزُّمَر، حاشیہ نمبر ۳۳)

قیامت تک جواب نہ دے سکنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ دنیا باقی ہے اس وقت تک تو معاملہ صرف اسی حد پر رہے گا کہ اِن کی دعاؤں کا کوئی جواب ان کی طرف سے نہ ملے گا، لیکن جب قیامت آ جائے گی تو اس سے آگے بڑھ کر معاملہ یہ پیش آئے گا کہ وہ معبُود اپنے اِن عابدوں کے اُلٹے دشمن ہوں گے، جیسا کہ آگے کی آیت میں آ رہا ہے۔

۶ – یعنی ان تک اِن پکارنے والوں کی پکار سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ خود اپنے کانوں سے اُس کو سنتے ہیں،

رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۱ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ
فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ
بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝۳۲ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ

رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا، اور یہی صریح کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اُن سے کہا جائے گا: ''کیا میری آیات تم کو نہیں سُنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبّر کیا[۴۳] اور مجرم بن کر رہے۔ اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں[۴۴] ہے۔'' اُس وقت اُن پر ان کے اعمال کی بُرائیاں کھل[۴۵] جائیں گی اور وہ اُسی چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ

ثبت کرنے اور دوبارہ اُن کو بعینہٖ اسی شکل میں پیش کر دینے کی متعدّد دوسری صورتیں اِسی دنیا میں خود انسان دریافت کر چکا ہے، اور ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آگے اس کے اور کیا امکانات پوشیدہ ہیں جو کبھی انسان ہی کی گرفت میں آجائیں گے۔ اب یہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی ایک ایک بات، اور اس کی حرکات وسکنات میں سے ایک ایک چیز، اور اس کی نیتوں اور ارادوں اور خواہشات اور خیالات میں سے ہر مخفی سے مخفی شے کو ثبت کرا رہا ہے، اور کس طرح وہ ہر آدمی، ہر گروہ اور ہر قوم کا پورا کارنامۂ حیات بے کم وکاست اس کے سامنے لا رکھے گا۔

۴۳ - یعنی اپنے گھمنڈ میں تم نے یہ سمجھا کہ اللہ کی آیات کو مان کر مطیعِ فرمان بن جانا تمھاری شان سے فروتر ہے، اور تمھارا مقام بندگی کے مقام سے بہت اونچا ہے۔

۴۴ - اس سے پہلے آیت ۲۴ میں جن لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے وہ آخرت کا قطعی اور کُھلا انکار کرنے والے تھے۔ اور یہاں اُن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اس کا یقین نہیں رکھتے، اگرچہ گمان کی حد تک اس کے امکان سے منکر نہیں ہیں۔ بظاہر ان دونوں گروہوں میں اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ ایک بالکل منکر ہے اور دوسرا اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے۔ لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار اور اس پر یقین نہ ہونے کے اخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا کے سامنے اپنی جوابدِہی کے

قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ فَلَا تَمۡلِكُوۡنَ لِىۡ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا‌ ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِيۡضُوۡنَ فِيۡهِ‌ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيۡدًۢا بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ‌ ؕ

ان سے کہو: "اگر میں نے اِسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے، جو باتیں تم بناتے ہو اللہ اُن کو خوب جانتا ہے، میرے اور تمھارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے،[10]

خبر کہ یہ لوگ ہماری عبادت کرتے تھے۔ اپنی اس گمراہی کے یہ خود ذمّہ دار ہیں۔ اس کا خمیازہ انھی کو بھگتنا چاہیے۔ ہمارا اس گناہ میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

۸ – اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن کی آیات کفارِ مکہ کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ صاف یہ محسوس کرتے تھے کہ اس کلام کی شان انسانی کلام سے بدرجہا بلند ہے۔ ان کے کسی شاعر، کسی خطیب، اور کسی بڑے سے بڑے ادیب کے کلام کو بھی قرآن کی بے مثل فصاحت و بلاغت، اس کی وجد آفرین خطابت، اس کے بلند مضامین اور دلوں کو برما دینے والے اندازِ بیان سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام کی شان بھی وہ نہ تھی جو خدا کی طرف سے آپؐ پر نازل ہونے والے کلام میں نظر آتی تھی۔ جو لوگ بچپن سے آپؐ کو دیکھتے چلے آرہے تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ آپؐ کی زبان اور قرآن کی زبان میں کتنا عظیم فرق ہے، اور ان کے لیے یہ باور کرنا ممکن نہ تھا کہ ایک آدمی جو چالیس پچاس برس سے شب و روز ان کے درمیان رہتا ہے، وہ یکایک کسی وقت بیٹھ کر ایسا کلام گھڑ لیتا ہے جس کی زبان میں اُس کی اپنی جانی پہچانی زبان سے قطعاً کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ یہ چیز ان کے سامنے حق کو بالکل بے نقاب کر کے لے آتی تھی۔ مگر وہ چونکہ اپنے کفر پر اَڑے رہنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لیے اس صریح علامت کو دیکھ کر سیدھی طرح اس کلام کو کلامِ وحی مان لینے کے بجائے یہ بات بناتے تھے کہ یہ کوئی جادو کا کرشمہ ہے۔ (ایک اور پہلو جس کے لحاظ سے وہ قرآن کو جادو قرار دیتے تھے، اس کی تشریح ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ ص، حاشیہ ۵)

۹ – اس سوالیہ طرزِ بیان میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اتنے بے حیا ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن خود گھڑ لانے کا الزام رکھتے ہیں؟ حالانکہ اِنھیں خوب معلوم ہے کہ یہ اُن کا تصنیف کردہ کلام نہیں ہو سکتا، اور ان کا اِسے سحر کہنا خود اس امر کا صریح اعتراف ہے کہ یہ ایک غیر معمولی کلام ہے، جس کا کسی انسان کی تصنیف ہونا ان کے اپنے نزدیک بھی ممکن نہیں ہے۔

۱۰ – چونکہ ان کے الزام کا محض بے اصل اور سراسر ہٹ دھرمی پر مبنی ہونا بالکل ظاہر تھا، اس لیے اس کی تردید میں دلائل پیش کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ پس یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اگر واقعی میں نے خود ایک کلام تصنیف کر کے اللہ کی طرف منسوب کرنے کا جُرمِ عظیم کیا ہے، جیسا کہ تم الزام رکھتے ہو، تو مجھے خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے تم نہ آؤ گے، لیکن اگر یہ خدا ہی کا کلام ہے

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۸ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ
اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ
وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۹ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ

اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔[11]"

ان سے کہو: "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ کل تمھارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا، مَیں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے، اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔[12]" اے نبیؐ! ان سے کہو: "کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام

اور تم جھوٹے الزامات رکھ رکھ کر اسے ردّ کر رہے ہو، تو اللہ تم سے نمٹ لے گا۔ حقیقت اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہے، اور جھوٹ سچ کا فیصلہ کرنے کے لیے وہ بالکل کافی ہے۔ ساری دنیا اگر کسی کو جھوٹا کہے اور اللہ کے علم میں وہ سچّا ہو، تو آخری فیصلہ لازماً اسی کے حق میں ہوگا۔ اور ساری دنیا اگر کسی کو سچّا کہہ دے، مگر اللہ کے علم میں وہ جھوٹا ہو، تو آخرِ کار وہ جھوٹا ہی قرار پائے گا۔ لہٰذا الٹی سیدھی باتیں بنانے کے بجائے اپنے انجام کی فکر کرو۔

۱۱- اس مقام پر یہ فقرہ دو معنی دے رہا ہے: ایک یہ کہ فی الواقع یہ اللہ کا رحم اور اس کا درگزر ہی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ زمین میں سانس لے رہے ہیں جنھیں خدا کے کلام کو افترا قرار دینے میں کوئی باک نہیں، ورنہ کوئی بے رحم اور سخت گیر خدا اس کائنات کا مالک ہوتا تو ایسی جسارتیں کرنے والوں کو ایک سانس کے بعد دوسرا سانس لینا نصیب نہ ہوتا۔ دوسرا مطلب اس فقرے کا یہ ہے کہ ظالمو! اب بھی اس ہٹ دھرمی سے باز آ جاؤ تو خدا کی رحمت کا دروازہ تمھارے لیے کھلا ہوا ہے، اور جو کچھ تم نے اب تک کیا ہے وہ معاف ہو سکتا ہے۔

۱۲- اس ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو مکے کے لوگ اس پر طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے رکھتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ آخر اِس میں وہ نرالی بات کیا ہے جس میں یہ عام انسانوں سے مختلف ہو اور ہم یہ سمجھیں کہ خاص طور پر اس شخص کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے۔ پھر وہ کہتے تھے کہ اگر اس شخص کو خدا نے رسول بنایا ہوتا تو وہ اس کی اَرْدَلی میں کوئی فرشتہ بھیجتا جو اعلان کرتا کہ یہ خدا کا رسول ہے، اور ہر اس شخص پر عذاب کا کوڑا برسا دیتا جو اس کی شان میں کوئی ذرا سی گستاخی کر بیٹھتا۔ یہ آخر کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اپنا رسول مقرر کرے، اور پھر اسے یوں ہی مکے کی گلیوں میں پھرنے اور ہر طرح کی زیادتیاں سہنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی ہوتا کہ خدا اپنے

عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰى
مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۰ ع

اللہ ہی کی طرف سے ہوا اور تم نے اِس کا انکار کر دیا (تو تمھارا کیا انجام[13] ہوگا)؟ اور اِس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے[14]۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔'' ع

رسول کے لیے ایک شاندار محل اور ایک لہلہاتا باغ ہی پیدا کر دیتا۔ یہ تو نہ ہوتا کہ اس کے رسول کی بیوی کا مال جب ختم ہو جائے تو اسے فاقوں کی نوبت آ جائے اور طائف جانے کے لیے اسے سواری تک میسّر نہ ہو۔ پھر وہ لوگ آپؐ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں آپؐ سے پوچھتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کا رسولِ خدا ہونا یہ معنیٰ رکھتا تھا کہ وہ فوق البشری طاقتوں کا مالک ہو، اس کے ایک اشارے پر پہاڑ ٹل جائیں اور ریگ زار دیکھتے دیکھتے کِشت زاروں میں تبدیل ہو جائیں، اس کو تمام ما کان و ما یکون کا علم ہو، اور پردۂ غیب میں چھپی ہوئی ہر چیز اس پر روشن ہو۔

یہی باتیں ہیں جن کا جواب اِن فقروں میں دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر فقرے کے اندر معانی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

فرمایا، اِن سے کہو: ''میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں۔'' یعنی میرا رسول بنایا جانا دنیا کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہے کہ تمھیں یہ سمجھنے میں پریشانی لاحق ہو کہ رسول کیسا ہوتا ہے اور کیسا نہیں ہوتا۔ مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں، اور میں اُن سے مختلف نہیں ہوں۔ آخر دنیا میں کب کوئی رسول ایسا آیا ہے جو بال بچے نہ رکھتا ہو، یا کھاتا پیتا نہ ہو، یا عام انسانوں کی سی زندگی بسر نہ کرتا ہو؟ کس رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ اترا ہے جو اس کی رسالت کا اعلان کرتا ہو اور اس کے آگے آگے ہاتھ میں کوڑا لیے پھرتا ہو؟ کس رسول کے لیے باغ اور محلات پیدا کیے گئے، اور کس نے خدا کی طرف بلانے میں وہ سختیاں نہیں جھیلیں جو میں جھیل رہا ہوں؟ کون سا رسول ایسا گزرا ہے جو اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھا سکتا ہو، یا اپنے علم سے سب کچھ جانتا ہو؟ پھر یہ نرالے معیار میری ہی رسالت کو پرکھنے کے لیے تم کہاں سے لیے چلے آ رہے ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان کے جواب میں یہ بھی کہو: ''میں نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمھارے ساتھ کیا، میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بھیجی جاتی ہے۔'' یعنی میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ماضی، حال، مستقبل سب مجھ پر روشن ہوں اور دنیا کی ہر چیز کا مجھے علم ہو۔ تمھارا مستقبل تو درکنار، مجھے تو اپنا مستقبل بھی معلوم نہیں ہے۔ جس چیز کا وحی کے ذریعے سے مجھے علم دے دیا جاتا ہے، بس اُسی کو میں جانتا ہوں۔ اِس سے زائد کوئی علم رکھنے کا میں نے آخر کب دعویٰ کیا تھا، اور کون سا رسول ایسے علم کا مالک کبھی دنیا میں گزرا ہے کہ تم میری رسالت کو جانچنے کے لیے میری غیب دانی کا امتحان لیتے پھرتے ہو۔ رسول کا یہ کام کب سے ہو گیا کہ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے پتے بتائے، یا یہ بتائے کہ حاملہ عورت لڑکا جنے گی یا لڑکی، یا یہ بتائے کہ مریض اچھا ہو جائے گا یا مر جائے گا۔

آخر میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو: ”میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔“ یعنی میں خدائی اختیارات کا مالک نہیں ہوں کہ وہ عجیب و غریب معجزے تمھیں دکھاؤں جن کے مطالبے تم مجھ سے آئے دن کرتے رہتے ہو۔ مجھے جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے، وہ تو صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے راہِ راست پیش کروں، اور جو لوگ اسے قبول نہ کریں انھیں بُرے انجام سے خبردار کر دوں۔

۱۳– یہ وہی مضمون ہے جو اس سے پہلے ایک دوسرے طریقے سے سورۂ حٰمٓ السجدہ، آیت ۵۲ میں گزر چکا ہے۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: جلد چہارم، تفسیر سورۂ مذکور، حاشیہ ۶۹۔

۱۴– مفسرین کے ایک بڑے گروہ نے اس گواہ سے مراد حضرت عبداللہؓ بن سَلام کو لیا ہے جو مدینۂ طیبہ کے مشہور یہودی عالم تھے اور ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ یہ واقعہ چونکہ مدینہ میں پیش آیا تھا، اس لیے اِن مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت مَدَنی ہے۔ اس تفسیر کی بنیاد حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص کا یہ بیان ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہؓ بن سلام کے بارے میں نازل ہوئی تھی (بخاری، مُسلِم، نَسائی، ابنِ جَرِیر)، اور اسی بنا پر ابنِ عباسؓ، مجاہد، قَتادَہ، ضَحّاک، ابنِ سیرِین، حَسَن بصری، ابنِ زید اور عَوف بن مالک اَلاَشجَعی جیسے متعدّد اکابرِ مفسّرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔ مگر دوسری طرف عِکرِمَہ اور شَعبِی اور مَسرُوق کہتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ پوری سورت مَکّی ہے۔ ابنِ جَرِیر طَبَرِیؒ نے بھی اِسی قول کو ترجیح دی ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اُوپر سے سارا سلسلۂ کلام مشرکینِ مکہ کو مخاطَب کرتے ہوئے چلا آ رہا ہے اور آگے بھی سارا خطاب اُنھی سے ہے، اِس سِیاق و سَباق میں یکایک مدینے میں نازل ہونے والی ایک آیت کا آ جانا قابلِ تصوّر نہیں ہے۔ بعد کے جن مفسرین نے اس دوسرے قول کو قبول کیا ہے، وہ حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص کی رِوایَت کو رد نہیں کرتے، بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت چونکہ عبداللہؓ بن سَلام کے ایمان لانے پر بھی چسپاں ہوتی ہے، اس لیے حضرت سعدؓ نے قُدَما کی عادت کے مطابق یہ فرما دیا کہ یہ ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب وہ ایمان لائے اس وقت انھی کے بارے میں یہ نازل ہوئی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اس آیت کے ٹھیک ٹھیک مصداق ہیں اور ان کے قبولِ ایمان پر یہ پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔

بظاہر یہی دوسرا قول زیادہ صحیح اور معقول محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس ”گواہ“ سے مراد کون ہے۔ جن مفسرین نے اِس دوسرے قول کو اختیار کیا ہے، ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد موسیٰؑ ہیں۔ لیکن بعد کا یہ فقرہ کہ ”وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے“ اس تفسیر کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ زیادہ صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو مُفسّر نیسابُوریؒ اور ابنِ کثیرؒ نے بیان کی ہے کہ یہاں گواہ سے مراد کوئی خاص شخص نہیں، بلکہ بنی اسرائیل کا ایک عام آدمی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مدّعا یہ ہے کہ قرآنِ مجید جو تعلیم تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے یہ کوئی انوکھی چیز بھی نہیں ہے جو دنیا میں پہلی مرتبہ تمھارے ہی سامنے پیش کی گئی ہو اور تم یہ عذر کر سکو کہ ہم یہ نرالی باتیں کیسے مان لیں جو نوعِ انسانی کے سامنے کبھی آئی ہی نہ تھیں۔ اس سے پہلے یہی تعلیمات اِسی طرح وحی کے ذریعے سے بنی اسرائیل کے سامنے تورات اور دوسری کُتُبِ آسمانی کی شکل میں آ چکی ہیں، اور ان کا ایک عام آدمی ان کو مان چکا ہے،

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ
اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ⑪
وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ
مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے۔[15] چونکہ اِنھوں نے اُس سے ہدایت نہ پائی، اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پُرانا جھوٹ ہے۔[16] حالانکہ اِس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے، اور یہ کتاب اُس کی تصدیق کرنے والی زبانِ عربی میں آئی ہے، تاکہ ظالموں کو متنبّہ کر دے[17] اور نیک رَوِش اختیار کرنے والوں کو

اور یہ بھی تسلیم کر چکا ہے کہ اللہ کی وحی اِن تعلیمات کے نُزول کا ذریعہ ہے۔ اس لیے تم لوگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وحی اور یہ تعلیمات نا قابلِ فہم چیزیں ہیں۔ اصل بات صرف یہ ہے کہ تمھارا غُرور وتکبّر اور بے بنیاد گھمنڈ ایمان لانے میں مانع ہے۔

۱۵ – یہ اُن دلائل میں سے ایک ہے جو قریش کے سردار عوام الناس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہکانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ قرآن برحق ہوتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک صحیح بات کی طرف دعوت دے رہے ہوتے تو قوم کے سردار اور شُیوخ اور معزّزین آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چند نا تجرِبہ کار لڑکے اور چند ادنیٰ درجے کے غلام تو ایک معقول بات کو مان لیں اور قوم کے بڑے بڑے لوگ، جو دانا اور جہاں دیدہ ہیں، اور جن کی عقل و تدبیر پر آج تک قوم اعتماد کرتی رہی ہے، اس کو ردّ کر دیں۔ اِس پُرفریب اِستِدلال سے وہ عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس نئی دعوت میں ضرور کچھ خرابی ہے، اسی لیے تو قوم کے اکابر اس کو نہیں مان رہے ہیں، لہٰذا تم لوگ بھی اس سے دُور بھاگو۔

۱٦ – یعنی ان لوگوں نے اپنے آپ کو حق و باطل کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جس ہدایت کو یہ قبول نہ کریں، وہ ضرور ضلالت ہی ہونی چاہیے۔ لیکن یہ اسے ”نیا جھوٹ“ کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، کیونکہ اس سے پہلے بھی انبیا علیہم السلام یہی تعلیمات پیش کرتے رہے ہیں، اور تمام کُتُبِ آسمانی جو اہلِ کتاب کے پاس موجود ہیں، انھی عقائد اور انھی ہدایات سے بھری ہوئی ہیں۔ اس لیے یہ اسے ”پُرانا جھوٹ“ کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ سب لوگ بھی دانائی سے محروم تھے جو ہزاروں برس سے اِن حقائق کو پیش کرتے اور مانتے چلے آ رہے ہیں، اور تمام دانائی صرف ان کے حصّے میں آ گئی ہے۔

لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ۚ جَزَآءً ۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ
اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ
ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ

بشارت دے دے۔ یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اُس پر جم گئے، اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں[18] گے۔ ایسے سب لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اپنے اُن اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں۔

ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اُس کی ماں نے مشقت اُٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقّت اُٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دُودھ چھُڑانے میں تیس مہینے لگ گئے[19]۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو

---

۱۷ — یعنی اُن لوگوں کو انجامِ بد سے خبردار کر دے جو اللہ سے کفر اور غیر اللہ کی بندگی کر کے اپنے اُوپر اور حق و صداقت پر ظلم کر رہے ہیں، اور اپنی اس گمراہی کی وجہ سے اَخلاق اور اعمال کی اُن برائیوں میں مبتلا ہیں جن سے انسانی معاشرہ طرح طرح کے مظالم اور بے انصافیوں سے بھر گیا ہے۔

۱۸ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حاشیہ نمبر ۳۳ تا ۳۵۔

۱۹ — یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگرچہ اولاد کو ماں اور باپ دونوں ہی کی خدمت کرنی چاہیے، لیکن ماں کا حق اپنی اہمیّت میں اس بنا پر زیادہ ہے کہ وہ اولاد کے لیے زیادہ تکلیفیں اُٹھاتی ہے۔ یہی بات اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ، مُسندِ احمد اور امام بخاریؒ کی ادب المُفرَد میں وارد ہوئی ہے کہ ایک صاحب نے حضورؐ سے پوچھا: کس کا حقِ خدمت مجھ پر زیادہ ہے؟ فرمایا: تیری ماں کا۔ انھوں نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ انھوں نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ انھوں نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔ حضورؐ کا یہ ارشاد ٹھیک ٹھیک اِس آیت کی ترجمانی ہے، کیونکہ اس میں بھی ماں کے تہرے حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: (۱) اس کی ماں نے اسے مَشقّت اُٹھا کر پیٹ میں رکھا۔ (۲) مَشقّت اُٹھا کر ہی اس کو جنا۔ (۳) اور اس کے

حمل اور دودھ چھڑانے میں ۳۰ مہینے لگ گئے۔

اس آیت، اور سورۂ لقمان کی آیت ۱۴، اور سورۂ بَقَرہ کی آیت ۲۳۳ سے ایک اور قانونی نکتہ بھی نکلتا ہے، جس کی نشان دِہی ایک مُقَدّمے میں حضرت علیؓ اور حضرت ابنِ عبّاسؓ نے کی اور حضرت عثمانؓ نے اسی کی بنا پر اپنا فیصلہ بدل دیا۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک شخص نے قبیلۂ جُہَینَہ کی ایک عورت سے نکاح کیا اور شادی کے چھ ہی مہینے بعد اس کے ہاں صحیح وسالم بچّہ پیدا ہو گیا۔ اس شخص نے حضرت عثمانؓ کے سامنے لا کر یہ معاملہ پیش کر دیا۔ آپ نے اس عورت کو زانیہ قرار دے کر حکم دیا کہ اسے رَجم کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ نے یہ قصّہ سنا تو فوراً حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا: یہ آپ نے کیا فیصلہ کر دیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ نکاح کے چھ مہینے بعد اس نے زندہ سلامت بچّہ جَن دیا، کیا یہ اس کے زانیہ ہونے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: نہیں۔ پھر انھوں نے قرآنِ مجید کی مذکورۂ بالا تینوں آیتیں ترتیب کے ساتھ پڑھیں۔ سورۂ بَقَرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''مائیں اپنے بچوں کو پورے دوسال دودھ پلائیں اُس باپ کے لیے جو رضاعت کی پوری مدّت تک دودھ پلوانا چاہے۔'' سورۂ لقمان میں فرمایا: ''اور دوسال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔'' اور سورۂ اَحقاف میں فرمایا: ''اس کے حمل اور اس کا دودھ چھُڑانے میں تیس مہینے لگے۔'' اب اگر تیس مہینوں میں سے رضاعت کے دوسال نکال دیے جائیں تو حمل کے چھ مہینے رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حمل کی کم سے کم مدت، جس میں زندہ سلامت بچّہ پیدا ہو سکتا ہے، چھ مہینے ہے۔ لہٰذا جس عورت نے نکاح کے چھ مہینے بعد بچّہ جنا ہو، اسے زانیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کا یہ اِستِدلال سُن کر حضرت عثمانؓ نے فرمایا: اس بات کی طرف میرا ذہن بالکل نہ گیا تھا۔ پھر آپ نے عورت کو واپس بلوایا اور اپنا فیصلہ بدل دیا۔ ایک رِوایَت میں ہے کہ حضرت علیؓ کے اِستِدلال کی تائید حضرت ابنِ عباسؓ نے بھی کی، اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے اپنے فیصلے سے رُجوع فرمالیا۔ (ابنِ جَرِیر، احکام القرآن للجصّاص، ابنِ کثیر)

ان تینوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے جو قانونی احکام نکلتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) جو عورت نکاح کے بعد چھ مہینے سے کم مدّت میں صحیح وسالم بچہ جنے (یعنی وہ اِسقاط نہ ہو بلکہ وَضعِ حمل ہو) وہ زانیہ قرار پائے گی اور اس کے بچے کا نسب اس کے شوہر سے ثابت نہ ہوگا۔

(۲) جو عورت نکاح کے چھ مہینے بعد یا اس سے زیادہ مدّت میں زندہ سلامت بچہ جنے، اس پر زِنا کا الزام محض اِس ولادت کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا، نہ اس کے شوہر کو اس پر تہمت لگانے کا حق دیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کا شوہر بچے کے نسب سے انکار کر سکتا ہے۔ بچہ لازماً اسی کا مانا جائے گا، اور عورت کو سزا نہ دی جائے گی۔

(۳) رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدّت دوسال ہے۔ اِس عمر کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تو وہ اس کی رضاعی ماں قرار نہیں پائے گی، اور نہ وہ احکامِ رضاعت اس پر مُتَرَتّب ہوں گے جو سورۂ نساء آیت ۲۳ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں امام ابوحنیفہؒ نے برسَبیلِ احتیاط دوسال کے بجائے ڈھائی سال کی مدّت تجویز کی ہے، تاکہ حرمتِ رضاعت جیسے نازک مسئلے میں خطا کر جانے کا احتمال باقی نہ رہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ لقمان،

قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى
وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ
اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ
عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ

اس نے کہا: ''اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں، اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو،[۲۰] اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سُکھ دے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابعِ فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔'' اس طرح کے لوگوں سے ہم اُن کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور اُن کی بُرائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔[۲۱] یہ جنّتی لوگوں

حاشیہ نمبر ۲۳)

اس مقام پر یہ جان لینا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ جدید ترین طبّی تحقیقات کی رُو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچے کو کم از کم ۲۸ ہفتے درکار ہوتے ہیں جن میں وہ نَشْو ونُما پا کر زندہ ولادت کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ مدّت ساڑھے چھ مہینے سے کچھ زیادہ بنتی ہے۔ اسلامی قانون میں نصف مہینے کے قریب مزید رعایت دی گئی ہے، کیونکہ ایک عورت کا زانیہ قرار پانا اور ایک بچے کا نسب سے محروم ہو جانا بڑا سخت معاملہ ہے، اور اس کی نزاکت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ماں اور بچے، دونوں کو اس کے قانونی نتائج سے بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجایش دی جائے۔ علاوہ بریں کسی طبیب، کسی قاضی، حتّٰی کہ خود حاملہ عورت اور اُسے بارور کرنے والے مرد کو بھی ٹھیک ٹھیک یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ استقرارِ حمل کس وقت ہوا ہے۔ یہ بات بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ حمل کی کم سے کم قانونی مدّت کے تعیُّن میں چند روز کی مزید گنجایش رکھی جائے۔

۲۰ – یعنی مجھے ایسے نیک عمل کی توفیق دے جو اپنی ظاہری صورت میں بھی ٹھیک ٹھیک تیرے قانون کے مطابق ہو، اور حقیقت میں بھی تیرے ہاں مقبول ہونے کے لائق ہو۔ ایک عمل اگر دنیا والوں کے نزدیک بڑا اچھا ہو، مگر خدا کے قانون کی پیروی اس میں نہ کی گئی ہو، تو دنیا کے لوگ چاہے اس پر کتنی ہی داد دیں، خدا کے ہاں وہ کسی داد کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف ایک عمل ٹھیک ٹھیک شریعت کے مطابق ہوتا ہے اور بظاہر اس کی شکل میں کوئی کسر نہیں ہوتی، مگر نیت کی خرابی، رِیا، خود پسندی، فخر وغرور، اور دنیا طَلَبی اس کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے، اور وہ بھی اس قابل نہیں رہتا کہ اللہ کے ہاں مقبول ہو۔

۲۱ – یعنی دنیا میں انھوں نے جو بہتر سے بہتر عمل کیا ہے، آخرت میں ان کا درجہ اُسی کے لحاظ سے مقرر کیا جائے گا، اور ان کی لغزشوں، کمزوریوں اور خطاؤں پر گرفت نہیں کی جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک کریم النفس اور قدر شناس آقا

الْجَنَّةِ ۭ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝۱۶ وَالَّذِيْ قَالَ
لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ
قَبْلِيْ ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ڰ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ښ
فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۷ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ حَقَّ
عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۱۸ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ

میں شامل ہوں گے، اُس سچّے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔ اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا: ”اُف! تنگ کر دیا تم نے، کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد پھر قبر سے نکالا جاؤں گا، حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (اُن میں سے تو کوئی اُٹھ کر نہ آیا)۔“ ماں اور باپ اللہ کی دُہائی دے کر کہتے ہیں: ”ارے بدنصیب! مان جا، اللہ کا وعدہ سچّا ہے۔“ مگر وہ کہتا ہے: ”یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔“ یہ وہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ اِن سے پہلے جنّوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اِسی قُماش کے) ہو گزرے ہیں، انھی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔[۲۲] دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں،

اپنے خدمت گزار اور وفادار ملازم کی قدر اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کی کسی ایسی خدمت کے لحاظ سے کرتا ہے جس میں اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، جاں نثاری و وفاشعاری کا کمال کر دکھایا ہو۔ اور ایسے خادم کے ساتھ وہ یہ معاملہ نہیں کیا کرتا کہ اس کی ذرا ذرا سی کوتاہیوں پر گرفت کر کے اس کی ساری خدمات پر پانی پھیر دے۔

۲۲ — یہاں دو طرح کے کردار آمنے سامنے رکھ کر گویا سامعین کے سامنے یہ خاموش سوال رکھ دیا گیا ہے کہ بتاؤ، ان دونوں میں سے کون سا کردار بہتر ہے۔ اُس وقت یہ دونوں ہی کردار معاشرے میں عملاً موجود تھے، اور لوگوں کے لیے یہ جاننا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ پہلی قسم کا کردار کہاں پایا جاتا ہے اور دوسری قسم کا کہاں۔ یہ جواب ہے سردارانِ قریش کے اِس قول کا کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ چند نوجوان اور چند غلام اس معاملے میں ہم سے بازی نہ لے جا سکتے تھے۔ اِس جواب کے آئینے میں ہر شخص خود دیکھ سکتا تھا کہ ماننے والوں کا کردار کیا ہے اور نہ ماننے والوں کا کیا۔

وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ
بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿۲۰﴾ع وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ
اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ

ع ۲ ۲

تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔[۲۳] پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: "تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لُطف تم نے اُٹھا لیا، اب جو تکبّر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں، اُن کی پاداش میں آج تم کو ذلّت کا عذاب دیا جائے گا۔"[۲۴] ع

ذرا انھیں عاد کے بھائی (ہودؑ) کا قصہ سناؤ، جب کہ اُس نے اَحقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا ـــــ اور ایسے خبردار کرنے والے اُس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی

۲۳ - یعنی نہ اچھے لوگوں کی نیکیاں اور قربانیاں ضائع ہوں گی، نہ بُرے لوگوں کو ان کی واقعی بُرائی سے بڑھ کر سزا دی جائے گی۔ نیک آدمی اگر اپنے اجر سے محروم رہ جائے، یا اپنے حقیقی استحقاق سے کم اجر پائے تو یہ بھی ظلم ہے، اور بُرا آدمی اپنے کیے کی سزا نہ پائے، یا جتنا کچھ قصور اس نے کیا ہے اس سے زیادہ سزا پا جائے تو یہ بھی ظلم ہے۔

۲۴ - ذلّت کا عذاب اُس تکبّر کی مناسبت سے ہے جو انھوں نے کیا۔ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ رسول پر ایمان لا کر غریب اور فقیر مومنوں کے گروہ میں شامل ہو جانا ان کی شان سے گری ہوئی بات ہے۔ وہ اس زُعم میں مبتلا تھے کہ جس چیز کو چند غلاموں اور بے نَوا انسانوں نے مانا ہے، اسے ہم جیسے بڑے لوگ مان لیں گے تو ہماری عزت کو بٹّا لگ جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں ذلیل و خوار کرے گا اور اُن کے غُرور کو خاک میں ملا کر رکھ دے گا۔

۲۵ - چونکہ سردارانِ قریش اپنی بڑائی کا زُعم رکھتے تھے اور اپنی ثَروت و مَشِیخَت پر پُھولے نہ سماتے تھے، اس لیے یہاں ان کو قومِ عاد کا قصہ سنایا جا رہا ہے، جس کے متعلق عرب میں مشہور تھا کہ قدیم زمانے میں وہ اس سرزمین کی سب سے زیادہ طاقتور قوم تھی۔

اَحقاف حِقف کی جمع ہے، اور اس کے لغوی معنیٰ ہیں: ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ

پہنچے ہوں۔ لیکن اِصطِلاحاً یہ صحرائے عرب (الرَّبعُ الخالی) کے جنوبی مغربی حصّے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔ نقشے میں اس کا مقام مُلاحظہ ہو:

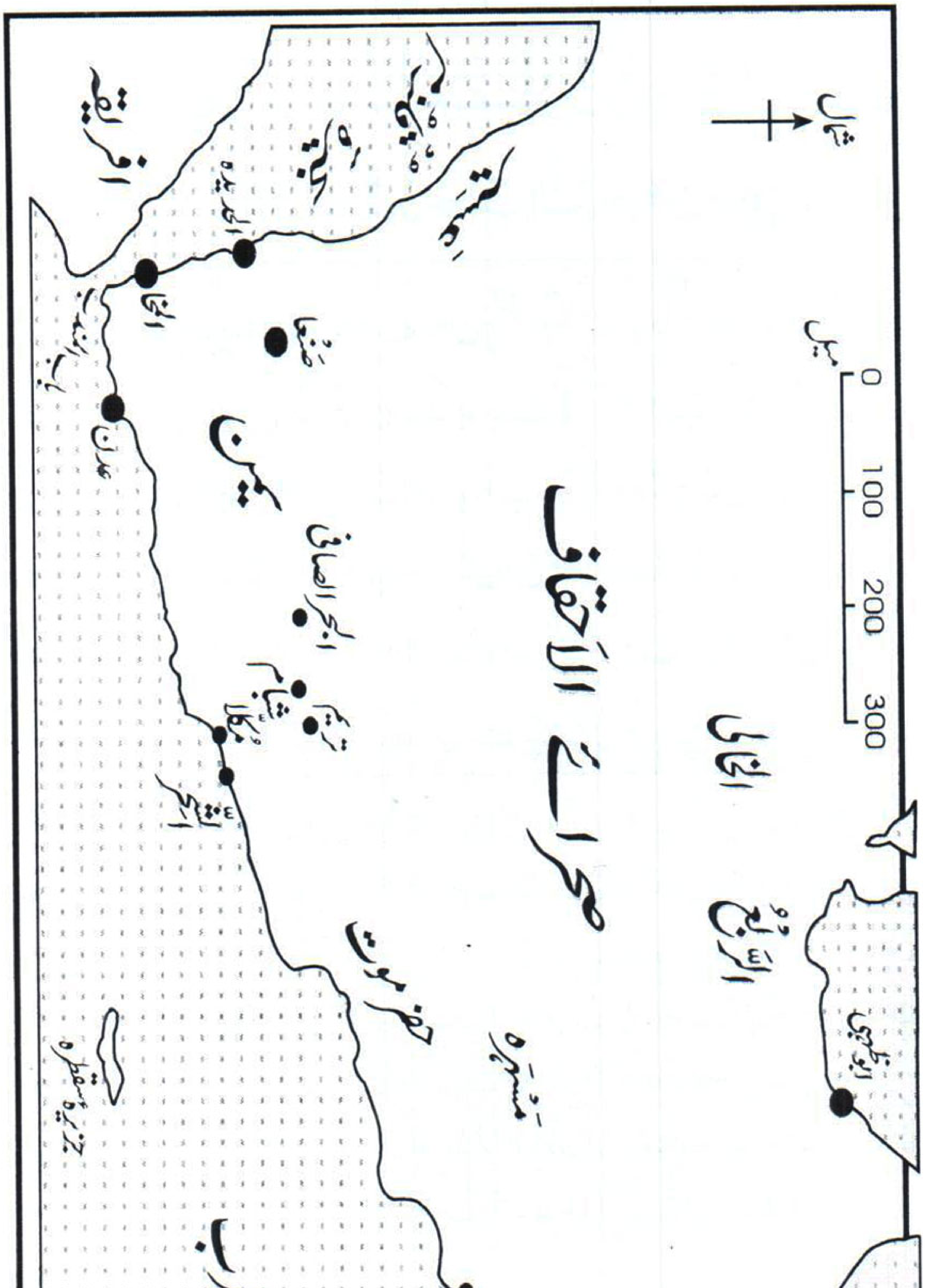

خَلۡفِهٖۤ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ
عَظِيۡمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَاۡفِكَنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ

آتے رہے ـــــ کہ ”اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، مجھے تمھارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔“ انھوں نے کہا: ”کیا تو اِس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبُودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ اپنا وہ عذاب جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے،

ابنِ اسحاقؒ کا بیان ہے کہ عاد کا علاقہ عُمان سے یمن تک پھیلا ہوا تھا، اور قرآنِ مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا اصل وطن الاحقاف تھا، جہاں سے نکل کر وہ گرد و پیش کے مَمالک میں پھیلے اور کمزور قوموں پر چھا گئے۔ آج کے زمانے تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عاد اسی علاقے میں آباد تھے۔ موجودہ شہر مُکَلّا سے تقریباً ۱۲۵ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب حَضْرَمَوت میں ایک مَقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہودؑ کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبرِ ہودؑ کے نام ہی سے مشہور ہے۔ ہر سال ۱۵ شَعبان کو وہاں عُرس ہوتا ہے اور عرب کے مختلف حصوں سے ہزاروں آدمی وہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ قبر اگرچہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے، لیکن اس کا وہاں بنایا جانا اور جنوبی عرب کے لوگوں کا کثرت سے اس کی طرف رُجوع کرنا کم ازکم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ مَقامی رِوایات اِسی علاقے کو قومِ عاد کا علاقہ قرار دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ حَضْرَمَوت میں متعدّد خَرابے (ruins) ایسے ہیں جن کو مقامی باشندے آج تک دارِ عاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شان دار تمدُّن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہوگا، اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگ زار بنا دیا ہوگا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک لَق و دق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۴۳ء میں بویریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ حَضْرَمَوت کی شمالی سطحِ مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدّو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدّو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے۔ میں نے دُور سے ایک شاقُول اس میں پھینکا تو وہ ۲۵ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا، اور اُس رسّی کا سرا گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔ مفصّل معلومات کے لیے مُلاحظہ ہو:

——Arabia and The Isles Haroid Ingrams, London, 1946.

اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَ
اُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾
فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ
مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا
مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ

اگر واقعی تُو سچّا ہے۔“ اس نے کہا کہ ”اِس کا علم تو اللہ کو ہے[26]، میں صرف وہ پیغام تمھیں پہنچا رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے[27] ہو۔“ پھر جب انھوں نے اُس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے: ”یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا“ ــــــ ”نہیں[28]، بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے، اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔“ آخرِ کار اُن کا حال یہ ہوا کہ اُن کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اِس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں[29]۔ ان کو ہم نے

——The Unveiling of Arabia, R.H. Kirnan, London. 1937.

—— The Empty Quarter, Philby. London. 1933.

۲۶ – یعنی یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ تم پر عذاب کب آئے گا۔ اس کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے کہ تم پر کب عذاب نازل کیا جائے اور کب تک تمھیں مہلت دی جائے۔

۲۷ – یعنی تم اپنی نادانی سے میری اس تنبیہ کو مذاق سمجھ رہے ہو اور کھیل کے طور پر عذاب کا مطالبہ کیے جاتے ہو۔ تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ خدا کا عذاب کیا چیز ہوتا ہے اور تمھاری حرکات کی وجہ سے وہ کس قدر تمھارے قریب آ چکا ہے۔

۲۸ – یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ اُن کو یہ جواب کس نے دیا۔ کلام کے انداز سے خود بخود یہ مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ وہ جواب تھا جو اصل صورتِ حال نے عملاً ان کو دیا۔ وہ سمجھے تھے کہ یہ بادل ہے جو ان کی وادیوں کو سیراب کرنے آیا ہے، اور حقیقت میں تھا وہ ہوا کا طوفان جو انھیں تباہ و برباد کرنے کے لیے بڑھا چلا آ رہا تھا۔

مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ
اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَآ اَبْصَارُهُمْ وَ لَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ
مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا
كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۲۶ ع۳ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ
الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۲۷ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ
الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا

وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے[30]۔ اُن کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل، سب کچھ دے رکھے تھے، مگر نہ وہ کان اُن کے کسی کام آئے، نہ آنکھیں، نہ دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے[31]، اور اُسی چیز کے پھیر میں وہ آ گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ ع

تمھارے گردوپیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے اُن کو سمجھایا، شاید کہ وہ باز آ جائیں۔ پھر کیوں نہ اُن ہستیوں نے اُن کی مدد کی جنھیں اللہ کو چھوڑ کر انھوں نے تقرُّب اِلی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا[32]؟ بلکہ وہ تو ان سے

۲۹ – قومِ عاد کے قصّے کی تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۱ تا ۵۶، ہود، حواشی ۵۴ تا ۶۵۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۳۴ تا ۳۷، الشعراء، حواشی ۸۸ تا ۹۴، العنکبوت، حاشیہ ۶۵۔ جلد چہارم، حٰم السجدہ، حواشی ۲۰-۲۱۔

۳۰ – یعنی مال، دولت، طاقت، اقتدار، کسی چیز میں بھی تمھارا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ تمھارا دائرۂ اقتدار تو شہر مکہ کے حُدود سے باہر کہیں بھی نہیں، اور وہ زمین کے ایک بڑے حصّے پر چھائے ہوئے تھے۔

۳۱ – اس مختصر سے فقرے میں ایک اہم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ خدا کی آیات ہی وہ چیز ہیں جو انسان کو حقیقت کا صحیح فہم و اِدراک بخشتی ہیں۔ یہ فہم و اِدراک انسان کو حاصل ہو تو وہ آنکھوں سے ٹھیک دیکھتا ہے، کانوں سے ٹھیک سنتا ہے، اور دل و دماغ سے ٹھیک سوچتا اور صحیح فیصلے کرتا ہے۔ لیکن جب وہ آیاتِ الٰہی کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اُسے نگاہِ حق شناس نصیب نہیں ہوتی، کان رکھتے ہوئے بھی وہ ہر کلمۂ نصیحت کے لیے بہرا ہوتا ہے، اور دل و دماغ کی جو نعمتیں خدا نے اسے دی ہیں ان سے اُلٹی سوچتا اور ایک سے ایک غلط نتیجہ اخذ کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک

عَنۡهُمۡ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفۡكُهُمۡ وَمَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَ اِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَيۡكَ
نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوۡهُ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا ۚ

کھوئے گئے، اور یہ تھا اُن کے جھُوٹ اور اُن بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے۔

(اور وہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے) جب ہم جِنّوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں[۳۳]۔ جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انھوں نے آپس میں کہا: خاموش

کہ اس کی ساری قوتیں خود اس کی اپنی ہی تباہی میں صَرف ہونے لگتی ہیں۔

۳۲ – یعنی اُن ہستیوں کے ساتھ عقیدت کی ابتدا تو انھوں نے اس خیال سے کی تھی کہ یہ خدا کے مقبول بندے ہیں، ان کے وسیلے سے خدا کے ہاں ہماری رسائی ہوگی۔ مگر بڑھتے بڑھتے انھوں نے خود انھی ہستیوں کو معبُود بنالیا، انھی کو مدد کے لیے پکارنے لگے، انھی سے دعائیں مانگنے لگے، اور انھی کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ یہ صاحبِ تصَرُّف ہیں، ہماری فریاد رسی و مشکل کشائی یہی کریں گے۔ اِس گمراہی سے ان کو نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات اپنے رسولوں کے ذریعے سے بھیج کر طرح طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے ان جھوٹے خداؤں کی بندگی پر اَڑے رہے اور اصرار کیے چلے گئے کہ ہم اللہ کے بجائے انھی کا دامن تھامے رہیں گے۔ اب بتاؤ، ان مشرک قوموں پر جب ان کی گمراہی کی وجہ سے اللہ کا عذاب آیا تو ان کے وہ فریاد رس اور مشکل کشا معبود کہاں مر رہے تھے؟ کیوں نہ اس بُرے وقت میں وہ ان کی دست گیری کو آئے؟

۳۳ – اس آیت کی تفسیر میں جو روایات حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرات حَسَن بصریؒ، سعید بن جُبیرؒ، زِرّ بن حُبَیشؒ، مجاہدؒ، عِکرِمہؒ اور دوسرے بزرگوں سے منقول ہیں، وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ جِنّوں کی پہلی حاضری کا یہ واقعہ، جس کا اس آیت میں ذکر ہے، بطنِ نَخلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ابنِ اسحاق، ابونُعَیم اصفہانی اور واقدی کا بیان ہے کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مایوس ہوکر مکۂ معظّمہ کی طرف واپس ہوئے تھے۔ راستے میں آپؐ نے نَخلہ میں قیام کیا۔ وہاں عشا یا فجر یا تہجُّد کی نماز میں آپؐ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جِنّوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا، اور وہ آپؐ کی قراءت سننے کے لیے ٹھیر گیا۔ اس کے ساتھ تمام رِوایات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اس موقع پر جِنّ حضورؐ کے سامنے نہیں آئے تھے، نہ آپؐ نے ان کی آمد کو محسوس فرمایا تھا، بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے آپؐ کو ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی۔

یہ مقام جہاں یہ واقعہ پیش آیا، یا تو الزَّیمہ تھا، یا السَّیل الکبیر، کیونکہ یہ دونوں مقام وادیِ نَخلہ میں واقع ہیں، دونوں جگہ پانی اور سرسبزی موجود ہے، اور طائف سے آنے والوں کو اگر اس وادی میں پڑاؤ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ انھی دونوں میں سے کسی جگہ ٹھیر سکتے ہیں۔ نقشے میں ان مقامات کا موقع مُلاحظہ ہو:

(نقشہ اگلے صفحے پر ہے)

فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا
سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ
اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ
اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾

ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انھوں نے جا کر کہا: ”اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سُنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہِ راست کی طرف[۳۴]۔ اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمھیں عذابِ الیم سے بچا[۳۵] دے گا۔“

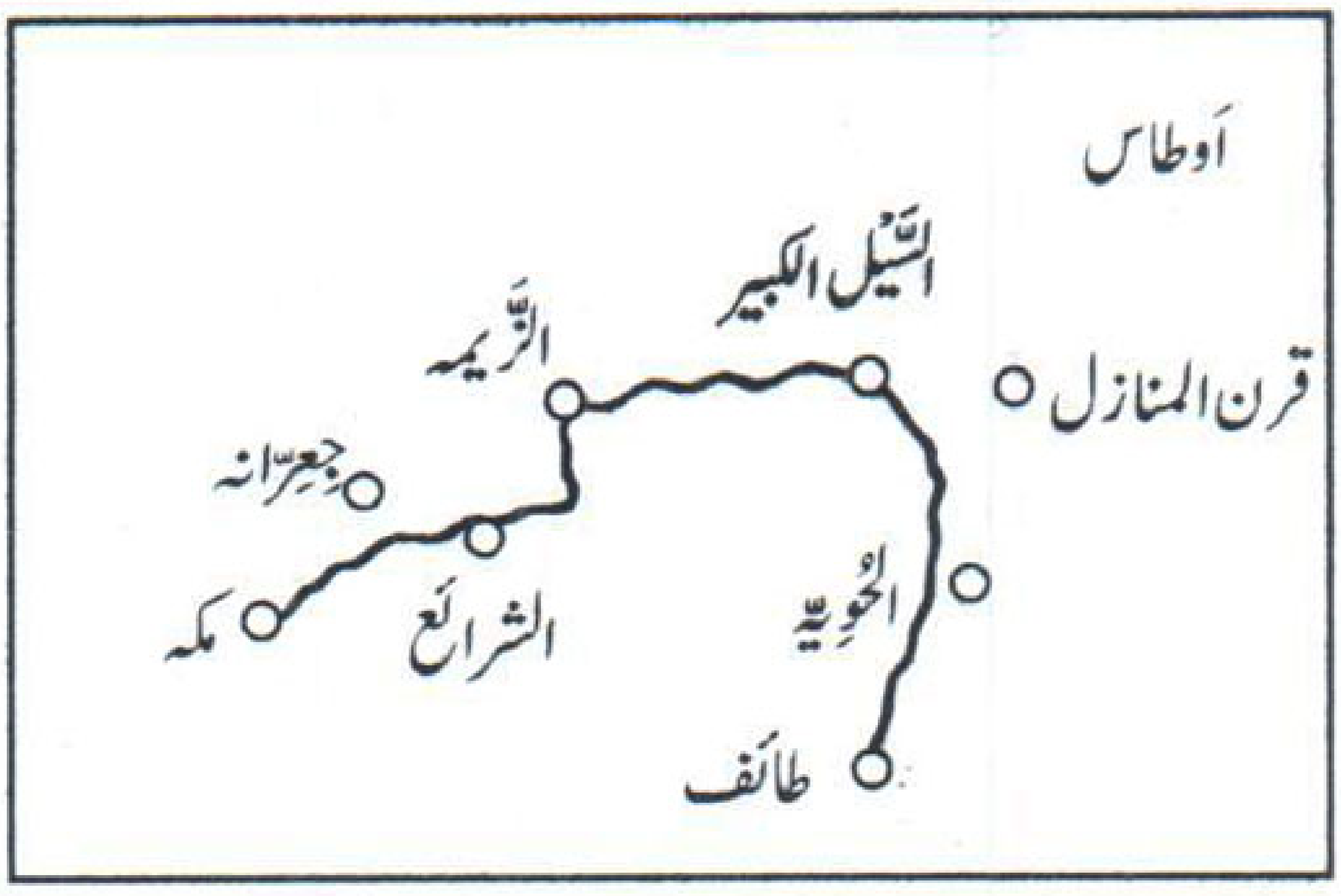

۳۴ - اس سے معلوم ہوا کہ یہ جنّ پہلے سے حضرت موسیٰؑ اور کتبِ آسمانی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ قرآن سننے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاؑ دیتے چلے آرہے ہیں، اس لیے وہ اِس کتاب، اور اس کے لانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے۔

۳۵ - معتبر رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد جنّوں کے پے در پے وفود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے لگے اور آپؐ سے ان کی رُو در رُو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بارے میں جو رِوایات کُتُبِ حدیث میں منقول ہوئی ہیں، ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکۂ معظّمہ میں کم از کم چھ وفد آئے تھے۔

ان میں سے ایک وفد کے متعلق حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں رات بھر غائب رہے۔ ہم لوگ سخت پریشان تھے کہ کہیں آپؐ پر کوئی حملہ نہ کر دیا گیا ہو۔ صبح سویرے ہم نے آپؐ کو حِرا کی طرف سے

وَ مَنۡ لَّا یُجِبۡ دَاعِیَ اللّٰہِ فَلَیۡسَ بِمُعۡجِزٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَیۡسَ
لَہٗ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَ لَمۡ
یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ لَمۡ
یَعۡیَ بِخَلۡقِہِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیَِۧ الۡمَوۡتٰی ؕ بَلٰۤی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ
قَدِیۡرٌ ﴿۳۳﴾ وَ یَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ ؕ

اور[٣٦] جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے، وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بُوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زِچ کر دے، اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سر پرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچا لیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور کیا اِن لوگوں کو یہ سُجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے ہیں اور ان کو بناتے ہوئے جو نہ تھکا، وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو جِلا اٹھائے؟ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے، اُس وقت اِن سے پوچھا جائے گا:

آتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر آپؐ نے بتایا کہ ایک جِنّ مجھے بلانے آیا تھا، میں نے اس کے ساتھ آ کر یہاں جِنّوں کے ایک گروہ کو قرآن سنایا۔ (مسلم، مُسنَدِ احمد، ترمِذی، ابوداؤد)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود ہی کی ایک اور رِوایت ہے کہ ایک مرتبہ مکّے میں حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ آج رات تم میں سے کون میرے ساتھ جِنّوں کی ملاقات کے لیے چلتا ہے؟ میں آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مکہ کے بالائی حصّے میں ایک جگہ حضورؐ نے لکیر کھینچ کر مجھ سے فرمایا کہ اس سے آگے نہ بڑھنا۔ پھر آپؐ آگے تشریف لے گئے اور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے اشخاص ہیں جنھوں نے آپؐ کو گھیر رکھا ہے اور وہ میرے اور آپؐ کے درمیان حائل ہیں۔ (ابنِ جَریر۔ بَیہقی، دلائل النبوۃ۔ ابوُنعَیم اصفہانی، دلائل النبوۃ)

ایک اور موقع پر بھی رات کے وقت حضرت عبداللہؓ بن مسعود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور مکۂ معظّمہ میں حَجُون کے مَقام پر جِنّوں کے ایک مُقدّمے کا آپؐ نے فیصلہ فرمایا۔ اس کے سال ہا سال بعد ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں جاٹوں کے ایک گروہ کو دیکھ کر کہا: حَجُون کے مقام پر جِنّوں کے جس گروہ کو میں نے دیکھا تھا، وہ ان لوگوں سے بہت مشابہ تھا۔ (ابنِ جَرِیر)

٣٦ — ہوسکتا ہے کہ یہ فقرہ بھی جِنّوں ہی کے قول کا حصّہ ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اُن کے قول پر اللہ تعالیٰ کی

اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا
تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا
سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع

"کیا یہ حق نہیں ہے؟" یہ کہیں گے: "ہاں، ہمارے رب کی قسم! (یہ واقعی حق ہے)۔" اللہ فرمائے گا: "اچھا تو اَب عذاب کا مزا چکھو، اپنے اُس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے۔"

پس اَے نبیؐ! صبر کرو جس طرح اُولُوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔[۳۷] جس روز یہ لوگ اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انھیں خوف دلایا جا رہا ہے، تو اِنھیں یوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی، اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟ ع

طرف سے اضافہ ہو۔ فَحوائے کلام سے دوسری بات زیادہ قرینِ قیاس محسوس ہوتی ہے۔

۳۷۔ یعنی جس طرح تمھارے پیش رَو انبیاؑ اپنی قوم کی بے رُخی، مخالفت، مزاحمت اور طرح طرح کی ایذا رسانیوں کا مقابلہ سال ہا سال تک مسلسل صبر اور اَن تھک جِدّوجُہد کے ساتھ کرتے رہے اسی طرح تم بھی کرو، اور یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ یا تو یہ لوگ جلدی سے ایمان لے آئیں، یا پھر اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دے۔

فہرست موضوعات

الف

ابراہیم علیہ السلام

— قصہ ابراہیم علیہ السلام ۲۹۱ تا ۳۰۱- ۵۳۴-۵۳۵

— آپؑ کی وہ خصوصیت جس میں کوئی نبی آپؑ کا شریک نہیں ۱۲۶- ۱۲۷

— آپؑ کے پاکیزہ اوصاف ۲۹۱- ۳۴۳

— آپؑ کی طرف جھوٹ کی نسبت اور اس کی حقیقت ۲۹۲- ۲۹۳

— آپؑ کا سب سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرنا ۲۹۱- ۵۳۴

— آپؑ کا جھوٹے معبودوں کے بارے میں اپنے باپ اور اپنی قوم سے خطاب ۲۹۲- ۵۳۴

— آپؑ کا اپنی قوم کے بتوں کو توڑنا ۲۹۳

— آپؑ کا آگ سے بچایا جانا ۲۹۳- ۲۹۴

— آپؑ کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے ۴۸۶

— آپؑ حضرت نوحؑ کے طریقے پر چلنے والے تھے ۲۹۱

— اپنے ملک سے آپؑ کی ہجرت ۲۹۴

— آپؑ بے اولاد تھے، اولاد کے لیے آپؑ کی دعا اور پہلے بیٹے کی بشارت ۲۹۴- ۲۹۵

— بیٹے کی قربانی کا واقعہ ۲۹۴ تا ۳۰۱

— ’’بڑی قربانی‘‘ فدیے میں دے کر بچہ چھڑا لیا گیا ۲۹۶

— آپؑ کا خواب دراصل وحی اور ایک حکم تھا ۲۹۵

— یہ بحث کہ آپؑ نے قربانی حضرت اسماعیلؑ کی پیش کی تھی یا حضرت اسحاقؑ کی ۲۹۷ تا ۳۰۱

— آپؑ کو حضرت اسحاقؑ کی بشارت ۲۹۷

— آپؑ کو اور حضرت اسحاقؑ کو برکت دی گئی ۲۹۷

— آپؑ کلمہ حق اپنی اولاد کے لیے چھوڑ گئے لیکن انھوں نے غیر اللہ کی بندگی شروع کر دی ۵۳۴-۵۳۵

— آپؑ تقلید آبائی کے نہیں بلکہ تقلید حق کے قائل تھے ۵۲۱- ۵۳۴- ۵۳۵

— آپؑ سے اور تمام انبیاؑ سے عہد لیا گیا ۷۳ تا ۷۵

ابلیس

— قصہ آدم و ابلیس ۳۴۷ تا ۳۵۰

— گمراہ انسان اس کی توقعات پوری کرتا ہے ۱۹۳- ۱۹۴

— اس کو انسان پر یہ اقتدار حاصل نہیں کہ زبردستی اسے اپنے راستے پر کھینچ کر لے جائے ۱۹۴- ۱۹۵

— انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے پر وہ کافروں میں سے ہو گیا ۳۴۸

(تفصیلات کے لیے دیکھو ’’شیطان‘‘)

اجر

— کیسے لوگ اس کے مستحق ہیں ۸۴- ۲۲۱- ۲۳۲- ۲۳۳- ۲۴۸- ۳۶۳- ۳۸۴- ۳۸۵- ۴۴۱- ۴۴۲- ۵۱۱

— اجرِ عظیم کیسے لوگوں کے لیے ہے ۸۴-۹۴-۹۷
— دہرا اجر کیسے لوگوں کے لیے ہے ۸۷-۸۸
— اجر کریم کن لوگوں کے لیے ہے ۱۰۴
— بے حساب اجر کن لوگوں کے لیے ہے ۳۶۳-۳۶۴
— نیکوکاروں کو اجر دینے سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ۳۷۲-۳۷۳
— نیکی کا اجر بے حساب ملے گا بشرطیکہ آدمی مومن ہو ۴۱۱
— مرد اور عورت سب کے لیے ایمان اور عمل صالح کا اجر یکساں ہے ۴۱۱

احسان

— معنی و تشریح ۸۴-۸۵
— نیکی کی حقیقت ۷-۸-۲۱
— نیکی کا راستہ نجات کا راستہ ہے ۴۱۱
— اللہ تعالیٰ نیکی میں خوبی کا اضافہ کر دیتا ہے ۵۰۰
— نیکی ہی انسان کے درجات بلند کرتی ہے ۲۲۳
— نیکی انسان اپنے لیے ہی کرتا ہے اور برائی کا خمیازہ بھی وہ خود ہی بھگتے گا ۵۸۴
— محسنین کون ہیں ۷-۸۴-۸۵-۶۰۹
— قرآن محسنین کو بشارت دیتا ہے ۶۰۸-۶۰۹
— محسنین کا انجام نیک ۲۹۱-۲۹۶-۳۰۲-۳۰۵-۳۷۲-۳۷۳-۴۱۱-۵۰۰

احکام القرآن

— ۱۲ تا ۱۸-۲۱-۴۵-۴۶-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۳-۸۰-۸۱-۸۴-۸۵-۸۷ تا ۸۹-۹۰ تا ۹۷-۹۸-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۹-۱۱۲ تا ۱۱۹-۱۱۹ تا ۱۲۲-۱۲۳-۱۲۹ تا ۱۳۱-۱۳۴-۱۳۵-۱۷۹-۱۸۹-۱۹۲-۱۹۳-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۲-۲۳۳-۲۵۳-۲۶۶-۲۶۷-۲۷۳-۳۲۶-۳۲۷-۳۵۵-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۷۹-۳۹۸-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۸-۴۲۴-۴۴۱-۴۵۴-۴۵۶ تا ۴۵۹-۴۶۰-۴۶۵-۴۸۳ تا ۴۸۵-۴۸۶-۴۹۴-۴۹۵-۵۰۰-۵۰۷ تا ۵۱۲-۵۵۳-۵۷۳-۵۸۴-۵۸۶-۵۸۷-۶۰۹-۶۲۱
(تفصیلات کے لیے دیکھو: ''اسلامی ریاست''، ''جہاد''، ''اخلاق اور اخلاقی تعلیمات''، ''حکمتِ تبلیغ''، ''اسلامی نظامِ معاشرت''، ''قانونِ اسلام'')

آخرت

— دین میں عقیدۂ آخرت کی اہمیت ۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۸-۱۹۴-۱۹۵-۲۱۶
— اس کے دلائل ۳۷ تا ۴۱-۱۷۵-۱۹۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۳۳۱-۳۳۲-۳۶۶-۴۰۱ و ۴۰۲-۴۱۴-۴۱۷-۴۱۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۶۱-۵۲۷-۵۵۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۷ و ۵۷۸-۵۸۷-۵۸۸-۵۹۰ تا ۵۹۲-۶۰۰-۶۲۰
— اس کے امکان کے دلائل ۲۳-۲۴-۴۱-۴۳-۱۷۴-۲۲۳-۴۱۷
— وقوعِ آخرت پر اخلاقی استدلال ۵۸۷
— وقوعِ آخرت کا قطعی فیصلہ ۴۱۷-۴۱۸
— اس کے برپا کیے جانے کا مقصد ۱۷۴-۱۷۵
— کائنات کے موجودہ نظام کے لیے ایک مدت مقرر ہے ۲۲۶-۶۰۰
— آخرت کا وقوع عقل و انصاف کا تقاضا ہے

۱۷۵-۴۶۵-۴۶۶-۵۸۷

— اس کا آنا یقینی ہے ۲۶- ۲۷- ۲۲۰- ۴۱۷-
۴۱۸-۴۸۱

— اس کا وقت طے شدہ ہے ۵۷۰

— اللہ کا وعدہ برحق اور سچا ہے، آخرت کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے ۲۶-۵۹۳-۶۱۲

— آخرت کے واقع ہونے کی اطلاع دے کر انسان کے ساتھ بہت بڑی بھلائی کی گئی ہے ۶۰۰

— راست باز اور گمراہ لوگوں کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا ۲۲۹-۵۸۷

— اس کو یاد رکھنے اور اس کے لیے سعی و کوشش کرنے کے ثمرات ونتائج ۳۴۳

— آخرت کی کامیابی ہی عظیم الشان کامیابی ہے اور انسان کو اسی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے ۲۸۹-۳۹۶

— آخرت کی زندگی ہی بہتر اور پائدار ہے ۵۰۷

— عقیدۂ آخرت کے اخلاقی نتائج ۵۲۸-۵۲۹

— اس کو نہ ماننے کے اخلاقی نتائج ۱۹۴- ۱۹۵-
۲۸۱- ۳۲۷- ۳۷۶- ۴۰۵- ۴۷۱- ۴۹۷-
۵۷۸-۵۹۰-۵۹۳-۶۰۱-۶۱۳

— انسان کے اخلاق کو درست رکھنے کے لیے آخرت کا عقیدہ ناگزیر ہے ۵۷۰

— اس کے بارے میں شک کرنے والوں اور اس سے غفلت برتنے والوں کا انجام ۵۹۳-۵۹۴

— انکار آخرت اور آخرت میں شک رکھنے کے نتائج یکساں ہیں ۵۹۳-۵۹۴

— انکار واقرارِ آخرت میں انسان کا اپنا ہی نقصان و فائدہ مضمر ہے ۵۷۰-۵۷۱

— منکرین آخرت گمراہ کن شک میں مبتلا ہیں
۱۹۴-۲۱۴-۵۴۷

— منکرینِ آخرت گمان اور خواہشات نفس کی بنا پر نہ کہ یقین و دلیل کی بنیاد پر، ایک عقیدہ بنائے بیٹھے ہیں ۵۹۰-۵۹۱

— تمام دلائل کے جواب میں منکرینِ آخرت کی آخری حجت کیا ہوتی ہے ۵۹۰-۵۹۱

— منکرینِ آخرت جہالت اور افلاس فکر ونظر میں مبتلا ہیں ۵۹۲

— منکرینِ آخرت پر ان کے اعمال کی برائی کھل جائے گی ۳۷۷-۵۹۳

— منکرینِ آخرت کو آخرت میں اللہ اسی طرح بھلا دے گا جس طرح انھوں نے آخرت کو بھلا دیا ہے ۴۵-۵۹۴

— منکرینِ آخرت کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے ۵۹۴

— منکرینِ آخرت پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے اور وہ گھاٹے میں رہ جانے والے ہیں ۶۱۲

— منکرین آخرت اسی دنیا کی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں ۵۶۹-۵۹۰

— منکرینِ آخرت مذاق کے طور پر آخرت کی تاریخ اور وقت پوچھتے ہیں ۲۸- ۲۹- ۱۳۳-
۲۶۴

— منکرین آخرت کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے تو دوبارہ ہماری بوسیدہ ہڈیوں کو کیسے جمع کیا جائے گا ۴۱ تا ۴۴- ۱۷۶-
۲۷۲-۲۷۳-۲۸۲-۲۸۸

— منکرین آخرت کا یہ مطالبہ کہ ہمارے باپ دادا کو اٹھا لاؤ ۲۸۲-۵۶۹-۵۹۰-۵۹۱

— آخرت پر منکرین کے اعتراضات ۱۷۶

— منکرینِ آخرت کا استدلال ۴۱-۱۷۴-

۵۶۹-۵۷۷-۵۹۰-۵۹۱-۶۱۲
— ان کے استدلال کا جواب ۴۱ تا ۴۴-۵۷۰
— انکارِ آخرت کے اصل محرکات ۴۱-۴۳-۱۷۷-۴۶۷-۵۷۸-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۶۱۳
— اس کا انکار سخت گمراہی ہے ۱۷۶-۳۲۷
— اس کا انکار کفر ہے ۳۳۱-۶۲۰-۶۲۱
— اس کا انکار بدنصیبی ہے ۶۱۲
— منکرینِ آخرت کا انجام ۴۵- ۲۱۳- ۲۱۴-۳۳۱-۴۴۱-۵۹۴-۶۲۰-۶۲۱
— دنیا پرستوں کی یہ غلط فہمی کہ جو یہاں مزے کر رہا ہے وہ آخرت میں بھی مزے کرے گا ۲۰۶-۳۹۳-۴۰۱ و ۴۰۲-۴۶۷ ۴۶۴ و ۴۶۸
— انکارِ آخرت کی غیر معقولیت ۲۸
— آخرت پر ایمان لانے والے اس سے ڈرتے ہیں اور منکرینِ آخرت اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں ۴۹۷
— آخرت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے والے گمراہ ترین لوگ ہیں ۴۹۷
— آخرکار سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے ۱۷-۲۱-۲۲۹-۲۷۳-۳۶۱-۳۷۶-۳۹۱-۴۱۱-۴۲۸-۴۹۶-۵۵۱-۵۵۲-۵۸۶
— تمام معاملات کے فیصلے کا ایک وقت مقرر ہے ۳۹۷-۴۹۷-۵۱۷-۵۷۰
— اللہ نے اختلافات کے آخری فیصلے کا وقت پہلے ہی سے مقرر کر رکھا ہے ۳۷۷- ۴۶۴-۴۶۵-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۹-۵۸۶
— آخرت میں تمام اختلافات کا فیصلہ کر دیا جائے گا ۵۰-۲۰۱-۳۵۷-۳۷۷-۴۶۴
— آخرت میں فیصلہ ہونے والا اگر نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں عذاب بھیج دیتا ۴۹۴-۴۹۹
— آخرت کو ہر وقت اپنے سے قریب سمجھنا چاہیے ۴۹۷
— حساب کا دن ۳۲۷-۳۴۵-۴۰۵
— جزا و سزا کا دن ۲۸۲-۳۴۹
— بہت بڑا دن ۳۶۴
— اس روز اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کرے گا ۲۶-۲۰۲- ۲۵۵- ۲۶۵- ۳۹۹-۴۸۱-۴۸۲-۴۹۶-۵۵۸-۵۹۱-۶۰۲
— وہاں اگلی پچھلی نسلوں کا حساب ایک ساتھ ہوگا ۴۴۹-۴۵۰
— اس روز اللہ تعالیٰ بہت جلدی حساب لے لے گا ۴۰۰
— اس روز ایک گروہ کو جنت میں اور ایک کو دوزخ میں جانا ہے ۴۸۱
— وہاں دنیا کی زندگی ایک گھڑی بھر سے زیادہ معلوم نہ ہوگی ۲۶۵-۶۲۱
— انسان کا اصل گھر آخرت ہی کا گھر ہے ۳۴۳-۴۱۰
— آخرت کی ناکامی ہی اصل ناکامی ہے ۳۶۴
— آخرت کی خوش خبری کن لوگوں کے لیے ہے ۳۶۵
— آخرت کی کامیابی کے لیے ضروری اوصاف ۵۰۷
— آخرت کے برپا ہونے کی کیفیت ۲۶۴-۲۶۵-۲۸۲-۳۸۳ تا ۳۸۵- ۳۹۹ تا ۴۰۱-۴۴۹ تا ۴۵۲
— وہ اچانک برپا ہوگی ۵۴۹
— وہاں کی زندگی نہ صرف جسمانی ہوگی بلکہ جسم بھی یہی ہوگا جس میں انسان یہاں کام کرتا رہا ہے ۱۷۴- ۱۷۵- ۱۷۶- ۱۷۷- ۲۶۸-۲۶۹-۴۵۰-۴۵۱
— آخرت محض روحانی عالم نہیں ہے ۴۵۰

— وہاں سماعت اور بینائی کی قوتیں اس دنیا سے مختلف ہوں گی ۲۸۸
— وہاں کے عذاب کی سختی ۳۷۷
— رسوا کن اور کبھی نہ ٹلنے والا عذاب ۳۷۴-۳۷۵
— آخرت کے روز بڑی ضرب لگائی جائے گی ۵۶۳
— وہ وقت قریب ہی آ لگا ہے ۴۰۰-۴۰۱
— وہاں عذاب الٰہی پر کفار کوئی احتجاج نہ کرسکیں گے ۵۱۴
— کفار جس حالت میں مبتلا ہوں گے اسے نہ وہ خود بدل سکیں گے نہ اللہ کے مقابلے میں کوئی ان کی مدد کرسکے گا ۵۱۳-۵۱۴
— کفار پر آخرت میں لعنت پڑی ہوگی اور وہاں ان کے لیے بدترین ٹھکانا ہے ۴۱۵
— وہاں اصل گھاٹے میں رہنے والے کون ہیں ۳۶۴-۳۶۵-۴۳۱-۵۹۲
— وہاں کا عذاب کیسے لوگوں کے لیے ہے ۲۸۵-۳۰۵-۵۴۸
— وہاں اہلِ ایمان کو کیا اجر دیا جائے ۴۶-۴۱۴
— وہاں خوف وحزن سے کون محفوظ ہوں گے ۵۴۹
— وہاں کیسے لوگوں کو امن نصیب ہوگا ۴۶۲
— دنیا و آخرت کی بھلائی کن لوگوں کے لیے ہے ۳۶۳
— وہاں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا سلوک ہوگا ۲۳۳ تا ۲۳۷
— وہاں بچوں کی حیثیت کیا ہوگی ۲۸۶-۲۸۷
— وہ ایمان لانے اور عمل کرنے کی جگہ نہیں بلکہ اعمال کا نتیجہ دیکھنے کی جگہ ہے ۵۱-۲۱۳
— وہاں انھی اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو دنیا میں کیے گئے ہوں گے ۲۸۵-۳۶۸
— اس روز انسان کے اعمال کی حقیقت کھول دی جائے گی ۱۶-۱۷-۳۶۱
— وہاں سب اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے ۳۹۹
— اس روز اللہ سے کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی ۳۹۹
— اس روز کفار بھیس بدل کر بھی کہیں نہ چھپ سکیں گے ۵۱۴
— اس روز سارا عالم اللہ واحد القہار کی بادشاہی کا اقرار کرلے گا ۳۹۹
— اس روز زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی ۳۸۳
— اس روز پوری کائنات اللہ کی حمد پکار اٹھے گی ۳۸۵
— اس روز معلوم ہوجائے گا کہ بادشاہی اللہ ہی کی ہے ۳۹۹
— اس روز ہر متنفس کو اپنے کسب کا بدلہ مل جائے گا ۳۹۹-۵۸۷
— اس روز اچھے اور برے انسانوں سے کیا سلوک ہوگا ۳۴۴ تا ۳۴۶-۵۷۱ تا ۵۷۳
— اس روز انسان اپنے کرتوتوں کے نتائج دیکھ لے گا ۳۷۷
— وہاں بڑے بڑے ہیکڑ لوگ گھٹنوں کے بل آرہیں گے ۲۸۳-۵۹۲
— وہاں مجرم چاہیں گے کہ انھیں دنیا میں واپس بھیج کر ایک اور موقع دیا جائے ۴۴-۲۳۷-۳۸۰-۳۸۱-۵۱۳
— ان کی اس خواہش کا جواب ۲۳۷-۳۸۱
— کفار پوچھیں گے کہ عذاب سے کیسے بچیں ۳۹۷
— وہاں انسان کو رجوع کا کوئی موقع نہ دیا جائے گا

۲۱۳-۴۵۲-۵۱۴
— وہاں ندامت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا ۵۳۹
— وہاں انسان کی توبہ اور معذرت قبول نہ ہو گی ۵۱-۴۱۴-۵۹۴
— مجرمین سزا پا کر رہیں گے، خواہ آہ وزاری کریں یا صبر کر کے بیٹھ رہیں ۴۵۲
— وہاں مجرمین کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہوگا ۲۳۷-۴۰۰-۴۴۹-۵۱۴-۵۹۴
— وہاں اللہ کے رحم کے سوا کوئی چیز انسان کو عذاب سے بچانے والی نہیں ہے ۵۷۱
— آخرت کو نہ اللہ ٹالے گا نہ کوئی اور ٹال سکتا ہے ۵۱۴
— وہاں مجرمین کے اولیا ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے ۳۸۳-۵۸۴
— مشرکوں کے الٰہوں اور ان کے اولیا کی کوئی حیثیت نہ ہوگی ۴۰۱
(نیز دیکھو ’’ولی‘‘)
— وہاں مجرموں کا کوئی ایسا شفیع نہ ہوگا جس کی بات لازماً مانی جائے ۳۷۶-۴۰۰-۴۰۱
— وہاں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا ۲۶-۲۷-۲۰۹-۲۲۷-۲۲۸-۲۸۳-۵۷۰-۵۷۱
— وہاں کفار اپنے پیشواؤں پر لعنت بھیجیں گے اور ان کے لیے دہرے عذاب کا مطالبہ کریں گے ۱۳۴
— وہاں گمراہ یہ چاہیں گے کہ ان کے گمراہ کرنے والے پیشوا ان کے حوالے کر دیے جائیں تو وہ ان کو پاؤں تلے روند ڈالیں ۴۵۳-۴۵۴
— وہاں متقین کے سوا سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے ۵۴۹
— وہاں مجرموں کو کوئی جائے پناہ نہ ملے گی ۴۶۷-۵۱۴
— وہاں مجرم انسانوں کے باہمی رشتے کاٹ دیے جائیں گے ۲۶۶-۲۶۷
— وہاں مجرمین اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوئی تدبیر نہ کر سکیں گے ۵۱۴
— وہاں سب نافرمان اور ان کے معبود گھیر لائے جائیں گے اور جہنم واصل کیے جائیں گے ۲۸۳-۲۸۵-۴۴۹
— وہاں پیشوا اور پیرو عذاب میں مشترک ہوں گے ۲۸۵
— وہاں پیرو اپنے پیشواؤں کو کوسیں گے ۳۴۵-۳۴۶
— وہاں گمراہ پیشوا اور پیرو ایک دوسرے کو مجرم ٹھیرائیں گے ۲۰۴ تا ۲۰۶- ۲۸۳- ۲۸۴-۴۱۳-۴۱۴
— شیطان اور اس کے پیرووں کا آپس میں جھگڑا ۵۳۸-۵۳۹
— شیطان اور اس کے پیرو عذاب میں مشترک ہوں گے ۵۳۹
— مشرکین اپنے معبودوں کا انکار کریں گے ۴۲۷-۴۶۶-۴۶۷
— وہاں مشرکین کے معبود اپنے پرستاروں سے براءت کا اظہار کریں گے ۲۰۸-۲۰۹-۲۲۶-۲۲۷-۶۰۳
— وہاں کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا ۲۲۷-۲۲۸-۳۶۱
— وہاں مجرمین پر ان کے اعمال کی برائی کھل جائے گی اور وہ اس کا اعتراف کریں گے ۳۹۷-۵۹۳
— وہاں انسان کا حسن عمل ضائع نہ ہو گا ۲۳۲-۲۳۳-۳۷۳
— وہاں اللہ تعالیٰ بتا دے گا کہ کون کیا کر کے آیا ہے ۱۷-۲۱-۳۶۱-۴۶۷

— وہاں ہر شخص سے اس کے اپنے عمل کی باز پرس ہوگی ۲۰۰-۲۰۱
— وہاں کس چیز کی باز پرس ہونی ہے ۲۰۸-۲۰۹
— وہاں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا اور کسی پر کسی دوسرے کا بوجھ نہیں لادا جائے گا ۲۶-۲۲۷-۴۹۵-۴۹۶
— وہاں مجرموں کو ان کے عمل کے مطابق سزا دی جائے گی ۲۸۵
— وہاں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا ۲۶۶-۳۸۳-۵۹۲-۶۱۳
— وہاں ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے متعین ہوگا ۶۱۴
— وہاں باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے ۵۹۲
— وہاں اہلِ ایمان کا استقبال کس طرح ہوگا ۱۰۴-۱۰۵
— وہاں جزا و سزا کس قاعدے پر مبنی ہوگی ۲۰۶-۲۰۷-۲۸۵
— وہاں مومن اور فاسق کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا ۴۶-۴۷
— وہاں اللہ کی عدالت میں فیصلہ کس طرح ہوگا ۳۸۳-۴۰۱-۵۷۰-۵۷۱
— وہاں کسی پر ظلم نہ ہوگا ۲۶۶-۲۸۳-۴۰۰-۶۱۳
— وہاں کس طرح خدا کی عدالت میں ملزموں کی پیشی ہوگی ۴۴
— مشرکین اپنے انجام سے ڈر رہے ہوں گے مگر وہ ان پر آ کر رہے گا ۵۰۰
— جب ظالم جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے زمین میں گڑے جا رہے ہوں گے ۵۱۳
— کفار خوف زدہ آنکھوں سے جہنم کی طرف دیکھیں گے ۵۱۳
— کفار کا انجام دیکھ کر مومن بے اختیار پکار اٹھیں گے کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا ہے ۵۱۳
— وہاں لوگوں کے اعمال پر کس کس طرح شہادت قائم کی جائے گی ۱۷-۱۰۶-۱۰۷-۳۸۳-۳۸۴-۴۱۴-۵۹۲
— انبیاؑ گواہی کے لیے حاضر کیے جائیں گے ۳۸۳
— نامۂ اعمال کی پیشی (دیکھو نامۂ اعمال)
— وہاں مجرموں کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے ۲۶۸-۲۶۹-۴۴۹-۴۵۰
— وہاں ہر وہ چیز بول اٹھے گی جس کے سامنے یا جس پر انسان نے کوئی کام کیا ہوگا ۴۵۰-۴۵۱
— ان انسانوں کے ہاتھ پاؤں سے گواہی طلب کی جائے گی جو نامۂ اعمال کے صحیح ہونے کا انکار کریں گے ۲۶۸-۴۵۰
— وہاں آدمی اپنے کسی جرم کا انکار نہ کرسکے گا ۵۱۴
— وہاں حق کی طرف بلانے والوں اور منکرین حق کا مقدمہ پیش ہوگا ۳۷۲
— وہاں تمام معاملات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا ۲۰۱-۲۰۲-۲۸۳
— وہاں کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور حق کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا ۳۸۵
— وہاں برائی کا بدلہ اتنا ہی ملے گا جتنی برائی کسی نے کی ہوگی ۴۱۰-۴۱۱
— نیکی کا اجر بے حساب ملے گا بشرطیکہ آدمی مومن ہو ۴۱۱
— وہاں مجرمین کی حالت کا نقشہ ۲۸۳-۲۸۴-۴۴۰
— وہاں سزا پانے والے کون ہوں گے اور اس سے بچنے والے کون ۲۹۰-۳۷۲-۳۷۳

۴۱۱ - ۴۲۸ - ۴۹۶ - ۵۲۸ - ۵۵۱ - ۵۸۶
— وہ جب چاہے تمام انسانوں کو جمع کر سکتا ہے ۵۰۴
— وہ ہمیشہ مبنی بر حقیقت بات کہتا ہے ۶۹ - ۳۴۹
— وہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا ۱۲۱
— وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت اور عدل کے مطابق کرتا ہے ۱۱
— اس کا انصاف بے لاگ ہے ۸۷ - ۸۸ - ۳۰ - ۳۰۷ - ۳۰۸ - ۳۲۵ - ۳۳۰ - ۳۳۳ - ۳۳۵ - ۳۳۶ - ۳۶۴ - ۳۷۸ - ۴۶۵
— وہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے ۴۰۹
— وہ مجرموں اور ظالموں سے انتقام لے کر رہتا ہے ۴۸
— وہ ظالموں سے انتقام لینے والا ہے ۳۷۳
— اس کا غضب کیسے لوگوں پر بھڑکتا ہے ۴۰۹ - ۴۹۷
— اس کے غضب کے مستحق کیسے لوگ ہیں اور کیوں ہیں ۳۹۶ - ۳۹۸
— اس کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی ۴۰۰
— بندوں کو ان کے اعمال کی سزا دینا اسی کا کام ہے ۴۸۰ - ۴۸۱
— تمام معاملات کا فیصلہ اسی کے ہاتھ ہے ۲۱ - ۲۰۱ - ۲۲۰
— تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۲۱ - ۵۱۷ - ۵۱۸
— اس کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا ۳۶۵
— اس کو سزا دینے اور معاف کرنے کا کلی اختیار ہے ۸۳
— غیب کا علم اسی کو ہے ۲۳۸ - ۲۶۶
— اللہ کے علم غیب کی چند مثالیں اور تشریح ۲۸ - ۲۹ - ۲۶۶
— وہ کائنات کی ہر کھلی اور چھپی چیز کو جانتا ہے ۱۷ - ۳۹ - ۲۳۸ - ۳۷۷
— وہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ۲۱ - ۱۱۷ - ۲۳۸ - ۳۶۱ - ۴۰۱ - ۵۰۳
— انسان اس سے کچھ نہیں چھپا سکتا ۱۷
— وہ لوگوں کی تمام حرکات دیکھ رہا ہے اور ان کی کوئی حرکت اس سے مخفی نہیں ۴۶۲ - ۴۷۱ - ۵۰۳ - ۵۰۴
— آدمی خواہ کوئی بات ظاہر کرے یا چھپائے اللہ کو اس کا علم ہے ۱۲۲ - ۴۷۱
— اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے ۳۹ - ۱۰۳ - ۱۷۳ - ۲۲۴ - ۳۹۴ - ۳۹۵ - ۴۶۶ - ۴۸۶
— اللہ کی صفات کا جامع بیان ۳۹۱
— اس کی قدرت اور اس کا علم تمام جزئیات پر حاوی ہے ۲۲۵
— اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے ۲۴ - ۵۰۴
— بندوں کے ہر کام سے باخبر ہے ۲۸ - ۶۹
— وہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے ۴۰۰
— وہ اپنے بندوں کی روش پر نگاہ رکھتا ہے ۵۰۴
— تمام انسانوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے ۲۴ - ۷۵ - ۲۲۳
— وہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے ۱۲۲
— قیامت کا علم اسی کو ہے ۵۵۱
— اس کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ۶۱۶
— اس کی صحیح معرفت حاصل ہونے کے ذرائع ۲۰ - ۲۱
— وہ اسی کو راہِ راست دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے اور وہ جسے چاہے اپنا کر لیتا ہے ۴۹۳
— وہ جسے چاہے گمراہی میں ڈالے اور جسے چاہے راہِ راست دکھائے ۲۲۱ - ۲۲۲
(تفصیل کے لیے دیکھو ''ضلالت'' اور ''تقدیر'')
— اس کی مشیت اور اس کی رضا میں فرق ۳۶۱
— اللہ کے کسی شخص کے سینے کو اسلام کے لیے کھولنے

— اس کی سزا پر اجماع ہے ۱۴۵
(نیز دیکھو ''قانونِ اسلام، فوجداری قوانین'')

آزمائش

— اللہ کی طرف سے انسان کی آزمائش کس کس طرح ہوتی ہے ۷۸-۸۲-۸۳-۱۹۴-۳۷۷-۳۷۸
— اہلِ ایمان کی آزمائش کس کس طرح کی جاتی ہے ۲۹۶-۲۹۷
— دنیا میں افراد اور قوموں کی آزمائش کس کس طرح کی جاتی ہے ۵۶۵-۵۶۸-۵۶۹

ازواجِ مطہراتؓ

— ان کے نام اور ان کی تعداد ۱۱۳-۱۱۴
— ان کا صدق ایمانی ۸۵
— ان کی زندگی مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ بنائی گئی تھی ۸۷تا۸۹
— یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تعلیمات لوگوں تک پہنچائیں جو آپؐ کی گھر کی زندگی میں ان کو حاصل ہوتی تھیں ۹۴
— ان کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل ۱۱۷
— وہ تمام مسلمانوں کے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں ۷۱-۷۲
— وہ مسلمانوں پر حرام کر دی گئیں ۶۷-۱۲۱-۱۲۲
— ان کو اللہ کے رسولؐ کی رفاقت اور زینت دنیا میں سے کسی ایک کو اپنے لیے پسند کر لینے کا اختیار دیا گیا جسے ''تخییر'' کہتے ہیں ۶۵-۸۴
— تخییر کے بعد جن ازواج مطہراتؓ نے حضورؐ کی رفاقت قبول کی ان کو طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کو نہ رہا تھا ۸۵-۱۱۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')

استکبار- دیکھو ''تکبر'' اور ''اخلاق''

اسحاق علیہ السلام

— آپؑ کی پیدائش کی بشارت ۲۹۷
— آپؑ کے امتیازی اوصاف ۲۹۹-۳۴۳
— یہ بحث کہ حضرت ابراہیمؑ نے قربانی حضرت اسماعیلؑ کی پیش کی تھی یا حضرت اسحاقؑ کی ۲۹۷ تا ۳۰۱
— بنی اسرائیل حضرت اسحاقؑ کی اولاد ہیں ۳۰۱

اسلام

— اس کی حقیقت اور اس کی روح ۲۱- ۷۹- ۲۷۷- ۲۹۶- ۳۵۴- ۳۵۵- ۳۶۴- ۳۷۹- ۳۸۰- ۴۲۴
— وہ دنیا میں غالب ہوکر رہنے کے لیے آیا ہے ۳۱۶-۳۱۷-۴۷۶
— اس کی عالم گیریت ۲۰۲-۲۰۳
— نظام اسلامی کی قوت جاذبہ ۲۱
— اس کی بنیادی قدریں ۹۷
— مسلم کسے کہتے ہیں ۹۴- ۹۵- ۵۴۹
— ''مسلم'' کی اقسام ۲۳۴
— اطاعت خدا اور اطاعتِ رسولؐ کا حکم ۹۲
— جس نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی اس نے بڑی کامیابی حاصل کی ۱۳۵
— دعوت اسلام کا اصل مقصود ۲۴۵- ۲۴۶- ۳۴۴- ۳۴۶- ۳۵۴- ۳۵۵- ۳۵۶- ۳۶۴- ۳۷۰- ۳۷۱- ۴۴۱- ۴۷۵- ۴۷۶- ۴۸۰ تا ۴۸۲- ۴۸۶ تا ۴۹۲
— اسلام کا مقصد محض انفرادی ایمان و طاعت نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی میں دین حق کا نفاذ ہے

۳۷۱-۳۷۲
— اسلام نے ان برائیوں کی طرف توجہ کی جن کی اصلاح میں دوسرے تمام نظام یا تو ناکام ہو چکے تھے یا انھیں ان کی فکر ہی نہ تھی ۴۰۷
— وہ حیرت انگیز انقلاب جو اسلام نے انسانی زندگی میں برپا کیا ۴۶۹-۴۷۰
— تبلیغِ اسلام کی اہمیت ۴۵۶-۴۵۷
— وہ صفات جو اسلام کے مبلغین میں ہونی چاہییں ۴۵۶ تا ۴۶۰ (نیز دیکھو ''حکمت تبلیغ'')
— اسلام کا تصور رواداری ۴۹۵-۴۹۶
— دینِ اسلام کو فرقہ بندی سے بچانے کی تدابیر ۴۹۳-۴۹۴-۵۸۶-۵۸۷
— اگر ہم فرقہ بندی کرنے والوں کو خوش کرنے کے لیے اسلام میں کوئی رد و بدل کریں تو اللہ تعالیٰ کے مواخذے سے ہمیں کوئی نہ بچا سکے گا ۵۸۷ (نیز دیکھو ''فرقہ بندی'')
— قانونی مسلمان اور حقیقی مسلمان کا فرق ۵۵۳
— سچے مسلمان کی صفات ۳۶۷-۳۶۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان'')
— اسلام میں کسی کو شرح صدر حاصل ہونے کا مطلب ۳۶۷-۳۶۸
— اسلام ایک نور ہے جس سے آدمی کو زندگی گزارنے کا سیدھا راستہ نظر آتا ہے ۳۶۷-۳۶۸
— تمام انبیاؑ کی لائی کتابوں پر ایمان لانا اسلام میں ضروری ہے ۴۹۵
— اسلام کے نزدیک وہ لوگ گمراہ ہیں جو اپنی عقل کے فیصلوں ہی کو صحیح جانتے ہیں اور وہی طریق کار اختیار کرتے ہیں جو ان کے خیال میں صحیح ہو اور دین کی پیروی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ۵۸۹
— اسلام کے نزدیک وہ لوگ بھی گمراہ ہیں جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتے، اور آنکھیں بند کر کے باپ دادا کے طریقے پر چلتے رہتے ہیں ۵۳۳-۵۳۴-۵۳۹
— اسلام کے نزدیک وہ لوگ بھی گمراہ ہیں جو دین کو مانتے تو ہیں لیکن پیروی اپنے ہی خیالات کی کرتے ہیں ۵۸۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان''، ''دین''، ''قرآن''، ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' اور ''نبوت'')

اسلامی اخلاق

دیکھو ''اخلاق''، ''قرآن، اس کا فلسفہ اخلاق'' اور ''اس کی اخلاقی تعلیمات''

اسلامی ریاست

— اس میں حاکمیت اللہ ہی کے لیے ہے ۳۲۶-۳۹۷
— اس ریاست کا مقصد وجود ۴۸۶
— اس کے اصول ۹۷-۹۸-۴۹۵-۵۰۸ تا ۵۱۰
— مسلمان فرماں روا کے اوصاف ۲۲۶-۳۲۷-۳۳۵-۴۳۶-۵۰۸
— اسلامی ریاست میں شوریٰ کی اہمیت، اس کا حکم اور اس کے تقاضے ۵۰۸ تا ۵۱۰
— اسلامی ریاست میں اسلام کے دشمنوں کو پنپنے کا موقع ہرگز نہیں دیا جا سکتا ۱۳۱-۱۳۳
— مطلق العنان فرماں رواؤں کے کردار کی قرآنی تصویر ۵۴۵-۵۴۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''خلافت'' اور ''قانونِ اسلام''، ''دستوری قانون'')

اسلامی قانون: (دیکھو ''قانون اسلام'')

اسلامی نظامِ معاشرت

— اس میں انسانی مساوات ۶۴-۶۵-۹۸

— اس میں رشتہ داروں کے حقوق دوسروں پر فائق ہیں ۷۱
— اس میں عورت کا صحیح مقام ۸۹-۹۰-۹۱-۹۲
— مسلم معاشرے میں اسلام کے دشمنوں کو پنپنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا ۱۳۱-۱۳۳
— منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپ کی نسبت سے پکارو، یہ ہی منصفانہ بات ہے ۷۰
— اگر کسی کے باپ کا نام معلوم نہ ہو تو وہ دینی بھائی اور رفیق ہے ۷۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون اسلام''، ''معاشرتی قوانین'')

اسماعیل علیہ السلام - ۳۴۳
— ان کی پیدائش ۲۹۴-۲۹۵
— ان کی قربانی کا واقعہ ۲۹۴ تا ۳۰۱
— ان کے امتیازی اوصاف ۲۹۴-۲۹۵-۲۹۹
— وہ ذبیح تھے یا حضرت اسحاقؑ ۲۹۷ تا ۳۰۱
— وہ نیک بندوں میں سے تھے ۳۴۳
— ان کی تعریف و توصیف ہمیشہ رہے گی ۲۹۶-۲۹۷
— بنی اسرائیل کا بنی اسماعیل سے حسد ۳۰۱

آسمان
— معنی و تشریح ۲۷۹-۲۸۰-۴۲۳
— آسمان دنیا کا مطلب ۲۷۹
— سما اور فلک کا فرق ۲۶۱
— آسمان کا غیر مرئی سہاروں پر قائم ہونا ۱۱-۱۲
— ساتوں آسمانوں میں سے ہر ایک میں اس کا قانون وحی کیا گیا ہے ۴۴۶
— آسمان و زمین بنانے میں کتنے دن لگے ۴۴۴-۴۴۶
— یہ بحث کہ آسمان پہلے بنایا گیا یا زمین؟ ۴۴۵
— آسمان و زمین کا ذکر قرآن میں توحید کے دلائل کے طور پر ہے، قرآن کوئی طبیعات یا علم ہیئت کی کتاب نہیں ہے ۲۶۱-۴۴۵
— آسمان بمعنی ''کائنات'' ۴۴۴-۴۴۵
— آسمان تاروں کے ساتھ گردش نہیں کر رہے بلکہ تارے آسمانوں میں تیر رہے ہیں ۲۶۱
— تاروں کو آسمان کی زینت بنایا گیا ہے ۲۷۹
— آسمانوں سے ایک خاص مقدار میں زمین پر پانی اتارا گیا۔ ۵۲۶
— اللہ تعالیٰ کے آسمان سے رزق اتارنے کا مفہوم ۳۹۷-۳۹۸
— شیاطین سے آسمان کے محفوظ کیے جانے کا مطلب ۲۷۹-۲۸۰
— آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں اللہ کی قدرت کے کرشمے اور توحید و آخرت کے دلائل ۱۱-۱۹-۲۲-۳۷-۱۷۳-۱۷۶ تا ۱۷۸-۲۰۰-۲۱۹-۲۳۹-۲۴۰-۲۵۹ تا ۲۶۲-۲۷۳-۲۷۹-۲۸۰-۳۳۱-۳۵۹-۳۸۱-۴۱۷-۴۲۳-۴۴۴-۴۴۶-۴۸۵-۵۰۴-۵۱۵-۵۲۶-۵۵۱-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۹-۵۸۳-۵۸۷-۵۸۸-۶۰۰-۶۲۰

اسوۂ حسنہ
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے ۸۰-۸۱
(تفصیلات کے لیے دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')

اصحابِ الایکہ - ۳۲۲

اصحابِ یاسین
— ان کا قصہ ۲۴۸ تا ۲۵۵

اصولِ تفسیر - (دیکھو ''قرآن، اس کی تفسیر کے صحیح

اصول'' اور ''اس کی تفسیر کے غلط طریقے'')

اصولِ فقہ

— فقہائے اسلام نے قرآن سے کس طرح قانونی احکام مستنبط کیے ہیں ۱۶- ۸۵ تا ۸۷- ۸۸- ۹۸- ۹۹- ۱۰۹ تا ۱۱۳- ۴۸۳- ۴۸۴- ۶۱۰

— شریعت کا قانون کس طرح غیر ضروری بندشوں کو ختم کرتا ہے ۶۹- ۷۰- ۱۰۱- ۱۰۲

— شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں ۸۷- ۸۹- ۱۰۱- ۱۰۲- ۱۱۴ تا ۱۱۶- ۱۱۹- ۱۲۰- ۱۸۷ تا ۱۸۹- ۶۰۹ تا ۶۱۱ (نیز دیکھو ''شریعت'')

اقامتِ دین

— دین حق کی سربلندی کے لیے کوشش کرنے والوں کے لیے فرشتے بھیجے جاتے ہیں ۱۰۴- ۴۵۵

— دین کے صحیح معنی ۴۸۹- ۴۹۰

— اسی دین کو قائم کرنے کا حکم ۴۸۶- ۴۹۳

— اقامت دین کی راہ میں پیش آنے والی تکالیف اللہ کے ہاں انسان کا درجہ بلند کرتی ہیں ۵۰۶

— اسلامی انقلاب میں کامیابی کا ملنا یا نہ ملنا اہم نہیں بلکہ اصل اہمیت اس کی ہے کہ آدمی حق کے لیے جان لڑا دے ۵۳۹- ۵۴۰

— مومن اگر کسی علاقے میں احکام الٰہی کی پابندی نہ کر سکے تو اللہ کی زمین وسیع ہے، وہ ہجرت کر جائے، اور اس راہ میں تکالیف اٹھانے والے کے لیے بڑا اجر ہے ۳۶۳

— مومن کا کام مایوس ہونا نہیں خواہ باطل کیسا ہی بالادست ہو ۴۵۴- ۴۵۵

— مومن نرم چارا نہیں بلکہ لوہے کے چنے ہیں ۵۱۱

— اسلامی نظام زندگی کی تعمیر نو کے لیے کام کرنے کی حکمت ۴۵۶ تا ۴۶۰

— اللہ کا وعدہ یہ نہیں ہے کہ ایمان لاتے ہی تم دنیا کے فرماں روا ہو جاؤ گے بلکہ یہ ہے کہ سخت آزمائشوں اور امتحانوں کے بعد منزل مراد ملے گی ۸۱- ۸۲

— ایک اصولی اور نظریاتی تحریک کو قوم پرست جتھوں پر اخلاقی فوقیت حاصل ہوتی ہے ۵۸

— مسلمانوں کو کب تک دنیا کی امامت حاصل نہیں ہو سکتی ۴۹- ۵۰

— دعوتِ حق کئی لوگوں کو چلتی ہوئی چیز نظر نہیں آتی لیکن اللہ اس تحریک کو ایسا فروغ دے گا کہ عقل دنگ رہ جائے گی ۵۰- ۵۱

— دعوتِ حق کی راہ میں کام کرنے والوں کو ایک ہی ذریعہ تقویت بخشتا ہے ۱۰۳- ۱۰۴
(نیز دیکھو ''دعوت حق''، ''دین''، ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' اور ''نبوت'')

اقامتِ صلوٰۃ - دیکھو ''نماز''

اقسام القرآن

— قرآن میں قسمیں کس غرض کے لیے اور کس معنی میں کھائی گئی ہیں ۲۴۵- ۲۷۸- ۳۱۹- ۵۲۳- ۵۵۳- ۵۵۴- ۵۵۹

آل

— معنی اور تشریح ۱۲۶

— آل فرعون ۴۰۵- ۴۱۲- ۴۱۳

اللہ

— احسن الخالقین ۳۰۴

— بصیر ۲۳- ۲۳۳- ۴۰۱- ۴۱۶- ۴۸۵

— حکیم ۱۱- ۲۳- ۶۸- ۱۷۳- ۲۰۲- ۲۱۹- ۳۵۵- ۳۹۵- ۴۶۳- ۴۷۸- ۵۱۶- ۵۵۱-

۵۷۹-۵۹۴-۶۰۰
— حلیم ۱۱۸-۲۴۰
— حمید ۱۴-۲۲-۱۷۵-۲۲۷-۴۶۳-۵۰۴
— لطیف ۱۷-۹۴-۴۹۷
— خبیر - ۱۷- ۲۸- ۶۸- ۹۴- ۱۷۳- ۲۲۶-
۲۳۳
— وکیل ۶۸-۱۰۸-۳۸۱
— حفیظ ۱۹۴
— خیر الرازقین - ۲۰۸
— رب العالمین ۳۴- ۲۹۲- ۳۱۴- ۳۸۵-
۴۲۴-۴۴۲-۵۴۱-۵۹۴
— رحمٰن ۲۴۷- ۲۵۱- ۲۵۴- ۲۶۵- ۴۳۹-
۵۳۰-۵۳۱-۵۳۸-۵۵۱
— رحیم ۳۹- ۷۱- ۸۳- ۱۱۶- ۱۳۱- ۱۳۶-
۱۷۳- ۲۴۵- ۲۶۶- ۳۷۹- ۴۳۹- ۴۵۶-
۴۷۹-۵۷۱-۶۰۵
— رفیع الدرجات ۳۹۸
— سمیع ۲۳- ۲۱۲- ۴۰۱- ۴۱۶- ۴۶۰- ۴۸۵-
۵۶۰
— شکور ۲۳۳-۲۳۶-۵۰۲
— عالم الغیب والشہادہ ۳۹-۱۷۴-۳۷۷
— عزیز ۱۱- ۲۳- ۳۹- ۸۴- ۱۵۷- ۱۷۵-
۲۰۲- ۲۱۹- ۲۳۲- ۲۴۵- ۲۵۹- ۳۲۱-
۳۴۶-۳۵۵-۳۵۹-۳۷۳-۳۹۱-۳۹۵-
۴۱۱- ۴۴۶- ۴۷۸- ۴۹۸- ۵۲۵- ۵۷۱-
۵۷۹-۵۹۴-۶۰۰
— علام الغیوب - ۲۱۲
— علیم ۲۸-۶۸-۱۱۷-۲۰۱-۲۴۱-۲۵۹-۲۷۳-
۳۹۱- ۴۴۶- ۴۶۰- ۴۸۶- ۵۱۵- ۵۲۵-
۵۵۱-۵۶۰

— علی ۲۴-۲۰۰-۳۹۷-۴۷۸-۵۱۶
— عظیم ۴۷۸
— غفار ۳۴۶-۳۵۹-۴۱۱
— غفور ۷۱- ۸۳- ۱۱۶- ۱۳۱- ۱۳۶- ۱۷۳-
۱۹۲- ۲۳۱- ۲۳۳- ۲۳۶- ۲۴۰- ۳۷۹-
۴۵۶-۴۷۹-۵۰۲-۶۰۵
— غنی ۱۴-۲۲-۲۲۷-۳۶۰
— قدیر ۸۴- ۲۱۸- ۲۴۱- ۴۶۱- ۴۸۲- ۵۱۵-
۶۲۰
— قوی ۸۳-۴۰۲-۴۹۷
— قہار ۳۴۶-۳۵۷-۳۹۹
— کبیر ۲۳-۲۰۰-۳۹۷
— وہاب ۳۲۱-۳۳۵
— مقتدر ۵۳۹
— رقیب ۱۱۹
— حسیب ۱۰۳
— خلاق ۲۷۳
— ولی ۴۸۲-۵۰۴
— واحد (یکتا) ۳۴۶-۳۵۷-۳۹۹-۴۳۱
— وحدہٗ لاشریک ۴۳۱
— رب ۲۶۵-۳۱۴-۳۶۱-۳۰۴-۴۲۲-۴۸۳
— اللہ کے اسمائے گرامی قرآن میں یوں ہی بیان
نہیں کر دیے گئے بلکہ سیاق و سباق سے ان کا
گہرا تعلق ہے ۱۱-۱۴-۲۳-۲۴-۳۹-۶۸-
۶۹- ۷۱- ۹۴- ۱۰۳- ۱۱۷- ۱۱۸- ۱۲۲-
۱۲۳- ۱۳۱- ۱۷۳- ۱۷۴- ۱۷۵- ۱۷۶-
۲۰۰- ۲۰۱- ۲۰۲- ۲۱۹- ۲۲۷- ۲۲۸- ۲۳۲-
۲۳۳- ۲۴۰- ۳۵۵- ۳۵۷- ۳۵۸-

۳۵۹-۳۹۱-۳۹۲-۴۶۰-۴۷۱-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۲-۵۰۲-۵۱۶-۵۶۰-۵۷۹-۶۰۵

— مومنوں اور کافروں سب کا رب ۴۹۵

— سب سے بالا و برتر ہے ۵۵۱

— بڑی برکت والا ۳۷-۴۲۴

— توبہ قبول کرنے والا ۳۹۱-۳۹۲-۵۰۳

— گناہ معاف کرنے والا ۳۹۱-۳۹۲

— بہت درگزر کرنے والا ۲۳۳-۴۶۳-۵۰۳

— سخت سزا دینے والا ۳۹۱-۳۹۲-۴۰۲-۴۶۳

— بھلائی کی قدر کرنے والا ۲۳۳

— بڑا فضل فرمانے والا ۳۹۱-۴۲۲

— کھلی اور چھپی ہر بات کو جاننے والا ۲۷۱

— عزت کا مالک ۳۱۴

— ان سب باتوں سے پاک جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں ۳۱۴

— حق بات ہی کہنے والا ۳۴۹

— اللہ ہی حق ہے ۲۴

— انتقام لینے والا ۳۷۳

— اصل اور حقیقی زندگی اسی کی ہے ۴۲۴-۴۲۵

— وہ ہر عیب اور نقص اور کمزوری سے پاک ہے ۳۱۴

— کائنات میں بڑائی اسی کے لیے ہے ۵۹۴

— اسی کے لیے حمد ہے ۱۷۳-۲۱۸-۳۱۴-۳۸۵-۴۲۴-۵۹۴

— وہ خود محمود ہے خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے ۱۴-۲۲

— اسی نے آسمانوں اور زمین کو تھام رکھا ہے ۲۳۹

— وہی دن کو رات میں اور رات کو دن میں تبدیل کرتا ہے ۲۳-۲۲۶-۳۵۹

— ساری کائنات کا خالق ۷۷-۳۷۷-۴۲۲-۴۲۳-۴۴۲ تا ۴۴۶-۴۶۰-۵۸۷-۶۰۰-۶۲۰

— کائنات کا مالک اور پروردگار ۴۲۴-۵۶۰-۵۹۴

— عرش کا مالک ہے ۳۹۸-۵۵۱

— اس کا عرش پر جلوہ فرما ہونا ۳۸

— تمام چیزوں کا خالق ۱۱-۱۲-۳۷-۲۷۰-۳۵۹-۳۷۷-۳۸۱-۴۲۲

— اس نے جو چیز بھی بنائی خوب ہی بنائی ۳۹

— انسان کا خالق ۲۱۹-۴۲۳-۴۲۴

— اس کی شانِ خلاقی ۲۳۱-۲۳۲-۲۷۳-۴۴۶

— اس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے ۲۲-۳۳۱-۳۵۷-۵۷۰-۵۸۷-۵۸۸

— کائنات کو اس نے برحق اور ایک مدتِ خاص کے لیے پیدا کیا ہے ۶۰۰

— وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ لوگ اس کو خدا مانیں ۳۶۰-۳۶۱

— سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ۲۲۷

— کائنات میں کوئی قوت اسے عاجز کرنے والی نہیں ۲۴۱-۳۷۸-۳۷۹

— کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ۴۸۵

— کائنات کی ہر چیز کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں ۳۸۱-۴۸۵

— ہر چیز کے خزانوں کا مالک ۳۸۱-۴۸۵

— آسمانوں اور زمین اور ان کی ہر چیز اور سارے مشرقوں کا مالک ۲۷۹

— پوری کائنات اس کے دست قدرت میں ہے ۳۸۲
— وہی ساری کائنات کا مالک و منتظم اور فرماں روا ہے ۲۲-۱۷۳-۲۱۸-۲۷۸-۲۷۹-۳۳۶-۳۵۹-۳۷۶-۴۷۸-۵۱۷-۵۵۱-۵۶۰-۵۶۱-۵۹۴
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''کائنات'')
— وہی پوری نوع انسانی کا مالک اور رب ہے ۳۰۴-۳۰۵-۴۲۴-۴۹۴-۵۶۱
— بندوں کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اسے عاجز کر سکیں ۵۰۵
— ہر چیز پر قادر ۸۴-۲۱۸-۲۷۳-۴۶۱-۴۸۲-۵۱۵-۶۲۰
— ہر چیز پر نگران ۱۱۹-۱۹۴-۲۱۲-۳۸۱
— سارے معاملات کا آخری فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے ۲۱
— تمام چیزوں کے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں ۲۴-۲۵-۲۱۸-۲۱۹-۲۷۳
— زندگی اور موت اس کے اختیار میں ہے ۳۷۵-۴۲۵-۴۲۶-۴۸۲-۵۶۱-۵۹۱
— وہ سب پر غالب ہے ۲۱۹-۳۹۱
— کائنات کی کوئی طاقت اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی ۱۱-۳۹-۲۱۹-۳۵۵-۳۵۶-۳۶۵-۵۵۹-۵۶۰
— وہی آسمان کا خدا بھی ہے اور زمین کا خدا بھی ۵۵۱
— اس کے لیے ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم کو لے آنا کچھ مشکل نہیں ۲۲۷-۲۲۸
— اس کے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکتا ۳۶۵-۴۰۶
— اس کی ڈالی ہوئی مصیبت کو کوئی دفع نہیں کر سکتا ۳۷۴
— اس کی پکڑ سے کوئی بچا نہیں سکتا ۸۷-۴۰۲-۴۰۸
— وہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا اور وہ مہربانی کرنا چاہے تو اس کی رحمت کو بھی کوئی نہیں روک سکتا ۸۷-۲۱۸-۲۱۹-۳۷۴
— وہی فیصلہ کرتا ہے کہ اپنی رحمت سے کس کو نوازے اور کسے نہ نوازے ۵۳۶
— وہ حق کو حق کر دکھاتا ہے اور باطل کو مٹا دیتا ہے ۴۸۴-۵۰۲
— وہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جن کو اس کے سوا پکارا جاتا ہے ۴۴
— عزت اور ذلت ساری کی ساری اسی کے اختیار میں ہے ۲۲۳-۳۱۴
— اس کے ہاں عزت حاصل کرنے کا ذریعہ ۲۲۳-۲۲۴
— اس کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا ۵۰۵-۵۱۳
— وہ جس کو جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے ۲۱۸-۲۱۹-۴۹۷
— اس پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے نبی اور اس کی لائی ہوئی شریعت کو مانا جائے ۴۸۷
— یہ فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے کہ کس کو نبی بنائے اور کسے نہ بنائے ۳۲۱
— اس نے تمام انبیائے کرام سے پختہ عہد لیا ۷۳-۷۴
— اس کی قدرت اور حکمت کے کرشمے ۲۳-۲۱۵-۲۲۶-۲۳۱-۲۳۲-۲۷۳
— وہی جسے چاہتا ہے اور جیسی چاہتا ہے اولاد دیتا ہے ۵۱۵
— وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے ۵۱۵
— وہی انسان کا رزاق ہے ۴۲۳-۴۲۴
— وہ لوگوں کو ایک حساب سے رزق دیتا ہے ۵۰۴

— وہ اپنے تمام بندوں پر مہربان ہے لیکن اس کی دین میں فرق وتفاوت ہے ۴۹۷
— دنیا میں زندگی بسر کرنے کے تمام ذرائع کی تقسیم وہی کرتا ہے ۵۳۷
— رزق کی تنگی و کشادگی اسی کے اختیار میں ہے ۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۳۷۹-۴۸۵-۴۸۶
— سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ کی صحیح تفسیر ۴۴۲-۴۴۴
— وہی کائنات کی تدبیر کر رہا ہے ۳۸
— وہ کائنات کے تختِ سلطنت کا مالک ہے ۳۹۸-۵۵۱
— کائنات میں بادشاہی اسی کی ہے ۲۲۶-۳۵۹-۳۶۰-۳۷۶-۳۹۹-۴۰۰-۵۱۵-۵۵۱-۵۹۲
— اس کے واحد وقہار ہونے پر آخرت میں بیک زبان تمام عالم گواہی دے گا ۳۹۹
— وہ آخرت ہی کا مالک یوم الدین نہیں ہے، دنیا کا بھی احکم الحاکمین ہے ۴۸۳-۴۸۴
— لوگوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے ۳۷۷
— اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے ۳۸-۳۹
— وہ بتدریج کام کرتا ہے ۳۹-۴۲۵
— اس کا ہر ارادہ اس کے صرف ایک حکم سے پورا ہوتا ہے ۳۷۳-۴۲۶-۴۴۶
— اسی نے زمین و آسمان کی ساری چیزوں کو مسخر کیا ہے ۱۹
— اسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے ۲۳-۲۴-۲۲۶
— اس کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوتی ۱۰۲-۱۳۳-۲۴۱
— اس کے لیے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر جلا اٹھانا کچھ مشکل نہیں ہے ۲۳-۲۴-۴۳-۲۴۸-۴۵۰-۴۵۱-۴۶۱
— اس کا اقرار انسان کے نفس میں موجود ہے ۲۲-۳۷۷-۳۷۸
— وہ ہر دعا مانگنے والے سے قریب ہے ۲۱۲
— دعائیں سننے اور ان کا جواب دینے کا اختیار اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں ۴۱۸-۴۲۰
— وہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۱۱-۳۶۶
— اس کا وعدہ برحق ہے ۴۱۵-۴۲۸
— اس کا انسان پر یہ حق ہے کہ انسان اسی کی بندگی کرے ۳۵۵
— لوگوں کے کفر سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۱۴
— اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرنی چاہیے ۶۱۵
— اس کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ۲۱۹-۲۸۵-۳۴۶-۳۶۰-۳۷۶-۳۹۱-۳۹۲-۴۲۲-۴۲۴-۵۶۱
— اس کو چھوڑ کر ہی انسان کسی غیر اللہ کو اپنا ولی بنا سکتا ہے ۴۷۳-۴۷۹-۴۸۰
— اس کے سوا کوئی اور الٰہ ہو نہیں سکتا اور وہی ایک حقیقی معبود ہے ۲۷۸-۲۷۹
— اسی کی بندگی کرنا سیدھا راستہ ہے ۵۴۸
— اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا جہالت ہے ۲۸۱
— وہ اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو ۳۸۲
— وہ اس سے پاک اور بالاتر ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو ۳۱۲-۳۵۷-۳۵۸-۵۵۱
— اس کی طرف اولاد منسوب کرنے کے عقیدے کی تردید ۳۵۷-۳۵۸

— اس کے سوا انسان کا اور تمام مخلوقات کا کوئی ولی نہیں ہے ۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۴۷۵-۴۸۲
(لفظ ''ولی'' کی تشریح کے لیے دیکھو ''ولی'')
— وہی اپنے بندوں کا نگہبان ہے ۴۱۲
— اس کی یاد سے غافل ہونے کے اخلاقی نتائج ۵۳۸
— خوف اسی سے ہونا چاہیے ۶۸
— اسی کے محاسبے سے ڈرنا چاہیے ۱۰۳
— اسی پر توکل کرنا چاہیے ۶۸-۱۰۸-۳۷۴
— ہر خوف وخطر کے مقابلے میں وہی کافی ہے ۱۰۳
— اپنے آپ کو اس کے حوالے کر کے انسان ہر خطرے سے مامون ہو جاتا ہے ۲۱
— اس کو ہر شکر اور تعریف کا استحقاق پہنچتا ہے ۲۲۷-۲۲۸
— وہ تو انسانوں پر فضل فرمانے والا ہے لیکن اکثر لوگ پھر بھی شکر ادا نہیں کرتے ۴۲۲
— وہ کسی کے شکر کا محتاج نہیں ۱۴-۳۶۱
— وہی صحیح رہنمائی کرنے والا ہے ۶۹-۷۰
— وہی بہتر جانتا ہے کہ مصلحت کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں ہے ۶۸-۲۳۳-۲۳۴
— اس کے فیصلے سراسر حکمت پر مبنی ہوتے ہیں جن میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے ۵۵۹-۵۶۰
— راہ راست پر چلنے والے بندوں کی حمایت کے لیے وہی کافی ہے ۳۷۳-۳۷۴
— وہ اپنی مخلوق پر رحیم و شفیق ہے ۳۹-۴۹۷-۴۹۸
— وہ کس کس طرح اہل ایمان کی مدد کرتا ہے ۵۷
— اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے ۳۷۹
— وہ بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے ۴۶۵-۴۶۶
— وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ۴۰۸-۵۸۷
— وہ مومنوں کے حق میں بہت رحیم ہے ۷۹
— اس کا قانونِ مغفرت ۳۸۰-۳۹۷
— اس کی شانِ حلیمی وغفاری ۲۴۱
— یہ اس کی شانِ حلیمی ورحیمی ہے کہ باغی انسانوں کو رزق دیے جاتا ہے اور مہلت پر مہلت دیتا ہے ۴۷۹-۴۸۰
— وہ لوگوں سے درگزر کرتا ہے ورنہ ان کے کرتوت ایسے ہیں کہ انھیں زندہ نہ چھوڑا جاتا ۲۴۱-۲۴۲
— وہ حق پہچاننے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی تکالیف کے ذریعے سے متنبہ کرتا رہتا ہے ۳۲-۳۳-۴۶۴
— وہ قصور کرنے والوں کو فوراً نہیں پکڑتا بلکہ سنبھلنے کی مہلت دیتا ہے ۱۷۳-۲۳۹-۲۴۰
— وہ انسان کے بہت سے قصوروں سے تو ویسے ہی درگزر فرماتا ہے ۵۰۵
— قصورواروں کو اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے ۳۷۹
— اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے ۳۹۴
— اس کے ہاں تقرب کا ذریعہ کیا ہے؟ ۲۰۷-۲۲۳
— انسان پر اس کے احسانات ۲۰-۲۲۵-۲۲۶-۶۰۰
— اس نے اپنی کھلی اور چھپی تمام نعمتیں انسان پر تمام کر دی ہیں ۲۰-۲۶۹-۲۷۰
— اس سے کیے ہوئے عہد کی باز پرس ضرور ہونی ہے ۸۷
— اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے ۱۷-۲۱-۲۲۹-۲۷۳-۳۶۱-۳۷۶-۳۹۱-۳۹۲-

۴۱۱ - ۴۲۸ - ۴۹۶ - ۵۲۸ - ۵۵۱ - ۵۸۶

— وہ جب چاہے تمام انسانوں کو جمع کر سکتا ہے ۵۰۴

— وہ ہمیشہ مبنی بر حقیقت بات کہتا ہے ۶۹ - ۳۴۹

— وہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا ۱۲۱

— وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت اور عدل کے مطابق کرتا ہے ۱۱

— اس کا انصاف بے لاگ ہے ۸۷ - ۸۸ - ۳۰ - ۳۰۷ - ۳۰۸ - ۳۲۵ - ۳۳۰ - ۳۳۳ - ۳۳۵ - ۳۳۶ - ۳۶۴ - ۳۷۸ - ۴۶۵

— وہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے ۴۰۹

— وہ مجرموں اور ظالموں سے انتقام لے کر رہتا ہے ۴۸

— وہ ظالموں سے انتقام لینے والا ہے ۳۷۳

— اس کا غضب کیسے لوگوں پر بھڑکتا ہے ۴۰۹ - ۴۹۷

— اس کے غضب کے مستحق کیسے لوگ ہیں اور کیوں ہیں ۳۹۶ - ۳۹۸

— اس کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی ۴۰۰

— بندوں کو ان کے اعمال کی سزا دینا اسی کا کام ہے ۴۸۰ - ۴۸۱

— تمام معاملات کا فیصلہ اسی کے ہاتھ ہے ۲۱ - ۲۰۱ - ۲۲۰

— تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۲۱ - ۵۱۷ - ۵۱۸

— اس کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا ۳۶۵

— اس کو سزا دینے اور معاف کرنے کا کلی اختیار ہے ۸۳

— غیب کا علم اسی کو ہے ۲۳۸ - ۲۶۶

— اللہ کے علم غیب کی چند مثالیں اور تشریح ۲۸ - ۲۹ - ۲۶۶

— وہ کائنات کی ہر کھلی اور چھپی چیز کو جانتا ہے ۱۷ - ۳۹ - ۲۳۸ - ۳۷۷

— وہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ۲۱ - ۱۱۷ - ۲۳۸ - ۳۶۱ - ۴۰۱ - ۵۰۳

— انسان اس سے کچھ نہیں چھپا سکتا ۱۷

— وہ لوگوں کی تمام حرکات دیکھ رہا ہے اور ان کی کوئی حرکت اس سے مخفی نہیں ۲۶۲ - ۴۷۱ - ۵۰۳ - ۵۰۴

— آدمی خواہ کوئی بات ظاہر کرے یا چھپائے اللہ کو اس کا علم ہے ۱۲۲ - ۴۷۱

— اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے ۳۹ - ۱۰۳ - ۱۷۳ - ۲۲۴ - ۳۹۴ - ۳۹۵ - ۴۶۶ - ۴۸۶

— اللہ کی صفات کا جامع بیان ۳۹۱

— اس کی قدرت اور اس کا علم تمام جزئیات پر حاوی ہے ۲۲۵

— اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے ۲۴ - ۵۰۴

— بندوں کے ہر کام سے باخبر ہے ۴۸ - ۶۹

— وہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے ۴۰۰

— وہ اپنے بندوں کی روش پر نگاہ رکھتا ہے ۵۰۴

— تمام انسانوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے ۲۴ - ۷۵ - ۲۲۳

— وہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے ۱۲۲

— قیامت کا علم اسی کو ہے ۵۵۱

— اس کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ۶۱۶

— اس کی صحیح معرفت حاصل ہونے کے ذرائع ۲۰ - ۲۱

— وہ اسی کو راہِ راست دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے اور وہ جسے چاہے اپنا کر لیتا ہے ۴۹۳

— وہ جسے چاہے گمراہی میں ڈالے اور جسے چاہے راہِ راست دکھائے ۲۲۱ - ۲۲۲

(تفصیل کے لیے دیکھو ''ضلالت'' اور ''تقدیر'')

— اس کی مشیت اور اس کی رضا میں فرق ۳۶۱

— اللہ کے کسی شخص کے سینے کو اسلام کے لیے کھولنے

اور کسی کے لیے تنگ کرنے کا مطلب ۳۶۷
___ اس پر جھوٹ باندھنے والوں کے منہ کالے ہوں گے ۳۸۱
___ اس کی قدرت کاملہ کی عظمت ۳۸۲-۳۸۳
___ وہ اپنی نشانیاں دکھاتا ہے مگر کون لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ۲۵-۱۷۷-۳۴۰-۳۷۵-۳۷۹-۳۹۷-۵۰۶-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۴
___ وہ حد سے گزرنے پر ہی عذاب بھیجتا ہے ۴۰۸ (تفصیل کے لیے دیکھو ''عذاب'')
___ اللہ کی تخلیق اور انسان کی صناعی میں واضح فرق ہے ۴۴۶
___ اس نے تمام انسانوں کو ایک امت کیوں نہ بنا دیا؟ ۴۷۵-۴۸۱ تا ۴۸۳
___ وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے ۴۸۲
___ اس کے مقابلے میں کوئی حامی و ناصر نہیں ہے ۵۰۵
___ اس کے سوا کوئی حامی و مددگار نہیں اور نہ اس کی مرضی کے خلاف کسی کی سفارش چل سکتی ہے ۳۸ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''شفاعت'')
___ سمندروں کے سینے پر چلنے والے ان پہاڑ نما جہازوں کو وہ جب چاہے روک دے اور جب چاہے انھیں ڈبو دے ۵۰۵-۵۰۶
___ اس پر بھروسا ایمان کا لازمی تقاضا اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ضروری وصف ہے ۲۱-۳۷۴-۴۸۵-۵۰۷
___ وہ ''خیروبرکت والی رات'' کو ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ کرتا ہے ۵۵۹
___ اللہ کو اذیت دینے کا مطلب ۱۲۳-۱۲۸

الٰہ

___ معنی وتشریح ۲۷۹-۵۶۱
___ اللہ کے سوا کسی اور کے الٰہ نہ ہونے کی وجہ ۲۱۹-۲۷۹-۳۵۷ تا ۳۶۰
___ الوہیت کے معنی میں پادشاہی وحکمرانی کا مفہوم بھی شامل ہے ۳۹۹
___ صرف ایک اللہ ہی الٰہ ہے ۲۷۸-۲۷۹
___ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ۲۱۹-۲۸۵-۳۴۶-۳۶۰-۳۷۶-۳۹۱-۳۹۲-۴۲۲-۴۲۴-۵۶۱
___ انسان کا الٰہ ایک ہی ہے ۴۴۱
___ اللہ ہی آسمان کا الٰہ بھی ہے اور زمین کا الٰہ بھی ۵۵۱
___ انسان جس کی بھی بے چون و چرا اطاعت کرے وہ اس کا الٰہ ہے ۵۸۹
___ اللہ کے سوا لوگوں نے دوسرے جو الٰہ بنا رکھے ہیں وہ بے چارے ان کی مدد تو کیا کریں گے، ان کی پرستش کرنے والے تو الٹے ان کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں ۲۷۱
___ یہ جھوٹے الٰہ جو اللہ کے شریک ٹھیرائے جاتے ہیں نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں ۱۹۹
___ جھوٹے الٰہوں نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا ہے ۱۲
___ اللہ کے سوا جو الٰہ تقرب الی اللہ کے لیے بنائے گئے ہیں وہ کسی کی کوئی مدد نہیں کر سکتے ۶۱۷
___ اللہ کے سوا جن کو بھی الٰہ بنایا جاتا ہے ان کی حیثیت یہ ہے کہ اگر خدائے رحمٰن کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت کسی کام نہیں آ سکتی اور نہ وہ اللہ کی پکڑ سے چھڑا سکتے ہیں ۲۵۴
___ جھوٹے الٰہوں کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کی دلیل ۲۹۲

— مشرکین کے الٰہوں کی آخرت میں کوئی حیثیت نہ ہوگی ۴۰۱

الحاد

— اللہ کی آیات کو غلط معنی پہنانا ۴۶۲

الیاس علیہ السلام

— ان کا قصہ ۳۰۲ تا ۳۰۶
— ان کے متعلق بنی اسرائیل کے عقائد ۳۰۵-۳۰۶
— ان کے اوصاف اور اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ ۳۰۲-۳۰۵

ام الکتاب

— معنی و تشریح ۵۲۳-۵۲۴

امانت

— اس کا وہ بارِ گراں جو انسان پر ڈالا گیا ہے ۱۳۵-۱۳۷ (تفصیل کے لیے دیکھو ''انسان'' اور ''خلافت'')

امتحان - (دیکھو ''آزمائش'')

امثال القرآن

— قرآن میں طرح طرح کی مثالیں کس لیے دی گئی ہیں ۳۶۹
— کلمات اللہ کے بے حد و حساب ہونے کی تمثیل ۲۲-۲۳
— تمام انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر جلا اٹھانا ایسا ہے جیسا ایک انسان کو پیدا کرنا اور پھر جلا اٹھانا ۲۳
— گلا پھاڑ پھاڑ کر بولنے والے متکبروں کی آواز کے لیے گدھے کی آواز کی مثال ۱۸
— حیات بعد موت کے لیے زمین کی مثال کہ سونی پڑی تھی لیکن بارش پڑتے ہی اس میں جان پڑ گئی ۵۰-۵۱-۲۲۳-۲۵۶-۴۶۱
— اللہ کی عظمت کے لیے آسمان پھٹ پڑنے کی مثال ۴۷۸
— ایک سعادت مند بیٹے اور نالائق بیٹے کی مثال ۶۰۹ تا ۶۱۲
— بحری جہازوں کی مثال ۵۰۵-۵۰۶
— ''اندھے اور بینا'' اور ''صالح و بدکار'' کی مثال ۴۱۷
— ہٹ دھرم کافروں کی تمثیل ۲۴۶-۲۴۷
— حوران جنت کی مثال ۲۸۷
— زقوم کے شگوفوں کی تمثیل ۲۸۹-۲۹۰-۵۷۱
— مشرک اور موحد کی تمثیل ۳۷۰
— ہٹ دھرم مخالفین حق کی تمثیل ۴۶۴
— آخرت اور دنیا کے لیے کام کرنے والوں کی تمثیل ۴۹۸-۴۹۹
— دل اور آنکھوں پر پردہ اور کانوں پر مہر کی مثال ۲۲۱-۲۲۲-۴۰۸-۴۰۹-۵۰۲-۵۰۳-۵۸۹-۶۱۷
— مومن اور کافر کے حال و مستقبل کو واضح کرنے والی تمثیل ۲۲۹
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہٹ دھرم مخالفین کی مثال ۲۴۶-۲۴۷
— دعوت حق کے فروغ کی مثال ۵۰-۵۱

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

— اس کے لیے صبر کی ضرورت ۱۷

انبیاؑ

— عرب میں مبعوث ہونے والے انبیاؑ ۳۶
— انبیائے سابقین کی تعلیمات کے وہ اثرات جو عرب میں محفوظ تھے ۳۷
— انبیائے کرام کی دعوت کا اولین مخالف قوموں کا خوش حال طبقہ تھا ۲۰۶-۵۳۴
— انبیاؑ کا کام یہ تھا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہر حکم پر

عمل کریں ۱۰۳-۳۶۴

— انبیا علیہم السلام بندوں کے اعمال پر گواہ نہیں ہیں بلکہ اس بات کے گواہ ہیں کہ انھوں نے اللہ کا پیغام صحیح صحیح پہنچا دیا ۱۰۷
(تفصیل کے لیے دیکھو ''نبوت'')

انتقام

— کسی کی زیادتی کا انتقام لینے کے حدود اور اس کے قواعد ۵۱۱-۵۱۲

انجیل

— اس کو ماننے والے خود اس کے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں ۴۹۴-۴۹۵
(تفصیلات کے لیے دیکھو ''بائبل'')

انسان

— تخلیق انسانی سے متعلق قرآن کا بیان ۳۹ تا ۴۲-۲۲۴-۲۷۲-۲۸۱-۳۴۷-۳۴۸-۳۵۹-۴۲۳-۴۲۵-۴۲۶

— انسان کے لیے اس کی اپنی پیدایش میں اور ان حیوانات میں جو زمین میں پھیلائے گئے ہیں نشانیاں ہیں ۵۷۹

— جانوروں کی طرح انسان کی جنس میں سے بھی اس کے لیے جوڑے بنائے گئے ہیں تاکہ سلسلۂ تناسل جاری ہو ۴۸۵

— اللہ تعالیٰ کا انسان میں ''اپنی'' روح پھونکنا کس معنی میں ہے ۴۰-۴۱

— انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ۳۴۸

— زمین و آسمان کی تمام چیزیں انسان کے لیے مسخر کیں ۱۹-۵۲۸-۵۸۳-۵۸۴

— اس کے لیے زمین و آسمان کی چیزیں کس معنی میں مسخر کی گئی ہیں ۱۹-۲۰

— اس کے آگے فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا گیا ۳۴۷-

۳۴۹

— ڈارون کا نظریۂ ارتقا اور قرآن ۴۰

— انسان کو ماں کے پیٹ میں تین پردوں کے اندر پرورش کیا گیا ۳۵۹

— موجودہ نسلِ انسانی وہ ہے جو طوفانِ نوح سے بچائی گئی تھی ۲۶۱

— انسانی زندگی کے مراحل ۲۳۷-۳۹۶-۳۹۷-۴۲۵

— انسان کی بڑھاپے میں کیا حالت ہوتی ہے ۲۶۹-۲۷۰-۴۲۵

— انسان کی پیدایش کا مقصد ۴۲۵

— انسانی زندگی کے لیے اس زمین میں اللہ کے پیدا کردہ موافق حالات بھی توحید کی دلیل ہیں ۴۳۰

— وہ عمر جس میں انسان پوری طرح اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوجاتا ہے اور جس کے بعد اپنی گنہگاری کے لیے اس کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوسکتا ۲۳۷-۲۳۸-۶۰۹

— وہ اصل انسان کون سا ہے جسے خلافت سونپی گئی تھی اور جس کو اپنا حساب دینا ہے ۴۱ تا ۴۴-۱۳۵ تا ۱۳۷-۲۳۸-۳۲۶

— دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اس کی فضیلت ۳۴۸-۴۸۳

— اسے کفر اور ایمان کے انتخاب میں آزاد کس لیے چھوڑا گیا ہے ۱۳۵ تا ۱۳۷-۴۷۵-۴۸۱ تا ۴۸۳

— وہ دنیا میں غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ نہیں ہے ۱۷۷-۳۶۱-۳۶۲-۵۵۰

— اس کو آخر کار پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے ۱۶-۲۱-۲۵۵-۲۷۳-۳۶۱-۴۲۸-۵۲۸-۵۸۶

— وہ ایک وقتِ مقرر کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کا مقدمہ اللہ کے حضور پیش ہوگا ۳۷۲ تا ۳۷۵

— کوئی انسان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

۲۶ - ۲۲۷ - ۲۲۸
— وہ اپنی نیکی و بدی کا خود ذمہ دار ہے ۴۶۵-۵۸۴
— وہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے ہی کرتا ہے اور بھٹکتا ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر ہے ۱۴-۳۷۵
— وہ اپنے اعمال کے برے نتائج سے بچ نہیں سکتا ۳۷۸
— وہ اپنے قول و عمل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے ۲۰۰-۲۰۱-۴۹۵-۴۹۶-۵۳۲-۵۸۴-۵۸۶
— اس کا پورا نامہ اعمال ثبت کیا جا رہا ہے ۱۷-۲۴۸
— وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ اسے جانتا ہے ۲۴-۲۸۳-۴۶۲
— اس کے لیے اصل ناکامی کیا ہے ۳۶۴-۳۶۵
— اس کے لیے اصل خسارہ کیا ہے ۵۱۳
— اس کے خسارے میں پڑنے کی اصل وجہ ۴۵۱-۴۵۲
— قوانینِ فطرت کے متعلق اس کا علم اور فطرت کی طاقتوں پر اس کا اقتدار سب کچھ اللہ کا بخشا ہوا ہے ۲۶۲-۲۶۳
— اس پر خدا کے احسانات ۲۰- ۲۶۹- ۲۷۰- ۴۲۲ تا ۴۲۴- ۶۰۰
(دیکھو "اللہ" انسان پر اس کے احسانات)
— اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ حکمت و دانائی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ انسان اس کا شکرگزار ہو ۱۲
— انسان اتنی نعمتیں پانے کے باوجود کم ہی شکرگزار ہوتا ہے ۴۱-۱۸۹
— انسان پر اللہ تعالیٰ کے یہ احسانات ہیں اور انسان کا حال یہ ہے کہ بغیر علم کے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے ۲۰
— انسان احسان فراموش ہے ۵۳۰
— جو لوگ اپنی خواہشات نفس کو خدا بنا لیں وہ علم کے باوجود گمراہی میں پھینکے جاتے ہیں اور ان کے دلوں اور کانوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے ۵۸۹
— انسان کی حقیر ابتدا اور خدا کے مقابلے میں اس کی جسارتیں ۲۷۲
— اس کے کرتوت بہت برے ہیں مگر اللہ درگزر فرماتا ہے ۲۴۱-۲۴۲
— وہ پوری طرح اللہ کی گرفت میں ہے ۱۷۷-۱۷۸
— اللہ کی قدرت کے آگے اس کی بے بسی ۲۶۹- ۵۰۵-۵۰۶
— اس کے علم کی نارسائی ۲۸-۲۹
— اس کا حقیقی معبود ایک ہی ہے ۲۷۸-۲۷۹-۴۴۱
— وہ اپنے خالق کو چھوڑ کر خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور اپنے آپ کو مستحق عذاب بھی ٹھیراتا ہے ۱۵
— اس کا رب صرف اللہ ہے ۴۲۴
— جو انسان اللہ کی بندگی قبول کرے اس نے فی الواقع بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا ۲۱
— اس کی زندگی اللہ کی رحمت پر منحصر ہے ۲۶۲-۲۶۳
— دنیا میں اس کی اصل حیثیت اور اس کے لیے صحیح راہ عمل ۴۷ تا ۴۹- ۱۳۵ تا ۱۳۷- ۲۳۸-۳۶۳
— اللہ کی عبادت اس کی فطرت کا تقاضا ہے ۲۷۹
— انسان کی فطرت میں کفر نہیں ہے ۲۲
— وہ خود اللہ کی بندگی کا محتاج ہے ۲۲۷
— اس پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی کرے ۳۵۵ تا ۳۵۷
— اس کے لیے سیدھا راستہ صرف اللہ کی بندگی ہے ۲۶۷
— اس کو تو ان لوگوں کی پیروی کرنی چاہیے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہوں ۱۶
— اس کو اللہ تعالیٰ حق پہچاننے کی مہلت دیتا ہے ۴۶۴
— اللہ اسے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کے ذریعے سے متنبہ کرتا رہتا ہے ۳۲-۳۳-۴۷-۴۸

— وہ خدا کی رہنمائی کے بغیر خود اپنے لیے صحیح راہِ حیات متعین نہیں کرسکتا ۵۶۰
— اس کو ہدایت میسر آنا سراسر اللہ کا فضل ہے ۲۸۸
— اس کے بگڑنے کی بنیادی وجہ خدا سے غفلت اور آخرت میں شک ہے ۳۵۰-۴۷۱
— ضروری نہیں کہ انسان کے برے اعمال کا نتیجہ دنیا ہی میں ظاہر ہو کیونکہ آخرت میں تو تمام برے اثرات سامنے آنے ہی ہیں ۴۲۸
— اس کے لیے دینِ حق ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے ۴۷۵-۴۷۶
— اس کو علم کے خلاف کوئی عقیدہ نہ رکھنا چاہیے ۱۶
— اس کو کون کون سے عوامل گمراہ کرتے ہیں ۲۶ تا ۲۸
— اس کے مبتلائے ضلالت ہونے کے اسباب (دیکھو ''ضلالت، اس کے اسباب'')
— دوسروں کی خاطر غلط رویہ اختیار کرنا اس کے لیے تباہ کن ہے ۳۶۲
— اس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا کے متعلق اپنے عقیدے کے تعین میں سہل انگاری سے کام لیتا ہے ۶۰۱
— انسان کا رویہ اس گمان سے متعین ہوتا ہے جو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں رکھتا ہے ۴۵۱
— انسان کے ''ظالم اور جاہل'' ہونے سے کیا مراد ہے؟ ۱۳۷
— انسانوں میں سے عقل رکھنے والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں ۳۶۳-۴۱۵
— غور وفکر کرنے والے انسانوں کے لیے نشانیاں ۳۴۰-۳۷۵-۵۸۴
— ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ۳۷۹-۵۷۹
— اللہ کی طرف رجوع کرنے والے کے لیے نشانی ۱۷۷-۳۹۷
— صبر وشکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ۲۵-۵۰۶
— عقل رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ۵۸۱
— یقین لانے والوں کے لیے نشانیاں ۵۸۰
— علم رکھنے والوں کے لیے قرآن ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہے ۴۳۹
— انسان کو اللہ تعالیٰ اس کے اپنے وجود میں ایسی نشانیاں دکھائے گا کہ اس پر کھل جائے کہ قرآن برحق ہے ۳۲-۴۷۰
— اللہ کے ہاں انسانوں کے درجات ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں ۶۱۳
— انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا ۲۴۸-۴۵۰-۴۵۱
— موت سے انسان کی صرف طبیعی زندگی ختم ہوتی ہے، اس کی روح باقی رہتی ہے ۴۳
— انسان کو اس کے اعمال کی حیثیت آخرت میں بتا دی جائے گی ۱۶-۱۷
— آخرت ہی انسان کا اصل گھر ہے ۳۴۳
— انسان کے لیے دنیا کی حیثیت کیا ہے؟ ۳۴۳
— انسان کو یہاں جو کچھ دیا گیا ہے وہ دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان ہے ۵۰۶
— خوش حالی میں پھولنا اور مصیبت میں خدا کو یاد کرنا انسان کی بڑی کمزوری ہے ۳۷۷-۳۷۸
— اس کی یہ کمزوری کہ خوش حالی میں مغرور اور مصیبت پڑنے پر مایوس اور خدا کا ناشکرا بن جاتا ہے ۲۵ تا ۲۷-۳۶۲-۳۶۳-۳۷۷-۳۷۸-۴۶۷-۴۶۸-۵۱۴
— ہر انسان کو ویسے ہی دوست ملتے ہیں جیسا وہ خود ہوتا ہے ۴۵۲

— گمراہ دوست انسان کو بھٹکائے پھرتے ہیں اور انسان سمجھتا ہے کہ وہ راہ راست پر ہے ۵۳۸
— انسانی طبائع اور افکار و اطوار کا اختلاف عین تقاضائے فطرت ہے ۲۳۱-۲۳۲
— انسانوں کے درمیان اختلاف کا فیصلہ کرنا اللہ ہی کا کام ہے ۳۷۷-۴۸۴-۴۸۸
— انسانوں کو ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں بلکہ ایک دوسرے کا محتاج رکھا گیا ہے ۵۳۷
— انسان کے پچھلے گناہوں کا کفارہ مستقبل میں اللہ کی اطاعت و بندگی اختیار کرنا ہے ۳۸۰
— انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدائشی راست رو اور ایک ہی امت کیوں نہ بنا دیا ۴۷۵-۴۸۱ تا ۴۸۳
— انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے ۴۸۲
— اللہ کی دوسری مخلوقات پر انسان کی فضیلت کے وجوہ ۴۸۳
— انسانی حواس میں سے اہم ترین حواس جن کا قرآن بار بار ذکر کرتا ہے ۴۱-۴۲
— انسانی صناعی اور خدائی تخلیق کا واضح فرق ۴۶۶
— انسان کی معلومات بہت محدود ہیں ۲۸-۲۹
— دنیا میں انسان کا امتحان کس طرح ہو رہا ہے ۴۴
(نیز دیکھو ''آزمائش'')
— زندہ انسان وہی ہے جس کا دل اور ضمیر زندہ ہو ۴۰۷
— انسان سے شیطان کی ازلی دشمنی ۲۲۰-۳۴۸-۳۴۹
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ابلیس'' اور ''شیطان'')
— انسان کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کی چالیں ۱۹۴-۲۲۰
— شیطان اس کا کھلا دشمن ہے ۲۲۰-۲۲۱-۲۶۶-۲۶۷-۵۴۸
— وہ شیطان کی پیروی کر کے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بناتا ہے ۲۲۰-۲۲۱-۳۴۹-۳۵۰
— شیطان کے فریب سے بچنے کے لیے اس کو اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے ۴۵۸-۴۵۹-۵۰۶
— اس پر شیطان کے مسلط ہونے کے اسباب و نتائج ۵۳۸-۵۳۹
— اللہ ہر انسان اور ہر قوم کو سنبھلنے کے لیے ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے ۲۴۱-۲۴۲
— دنیا کی زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ کر انسان غلط رویہ اختیار کرتا ہے اور اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل تباہ کرتا ہے ۱۳۵ تا ۱۳۷
— اللہ جب چاہے کسی قوم کو تباہ کر کے اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لا سکتا ہے ۲۲۷-۲۲۸
— انسان کی عمر کی کمی بیشی اللہ کے ہاں لکھی ہوئی ہے ۲۲۵
— اس کی عمر کا تعین اللہ کے اختیار میں ہے ۴۲۵-۴۲۶

انفاق فی سبیل اللہ

— اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ایسی تجارت ہے جس میں کوئی خسارہ نہیں ہے ۲۳۳
— اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اہل ایمان کی صفت ہے ۴۵-۴۶-۵۰۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''زکوٰۃ'' اور ''قرآن، اس کا معاشی تصور'')

اہل البیت

— ان سے کون مراد ہیں؟ ۹۲-۹۳
— اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کی تفسیر ۵۰۰ تا ۵۰۲
— اہلِ بیت سے گندگی دور کر دینے کا مطلب ۹۳-۹۴

— کیا اہلِ بیت معصوم ہیں؟ ۹۳
— اہلِ بیت کی ذمہ داری ۹۴

اہلِ کتاب-۸۴

— وہ خود اپنی دینی کتابوں کے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں ۴۹۴-۴۹۵
— ان میں بت پرستی کیسے شروع ہوئی ۱۸۱
— وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے قسمیں کھاتے تھے کہ رسول آیا تو ہم اطاعت کریں گے ۲۴۰-۳۱۳

آیات

— آیاتِ الٰہی کی چھ بڑی قسمیں ۴۷
— آیت (بمعنی معرفت حق کے نشانات اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں) ۲۵- ۴۸- ۵۰- ۱۷۴- ۱۹۱- ۱۹۳- ۲۵۶- ۲۵۹- ۲۶۱- ۲۶۳- ۲۸۱- ۳۷۵+۳۷۹- ۳۹۷- ۴۲۸- ۴۲۹- ۴۳۰- ۴۶۰- ۴۶۱- ۴۶۸ تا ۴۷۱- ۵۰۴- ۵۰۵- ۵۴۰- ۵۴۱- ۵۶۸- ۵۷۹- ۵۸۰- ۵۸۱-۵۸۳-۵۸۴
(تفصیل کے لیے دیکھو ’’قرآن، وہ تلاش حق کے کن طریقوں کی نشان دہی کرتا ہے‘‘)
— اللہ کی نشانیوں کا انکار کرنے والا غدار اور ناشکرا ہے ۲۵-۲۶
— اللہ کی نشانیوں سے کیسے لوگ سبق لیتے ہیں ۲۵- ۱۷۷- ۱۷۸- ۳۴۰- ۳۷۵- ۳۷۹- ۳۹۷-۵۰۶-۵۷۱-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲
— اللہ کی نشانیوں سے کون لوگ صحیح علم حاصل کرسکتے ہیں ۵۸۴
— اللہ کی نشانیوں کے منکر بڑے ظالم لوگ ہیں اور اللہ ان سے انتقام لے کر رہے گا ۴۷- ۴۸
— آیت (بمعنی معجزہ و علامت نبوت) ۴۰۲- ۴۲۸-۵۴۰-۵۴۱-۵۶۸
— کوئی رسول اپنے اختیار سے معجزہ دکھانے کی طاقت نہیں رکھتا ۴۲۸
— معجزہ اللہ ہی کے اذن سے رونما ہوتا ہے ۴۲۸
— معجزہ تماشا دکھانے کے لیے نہیں بلکہ فیصلہ کردینے کے لیے رونما ہوتا ہے ۴۲۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’معجزہ‘‘)
— آیت (بمعنی آیات کتاب اللہ اور بمعنی ارشادات و احکام الٰہی) ۷- ۱۰- ۴۵- ۴۹- ۹۲- ۱۷۵- ۲۶۳- ۳۸۱- ۳۸۳- ۳۹۱- ۴۰۹- ۴۱۶- ۴۲۳- ۴۲۶- ۴۴۸- ۴۵۳- ۴۶۲- ۴۶۳- ۵۰۶- ۵۴۹- ۵۸۱- ۵۹۰- ۵۹۳-۵۹۴-۶۰۳-۶۱۷
— اللہ کی آیات کا انکار کرنے والوں کا انجام بد ۴۴۸-۴۵۳-۵۸۳
— اللہ کی آیات کو زک دینے کی کوشش کا انجام ۱۷۵
— اللہ کی آیات کے مقابلے میں کج بحثی کرنے کا انجام بد ۳۹۱ تا ۳۹۳- ۴۲۶- ۴۲۷
— کتاب اللہ کا مقابلہ استکبار اور استہزا سے کرنے والوں کا انجام ۵۸۱ تا ۵۸۳ -۵۹۳-۵۹۴
— اللہ کی آیات کا مقابلہ کج بحثیوں سے کرنے والوں کا انجام ۴۱۶- ۵۰۶
— اللہ کی آیات کے مقابلے میں جھگڑا کرنے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں ۴۰۹- ۵۸۱
— اللہ کی آیات کو نہ ماننے کا نتیجہ گمراہی ہے ۴۲۳
— اللہ کی آیات کے خلاف کوشش کرنے والوں کے لیے عذاب ہے ۲۰۷- ۲۰۸

— اللہ کی آیات کو غلط معنی پہنانے (الحاد) کے نتائج ۴۶۲
— اللہ کی آیات کا انکار کرنے والوں کی عقل ماری جاتی ہے ۶۱۷

ایکہ: (دیکھو "اصحاب الایکہ")

ایمان

— مومن کی تعریف ۴۶-۹۴-۹۵
— مومن کی صفات ۷-۲۵-۴۵-۴۶-۸۰ تا ۸۳-۹۴ تا ۹۷-۱۰۲-۱۰۳-۱۳۵-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۲-۲۳۳-۲۴۷-۳۱۲-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۸۱-۴۰۹-۴۴۱-۴۴۹-۴۵۶ تا ۴۶۰-۴۹۷-۵۰۷ تا ۵۱۱-۵۴۹-۶۰۹
— مومن و فاسق برابر نہیں ہو سکتے ۴۶
— مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے ۲۲۹-۳۳۱-۳۳۲-۳۶۳-۳۶۶-۳۶۷-۵۸۷
— صداقت ایمانی کا معیار ۷۹-۸۰-۹۷-۹۸
— آدمی کے صادق الایمان ہونے کی علامات ۸۱ تا ۸۳
— مومن سے اگر کوئی گناہ ہو جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے ۳۳۶
— مومنین کو اللہ نے توبہ کیے بغیر بھی خطا بخشی کی رعایت دی ہے ۳۹۲
— مومنین پر دنیا میں آنے والی تکلیفیں اور مصیبتیں ان کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں ۵۰۵-۵۰۶
— اللہ تعالیٰ مومنوں کے اعمال میں سے بہترین کے مطابق جزا دے گا اور ان کی برائیوں سے درگزر فرمائے گا ۳۷۳-۶۱۱
— مومن کو کفار و منافقین کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے ۱۰۸
— اللہ کے حکم پر دل میں بھی آدمی کبیدہ خاطر ہو تو اس پر گرفت ہو گی ۱۱۸
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دل میں بھی کوئی وسوسہ ہو تو وہ قابل گرفت ہے ۱۱۸
— اہلِ ایمان کا نبی سے کیا تعلق ہونا چاہیے؟ ۷۱-۷۲-۱۳۴-۱۳۵
— ان کا کام نبی کی اطاعت کرنا ہے ۸۷-۹۲-۹۷-۹۸-۱۳۵
— مومنوں کو قرآن کا وارث بنایا گیا ہے ۲۳۳-۲۳۴
— ایمان کی اہمیت ۴۹-۵۰
— ایمان کے تقاضے ۲۱-۹۷-۹۸-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۲۳-۱۲۸-۱۳۵-۲۷۷-۳۶۳-۴۵۴-۴۵۶-۴۵۷-۴۸۵-۵۰۷ تا ۵۱۱-۶۰۹
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے تقاضے ۹۲-۹۷-۹۸-۱۰۴-۱۱۸-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۷-۱۳۵
— ایمان اللہ کی احسان مندی کا لازمی تقاضا ہے ۳۶۱
— اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ سے ڈرے ۳۶۳
— ایمان لانا اسی وقت تک نافع ہے جب تک حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آجاتی ۲۱۳-۴۵۲-۵۱۴
— عذاب الٰہی کو آتے دیکھ کر ایمان لانا بے کار ہے ۵۱-۳۱۹-۳۲۲-۴۳۱
— عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان کے نافع ہونے کی واحد مثال ۳۰۹
— خدا کے ہاں اسی شخص کا ایمان معتبر ہے جو شعور کے ساتھ کلمہ توحید کی شہادت دے ۵۵۲-۵۵۳
— ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے کا مطلب ۸۱ تا ۸۳
— قانونی حقوق میں اہل ایمان سب برابر ہیں ۸۳

— مومن کے لیے قرآن شفا اور ہدایت ہے ۴۶۴
— تمام کتب آسمانی پر ایمان لانا ضروری ہے ۴۲۶-۴۹۵
— اہل ایمان کی نصرت کے لیے اللہ کے وعدوں کا صحیح مطلب ۸۱-۸۲
— اللہ دنیا اور آخرت دونوں میں اہل ایمان کی مدد کرتا ہے ۳۱۳-۴۱۴
— اللہ کا یہ وعدہ برحق ہے ۴۱۵
— مومن اور کافر اور منافق کا فرق ۲۲۹-۲۳۴
— مومن اور کافر کے حال اور مستقبل کا فرق ۲۲۹
— مومن اور فاسق کا فرق ۴۶-۴۷
— اہل ایمان کا انجامِ نیک ۵۰۷
— مومن صالح کا انجامِ نیک ۴۶-۴۷-۳۷۲-۳۷۳-۴۱۱-۴۶۲-۵۴۹
— مومنین کے اجر کا سلسلہ ٹوٹنے والا نہیں ہے ۱۰۸-۴۴۱
— فرمانبردار مومن ہی حقیقت میں علم رکھتا ہے ۳۶۲-۳۶۳
— مومن صالح اور مفسد کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا ۳۳۱
— مومن صالح اور بدکار انسان نہ دنیا میں ایک جیسے ہوسکتے ہیں نہ آخرت میں ۵۸۷
— قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی فضیلت، ان کے طبقات اور آخرت میں ان کا انجام ۲۳۳-۲۳۷
— ایمان اور عمل صالح کا لزوم ۱۰-۱۴-۱۷-۲۰۷-۲۲۱-۲۲۳-۲۲۴-۴۱۱-۴۴۱-۴۴۴-۵۰۰-۵۰۳-۵۰۴-۵۸۷-۵۹۲
— صرف ایمان ہی اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت ہے ۶۱۹
— ایمان کے بغیر کوئی عمل صالح نافع نہیں ہے ۷۹-۴۱۱
— ایمان و عمل صالح کے ثمرات ۱۰-۴۵-۴۶-۸۳-۹۴-۹۷-۱۰۴-۱۰۸-۱۷۴-۱۷۵-۲۰۷-۲۲۱-۲۲۳-۲۲۴-۲۳۲-۲۳۳-۲۹۱-۲۹۷-۳۰۲-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۹-۳۷۳-۴۴۹-۴۵۴-۴۵۴ تا ۴۵۶-۵۰۰-۵۰۳-۵۹۳-۶۰۹
— ایمان اور عمل صالح کے اخلاقی نتائج ۳۲۵
— اہلِ ایمان کے لیے اللہ کی ہدایات ۱۳۵
— اہلِ ایمان پر اللہ کی عنایات ۱۰۴
— اللہ مومن پر مہربان ہے ۱۳۶
— اہلِ ایمان کے حق میں فرشتے دعا کرتے ہیں ۱۰۴-۱۰۵-۳۹۴-۳۹۴ تا ۳۹۶
— اہل ایمان میں سے دین حق کے لیے کام کرنے والوں پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے ۴۵۵
— فرشتوں اور مومنوں کے درمیان ایمان کا رشتہ ہے ۳۹۴
— اہل ایمان کے ساتھ ان کے صالح والدین، صالح اولاد اور صالح بیویوں کو جنت میں یکجا کر دیا جائے گا ۳۹۵
— اہل ایمان کے لیے جنت کا وعدہ ۱۱-۴۵۴-۴۵۵-۶۰۹
— کسی مومن کو بے قصور اذیت دینا گناہ ہے ۱۲۳
— یہ مسئلہ کہ گناہ گار مومن جہنم میں جائیں گے یا نہیں؟ ۲۳۵-۲۳۶
— وہ مقامات جہاں ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' سے مراد صرف صادق الایمان لوگ ہی نہیں ہیں ۷۶-۷۷-۱۳۴
— مومن اگر کسی علاقے میں احکامِ الٰہی کی پابندی نہ کرسکے تو اسے ہجرت کر جانی چاہیے ۳۶۳

___ مومن کا کام مایوس ہونا نہیں، چاہے باطل کی قوتیں کتنی ہی بالادست ہوں ۴۵۴ - ۴۵۵
___ مومن باطل کا مقابلہ کرتے ہیں نہ کہ دب جاتے ہیں ۵۱۱

ایوب علیہ السلام
___ ان کا قصہ ۳۳۹ تا ۳۴۲

ب

بائبل
___ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کے معاملے میں اس کی تضاد بیانی ۲۹۷ - ۲۹۸
___ اس کا حضرت موسیٰ کی زندگی کے اہم ترین واقعے سے خالی ہونا ۴۰۴
___ قصہ حضرت موسیٰ میں بائبل اور قرآن کے بیان کا فرق ۵۴۲
___ بنی اسرائیل کے شرک اور انبیا پر ان کے ظلم کی شہادتیں ۳۰۳ - ۳۰۵
___ اس میں نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ۳۰۵ - ۳۰۶
___ اس میں حضرت داوٗدؑ پر زنا کا جھوٹا الزام ۳۲۷ - ۳۲۹
___ بنی اسرائیل کے شرک اور اخلاقی زوال پر اس کی شہادت ۳۴۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''انجیل''، ''اہلِ کتاب''، ''بنی اسرائیل''، ''تورات''، ''موسیٰ علیہ السلام'' اور ''عیسیٰ علیہ السلام'')

برزخ
___ حیاتِ برزخ کا ثبوت ۲۵۴ تا ۲۵۶
___ حیاتِ برزخ میں بھی اللہ مومنین سے اچھا معاملہ کرتا ہے ۳۷۲
___ عذابِ قبر (یعنی عذاب برزخ) کا ثبوت ۴۱۲
___ عذابِ برزخ کی کیفیت ۴۱۲ - ۴۱۳

برکت
___ معنی وتشریح ۳۳۲ - ۴۴۲
___ قرآن میں برکت والی سرزمین سے مراد شام و فلسطین ہے ۱۹۲ - ۱۹۳

بشر
___ معنی وتشریح ۲۹۷ - ۳۴۷ - ۳۴۸
___ بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے، اس لیے اللہ انبیا کو پیغام پہنچانے کے دوسرے طریقے اختیار کرتا ہے ۵۱۶
___ بشریت انبیا (دیکھو ''نبوت'')

بعل
___ شرقِ اوسط کے مشرکین کا سب سے بڑا دیوتا ۳۰۴ - ۳۰۵

بنی اسرائیل
___ ان کی مختصر تاریخ ۴۹ - ۳۰۲ تا ۳۰۵
___ وہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد ہیں ۳۰۱
___ ان کو کتاب اللہ کا وارث بنایا گیا ۴۱۵
___ ان کو ''کتاب''، ''حکم'' اور ''نبوت'' دی گئی ۵۸۶
___ دین کے معاملے میں ان کو واضح ہدایات دی گئی تھیں ۵۸۶
___ جب تک انھوں نے اللہ کی آیات پر ایمان رکھا انھیں دنیا کی امامت حاصل رہی ۴۹ - ۵۰
___ امامت کا منصب ان سے سلب کر کے اب امت محمدیہ کو دیا گیا ہے ۵۸۶
___ ان کا فرعون کی غلامی سے نجات پانا ۳۰۲ - ۵۶۸
___ کیا وہ فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کے وارث

ہوئے تھے؟ ۵۶۷-۵۶۸
— اللہ نے کس بنا پر ان کو توحید کی علم برداری کے لیے منتخب کیا تھا؟ ۵۶۸
— ان کو اللہ نے اپنی کن نعمتوں سے نوازا تھا اور وہ کیوں ان سے محروم ہوئے؟ ۵۸۶-۵۸۷
— حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کا سلوک ۱۳۴-۱۳۵
— انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیوں کیا؟ ۱۶۵
— حضرت سلیمان علیہ السلام سے ان کی عداوت ۱۸۰-۱۸۱
— اپنے انبیاؑ کے ساتھ ان کا سلوک ۱۳۴-۱۳۵-۳۰۳-۳۰۴
— ان کا داود علیہ السلام پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا ۳۲۷ تا ۳۲۹
— حضرت سلیمانؑ پر ان کی تہمتیں ۳۳۶
— حضرت الیسع کے دور میں ان کا اخلاقی زوال ۳۴۴
— حضرت موسیٰ کے بعد ان کا بگاڑ ۵۰-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵
— حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا بگاڑ ۳۰۲ تا ۳۰۵
— ان کے گمراہ ہونے کی وجہ ۵۸۶-۵۸۷
— ان کے گمراہ کن اختلافات کا قیامت کو فیصلہ کیا جائے گا ۵۰-۵۸۶
— ان کو ایسی نشانیاں دکھائی گئیں جو ان کے لیے صریح آزمایش تھیں ۵۶۸-۵۶۹
— ''بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ'' کے متعلق تفسیری بحث ''۶۰۶ تا ۶۰۸
— ان کو کتاب اللہ کی رہنمائی نے کس حالت سے نکال کر کس درجے تک پہنچایا؟ ۴۹-۵۰

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''یہود'')

بنو قریظہ - (دیکھو ''غزوۂ بنی قریظہ'')

بنی النضیر
— وہی مدینے پر عرب قبائل کے مشترکہ حملے کے محرک تھے ۵۸
— مدینہ سے ان کے اخراج کے وجوہ ۵۴-۵۵-۵۶

بہتان
— معنی اور تشریح ۱۲۳-۱۲۸-۱۲۹-۵۰۲
— غیبت اور بہتان کا فرق ۱۲۸-۱۲۹

بینات
— معنی اور تشریح ۴۰۲-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۲۴-۴۳۱
— وہ بینات جو انبیاؑ لائے ۴۰۶-۴۱۴-۵۴۸

پ

پردہ: ۸۷ تا ۱۲۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، معاشرتی قوانین'')

ت

تبرج
— معنی اور تشریح ۹۱ (نیز دیکھو ''پردہ'')

تبع - ۵۶۹-۵۷۰

تبنیت
— متبنّیٰ بنانے کی رسم نے معاشرے میں اخلاقی و قانونی مشکلات پیدا کر دی تھیں ۶۳-۶۴-۱۰۱-۱۰۲
— محض قانونی حکم سے صدیوں پرانی اس رسم کا ٹوٹنا محال تھا، اس لیے ضروری ہوا کہ حضورؐ خود اس کو توڑیں ۶۴-۱۰۳-۱۰۴
— آپؐ اس رسم کو توڑنے میں ہچکچا رہے تھے ۶۶-

۶۸-۷۴-۱۰۱
— اس شش و پنج کے بارے میں اللہ کا ارشاد ۹۹-۱۰۰
— یہ رسم آپؐ نے اللہ کے حکم سے توڑی ۱۰۱-۱۰۲

تخییر - ۸۵ تا ۸۸

تسبیح
— معنی اور تشریح ۴۵- ۱۰۴- ۲۰۸- ۲۰۹- ۲۵۶- ۲۵۸- ۵۲۸

تصویر
— شریعتِ الٰہی میں تصاویر اور مجسّموں کی حرمت ۱۸۰ تا ۱۸۹
— تورات میں تصویر کشی کی ممانعت ۱۸۰- ۱۸۱
— فوٹو کا حکم ۱۸۷- ۱۸۸
— تصویر کا جواز پیش کرنے والوں کے دلائل اور ان کی غلطی ۱۸۱- ۱۸۵- ۱۸۷ تا ۱۸۹

تعددِ ازواج
— اس کا جواز ''ناگزیر شخصی ضروریات'' کے ساتھ مقید نہیں ہے ۱۱۶

تقدیر
— بمعنی منصوبہ اور مقرر ضابطہ ۲۵۹
— کائنات کی تدبیر کا منصوبہ ۴۴۶
— وہ خاص ساعت جس میں اللہ قسمتوں کے فیصلے فرماتا ہے ۵۵۶- ۵۵۹- ۵۶۰
— تقدیر کے باوجود اللہ سے دعا مانگنا نافع ہے ۴۱۸- ۴۲۰- ۴۲۱- ۴۲۲- ۵۰۳
— دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے ۴۲۰- ۴۲۱
— انسان کی پیدائشی قسمت جس کو بدلنے کی طاقت اللہ کے سوا کسی میں نہیں ۵۳۷
— اللہ نے اختلافات کے فیصلے کا وقت مقرر کر رکھا ہے ۴۶۴- ۴۶۵- ۴۹۳- ۴۹۴
— اللہ کی مشیت اور اس کی رضا کا فرق ۲۰۸- ۳۶۰- ۳۶۱- ۵۲۱- ۵۳۲- ۵۳۳
— اللہ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں جنھیں کوئی بدل نہیں سکتا ۵۵۶- ۵۵۹- ۵۶۰
— تم اللہ کے طریقے میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور نہ کوئی طاقت اللہ کے ضابطے کو بدل سکتی ہے ۱۳۳- ۲۴۱
— تقسیم رزق سراسر اللہ کے اختیار میں ہے ۵۳۶
— رزق کی تقسیم میں اللہ کا طریقہ ۴۹۷- ۴۹۸- ۵۰۴- ۵۳۶- ۵۳۸
— اللہ کی تقسیمِ رزق کو بدل دینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے ۴۹۸
— رزق کی کمی بیشی اللہ ہی کے اختیار میں ہے ۲۰۶- ۲۰۷- ۲۰۸- ۳۷۹- ۴۸۵
— کائنات کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں ۳۸۱- ۴۸۵
— ہر شخص کی عمر میں کمی بیشی اللہ کے ہاں لکھی ہوئی ہے ۲۲۵- ۴۲۵- ۴۳۶
— کسی شخص کو معلوم نہیں کہ اسے موت کس سرزمین پر آنی ہے ۲۷- ۲۸
— زندگی اور موت اللہ ہی کے اختیار میں ہے ۴۲۵- ۴۲۶
— اللہ جس کو جیسی اور جتنی چاہے اولاد دیتا ہے ۵۱۵
— اللہ جس کو جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے ۴۹۷
— اللہ اپنے عطیوں کی تقسیم اپنے بندوں میں کس طرح کر رہا ہے ۵۳۶- ۵۳۷
— اللہ اپنے تمام بندوں پر مہربان ہے لیکن اس کی عطا و بخشش میں فرق و تفاوت ہے ۴۹۷

— اللہ ہی کی توفیق سے آدمی کو اسلام میں شرحِ صدر حاصل ہوتا ہے ۳۶۶-۳۶۷

— اللہ کی مدد کے بغیر کوئی شخص شیطان کی چالوں سے نہیں بچ سکتا ۴۵۸-۴۵۹

— اللہ بگڑے ہوئے لوگوں پر شیاطین اور ائمۂ شر مسلط کر دیتا ہے ۴۵۲-۵۳۸

— انسان کو بااختیار بنا کر امتحان کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے ۴۴-۱۳۵ تا ۱۳۷

— اللہ کی توفیق کے بغیر انسان دنیا کے امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکتا ۴۸۱-۴۸۳

— کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرنے والا ہے ۲۷-۲۸

— انسان کی کوئی تدبیر اللہ کی توفیق اور اس کے اذن کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی ۵۰۷

— اللہ کی توفیق کے بغیر انسان کا کوئی ارادہ عمل میں نہیں آ سکتا ۶۱۱

— اپنی گمراہی کے حق میں تقدیر کو دلیل بنانا جہالت ہے ۲۶۳-۵۲۱-۵۳۲-۵۳۳

— لوگوں کا تقدیر سے غلط استدلال ۲۶۳-۴۲۰

— آدمی اللہ کے اذن ہی سے نیکی کے راستے پر چل سکتا ہے ۲۳۴

— اللہ نے انسان کو کفر و ایمان کے انتخاب میں آزاد کس لیے چھوڑا ہے ۴۷۵-۴۸۱ تا ۴۸۴

— آدمی اپنے اچھے اور برے عمل اور ہدایت یا ضلالت اختیار کرنے کا خود ذمہ دار ہے ۲۳۷-۲۳۸-۳۷۵-۳۷۸-۴۶۵-۵۸۴-۶۱۷

— اللہ نے یہ نہیں چاہا کہ پیدائشی طور پر تمام انسانوں کو ایک امت بنا دے ۴۴-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳

— اللہ کے کسی کو گمراہی میں ڈالنے کا مطلب ۲۲۱-۲۲۲-۵۸۹

— اللہ جسے گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ راست نہیں دکھا سکتا ۵۱۲-۵۱۳-۵۸۹

— اللہ کیسے لوگوں کے کانوں اور دلوں پر مہر لگاتا اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے؟ ۲۲۱-۲۲۲-۴۰۹-۴۱۰-۵۰۲-۵۰۳-۵۸۹-۶۱۷

— کیسے لوگوں کے دلوں پر ٹھپا لگا دیا جاتا ہے ۴۰۹-۴۱۰

— کیسے لوگوں کو گمراہی میں ڈالا جاتا ہے ۴۰۸-۴۰۹-۴۲۷-۵۱۲-۵۳۸-۵۸۹-۶۲۰

— کیسے لوگوں کو نیکی اور ایمان کی توفیق نہیں دی جاتی ۲۴۶-۲۴۷

— اللہ جسے چاہے ہدایت دے ۲۲۱-۲۲۲-۵۱۷

— کیسے لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھا جاتا ہے ۳۵۷-۳۶۷-۳۶۸-۳۷۳-۳۷۴-۴۰۶-۴۰۹-۴۱۰-۴۴۹-۴۶۴-۵۸۹-۶۰۶-۶۰۸

— کیسے لوگوں کو ہدایت بخشی جاتی ہے؟ ۳۶۵-۳۶۷-۳۶۸

— کیسے لوگوں کو اللہ کی طرف سے ہدایت ملتی ہے اور کیسے لوگوں کو نہیں ملتی؟ ۴۷۵-۴۸۳-۴۹۳

— باطل مذہبوں کی پیدائش کا ذمہ دار اللہ نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے یہ کام کیا ہے ۴۹۳-۴۹۴

— دنیا میں انسان پر ڈالے جانے والے بہت سے مصائب کی حقیقت ۵۰۵-۵۰۶

— کوئی کسی کے لیے منحوس نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے ہی نصیب کی برائی دیکھتا ہے ۲۵۲

— انسان پر جو مصیبت بھی آتی ہے، اس کے اپنے

ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے ۵۰۵
— اللہ نے ثمود کو راہِ راست پیش کی مگر انھوں نے خود اندھا رہنا پسند کیا ۴۴۹
— دوزخیوں سے متعلق اللہ کا ارشاد کہ ''انھوں نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا، ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا ہے'' ۵۵۰
— اللہ اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے ۴۰۰-۴۶۵-۵۵۰-۵۸۷
— انسان کے اپنے ہی اعمال پر جزا و سزا مرتب ہو گی ۳۹۹-۵۵۰-۵۸۷-۵۹۲
— انسان کو حسن عمل کی طرف دعوت ۳۷۹-۳۸۰-۶۱۹
— اللہ اپنے بندوں کے کفر کو پسند نہیں کرتا ۳۶۰
— قضا و قدر پر جو اشارات قرآن میں ہیں وہ انسان میں قناعت، توکل علی اللہ، صبر و استقامت اور دنیوی طاقتوں سے بے خوفی پیدا کرنے کے لیے ہیں ۲۲۷-۴۸۵-۴۸۶
— بہت سے کافر جان بوجھ کر گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ۳۷۰

تقلید

— اندھی تقلید اہم ترین اسبابِ ضلالت میں سے ہے ۲۰-۱۳۴-۲۹۰
— مشرکینِ عرب کا تقلیدِ آبائی پر اصرار ۵۳۲ تا ۵۳۵
— اللہ ان اسلاف کا بھی رب ہے جن کی تقلید کی جاتی ہے ۵۶۱
— کم علم لوگوں کی تقلید کی ممانعت ۵۸۶-۵۸۷
— رسول کی تقلید (پیروی) ہی سیدھے راستے تک پہنچنے کا ذریعہ ہے ۲۵۳
— حضرت ابراہیمؑ نے تقلیدِ آبائی کے بجائے تقلیدِ حق کا مسلک اختیار کیا ۵۲۱-۵۳۴
— صحیح مسلک تقلیدِ حق ہے نہ کہ تقلیدِ آبائی ۵۳۵

تقویٰ

— معنی و تشریح ۳۶۳
— اللہ سے ڈرنے ہی کا نام تقویٰ ہے ۵۴۸
— ایمان کا لازمی تقاضا ۳۶۳
— سچائی لانے والے اور سچائی کی تصدیق کرنے والے ہی متقی ہیں ۳۷۲
— تقویٰ کے تقاضے ۸۷ تا ۸۹- ۱۱۲- ۱۳۵- ۳۰۲-۳۰۴
— اس کا تقاضا ہے کہ کفار و منافقین کی اطاعت نہ کی جائے ۶۸
— اس کا تقاضا ہے کہ نبی کی اطاعت کی جائے ۵۴۸
— متقین کے لیے اللہ کا وعدہ ۳۶۶
— اللہ ہی متقین کا ولی ہے ۵۸۷
(لفظ ولی کی تشریح کے لیے دیکھو ''ولی'')
— متقین کا انجامِ نیک ۳۴۴- ۳۶۶- ۳۸۱- ۵۴۹-۵۶۱
— تقویٰ کے نتائج ۱۳۵- ۴۴۹
— متقیوں اور فاسقوں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا ۳۳۱-۳۳۲
— حضورؐ کو سب سے پہلے خود تقویٰ اختیار کرنے کا حکم تھا ۳۶۴

تکبر

— معنی و تشریح ۴۲۷ - ۴۲۸
— تکبر کے مظاہر اور اس کی مذمت ۱۸- ۱۹
— اللہ کی آیات کی پیروی کو اپنی شان سے فروتر سمجھنا ۴۰۹-۴۱۰-۵۹۳
— کتاب اور رسولؐ کی پیروی کو اپنی شان سے فروتر سمجھنا ۳۸۱

— اپنے عقائد پر اصرار کر کے نبی کی بات نہ ماننا ۴۶۱

— نفس کا تکبر ایمان لانے میں مانع ہوتا ہے ۶۰۶-۶۰۸

— انکارِ آخرت کی وجہ تکبر ہے ۴۰۵-۵۹۳-۶۱۳

— اللہ کی بندگی سے منہ موڑنا ۴۱۸-۴۲۰

— فرعون متکبر تھا ۴۰۵

— تکبر کے اخلاقی نتائج ۴۰۹-۴۱۰

— ''تکبر'' اور ''کفر'' کا لزوم ۳۸۱-۳۸۴-۴۰۵-۴۰۹-۴۱۶-۴۲۷-۴۲۸

— متکبرین کا انجامِ بد ۳۸۴-۴۲۷-۴۲۸-۶۱۳

— مومن تکبر نہیں کرتے ۴۵

تلمود

— اس کی بے سروپا روایات ۳۳۶

— اس کا حضرت موسیٰ کی زندگی کے اہم ترین واقعے سے خالی ہونا ۴۰۴ (نیز دیکھو ''بائبل'')

توبہ

— معنی وتشریح ۵۰۳

— اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے ۱۳۶-۳۹۱

— اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے ۵۰۳

— ''توبہ قبول کرنا'' اور ''گناہ معاف کرنا'' دونوں ہم معنی نہیں ہیں ۳۹۲

— توبہ کے بغیر بخشش کی رعایت صرف مومنین کے لیے ہے ۳۹۲

توحید

— اس کی تشریح اور اس کی حقیقت ۴۹۳-۴۸۴-۴۸۶-۴۸۷

— توحید اور شرک میں فرق ۳۷۰-۳۷۱

— اس کے دلائل ۱۱-۱۲-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۳۲-۳۷-۳۸ تا ۴۱-۴۷-۴۸-۱۷۳-۱۹۹-۲۰۰-۲۱۶-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۴ تا ۲۲۶-۲۳۱-۲۳۹-۲۴۰-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۶ تا ۲۶۲-۲۷۰-۲۷۸-۲۷۹-۳۰۴-۳۰۵-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۲-۳۷۰-۳۷۶-۳۷۷-۳۹۸-۴۰۱-۴۱۸-۴۲۲ تا ۴۲۶-۴۳۰-۴۴۲ تا ۴۴۶-۴۶۰-۴۶۱-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۲ تا ۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۱۵-۵۱۶-۵۲۵ تا ۵۲۸-۵۳۴-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۷-۵۶۰ تا ۵۶۲-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۹ تا ۵۸۱-۵۸۳ تا ۵۸۵

— (توحید کے دلائل ہی خدا کی ہستی کے دلائل ہیں، اس لیے ہم نے ان کا الگ عنوان قائم نہیں کیا)۔

— اللہ کی حکمت اور اس کی شانِ خلاقی پر دلالت کرنے والی نشانیاں ۲۳۱

— عقیدۂ توحید انسان کو کیوں قبول کرنا چاہیے ۱۹-۲۰

— وہ دینِ حق کی اصل بنیاد ہے ۴۷۵

— اس کو اختیار کرنا حقیقت کے عین مطابق ہے ۲۹

— اس کی صداقت کا نقش ہر انسان کے نفس میں موجود ہے ۲۵-۳۶۲-۳۷۷-۳۷۸-۵۶۱

— عقیدۂ توحید کے تقاضے ۳۹۷-۳۹۸-۴۴۱-۴۵۴-۴۶۰-۴۷۵-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۶-۴۸۷-۵۶۱-۶۰۹

— انسانی زندگی پر اس کے اثرات ۳۷۰-۳۷۱

— اللہ کی بندگی کرنا انسان کی اپنی ضرورت ہے ۲۷۷

— اللہ کے سوا کسی دوسرے سے دعا مانگنے کا کچھ حاصل نہیں ۲۲۶-۲۲۷

— اللہ اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو ۳۱۲

— انسانوں کے اندر اتفاق و اتحاد صرف توحید ہی کے اعتقاد میں ممکن ہے ۳۵۷

— تمام انبیاءؑ توحید ہی کی تعلیم دیتے رہے ہیں ۳۸۱ - ۴۴۷

— عقیدۂ توحید کو اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ دنیا میں غالب ہو کر رہنا ہے ۳۱۶ - ۳۱۷

— صرف توحید ہی کی پیروی کر کے آدمی اللہ کی رحمت کا مستحق ہو سکتا ہے ۴۸۱ - ۴۸۳

— توحید پر استقامت کی صورت میں اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے مدد کرتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں مومن کے ساتھی ہوں گے ۴۵۴ - ۴۵۵

تورات

— وہ اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کو عطا کی گئی ۴۹ - ۴۱۵ - ۴۶۴ - ۶۰۸

— اس کی تعلیم نہایت واضح تھی ۳۰۲

— وہ رحمت اور ہدایت بن کر آئی تھی ۶۰۸

— وہ اہلِ دانش کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ۴۱۵

— بنی اسرائیل اس کے وارث بنائے گئے تھے ۴۹ - ۴۱۵

— جب تک بنی اسرائیل نے اس پر ایمان رکھا اور صبر و استقامت سے جمے رہے انھیں دنیا کی امامت حاصل رہی ۴۹ - ۵۰

— اس کے ماننے والے خود اس کے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں ۴۹۴ - ۴۹۵

— اس میں تصویر کشی اور مجسمہ سازی کی حرمت ۱۸۰ - ۱۸۱

— تمام انبیائے بنی اسرائیل اس کے پیرو تھے ۱۸۰

— قرآن وہی تعلیم لایا ہے جو تورات میں آئی تھی ۶۰۸

— اس کی بھی اسی طرح مخالفت کی گئی تھی جس طرح قرآن کی کی گئی ۴۶۴ (نیز دیکھو "بائبل")

توکل

— اس کے معنی اور اس کی حقیقت ۶۸ - ۶۹ - ۵۰۷

— اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے ۶۸ - ۱۰۸

— اللہ ہی پر توکل کیوں کرنا چاہیے ۳۷۳ - ۳۷۴

— توکل علی اللہ کا اخلاقی نتیجہ ۳۷۳ - ۳۷۴ - ۴۰۵ - ۴۰۶ - ۴۱۲ - ۴۱۶ - ۴۶۰ - ۴۸۵ - ۵۶۵ - ۵۶۶

— دین میں توکل علی اللہ کی اہمیت ۵۰۷

ث

ثمود - ۴۰۸

— ان پر اچانک عذاب آیا ۴۴۷

— ان پر نزولِ عذاب کی وجہ ۳۲۲ - ۴۴۷ - ۴۴۸ - ۴۴۹

— حق کے انکار کے لیے ان کی حجتیں ۴۴۷

— ان میں سے صاحب ایمان لوگ بچا لیے گئے ۴۴۹

ج

جادو

— معجزے اور جادو کا فرق ۴۰۳

جاہلیت

— معنی اور تشریح ۹۱

جدال

— کج بحثی اور بحث برائے تحقیق کا فرق ۳۹۱ - ۳۹۳

— اللہ کی آیات کے مقابلے میں کج بحثی کا انجام ۳۹۱ - ۳۹۳

جزا و سزا

— اللہ کا بے لاگ قانونِ جزا و سزا ۸۷ - ۸۸ - ۳۰۶ - ۳۰۷ تا ۳۱۱ - ۳۲۵ - ۳۳۰ - ۳۶۴ - ۵۸۶ - ۵۸۷

— نیکی کی جزا اور بدی کی سزا کے معاملے میں اللہ کا ضابطہ ۲۰۶ - ۲۰۷ - ۲۶۶ - ۲۸۵ - ۴۱۰ - ۴۱۱ - ۴۵۳ - ۶۱۱ - ۶۱۲ - ۶۱۳

— کائنات کی تخلیق کے برحق ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس میں قانونِ مکافات ہو ۵۸۷-۵۸۸
— دنیا کی موجودہ زندگی میں بھی اللہ کا قانون مکافات کام کر رہا ہے ۵۰- ۱۲۳- ۱۳۳- ۱۹۲- ۱۹۳- ۲۳۰- ۲۳۱- ۲۴۱- ۲۵۵- ۲۵۶- ۲۹۰- ۲۹۱- ۳۰۶- ۳۱۹- ۳۲۲- ۳۶۳- ۳۶۹- ۳۷۸- ۳۷۹- ۳۸۰- ۳۹۳- ۴۰۱- ۴۰۲- ۴۰۸- ۴۱۲- ۴۱۳- ۴۲۸- ۴۲۹- ۴۳۰- ۴۳۱- ۴۴۷ تا ۴۴۹- ۴۵۰- ۴۵۱- ۵۰۵- ۵۰۶- ۵۲۵- ۵۳۴- ۵۴۱- ۵۴۵- ۵۴۶- ۵۶۵ تا ۵۶۸- ۶۱۶- ۶۱۷
— بہت سے قصوروں کی سزا دنیا میں نہیں دی جاتی ۵۰۵-۵۰۶
— انسان کو سزا اس کے اپنے عمل کی ملتی ہے ۳۹۹-۵۵۰
— انسان کو جزا و سزا اس کے عمل کے لحاظ سے ملتی ہے ۵۹۲-۶۰۹
— ہر ایک کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے متعین ہوتا ہے ۶۱۲
— انسان کو سزا اس وقت دی جائے گی جب اس پر حجت پوری ہو چکی ہو گی ۵۵۰
— مومنِ صالح اور بدکار انسانوں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا ۵۸۷-۵۸۸
— موت کے بعد اور قیامت سے پہلے بھی جزا و سزا کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۴۱۲
(نیز دیکھو ''برزخ'')
— جزا و سزا میں ظلم کی مختلف صورتیں کیا ہو سکتی ہیں؟ ۴۰۰
— مومن کے اعمال کی جو کچھ جزا اللہ تعالیٰ نے مہیا کر رکھی ہے کوئی اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا ۴۶

جن

— ان کی حقیقت ۱۷۹-۱۹۰-۱۹۱
— جن اور انسان دو الگ قسم کی مخلوق ہیں ۴۵۲-۴۵۳-۶۱۲
— گمراہ انسان ان کی بندگی بجا لاتے ہیں ۲۰۹
— وہ کیسے جن تھے جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے ۱۷۹-۱۸۹ تا ۱۹۱-۳۳۹
— مشرکینِ عرب جنوں کو اللہ کا شریک اور غیب داں سمجھتے تھے ۱۹۰-۱۹۱
— ان کا دائرۂ عمل زمین اور اس کے ماحول تک محدود ہے ۲۷۹-۲۸۰
— جنوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن سن کر ایمان لانا اور اپنی قوم میں تبلیغ اسلام کرنا ۵۹۶-۵۹۸-۶۱۸ تا ۶۲۰
— آپؐ کو جنوں کے قرآن سننے کا علم نہیں ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے بعد میں وحی کے ذریعے سے آپ کو اس سے مطلع کیا ۶۱۸
— یہ جن حضرت موسیٰؑ اور تورات پر پہلے سے ایمان رکھتے تھے ۶۱۹
— بعد میں جنوں کے وفود رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آنحضورؐ کی خدمت میں بار بار حاضر ہوتے رہے ۶۱۹-۶۲۰
— جنوں میں بھی انسانوں کی طرح منکرینِ آخرت موجود ہیں اور انھیں بھی اس حرکت کی سزا دی جائے گی ۶۱۲
— ''جن'' بمعنی ''فرشتہ'' ۳۱۲

جنت

— وہ کیسے لوگوں کے لیے ہے؟ ۱۰- ۴۷- ۲۰۷- ۲۳۴- ۲۸۵- ۲۸۶- ۳۴۴- ۳۶۶- ۳۸۴- ۴۱۱- ۴۵۴ تا ۴۵۶- ۵۰۰- ۵۰۷- ۵۴۹- ۵۷۲- ۶۰۹- ۶۱۱ تا ۶۱۲
— اس کی نعمتوں کی کیفیت اور تفصیلات ۲۰۷-

۲۳۴ تا ۲۳۷-۲۶۶-۲۸۵ تا ۲۸۷-۳۴۴-۳۶۶-۵۰۰-۵۴۹-۵۷۲-۵۷۳
— وہاں مومن جو چاہے گا اسے ملے گا اور اس کی ہر تمنا پوری ہوگی ۴۵۶-۵۰۰-۵۷۲
— اس کا دوام ۱۱-۲۰۷-۲۰۸-۲۳۴-۲۳۷-۳۴۴-۳۴۵-۳۶۶-۳۸۴-۳۸۵-۳۹۵-۴۱۱-۴۴۲-۴۵۶
— جنت کا اجر بہتر اور پائدار ہے ۵۰۷
— اس کی نعمتوں کی حیثیت ۱۱
— جنت کا کھانا غذا کے طور پر نہیں، صرف لذت کے لیے ہوگا ۲۸۶
— حور و غلمان کی تشریح ۲۷۶-۲۸۷-۵۷۲
— اس کی شراب کی کیفیت ۲۸۶-۲۸۷
— اہلِ جنت زمین کے وارث ہوں گے ۳۸۵
— جنت میں اہلِ جنت جہاں چاہیں گے اپنا گھر بنائیں گے ۳۸۵
— جنت میں اہلِ جنت کے داخلے کا منظر ۳۸۴
— جنت کے منتظم اہلِ جنت کا کس طرح استقبال کریں گے ۳۸۴
— جنتیوں پر اللہ تعالیٰ بھی سلام بھیجتا ہے ۱۰۵-۲۶۶
— وہاں انسان کو حیات جاوداں ملے گی ۱۱-۲۸۸-۲۸۹-۳۹۵-۵۴۹-۵۷۲-۵۷۳-۶۰۹
— وہاں نہ کوئی مشقت ہوگی نہ اہل جنت کو کبھی تکان لاحق ہوگی ۲۳۷
— جنت کے دروازوں کی کیفیت ۳۴۴-۳۸۴
— شہید کے لیے جنت کی بشارت ۲۵۴
— اہل جنت کی باہم گفتگو ۲۸۷
— اہل جنت اور اہل دوزخ کی باہمی گفتگو ۲۸۸
— مومن جنت میں داخل ہوکر اللہ کا شکر ادا کریں گے ۲۳۶-۲۸۸-۳۸۵-۳۹۶
— وہاں صالح لوگوں کو ان کے صالح والدین، صالح اولاد اور صالح بیویوں کے ساتھ یکجا کر دیا جائے گا ۳۴۵-۳۹۵-۳۹۶-۵۴۹
— دنیا میں کیے ہوئے اعمال کی وجہ سے جنت ملے گی ۴۶-۴۷-۵۴۹-۶۰۹
— جنت کا ملنا صریح کامیابی ہے ۵۷۳-۵۹۵
— کوئی شخص اللہ کے فضل کے بغیر محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت نہیں پا سکتا ۵۰۰-۵۷۳
— مومنین صالحین کو جنت عطا کرنا اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۳۴۵-۳۶۶-۳۹۵

جنگ (دیکھو ”جہاد“ اور ”قانون اسلام“، ”قانون صلح و جنگ“)

جنگ احد - (دیکھو ”غزوۂ احد“)

جنگ احزاب - (دیکھو ”غزوۂ احزاب“)

جنگ بنی قریظہ - (دیکھو ”غزوۂ قریظہ“)

جہاد فی سبیل اللہ
— اس سے جی چرانے والے منافق ہیں ۷۶-۸۰ تا ۸۲
— عورتوں کا جہاد کیا ہے؟ ۹۰
— اندرونی دشمنوں کے استیصال کے لیے جہاد ۱۳۱
— اندرونی دشمنوں (منافقوں) کا جرم ۷۶-۷۷
— جنگ میں دشمن کو دھوکا دینا جائز ہے ۶۱-۶۲ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ”قانون اسلام، قانون صلح و جنگ“)

جہنم
— کیسے لوگوں کے لیے ہے ۴۴-۴۵-۴۷-۱۱۳-۱۳۶-۲۰۹-۲۳۷-۲۶۸-۲۸۳-۲۸۸-۲۸۹-۳۱۲-۳۳۱-۳۴۵-۳۴۹-

۳۶۲-۳۶۴-۳۶۵-۳۷۲-۳۸۱-۳۸۴-
۳۹۳-۴۱۱-۴۱۸-۴۲۶-۴۲۷-۴۴۹-۴۴۹-
۴۵۳-۴۶۲-۵۱۳-۵۵۰-۵۷۱-۵۹۳-
۵۹۴-۶۱۳-۶۲۰-۶۲۱

— کافروں کو جہنم کی سزا کیوں دی جائے گی ۳۹۷-۴۲۷-۵۵۰

— اس کے عذاب کی کیفیت ۲۰-۴۷-۱۳۳-۲۳۷-۲۸۹-۲۹۰-۳۴۵-۳۶۵-۳۶۸-۳۸۱-۴۲۷-۴۴۶-۴۶۸-۵۱۳-۵۴۸-۵۵۰-۵۷۱-۵۸۱تا۵۸۳-۶۱۳

— اس کا دوام ۴۵-۱۳۳-۱۳۴-۲۳۷-۴۲۷-۴۲۸-۴۵۳-۵۱۳-۵۵۰

— کفار اس میں ہمیشہ کے لیے داخل کیے جائیں گے ۳۸۴

— اللہ کا یہ قول کہ میں شیطان اور اس کے پیروؤں سے جہنم کو بھردوں گا ۴۴-۴۵-۳۴۹

— اس میں مشرکین کے ساتھ ان کے جھوٹے معبود بھی ڈالے جائیں گے ۲۸۳

— وہاں کفار سے طنزاً ان کے جعلی معبودوں کے متعلق سوال کیا جائے گا ۴۲۷

— وہاں کفار اپنے پیشواؤں کو کوسیں گے ۱۳۴

— وہاں پیشواؤں اور پیروؤں کا باہمی جھگڑا ۲۰۵-۲۸۴-۳۴۵-۳۴۶-۴۱۳-۴۱۴

— وہاں کفار یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ جن اہلِ ایمان کو وہ دنیا میں برا سمجھتے تھے وہ جہنم میں نہیں ہیں ۳۴۶

— اس میں کافروں کے داخلے کا منظر ۳۸۴

— وہ کفار پر مسلط کردی جائے گی ۳۷۷

— اس کے منتظم فرشتوں اور اہلِ جہنم کی گفتگو ۳۸۴-۴۱۴-۵۵۰

— وہاں عذاب میں کمی نہ ہوگی اور مجرمین اس میں مایوس پڑے رہیں گے ۵۵۰

— کفار جہنم کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی زندگی کے خاتمے کی دعا کریں گے ۵۵۰

— وہاں مجرموں کی کوئی دعا قبول نہ ہوگی ۴۱۴

— کافروں کو نہ جہنم سے نکالا جائے گا اور نہ معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا ۵۹۴

— وہاں مجرموں کے لیے کھانے کا کیا سامان ہوگا ۲۸۹-۳۴۵-۵۷۱

— ان کے پینے کے لیے کیا سامان ہوگا ۴۲۷

— کافروں کو بتایا جائے گا کہ تم بڑے عزت دار بنے پھرتے تھے، لو اب یہ ہی وہ چیز ہے جس کے آنے میں تم شک کرتے تھے ۵۷۱-۵۷۲

— جہنم اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی ۴۵۳

— جہنم انجام ہے کافروں کی دنیا میں نافرمانیوں اور ناحق تکبر کا ۴۵-۶۱۳

— دوزخیوں نے خود ہی اپنے آپ کو جہنم کے قابل ثابت کیا ۵۵۰

— یہ مسئلہ کہ آیا گنہگار مومن جہنم میں جائیں گے یا نہیں ۲۳۵-۲۳۶

— کافروں کے آگے جہنم ہے ۵۸۲

— دوزخی جب کبھی باہر نکلنا چاہیں گے دوبارہ اس میں دھکیل دیے جائیں گے ۴۷

— ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا ۱۳۴

ح

حبط اعمال-

— اس کے وجوہ ۷۹-۸۰

— شرک آدمی کے تمام اعمال ضائع کردیتا ہے ۳۸۲

حجاب

— آیتِ حجاب ۱۲۱
(تفصیل کے لیے دیکھو ''قانون اسلام'')

حدیث

— احادیث کو جانچنے میں روایت استعمال کرنے کا صحیح طریقہ ۷۲- ۷۳- ۱۴۳- ۱۴۴- ۳۳۴- ۳۳۵-۳۳۷-۳۳۸

— اللہ نے خود روایتِ حدیث کا حکم دیا ہے ۹۲ تا ۹۴

— اللہ سنتِ رسول کو حکمت سے تعبیر فرماتا ہے ۹۲-۹۴

— حدیث کس طرح قرآن کی تشریح کرتی ہے ۹-۱۰- ۴۶-۷۰-۷۱-۷۲-۹۰-۹۱-۹۵-۹۷-۱۰۷- ۱۰۸-۱۱۲-۱۲۵-۱۲۷-۱۲۸-۱۳۵-۱۳۶-۱۴۰ تا ۱۴۳-۱۵۴ تا ۱۶۲-۱۸۱ تا ۱۸۵-۲۰۳-۲۱۸- ۲۳۵-۲۳۶-۲۶۵-۲۸۶-۲۸۷-۳۲۳- ۳۲۴-۳۳۱-۳۳۲-۳۵۶-۳۵۷-۳۶۰- ۳۶۱-۳۷۴-۳۸۲-۳۸۳-۴۱۳-۴۲۰ تا ۴۲۲- ۴۵۰-۴۵۱-۴۵۴-۴۵۹-۴۶۶-۵۰۵-۵۰۶- ۵۰۸-۵۲۸-۵۵۳-۵۷۲-۵۷۳-۶۰۹

حکم

— معنی اور تشریح ۵۸۶

حکمت

— دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ کا شکر گزار ہو ۱۲-۱۴

— حکمت سے مراد سنت رسولؐ ۹۲-۹۴

حکمت تبلیغ

— ۲۰۰ تا ۲۰۲-۲۴۷-۲۴۸-۲۵۳-۲۵۴-۴۳۵- ۴۳۶-۴۵۶ تا ۴۶۰-۴۸۲-۴۸۳-۴۹۵- ۴۹۶-۵۱۵-۵۳۹-۵۵۳-۵۵۴-۵۷۷

حلال وحرام - (دیکھو ''قانون اسلام'')

حمد

— معنی وتشریح ۱۷۳

حنیف

— حنفا سے مراد عرب کے وہ لوگ ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں بھی توحید کے قائل تھے ۳۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''عرب'')

حور - (دیکھو ''جنت'')

خ

ختم نبوت - ۲۰۳

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھولنے کے لیے قادیانیوں کی غلط تاویلات ۷۴-۷۵

— آیتِ خاتم النّبیین کی مفصل تشریح ۱۰۳-۱۰۴- ۱۳۸ تا ۱۵۴

— مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ بغاوت کی بنا پر نہیں بلکہ نبوت کے جھوٹے دعوے کی بنا پر کی گئی تھی ۱۴۵

— ختم نبوت کا معاملہ کس قدر اہم ہے ۱۵۱-۱۵۲

— نئی نبوت کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے ۱۵۲-۱۵۳

— اب نئی نبوت امت کے لیے رحمت نہیں لعنت ہے ۱۵۳-۱۵۴

— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزولِ ثانی سے مہرِ ختمِ نبوت کے ٹوٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۱۶۴-۱۶۵

خسران

— کیسے لوگوں کے لیے ہے ۳۸۱-۳۸۲-۵۹۲-۶۱۲

— انسان کے خسارے میں پڑنے کی اصل وجہ ۴۵۱-۴۵۲

— انسان کے لیے اصل گھاٹے کا سودا کیا ہے؟ ۳۶۴-۳۶۵-۵۱۳

خشوع

— معنی وتشریح ۹۵-۹۶

خلافت

— امامت سے مراد خلافت ۱۳۶

__ اللہ نے زمین میں انسان کو خلافت عطا کی ۱۳۵-۲۳۸

__ انسانی خلافت کی حقیقت ۱۳۵ تا ۱۳۷-۴۸۳

__ حکومت کے فرائض ۳۲۶-۳۲۷

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو "امانت"، "اسلامی ریاست" اور "قانونِ اسلام"، "دستوری قانون")

خواب - انبیاؑ کا خواب بھی وحی کی ایک قسم ہے ۲۹۵

د

داود علیہ السلام

__ ان کا قصہ ۳۲۳ تا ۳۳۱

__ ان کو اللہ تعالیٰ نے کیا غیر معمولی طاقتیں عطا کی تھیں ۱۷۸-۳۲۳-۳۲۴

__ ان کے حالات ۱۷۸

__ دنبیوں کے مقدمے کا واقعہ اور اس کی تحقیق ۳۲۴ تا ۳۳۱

__ ان پر زنا کی جھوٹی تہمت ۳۲۷ تا ۳۲۹

__ کیا ان کی ننانوے بیویاں تھیں؟ ۳۳۰-۳۳۱

__ ان کی صفات عالیہ ۳۲۳

__ ان کے لیے تقرب کا مقام اور بہترین انجام ہے ۳۲۶

__ پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور پرندے بھی ۳۲۳-۳۲۴

__ ان کو مضبوط سلطنت، حکمت اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی گئی تھی ۳۲۴

__ ان کو حکمرانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایات ۳۲۷

__ لوہا ان کے لیے نرم کیا گیا تھا، اس سے آپ کیا کیا کام لیتے تھے ۱۷۸

دجال - ۱۵۴ تا ۱۶۹

درود

__ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا حکم اور اس کی تشریح ۱۲۳ تا ۱۲۸

__ درود کے متعلق لوگوں کے شبہات و اعتراضات اور ان کا جواب ۱۲۵ تا ۱۲۷

__ غیر انبیا کے لیے درود کے مسئلے میں فقہا کے اختلافات ۱۲۷-۱۲۸

دعا

__ غیر اللہ سے دعا اور استمداد شرک ہے ۲۳۹-۴۰۱-۴۱۹-۴۲۴

__ اللہ دعائیں قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے مزید دیتا ہے ۵۰۳

__ دعا صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے ۳۹۸-۴۱۸-۴۲۴

__ دعائیں قبول کرنے یا نہ قبول کرنے کے جملہ اختیارات اللہ ہی کے پاس ہیں ۴۱۸

__ دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے ۴۲۰-۴۲۱

__ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود دعائیں سننے والا نہیں ہے ۲۲۶-۲۲۷-۴۱۹

__ مشرکین کے معبودوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ کون ان سے دعا کر رہا ہے ۶۰۲-۶۰۳

__ اللہ کے سوا دوسروں سے دعائیں مانگنے والے جہنم میں جائیں گے ۴۱۸-۴۲۰

__ غیر اللہ کو پکارنا دنیا اور آخرت دونوں میں لاحاصل ہے ۴۱۱

__ دعائیں سننے اور ان پر کوئی کارروائی کرنے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ۴۱۹-۶۰۲

__ اللہ سے دعا مانگنے کے آداب ۴۲۱

__ عبادت اور دعا ہم معنی ہیں ۴۱۸-۴۲۰ تا ۴۲۲-۴۲۴

__ دعا کے مسئلے پر مفصل بحث ۴۱۸ تا ۴۲۲

__ قرآنی دعائیں ۵۲۸-۶۱۱

__ کیسے لوگوں کی دعا قبول کی جاتی ہے ۵۰۳

دعوتِ حق

__ اس کا صحیح طریقہ ۲۰۰ تا ۲۰۲-۲۱۷

(نیز دیکھو ''حکمتِ تبلیغ'' اور ''اقامتِ دین'')

دل

— قرآن کی زبان میں دل سے کیا مراد ہے ۴۱-۴۲

دنیا

— وہ کسی حکیم کی حکمت کے بغیر وجود میں نہیں آئی ہے ۲۳۱-۲۳۲
— دنیوی زندگی دراصل وہ وقت ہے جو امتحان کے لیے انسان کو دیا گیا ہے ۴۴-۴۵-۲۳۷-۲۳۸
— حیاتِ دنیا کی حقیقت ۲۶-۲۰۷-۳۴۳-۳۶۶-۳۶۷-۴۱۰-۵۰۶
— دنیا کی زندگی آخرت میں ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہ محسوس ہو گی ۶۲۱
— اس کے مصائب کی اخلاقی حیثیت ۵۰۵-۵۰۶
— دنیا کی موجودہ زندگی میں بھی اللہ کا قانونِ مکافات کام کر رہا ہے (دیکھو ''جزا و سزا'')
— صرف دنیا چاہنے والے، اور آخرت کے لیے کوشش کرنے والے کی سعی اور اس کے نتائج کا فرق ۳۸۱-۴۹۸-۴۹۹
— دنیا و آخرت کی کامیابی کن لوگوں کے لیے ہے ۳۶۳
— خدا کے نافرمان اپنے حصے کی نعمتیں دنیا ہی میں پا لیتے ہیں، آخرت کی نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ۶۱۳
— دنیوی زندگی میں آدمی کا امتحان کس طرح لیا جا رہا ہے ۳۷۸ (نیز دیکھو ''آزمائش'')
— انسان دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو سے کس کس طرح دھوکا کھاتا ہے ۲۶-۲۷-۳۸-۳۹-۲۲۰-۳۹۳-۳۹۴-۵۸۳-۵۹۴-۶۱۶
— دھوکا کھانے والوں کا انجام ۵۹۴
— دنیا کی کمائی کفار کے کسی کام نہ آئے گی ۵۸۳
— دنیا کے مال و متاع کی حقیقت ۵۰۶-۵۳۷-۵۳۸
— دنیوی نعمتیں اس بات کی علامت نہیں کہ نعمت پانے والا اللہ کا محبوب ہے ۲۰۶-۲۰۷-۳۷۸-۳۷۹-۴۶۷
— دنیا کی دولت انسانی فضل و شرف کا معیار نہیں ہے ۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸
— اس خیال کی غلطی کہ ایمان داری اور راست بازی اختیار کرنے سے آدمی کی دنیا برباد ہو جاتی ہے ۳۶۳
— دنیا کی زندگی میں جو کچھ دیا جا رہا ہے، انسان کو امتحان کے طور پر دیا جا رہا ہے ۲۰۷-۳۷۸
— دنیا کے مادی وسائل خدا کی پکڑ سے انسان کو نہیں بچا سکتے ۲۱۱
— دنیا میں چھوٹے چھوٹے عذاب انسان کی آنکھیں کھولنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں ۴۷-۴۸
— دنیا کے ذرائع کی تقسیم میں اللہ کی پوشیدہ حکمت ۵۳۶ تا ۵۳۸

دوزخ - (دیکھو ''جہنم'')

دہریت - (دیکھو ''توحید'' اور ''شرک'')

دین

— معنی و تشریح ۳۵۵-۳۵۶-۴۰۴ تا ۴۰۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۹۸-۴۹۹
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی حقیقت ۴۷۵-۴۷۶
— اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا حکم ۳۵۵-۳۶۴-۳۸۴-۳۹۷-۳۹۸-۴۲۴
— دینِ خالص اللہ کا حق ہے ۳۵۷

— مشرکینِ عرب تک مصیبت کے وقت دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی سے دعا مانگنے لگتے تھے ۲۵

— دین میں تفرقہ برپا کرنے کا مطلب اور اس کی ممانعت ۴۸۶-۴۹۲

اس میں تفرقہ رونما ہونے کی وجہ ۴۹۳-۴۹۴-۵۸۶-۵۸۷

— دینِ حق ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے ۴۷۶-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷

— دین میں بگاڑ رونما ہونے کی وجہ ۴۷-۴۹۲ تا ۴۹۵

— انسان کا اصل دین ایک ہی تھا اور دوسرے مذاہب اس میں بگاڑ پیدا ہونے کی وجہ سے وجود میں آئے ۴۷۶-۴۹۲ تا ۴۹۵-۵۸۶-۵۸۷

— کسی کو راضی کرنے کے لیے دین میں تغیر نہیں کیا جا سکتا ۴۷۶-۴۹۵

— اللہ کے دین کو چھوڑ کر غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کو ماننا بدترین شرک ہے ۴۷۶-۴۹۸

— یہ حرکت کرنے والوں کے لیے درد ناک عذاب ہے ۵۰۰

— دین کو قائم کرنے کا مطلب ۴۸۷-۴۸۸

— دین کو ”قائم کرنے“ اور ”قائم رکھنے“ ہی کے لیے تمام انبیاؑ آئے ۴۸۷

— دینِ حق صرف مان لینے کے لیے نہیں بلکہ زمین میں قائم اور نافذ ہونے کے لیے آیا ہے ۳۱۶-۳۱۷-۴۷۶-۴۸۶ تا ۴۹۲

— دین چند مذہبی امور اور عقائد و عبادات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ پورے نظامِ زندگی پر حاوی ہے ۴۸۸ تا ۴۹۲

— دین کو محدود رکھنے کے خطرناک نتائج ۴۸۹

— ”دین“ کے معاملے میں کس طرح غلط فہمی پیدا ہوئی ۴۹۰

— ”دین“ کو محدود کرنے کے خلاف سب سے بڑی دلیل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل ہے ۴۹۲

— دین کے معاملے میں بنی اسرائیل کو واضح ہدایات دی گئیں ۵۸۶

— امتِ محمدیہ کو بھی دین کے معاملے میں صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا گیا ۵۸۶

— دینِ حق کے مقابلے میں کفار کی حجت بازیاں اور جھگڑے باطل ہیں ۴۹۶

— دین کی بنیاد اگر قیاس و گمان کے بجائے علم پر رکھنی ہو تو پھر اس کا ذریعہ وحیِ الٰہی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ۴۱۸

— ”دین“ بمعنی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ اور اس کی حاکمیت کے آگے تسلیم و اطاعت ۳۵۵-۳۶۴-۴۲۴

— ”دین“ بمعنی قانون، ضابطہ، شریعت، طریقہ اور نظامِ فکر و عمل ۴۹۸

— ”دین“ بمعنی محاسبہ و جزائے اعمال ۲۸۲-۳۴۹

— دین ایک جامع اصطلاح بمعنی نظامِ زندگی جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرے ۴۰۴-۴۸۶

ذ

ذکر

— اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب ۹۶-۹۷-۱۰۳-۱۰۴

— ذکر بمعنی نصیحت ۳۶۷

— اللہ کا ذکر سن کر جس کا دل اور سخت ہو جائے اس کے لیے تباہی ہے ۳۶۷

ذوالکفل علیہ السلام-۳۴۳

ر

رب-
—معنی وتشریح ۳۵۹
رب العالمین - دیکھو''اللہ'' اور''الٰہ''

رزق
—''رزق''، یعنی جنت کی نعمتیں ۲۸۵
— ''رزق'' بمعنی بارش ۳۹۷-۳۹۸
— رزقِ کریم ۸۷
— طیباتِ رزق سے کیا مراد ہے ۴۲۳-۴۲۴
— رزق کی تقسیم کا خدائی انتظام ۴۹۷-۴۹۸-۵۰۴-۵۳۶-۵۳۷
— رزق کی تقسیم کا انتظام کن مصلحتوں کے تحت ہو رہا ہے ۲۰۶- ۲۰۷- ۲۰۸- ۳۷۹- ۵۰۴- ۵۳۶ تا ۵۳۸
— اللہ کے رزق سے مراد رزقِ حلال ہے ۴۵-۴۶-۵۱۱
— اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرنے کا مطلب ۴۵-۵۰۸-۵۱۰-۵۱۱
— اللہ کی شان رزاقی ۲۰۸-۴۴۲-۴۴۳
— رزق کی تنگی وکشادگی اللہ ہی کے اختیار میں ہے ۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۴۸۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو''تقدیر'')

رسالت، رسول- (دیکھو''نبوت'')

روح
— بمعنی وحی ۳۹۸-۵۱۶
— انسان میں روح پھونکے جانے کا مطلب ۴۱
— روح کو موت کے وقت اللہ ہی قبض کرتا ہے ۳۷۵
— روح کا نیند میں قبض کیا جانا ۳۷۵
— روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے ۴۳

روزہ
— روزہ تمام شریعتوں کا جز رہا ہے ۴۹۰-۴۹۱
— روزے کا حکم ۹۵-۹۶

ز

زکوٰۃ
— اس کے ادا کرنے کا حکم ۹۲
— اس کے ادا نہ کرنے کا نتیجہ ۴۴۱
— دین میں اس کی اہمیت ۷
— زکوٰۃ اگرچہ تمام شریعتوں کا جز رہی ہے لیکن اس کے احکام تمام شریعتوں میں الگ رہے ہیں ۴۸۹
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو''انفاق فی سبیل اللہ'' اور''قرآن، اس کا معاشی تصور'')
— زقوم ۲۸۹-۵۷۱

زمین - اس کو دو دن میں بنایا گیا ۴۴۲
— اس کی تخلیق و تدبیر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے اور توحید و آخرت کے دلائل ۱۱-۱۲-۱۹- ۲۲- ۲۳- ۳۷- ۳۸- ۵۰- ۱۷۳-۱۷۶- ۱۷۷- ۲۰۰- ۲۱۹- ۲۲۳- ۲۳۹-۲۴۰- ۲۵۶ تا ۲۵۹- ۲۷۳- ۳۳۱- ۳۵۹-۳۶۶- ۳۸۱- ۴۱۷- ۴۲۳- ۴۴۲ تا ۴۴۵-۴۶۱- ۴۸۵- ۵۰۴- ۵۱۵- ۵۲۵ تا ۵۲۷-۵۵۱- ۵۵۲- ۵۶۹- ۵۷۰- ۵۷۹ تا ۵۸۱-۵۸۳-۵۸۷-۵۸۸-۶۰۰
— اس میں انسانی زندگی کے لیے اللہ کے پیدا کردہ موافق حالات بھی توحید کی دلیل ہیں ۴۳۰
— بے جان زمین میں کس طرح جان دار نباتات پیدا ہوتے ہیں ۲۵۷
— زمین پر پانی کے دو ذخیروں کی الگ الگ خاصیتیں اور فوائد ہیں ۲۲۵-۲۲۶

— اس میں پہاڑوں کے جمائے جانے کی حکمت ۱۱-۴۴۲
— زمین کی برکتوں سے کیا مراد ہے؟ ۴۴۲
— اللہ نے زمین پہلے بنائی یا آسمان؟ ۴۴۵
— زمین کو انسان کے لیے گہوارہ بنایا گیا ۵۲۵

زندگی بعد موت

— ایک روز یقیناً مردوں کو زندہ کیا جائے گا ۲۴۸
— اس کے منکر جہنم میں جائیں گے ۲۸۸
— مرنے کے بعد روح زندہ رہتی ہے ۴۳-۲۵۴ تا ۲۵۶
— قیامت کے روز مردوں کے جی اٹھنے کی کیفیت ۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶
— قیامت کے روز انسان اسی طرح زندہ ہوکر زمین سے نکل کھڑے ہوں گے جیسے بارش سے روئیدگی نکلتی ہے ۲۲۳
— قیامت کے روز انسان اپنے موجودہ جسم کے ساتھ دوبارہ اٹھایا جائے گا ۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷
— اس کے امکان اور وقوع کے دلائل ۲۳-۴۱-۴۲-۴۳-۲۲۳-۲۷۲-۲۷۳-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۴۶۱-۵۲۷
— قیامت کے روز صور کی آواز پر سب اٹھ کھڑے ہوں گے ۳۸۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''آخرت''، ''برزخ''، ''حشر''، ''قیامت'')

زیدؓ بن حارثہ

— ان کے مفصل حالات ۹۹
— ان کے ساتھ حضرت زینبؓ کا نکاح اسلامی نظام معاشرت میں انسانی مساوات کا بہترین مظاہرہ تھا ۶۴-۶۵-۹۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ'')

زینبؓ ام المومنین

— ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ۹۴
— یہ نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا ۱۰۱
— اس حکم نکاح کی مصلحت اور وجہ ۱۰۱-۱۰۲
— ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح پر معترضین کے اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ۹۸-۱۰۴-۱۱۲-۱۱۳
— ان کو حضرت زیدؓ سے نکاح سخت ناگوار تھا اور صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے انھوں نے قبول کیا تھا ۹۸-۱۰۰
— حضرت زیدؓ نے کس وجہ سے ان کو طلاق دی ۱۰۰
(نیز دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')

س

سبا

— قوم سبا کا قصہ ۱۹۱ تا ۱۹۹

سجدہ

— کسی کو سجدہ کرنا اس کی عبادت کرنے کا ہم معنی ہے ۴۶۰
— غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت ۴۶۰
— سجدۂ تلاوت کی آیات ۴۵-۳۲۵-۴۶۱
— آیتِ سجدہ پڑھنے اور سننے والا صرف رکوع بھی کرسکتا ہے ۳۲۶

سحر- (دیکھو ''جادو'')

سریہ-
— سریہ اور غزوہ کا فرق ۵۴

سلام-
— معنی وتشریح ۱۲۳ تا ۱۲۸

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجنے کا مطلب ۱۲۳ تا ۱۲۸
— غیر انبیا کے لیے صلوٰۃ و سلام کے مسئلے میں فقہا کے اختلافات - ۱۲۸
— تمام رسولوں پر سلام - ۳۰۵-۳۱۴
— آخرت میں مومنین کا استقبال سلام سے ہو گا ۱۰۴-۱۰۵

سلیمان علیہ السلام

— ان کا قصہ ۱۷۹ تا ۱۸۹-۳۳۳ تا ۳۳۹
— ان کے بعد بنی اسرائیل کا بگاڑ ۳۰۲ تا ۳۰۵
— ان کے عمل سے تصاویر اور مجسّموں کے جواز پر استدلال غلط ہے ۱۸۰-۱۸۱ (تفصیل کے لیے دیکھو "تصویر")
— ان سے بنی اسرائیل کی عداوت ۱۸۰-۱۸۱
— ان پر بنی اسرائیل کی تہمتیں ۳۳۶
— ان کی والدہ پر بنی اسرائیل کی تہمت ۳۲۷-۳۲۹
— ان کے سامنے گھوڑوں کے پیش کیے جانے کا واقعہ اور اس کی حقیقت ۳۳۲ تا ۳۳۵
— ان کی آزمائش ۳۳۳-۳۳۵ تا ۳۳۸
— ان کی کرسی پر ایک جسد لا ڈالنے کا واقعہ اور اس کی حقیقت ۳۳۵ تا ۳۳۸
— وہ غیر معمولی قوتیں جو اللہ نے انھیں عطا فرمائی تھیں ۳۳۸-۳۳۹
— وہ جن جو ان کے لیے مسخر کیے گئے تھے ۱۷۹-۱۸۹ تا ۱۹۱-۳۳۹
— ان کے لیے ہوا بھی مسخر کی گئی تھی ۳۳۸
— ان پر اللہ تعالیٰ کی وہ خاص عنایات جن میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے ۳۳۹
— وہ اللہ کے بہترین بندے اور کثرت سے اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے ۳۳۲
— ان کے لیے تقرب کا مقام اور بہترین انجام ہے ۳۳۹
— ان کی دعا ۳۳۵
— انگشتری سلیمان محض ایک افسانہ ہے ۳۳۶

سماعِ موتیٰ

— اس کی حقیقت ۶۰۳
سنت - (دیکھو "حدیث")

ش

شاہد - (دیکھو "شہادت")

شب برات

— نصف شعبان کی رات کے متعلق یہ غلط فہمی کہ وہی قسمتوں کے فیصلے کرنے کی رات ہے ۵۶۰

شراب

— اس کے نقصانات ۲۸۷
— جنت کی شراب اور دنیا کی شراب کا فرق ۲۸۶-۲۸۷

شرع

— معنی و تشریح ۴۸۶
— وہ اللہ کی میزان ہے جو انصاف قائم کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے ۴۹۷
— تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے ۴۹۸-۴۹۹

شرک

— شرک اور توحید میں فرق ۳۷۰-۳۷۱
— اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرنی چاہیے ۳۵۵-۳۶۴-۴۲۴
— اس کے سوا کسی سے دعا مانگنا شرک ہے ۴۱۸-۴۲۰-۴۲۴
— اس کے سوا دوسروں کو مدد کے لیے پکارنا باطل اور شرک ہے ۲۴-۲۳۹-۴۰۱-۴۲۴-۴۲۷
— شرک کی بدترین اور مکمل ترین صورتیں ۴۱۹-۴۷۶
— شرک کی بنیاد یقین پر نہیں بلکہ شک پر ہے ۲۱۴-۵۶۱

— شرک کی نامعقولیت ۲۷۹
— مشرکین ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے ہیں ۲۳۹-۲۴۰
— انسان جس کی بھی بے چون و چرا عبادت کرے اس کو وہ دراصل اپنا معبود بناتا ہے ۵۸۹
— اللہ کے ہاں کسی کو ذریعۂ تقرب سمجھ کر اس کی بندگی کرنا بھی شرک ہے ۳۵۷-۶۱۷-۶۱۸
— کسی کو اللہ کی اولاد قرار دینا شرک ہے ۵۳۰
— اللہ کی طرف اولاد منسوب کرنے کے عقیدے کی تردید ۳۵۷-۳۵۸
— اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرنے والوں کی حماقت ۵۳۰
— مشرکینِ عرب کا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا ۳۱۱-۳۱۲-۵۲۱-۵۳۰ تا ۵۳۲
— غیراللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کو ماننا بدترین شرک ہے ۴۷۶-۴۹۸-۵۰۰
— اللہ کے سوا کسی کو ولی بنانا شرک ہے ۴۸۰ (نیز دیکھو ''ولی'')
— اللہ کے بجائے دوسروں کو اپنا ولی بنا کر آدمی اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے ۴۸۱-۴۸۳
— مشرکین اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں ان کی آخرت میں کوئی حیثیت نہ ہوگی ۴۰۱
— کسی نبی اور کسی کتابِ الٰہی نے شرک کی تعلیم نہیں دی ۵۲۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۴۰-۶۰۱-۶۰۲
— اللہ کے ساتھ شرک کرنے کی مختلف صورتیں ۵۳۰
— مشرکین اپنے شرک کی کیا توجیہیں کرتے ہیں ۳۵۷-۶۱۷-۶۱۸
— شفاعت کا مشرکانہ عقیدہ ۵۵۲ (نیز دیکھو ''شفاعت'')
— مشرک انسان دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتا ہے ۳۶۲
— جنھیں اللہ کا شریک ٹھیرایا جاتا ہے ان کی شرکت کا کوئی علمی ثبوت نہیں ہے ۴۱۱
— مشرکین کے اس فلسفے کا ابطال کہ اپنے معبودوں کو سجدہ کر کے وہ دراصل ان کے خالق کو سجدہ کرتے ہیں ۴۶۰-۴۶۱
— مشرکینِ عرب خود مانتے تھے کہ ان کا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ ہی ہے ۵۵۲
— وہ مانتے تھے کہ اللہ ہی کائنات کا خالق ہے ۲۲-۳۷۳-۳۷۴-۵۲۵
— وہ مانتے تھے کہ رزق دینے والا اللہ ہے ۲۰۰-۲۰۱
— وہ مانتے تھے کہ کائنات کا مالک و پروردگار اللہ ہی ہے ۵۶۱
— مشرکین کے معبودوں نے نہ زمین میں کچھ پیدا کیا ہے نہ آسمان و زمین کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے ۱۲-۲۳۹-۶۰۱
— مشرکین کے معبودوں کی اقسام ۲۸۳-۶۰۳
— مشرکین کی اصل گمراہی کیا ہے ۲۲
— شرک کی خلاف قرآن کے دلائل ۱۱-۱۲-۱۳-۱۵-۲۲-۲۳-۲۴-۳۲-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۴-۲۱۶-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۴ تا ۲۲۶-۲۲۷-۲۳۹-۲۴۰-۲۵۳-۲۵۴-۲۹۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۱۱-۳۱۲-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۲-۳۷۶-۳۸۲-۴۰۱-۴۱۱-۴۲۲ تا ۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۴۲-۴۶۰-۵۱۵-۵۴۴-۵۵۱-۵۵۲ تا ۵۵۴-۵۵۷-۵۶۰ تا ۵۶۲-۶۰۱-۶۰۲-۶۱۷-۶۱۸
(شرک کی تردید کے دلائل دہریت کی تردید کے دلائل بھی ہیں، اس لیے ان کا عنوان ہم نے الگ قائم نہیں کیا)

— شرک کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ۲۳۹
— اس کو اختیار کرنے میں آدمی کا اپنا نقصان ہے ۲۱۹
— انسان کو کسی کی خاطر بھی شرک نہ کرنا چاہیے ۱۶
— شرک محض جھوٹ ہے ۳۵۷-۳۵۸
— شرک ظلم عظیم ہے ۱۵
— شرک کرنے والے ''کاذب'' اور ''کافر'' ہیں ۳۵۸
— جو شخص اللہ کی قدر پہچانتا ہے وہ کبھی شرک نہیں کر سکتا ۳۸۲
— وہ اللہ کی ناشکری ہے ۲۷۰-۳۵۷-۳۵۸-۵۳۰
— شرک کا ہر عقیدہ دراصل اللہ پر کسی نقص کا الزام ہے ۲۵۸
— شرک کیسا جرمِ عظیم ہے ۴۷۸-۴۷۹
— مشرکین کے معبود ان کی مدد کرنے کے بجائے خود ان کی خدمت کے محتاج ہیں ۲۷۱
— مشرکین اللہ کی نسبت اپنے معبودوں سے زیادہ محبت رکھتے ہیں ۳۷۶-۳۷۷
— مشرکین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ناگوار گزرتی تھی ۴۹۳
— مشرکین سے ان کے جعلی معبودوں کی بابت استفسار کیا جائے گا ۴۲۷-۴۶۶-۴۶۷
— مشرکین کے معبود قیامت تک ان کی دعاؤں کا جواب نہیں دے سکتے بلکہ وہ بے خبر ہیں کہ کوئی ان کو پکار رہا ہے ۶۰۲-۶۰۳
— قیامت کے روز مشرکین کے معبود ان سے براءت کا اظہار کریں گے ۴۶۷-۶۰۳
— خدا کا عذاب دیکھ لینے کے بعد مشرکین اپنے معبودوں کا انکار کرتے ہیں ۴۷۱
— آخرت میں مشرکین اپنے معبودوں کا انکار کریں گے ۴۲۷-۴۶۶-۴۶۷
— وہاں مجرمین ان سفارشیوں کو کہیں نہ پائیں گے جن کے بھروسے پر وہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے ۴۶۷
— مشرکین کے اولیا آخرت میں ان کے کسی کام نہ آئیں گے ۵۸۳-۵۸۴
— وہاں مشرکین خود مان لیں گے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے ۴۶۶-۴۶۷
— شرک کی فطرت ہی یہ ہے کہ اس میں لوگ کبھی متفق نہیں ہو سکتے ۳۵۷-۳۵۸
— شرک کے ساتھ کوئی عمل صالح نہیں ہو سکتا ۳۸۲
— مشرک اپنے کسی عمل پر اجر کا مستحق نہیں ہو سکتا ۳۸۲
— انسانی زندگی پر شرک کے اثرات ۳۷۰-۳۷۱
— اس کا لازمی نتیجہ جہنم کی آگ ہے ۴۱۱
— اس کے نتائج آخرت میں ۲۰۹
— شرک کا انجامِ بد ۲۸۳ تا ۲۸۵-۳۰۵-۳۹۷
— مشرکین کا انجامِ بد ۱۳۶-۴۲۷-۴۴۱-۴۴۷ تا ۴۵۲-۴۶۸-۵۰۰-۵۳۴
— آخرت میں مشرکین کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے ۴۶۷
— مشرکین کے معبودوں سے متعلق آلِ فرعون کے مومن کا بیان ۴۱۱
— شرک کی اصل وجہ انکارِ آخرت ہے ۳۷۶-۴۴۱
— ان مشرکین کے لیے تباہی ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں ۴۴۱
— مشرکین آخرت میں اپنے انجام سے ڈر رہے ہوں گے لیکن وہ آ کر رہے گا ۵۰۰
— اللہ اس شرک سے بالاتر ہے جو مشرکین کرتے

ہیں ۳۸۲
__ شرک خدا کے مقابلے میں ایسی جسارت ہے کہ جس پر اگر آسمان پھٹ پڑیں تو بعید نہیں ۴۷۸
__ انسانی شرک کے جواب میں اللہ تعالیٰ سے فرشتے درگزر کرنے کی درخواست کرتے ہیں ۴۷۸-۴۷۹
__ شرک کا حکم اگر والدین دیں تو اسے نہ ماننا چاہیے ۱۶

شریعت

__ شریعتِ اسلام دنیا کے تمام انسانوں کے لیے بصیرت کی روشنی ہے لیکن جو اس کی صداقت پر ایمان لائے وہی اس سے ہدایت پا سکتا ہے اور اسی کے لیے وہ رحمت ہے ۵۸۷
__ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت کو دین کے معاملے میں صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا گیا ہے ۵۸۶-۵۸۷
__ کیا اللہ کی بھیجی ہوئی مختلف شریعتیں باہم متضاد ہیں؟ ۴۹۰-۴۹۱ (نیز دیکھو ''اصولِ فقہ'')

شفاعت

__ اس کا مشرکانہ عقیدہ اور اس کا ابطال ۲۵۴-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۵۵۲
__ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکتا ۳۸-۱۹۹-۲۰۰
__ شفاعت کے متعلق اسلامی عقیدے اور مشرکانہ عقیدے کا فرق ۲۰۰-۳۷۶
__ آخرت میں کون سفارش کر سکے گا اور کس کی کر سکے گا؟ ۵۵۲

شک

__ اس سے کس طرح گمراہی کا آغاز ہوتا ہے ۴۹-۱۹۴-۲۱۴-۴۹۷-۵۴۷

شکر

__ معنی و تشریح اور اس کے تقاضے ۱۴-۲۵-۴۱-۴۲-۱۸۹-۱۹۳-۱۹۴-۲۷۱-۵۰۶
__ اللہ کی نعمتوں سے متمتع ہونے کا لازمی تقاضا ۳۸۲-۴۲۲-۵۸۳
__ دین میں شکر کی اہمیت ۲۵-۱۹۳-۱۹۴-۵۰۶
__ ناشکری کیا ہے؟ ۲۱۹
__ شرک اللہ کی ناشکری ہے ۵۳۰
__ کفر اللہ کی ناشکری ہے ۳۶۱
__ اللہ کی نعمتیں کھا کر اللہ ہی کی بندگی سے منہ موڑنا ناشکری ہے ۲۵۶-۲۵۸
__ اللہ اس کو پسند کرتا ہے کہ انسان شکر کا رویہ اختیار کرے ۳۶۱
__ اللہ کا شکر ادا کرنا خود شکر کرنے والے ہی کے لیے مفید ہے ۱۲-۱۴-۳۶۱
__ ناشکری کی سزا انسان کو کیسے دی جاتی ہے؟ ۱۹۲-۱۹۳

شہادت

__ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس معنی میں شاہد ہیں ۱۰۵ تا ۱۰۹
__ دوسرے انبیاؑ کس معنی میں گواہ ہیں؟ ۱۰۷
__ آخرت میں لوگوں کے اعمال پر کس کس طرح شہادت قائم کی جائے گی؟ ۱۰۶-۱۰۷-۲۶۸-۲۶۹-۳۸۳-۳۸۴-۴۱۴-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۵۱۴-۵۹۲
__ حق کی شہادت کا مفہوم ۵۵۳
__ شہید کے لیے جنت کی بشارت ۲۵۴
__ شہید بمعنی گواہ ۱۰۵-۱۲۲-۴۷۱-۶۰۴
(قانونِ شہادت کے لیے دیکھو ''قانونِ اسلام'')

شوریٰ

— اسلامی نظامِ زندگی میں شوریٰ کی اہمیت، اس کا حکم اور اس کے تقاضے ۵۰۸ تا ۵۱۰

شیطان

— وہ مردود ہے ۳۴۹
— اس کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے ۳۴۸
— اس کی پہنچ عالمِ بالا تک نہیں ہے ۲۷۹-۲۸۰
— اس کو قیامت تک انسانوں کو بہکانے کے لیے مہلت دی جاتی ہے ۳۴۹
— اس کو انسان پر کوئی اقتدار عطا نہیں کیا گیا ہے ۳۴۰
— وہ انسان کا دشمن ہے ۲۲۰- ۲۶۶- ۲۶۷- ۳۴۸-۳۴۹-۵۴۸
— وہ انسان کو جہنم کا مستحق بنانا چاہتا ہے ۲۲۰-۲۲۱
— انسان کو گمراہ کرنے کے لیے اس کی چالیں ۱۹۴-۲۲۰
— اس کے فریب سے بچنے کے لیے اللہ ہی سے پناہ مانگنی چاہیے ۴۵۸- ۴۵۹
— وہ انسان کا بدترین ساتھی ہے ۵۳۸
— وہ آدمی کو قیامت پر ایمان لانے سے روکتا ہے ۵۴۸
— آخرت میں انسان اس کی پیروی کرنے پر پچھتائے گا ۵۳۸
— آخرت میں شیطان اور اس کے پیرو انسان یکساں مبتلائے عذاب ہوں گے ۳۴۹- ۵۳۸-۵۳۹
— اس کی پیروی کرنے والا دراصل خدا کے بجائے اس کی عبادت کرتا ہے ۲۶۶- ۲۶۷
— اللہ کے چیدہ بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا ۳۴۹
— کیسے لوگوں پر اس کا بس چلتا ہے ۵۳۸
— اس کی پیروی کرنے والے انسانوں کے لیے جہنم ہے ۳۴۹
— دعوتِ حق کو ناکام کرنے کے لیے اس کی چالیں ۴۵۹
— شیاطینِ جن ۲۰۹- ۲۱۰
— وہ شیاطین جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر کیے گئے تھے ۳۳۹
— وہ حضرت ایوبؑ کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے ۳۴۰
— یوم آخر تک شیطان لعنت زدہ ہے اور عذابِ الٰہی کا مستحق ۳۴۹
— جہنم کو شیطان اور اس کے پیروؤں سے بھر دیا جائے گا ۳۴۹- ۳۵۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ابلیس'' اور ''انسان'')

ص

صبر

— معنی و تشریح ۲۵- ۵۰- ۹۵- ۹۶- ۱۹۳- ۱۹۴-۳۶۳-۳۶۴- ۴۵۸- ۴۵۹- ۵۰۶- ۵۴۷- ۵۴۸-۶۲۱
— دین میں اس کی اہمیت ۱۷- ۲۵-۴۹- ۵۰- ۹۵-۹۶-۱۹۳-۱۹۴-۴۱۵-۴۲۸- ۴۵۸- ۵۰۶-۵۱۲-۶۲۱
— صبر کرنا اولوا العزمی کا کام ہے ۵۱۲
— اس کی برکات اور نتائج ۴۵۸- ۴۵۹
— راہِ خدا میں مصائب برداشت کرنے والوں کا اجر ۳۶۳-۳۶۴
— عدمِ تحمل اور بے جا اشتعال شیطان کی اکساہٹ کا نتیجہ ہوتا ہے ۴۵۸- ۴۵۹
— حضرت ایوبؑ کا صبر ۳۳۹ تا ۳۴۳

صحابۂ کرامؓ

— ان کا خلوص اور ان کی جان نثاریاں ۵۵- ۶۰- ۶۱- ۶۲- ۶۳- ۸۱ تا ۸۳

صحیفہ - کتاب اور صحیفہ کا فرق ۲۳۱

صدقہ

— اس کے معنی ۹۵-۹۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''زکوٰۃ'')

صراطِ مستقیم

— صراطِ مستقیم کیا ہے ۲۶۶-۲۶۷-۴۴۱-۵۴۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والے تھے ۵۱۷
— سیدھے راستے پر کون لوگ ہیں ۷-۸

صلوٰۃ

— بمعنی دعائے رحمت ۱۰۴-۱۰۵-۱۲۳-۱۲۴
— بمعنی رحمت و مہربانی ۱۰۴-۱۰۵-۱۲۳-۱۲۴
(صلوٰۃ بمعنی نماز کے لیے دیکھو ''نماز'' اور بمعنی درود کے لیے دیکھو ''درود'')

صور

— نفخِ صور کی کیفیت ۲۶۴-۲۶۵-۳۸۲-۳۸۳

ض

ضلالت

— اللہ جسے گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ راست نہیں دکھا سکتا ۵۱۲-۵۱۳-۵۸۹
— ضلالت اختیار کرنا انسان کی اپنی ذات کے لیے نقصان دہ ہے ۳۷۵
— جو اللہ سے ہدایت نہ پائے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۶۸-۳۷۳-۴۰۸
— کیسے لوگ گمراہ ہیں ۱۲-۹۸-۶۲۰
— اللہ کیسے لوگوں کو گمراہی میں ڈالتا ہے ۴۰۸-۴۰۹-۴۲۷-۵۱۲-۵۱۳-۵۳۸-۵۸۹
— اللہ کے کسی کو گمراہی میں پھینک دینے کا مطلب ۲۲۱-۲۲۲-۵۸۹
— کیسے لوگ ہدایت سے محروم رہتے ہیں ۴۱۰-۴۴۹
— ضلالت و ہدایت کے معاملے میں تقدیر کو بہانہ بنانے کی مذمت ۲۶۳-۵۳۲
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''تقدیر'')
— اسباب ضلالت ۸-۹-۱۰-۲۰-۲۱-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۴۲-۱۳۴-۱۷۶-۱۹۴-۱۹۵-۲۰۴ تا ۲۰۶-۲۴۹ تا ۲۵۲-۲۵۳-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۶ تا ۲۶۸-۲۹۰-۳۱۱-۳۲۷-۳۶۰-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۷-۴۰۴-۴۰۸ تا ۴۱۰-۴۲۳-۴۲۶ تا ۴۲۸-۴۳۱-۴۵۱-۴۵۲-۴۶۴-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۱-۴۷۶-۴۹۷-۵۰۴-۵۱۴-۵۱۵-۵۲۱-۵۳۲ تا ۵۳۸-۵۴۴-۵۴۵-۵۵۷-۵۶۱-۵۶۲-۵۷۶-۵۸۰-۵۸۲-۵۸۹-۵۹۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۶-۶۰۸-۶۱۷-۶۱۸
— خدا اور رسول کی نافرمانی صریح ضلالت ہے ۹۸
— دلیل کے بغیر محض دوسروں کی تقلید میں کوئی عقیدہ اختیار کرنا ضلالت ہے ۵۵۲-۵۵۳
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''علم'')
— برائی کو خوبی سمجھنا انتہائی گمراہی ہے ۲۲۱-۲۲۲-۴۱۰
— گمراہی کا سب سے بڑا سبب ۵۸۹
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تقدیر'' اور ''ہدایت'')

ط

طاغوت

— معنی و تشریح ۳۶۵
— طاغوت کی بندگی سے اجتناب اور صرف اللہ کی بندگی پر ہی انسان کی نجات منحصر ہے ۳۶۵

ظ

ظلم - ظالم - ظالمین

— معنی اور حقیقت ۱۵-۲۸۲-۲۸۳-۳۰۱-۴۰۰-۴۶۵-۴۶۶-۵۸۷-۵۸۸-۶۰۸-۶۰۹

— حق کو نہ ماننا ظلم ہے ۲۳۷

— کبرِ نفس کی بنا پر ایمان لانے سے انکار کرنا ظلم ہے ۶۰۶

— کسی دلیل کے بغیر کوئی عقیدہ اختیار کرنا اور اس کی تبلیغ کرنا ظلم ہے ۲۳۹-۲۴۰

— حقیقت کے خلاف عقیدہ رکھنا ظلم ہے ۱۲

— شرک کس بنا پر ظلم عظیم ہے ۱۵

— اللہ کی یاد سے غفلت اور شیطان کی پیروی ظلم ہے ۵۳۸-۵۳۹

— خدا کی ناشکری کرنا ظلم ہے ۱۹۳

— غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کا ماننا ظلم ہے ۴۹۸ تا ۵۰۰

— گمراہی پر ہٹ دھرمی ظلم ہے ۳۶۸

— اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانا ظلم ہے ۴۸۱-۴۸۲ (تشریح کے لیے دیکھو "ولی")

— ظالم کون لوگ ہیں ۲۸۳-۵۱۲-۵۸۷

— سب سے بڑا ظالم کون ہے اور اس کا انجام کیا ہے ۴۷-۳۷۲

— ظالم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے ۵۸۷

— اللہ کی آیات سے نصیحت قبول نہ کرنے والے ظالم ہیں ۴۷

— شرک کرنے والے ظالم ہیں ۲۰۹

— جان بوجھ کر حق سے منہ موڑنے والے ظالموں کا انجام ۵۱۲-۵۱۳

— لوگوں پر ظلم کرنے والوں کا انجام ۵۱۲-۵۱۳

— آخرت میں ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۲۳۷

— جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور سچائی کو جھٹلائے اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ۳۷۲

— حضرت عیسیٰ کی مخالفت کرنے والے، اور ان کی عقیدت میں غلو کرنے والے، دونوں گروہ ظالم ہیں ۵۴۸

— ظالم اللہ کی رحمت سے محروم ہیں ۴۸۱-۴۸۲

— ظالموں کا کوئی ولی و مددگار نہیں ہے ۴۸۲

— اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ۵۱۱

— اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا ۶۰۶

— قرآن ظالموں کے لیے تنبیہ ہے ۶۰۸-۶۰۹

— ظالموں کا انجامِ بد ۵۰۰-۵۳۹-۵۴۸

— جو شخص ظلم کا بدلہ لے وہ قابل ملامت نہیں بلکہ ظلم کرنے والا قابلِ ملامت ہے ۵۱۲

ظہار - (دیکھو "قانونِ اسلام")

ع

عائشہ ام المومنینؓ

— آپؓ پر بعض اہلِ تشیع کا بے جا طعن ۲۷

— جنگِ جمل میں شرکت پر ان کا افسوس ۹۰

عاد - ۳۲۲-۴۰۸-۴۴۷

— قدیم عرب کی قوموں میں وہ سب سے زیادہ طاقت ور قوم تھی ۹۱۳

— ان کا اصل وطن احقاف تھا اور یہیں سے وہ پھیلے ۶۱۵

— انھوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت سے جہالت برتی ۴۴۷-۶۱۵-۶۱۶

— ان کا قصہ ۶۱۳ تا ۶۱۷

— ان پر نزولِ عذاب کی وجہ ۳۲۲-۴۴۷-۴۴۸-۶۱۶

— ان کے عذاب کی کیفیت ۴۴۸-۴۴۹-۶۱۶

— ان پر اچانک عذاب آیا ۴۴۷

— وہ اسی عذاب کے پھیر میں آ گئے تھے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۶۱۷

عبادت

— معنی وتشریح ۳۵۵
— دعا اور عبادت ہم معنی ہیں ۴۱۸-۴۲۰-۴۲۴
— انسان جس کی بھی بے چون و چرا عبادت کرے اس کو وہ اپنا معبود بناتا ہے ۵۸۹
— کسی کو سجدہ کرنا اس کی عبادت کرنے کا ہم معنی ہے ۴۶۰
— اطاعتِ غیر اللہ کے لیے لفظِ عبادت کے استعمال کی مثالیں ۲۰۹-۲۱۱
— عبادت بمعنی ''غلامی و بندگی'' ۳۶۵
— عبادت بمعنی ''اطاعت'' ۲۶۶ تا ۲۶۸-۲۸۳
— عبادت بمعنی پرستش ۲۰۸- ۲۰۹- ۳۵۷- ۴۲۴-۶۰۳
— عبادت بمعنی ''غلامی واطاعت و پرستش'' ۲۶۷-۳۸۱-۳۸۲-۴۴۷-۴۶۰-۵۴۸-۶۱۵
— انسان کو ایک ہی الٰہ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے ۲۷۹-۳۸۲-۴۴۷
— عبادت صرف اللہ ہی کے لیے ہے ۳۵۵-۳۵۶
— اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنی چاہیے ۶۱۵
— غیر اللہ کی عبادت کیوں نہیں کرنی چاہیے؟ ۴۶۰
— اللہ کی عبادت کرنے کا مطلب ۳۵۶
— اللہ کی عبادت انسان کی فطرت کا تقاضا ہے ۲۷۹
— خالق کی بندگی کرنا سراسر عقل وفطرت کا تقاضا ہے ۲۵۳
— اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا جہالت ہے ۳۸۱
— صرف اللہ کی بندگی کرنا ہی سیدھا راستہ ہے ۲۶۷-۵۴۸
— اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کرنے والے جہنم میں داخل ہوں گے ۴۱۸

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''توحید''، ''دعا'' اور ''شرک'')

عدت - (دیکھو: ''قانونِ اسلام''، ''قانون نکاح و طلاق'')

عدل

— معنی اور تشریح ۴۹۵-۴۹۶

عذاب

— لوگوں کے مبتلائے عذاب ہونے کی اصل وجہ ۳۹۶-۳۹۸
— جب خدا کا عذاب آ جاتا ہے تو پھر مہلت نہیں ملتی ۵۱-۲۱۳-۳۱۹-۳۲۲
— عذاب سے پہلے حق جاننے کے لیے کافی مہلت دی جاتی ہے ۴۶۴
— خدا کا عذاب اچانک آتا ہے ۳۲۲-۳۸۰-۴۴۷
— دنیا میں عذاب کیسے لوگوں پر آتا ہے ۱۰-۳۲۲- ۴۰۸- ۴۳۱- ۴۴۷ تا ۴۴۹- ۵۴۱- ۵۴۵-۵۴۶
— آخرت کے عذابِ اکبر سے پہلے دنیا میں عذابِ ادنیٰ ۴۷
— دنیا میں قوموں پر عذاب آنے کی وجہ ۵۰- ۱۹۲- ۱۹۳-۲۱۱-۲۳۱-۲۴۱-۲۵۵-۲۵۶-۲۹۰-۲۹۱- ۳۰۶- ۳۱۹- ۳۲۲- ۳۶۹- ۳۷۸- ۳۸۰- ۳۹۳- ۴۰۱- ۴۰۲- ۴۰۸- ۴۱۲- ۴۱۳- ۴۲۸- ۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۴۷ تا ۴۴۹-۴۹۸ تا ۵۰۰- ۵۲۵-۵۳۳-۵۳۴-۵۶۵ تا ۵۶۸-۶۱۶-۶۱۷
— قوموں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب خدا کی نشانیاں ہیں ۳۰۶-۴۰۱
— قوموں پر آنے والے دنیوی عذاب ان کے گناہوں کی اصل سزا نہیں ہیں ۳۹۳
— کافروں کے لیے عذاب کے دو مرحلے ہیں ۴۱۳

— قوموں پر جب عذاب آیا تو ان کے جعلی معبود کچھ کام نہ آئے ۶۱۷
— وہ عذاب جو دنیا میں آزمائش کے طور پر ڈالا جاتا ہے ۵۶۲-۵۶۳
— خدا کا عذاب ایسے رخ سے آتا ہے جدھر آدمی کا وہم وگمان بھی نہیں جاسکتا ۳۶۹
— اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ۳۶۵-۳۶۶-۳۸۰-۴۰۸-۵۱۳-۶۲۰
— اللہ اسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے جو اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لیتی ہے ۴۰۸
— اللہ کے عذاب سے کیسے لوگ بچتے ہیں؟ ۴۴۹
— کسی کے مرتبے کی بلندی اس کو عذاب سے نہیں بچا سکتی ۸۷-۸۸
— خدا کا عذاب دیکھ کر ایمان لانا نافع نہیں ہوتا ۵۱-۴۳۱
— عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان کے نافع ہونے کی واحد مثال ۳۰۹
— آخرت کا عذاب کیسے لوگوں کے لیے ہے ۹-۱۰-۲۰-۲۱-۴۵-۴۷ تا ۴۹-۷۵-۱۲۳-۱۳۶-۱۷۵-۱۷۶-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۲۱-۲۲۴-۲۳۷-۲۴۶-۲۴۷-۲۸۵-۳۱۴-۳۲۷-۳۶۴-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۷-۳۸۴-۴۵۲-۴۵۳-۴۶۷-۴۶۸-۴۹۷-۴۹۸ تا ۵۰۰-۵۰۳-۵۰۴-۵۱۲-۵۱۳-۵۲۵-۵۳۹-۵۴۸-۵۵۰-۵۷۱-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۵-۶۲۱
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ”جہنم، کیسے لوگوں کے لیے ہے“)
— دہرا عذاب کیسے لوگوں کے لیے ہے ۸۷-۸۸
— آخرت کے عذاب کی کیفیت ۳۶۸-۳۶۹
— آخرت کے عذاب کی سختی ۳۷۷
— دردناک عذاب ۷۵-۵۰۰-۵۸۲-۵۸۳
— دردناک دن کا عذاب ۵۴۸
— ذلت والا عذاب ۱۲۳-۵۸۲-۶۱۳
— آگ کا عذاب ۴۷
— بڑا عذاب ۴۷-۵۸۳
— حق کے مخالفوں کے لیے وہ رسوا کن عذاب ہے جو ٹلنے والا نہیں ۳۷۴-۳۷۵-۵۸۲
— خدا کے عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ کتاب اللہ کی پیروی کی جائے ۳۸۰
— صرف ایمان ہی اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت ہے ۶۱۹
— دنیوی عذابوں کی کیفیت ۲۵۵-۴۰۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ”جزا و سزا“)

عذابِ قبر - (دیکھو ”برزخ“)

عرب
— جاہلیت میں ان کی حالت ۲۴۶
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب عقیدۂ توحید سے بالکل ناآشنا نہ تھے ۳۶-۳۷-۱۹۴
— عرب کا اصل دین ”دینِ ابراہیمی“ تھا بعد میں انھوں نے بت پرستی اختیار کی ۳۷-۵۳۴-۵۳۵
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب کے انبیا ۳۶-۲۴۶
— عربوں میں شرک و بت پرستی کا آغاز کب ہوا ۳۷-۳۷۱
— ان کے جاہلانہ خیالات اور عقائد ۲۱۰-۳۱۱-۵۲۱-۵۳۰-۵۳۲-۵۳۳
— مشرکینِ عرب خود جانتے تھے کہ رزق دینے والا اللہ ہے ۲۰۰-۲۰۱
— وہ مانتے تھے کہ کائنات کا خالق اللہ ہی ہے

۳۷۳-۳۷۴-۵۲۵
— وہ یہ بھی مانتے تھے کہ صرف ان کا ہی نہیں، ان کے معبودوں کا خالق بھی اللہ ہی ہے۵۵۲
— وہ اللہ ہی کو کائنات کا مالک و پروردگار تسلیم کرتے تھے۵۶۱
— وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۳۱۱-۳۱۲-۵۲۱-۵۳۰تا ۵۳۲
— عورتوں کے متعلق زمانۂ جاہلیت میں ان کا نقطۂ نظر ۵۳۰
— وہ کسی آسمانی کتاب کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۲۰۴
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے وہ خود ایک نبی مانگ رہے تھے۲۴۰-۲۴۱-۳۱۳
— عہدِ نبویؐ میں قبائلِ عرب کے علاقے ۵۷
— عرب میں صدیوں سے کوئی نبی نہیں آیا تھا ۳۵
(مزید تفصیل کے لیے ''قریش'')

عرش -۳۸۵-۳۹۸-۵۵۱
— اس پر اللہ کا جلوہ فرما ہونا ۳۸

علم
— قرآن میں علم سے مراد کون سا علم ہے۲۳۲
— علم رکھنے والے ہی خدا سے ڈرتے ہیں۲۳۲
— علم کے بغیر لوگوں کی رہنمائی کرنا بڑی غلطی ہے ۹-۱۰-۵۸۶-۵۸۷
— بے جانے بوجھے کسی کو معبود مان بیٹھنا غلط ہے ۱۶
— علم کے بغیر خدا کے بارے میں جھگڑا کرنا غلط ہے ۲۰-۲۱
— باپ دادا کی اندھی تقلید گمراہی کی موجب ہے ۲۰-۲۱-۵۳۲-۵۳۳
— اصل علم حقیقت کا علم ہے اور اس سے محرومی جہالت ہے۳۶۳
— علم کے بغیر کوئی عقیدہ اختیار کرنا صحیح نہیں ہے ۴۱۱-۵۷۷
— دلیل کے بغیر محض قیاس و گمان پر کوئی عقیدہ اختیار کرنا غلط ہے۵۹۰-۶۰۱-۶۰۲
— غیبی حقائق کا علم صرف وحی کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۴۱۷-۴۱۸
— رسولوں کے لائے ہوئے علم کے مقابلے میں اپنے دنیوی علوم میں مگن رہنا تباہی کا موجب ہے۴۳۱
— علمی دلیل کے بغیر محض دوسروں کی تقلید میں کوئی عقیدہ اختیار کرنا غلط ہے ۱۶-۱۷-۲۰-۲۱-۲۹۰-۴۱۱-۵۲۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۵-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۷
— انسان کو وہ علم حاصل نہیں ہے جس سے وہ خدا کی رہنمائی کے بغیر خود اپنے لیے صحیح راہِ حیات متعین کرلے۵۶۰

علم غیب
— (دیکھو ''اللہ، غیب کا علم اللہ ہی کو ہے'')

عمل صالح
— معنی وتشریح ۶۱۱
— ایمان کے ساتھ اس کا تعلق ۱۰
— اس کے نتائج ۱۰
— اس کی اہمیت ۴۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''ایمان'')

عورت
— جاہلیت میں عورتوں کے متعلق اہل عرب کا نقطۂ نظر ۵۳۰
— اسلامی نظامِ معاشرت میں اس کا صحیح مقام ۸۹ تا ۹۲-۱۲۱-۱۲۲-۱۳۱-۱۳۲

— عورتوں کی سماجی و سیاسی سرگرمیوں کے لیے حضرت عائشہؓ کی جنگ جمل میں شرکت کو جواز بنانا صحیح نہیں ہے ۹۰-۹۱
— عورت کا جہاد کیا ہے ۹۰
— نیکی میں اس کا اجر مردوں کے برابر ہے ۹۴-۹۶ تا ۹۸-۴۱۱
— عورت بھی مرد کی طرح سزا و جزا کی مستحق ہے ۱۳۶
— عورتوں کے لیے زیورات کے استعمال کا جواز ۵۳۱-۵۳۲
— عورت کو بلاضرورت غیرمردوں سے بات کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے ۸۹-۹۰

عہد و پیمان

— اللہ سے کیے ہوئے عہد کی بازپرس ضرور ہونی ہے ۷۳-۷۵-۷۸

عیسیٰ علیہ السلام

— ان کا قصہ ۵۴۶ تا ۵۴۸
— ان کی پیدایش ایک معجزہ تھی ۵۴۶
— وہ معجزے جو خدا نے ان کو عطا کیے تھے ۵۴۶-۵۴۷
— وہ صریح نشانیاں اور حکمت لے کر آئے ۵۴۸
— ان کے معاملے میں عیسائیوں اور یہودیوں میں اختلاف ۵۴۸
— ان کی مخالفت کرنے والے، اور ان کی عقیدت میں غلو کرنے والے، دونوں گروہ ظالم اور مستحقِ عذاب ہیں ۵۴۸
— ان کی آمدِ ثانی کا مسئلہ اور اس کے بارے میں قادیانیوں کی غلط تاویلات ۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۴ تا ۱۶۹
— حضرت عیسیٰ کے نزول کے بارے میں احادیث کا بیان ۱۵۴ تا ۱۶۲-۱۶۶
— ان کا نزولِ ثانی ایک نئے پیغمبر کی حیثیت سے نہ ہوگا بلکہ وہ ایک کارِ خاص کے لیے بھیجے جائیں گے ۱۶۳-۱۶۴
— ان کے نزولِ ثانی پر تمام ملتوں کے اختلاف ختم ہوکر سب ملتِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے ۱۵۵-۱۵۶-۱۶۰
— بنی اسرائیل نے ان کا انکار کیوں کیا؟ ۱۶۵
— وہ بنی اسرائیل کے لیے نمونہ بنائے گئے تھے ۵۴۶
— انھوں نے ان اختلافات کی حقیقت کھولی جو بنی اسرائیل میں برپا تھے ۵۴۸
— انھوں نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ اللہ سے ڈریں اور ان کی اطاعت کریں ۵۴۸
— ان کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے ۴۸۶-۵۴۷-۵۴۸
— ان سے پختہ عہد لیا گیا ۷۳ تا ۷۵
— وہ قیامت کی نشانی کس معنی میں تھے ۵۴۷

عیسائیت

— اس کی بنیادی گمراہی ۱۵۵-۵۴۸
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں آکر اس کی تردید کریں گے ۱۵۵
— عیسائیوں کے شرک سے مشرکین عرب کا استدلال ۵۴۶
— عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ کی تعلیم سے انحراف ۵۴۷-۵۴۸
— عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کی صاف صاف تعلیمات کے باوجود آپس میں اختلافات پیدا کیے، ان کے اس ظلم کی سزا دردناک دن کا عذاب ہے ۵۴۸
— حضرت عیسیٰ کے معجزات اور ان کی معجزانہ پیدایش کی بنا پر ان کو الوہیت کا درجہ دینا جہالت کا فعل ہے ۵۴۶-۵۴۷-۵۵۱
— اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو عیسائی کرتے ہیں ۵۵۱

غ

غزوۂ احزاب

— غزوہ اور سریہ کا فرق ۵۴
— اس غزوہ کے اسباب اور اس کی تاریخ ۵۴ تا ۶۲
— غزوۂ احزاب نے کھوٹے کھرے کو الگ الگ کر دیا ۶۰-۶۷-۸۱ تا ۸۳
— اس پر قرآن کا تبصرہ ۵۷ تا ۸۳
— اس تبصرے کا زمانۂ نزول ۵۷-۶۷
— غزوۂ احزاب کے موقع پر انصارِ مدینہ کی جان نثاری ۶۱
— اللہ کے وہ مخفی لشکر جنھوں نے اس جنگ میں مسلمانوں کی مدد کی ۶۲-۵۷-۶۷

غزوۂ احد-اس کے اثراتِ مابعد ۵۴
— ان مشکل حالات میں حضورؐ کا تدبر ۵۵

غزوۂ بنی قریظہ
— اس کی تاریخ ۵۴-۵۸-۶۰ تا ۶۳
— بنی قریظہ کے خلاف جنگ کے وجوہ ۵۸-۶۰-۶۲-۶۳-۵۷-۶۷
— بنی قریظہ اور قریش میں کس طرح پھوٹ ڈالی گئی ۶۱-۶۲
— اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ کو بنی قریظہ نے خود ہی حکم بنایا تھا ۶۲
— بنی قریظہ کا محاصرہ حکمِ خداوندی کے تحت ہوا تھا ۶۲
— غزوۂ بنی قریظہ پر قرآن کا تبصرہ ۸۴

غزوۂ بنی النضیر - دیکھو "بنی النضیر"

غلامی
— اسلامی نظام معاشرت میں غلامی کی حیثیت ۶۴-۶۵
— لونڈی سے بربنائے ملک تمتع کی اجازت ۱۱۳-۱۱۴
— تمتع کی اجازت کسی تعداد کی قید سے مقید نہیں ہے اور اس کے وجوہ ۱۱۸-۱۱۹
— اس کو کن حالات میں کن وجوہ سے جائز رکھا گیا ہے ۱۱۹
— غلاموں کی خرید و فروخت کن حالات اور کن وجوہ سے جائز رکھی گئی ہے ۱۱۹

غلمان - (دیکھو "جنت")

غنیمت -۶۹-۷۹-۸۴

غیبت
— اس کے معنی اور بہتان اور غیبت کا فرق ۱۲۸

ف

فاسق - (دیکھو "فسق")

فرشتہ
— مشرکین عرب کا فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا ۳۱۱-۳۱۲-۵۲۱-۵۳۰ تا ۵۳۲
— فرشتے خود اس شرک کی تردید کرتے ہیں ۳۱۲
— وہ آخرت میں اپنی عبادت کرنے والوں سے اظہار بیزاری کریں گے ۳۸۵
— فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینے والوں کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے ۳۱۱
— ملائکہ پرستی کی سند کسی آسمانی کتاب میں نہیں دی گئی ۵۳۳
— فرشتوں کو عورت اور اللہ کی بیٹیاں قرار دینے والوں کو آخرت میں اپنے اس فعل کی جواب دہی کرنی ہوگی ۵۳۲
— مشرکین ہر زمانے میں ان کو معبود بناتے رہے ہیں ۲۰۸-۲۰۹
— ان کی حقیقت اور ان کا کام ۴۳-۲۱۸-۲۷۸-۲۸۱-۳۱۱-۳۱۲
— عرش کے حامل فرشتے ۳۹۴
— عرش کے گرد و پیش رہنے والے فرشتے ۳۹۴

— وہ زمین والوں کی باغیانہ جسارتیں دیکھ کر اللہ سے درگزر کی درخواست کرتے ہیں ۴۷۸-۴۷۹
— فرشتوں کا قول کہ مومن نہیں بلکہ کافر ہی بھٹکائے جاسکتے ہیں ۳۱۲
— وہ اللہ کی حمد و تسبیح کرتے ہیں ۳۹۴-۴۶۱-۴۷۸
— وہ خود جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے اور وہ صف بستہ خدمت گار اور رب العالمین کی تسبیح کرنے والے ہیں ۳۱۲
— وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ۳۹۴
— وہ اللہ کے مقرب ہیں ۴۶۱
— وہ کارکنان قضا و قدر ہیں جو اللہ کے حکم کے تحت کام کرتے ہیں ۳۸-۳۹
— وہ اللہ کے بندے ہیں ۵۳۱
— وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی پر وحی آنے کا ذریعہ ہیں ۵۱۶
— وہ اہل ایمان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں ۱۰۵-۳۹۴ تا ۳۹۶
— وہ مومنین کو جنت کی بشارت دیتے ہیں ۴۵۴
— وہ دنیا و آخرت میں کس کس طرح اہل ایمان کی رفاقت کرتے ہیں ۴۵۴-۴۵۵
— ان سے اولین انسان کو سجدہ کرایا گیا ۳۴۸
— انسان کی تخلیق کے موقع پر اللہ تعالیٰ اور ابلیس میں مکالمہ فرشتوں کے توسط سے ہوا تھا ۳۴۷
— ''ملاءِ اعلیٰ'' سے مراد فرشتے ہیں ۳۴۷
— آخرت میں وہ عرش کے گرد حمد و تسبیح کریں گے ۳۸۵
— وہ فرشتے جو انسان کا نامۂ اعمال ثبت کر رہے ہیں ۵۵۱
— جہنم کا منتظم فرشتہ ۵۵۰
— رسول بمعنی فرشتہ ۵۵۱
— ''جن'' بمعنی فرشتہ ۳۱۲
— موت کا فرشتہ (دیکھو ''ملک الموت'')

فرعون

— میخوں والا فرعون ۳۲۲
— قصۂ فرعون و موسیٰ علیہ السلام ۴۰۲-۴۱۳-۵۴۰ تا ۵۴۶-۵۶۵ تا ۵۶۹
— وہ اللہ کو دیکھنے کے لیے ہامان کو ایک بلند عمارت بنانے کا حکم دیتا ہے ۴۰۹-۴۱۰
— اس کی سیاسی چالیں جن کی پیروی اب تک کی جارہی ہے ۴۰۴ تا ۴۰۶-۵۴۵
— فرعون کی چال بازیاں اس کے اپنے لیے تباہی کی باعث ہوئیں ۴۱۰
— اس نے بنی اسرائیل کے لڑکوں کے قتل کرنے کا حکم دیا لیکن اس کی چال اکارت گئی ۴۰۳-۴۰۴
— اس کا حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کرنا ۴۰۴
— اس کے وہ الزامات جو اس نے قتل کی سزا دینے کے لیے حضرت موسیٰ پر لگائے تھے ۴۰۴-۴۰۵
— اس کو حضرت موسیٰ سے یہ خطرہ تھا کہ وہ اس کی ''سیاسی خدائی'' ختم کر کے رکھ دیں گے ۴۰۴
— وہ فوق الفطرت خدائی کا نہیں بلکہ سیاسی خدائی کا دعویدار تھا ۵۴۴
— حضرت موسیٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ رب العالمین کے سوا کوئی بھی کسی نوعیت کی خدائی نہیں رکھتا ۵۶۵
— اس کو حضرت موسیٰ پر ہاتھ ڈالنے سے کیا چیز روک رہی تھی ۴۰۵
— اس کی اپنی قوم کا ایک مومن بھرے دربار میں حضرت موسیٰ کی حمایت کرتا ہے ۴۰۵ تا ۴۱۲
— اس کے لیے اس کے برے عمل خوش نما بنا دیے

گئے اور اسے راہِ راست سے روک دیا گیا ۴۱۰

— وہ اپنی دولت و ثروت اور عزت و جاہ کی بنا پر حضرت موسیٰ کو حقیر سمجھتا تھا ۵۴۱-۵۴۴

— اس نے اور اس کے اعیانِ سلطنت نے اللہ کی نشانیوں کا مذاق اڑایا ۵۴۰-۵۴۱

— اللہ نے اس کو اور اس کی قوم کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھائیں ۵۴۱

— اسے اور اس کی قوم کو ہوش میں لانے کے لیے سات عذاب پے در پے نازل کیے گئے مگر وہ سیدھی راہ پر نہ آئے ۵۴۱-۵۴۲

— کیا جادوگر بھی ایسے عذاب لا سکتے تھے؟ ۵۴۴

— فرعون کی ہٹ دھرمی اور بوکھلاہٹ ۳۴۳-۵۴۴-۵۴۵

— فرعون کی قوم فاسق تھی اس لیے اس نے فرعون کی اطاعت کی ۵۴۵-۵۴۶

— فرعون اور آلِ فرعون کا انجام ۴۱۲-۴۱۳-۵۴۵-۵۴۶

— اس کا انجام باعث عبرت تھا ۵۶۷

— اس پر کوئی آنکھ نہ روئی بلکہ سب نے اس طرح اطمینان کا سانس لیا کہ گویا ایک کانٹا تھا جو پہلو سے نکل گیا ۵۶۸-۵۶۹

— آل فرعون کی غرقابی کے بعد ان کا جانشین کسے بنایا گیا؟ ۵۶۷

— فرعون کی قوم کو کن لوگوں کا پیش رو قرار دیا گیا ہے؟ ۵۴۶

— فرعون کا حضرت موسیٰ کو ''اے ساحر'' کہنے سے متعلق تفسیری مباحث ۵۴۳-۵۴۴

— فرعون کا حضرت موسیٰ پر یہ اعتراض کہ یہ شخص تمھارا ''دین بدل ڈالنا'' چاہتا ہے، کس معنی میں تھا؟ ۴۰۵

— فرعون کو اعتراض تھا کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ سونے کے کنگن اور فرشتوں کے دستے کیوں نہیں اتارے گئے؟ ۵۴۴-۵۴۵

— وہ حد سے گزر جانے والوں میں بھی اونچے درجے کا مجرم تھا ۵۶۸

— اس کا اصل قصور ۵۴۵

فرقہ بندی

— اس کا آغاز کیسے ہوتا ہے ۴۹۳-۵۸۶-۵۸۷

— وہ ظلم ہے اور تفرقے برپا کرنے والوں کے لیے دردناک دن کا عذاب ہے ۵۴۸

— اللہ تعالیٰ تمام اختلافات کا فیصلہ قیامت کے روز کر دے گا ۵۸۶

— دین اسلام کو فرقہ بندی سے بچانے کے لیے تدابیر و ہدایات ۵۸۶-۵۸۷

— اگر ہم فرقہ بندوں کو خوش کرنے کے لیے دین اسلام میں رد و بدل کریں گے تو ہمیں خدا کے مواخذے سے کوئی نہ بچا سکے گا ۵۸۷

— فرقہ بندی کرنے والے ظالم ہیں ۵۸۷

فسق

— فاسقین کون ہیں؟ ۴۷-۴۴۵-۴۴۶

— فاسق قوم سے کیا مراد ہے؟ ۵۴۵-۵۴۶

— فاسقوں کا انجام بد ۴۷-۳۴۵-۶۱۳-۶۱۲-۶۲۱

— فاسق و فاجر اور متقی برابر نہیں ہو سکتے ۴۶-۴۷-۳۳۱-۳۳۲

فلاح

— اس کا مفہوم قرآن کی زبان میں ۸

— وہ کیسے لوگوں کے لیے ہے اور کن کے لیے نہیں

ہے ۷-۸ (نیز دیکھو ''اخلاق'')

فلک - معنی اور تشریح ۲۶۱

— آسمان اور فلک کا فرق ۲۶۱
(نیز دیکھو ''آسمان'')

ق

قادیانیت - (دیکھو ''ختمِ نبوت'' اور ''عیسیٰ علیہ السلام'')

— قادیانیوں کی نت نئی تاویلات پر ایک نظر ۱۶۹

قارون - ۴۰۲

قانونِ اسلام

— اصولِ قانون اور اصولی احکام

— شارع اور حاکم صرف اللہ ہے ۳۹۷-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۶-۴۸۷-۴۹۸-۴۹۹

— اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت کو صرف ایمان وعقائد اور چند مذہبی مسائل تک محدود نہیں کیا جا سکتا ۴۸۴-۴۸۸ تا ۴۹۰

— اللہ کے فیصلوں اور احکام کو ماننے یا نہ ماننے پر کفر و اسلام کا دارومدار ہے ۴۸۴

— اللہ ہی قانون دینے والا ہے اور یہ قرآن اس کا قانون ہے ۴۸۶-۴۸۷

— اللہ کی تشریعات کی نوعیت آئین کی ہے ۴۸۷

— حکم صرف اللہ کے لیے ہے ۲۲۶-۳۹۷

— اس کے حکم کے بغیر کسی اور کا حکم ماننا شرک ہے ۴۹۸-۴۹۹

— نبی کے احکام بحیثیتِ نبی اور بحیثیتِ انسان میں اصولی فرق ۶۱

— قانونی حقوق میں تمام اہل ایمان برابر ہیں ۸۳

— کوئی شخص کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا ۲۲۷-۲۲۸

— ہر شخص پر صرف اس کے ذاتی عمل کی ذمہ داری ہے ۳۶۱

— اسلامی قانون میں حیلوں کے جواز کی صحیح نوعیت ۳۴۰ تا ۳۴۲

— ناجائز حیلوں سے گناہ کو قانونی شکل دے کر آدمی قاضی کی گرفت سے بچ سکتا ہے مگر خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکتا ۳۴۲

— نادانستہ فعل پر گرفت نہیں ہے، گرفت اسی بات پر ہے جو آدمی جان بوجھ کر بالارادہ کرے ۰ ۷

— کسی حکم سے پہلے جو کام اس کے خلاف ہوا ہو اس پر گرفت نہیں ہے ۱۳۱-۱۳۲

— کسی مسلمان کو خدا اور رسول کے مقابلے میں آزادیِ رائے استعمال کرنے کا حق نہیں ہے ۹۷-۹۹

— شریعت میں وہ سنت معتبر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں مقرر فرمائی ہو اور جس پر صحابہؓ کا عمل ہو ۱۸۶

— اسلامی شریعت حلال وحرام کے درمیان واضح حد کھینچتی ہے، ان کے حدود کو مبہم نہیں چھوڑتی ۱۸۸-۱۸۹

— قانونِ اسلام میں کس طرح ہر ممکن احتیاط برتی گئی ہے ۶۱۱

— ''عدل'' اسلامی قانون کی بنیاد ۴۹۵

قانونِ صلح وجنگ اور بین الاقوامی قانون

— دوسروں کی زیادتی کا انتقام لینے کے بارے میں حدود وقواعد ۵۱۱-۵۱۲

— جنگ میں کس قسم کی چالیں جائز ہیں ۶۱-۶۲
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''جہاد فی سبیل اللہ'')

تمدن و معاشرت اور تہذیب و ثقافت کے متعلق احکام

— اسلامی قانونِ معاشرت کی روح اور مقاصد ۱۳۱
— مغنیہ عورتوں کا گانا سننا حرام ہے ۹-۱۰
— تصاویر اور مجسّموں کی حرمت ۱۸۰ تا ۱۸۹
— عورتوں کو گانے بجانے کی تعلیم دینا حرام ہے ۹
— عورتوں کے لیے زیور کے استعمال کا جواز ۵۳۱-۵۳۲
— مخلوط تعلیم اور مخلوط مجالس وغیرہ کا اسلام میں کوئی جواز نہیں ہے ۸۹-۹۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۳۱-۱۳۲
— متبنّیٰ کو حقیقی اولاد کی حیثیت حاصل نہیں ہے ۶۳-۶۴-۶۵
— کسی شخص کا نسب اس کے حقیقی باپ کے سوا کسی دوسرے شخص سے ملانا ممنوع ہے ۷۰
— پردے کے احکام ۶۵-۶۶-۶۷ تا ۹۲-۱۱۹ تا ۱۲۲-۱۲۹ تا ۱۳۲
— کن کن سے پردہ کرنے کا حکم نہیں ہے ۱۲۲-۱۲۳
— آیت حجاب، اس کا سبب نزول اور اس کی تشریح ۱۲۱-۱۲۲
— پردے کے احکام کی اصل غرض ۱۲۱-۱۲۲-۱۲۹-۱۳۱-۱۳۲
— چہرے کے پردے کا حکم ۱۲۹ تا ۱۳۲
— معاشرے میں میل جول کے احکام ۱۱۹ تا ۱۲۱
— زنا کی سزا دینے میں اسلام کس قدر احتیاط ملحوظ رکھتا ہے ۶۱۰-۶۱۱
— والدین کے حقوق ۱۵-۱۶-۶۰۹

قانونِ معیشت

— گانے بجانے والی لونڈیوں کی خرید و فروخت ممنوع ہے ۹
— زیور کی زکوٰۃ کا حکم ۵۳۱
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ”قرآن، اس کا معاشی نقطہ نظر“)

قانون میراث

— حمل کی قلیل ترین مدت ۱۶-۶۱۰-۶۱۱
— متبنّیٰ وارث نہیں ہوسکتا ۶۳-۶۴-۶۹
— میراث میں رشتہ دار ہی ایک دوسرے کے حق دار ہیں ۷۱-۷۳

دستوری قانون

— حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ۲۷۳-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۶-۴۸۷
— انسانی حکومت حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہوکر ہی حاکم حقیقی کی خلافت (نیابت) قرار پاسکتی ہے ۳۲۶-۳۲۷
— شارع و قانون ساز صرف اللہ ہے ۴۹۸-۴۹۹
— مسلمانوں کی عدلیہ اور مقننہ کو لازماً خدا اور رسول کے احکام کی پابندی کرنی ہوگی ۹۷ تا ۹۹
— اللہ کی قانونی حاکمیت ۳۵۵-۳۶۴-۵۸۶-۵۸۷
— شوریٰ کا حکم، اس کی اہمیت اور اس کے تقاضے ۵۰۸ تا ۵۱۰
— حکومت کے فرائض ۳۲۶-۳۲۷
— اختلافات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کو کرنا ہے ۴۸۳
— اولی الامر کی صفات:
(۱) فاجر و فاسق نہیں بلکہ نیکو کار اور متقی پرہیز گار ہوں ۳۳۱-۳۳۲
(۲) معاملہ فہم اور دانا ہوں ۳۲۴
(۳) ذی علم ہوں ۳۶۳

(۴) خواہشات نفس کی پیروی نہ کرتے ہوئے حق کے ساتھ حکومت کریں ۳۲۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست'')

قانونِ شہادت

— شہادت وہی معتبر ہے جو علم پر مبنی ہو ۵۵۲-۵۵۳

ضابطۂ عدالت

— حاکمِ عدالت اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتا ہے ۶۱۰

فوجداری قانون

— فوجداری قانون بھی دین کا حصہ ہے ۴۹۰
— حمل کی قلیل ترین مدت جس سے کم مدت میں اگر کوئی عورت نکاح کے بعد بچہ جنے تو وہ زانیہ شمار ہوگی ۱۶-۶۱۰-۶۱۱
— ارتداد کی سزا پر اجماع ۱۴۵
— مرتد اور باغی کے درمیان قانونی فرق ۱۴۵
— جھوٹی افواہیں پھیلا کر ملک کے نظام میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش مستلزم سزا ہے ۱۳۱-۱۳۳
— کن حالات میں جلاوطنی کی سزا دی جاسکتی ہے ۱۳۱-۱۳۳
— بوڑھے اور بیمار پر ضرب تازیانہ کی حد جاری کرنے کا طریقہ ۳۴۱
— کسی شخص پر جھوٹا الزام لگانا مستلزم سزا ہے ۱۲۳-۱۲۸-۱۲۹

قانون نکاح وطلاق

— رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت جس کے بعد دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی ۱۶-۶۰۹-۶۱۰
— نکاح کے اصطلاحی معنی ۱۰۹
— منہ بولے رشتے سے کوئی حرمت قائم نہیں ہوتی ۶۳-۶۴-۱۰۱-۱۰۲
— ظہار سے بیوی حرام نہیں ہوتی ۶۹-۷۰
— تخییر کا مفہوم اور اس کا قانون ۸۵ تا ۸۸
— خلوت سے پہلے طلاق دینے کی صورت میں عدت نہیں ہے ۱۱۰
— خلوت سے پہلے شوہر کے مرجانے کی صورت میں عدت ساقط نہیں ہوتی ۱۱۰
— ''طلاق قبل خلوت'' کی صورت میں مرد کو رجوع کا حق باقی نہیں رہتا ۱۱۱
— خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں مہر اور متعۂ طلاق کا حکم ۱۱۱
— طلاق کے بعد بھلے طریقے سے رخصت کرنے کا مطلب ۱۱۱
— طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کے ساتھ معلق کرنا خدائی تشریع کی حکمت کے بالکل خلاف ہے ۱۱۱-۱۱۲
— طلاق قبل نکاح کے مسئلے میں فقہا کے اختلافات ۱۱۱-۱۱۲
— شریعت طلاق کا کلی اختیار مرد کو دیتی ہے ۱۱۱
— عدت عورت پر شوہر کا حق ہے ۱۰۱-۱۰۲
— عدت، صرف شوہر ہی کا حق نہیں ہے بلکہ حقِ اللہ اور حق اولاد بھی اس میں شامل ہے ۱۱۰
— مرد کے مرنے یا طلاق کی صورت میں عدت ساقط نہیں ہوتی خواہ طرفین اس پر رضامند ہوں ۱۱۰-۱۱۱
— وہ مصالح جن کی بنا پر عدت لازم کی گئی ہے ۱۱۰-۱۱۱
— مسلمان مرد کی اہل کتاب بیوی کے معاملے میں طلاق، عدت اور مہر کے احکام ۱۱۰
— اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنا مسلمان کے لیے پسندیدہ نہیں ہے ۱۱۰
— منکوحہ بیویوں کے علاوہ لونڈی سے بر بنائے

ملک تمتع کی اجازت ۱۱۳-۱۱۴
— لونڈیوں سے تمتع کی اجازت کسی قید سے مقید نہیں ہے، اور اس کے وجوہ ۱۱۸-۱۱۹
— چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹیاں حلال ہیں ۱۱۴
— تعددِ ازواج کا جواز ''ناگزیر شخصی ضروریات'' کے ساتھ مقید نہیں ہے ۱۱۶-۱۱۹
— کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر نکاح کرلے ۱۱۴
— اسلامی شریعت اور عیسائی و یہودی شریعتوں کے احکام نکاح میں فرق ۱۱۴

قرآن

— اس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے ۳۴-۳۵-۲۴۵-۳۵۵-۳۶۷-۳۷۵-۳۹۱-۴۳۹-۴۴۱-۴۵۳-۴۶۳-۴۸۰-۴۹۷-۵۵۹-۵۷۹-۶۰۰
— وہ اس خاص ساعت میں نازل کیا گیا جب اللہ تعالیٰ قسمتوں کے فیصلے فرماتا ہے ۵۵۶-۵۵۹-۵۶۰
— اس کے ایک رات میں نازل کیے جانے کا مطلب ۵۵۹
— وہ کون سی رات تھی جس میں قرآن نازل ہوا ۵۵۹-۵۶۰
— اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ نے نازل کیا ہے ۲۳۳-۳۵۵-۳۷۵-۴۴۱-۴۸۰-۴۹۷-۵۳۹
— آپؐ کی ذات ہی میں اس کے کلام اللہ ہونے کی دلیل موجود تھی ۳۴-۳۵
— اسے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں نازل کیا ۳۶۹-۴۳۹-۴۸۰-۵۲۳-۶۰۸
— اس کو اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا تا کہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں ۵۷۳
— اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے ۳۶۹
— وہ ایک نعمت ہے صاف پڑھی جانے والی تا کہ انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے ۲۷۰
— اس شبہے کا جواب کہ عربی قرآن غیر عرب لوگوں کے لیے کیسے ہدایت بن سکتا ہے ۴۴۰
— قرآن کو عجمی قرآن کیوں نہ بنایا گیا، اعتراض اور جواب ۴۶۳-۴۶۴
— اس کے عربی زبان میں نازل کیے جانے کی حکمت ۳۶-۳۶۹-۴۳۹-۴۴۰-۵۲۳
— وہ ایک زبردست کتاب ہے ۴۳۷
— وہ اٹل کتاب ہے جس کی کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوسکتی ۴۶۲-۴۶۳
— اس کے کلامِ الٰہی ہونے کے دلائل ۳۴-۳۵-۳۶-۴۷ تا ۴۹-۵۰۲-۵۰۳-۵۲۳-۵۹۷-۵۹۸
— وہ آپ ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ۵۵۶-۵۵۹
— وہ اللہ کے نزدیک بڑی بلند مرتبہ کتاب ہے ۵۲۳-۵۲۴
— حکمت سے لبریز کتاب ۷-۳۶-۲۴۵-۵۲۳-۵۲۴
— حق اور راہِ راست کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ۶۱۹
— غفلت سے چونکانے والی کتاب ۳۱۹
— وہ ''ذکر'' ہے ۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۵۰
— بڑی برکت والی کتاب ۳۳۲
— نصیحت بھرا قرآن ۳۱۹
— قرآنِ مبین ۵۲۳-۵۵۹
— بہترین کلام ۳۳۶-۳۶۷
— کیسے لوگ اس سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں؟ ۷
— مومنینِ صالحین پر اس کا اثر ۳۶۷
— اس کا نزول اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے ۳۶-۲۴۵-۴۳۹-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۹-۵۶۰

— اس کا نزول نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے لیے بڑا شرف ہے ۵۴۰
— اس کی آمد اہلِ عرب کی قسمت کا فیصلہ کر دینے والی تھی ۵۰
— وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی دلیل ہے ۲۴۵
— وہ اس ہستی کا نازل کردہ ہے جس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی ۲۴۵
— اس کا یہ دعویٰ کہ وہ منزل من اللہ ہے، انسان کے لیے کیا چیلنج پیش کرتا ہے ۳۴
— وہ کس غرض کے لیے آیا ہے ۳۲-۳۵-۳۶-۲۴۵-۲۷۰-۳۳۲-۳۵۵-۴۸۱-۴۹۱-۵۵۹-۶۰۸-۶۰۹
— وہ ایک ہدایت نامہ ہے جو دین کی صاف شاہراہ دکھاتا ہے ۵۷۷-۵۸۶-۵۸۷
— وہ سراسر ہدایت ہے ۳۵-۳۶۸-۵۸۳
— وہ انسان کے لیے بصیرت کی روشنیاں لے کر آیا ہے ۵۸۷
— وہ تمام انسانوں کے لیے برحق کتاب ہے ۳۷۵
— وہ بنی نوع انسان کو انجامِ بد سے بچانا چاہتا ہے ۳۶۹
— تمام انسانوں کو اس کی پیروی کی دعوت ۳۷۹-۳۸۰
— وہ حق ہے جس کے مقابلے میں باطل کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی ۲۱۲-۴۳۷-۴۶۳
— وہ سراسر حق ہے اور حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے ۳۵-۱۷۵-۲۳۳-۳۵۵-۳۷۵-۴۷۰-۴۹۷-۵۳۵
— اللہ تعالیٰ لوگوں کو آفاق اور ان کے اپنے نفس میں ایسی نشانیاں دکھائے گا جن سے ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ قرآن حق ہے ۴۶۸-۴۶۹
— اس کی دعوت پر انسان کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے ۴۶۸-۴۶۹-۶۰۶-۶۰۷
— وہ دلائل جن کی بنا پر آدمی کو اس پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا چاہیے ۳۲-۳۵۵-۳۸۹-۴۳۹-۵۵۹-۵۶۰-۵۷۹
— اس کے ذریعے سے انسان کو ہدایت مل سکتی ہے ۲۳۳-۳۶۸
— وہ خدا کے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۱۷۵
— اس کی وارث ہونے والی امت کا شرف اور اس کا انجام ۲۳۳ تا ۲۳۷
— اس کے مضامین میں مکمل یکسانی ہے ۳۶۷-۳۶۸
— اس میں مضامین کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے ۳۶۷
— وہ کسی اینچ پیچ کے بغیر صاف صاف حقائق بیان کرتا ہے ۳۶۹-۴۳۹-۴۴۰-۵۳۲
— وہ جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے ان میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے ۳۲
— اس میں ہر طرح کی مثالیں دے کر لوگوں کو حقیقت سمجھائی گئی ہے ۳۶۹-۳۷۹
— خدا کے عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت یہ ہے کہ قرآن کی پیروی کی جائے ۳۸۰
— وہ ماننے والوں کو بشارت دیتا ہے اور منکرین کو انجامِ بد سے ڈراتا ہے ۴۳۹-۴۴۰
— وہ ظالموں کے لیے تنبیہ اور نیکوکاروں کے لیے بشارت ہے ۶۰۸-۶۰۹
— وہ تاریخِ بنی اسرائیل کے ان اہم واقعات کو بیان کرتا ہے جنھیں خود بنی اسرائیل فراموش کر گئے تھے ۴۰۴ (نیز دیکھو ''بائبل'' اور ''تلمود'')

— قرآن اور دیگر آسمانی کتب کے بیان میں صریح اختلاف جو مخالفین کے ان اعتراضات کا خاتمہ کرتا ہے کہ قرآن کو پچھلی کتابوں سے نقل کر لیا گیا ہے ۱۸۰-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۷ تا ۳۰۱-۳۲۷ تا ۳۳۱-۳۳۳ تا ۳۳۸-۵۴۲-۵۴۳

— قرآن وہی نعمت لے کر آیا ہے جو پہلے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی ۴۶۴-۵۷۷

— وہ وہی تعلیم لے کر آیا ہے جو پہلے انبیاؑ لائے تھے ۶۰۶-۶۰۷

— وہ وہی تعلیم لایا ہے جو تورات لائی تھی ۶۰۸

— وہ وہی تعلیم لے کر آیا ہے جو تمام کتبِ آسمانی لائی تھیں ۳۳-۵۲۳-۵۲۴

— وہ تمام کتبِ آسمانی کی تصدیق کرتا ہے ۲۳۳-۶۱۹

— وہ ان اختلافات کا فیصلہ کر دیتا ہے جو اہلِ کتاب نے تورات اور انجیل میں پیدا کر دیے تھے ۴۹۴-۴۹۵

— کفارِ مکہ اسے سن کر کس طرح متاثر ہوتے تھے ۴۳۴-۴۳۵

— وہ ان منکرین حق کو مطمئن نہیں کر سکتا جو ہٹ دھرم ہیں ۹۹-۱۱۳-۲۲۹-۲۳۲

— منکرین کا اس سے انکار تکبر و ضد کی وجہ سے ہے نہ کہ دلیل کی بنا پر ۳۱۹

— کفار مکہ اسے جادو کیوں کہتے تھے ۲۱۰-۵۳۵-۶۰۳-۶۰۴

— اس پر کفار مکہ کا اعتراض کہ یہ چونکہ ایک عرب پر عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے کلام اللہ نہیں ہے ۴۳۶-۴۶۴-۵۲۳

— اس اعتراض کا جواب ۴۳۸-۴۶۳-۴۶۴-۵۲۳

— اس کے خلاف سردارانِ قریش کا یہ استدلال کہ اگر قرآن حق ہوتا تو قوم کے بڑے لوگ اس پر ایمان لاتے ۶۰۸-۶۱۲

— کفارِ مکہ کا یہ الزام کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصنیف کر لیا ہے اور اس کا جواب ۳۴-۳۵-۵۰۲-۵۰۳-۵۶۲-۶۰۳-۶۰۴

— قرآن پر قریش کے اس اعتراض کا جواب کہ خدا کی کتاب انسان پر کس طرح نازل ہو گئی ۴۹

— اس کا انکار کرنے والے کافر ہیں ۲۳۷-۲۳۸-۳۸۱

— اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دینے والے کافر ہیں ۵۰۲-۵۰۳

— اس پر ایمان نہ لانے والے کافر ہیں ۲۰۴

— باطل پرستوں کی کوئی چال اس کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتی ۴۶۲-۴۶۳

— اس کو زک دینے کے لیے کفار مکہ کی تدبیریں ۸-۹-۱۰-۳۸۸-۴۳۶-۴۵۳-۴۵۶-۴۵۷-۴۶۲-۴۶۴-۴۹۶-۵۵۰-۵۵۱

— اس کے مقابلے میں کفار مکہ کی ہٹ دھرمی ۴۳۶-۴۳۷-۴۴۰-۴۴۱
(نیز دیکھو ''قریش'')

— اس کی تلاوت اہلِ ایمان کی لازمی صفات میں سے ہے ۲۳۲

— اس کو پڑھنے اور اس کی پیروی کرنے کے ثمرات و نتائج ۳۳۲-۳۳۳

— اس کی پیروی کا صحیح طریقہ ۳۸۰

— اس کی پیروی کرنے والے خدا کی تائید و رحمت سے نوازے جائیں گے ۵۷۷

— جن منافقین کو اس کی پیروی نہ کرنی ہو ان کے

لیے سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ اس کو ماننے سے انکار کردیں ۱۲۱
— بدنصیب ہے وہ جس کا دل اسے پڑھ کر اور سخت ہوجائے ۳۶۷-۳۶۸
— اس سے کیسے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ۲۴۷-۲۷۰-۴۳۹-۴۴۰
— اللہ سے ڈرنے والے اس سے کیا اثر لیتے ہیں؟ ۳۶۷-۳۶۸
— وہ کن لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے؟ ۷-۵۸۷-۵۸۸
— وہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے ۴۶۴
— وہ ایمان نہ لانے والوں کے لیے کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے ۴۶۴
— اس کے خلاف کوشش کرنے والوں کا انجامِ بد ۴۵۳
— اس کو جھٹلانے والوں کا انجامِ بد ۴۲۶-۴۲۷-۴۸۲-۴۸۳
— اس کو رد کرنے والے تباہی سے دوچار ہوں گے ۵۷۷
— اس کا مقابلہ استکبار اور استہزا سے کرنے والوں کا انجامِ بد ۵۸۱ تا ۵۸۳
— اس کے بہترین پہلو کی پیروی کی جانی چاہیے ۳۶۵-۳۸۰
— وہ بنیادی طور پر علم طبیعیات یا علمِ ہیئت کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں آثارِ کائنات کا ذکر محض توحید کے دلائل کے طور پر کیا گیا ہے ۴۴۵
— اس نے انسانی زندگی میں کیا عظیم الشان انقلاب برپا کیا ۴۶۹-۴۷۰
— وہ قولِ صالح اور عملِ صالح کو لازم وملزوم کے طور پر پیش کرتا ہے ۲۲۴
— وہ اپنے پیروؤں کو مغلوبانہ زندگی نہیں بلکہ اسلام کی حکومت قائم کرنے کا حکم دیتا ہے ۴۹۱
— وہ ''دین'' کا غلبہ چاہتا ہے اور یہ مضمون مکی اور مدنی دونوں سورتوں میں ہے ۴۹۱
— وہ ''ام الکتاب'' میں ثبت ہے ۵۲۳
— اس کے ساتھ رسول بھیجنا نہ صرف حکمت بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا بھی ہے ۵۵۹
— اس کی تفسیر کے صحیح اصول ۳۳۳ تا ۳۳۸-۵۴۷-۵۶۴-۵۶۵-۵۸۵-۶۰۷
— تفسیر القرآن بالقرآن ۱۶-۳۸-۳۹-۴۷-۸۲-۹۴-۱۰۵-۱۰۷-۱۹۰-۱۹۱-۲۰۳-۲۰۹-۲۱۲-۲۳۰-۲۴۹ تا ۲۵۱-۲۵۲-۲۶۸-۲۶۹-۲۸۶-۲۹۹-۳۳۱-۳۳۲-۳۴۵-۴۰۱-۴۵۱-۴۸۴-۴۸۹ تا ۴۹۲-۵۲۴-۵۴۰-۵۴۴-۵۵۹-۵۶۰
(حدیث کس طرح قرآن کی تفسیر کرتی ہے، اس کے لیے دیکھو ''حدیث'')
— اس کے الفاظ سے زائد مطلب لینا کس صورت میں صحیح ہے ۳۳۴
— اس کی تفسیر کے غلط طریقے ۷۵-۲۱۳-۳۷۹-۴۴۳-۴۴۴-۴۸۸ تا ۴۹۲-۵۰۱-۵۰۲-۵۱۶-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵
— اس کا طرزِ استدلال ۷-۱۱-۱۲-۱۳
— توحید کے بارے میں اس کا طرزِ استدلال ۲۴۴
(نیز دیکھو ''توحید، اس کے دلائل'')
— آخرت پر اس کا طرزِ استدلال ۲۴۴
(نیز دیکھو ''آخرت، اس کے دلائل'')
— رسالت محمدیؐ پر اس کا استدلال ۲۴۴
(نیز دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کی نبوت کے دلائل'')
— اس کا مخصوص طرزِ بیان ۲۸-۲۹-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۵۰-۵۱-۸۷-۸۸-۱۳۵-۱۳۶-۱۷۲-۲۰۰-۲۰۱-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۳-

۳۷۰-۳۹۱-۳۹۳-۴۴۵-۴۸۳-۴۸۴-
۵۴۶-۵۵۰-۵۶۵
— مکی سورتوں کا زمانۂ نزول متعین کرنے کا طریقہ
۶-۳۲-۱۷۲-۲۱۶-۲۷۶-۵۵۶
— کسی واقعے کو شانِ نزول قرار دینے کا مطلب ۶۰۷
— نظامِ کائنات اور تخلیقِ کائنات کے متعلق اس کا
بیان ۱۱-۱۲-۱۹-۲۲-۲۳-۳۷-۳۸-۳۹-
۱۳۵ تا ۱۳۷-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۷-۲۱۸-
۲۲۵-۲۲۶-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۹-۲۴۰-
۲۴۱-۲۵۶ تا ۲۶۲-۲۷۸-۲۸۰-۳۳۱-
۳۵۹-۳۶۰-۳۸۱-۴۲۲ تا ۴۲۶-۴۴۲-
۴۴۶-۵۰۴-۵۰۵-۵۸۷-۵۸۸-۶۰۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "کائنات")
— اس کا تصورِ زمان و مکان ۳۸-۳۹
— تخلیقِ انسان سے متعلق اس کا بیان (دیکھو "انسان")
— اس کا فلسفۂ تاریخ ۳۸-۳۹-۵۰-۵۱-۱۷۲-
۱۹۱-۱۹۳-۱۹۴-۲۳۸-۲۴۱-۲۵۵-۲۷۶-
۲۷۸-۳۹۳-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۶-۴۰۸-
۴۳۰-۴۳۱-۴۴۷ تا ۴۴۹-۵۲۴ تا ۵۲۶-
۵۴۰-۵۴۶-۵۶۵ تا ۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰
— اس کا فلسفۂ اخلاق ۱۳۶-۱۳۷-۲۰۶-۲۰۷-
۲۰۸-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۸-۲۲۹-۴۵۶ تا ۴۶۰-
۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۵-
۵۴۶-۵۵۲-۵۶۹-۵۷۰-۵۸۷ تا ۵۹۰
— اس کی اخلاقی تعلیمات ۷-۸-۱۸-۴۵-
۴۶-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۸-۱۱۹-۱۲۰-
۱۳۵-۲۲۳-۳۰۱-۳۲۳-۳۳۶-۳۳۹-
۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۵۰-۳۷۳-۳۷۴-
۳۸۱-۳۸۹-۴۵۶ تا ۴۶۰-۴۹۵-۴۹۶-
۵۰۷ تا ۵۱۲-۵۲۸-۵۲۹-۵۴۵-۵۴۶-
۵۴۹-۵۸۴ تا ۵۸۶-۶۰۹-۶۱۱-۶۱۲
— اس کا علم النفس ۱۸-۲۵ تا ۲۸-۸۹-۱۷۷-
۱۷۸-۲۲۱-۲۲۲-۳۶۲-۳۷۷-۴۵۶ تا
۴۶۰-۴۶۴-۴۶۷-۴۶۸-۵۴۵-
۵۴۶-۵۶۱-۵۶۲-۵۸۹-۵۹۰-۶۱۷
— اس کی پیشین گوئیاں ۵۰-۵۱-۲۷۶-۲۷۷-
۳۱۳-۳۱۴-۳۱۸-۳۲۲-۴۶۸ تا ۴۷۰
— وہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے کن ذرائع کی نشان
دہی کرتا ہے ۲۵-۳۲-۱۹۱-۲۵۶ تا ۲۶۲-
۲۶۹-۲۷۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۶۶-۳۶۷-
۳۷۵-۳۹۷-۳۹۸-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۹-
۴۳۰-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۸ تا ۴۷۰-۵۰۴-
۵۰۵-۵۰۶-۵۲۵ تا ۵۲۸-۵۳۲-۵۷۶-
۵۷۹ تا ۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۶
— اس کا فلسفۂ معیشت ۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۳۷۹-
۵۳۶-۵۳۸
— خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ
۲۳۲-۲۳۳
— شخصی ملکیت کا اثبات ۲۷۰
— "سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ" کی صحیح تفسیر ۴۴۲ تا ۴۴۶
— زرپرستی اور حرصِ مال کی مذمت ۲۰۶
— انفاق فی سبیل اللہ یا زکوٰۃ و صدقہ کی اہمیت ۷-
۹۲-۲۳۳-۵۰۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو "انفاق فی سبیل اللہ"،
"زکوٰۃ" اور قانونِ اسلام، قانون معیشت")
— اس کے خلاف مغربی مستشرقین کا تعصب ۱۴-۴۰۴
— اس میں قسمیں کس غرض کے لیے کھائی گئی ہیں
۲۴۵-۲۷۸-۳۱۹-۵۲۳-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۹
— اس میں قصے کس غرض کے لیے بیان کیے گئے
ہیں ۱۵-۱۷۲-۲۴۹-۲۷۷-۲۹۳-۳۱۸-
۳۳۵-۳۸۸

— قصۂ آدم و ابلیس بیان کرنے کا مقصد ۳۱۸-۳۵۰
— قصۂ ہود علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۶۱۳ - ۶۱۷
— قصۂ لقمان بیان کرنے کا مقصد ۶ - ۱۳- ۱۴- ۱۷
— قصۂ ابراہیمؑ بیان کرنے کا مقصد ۲۷۷-۲۹۴-۳۰۱-۵۳۵
— قصۂ اصحابِ یاسین بیان کرنے کا مقصد ۲۴۹
— قصۂ فرعون و موسیٰ علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۳۸۸ - ۳۸۹ - ۴۰۵-۴۰۶- ۴۱۶- ۴۱۷-۵۲۱-۵۲۲-۵۴۰-۵۴۱-۵۵۷
— قصۂ داود علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۱۷۲- ۳۲۳-۳۳۰-۳۳۹
— قصۂ سلیمان علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۱۹۱-۳۳۶-۳۳۹
— قومِ سبا کا قصہ بیان کرنے کا مقصد ۱۷۲-۱۹۱
— قصۂ ایوب علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۳۴۲
— قصۂ عیسیٰ علیہ السلام بیان کرنے کا مقصد ۵۴۶
— قرآن کی نگاہ میں کامیابی اور ناکامی کا معیار ۲۸۹-۳۶۴-۳۹۶-۵۹۲-۵۹۳
(نیز دیکھو ''خسران'' اور ''فلاح'')

قرآنی تمثیلات - (دیکھو ''امثال القرآن'')

قرآنی دعائیں - ۵۲۸-۶۱۱ (دیکھو ''دعا'')

قرآنی قصے

— قصۂ آدمؑ و ابلیس ۳۴۷ تا ۳۵۰
— قصۂ نوح علیہ السلام ۲۹۰- ۲۹۱
— قصۂ ہود علیہ السلام ۶۱۳ - ۶۱۷
— قصۂ لقمان ۱۲ تا ۱۸
— قصۂ ابراہیم علیہ السلام ۲۹۱ تا ۳۰۱ -۵۳۴- ۵۳۵
— قصۂ لوط علیہ السلام ۳۰۶
— قصۂ الیاس علیہ السلام ۳۰۲ تا ۳۰۶
— قصۂ فرعون و موسیٰ علیہ السلام ۴۰۲ تا ۴۱۳ - ۵۴۰ تا ۵۴۶ - ۵۶۵ - ۵۶۹
— قصۂ یونس علیہ السلام ۳۰۷ تا ۳۱۰
— قصۂ داود علیہ السلام ۱۷۸ - ۳۲۳ تا ۳۳۱
— قصۂ سلیمان علیہ السلام ۳۳۲ - ۳۳۹
— قصۂ قومِ سبا ۱۹۱ تا ۱۹۹
— قصۂ اصحابِ یاسین ۲۴۸ تا ۲۵۵
— قصۂ ایوب علیہ السلام ۳۳۹ تا ۳۴۲
— قصۂ عیسیٰ علیہ السلام ۵۴۶ تا ۵۴۸

قربانی

— عیدالاضحیٰ کی قربانی سنتِ ابراہیمی کی یادگار ہے ۲۹۶-۲۹۷

قریش

— زمانۂ جاہلیت میں ان کے گمراہانہ عقائد ۵۲۰- ۵۲۱-۵۳۰-۵۳۲-۵۹۸-۵۹۹
— وہ سرے سے وحی و رسالت ہی کے منکر تھے ۲۵۱-۲۵۲
— ان کا اپنے شرک پر عیسائیوں کے شرک سے استدلال ۵۴۶
— وہ حضرت ابراہیمؑ سے اپنے تعلق پر فخر کرتے تھے لیکن انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے چھوڑے ہوئے کلمۂ حق کو چھوڑ کر بت پرست قوموں کی پیروی اختیار کر لی ۵۳۴- ۵۳۵
— وہ اپنے اسلاف میں سے بہترین کو چھوڑ کر گمراہ ترین اسلاف کی پیروی میں لگ گئے ۵۳۵
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے کے لیے ان کی حجتیں ۲۱۰ - ۴۳۶ - ۴۶۴ - ۵۰۲ - ۵۰۳- ۵۲۳- ۶۰۳- ۶۰۴ - ۶۰۸ - ۶۱۲
— وہ قرآنِ مجید کو جادو قرار دیتے تھے ۲۱۰- ۵۳۵- ۶۰۳- ۶۰۴

— وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دیتے تھے ۳۴-۳۵
— ان کو اللہ تعالیٰ کی تنبیہ کہ قرآن کو محمدؐ کی تصنیف قرار دے رہے ہو، کیا کبھی سوچا بھی ہے کہ حقیقت کھلنے پر تمھارا کیا انجام ہو گا ۴۶۸-۶۰۵-۶۰۶
— وہ نہ خود قرآن سنتے تھے اور نہ دوسروں کو سننے دیتے تھے ۴۵۳
— ان کو قرآن جیسے شرف کی ناقدری کی جواب دہی کرنی ہوگی ۵۴۰
— محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے جھوٹے اتہامات ۲۱۱-۲۱۲-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۵-۳۱۹ تا ۳۲۱-۴۱۶-۴۳۴-۵۶۲-۵۶۳
— ان سردارانِ قریش کی اخلاقی حالت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھے ۲۲۱-۲۲۲-۴۶۴-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۶
— قریش کی مخالفت کے اصل وجوہ ۲۲۳-۳۱۸-۳۸۹-۴۳۴-۴۶۵-۵۰۴-۵۲۱-۵۲۲-۵۳۵-۵۳۶
— قرآن میں اللہ تعالیٰ قریش کی حالت کا کیا نقشہ کھینچتا ہے ۲۴۶-۲۴۷-۵۶۲-۵۶۳
— قریش کا انکار شک، تکبر، ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا نہ کہ یقین محکم اور دلیل کی بنا پر ۳۱۹-۴۶۴-۴۶۹-۴۷۱
— قریش کو ان کی ہٹ دھرمی پر ملامت ۵۳۹-۵۷۷
— حضورؐ پر ان کا یہ اعتراض کہ آپ نے سب خداؤں کی جگہ ایک ہی خدا بنا لیا ہے ۳۲۰-۳۴۶-۳۴۷
— وہ آپؐ کی دعوت نہ ماننے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے ۴۳۵
— ان کے کھاتے پیتے لوگ آپؐ کے اولین مخالف تھے ۵۳۳-۵۳۴
— وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے کیا وجوہ بیان کرتے تھے ۳۱۸-۳۱۹-۳۲۱
— وہ کس طرح مسلمان ہونے والوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے ۲۲۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'')
— ان کا حضورؐ پر یہ الزام کہ آپ اقتدار کے طالب ہیں اور اپنی سرداری قائم کرنا چاہتے ہیں ۳۲۰
— سردارانِ قریش کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے لائق نہ سمجھنا اور اللہ کی طرف سے اس کا جواب ۳۲۱-۳۲۲
— قریش کا اعتراض کہ نبی ہمارے درمیان ہی سے کیوں آیا ۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱
— قریش کا اعتراض کہ ہمارے درمیان سے کیا ایک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی رہ گئے تھے جنھیں نبی بنانے کے لیے چنا گیا ۳۲۰-۳۲۱
— قریش کا اعتراض کہ جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں وہ ہم نے کبھی نہیں سنا ۳۲۰
— قریش کے اس اعتراض کا جواب کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جگہ اللہ تعالیٰ نے مکہ و طائف کے کسی امیر کو کیوں نہ نبوت دی ۵۳۵-۵۳۶
— قریش دولت و جاہ کو بڑائی تصور کرتے تھے ۵۳۸
— جس طرح فرعون اپنی دولت و عزت کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو حقیر جانتا تھا اسی طرح قریش بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حقیر سمجھتے تھے ۵۴۱-۵۵۴
— قرآن کی دعوت کے مقابلے میں ان کی ہٹ دھرمی ۴۳۶-۴۳۷-۴۴۰-۴۴۳-۴۶۴-۵۶۲-۵۶۳
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے ان کی تدبیریں ۸-۹-۱۰-

۳۲-۳۸۸-۴۳۶-۴۵۳-۴۵۶-۴۵۷-
۴۶۲-۴۹۶-۵۵۰-۵۵۱
— قریش کی تدبیروں کے ناکام ہونے کی پیشین گوئی ۳۱۳-۳۱۴-۴۳۷-۴۳۸
— آنحضورؐ کو قتل کرنے کے لیے ان کی سازشیں ۳۸۸-۴۳۶-۵۳۹
— وہ قرآن کو سن کر کس طرح متاثر ہوتے تھے ۴۳۴-۴۳۵
— وہ حضورؐ کی شخصیت کا وزن کیا کچھ محسوس کرتے تھے ۳۱۷
— وہ آپؐ کی مخالفت پر دل ہی دل میں پشیمان تھے ۴۶۵
— وہ خود جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات وہ لگاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ۹-۱۷۶-۲۷۱-۴۳۵
— وہ اپنے دلوں میں آپ کی صداقت کے معترف تھے ۴۳۵
— ان کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصالحت کی کوششیں ۳۱۶-۳۱۷-۴۳۴-۴۳۵
— ان کا ابوطالب کے پاس جا کر آپؐ کی شکایت کرنا ۳۱۶
— حضورؐ کا ان سے یہ کہنا کہ جو کلمہ میں لایا ہوں اُسے مان لو تو عرب و عجم تمھارے تابع ہوجائیں گے ۳۱۶-۳۱۷
— ان کے اندر ایک مصلحت پرست گروہ بھی تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حق پر جانتا تھا مگر ساتھ نہیں دے رہا تھا ۳۸۹
— اسلام قبول کرنے والوں پر ان کے مظالم ۴۵۶-۴۵۸-۴۹۶
— مکی زندگی کے آخری دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے مظالم ۵۹۶-۵۹۷
— مکہ کا وہ قحط جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر رونما ہوا ۵۵۶-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴
— قریش بڑھ بڑھ کر اس لیے باتیں کرتے تھے کہ انھوں نے خدا کا عذاب دیکھا نہیں تھا ۳۲۱
— وہ عذاب دیکھنے کی جلدی مچاتے تھے اور طنزاً قیامت سے پہلے ہی عذاب میں سے اپنا حصہ مانگتے تھے ۳۲۲-۵۴۹
— وہ کہتے تھے کہ ہم تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیے جا رہے ہیں آخر عذاب کیوں نہیں آتا؟ ۳۸-۳۹-۵۰-۵۱
— وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جعلی معبودوں سے ڈراتے تھے ۳۷۳
— وہ مانتے تھے کہ اللہ ہی زمین و آسمان کا خالق ہے ۵۲۵
— ان کو بیٹیوں کی پیدایش بہت ناگوار گزرتی تھی مگر اللہ کے لیے وہ بیٹیاں تجویز کرتے تھے ۳۱۱-۵۳۰
— ان کے پاس اپنی ملائکہ پرستی کے لیے کوئی سند سوائے باپ دادا کے عمل کے نہ تھی ۵۳۳
— ان کو اللہ تعالیٰ متاع حیات دیتا رہا حالانکہ وہ مشرک تھے لیکن اللہ نے ان کے لیے حق اور رسول بھیجا تو انھوں نے اس کو جادو قرار دیا ۵۳۵
— شرک کی تردید میں حضرت عیسیٰ کی مثال پر قریش کا مذاق اڑانا ۵۴۶
— قریش آخرت کے منکر تھے، ان کی دلیل اور جواب ۵۶۹-۵۷۰
— ان کی حرکتوں سے مسلمانوں کو درگزر کرنے کی ہدایت تاکہ اللہ خود ہی قریش کو ان کی کمائی کا بدلہ دے ۵۸۴
— ان کا حضورؐ سے کہنا کہ جو کچھ بھی دعوت تم دیتے ہو اس کی طرف سے ہمارا دل بند ہے اور کان بہرے ہیں، تم اپنا کام کرو اور ہم اپنا ۴۴۰-۴۴۱
— وہ بہت سے معبودوں کے ساتھ اللہ کو بھی معبود تسلیم کرتے تھے مگر اللہ کو معبودِ واحد ماننے سے

ان کو انکار تھا ۳۲۰-۳۴۶-۳۴۷
— ان کا اعتراض کہ کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟ یہ کام تو فرشتوں کے کرنے کا ہے ۳۳-۲۴۹ تا ۲۵۱-۴۴۷

قسم

— اس کے توڑنے کا کفارہ ۳۴۲
— قسم فوراً پوری کر دینا ضروری نہیں ہے ۳۴۲
(نیز دیکھو ''اقسام القرآن'')

قضا و قدر۔ (دیکھو ''تقدیر'')

قنوت: معنی و تشریح ۹۴-۹۵

قیامت

— علامات قیامت ۵۴۷-۵۶۴-۵۶۵
— قیامت کی علامات از روئے حدیث ۱۵۹
— وہ قریب آ لگی ہے ۴۰۰
— وہ تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کیے جانے کا دن ہے ۲۰۸-۵۹۱
— وہ کس لیے آئے گی؟ ۱۷۴-۱۷۵
— وہ آ کر رہے گی ۱۷۴
— اللہ کا وعدۂ قیامت برحق ہے ۵۹۳
— اس کے آنے میں کوئی شک نہیں ۴۱۷-۵۹۱-۵۹۳
— اس کا برپا ہونا ہر وقت ممکن ہے ۱۷۷-۴۱۸
— اس کا وقت آنے پر کوئی طاقت اسے ٹال نہیں سکتی ۵۱۴
— وہ اچانک آئے گی ۲۶۴-۲۶۵-۵۴۹
— اس کا وقت مقرر ہے ۲۰۲-۲۰۴-۵۷۰
— اس کا وقت خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں ۲۸-۱۳۳-۱۷۴-۳۴۹-۴۶۶-۵۵۱
— وہ کس طرح برپا ہو گی ۲۶۴-۲۶۵-۲۸۲-۳۲۲-۳۸۲-۳۸۳-۵۶۲
— اس روز یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ ساری کائنات اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے ۳۸۲
— اس روز مجرمین کس طرح پکڑ لیے جائیں گے ۲۱۳
— اس روز کفار کے منہ کالے ہوں گے ۳۸۱
— اس روز کفار کی حالتِ زار ۴۰۰
— تمام اختلافات کی حقیقت اس روز کھول دی جائے گی اور فیصلہ کر دیا جائے گا ۵۰-۵۸۶
— اس روز اللہ مجرمین سے انتقام لے گا ۵۶۳
— اس کے آنے کی تاریخ کفار کس غرض سے پوچھتے تھے؟ ۲۸- ۲۹- ۱۳۳- ۱۷۴- ۲۰۲- ۲۰۳-۲۰۴-۲۶۴
— کفار کے مطالبۂ قیامت کا جواب ۲۰۲-۲۰۴
— معترضین بار بار اس کے قیام کا تقاضا کیوں کرتے تھے؟ ۱۷۴
— اللہ کی سب سے بڑی رحمت یہ ہے کہ روزِ قیامت کی سختیوں سے آدمی بچ جائے ۳۹۶
— روزِ قیامت کی سختیاں ۳۹۶
— اس کے عذاب سے بچنے کے لیے انسان کو کیا کرنا چاہیے ۳۷۷
— اس پر ایمان لانے میں شیطان مانع ہے ۵۴۸
— اس پر ایمان لانا ہی سیدھا راستہ ہے ۵۴۷-۵۴۸
— اس روز کون شفاعت کر سکے گا؟ ۱۹۹-۲۰۰
— اس روز نہ باپ بیٹے کی جگہ بدلہ دے گا اور نہ بیٹا باپ کی جگہ ۲۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''شفاعت'')
— اس روز کفار آپس میں جھگڑیں گے ۳۷۲
— جو روزِ قیامت کی سختی سے بچ گیا اس پر اللہ کا بڑا رحم ہے ۳۹۶
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''آخرت'' اور ''زندگی بعد موت'')

ک

کافر- (دیکھو ''کفر'')

کائنات

— کائنات کا مالک اللہ ہے۲۲-۳۴۶-۳۷۶-۴۷۸

— اس کا خالق اللہ ہے ۳۷۷-۴۲۵

— اس کو پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام تھا۴۲۵

— کافر بھی یہ مانتے ہیں کہ کائنات کا خالق اللہ ہی ہے۳۷۴

— کائنات کو برحق پیدا کیا گیا ہے۳۳۱-۳۵۷-۵۷۰-۵۸۷-۵۸۸

— کائنات میں سب کچھ نہ اتفاقاً پیدا ہوا ہے نہ اتفاقاً چل رہا ہے بلکہ اس کو ایک زبردست حکیم نے علم و حکمت کے ساتھ بنایا ہے اور یہ ایک قانون کے تحت چل رہی ہے ۴۵-۲۳۱-۲۵۶ تا ۲۶۲

— کفار ہی یہ گمان کرتے ہیں کہ کائنات کو فضول اور بے مقصد بنایا گیا ہے۳۳۱-۳۳۲

— یہ اللہ ہی کا منصوبہ ہے جس کے مطابق کائنات وجود میں آئی اور اس میں مخلوقات کو پیدا کیا گیا۴۴۶

— کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا گیا۳۷-۴۴۲ تا ۴۴۶

— کائنات بناتے ہوئے اللہ تھک نہیں گیا جیسا کہ بائبل کا بیان ہے۶۲۰

— کائنات میں زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں کے اندر بھی زندگی موجود ہے۵۰۴-۵۰۵

— کائنات میں سورج، چاند، تارے، سیارے تمام متحرک ہیں ہر ایک کا اپنا ایک مدار ہے، آسمانوں کے ساتھ تارے گردش نہیں کر رہے ہیں بلکہ آسمانوں کے اندر تارے تیر رہے ہیں ۲۶۱

— کائنات کو ایک مقرر مدت کے لیے بنایا گیا ہے ۲۲۶-۶۰۰

— سورج اور چاند کو مسخر کیا گیا ہے اور سب ایک مقررہ وقت تک کے لیے چلے جار ہے ہیں۲۳-۲۴-۲۵۹-۳۵۹

— انسان کے لیے کائنات کو کس معنی میں مسخر کیا گیا ہے۱۹-۲۰-۵۸۷

— کائنات کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں ۳۸۱

— کائنات کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۵۹۲

— کائنات میں اللہ کی نشانیاں ۳۹۷-۳۹۸

— کائنات کے تمام معاملات کی تدبیر اللہ تعالیٰ خود کر رہا ہے ۳۸

— تدبیرِ کائنات کے کام کی روداد اللہ کے حضور پیش ہوتی ہے ۳۸

— کائنات کی کوئی چیز اللہ کے مشابہ نہیں ہے ۴۸۵

— کائنات کا ذکر جہاں کہیں بھی قرآن میں آیا ہے، توحید کے دلائل کے طور پر آیا ہے نہ کہ قرآن کوئی علمِ طبیعیات یا علمِ ہیئت کی کتاب ہے ۴۴۵

— آفاقِ ارض وسما اور انسان کے اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ قرآن کے برحق ہونے کے دلائل دکھائے گا ۳۲-۴۷۰

— کائنات کے لیے صرف لفظ ''آسمان'' کا استعمال ۴۴۴-۴۴۵

— کائنات موجودہ صورت گری سے پہلے مادے کی ابتدائی شکل میں تھی اور بے شکل منتشر الاجزا غبار کی صورت میں فضا کے اندر پھیلی ہوئی تھی ۴۴۵

کتاب

— اللہ کی رضا معلوم کرنے کا اصل ذریعہ اللہ کی کتاب ہے۵۳۲

— اللہ کی تمام کتابوں پر ایمان ضروری ہے ۴۲۶-۴۹۵

— تمام کتبِ آسمانی کو ماننا کیوں ضروری ہے؟ ۴۸۷

— صرف پچھلی کتابوں پر ایمان ہی کافی نہیں ہے

بلکہ قرآن پر ایمان لانا بھی ضروری ہے ۵۷۵
— اللہ کی کتابوں کو جھٹلانے والوں کا انجامِ بد ۴۲۶-۴۲۷
— ام الکتاب کیا ہے ۵۲۳-۵۲۴
— پچھلے انبیاؑ کی لائی ہوئی کتابوں میں کس طرح تحریف ہوئی ۴۹۴-۴۹۵
— صحیفہ اور کتاب کا فرق ۲۳۱
— کتاب کا نزول اللہ کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے ۵۷۷
— کتاب کے ساتھ رسول بھیجنا حکمت کا تقاضا بھی ہے اور رحمت کا تقاضا بھی ۵۵۹
— اللہ کی کسی کتاب میں غیر اللہ کی بندگی کی تعلیم نہیں دی گئی ۲۱۰-۲۱۱-۵۳۲
— قرآن سمیت تمام کتبِ آسمانی کی تعلیم ایک ہی تھی ۵۲۳-۵۲۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''آیت'' اور ''قرآن'')

کسب
— معنی اور تشریح ۳۶۹

کفر
— معنی اور تشریح ۳۸۱-۳۹۳
— کفر بمعنی کفرانِ نعمت ۱۴
— کافر گمراہ اور ظالم ہیں ۱۲
— کافر تکبر میں مبتلا ہیں ۴۲۷-۴۲۸
— کفر دراصل تکبر کی وجہ سے ہے اور تکبر کا سبب انکار آخرت ہے ۳۸۱-۳۸۴-۴۰۹-۴۱۶-۴۲۷-۴۲۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تکبر'')
— دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیرانا کفر ہے ۳۹۷-۴۴۲
— قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننا کفر ہے ۲۰۴-۲۳۷-۲۳۸-۳۸۱-۵۰۲-۵۰۳
— اللہ کی کتاب اور اس کی آیات کا انکار کفر ہے ۳۸۱-۴۵۳
— قرآن کی مخالفت کفر ہے ۴۵۳
— قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دینا کفر ہے ۵۰۲-۵۰۳
— آخرت کا انکار کفر ہے ۳۳۱-۶۲۰-۶۲۱
— انبیاؑ کی دعوت کے منکر کافر ہیں ۴۰۲
— اللہ کی آیات میں جھگڑے پیدا کرنا کفر ہے اور اس کا انجام بہت برا ہے ۳۹۱-۵۷ تا ۳۹۳-۴۶۲
— مومن اور کافر کا فرق ۲۲۹
— کافر کی نشانیاں ۲۵-۲۶۲-۲۶۳-۳۶۲-۴۶۲-۵۸۱-۶۰۳
— مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے ۳۳۱-۳۶۷
— کفر درحقیقت اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی ہے ۳۶۱
— کفر درحقیقت جہالت ہے ۳۶۳
— کافروں کی اطاعت و پیروی نہ کی جائے ۶۸
— کفر بجائے خود موجبِ عذاب ہے، اعمال خواہ نیک ہوں یا بد ۵۰۳-۵۰۴-۵۹۲-۵۹۳
— کفر کے ساتھ اگر بدعملی کی شدت نہ ہو تو عذاب میں بھی شدت نہ ہوگی ۱۷۴-۱۷۵
— اللہ کا ذکر سن کر جس کا دل اور سخت ہو جائے اس کے لیے تباہی ہے ۳۶۷
— کافروں اور دہریوں کا کفر کسی علم و یقین کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض گمراہ کن شک کی بنیاد پر ہے ۲۱۳-۲۱۴-۴۰۹-۴۱۶
— جو لوگ کفر کرتے ہیں عنقریب انھیں حقیقت معلوم ہو جائے گی ۵۵۱-۵۵۳
— کافروں کا کفر اللہ کے لیے نہیں، خود ان کے لیے نقصان دہ ہے ۱۴-۲۱-۲۲-۳۶۰

— اللہ خود لوگوں کی بھلائی کے لیے یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اس سے کفر کریں ورنہ لوگوں کے کفر کرنے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ۳۶۰-۳۶۱

— اللہ کو لوگوں کا کفر کس قدر ناپسند ہے ۳۶۰-۳۹۶-۳۹۷

— ایک اللہ کا ذکر سننا کافروں کو ناگوار ہوتا ہے اور دوسرے معبودوں کا ذکر سن کر وہ خوش ہوجاتے ہیں ۳۷۶-۳۹۷

— کافروں کو ان کے کفر اور برے اعمال کی وجہ سے جہنم کا ایندھن بنایا جائے گا ۲۶۸-۳۶۸-۳۸۱

— کفار کو سزا ملنی ہی ہے خواہ اس دنیا میں ملے یا آخرت میں ۵۳۹

— کفار کے دنیا میں ظاہری عیش و آرام سے مومنوں کو دھوکا نہیں کھانا چاہیے ۳۹۳-۴۳۱

— اللہ کو محض خالقِ کائنات مان لینے سے کافر کا کفر ختم نہیں ہوجاتا کیونکہ اللہ کو ماننے کے جو تقاضے ہیں انھیں وہ پورا نہیں کرتا ۲۲-۴۷-۳

— کافروں کا یہ گمان غلط ہے کہ زمین و آسمان (کائنات) کو فضول پیدا کیا گیا ہے اور ان سے ان کے اعمال کی بازپرس کبھی نہیں ہونی ہے ۳۳۱

— کفار کا یہ قول کہ ''اللہ ہمیں ہدایت بخشتا تو ہم بھی متقی ہوتے'' ۳۸۰-۳۸۱

— کفار کا یہ قول کہ ''اگر ہدایت آجائے تو ہم سب سے پہلے اس کے ماننے والے ہوں گے'' ۲۴۰-۳۱۳

— کفار کا یہ قول کہ ''کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے، ہماری رہنمائی کے لیے تو فرشتے آنے چاہئیں ۲۴۹ تا ۲۵۱-۴۴۷

— کفار کے سامنے آخرت میں جو کچھ پیش آئے گا اس کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا ۳۷۷

— کفار کی آنکھوں پر پٹی ہے اور کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے دور سے کسی کو آواز دی جاتی ہو ۴۶۴

— کافروں کو خدا کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکتا ۱۳۳-۱۳۴

— آخرکار کافر ہی گھاٹے میں رہیں گے ۲۳۸-۲۳۹-۳۸۱-۳۸۲

— کافر اپنے حصے کی نعمتیں دنیا ہی میں پالیتے ہیں، آخرت کی نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ۶۱۳

— آخرت میں کفار خود اپنی حماقت پر اپنے آپ کو کوسیں گے اور اپنی گمراہی کا خود اقرار کریں گے ۳۹۶-۳۹۷-۴۲۷

— اللہ نے کفار پر جہنم کا فیصلہ چسپاں کردیا ہے ۳۹۳

— کفار کو جہنم میں کیوں ڈالا جائے گا ۳۹۷-۴۲۷

— کفار محض اللہ تعالیٰ کی حلیمی و رحیمی کی وجہ سے دنیا میں مہلت پارہے ہیں ۴۸۰

— عدالتِ آخرت میں کفار کی پیشی کا منظر ۴۴۹-۴۵۰

— آخرت میں کفار کو مومنین سے الگ کردیا جائے گا ۲۶۶

— کفار کا ٹھکانا آگ ہے ۴۵۰-۴۵۱

— کفار کی غلط فہمی کہ اول تو آخرت ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو ہمارے لیے وہاں بھی عیش و آرام ہے ۴۶۷-۴۶۸

— کفار نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ حقیقت کھلنے پر ان کا کیا انجام ہوگا ۴۶۸-۶۰۵-۶۰۶

— کفار کے جہنم میں داخلے کا منظر ۳۸۴

— کفار کا انجام بد ۱۰-۲۱-۷۵-۱۳۳-۱۳۴-۲۰۶-۲۱۳-۲۱۴-۲۲۱-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۷ تا ۲۳۹-۲۶۸-۳۳۱-۳۳۷-۳۶۲-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۹-۳۷۲-۳۸۱-۳۸۴-۳۹۳-۳۹۷-۴۰۲-۴۱۱-۴۲۶-۴۲۷-۴۳۱-۴۳۵-۴۴۹-۴۶۷-۴۶۸-۵۰۳-۵۰۴-

۵۸۳-۵۹۳-۵۹۴-۶۱۳-۶۲۰-۶۲۱

— کفار خسارے میں پڑ گئے ہیں ۴۵۱-۴۵۲

— کافروں کے کفر پر اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوتا ہے ۳۹۶

— کفار اس بڑائی کو نہیں پہنچ سکتے جس کا وہ گھمنڈ کرتے ہیں ۴۱۶

— کفار کو راہِ راست پر لانے کے لیے جو طریقے بھی بہترین ہو سکتے تھے اللہ تعالیٰ نے وہ سب اختیار کیے ہیں ۴۷۶-۴۷۷

— ان کافروں سے کیا معاملہ ہو گا جن کے علاقے میں ایک طویل مدت سے کوئی پیغمبر نہیں آیا ۳۶-۳۷-۲۴۶

— کفار کے بے دلیل عقیدے ان کے نامۂ اعمال میں ثبت کر لیے گئے ہیں اور انھیں اس کی جواب دہی کرنی ہو گی ۵۳۲

— کفار ہمیشہ سے باپ دادا کے عمل کو اپنے مذہب کے حق میں دلیل بناتے رہے ہیں ۲۰-۲۹۰-۵۳۳-۵۳۴

کفارِ عرب - (دیکھو ''عرب'')

کفارِ مکہ - (دیکھو ''قریش'')

کفارہ - (دیکھو ''قسم'')

گ

گمراہی - (دیکھو ''ضلالت'')

گناہ

— نادانستہ خطا سرزد ہو جانے پر کوئی گرفت نہیں ہے البتہ اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا ارادہ دل سے کیا گیا ہو ۷۰

ل

لعنت

— خدا کی لعنت کے مستحق کیسے لوگ ہیں ۱۲۳-۱۳۱-۱۳۵-۴۱۵

لقمان

— عرب میں ان کی شہرت ٦

— ان کے حالات اور نصائح ۱۲ تا ۱۸

— ان کو حکمت دی گئی تھی ۱۲

— کلام لقمان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعریفی کلمات ۱۳

لوط علیہ السلام

— ان کا قصہ ۳۰٦

— قومِ لوط اور اس پر عذاب کی وجہ ۳۲۲

— حضرت لوطؑ کی بیوی کے سوا ان کے گھر کے سب افراد عذابِ الٰہی آنے پر بچا لیے گئے ۳۰٦

لیلۃ القدر

— وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا ۵۵۹-۵٦۰

— اللہ تعالیٰ خیر و برکت والی اس رات میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ کرتا ہے ۵۵۹

م

ماریہ قبطیہ

— نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے بر بنائے ملک ان سے تمتع فرمایا تھا ۱۱۳-۱۱۴

متبنّٰی - (دیکھو ''تبنیت'')

متقی - متقین (دیکھو ''تقویٰ'')

متکبر - متکبرین (دیکھو ''تکبر'')

محسن - (دیکھو ''نیکی'' اور ''احسان'')

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

— رسول مبین ۵۳۵-۵٦۲

— آپؐ پر قرآن اللہ نے نازل کیا ہے ۳۴-۳۵-۲۴۵-۳۳۲-۳۵۵-۳۷۵-۳۹۱-۴۴۱-۴۵۳-۴۸۰-۴۹۷-۵۵۹-۵۷۹-٦۰۰

— قرآن کا نزول آپؐ کے لیے بھی اور آپؐ کی

قوم کے لیے بھی شرف ہے ۵۴۰
— آپؐ تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نذیر و بشیر بنا کر بھیجے گئے تھے ۱۰۵-۲۰۲-۲۰۳-۲۱۱-۲۳۰-۳۵۰
— آپؐ کو اللہ کی طرف دعوت دینے والا بنایا گیا تھا ۱۰۸
— آپؐ صرف انسانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ جنوں کی رہنمائی کے لیے بھی مبعوث ہوئے تھے ۵۹۶-۵۹۸-۶۱۸ تا ۶۲۰
— آپؐ کی اطاعت کا حکم ۷-۸-۹۳-۹۷-۹۸-۱۳۵
— اللہ کی نگاہ میں آپؐ کا مرتبہ ۱۲۳-۱۲۴-۱۲۸
— آپؐ سیدھے راستے پر تھے ۲۴۵-۵۳۹
— آپؐ سچائی لے کر آئے تھے ۳۷۲
— آپؐ رسولوں میں سے تھے ۲۴۵
— آپؐ کوئی نرالے رسول نہ تھے ۶۰۵
— اللہ نے آپؐ کو دین کی صاف شاہراہ پر قائم کیا ہے ۵۸۶
— اللہ کے حکم سے آپؐ نے ان اختلافات کا دروازہ بند کر دیا جو توراۃ و انجیل میں پیدا کر دیے گئے تھے ۴۹۴-۴۹۵
— آپؐ اللہ کے سیدھے راستے کی طرف بلاتے تھے ۵۱۷
— آپؐ حق لے کر آئے تھے ۲۳۰-۲۸۵-۵۳۵
— آپؐ کا ذریعۂ علم وحی تھا ۲۱۲-۲۴۷-۳۸۱-۳۸۲-۴۴۱-۴۷۸-۴۸۶-۵۱۶
— آپؐ کو اللہ تعالیٰ کن کن طریقوں سے تعلیم دیتا تھا ۴۷۷-۵۱۶-۵۱۷
— آپؐ کی ذات میں ایمان والوں کے لیے بہترین نمونہ ہے ۸۰-۸۱
— آپؐ کے ساتھ اہلِ ایمان کا کیا تعلق ہونا چاہیے ۱۷-۴۷-۱۰۴-۱۱۸-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۷
— آپؐ کے خلاف اگر کسی کے دل میں بھی وسوسہ ہو تو اس پر گرفت ہو گی ۱۱۸-۱۲۲
— آپؐ اور آپؐ پر ایمان لانے والے عذاب سے محفوظ ہیں ۳۷۲
— آپؐ کے مخالفین کو اللہ سزا دے گا ۵۳۹
— آپؐ کو نہ ماننے والے کافر ہیں ۲۳۷-۲۳۸-۳۸۱-۳۸۴-۴۱۴
— آپؐ کو تکلیف پہنچانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ۱۲۱
— آپؐ کی نبوت کے دلائل ۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۴۹-۲۴۵-۲۵۲-۲۵۳-۳۵۰-۴۷۷-۵۱۷-۵۱۸
— آپؐ نبوت ملنے سے پہلے نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے ۵۱۷
— بعثت سے پہلے آپؐ کی پوری زندگی اس بات کی گواہ تھی کہ آپؐ جھوٹے مدعی نبوت نہیں ہوسکتے ۲۱۱-۳۵۰
— بائبل میں آپؐ کی نبوت کی شہادت ۳۰۵-۳۰۶
— آپؐ کو کس منصبِ عظیم پر اللہ نے مامور فرمایا ہے ۱۰۵ تا ۱۰۸
— آپؐ کی دعوت کیا تھی ۳۵۴-۳۵۵-۳۶۴-۴۴۱-۴۷۵
— آپؐ کی بعثت کس مقصد کے لیے ہوئی تھی ۲۱۱-۲۱۲-۲۴۵-۲۴۶-۳۴۴-۳۶۴-۴۸۰ تا ۴۸۲
— آپؐ کے لائے ہوئے دین کی حقیقت ۴۷۵-۴۷۶
— آپؐ کے لائے ہوئے دین کی بنیادی تعلیمات (دیکھو "اسلام")
— آپؐ کی بعثت اللہ کی رحمت تھی ۵۵۹-۵۶۰
— آپؐ کے ذریعے سے حق پہنچا دیا گیا، اب نافرمانوں کے سوا کوئی اور نہ بھٹکے گا ۶۲۱
— آپؐ کی بعثت سے پہلے صدیوں سے عرب میں کوئی نبی نہیں آیا تھا ۳۶-۲۴۶-۲۴۷
— آپؐ کی آمد سے پہلے اہل عرب خود ایک نبی مانگ رہے تھے ۲۴۰-۲۴۱-۳۱۳
— پچھلے انبیاؑ کے بعد آپؐ کے مبعوث کیے جانے

کی وجہ ۴۹۴
— آپؐ تمام انبیاؑ کی لائی ہوئی کتابوں کو ماننے پر مامور تھے ۴۹۵
— آپؐ پچھلے تمام انبیاؑ کی تصدیق کرتے تھے ۲۸۵
— آپؐ کی دعوت وتعلیم وہی تھی جو پہلے انبیاؑ کی تھی ۳۸۱-۳۸۲-۴۶۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۱-۴۸۵-۴۸۶-۵۲۳-۵۲۴-۶۱۴-۶۱۵
— آپؐ دین میں باختیارِ خود کوئی رد و بدل کر لینے کے مجاز نہ تھے ۴۹۵-۵۸۶-۵۸۷
— آپؐ تمام انسانوں کے درمیان انصاف پر مامور تھے ۴۹۵-۴۹۶
— آپؐ وحیِ الٰہی کی پیروی پر مامور تھے ۵۳۹-۶۰۵-۶۰۶
— آپؐ کا کام صرف حق پہنچا دینا تھا، کسی کے حق قبول نہ کرنے کی ذمہ داری آپؐ پر نہ تھی ۲۳۰-۳۷۵-۵۱۴
— آپؐ کا کام لوگوں کو حقیقت سے خبردار کرنا تھا ۲۱۲-۳۴۶-۶۰۵-۶۰۷
— آپؐ کی ذمہ داری یہ نہ تھی کہ لوگوں کو راست رو بنا دیں ۲۱۱-۳۷۵-۵۱۴
— آپؐ دوسروں کو جس چیز کی دعوت دیتے تھے اس پر سب سے پہلے خود عمل کرتے تھے ۳۶۴
— آپؐ نے کبھی جاہلیت کے طریقوں کی پیروی نہیں کی ۲۳-۲۱۱
— آپؐ اپنی دعوتِ حق پر لوگوں سے کسی اجر کے طالب نہ تھے ۳۵۰-۵۰۰ تا ۵۰۲
— آپؐ نبوت کے کام میں بالکل بے غرض تھے ۲۱۲
— ”اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى“ کی صحیح تفسیر ۵۰۱-۵۰۲
— سردارانِ قریش سے آپؐ کا ارشاد کہ اگر تم میری دعوت مان لو تو عرب و عجم کے حکمران ہوجاؤ گے ۳۱۶
— مشرکینِ عرب پر آپؐ کے غالب آنے کی پیشین گوئی ۳۱۳-۳۱۴-۳۱۸-۳۲۲
— آپؐ کی دعوت کے دنیا پر چھا جانے کی پیشین گوئی ۴۶۸ تا ۴۷۰ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ”قرآن، اس کی پیشین گوئیاں“)
— کفار کی طرف سے معجزات کا مطالبہ اور اس کے جوابات ۴۲۸ تا ۴۳۰-۶۰۵-۶۰۶
— وہ حکمت جو دعوتِ دین کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے آپؐ کو سکھائی گئی ۴۵۴-۴۵۶-۴۶۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ”حکمت تبلیغ“ اور ”دعوت حق“)
— آپؐ اللہ کی طرف سے حق کی تعلیم اور ہدایت پاتے تھے ۲۱۲
— آپؐ بذاتِ خود عالم الغیب نہ تھے ۳۴۷-۶۰۵
— آپؐ کو بذریعۂ وحی صرف وہ حقائق بتائے گئے تھے جو نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے ضروری تھے ۳۴۷
— آپؐ کی بشریت ۴۴۱ (نیز دیکھو ”نبوت“)
— آپؐ فوق البشری طاقتوں کے مالک نہ تھے ۶۰۵-۶۰۶
— آپؐ خود کسی کو ہدایت بخش دینے پر قادر نہ تھے ۲۲۸ تا ۲۳۰-۵۳۹
— آپؐ کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ خدا کے عذاب سے کسی کو بچالیں ۳۶۵-۳۶۶
— آپؐ کا کام لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنا نہ تھا بلکہ غافلوں کو بیدار کرنا تھا ۴۷۴-۴۷۵-۴۸۰-۴۸۱
— بندوں کے اعمال کی نگرانی اور ان کا محاسبہ آپؐ کے سپرد نہیں کیا گیا تھا، یہ کام اللہ نے اپنے ہاتھ ہی میں رکھا ہے ۴۸۰-۴۸۱-۵۱۴
— آپؐ کے گواہ ہونے کا مفہوم ۱۰۵ تا ۱۰۹
— آپؐ سے اور دوسرے انبیاؑ سے کس چیز کا عہد لیا گیا تھا ۷۳ تا ۷۵
— آپؐ کے اخلاق کریمانہ ۹۹-۱۰۰-۱۲۰-۱۲۱-۲۵۵

— آپؐ بحیثیتِ قاضی ۴۹۵-۴۹۶

— آپؐ بحیثیتِ حاکم وفرماں روا ۹۷-۹۸

— آپؐ کے کمالات بحیثیتِ فوجی قائد ۵۵-۵۶-۵۸-۷۷-۸۰-۸۱

— آپؐ کے کمالات بحیثیتِ مدبر ۵۵-۵۶-۶۰-۶۱-۶۲

— آپؐ حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے والے تھے ۵۳۵

— آپؐ کتاب ہی نہیں حکمت بھی لائے تھے ۹۲-۹۴

— آپؐ کے احکام بحیثیتِ نبی اور بحیثیتِ انسان میں اصولی فرق ۶۱

— آپؐ کی امت کی فضیلت، اس کے طبقات اور آخرت میں اس کا انجام ۲۳۳ تا ۲۳۷

— آغازِ نبوت میں قریش کن غلط فہمیوں میں مبتلا تھے ۳۲-۳۳-۳۸-۳۹

— مکہ کے ان سرداروں کی اخلاقی حالت جو آپؐ کی مخالفت میں پیش پیش تھے ۲۲۱-۲۲۲

— آپؐ کے خلاف ان کے الزامات، اعتراضات اور شبہات ۲۱۰- ۲۱۱- ۲۱۲- ۴۳۴- ۵۳۵- ۵۶۲-۵۶۳-۶۰۳-۶۰۴

— کفارِ قریش خود جانتے تھے کہ وہ آپؐ پر جو الزامات لگاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ۹-۱۷۶-۱۷۱

— کفارِ مکہ کی طرف سے آپؐ پر کہانت کا الزام اور اس کا جواب ۲۸۰-۲۸۱

— کفارِ مکہ آپؐ کی باتوں کو جادو کس معنی میں کہتے تھے ۲۸۲- ۳۲۰- ۵۳۵-۶۰۳

— کفارِ مکہ کا آپؐ کو شاعر کہنا ۲۷۰- ۲۸۵

— کفارِ مکہ کا آپؐ کو مجنون کہنا ۱۷۶- ۲۱۱- ۲۸۵

— سرداران قریش کی آپؐ سے مصالحت کی بات چیت ۳۱۶- ۳۱۷- ۴۳۴- ۴۳۵

— مشرکین کو آپؐ کی دعوت سخت ناگوار گزرتی تھی ۴۹۳

— آپؐ سے کفار کا حسد اور بغض حضرت آدمؑ سے شیطان کے حسد اور بغض جیسا تھا ۳۵۰

— اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ اے نبی تم بھی انتظار کرو اور یہ کفار بھی منتظر رہیں کہ کس کا کیا انجام ہوتا ہے ۵۷۳-۵۷۴

— جو کوئی آپؐ کی دعوت کو نہ مانے گا، اس کا انجام ۶۲۰

— آپؐ کا بھروسا اللہ ہی پر تھا اور مصیبت میں آپؐ اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے ۴۸۵

— کفار مکہ آپؐ کی شخصیت کا وزن پوری طرح محسوس کرتے تھے ۳۱۷

— وہ اپنے دلوں میں آپؐ کی صداقت کے معترف تھے ۴۳۵

— آپؐ کی مخالفت کرنے والے کفار کی ذہنی حالت ۴۶۵

— کفار قریش کو کیا چیز آپؐ پر ایمان لانے سے روک رہی تھی ۲۲۳- ۳۱۸- ۳۸۹- ۴۱۶- ۴۳۴- ۴۶۵-۵۰۴-۵۲۱-۵۲۲-۵۳۵-۵۳۶

— وہ آپؐ کی بات نہ ماننے کے کیا وجوہ بیان کرتے تھے ۳۱۹-۳۲۱

— وہ آپؐ کو اس لیے نبی ماننے سے انکار کرتے تھے کہ آپؐ بشر ہیں ۲۴۹ تا ۲۵۱

— ان کو اس بات پر تعجب تھا کہ خود ان کی اپنی قوم کا آدمی نبی کیسے ہوگیا ۳۱۹

— وہ دراصل آپؐ کو نہیں بلکہ اللہ کے پیغام کو جھٹلا رہے تھے ۳۲۱

— سرداران قریش کا آپؐ کو نبوت کے لائق نہ سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ۳۲۱-۳۲۲

— آپؐ کو صبر کے ساتھ مکی زندگی کے سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین ۳۲۳- ۴۱۵- ۴۲۸- ۶۲۱

— وہ اولین مسلمان جو آپؐ کی دعوت سنتے ہی کسی

شک وشبہ کے بغیر ایمان لے آئے ۱۰۰
— مکی زندگی کے آخری دور میں آپؐ کے مصائب ۵۹۶تا ۵۹۸
— طائف کا سفر ۵۹۷
— طائف سے واپسی پر آپؐ کی رقت انگیز دعا ۵۹۷
— اس حالت میں بھی آپؐ دشمنوں کے لیے بددعا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے ۵۹۸
— آپؐ کا کفار مکہ کو چیلنج کہ میں اپنا کام جاری رکھوں گا تمھیں جو کچھ کرنا ہے کرلو ۳۷۴
— آپؐ کی دعوت کو زک دینے کے لیے قریش کی تدبیریں ۸-۹-۱۰- ۳۸۸- ۴۳۶- ۴۵۳- ۴۵۶-۴۵۷-۴۶۲-۴۶۴-۴۹۶-۵۵۰-۵۵۱
— آپؐ کے خلاف تدبیریں کرنے والوں کا انجام ۴۵۳
— آپؐ پر کفار مکہ کا یہ الزام کہ آپؐ نے قرآن خود تصنیف کرلیا ہے اور اس کا جواب ۳۴- ۳۵-۵۰۲-۵۰۳-۵۶۲-۶۰۳-۶۰۴
— آپؐ کو قتل کرنے کے لیے ان کی سازشیں ۳۸۸- ۴۳۶
— آپؐ کے مقابلے میں کفار مکہ کی ہٹ دھرمی کا جواب ۴۳۷-۴۴۱-۴۶۴-۵۶۲-۵۶۳
— آپؐ کی طرف سے کفار کے اتہامات کا جواب ۲۱۲-۲۱۳
— آخرت کا عقیدہ پیش کرنے پر کس طرح آپؐ کا مذاق اڑایا گیا ۱۷۶
— آپؐ سے اللہ کا وعدہ کہ وہ آپؐ کے جھٹلانے والوں کو ضرور سزا دے گا ۴۲۸
— آپؐ کی دعا پر مکہ میں قحط برپا ہونا ۵۵۶- ۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴
— سرداران قریش کی آپؐ سے درخواست کہ قحط دور کرنے کے لیے دعا فرمائیں ۵۵۶-۵۶۳
— اپنی قوم کو ہدایت دینے کے لیے آپؐ کی بے چینی ۲۲۲
— ہجرت حبشہ ۳۵۴
— مدینہ کے ابتدائی دور میں آپؐ کی معاشی تنگ حالی ۶۵-۶۶-۸۴
— آپؐ کی کثرتِ ازواج کے وجوہ ۱۱۲تا ۱۱۸
— آپؐ کے لیے چار بیویوں کی قید نہ ہونے کے وجوہ ۶۵-۶۶-۱۱۲تا ۱۱۶
— آپؐ کو اجازت تھی کہ جس بیوی سے جو چاہیں سلوک کریں ۱۱۶-۱۱۷
— ازواجِ مطہرات سے آپؐ کا عدل ۱۱۷-۱۱۸
— آپؐ کی ازواج کے نام اور ان کی تعداد ۱۱۳-۱۱۴
— آپؐ کی ازواج مطہرات امت کے لیے حرام کردی گئی ہیں ۶۷-۱۲۱-۱۲۲
— آپؐ کی ازواج امت کی مائیں ہیں ۷۱-۷۲
— حضرت زینبؓ سے نکاح کا حکم آپؐ کو کیوں دیا گیا تھا ۶۴-۶۶-۱۰۱-۱۰۲
— حضرت زینبؓ سے نکاح کرنے پر آپؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان ۶۴-۶۵
— آپؐ کے خلاف مغربی مستشرقین کا اندھا تعصب ۴۰۴
— آپؐ کو حضرت زینبؓ سے نکاح میں کیوں تامل تھا؟ ۶۸-۷۴-۱۰۰-۱۰۱
— شماتتِ اعدا کے اندیشے سے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح میں تامل کرنے پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ۱۰۰-۱۰۱
— آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا تھا ۱۰۱
— یہ نکاح آپؐ پر فرض تھا ۱۰۲
— آپؐ کی خانگی زندگی کے معاملات پر بھی براہِ

راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی قائم تھی ۶۵-۶۶
— آپؐ کی صاحبزادیوں کی تعداد ۱۳۰-۱۳۱
— وہ مملوکہ خاتون جن سے آپؐ نے بربنائے ملک تمتع فرمایا ۱۱۳-۱۱۴
— وہ خاص امور جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے احکام عام مسلمانوں کے احکام سے مختلف تھے ۱۰۲-۱۱۴ تا ۱۱۷
— تخییر کے بعد جن ازواجِ مطہراتؓ نے آپؐ کی رفاقت قبول کرلی تھی ان کو طلاق دینے کا آپؐ کو اختیار نہ تھا ۸۵-۱۱۸
— آپؐ کا گھر مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا اور مسلمانوں کے گھروں میں جو اصلاحات نافذ کرنی ہوتی تھیں وہ پہلے آپؐ کے گھر میں نافذ کی جاتیں ۱۱۹ تا ۱۲۱
— آپؐ پر درود وسلام بھیجنے کا حکم اور اس کی تشریح ۱۲۳ تا ۱۲۸
— غیر انبیاؑ کے لیے صلوٰۃ وسلام کے مسئلے میں فقہا کے اختلافات ۱۲۸
— اللہ تعالیٰ اور فرشتے آپؐ پر درود وسلام بھیجتے ہیں ۱۲۳
— درود میں آپؐ کی آل کو شامل کرنے کا مطلب ۱۲۶
— اللہ نے آپؐ کو شعر کی تعلیم نہیں دی نہ شاعری آپؐ کے لیے زیبا تھی ۲۶۹
— آپؐ بھی انسانوں کی طرح موت سے ہم کنار ہونے والے تھے ۳۷۱-۳۷۲
— آپؐ کی نصرت کے لیے اللہ کا وعدہ ۴۱۴-۴۱۵
— صبر کی طاقت حاصل کرنے کے لیے آپؐ کو نماز کی تلقین ۴۱۵-۴۱۶
— آپؐ کا وہ ''قصور'' جس کی معافی چاہنے کے لیے اللہ نے آپؐ کو ہدایت فرمائی ۴۱۵-۴۱۶
— آپؐ کس طرح اپنے صحابہؓ کی تربیت فرماتے تھے ۴۵۹
— وہ حیرت انگیز انقلاب جو آپؐ کی دعوت نے دنیا میں برپا کیا ۴۶۹-۴۷۰
— آپؐ کو کن باتوں میں دوسرے انبیاؑ پر فضیلت حاصل ہے ۱۴۱
— آپؐ کا بنی نوع انسان پر کتنا بڑا احسان ہے ۱۲۴
— مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ اللہ کے بندے ہیں ۳۷۹
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''ختم نبوت''، ''قرآن''، ''قریش'' اور ''نبوت'')

مدینہ-
(دیکھو ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم''، ''منافقین'' اور ''یہود'')
مسلم - (دیکھو ''اسلام'')
مرتد - (دیکھو ''قانون اسلام، قانون فوجداری'')
مسیح - (دیکھو ''عیسیٰ علیہ السلام'')
مسیحِ موعود
— ایک یہودی عقیدہ اور اس کی حقیقت ۱۵۴ تا ۱۶۹
مسیحی، مسیحیت - (دیکھو ''عیسائیت'')
مستشرقین
— قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کا اندھا تعصب ۴۰۴
— قرآن کے خلاف ان کی چالیں ۱۴
مشرک، مشرکین - (دیکھو ''شرک'')
مشرکینِ عرب - (دیکھو ''شرک'' اور ''عرب'')
مشیتِ الٰہی - (دیکھو ''تقدیر'')
معبود
— معبودوں کی دو قسمیں ۲۸۳
— کون سے معبود جہنم میں ڈالے جائیں گے ۲۸۳

(تفصیل کے لیے دیکھو ''الٰہ'')

معجزہ، معجزات

— معجزے کا ثبوت کن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے ۳۳۴-۳۳۵
— معجزے اور جادو کا فرق ۴۰۳
— حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچایا جانا ۲۹۳-۲۹۴
— حضرت ایوبؑ کے لیے زمین سے چشمہ نکالا جانا ۳۴۰
— وہ معجزات جو حضرت موسیٰ کو دیے گئے ۴۰۲-۴۰۳-۴۰۵-۵۶۵ تا ۵۶۷
— وہ معجزات جو حضرت موسیٰ کے ذریعے سے فرعون اور اس کی قوم کو دکھائے گئے ۵۴۱-۵۴۲
— حضرت یونسؑ کے قصے میں اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی قدرت کے کرشمے ۳۰۷-۳۰۸
— وہ معجزات جو حضرت عیسیٰ کو عطا کیے گئے ۵۴۶-۵۴۷
— قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزے کا مطالبہ اور اس کا جواب ۴۲۸ تا ۴۳۰-۶۰۵-۶۰۶
— معجزہ کوئی کھیل تماشا نہیں بلکہ فیصلہ کن چیز ہے اور اس کے بعد پھر عذاب ہی آتا ہے ۴۲۹
(نیز دیکھو ''آیت بمعنی معجزہ'')

مغفرت

— مغفرت کیسے لوگوں کے لیے ہے ۹۴-۹۷-۱۳۵-۱۷۵-۲۲۱-۲۴۸-۲۵۴-۳۷۹-۳۸۰-۶۰۵
— سرکشی چھوڑ کر اطاعت کی طرف آنے والے کے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں ۳۷۹
— بعض حالات میں توبہ کے بغیر بھی مغفرت ہو سکتی ہے ۳۹۲

ملائکہ - (دیکھو ''فرشتہ'')

ملک الموت

— انسانوں کی روح قبض کرنے والا فرشتہ ۴۱
— روحیں قبض کرنے والا صرف ایک ہی فرشتہ نہیں بلکہ بہت سے فرشتے اس کے ماتحت کام کرتے ہیں ۴۳

منافقین

— ان کی صفات اور ان کا طرزِ عمل ۷۶-۸۰ تا ۸۲
— منافقت کیا چیز ہے ۱۳۱-۱۳۲
— منافق اور مشرک کی سزا ۱۳۶
— مدینہ میں منافقین کا کردار ۵۵-۵۶-۵۷-۶۰-۶۴-۷۶ تا ۸۰-۹۹-۱۳۱
— منافقین کی اطاعت و پیروی نہ کی جائے ۶۸
— اندرونی دشمنوں (منافقین) کے ساتھ سخت برتاؤ کا حکم ۱۳۱
— مومن اور منافق کا فرق ۲۲۹-۲۳۴

منکرینِ حدیث

— منکرین حدیث کے دلائل کا ابطال:
(۱) جنوں کے بارے میں ۲۱۰
(۲) حضرت سلیمانؑ کے جنوں کے بارے میں ۱۹۰-۱۹۱
(۳) اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں ۴۴۴-۴۴۵
(۴) وحی کے بارے میں ۵۱۴

موت

— اس کی حقیقت ۴۱-۴۳-۴۴
— مرتے وقت ہی آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ صالح کی حیثیت سے جا رہا ہے یا مجرم کی حیثیت سے ۴۳
— موت خود بخود نہیں بلکہ اللہ کے روح قبض کرنے سے واقع ہوتی ہے ۴۳-۳۷۵

موسیٰ علیہ السلام ۴۹-۷۳-۴۱۵-۴۶۴-۶۰۸

— ان کا قصہ ۴۰۲ تا ۴۱۳-۵۴۰ تا ۵۴۶-۵۶۵ تا ۵۶۹
— ان کے اوصاف ۵۶۵-۵۶۶
— ان پر سلام ۳۰۲

— اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ ۱۳۴-۱۳۵
— ان پر اللہ تعالیٰ کی عنایات ۳۰۲
— ان کو راہ راست دکھائی گئی اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا گیا ۳۰۲
— ان کو ہدایت اللہ ہی کی طرف سے ملی تھی ۴۱۵
— ان سے کس بات کا پختہ عہد لیا گیا تھا ۳۷ تا ۵۷
— ان کو اللہ نے کتاب و نصرت عطا فرمائی تھی ۴۹-۳۰۲-۴۱۵-۴۶۴
— وہ بینات لائے تھے ۴۰۶
— وہ نشانیاں جو آپؑ کے نبی ہونے پر صریح دلالت کر رہی تھیں ۴۰۲-۴۰۳
— وہ معجزات جو ان کو دلیلِ نبوت کے طور پر دیے گئے ۵۶۵-۵۶۶
— وہ معجزات جو ان کی دعا پر فرعون اور آل فرعون کو ہدایت دینے کے لیے ظاہر ہوئے ۵۴۱-۵۴۲
— وہ معجزہ جو مصر سے خروج کے وقت رونما ہوا ۵۶۶-۵۶۷
— جن بھی ان پر ایمان رکھتے تھے ۶۱۹
— ان کی دعوت کیا تھی ۵۶۵
— ان کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے ۴۸۶
— ان کی تعلیم وہی تھی جو قرآن کی تعلیم ہے ۶۰۸
— ان کو فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا ۴۰۲
— ان کو اللہ نے اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا ۵۴۰
— ان کا فرعون سے مطالبہ کہ بنی اسرائیل کو میرے حوالے کرو ۵۶۵
— فرعون کا ان کے قتل کا ارادہ ظاہر کرنا اور ان کا جواب ۴۰۴-۴۰۵-۵۶۵
— فرعون کے وہ الزامات جو اس نے قتل کی سزا دینے کے لیے آپؑ پر لگائے ۴۰۳-۴۰۴
— فرعون کے مقابلے میں ان کو قدم قدم پر اللہ کی رہنمائی حاصل تھی ۴۱۵
— فرعون کی اپنی قوم کا ایک مومن بھرے دربار میں ان کی حمایت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے ۴۰۵ تا ۴۱۲
— اللہ نے ان کو اور حضرت ہارونؑ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے نجات عطا فرمائی ۳۰۲-۵۶۸
— فرعون اور آلِ فرعون کے رویے کے متعلق اللہ تعالیٰ سے ان کی فریاد ۵۶۶
— ان کو ہجرت کا حکم اور فرعون کا غرق ہونا ۵۶۶-۵۶۷
— بنی اسرائیل کا ان کو اذیتیں دینا ۳۴-۱۳۵
— اللہ نے ان تہمتوں سے ان کی براءت فرمائی جو بنی اسرائیل ان پر لگاتے تھے ۱۳۴-۱۳۵
— وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھے ۱۳۵
— مصر میں ان کی دعوت کے اثرات ۴۱۲-۴۱۳
— ان کے بعد بنی اسرائیل کا بگاڑ ۵۰-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵
— کیا فرعون نے حضرت موسیٰ پر لکنت کا طنز کیا تھا؟ ۵۴۴-۵۴۵

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'' اور ''فرعون'')

موسیقی

— اس کے متعلق شرعی احکام ۹-۱۰

مومن - (دیکھو ''ایمان'')

مومنِ آلِ فرعون

— اس کا قصہ ۴۰۵ تا ۴۱۲ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''موسیٰ علیہ السلام'')

میزان

— اللہ کی طرف سے میزان نازل کیے جانے کا مطلب ۴۹۷

ن

نامۂ اعمال

— اس میں کیا کچھ ثبت کیا جا رہا ہے ۲۴۸
— آخرت میں ہر انسان کا نامۂ اعمال پیش ہوگا ۳۸۳
— قیامت کے دن ہر انسان کو اپنا نامۂ اعمال دیکھنے کے لیے طلب کیا جائے گا ۵۹۲
— انسان کا پورا نامۂ اعمال خدا کے فرشتے ثبت کر رہے ہیں ۵۵۱
— اللہ ہر ایک کا نامۂ اعمال تیار کرا رہا ہے ۵۹۲-۵۹۳
— یہی نامۂ اعمال آخرت میں ٹھیک ٹھیک شہادت دے گا ۵۹۲
— انسان کا اپنا ہی کیا دھرا اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوگا ۵۹۲

نبوت

— وہ کسبی چیز نہیں ہے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے ۱۵۲-۵۱۷-۵۱۸
— وہ اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے ۵۳۶-۵۳۷
— نبی کی بعثت اللہ کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے ۵۵۷-۵۵۹ تا ۵۶۱
— نبوت اور رسالت کا فرق ۱۴۹-۱۵۰
— ''نذیر'' بمعنی رسول ۵۳۳
— نبوت کے متعلق لوگوں کے جاہلانہ تصورات اور ان کی تردید ۶۰۵ تا ۶۰۷
— کن حالات میں نبی کی بعثت ضروری ہوتی ہے ۲۴۶
— وہ عہد جو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا علیہم السلام سے لیا ہے ۳۷ تا ۵۷
— کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا ہو ۲۳۰
— ہر قوم کے لیے ایک نبی آنے کا صحیح مفہوم ۲۳۰-۲۳۱
— نبی اسی قوم کا آدمی ہونا چاہیے جس میں وہ مبعوث ہو ۳۱۹-۳۲۰-۳۸۴-۴۲۰
— نبوت کا تسلیم کرنا ہمیشہ سے دینِ حق کا لازمی جز رہا ہے ۴۸۷
— تمام رسولوں پر ایمان ضروری ہے ۴۸۶
— نبی پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ ۴۸۷
— یہ فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے کہ کسے اپنا نبی بنائے ۳۲۱-۳۹۸-۳۹۹-۵۳۶-۵۳۷
— قرآن میں بعض رسولوں کا ذکر ہے اور بعض رسولوں کا نہیں ہے ۴۲۸
— اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ انبیا ہی کے واسطے سے اپنی شریعت بھیجی ہے ۴۸۷
— کسی قوم میں رسول اور کتاب کا آنا اس کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہوتا ہے ۴۹ تا ۵۱
— ایک وقت میں تین نبی بھیجنے کی واحد مثال ۲۴۹
— انبیا علیہم السلام جنوں کے لیے بھی نبی تھے ۶۱۹
— ہر زمانے کے منکرین نے انبیا کا اس لیے انکار کیا کہ وہ انسان کو نبی ماننے کے لیے تیار نہ تھے ۲۴۹-۴۴۷-۵۳۶
— انسانوں کی ہدایت کے لیے ہمیشہ انسان ہی نبی بنائے گئے ہیں ۵۳۶
— ہر زمانے کے منکرینِ انبیاؑ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو نبی ہے وہ بشر نہیں ہوسکتا اور جو بشر ہے وہ نبی نہیں ہوسکتا ۲۴۹ تا ۲۵۱-۴۴۷-۵۴۴-۵۴۵
— انبیاؑ کا ذریعہ علم وحی ہے ۲۳۳-۳۸۱-۳۸۲-۴۴۱ (تشریح کے لیے دیکھو ''وحی'')
— انبیاء کا خواب بھی وحی کی ایک قسم ہے ۲۹۵

— نبی کو نبوت پر سرفراز ہونے اور وحی نازل ہونے سے پہلے وہ علم حاصل نہیں ہوتا جو نبوت اور نزولِ وحی کے بعد ہوتا ہے ۵۱۷-۵۱۸

— نبی غیب داں نہیں ہوتا ۶۱۶

— کوئی نبی اپنے اختیار سے معجزہ نہیں دکھا سکتا ۴۲۸

— لوگوں کی قسمتیں بنانا اور بگاڑنا نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا ۴۷۵-۴۸۰-۴۸۱

— لوگوں پر عذاب لے آنا نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا ۶۱۵-۶۱۶

— نبی کی رشتہ داری کسی کو خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتی ۸۷-۸۸-۳۰۶

— نبی خود بھی اگر قصور کرے تو سزا سے نہیں بچ سکتا ۳۰۷ تا ۳۱۰-۳۲۵-۳۳۰-۳۶۴-۵۸۶-۵۸۷

— انبیا علیہم السلام بھی آزمائشوں سے نہیں بچے ہیں ۲۳۰-۳۳۳ تا ۳۳۶

— نبی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ خدا کے عذاب سے کسی کو بچا لے ۳۶۵-۳۶۶

— اللہ نبی سے رو در رو کلام نہیں کرتا ۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۵۱۶

— نبی تک اللہ کا پیغام پہنچنے کے طریقے ۲۳۳-۵۱۶

— تمام انبیاؑ پر وحی آتی رہی ہے ۴۷۸-۴۷۹

— انبیا علیہم السلام کی کوششوں کا اصل مقصد انسانی زندگی میں کس قسم کی اصلاح کرنا تھا ۳۷۰-۳۷۱

— انبیاؑ کی بعثت کا مقصد ۳۷۱- ۳۸۱- ۳۹۹- ۴۸۶ تا ۴۹۲-۶۱۶

(مزید تشریح کے لیے دیکھو ”اسلام“ اور ”دین“)

— نبی کا کام ان حقیقتوں کو کھولنا ہے جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ۵۴۸

— انبیاؑ کی شریعتوں کے اختلاف کی حقیقت ۴۹۰- ۴۹۱

— اللہ تعالیٰ نے کبھی دشمنانِ حق کی شرارتوں کی وجہ سے انبیاؑ کی بعثت کا سلسلہ بند نہیں کیا ۵۲۴ تا ۵۲۶

— نبی کی صداقت کن باتوں سے پہچانی جاتی ہے ۲۵۲-۲۵۳-۴۰۶-۴۰۷-۵۰۲

— انبیاؑ علیہم السلام کے اوصاف ۳۴۳

— اولوا العزم پیغمبروں نے صبر کیا ۶۲۱

— نبی کا کام ہے کہ سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرے ۱۰۰-۱۰۲

— نبی کا فرض ہے کہ اللہ کا حکم بجا لانے میں کسی کی پروا نہ کرے ۱۰۲

— اللہ سے ڈرنا اور اس کے احکام کی تعمیل کرنا سب سے پہلے نبی کا کام ہوتا ہے ۳۶۴

— اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاؑ کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایت دینے والی کتاب لے کر آئے ۲۳۰

— نبی کے کام بحیثیت نبی اور بحیثیتِ انسان کے درمیان اصولی فرق ۶۱

— نبی کی ذمہ داری کس حد تک ہے ۲۱۷- ۲۲۸- ۲۳۰-۲۵۱-۲۹۰-۵۱۴

— نبی ان لوگوں کو ہدایت نہیں دے سکتا جو خود ہدایت نہ چاہتے ہوں ۲۲۸ تا ۲۳۰-۵۹۳

— وہ بینات کیا تھیں جو اللہ کے رسول لے کر آئے ۴۰۲-۴۰۶-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۴- ۵۴۸

— کسی نبی نے غیر اللہ کی بندگی کی تعلیم نہیں دی ۱۰-۲۱۱

— انبیاؑ اللہ کی طرف سے کیا چیز لے کر آتے ہیں ۲۳۰

— تمام انبیا علیہم السلام کتاب ہی نہیں لائے بلکہ حکمت بھی لائے ۹۲-۹۴-۳۲۴- ۵۴۸

— تمام انبیاء کی تعلیم و دعوت ایک ہی تھی ۳۸۱-۴۴۷-۵۲۳-۵۲۴
— تمام انبیاء کی تعلیم وہی تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں ۳۸۱-۳۸۲-۴۱۴- ۴۶۹ تا ۴۷۶-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۶-۴۸۷-۶۱۵
— انبیاء نے اپنی قوموں کو کس کس طرح سے برے انجام سے ڈرایا ۳۰۲ تا ۳۰۴
— انبیاء کی امتوں میں بگاڑ پیدا ہونے کی وجہ ۴۷۶-۴۹۲ تا ۴۹۵
— خدا کی اطاعت کے ساتھ نبی کی اطاعت کا حکم ۹۲-۹۷-۹۸-۱۳۴-۱۳۵
— خدا سے ڈرنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ نبی کی اطاعت کی جائے ۵۴۸
— اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کی کس طرح مدد فرماتا رہا ہے ۲۹۰-۲۹۱-۳۰۲
— اللہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے رسولوں کی مدد کرتا ہے ۳۱۳-۴۱۴
— اللہ کا یہ وعدہ برحق ہے ۴۱۵
— انبیاء کو غلبہ عطا کرنے کا صحیح مفہوم ۳۱۳-۳۱۴
— کسی کو نبی ماننے اور نہ ماننے سے کتنا بڑا بنیادی اختلاف واقع ہوتا ہے ۱۵۳-۱۵۴
— اسلام میں منصبِ نبوت کی اہمیت ۱۵۱
— نبوت کی پیروی قبول کرنے یا نہ کرنے ہی پر آخرت میں انسان کے انجام کا فیصلہ ہوگا ۲۳۷-۴۱۴
— نبی کو ماننے والے ہی خدا کی سزا سے بچ سکتے ہیں ۳۰۵
— آخرت میں انبیا علیہم السلام گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں گے ۱۰۵ تا ۱۰۷-۳۸۳
— رسولوں کے لائے ہوئے علم کے مقابلے میں اپنے دنیوی علوم پر مگن رہنا تباہی کا موجب ہے ۴۳۱
— تمام انبیاؑ کی مخالفت ہمیشہ ایک ہی طرح کی جاتی رہی ہے ۲۲۰-۲۳۰-۲۴۸ تا ۲۵۳-۴۶۳-۴۶۴-۵۲۴-۵۲۵
— ہمیشہ خوش حال طبقے نے انبیاؑ کا مذاق اڑایا ہے ۲۰۶-۵۳۳-۵۳۴
— انبیاؑ کی دعوت کے خلاف کفار کی ہمیشہ یہی دلیل رہی ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں ہمارے باپ دادا کے وقتوں سے وہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے ۵۳۴
— رسولوں کے خلاف دشمنانِ حق کی ساری چالیں آخر کار ناکام رہیں ۳۹۳
— انبیاؑ کے جھٹلانے والوں کا برا انجام ۲۱۱-۲۳۰-۲۳۱-۲۵۴-۲۹۰-۳۰۵-۳۱۳-۳۲۲-۳۶۹-۳۸۴-۴۰۲-۴۲۶-۴۲۷-۵۲۵-۵۲۶-۵۳۴-۵۴۱-۵۴۵-۵۴۶-۶۲۰
— اللہ کی یہ ناقابلِ تبدیل سنت ہے کہ جو قوم اپنے نبی کو جھٹلاتی ہے وہ تباہ کر کے رکھ دی جاتی ہے ۲۴۱
— رسولوں پر اللہ تعالیٰ کا سلام ۱۹۷-۲۹۱-۳۰۲-۳۰۵-۳۱۴-۵۱۴
— نبی اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے ۱۰۲-۱۰۳
— نبی کی تبلیغ و بشارت اور غیر نبی کی تبلیغ و بشارت میں بنیادی فرق ۱۰۸
— نئے نبی کا تقرر کن حالات میں کیا جاتا ہے ۱۵۲
— نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی (دیکھو ''ختم نبوت'')

نصاریٰ - (دیکھو ''عیسائیت'')

نفاق (دیکھو ''منافق'')

نکاح

— اس کے لغوی معنوں میں اختلاف ۱۰۹

— قرآن وسنت میں نکاح کا لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے ۱۰۹

(نیز دیکھو ''قانونِ اسلام، قانونِ نکاح وطلاق'')

نماز

— اس کے قائم کرنے کا حکم ۱۷-۹۰-۹۲

— اس کو قائم کرنے کا مطلب ۴۸۸

— اقامتِ صلوٰۃ اہل ایمان کی لازمی صفات میں سے ہے ۲۳۲-۵۰۷

— دین میں اس کی اہمیت ۷-۲۲۹

— اس سے ہر مومن کو راہِ خدا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے ۴۱۶

— اقامت صلوٰۃ کے ثمرات ونتائج ۲۳۲-۲۳۳

— نماز کے اوقات ۴۱۶

— نماز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا حکم ۱۲۷

— نماز اگرچہ تمام شریعتوں کا جز رہی ہے لیکن اس کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں ۴۸۹

نوح علیہ السلام ۷۳-۳۹۳-۴۰۸

— ان کا قصہ ۲۹۰-۲۹۱

— ان کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے ۴۸۶

— وہ اللہ کے مومن بندوں میں سے تھے ۲۹۱

— حضرت ابراہیمؑ انھی کے طریقے کے پیرو تھے ۲۹۱

— قومِ نوحؑ ۳۲۲

— طوفانِ نوح کے بعد وہ موجودہ نسل انسانی کے اولین پیغمبر تھے ۴۸۶

— موجودہ انسان ان لوگوں کی اولاد ہیں جو حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیے گئے تھے ۲۶۱-۲۶۲-۲۹۰-۲۹۱

— ان کی کشتی ہی بنی نوع انسان کی اولین کشتی تھی اور یہیں سے کشتی سازی کا رواج ہوا ۲۶۲

— ان کا خدا کو مدد کے لیے پکارنا ۲۹۰

— ان کے لیے تمام دنیا میں سلام اور تعریف ہے ۲۹۱

— ان سے پختہ عہد لیا گیا ۷۳ تا ۷۵

نیکی - (دیکھو ''احسان'')

و

وراثت

— اہلِ جنت زمین کے وارث ہوں گے ۳۸۴

(قانونِ وراثت کے لیے دیکھو ''قانون اسلام'')

وحی

— معنی وتشریح ۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۵۱۶

— اللہ کے طبعی احکام پر بھی لفظِ وحی کا اطلاق ہوتا ہے ۴۴۶

— قرآن وحی کیا گیا ہے ۲۳۳-۵۳۹

— نبی کا ذریعۂ علم ۴۴۱

— انبیاء کا علم عام انسانی علوم سے وحی کی بدولت ہی ممتاز ہوتا ہے ۵۱۶-۵۱۷

— ماورائے حس وادراک امور میں وحی ہی ایک قطعی اور یقینی ذریعہ علم ہے ۴۱۸

— انبیاؑ کا خواب بھی وحی کی ایک قسم ہے ۲۹۵-۵۱۷

— وحی کے لیے لفظ ''روح'' کا استعمال ۵۱۶

— انبیاؑ پر وحی آنے کے مختلف طریقے ۴۷۷-۵۱۶

— وہ ایک نور ہے جس سے اللہ اپنے رسولوں کی رہنمائی کرتا ہے ۵۱۷

—— اللہ جس پر چاہتا ہے وحی نازل کرتا ہے ۳۹۸-۳۹۹
—— کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ اللہ سے رو در رو بات کرے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ انبیاؑ کو علم دینے کے لیے دوسرے طریقے اختیار فرماتا ہے ۵۱۶
—— آسمانوں میں ان کا قانون وحی کیا گیا ہے ۴۴۶

ولی
—— معنی وتشریح ۴۷۵-۴۸۰-۴۸۱-۵۰۴-۵۸۳
—— اللہ کے سوا جن کو پکارا جاتا ہے ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے ۱۹۹- ۲۳۹- ۲۴۰- ۳۵۷- ۳۶۰-۳۷۶-۴۰۰-۶۰۱-۶۰۲
—— اللہ کے مقابلے میں کوئی ولی وسرپرست انسان کے کام نہیں آسکتا ۲۵۴-۵۸۳-۵۸۷-۶۲۰
—— اللہ کے سوا انسان کا کوئی ولی نہیں ہوسکتا ۴۷۵- ۴۸۲ تا ۴۸۴
—— اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانا شرک ہے اور یہ حرکت کرنے والے کاذب اور کافر ہیں ۳۵۸-۴۸۰
—— اللہ کے سوا کسی اور سے دعا مانگنا دراصل اس کی عبادت کرنا ہے ۴۲۰-۴۲۴
—— دوسروں سے دعا مانگنا حقیقت نہیں بدل سکتا کیونکہ ان کو معبود بنا لینے سے انھیں کسی قسم کے اختیارات حاصل نہیں ہو سکتے ۴۱۹
—— اللہ کے سوا کسی اور سے دعا مانگنا حد درجے کی گستاخی اور حماقت ہے اور اس کا انجام دوزخ کا عذاب ہے ۴۱۹-۴۲۰

ہ

ہارون علیہ السلام
—— ان پر اللہ تعالیٰ کی عنایات ۳۰۲
—— وہ نبوت کے کام میں حضرت موسیٰ کے ساتھی اور مددگار تھے ۳۰۲

ہامان -۴۰۲-۴۰۹

ہجرت -اس کا مقصد ۳۵۴
—— اپنا دین بچانے کی خاطر ہجرت کرنے والوں کا اجر ۳۶۳-۳۶۴
—— ہجرت حبشہ ۳۵۴

ہدایت
—— اس کے ذرائع ۲۰-۲۱-۲۵-۲۳۲
—— اللہ کی رضا معلوم ہونے کا ذریعہ صرف اللہ کی کتاب ہے ۵۲۱
—— انسان کی ہدایت کے لیے اللہ کیا طریقے استعمال فرماتا ہے ۳۲-۳۳-۴۷ تا ۴۹
—— انسان کو صحیح رہنمائی صرف اللہ کی نازل کردہ تعلیم ہی سے مل سکتی ہے ۲۳۳-۲۳۴
—— انسان کو ہدایت نصیب ہونا سراسر اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے ۲۸۸
—— انسان کے صحیح راستے پر قائم رہنے کا انحصار کن امور پر ہے ۱۹۴-۱۹۵
—— ہدایت کیسے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۴۹۳-۵۰۶
—— کیسے لوگ اس سے محروم رہتے ہیں ۳۵۷- ۳۶۷-۳۶۸-۴۰۶-۵۸۹-۶۰۶
—— جو اللہ سے ہدایت نہ پائے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۶۸- ۳۷۳- ۴۰۸- ۵۱۲- ۵۱۳-۵۸۹
—— جسے اللہ ہدایت بخشے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا ۳۷۳
—— جسے اللہ گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۶۸-۴۰۸
—— اللہ جسے چاہے ہدایت دے ۲۲۱-۲۲۲-۵۱۷
—— کیسے لوگ قرآن سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں ۷-۵۸۷
—— ہدایت پانے والے کون ہیں اور کون نہیں ہیں

۲۲۸-۲۳۰-۳۶۵-۳۶۶-۷
— ہدایت اختیار کرنے والا خود اپنا بھلا کرتا ہے ۳۷۵
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''تقدیر'' اور ''ضلالت'')

هود علیہ السلام
— ان کا قصہ ۶۱۳ تا ۶۱۷

ی

یثرب -۷۶

الیسع علیہ السلام
— ان کے حالات ۳۴۳-۳۴۴

یعقوب علیہ السلام -۳۴۳

یوسف علیہ السلام
— مصر میں ان کے وہ اثرات جو صدیوں تک قائم رہے ۴۰۸-۴۰۹

یوشع بن نون علیہ السلام
— حضرت موسیٰ کے خلیفہ اول ۳۰۳

یونس علیہ السلام
— وہ رسولوں میں سے تھے ۳۰۷
— ان کا قصہ ۳۰۷ تا ۳۱۰
— ان پر عتاب کی وجہ ۳۰۷-۳۰۹-۳۱۰
— ان کا مچھلی کے پیٹ میں جانا اور پھر اس سے نکلنا ۳۰۷-۳۰۸
— ان کی قوم کا ایمان عذابِ الٰہی آ جانے کے بعد کیوں قبول کیا گیا ۳۰۹-۳۱۰

یہود
— ان کے علما نے بنی اسماعیل سے حسد کی بنا پر حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیا ۳۰۱
— حضرت یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے عہد میں وہ تین آنے والوں کے منتظر تھے ۳۰۵-۳۰۶
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں ان کی گمراہی ۵۴۸
— ان کے ہاں مسیحِ موعود کے عقیدے کی حقیقت ۱۶۵
— دجال یہودیوں ہی میں سے ہوگا ۱۶۵-۱۶۶
— یہودیوں کی مجوزہ مملکتِ اسرائیل ۱۶۷
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اہلِ کتاب'' اور ''بنی اسرائیل'')

قوم سبا کا یمن میں بنایا ہوا مشہور ڈیم ''سدِّ مآرِب''

متعلقہ صفحہ ۱۹۲ - ۱۹۳

(جلد چہارم)

قوم سبا کا یمن میں بنایا ہوا مشہور ڈیم ''سدِّ مآرِب''

متعلقہ صفحہ ۱۹۲ - ۱۹۳ (جلد چہارم)